تفسیر موضوعی

قرآن کا دائمی منشور

11-12

مؤلف

آیت اللہ استاد جعفر سبحانی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تفسیر موضوعی

جلد گیارہ

قرآن کا دائمی منشور

نگارش

آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

ترجمہ

مولانا قیصر عباس

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ------------------ تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور

جلد ---------------------- گیارہ، بارہ

مؤلف -------------------- آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

مترجمین ------------------ مولانا قیصر عباس

ترتیب و تنظیم نو ---------------- قلب علی سیال

کمپوزنگ ------------------ فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

طبع ثانی ------------------ مکتبہ جدید پریس لاہور

سال اشاعت ---------------- فروری 2012ء

ناشر ---------------------- مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ مکمل سیٹ -------------- 3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے
ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان
کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

تفسیر قرآن کا یہ طریقہ علماء ومحققین اور عام طالبانِ قرآنیات کے لیے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے قرآن کی ہمہ گیر تعلیمات اور اسلام کے آفاقی ضوابط کو بہتر اور جامع طور پر سمجھنے سمجھانے کے علاوہ بالوقت استنباط احکام بھی کر سکتے ہیں۔ آیت اللہ جعفر سبحانی نے فارسی زبان میں یہ اولین تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کے نام سے ترتیب دی اور مولانا قیصر عباس نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔

تفسیر موضوعی کی طباعت واشاعت میں حسب ذیل دو مقاصد ہمارے پیش نظر رہے ہیں:

۱: اردو خوان طالبان قرآنیات کو تفسیر قرآن کی ایک نئی روش سے روشناس کرانا۔

۲: علماء ومحققین کی خدمت میں اسلامی وقرآنی تعلیمات کا ایک ایسا مرقع پیش کرنا کہ جس میں ہر موضوع اپنی جگہ مکمل ہو۔

اس وقت تفسیر موضوعی کی جلد نمبر 11، 12 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر دو جلدوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ تاکہ کتاب کی قیمت میں کمی کی جاسکے۔ کتاب تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کی طباعت ثانی دس سال بعد پیش کی جارہی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور جلد نمبر 11

عنوان	صفحہ نمبر
قصص القرآن	17
موضوعات، مقاصد اور خصوصیات	17
۱)۔قصص کے موضوعات	18
۲)۔قصص قرآنی کے مقاصد	19
(الف)۔پند و نصیحت	20
(ب)۔پیغمبروں کی دعوت کا مقصد واحد	21
(ج)۔قلب پیغمبر کی تقویت	22
۱)۔قصص انبیاء کی واقعیت	22
۲)۔تحریفات کی تصحیح	23
۳)۔قصص کا انتخاب	24
پیغمبر اول ابوالبشر حضرت آدمؑ کی داستان	25
آپ کی زندگی کے آٹھ بنیادی پہلو	25
(۱)۔تخلیق آدمؑ	26
موضوع سے متعلق آیات	26
آیات کی موضوعاتی حوالہ سے تفسیر	27
۱)۔خاک	28
۲)۔مٹی	28
۳)۔چپکنے والی مٹی	28
۴)۔تاریک کیچڑ	28
۵)۔مٹی کا خلاصہ	29
۶)۔ٹھیکرے کی طرح خشک مٹی	29
۲)۔دوسرا مرحلہ۔۔۔صورت بنانا	29
۳)۔تیسرا مرحلہ۔۔۔روح پھونکنے کا مرحلہ	31
نظریہ استقلال یا نظریہ اشتراک	32
اس نظریہ کی بنیاد نظریہ قدیم پر ہے	33
قرآن اور تحول انواع کے مدعی	34
نتیجہ گفتگو	36
انسان اول کی نسلی بقاء	36
۲)۔زمین پر حضرت آدمؑ کی خلافت	38
موضوع سے متعلق آیات	38
۱)۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانشینی	40
(الف)۔''نمائندگی'' نمایاں کرنے کے مفہوم میں	41
(ب)۔اس کی ''نمائندگی'' کائنات میں تصرف کرنے میں	43
۲)۔سابقین کا جانشین	44
جانشین نوع انسان ہے	47
(۳)۔اسماء کا علم	48
موضوع سے متعلق آیات	48
آیات کی موضوعاتی تفسیر	49
آیات کے جملات اور کلمات کی وضاحت	49
۲)۔فرشتوں پر آدمؑ کی علمی برتری	52

فہرست	صفحہ
(الف)۔موجودات کے اسماء کی تعلیم	52
(ب)۔اسرار ہستی کی تعلم اور موجودات کے آثار سے آگاہی	53
(۴)۔آدمؑ مسجود ملائکہ	56
موضوع سے متعلق آیات	56
آیات کی موضوعاتی تفسیر	58
۱)۔کیا فرشتوں کا سجدہ آدمؑ کے لیے تھا؟	58
۲)۔کیا سجدہ آدمؑ کے لیے تھا؟	62
۳)۔بارگاہ الٰہی سے دھتکارا ہوا ابلیس	63
۴)۔کیا ابلیس فرشتہ تھا؟	65
۵)۔تکبر اللہ کے مقابلہ میں تھا یا آدمؑ کے	67
۶)۔ابلیس کی مہلت کی درخواست	71
۷)۔دھتکارے ہوئے شیطان کا ردعمل	71
۸)۔شیطان کا محدود تسلط	72
(۵) بہشت میں آدمؑ کی سکونت	75
موضوع سے متعلق آیات	75
آیات کی موضوعاتی تفسیر	77
۱)۔بہشت میں آدمؑ کی سکونت	77
۲)۔درخت سے روکنا اور اللہ کا خبردار کرنا	79
۳)۔شیطان کا وسوسہ اور اس کا نتیجہ	80
(۶) نصیحت الٰہی کی مخالفت	83
موضوع سے متعلق آیات	83
آیات کی موضوعاتی تفسیر	84
الف۔عصمت اور قرب درخت سے روکنا:	84
ب۔عصمت اور آدمؑ کی لغزش	86
ج۔عصمت اور ''ظلمنا انفسنا'' کا جملہ	87
ھ۔عصمت اور لفظ 'غفران'	89
آدمؑ کی توبہ کی کیفیت	89
کیا شیطانی وسوسہ اور اس کا گمراہ کرنا عمومی ہے؟	90
حضرت آدم کا چناؤ	92
(۷) حضرت آدمؑ کا زمین پر اترنا	94
موضوع سے متعلق آیات	94
آیات کی موضوعاتی تفسیر	95
نکات اور نصائح	97
(۸)۔اولاد آدمؑ کی سرگذشت	99
موضوع سے متعلق آیات	99
آیات کی موضوعاتی تفسیر	100
نکات اور نصائح	104
حضرت آدمؑ کی زوجہ کی خلقت کی بحث	106
اولاد آدمؑ کے ازدواج کی کیفیت	107
دوسرے پیغمبر: بانی تحریر حضرت ادریس علیہ السلام	108
تیسرے پیغمبر: شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام	110
حضرت نوحؑ کی زندگی کے سات پہلو	110
(۱)۔حضرت نوحؑ کے معنوی مقامات	110
موضوع سے متعلق آیات	111
(۲)۔حضرت نوحؑ کے خلاف تہمتیں اور اعتراضات	113
موضوع سے متعلق آیات	113
الف: تہمتیں	114
۱)۔دیوانگی کا اتہام	114
۲)۔دروغگوئی کا الزام	115

فہرست	صفحہ

فہرست	صفحہ
۳)۔ گمراہی کی تہمت	115
۴)۔ برتری طلب کرنے کا الزام	115
ب: اعتراضات	116
۱)۔ انسان ہونا	116
۲)۔ مفلس اور گمنام پیروکاران	116
(۳)۔ الزامات و اعتراضات کے سلسلہ میں حضرت نوحؑ کا جواب	118
موضوع سے متعلق آیات	118
آیات کی موضوعاتی تفسیر	120
(۴)۔ حضرت نوحؑ کا دعوت حق دینے کا طریقہ، مستقل مزاجی اور قوم کا انکار وہٹ دھرمی	125
موضوع سے متعلق آیات	125
ہدایات ونصائح	127
تبلیغ حق میں مستقل مزاجی	130
(۵)۔ ہمہ گیر طوفان اور کفار کی نابودی	132
موضوع سے متعلق آیات	132
زمین وآسمان میں عذاب کی نشانیاں	134
طوفان کے بعد سکون	136
(۶)۔ اولاد نوحؑ کی سرگذشت	138
موضوع سے متعلق آیات	138
آیات کی موضوعاتی تفسیر	139
اللہ کے وعدے سے کیا مقصود ہے؟	140
خائن زوجہ	141
(۷)۔ نکات ونصائح	142
۱)۔ حضرت نوحؑ کی رسالت صرف ان کی اپنی قوم کے لیے تھی	143
۲)۔ طوفان کا پوری دنیا پر آنا ان کی رسالت کے عالمگیر ہونے کی دلیل ہے	144
چوتھے پیغمبر: حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد کے درمیان	147
(۱)۔ قوم ہود کی زندگی کی خصوصیات	149
موضوع سے متعلق آیات	149
(۲)۔ تبلیغ کے مطالب اور حضرت ہودؑ کی تبلیغ کا طریقہ کار	152
موضوع سے متعلق آیات	152
تبلیغ کا طریق کار	154
(۳)۔ تہمتیں، اعتراضات اور ان کے جوابات	156
موضوع سے متعلق آیات	156
الف۔ اتہامات	158
۱)۔ احمقانہ دعوت	158
۲)۔ دروغگوئی کی تہمت	158
۳)۔ جنون کی تہمت	158
ب۔ اعتراضات	159
حضرت ہودؑ کے جوابات	160
(۴)۔ نزول عذاب کا خوف دلانا اور عذاب کی درخواست	162
موضوع سے متعلق آیات	162
آیات کی موضوعاتی تفسیر	163
(۵)۔ نزول عذاب اور ان کی کیفیت	165
موضوع سے متعلق آیات	165

فہرست	صفحہ
آیات کی موضوعاتی تفسیر	167
(۶)۔ نکات اور عبرت آمیز باتیں	169
پانچویں پیغمبر: قوم ثمود کے لیے حضرت صالح علیہ السلام	171
(۱)۔ قوم صالحؑ کی خصوصیات	172
موضوع سے متعلق آیات	172
(۲)۔ تبلیغ کے مطالب اور طریقۂ کار	175
موضوع سے متعلق آیات	175
(۳)۔ حضرت صالحؑ کا معجزہ	178
موضوع سے متعلق آیات	178
لوگوں کی درخواست کے بعد معجزہ	180
(۴)۔ مخالفین اور مخالفت کے محرکات	182
موضوع سے متعلق آیات	182
(۵)۔ عذاب الٰہی یا مخالفت پر ردعمل	187
موضوع سے متعلق آیات	187
قوم ثمود کی ہٹ دھرمی	190
(۶)۔ نکات اور عبرت آمیز باتیں	194
چھٹے پیغمبر: نمائندہ توحید حضرت ابراہیم علیہ السلام	196
حضرت ابراہیمؑ بابل میں	201
الف: حضرت ابراہیمؑ کی بابل میں زندگی	201
الف: آزر کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ	202
موضوع سے متعلق آیات	202
آذر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوشخبری	205
آذر حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہ تھا	206
ب: ستارہ پرستوں کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ	209
موضوع سے متعلق آیات	210
حضرت ابراہیمؑ کے دلائل کی وضاحت چند مطالب کے ذریعہ	212
(۳)۔ حضرت ابراہیمؑ کا بت پرستوں سے مناظرہ	222
موضوع سے متعلق آیات	222
بت پرستی کی مذمت میں حضرت ابراہیمؑ کی منطق	225
حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے میں ان کی قوم کی منطق	226
(۴)۔ بت شکنی کا عزم	230
موضوع سے متعلق آیات	230
بت شکنی:	232
(۵)۔ حضرت ابراہیمؑ پر کھلی عدالت میں مقدمہ	235
موضوع سے متعلق آیات	235
(۶)۔ اس اقدام پر بت پرستوں کا ردعمل	240
موضوع سے متعلق آیات	240
ابراہیم علیہ السلام آگ میں	241
متعصب ترین لوگ	242
(۷)۔ حضرت ابراہیمؑ کا بابل کے حکمران سے مناظرہ	243
علمبر دار توحید کی زندگی کا دوسرا حصہ	245
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فلسطین کی طرف ہجرت	245
حضرت ابراہیمؑ کے دو علیم و حلیم بیٹے اسماعیل و اسحاق	247
موضوع سے متعلق آیات	247
آیات کی موضوعاتی تفسیر	249
موضوع سے خارج دو نکات	251
(۲)۔ اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی مدد سے کعبہ کی تعمیر نو	252

فہرست	صفحہ
موضوع سے متعلق آیات	252
آیات کی موضوعاتی تفسیر	254
ابراہیم علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش بزرگ	257
موضوع سے متعلق آیات	257
آیات کی موضوعاتی تفسیر	258
(۴)۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مردہ کو زندہ کرنا	263
موضوع سے متعلق آیت	263
ایک سوال کا جواب	265
جواب	265
(۵)۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مقام امامت	267
موضوع سے متعلق آیت	267
آیات کی موضوعاتی تفسیر	267
۱)۔کلمات سے کیا مراد ہے؟	267
۲)۔''اماما'' سے کیا مراد ہے؟	268
۱)۔انبیاء کے سردار	269
۲)۔مطاع فرمانروا	270
(۶)۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں	274
چھٹے پیغمبر:(۷)۔ حضرت خلیل اللہ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام	277
آٹھویں پیغمبر: حضرت لوط علیہ السلام سرزمین اُردن پر	279
(۱)۔تبلیغ کا تاکیدی پہلو	281
موضوع سے متعلق آیات	281
آیات کی موضوعاتی تفسیر	282
(۲)۔قوم لوطؑ کا ردِعمل	285
موضوع سے متعلق آیات	285
آیات کی موضوعاتی تفسیر	286
(۳)۔عذاب کے فرشتوں کا آنا اور گنہگاروں سے ان کا ٹکراؤ	288
موضوع سے متعلق آیات	288
آیات کی موضوعاتی تفسیر	290
(۴)۔علاقہ کی تطہیر یا نزول عذاب	294
موضوع سے متعلق آیات	294
آیات کی موضوعاتی تفسیر	295
(۵)۔نزول عذاب کا وقت	296
موضوع سے متعلق آیات	296
آیات کی موضوعاتی تفسیر	296
عذاب کی کیفیت	297
موضوع سے متعلق آیات	297
آیات کی موضوعاتی تفسیر	299
۱)۔پتھروں کی بارش	299
۲)۔شدید زلزلہ	300
۳)۔گذشتہ دونوں عذابوں کے ساتھ آسمانی چنگھاڑ	300
(۷)۔ہلاک ہونے والے اور نجات پانے والے	302
موضوع سے متعلق آیات	302
آیات کی موضوعاتی تفسیر	303
نویں پیغمبر: حضرت اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام	305
موضوع سے متعلق آیات	305
آیات کی موضوعاتی تفسیر	305
دسویں پیغمبر: حضرت یعقوب ابن اسحاق علیہ السلام	307
موضوع سے متعلق آیات	307

فہرست	صفحہ
آیات کی موضوعاتی تفسیر	308
گیارہویں پیغمبر: حضرت یوسف علیہ السلام	310
مقدمہ	310
زندگانی جناب یوسف علیہ السلام کا پہلا دور	312
حضرت یوسف علیہ السلام کا بچپن	312
سرزمین کنعان میں حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب واقعہ نما	312
موضوع سے متعلق آیات	312
آیات کی موضوعاتی تفسیر	313
معجزہ قرآن	313
حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب	315
خواب۔۔۔عالم غیب کا ایک دریچہ	316
خواب یوسفؑ کے بارے میں قرآن اور توریت میں اختلاف	319
سجدہ کا مقصد	319
حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا منصوبہ خیانت	321
موضوع سے متعلق آیات	321
آیات کی موضوعاتی تفسیر	323
حسد کی آگ	323
سازش کی منصوبہ بندی	325
منصوبہ پرعمل	326
سبق آموز نکات	327
جدائی کا آغاز	328
موضوع سے متعلق آیات	328
آیات کی موضوعاتی تفسیر	329
جھوٹی رپورٹ	329
حضرت یعقوبؑ کا ردعمل	330
کنوئیں سے حضرت یوسفؑ کی نجات	331
زندگانی یوسف علیہ السلام کا دوسرا حصہ	334
یوسفِ کنعانی: عزیز مصر کے گھر میں نئی زندگی کا آغاز	334
موضوع سے متعلق آیات	334
آیات کی موضوعاتی تفسیر	334
(۲)۔ایمان وخواہشات کی جنگ	337
موضوع سے متعلق آیات	337
آیات کی موضوعاتی تفسیر	338
دام شیطانی	339
اس فریب سے حضرت یوسفؑ کونجات	340
جملہ کی دوسری طرح تفسیر	341
برہانِ رب سے کیا مراد ہے؟	343
''برھان ربہ'' کی تفسیر میں بے معنی نظریات	344
جال سے فرار	347
دونوں کی شکایت کا افشاء	348
(۳)۔مصر میں عزیز مصر کی بیوی کے عشق کا چرچا	350
موضوع سے متعلق آیات	350
آیات کی موضوعاتی تفسیر	350
عزیز مصر کی زوجہ کی طرف سے مہمانوں کی مذمت	353
قدرتِ ہوس	354
سبق آموز نکات	355

فہرست	صفحہ
زندگانی حضرت یوسف علیہ السلام کا تیسرا حصہ: زندان کی تاریکی سے کرسی صدارت تک	356
موضوع سے متعلق آیات	356
آیات کی موضوعاتی تفسیر	357
بے گناہ قیدی	358
موضوع سے متعلق آیات	361
آیات کی موضوعاتی تفسیر	362
اسباب طبعی کا دخل	363
بادشاہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی تعبیر	365
موضوع سے متعلق آیات	365
آیات کی موضوعاتی تفسیر	367
زندان سے آزادی	371
موضوع سے متعلق آیات	371
آیات کی موضوعاتی تفسیر	372
صدارت کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کا انتخاب	377
موضوع سے متعلق آیات	377
آیات کی موضوعاتی تفسیر	377
زندگانی یوسف علیہ السلام کا چوتھا حصہ: دورِ حکمرانی اور جدائیوں کا اختتام	381
حضرت یوسف علیہ السلام کی بھائیوں سے ملاقات	381
موضوع سے متعلق آیات	381
آیات کی موضوعاتی تفسیر	384
قافلہ کا کنعان میں ورود	386
مصر کا دوسرا سفر	388
حضرت یوسفؑ کی عاقلانہ تدبیر	391
موضوع سے متعلق آیات	391
آیات کی موضوعاتی تفسیر	393
موضوع سے متعلق آیات	396
آیات کی موضوعاتی تفسیر	398
عزیز مصر سے دوسری درخواست	399
کنعان میں ورود	401
مصر کا تیسرا سفر	403
موضوع سے متعلق آیات	403
آیات کی موضوعاتی تفسیر	404
پردہ اٹھتا ہے	406
یعقوب علیہ السلام کے غم کا اختتام	410
موضوع سے متعلق آیات	410
آیات کی موضوعاتی تفسیر	410
جدائی کا اختتام	413
موضوع سے متعلق آیات	413
آیات کی موضوعاتی تفسیر	414
مصر کی طرف سفر	416

فہرست

تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور جلد نمبر 12

عنوان	صفحہ نمبر
پیش لفظ	422
۱۔انسانی فطرت کے تمایلات کی رہنمائی	422
۲۔احکام و معارف کے اصولوں کی تعلیم	422
بارہویں پیغمبر: حضرت شعیب علیہ السلام بمقامِ مدین	424
حضرت شعیبؑ کی بعثت کا زمانہ اور علاقہ	424
حضرت شعیبؑ کی خصوصیات	425
(۱) دعوتِ شعیبؑ کے مختلف پہلو	427
موضوع سے متعلق آیات	427
آیات کی موضوعی تفسیر	429
(۲) تبلیغ کا طریق کار	431
موضوع سے متعلق آیات	431
آیات کی موضوعی تفسیر	433
۱۔اپنی بات کی حقانیت وسچائی پر دلیل و برہان لانا	433
۲۔نعماتِ الٰہی کی یاددہانی	433
۳۔ظالموں کے انجام کا تذکرہ	434
۴۔عذاب الٰہی سے ڈرانا	434
(۳) قوم کا ردِ عمل	436
موضوع سے متعلق آیات	436
آیات کی موضوعی تفسیر	437
(۴) عذابِ الٰہی کا نزول	441
موضوع سے متعلق آیات	441
آیات کی موضوعی تفسیر	442
نکات وعبرت	444
تیرہویں پیغمبر: حضرت موسیٰؑ ابن عمران (کلیم اللہ)	445
(۱) ولادت سے ۔۔۔۔۔۔ مدین کی ہجرت تک	448
(الف) ولادت سے دربارِ فرعون میں پہنچنے تک	448
موضوع سے متعلق آیات	448
اللہ تعالیٰ کی مشیت اور فرعون کی قساوتِ قلبی	450
سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قصص کی آیات کا موازنہ	452
(ب) فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰؑ کی زندگی	455
آیات کی موضوعی تفسیر	457
حفاظتِ الٰہیہ	461
(۲) مدین میں زندگی کے دس سال	463
موضوع سے متعلق آیات	463
آیات کی موضوعی تفسیر	465
یہ ضعیف باپ (شعیبؑ کون تھا)؟	468
(۳) مدین سے مصر کو واپسی	470
موضوع سے متعلق آیات	470
آیات کی موضوعی تفسیر	467
حضرت موسیٰؑ کے معجزات	479
رسالت موسیٰؑ کے مطالب	480
حضرت موسیٰؑ کی اللہ تعالیٰ سے درخواستیں	482
ایک سوال کا جواب	484
(۴) فرعون کے ساتھ مبارزہ سے اس کی ہلاکت تک	486
پہلا مرحلہ پیغامات الٰہی کا ابلاغ	486
موضوع سے متعلق آیات	486
آیات کی موضوعی تفسیر	490

فہرست	صفحہ
حضرت موسیٰؑ کی فرعون کے خلاف دلیل	491
دوسرا مرحلہ اتہامات، دھمکیاں اور معجزہ کی درخواست	493
موضوع سے متعلق آیات	493
آیات کی موضوعی تفسیر	497
(الف) تہمت	497
ا۔ساحر	497
۲۔کذاب (جھوٹا)	497
۳۔جنون (دیوانگی)	497
۴۔الف۔برتری طلب کرنا	498
(ب) آباؤاجداد کے طریق سے ہٹانا	498
(ج) تمسخر	498
(د) دھمکیاں	498
(ھ) لجاجت	498
(۵) زمینوں پر قبضہ	498
تیسرا مرحلہ جادوگروں کی طلبی	500
موضوع سے متعلق آیات	500
آیات کی موضوعی تفسیر	508
(الف) ماہر جادوگروں کا اکٹھا کرنا	508
(ب) فرعون کی شکست اور جادوگروں کا ایمان	510
(ج) سب سے پہلے جادوگر ہی کیوں ایمان لائے؟	512
(د) شرمناک شکست کے بعد	513
آیات کی موضوعی تفسیر	515
(ھ) فرعون کے محل میں نفوذ!	516
زوجۂ فرعون کا ایمان	517
(و) توحید کے فروغ سے فرعون کا خوف	519
موضوع سے متعلق آیات	519
(ز) موسیٰ کے قتل کی سازش!	520
(ح) سادہ لوح عوام کو دھوکہ دہی	522
(ط) مومن آلِ فرعون کا واقعہ	524
موضوع سے متعلق آیات	524
آیات کی موضوعی تفسیر	527
(ی) مومن آلِ فرعون کی گفتگو میں تعمیری و تعلیمی نکات	528
(ک) آخری اتمامِ حجت	530
موضوع سے متعلق آیات	530
آیات کی موضوعی تفسیر	533
ا۔قحط اور پھلوں کی کمی	533
۲۔طوفان	533
۳۔ٹڈی دل	533
۴۔قمل	533
۵۔ضفادع	534
۶۔خون	534
(۵) آلِ فرعون کی تباہی و ہلاکت	535
موضوع سے متعلق آیات	536
آیات کی موضوعی تفسیر	538
غرق ہوتے وقت ایمان لانا	540
بنی اسرائیل کی مصر سے ہجرت	541
موضوع سے متعلق آیات	541
آیات کی موضوعی تفسیر	542
کیا بنی اسرائیل دوبارہ مصر میں واپس آئے؟	543
(۶) مصر سے خروج اور صحرائے سینا میں ورود	546
موضوع سے متعلق آیات	546
آیات کی موضوعی تفسیر	548
بیابان میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمات کا نزول	550
میقات میں موسیٰؑ پر تورات کا نزول	552
موضوع سے متعلق آیات	552
آیات کی موضوعی تفسیر	553

فہرست	صفحہ
قرآن میں تورات کی صفات	557
۲۔ بنی اسرائیل کے سرکردہ افراد کی اللہ کو دیکھنے کی درخواست	559
موضوع سے متعلق آیات	559
آیات کی موضوعی تفسیر	561
بنی اسرائیل اور رویت الٰہی کی درخواست	561
موسیٰؑ اور رویت کی درخواست	563
بت پرستی کی طرف لوٹنا!	565
آیات کی موضوعی تفسیر	570
سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں گئوسالہ پرستی کا تذکرہ	571
حضرت موسیٰ کی اپنے بھائی سے جواب طلبی!	574
حضرت موسیٰؑ کی سامری سے گفتگو	575
سامری کی سزائیں	576
(۷) صحرائے سینا میں چالیس سال کی سرگردانی	580
موضوع سے متعلق آیات	580
آیات کی موضوعی تفسیر	582
(۸) بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمیاں!	585
موضع سے متعلق آیات	585
آیات کی موضوعی تفسیر	588
بیت المقدس میں داخلہ	590
بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی کی ایک اور مثال!	590
قرآن اور بنی اسرائیل کی گائے کا قصہ!	593
موضوع سے متعلق آیات	593
آیات کی موضوعی تفسیر	595
آیات کی تفسیر میں شیخ عبدہ کا نظریہ	597
قارون۔۔۔ایک متکبر دنیادار!	599
موضوع سے متعلق آیات	599
آیات کی موضوعی تفسیر	602

فہرست	صفحہ
قارون کے دور دِ عمل	604
قارون اور اس کے خزانوں کو زمین کا نگل لینا	606
حضرت موسیٰ اور اُن کے معلم کا واقعہ	608
موضوع سے متعلق آیات	608
اس داستان کا خلاصہ	612
ا۔ موسیٰؑ سے اس آیت میں کون سی شخصیت مراد ہے؟	614
مجمع البحرین (دو دریاؤں کے سنگھم کی جگہ) سے کون سی جگہ مراد ہے؟	614
جملہ "اوامضی حقباً" سے کیا مراد ہے؟	615
۲۔ فلما بلغ مجمع بینهما نسیا حوتهما فاتخذ سبیله فی البحر سرباً	615
پیروی کی پہلی منزل	619
چودھویں پیغمبر: حضرت داؤد علیہ السلام کی سرگزشت	627
موضوع سے متعلق آیات	628
آیات کی موضوعی تفسیر	631
تعارف: حضرت داؤدؑ بزبانِ قرآن مجید	636
موضوع سے متعلق آیات	636
آیات کی موضوعی تفسیر	638
قضاوت میں حضرت داؤدؑ بطور خلیفۂ خدا	640
موضوع سے متعلق آیات	640
آیات کی موضوعی تفسیر	642
حضرت داؤدؑ کا حضرت سلیمانؑ کے مطابق فیصلہ	644
داستانِ حضرت داؤدؑ کے سبق آموز نکات	645
پندرہویں پیغمبر: حضرت سلیمانؑ کی سرگذشت	647
(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام کی صفات	648
موضوع سے متعلق آیات	648
آیات کی موضوعی تفسیر	649
(۲) حضرت سلیمانؑ کے سامنے سواروں کی حاضری	651

فہرست	صفحہ
موضوع سے متعلق آیات	651
آیات کی موضوعی تفسیر	651
(۳) حضرت سلیمانؑ کا امتحان اور آزمائش	653
موضوع سے متعلق آیت	653
(۴) بے مثل بادشاہی کی درخواست	653
موضوع سے متعلق آیات	653
حضرت سلیمانؑ کی بادشاہی کی حدود	655
ہواؤں کی تسخیر	655
۲۔ جنات کی تسخیر	656
۳۔ تانبے کی کانوں کی تسخیر	656
آیات کی موضوعی تفسیر	658
(۶) چیونٹیوں کی سرزمین کا سفر	661
موضوع سے متعلق آیات	661
آیات کی موضوعی تفسیر	662
(۷) ھُدھُد اور ملکہ سبا کا واقعہ	664
موضوع سے متعلق آیات	664
آیات میں آمدہ الفاظ کے لغوی معنی و توضیحات	669
آیات کی موضوعی تفسیر	669
ملکہ سباء کے نام حضرت سلیمانؑ کا خط!	672
ملکہ سبا کے قاصد حضرت سلیمانؑ کے حضور!	672
ملکہ سباء حضرت سلیمانؑ کے حضور!	675
حضرت سلیمانؑ کی وفات	680
سولھویں پیغمبر: حضرت ایوب علیہ السلام کے حالاتِ زندگی	683
موضوع سے متعلق آیات	683
وضاحتِ الفاظ	685
آیات کی موضوعی تفسیر	686
حضرت ایوبؑ کی زندگی کے اہم واقعات	686
داستانِ حضرت ایوبؑ کے اہم نکات	689
سترہویں پیغمبر: حضرت یونسؑ کے حالات	690
موضوع سے متعلق آیات	690
آیات کے الفاظ کی تشریح	693
آیات کی موضوعی تفسیر	693
(۱) حضرت یونس کی اپنی قوم کے لیے بددعا	694
(۲) حضرت یونس کی کشتی میں کیفیت	697
(۳) حضرت یونس۔۔۔ بے آب و گیاہ سرزمین پر	699
عصمت کے مخالفین کی بحث	700
اس داستان کے سبق آموز نکات	702
اٹھارہویں پیغمبر: حضرت ذکریا علیہ السلام	703
موضوع سے متعلق آیات	703
آیات کی موضوعی تفسیر	707
حضرت ذکریاؑ کی دعا کی قبولیت	709
حضرت ذکریاؑ کی داستان کے سبق آموز نکات	713
انیسویں پیغمبر: حضرت یحییٰ علیہ السلام	715
موضوع سے متعلق آیات	715
الفاظ کی لغوی توضیح	716
آیات کی موضوعی تفسیر	717
بیسویں پیغمبر: قرآن مجید میں۔۔حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات	721
(۱) حضرت مسیح علیہ السلام کی معجزانہ ولادت	722
موضوع سے متعلق آیات	722
آیات کی موضوعی تفسیر	726
حضرت مریمؑ کا بچہ کو لے کر قوم کی طرف آنا	730
(۲) حضرت مسیح علیہ السلام کی قرآن مجید میں خصوصیات کا بیان	733
موضوع سے متعلق آیات	733

فہرست	صفحہ
آیات کی موضوعی تفسیر	735
۱۔کلمۂ خدا	735
۲۔آپ کا نام مسیحؑ وعیسیٰؑ ابن مریمؑ	735
۳۔آیت خدا اور رحمتِ الٰہی کا مظہر	736
۴۔گہوارے میں کلام	736
۵۔روحانی کمالات	737
۶۔صاحبِ شریعت وصاحبِ کتاب نبی!	737
۷۔اولوالعزم انبیاء سے ایک	737
۸۔بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے	737
(۳) حضرت عیسیٰؑ کی کتاب اور شریعت	739
موضوع سے متعلق آیات	739
آیات کی موضوعی تفسیر	741
(۴) حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے معجزات ودلائل	743
موضوع سے متعلق آیات	743
آیات کی موضوعی تفسیر	745
(۵) بنی اسرائیل میں تبلیغ	748
موضوع سے متعلق آیات	748
آیات کی موضوعی تفسیر	749
(۶) حضرت عیسیٰؑ ۔۔۔۔ان کے حواری اور مائدہ (دسترخوان) کا نزول	752
موضوع سے متعلق آیات	752
آیات کی موضوعی تفسیر	754
۱۔مومنوں کا کافروں سے جدا ہونا	755
۲۔مائدہ آسمانی کی درخواست	756
۱۔حواریوں کے نام	759
۲۔حواریوں کا تعارف بزبان قرآن مجید	759
حواریوں کے بارے میں کتاب مقدس کا نظریہ	759
حواریوں کے عہدہ جدید کا دوسرا رخ	760
چور حواری!	761
مسیحؑ کی گرفتاری اور حواریوں کی گہری نیند!	761
مسیحی پیشواؤں کی حضرت عیسیٰؑ سے برائت!	762
پطرس شیطان ہے!	762
مائدہ کی حقیقت کیا تھی؟	762
(۷) حضرت مسیحؑ کے قتل کی سازش اور مسیحؑ کا آسمان کی طرف اٹھنا	764
موضوع سے متعلق آیات	764
پہلی آیت کی تفسیر	766
دوسری آیت کی تفسیر	767
تیسری آیت کی تفسیر	770
چوتھی آیت کی تفسیر	771
(۸) دین وکتابِ مسیحؑ میں تحریف	773
موضوع سے متعلق آیات	776
آیات کی موضوعی تفسیر	776
(۹) حضرت مسیحؑ کے لیے الوہیت کا تصور	777
موضوع سے متعلق آیات	779
آیات کی موضوعی تفسیر	779
۱۔مسیحؑ اللہ کے نبی ہیں!	783
۲۔مسیحؑ کے اللہ کا بیٹا ہونے کا مفروضہ	784
۳۔مسیحؑ کی الوہیت کا مفروضہ	785
مسیحؑ کی الوہیت کا مفروضہ	786
۴۔تثلیث کا مفروضہ	789
۵۔مسیحؑ کی الوہیت کا مفروضہ	790
(۱۰) حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن	792
موضوع سے متعلق آیات	792
آیات کی موضوعی تفسیر	793

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قصص القرآن

موضوعات، مقاصد اور خصوصیات

قرآن مجید کے اہم ترین موضوعات میں سے ایک جس کے بارے میں بہت سی آیات پائی جاتی ہیں، قصص کا موضوع ہے، اس میں انبیاء پیغمبران کی زندگی اور ان کی امتوں سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ کبھی کبھی کسی ایک فرد یا چند محدود افراد کی زندگی بھی زیر بحث آتی ہے۔ تمام مقامات پر گفتگو کا سلسلہ وعظ و نصیحت سے متعلق باتوں پر ختم ہوتا ہے۔

اگر قرآن مجید کے بڑے محوروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کے پہلے دو حصوں کو ''عقائد و معارف'' اور ''قوانین و احکام'' کا نام دیا جا سکتا ہے، جبکہ تیسرا حصہ داستانوں پر مشتمل ہے۔ اگر تیسرے حصہ کو اخلاقی مسائل اور عظیم انسانی اقدار قرار دیں تو پھر قصص قرآن دونوں حصوں میں پائے جائیں گے۔ کیونکہ انبیاء کی اپنی امتوں کے ساتھ کشمکش و اختلاف، معارف اور اخلاقی اقدار کے سلسلے میں ہی تھا، اس صورت میں ان داستانوں سے ہدایت کے وسائل کا کام لیا گیا ہے جو عقائد اور اخلاقی اصول کی خدمت کے لیے ہی ہیں۔

جب سے اسلامی مفکرین کی توجہ تفسیر قرآن کی جانب مبذول ہوتی ہے، قرآنی کہانیاں مستقل طور پر، یا دوسری آیات کے تفسیر کے ذیل میں ان کی توجہ کا مرکز رہی ہیں، وہ مفسرین جنہوں نے قرآن کی تفسیر سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے کی ہے۔ انہوں نے بھی قصص سے متعلق آیات پر پہنچ کر ان کی تشریح کی ہے اور انہیں خصوصی اہمیت دی ہے۔ بلکہ جنہوں نے اپنی توجہ کا محور قصہ ہائے قرآنی کو قرار دیا ہے انہوں نے بھی قرآن کے تمام قصوں سے متعلق مستقل یا ان میں سے بعض کے متعلق کتابیں لکھی ہیں۔ اگر ایسی تصنیفات کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو ان سے ایک بہت بڑی لائبریری بن سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ہم کتاب خانوں کی فہرستیں یا چلبی کی کتاب ''کشف الظنون'' اور تھرانی کی کتاب ''الذریعۃ'' کی طرف رجوع کریں، میرے عزیز دوست اور محترم مصنف جناب آقائی عرفانیاں، جنہوں نے قطب الدین راوندی (ت ۵۷۳ ھ) کی کتاب قصص الانبیاء پر تحقیق کی ہے، اس نے کتاب کے مقدمہ میں قصص قرآن سے متعلق تحریر کی گئی ۱۷۴ کتب کے نام لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض شائع بھی ہو چکی ہیں۔ لیکن اکثر مخطوط صورت میں باقی ہیں یا زمانے کے حادثات نے انہیں ختم کر دیا ہے۔

قرآنی قصص کو مستقل کتب کی صورت میں تحریر کرنے کی طرف توجہ اس بات پر شاہد ہے کہ قرآن کی موضوعی تفسیر ایک محدود دائرے (قصص قرآن) کی شکل میں ایک طولانی سابقہ رکھتی ہے۔ کبھی کبھی تفسیر کی یہ روش آیات احکام کے سانچے میں بھی نمایاں ہوتی تھی۔ اگرچہ زیادہ توجہ اور اہمیت ترتیبی تفسیر کو ہی دی جاتی رہی ہے۔

ا)۔قصص کے موضوعات

قصص قرآنی سے واقفیت کے لیے ان کی خصوصیات سے متعلق تدریجاً گفتگو کی جانا چاہیے۔ان میں ایک ان قرآنی داستانوں کے موضوع کو بیان کرتا ہے۔عموماً قصص قرآن کا محور انبیاءاور ان کی معاصر اقوام کی سرگذشت ہے۔جب کہ وقائع نگاری اور داستان سرائی کا محور عموماً کسی بادشاہ، حکمران اور اس کی ملکی فتوحات کا بیان ہوتا ہے۔قصص سے متعلق قرآنی ابحاث کا موضوع انبیاء کی زندگی، ان کی دعوت کے حالات اور ان کی قوموں کا مثبت یا منفی ردعمل ہوتا ہے۔اگر کبھی ظالموں، جابروں اور مستکبروں کے حالات زندگی بیان کئے جاتے ہیں تو یہ بھی ان انبیائے الٰہی کے خلاف نبرد آزما ہونے کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔

مشرق میں تاریخ نگاری کا سلسلہ شہنشاہوں کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے، تاریخ مشرق کے سلسلہ کی کڑیاں بادشاہوں اور حکمرانوں کے ذریعہ ہی ملتی ہیں۔اگر ہم صحیح اور فائدہ مند تاریخ لکھنا چاہیں تو پھر تاریخ انسانی کا آغاز انبیاء کی تاریخ ہی سے کرنا پڑے گا، بلکہ اس زنجیر کی کڑیاں انبیاء اور رسولوں کو بنانا پڑے گا لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک یہ کام نہیں ہوا اور ہمیشہ تاریخ کا محور مادی حکمران ہی رہے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی مصلحت کی بناء پر بعض پیغمبروں سے متعلق ہی گفتگو کی ہے اور دوسرے لوگوں کا ذکر نہیں کیا۔اس لیے قرآن میں صرف پچیس (۲۵) پیغمبروں کے اسمائے گرامی ہی آئے ہیں، جب کہ ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، یہ اس لئے ہے کہ خود قرآن بھی تمام انبیاء کی تاریخ زندگی بیان نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ

''ہم نے آپ سے پہلے بھی نبی رسول بھیجے ہیں جن میں بعض کی زندگی کے حالات ہم نے آپ کے سامنے بیان کئے ہیں اور بعض کے نہیں کئے''۔(مومن۔78)

قرآن حکیم نے اقوام کی زندگی کو''انباء القریٰ'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کا ترجمہ آبادیوں کی سرگذشت ہے۔اس سے مراد وہ امتیں ہیں جو بڑی یا چھوٹی آبادیوں میں رہتی تھیں۔مشہور معانی کا عکس''قریہ'' بھی قرآن میں آبادی ہی کے معنی میں آتا ہے جو گاؤں، قصبے اور شہر کو شامل ہے۔یہ لفظ صرف شہر کے ساتھ مخصوص نہیں۔قرآن نے اس دور کی سب سے بڑی آبادیوں مثلاً مصر وغیرہ کو بھی لفظ''قریہ''ہی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡيَةَ الَّتِىۡ كُنَّا فِيۡهَا

''بابا جان! اس آبادی سے پوچھو جس میں ہم رہتے تھے''۔(یوسف۔82)

ان آیات کی بناء پر جس طرح چھوٹی آبادیوں میں انبیاء تبلیغ کے فریضہ پر عمل کرتے تھے، اسی طرح بڑی آبادیوں میں بھی اس ذمہ

داری پر عمل پیرا رہتے تھے۔ بلکہ بعض آیات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء حساس اور بڑے بڑے مقامات پر تبلیغ میں مصروف رہتے تھے، جہاں سے نواحی علاقوں تک بھی ان کی تبلیغ کا اثر پہنچ جاتا تھا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر قصبہ اور دیہات میں پیغمبر نہیں بھیجتا تھا۔ بلکہ ایک مرکزی جگہ پر انبیاء کو بھیج کر اس مرکز کے تابع لوگوں پر حجت تمام کرتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا

''اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک ان کے مرکز میں کوئی پیغمبر نہ بھیجے''۔ (القصص۔59)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ

''یہ شہروں اور آبادوں کی خبریں ہیں جو ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں''۔ (ہود۔100)

پھر ارشاد ہوتا ہے: ی

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ○

یہ آبادیوں کی داستانیں ہیں جو ہم تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں''۔ (اعراف۔101)

قرآن حکیم نے اصحاب کہف جیسی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی زندگی کے حالات بیان فرمائے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ پیغمبر نہیں تھے تاہم ان کا کام الٰہی رنگ رکھتا تھا۔ انبیاء کے مانند دلوں میں توحید کے شجر کی آبیاری کے لیے انہوں نے زندگی سے ہاتھ اٹھا کر اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح ''ذوالقرنین'' کی داستان بھی اسی مقصد سے بیان کی گئی ہے۔

نتیجہ

قصص قرآنی کا موضوع خاص اہمیت وشرافت رکھتا ہے۔ یہ موضوع ہدایت وتبلیغ کے سلسلہ میں انبیاء کے کارناموں اور ان کے حق طلب جہاد کا محور ہے۔ اگر ان کے علاوہ یہ کسی کی بات کرتا ہے تو وہ بھی اپنے اسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے جس کے لیے موضوع آگے بڑھ رہا ہوتا ہے۔

۲)۔ قصص قرآنی کے مقاصد

قرآنی قصوں کی ایک خصوصیت ان کے مقاصد ہیں۔ داستان گو اور وقایع نگار افراد کا مقصد عموماً تفریح، وقت گذاری اور مادی وخیالی لذتوں کی تکمیل ہوتا ہے۔ ان کا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ داستان گو کوئی معنوی وتربیتی مقصد رکھتا ہو۔ البتہ ہم اس بات کے

مدعی بھی نہیں ہیں کہ وہ کہانیاں جو انسانی تخیل کی پیداوار ہیں، ان میں اس طرح کے مقاصد بالکل نہیں پائے جاتے، بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ اس طرح کے قصے اور کہانیوں کی مثبت تاثیریں ان کی منفی تاثیروں سے کم ہوتی ہے۔ خواجہ ابوالقاسم فردوسی اس طرح کہتے ہیں:

بسی رنج بر دم دراین سال سی
عجم زندہ کردم بدین پارسی

''ان تیس سالوں میں میں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں تب جا کر فارسی کے ذریعہ میں نے عجم کو زندہ کیا ہے''

اپنے شاہنامہ کی تصنیف میں انہوں نے تیس سال تک تکلیف اٹھائی، تب جا کر شاہنامہ کے عنوان سے ۶۰ ہزار شعر ایرانی معاشرہ کے سامنے پیش کئے۔ یقیناً یہ ادبی اور فارسی زبان کے تحفظ کے حوالہ سے ایک شاہکار ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے اس پہلو سے قطع نظر کرلیں تو اس کا سب سے بڑا مقصد قومی افتخار کا اظہار کرنا اور اس ملک کے لوگوں کو ایسے بادشاہوں اور حکمرانوں سے متعارف کروانا ہے، جو بہت کم عدل و انصاف کے لیے اقدام کرتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس نے ایران کی تاریخ شہنشاہوں کے سلسلہ کی بنیاد پر رکھی ہے۔ ہاں! البتہ سعدی و مولانا روم جیسے نامور شعراء بھی ہیں کہ جنہوں نے داستانوں کے پیرائے میں انسانوں کو کوئی درس اور عبرت آموز نصیحتوں سے آگاہ کیا ہے۔ لیکن سعدی نے ''گلستان'' میں دسویں نصیحت کے ذیل میں عشق اور جوانی کے عنوان سے ایک خاص باب تحریر کیا ہے جو بری باتوں سے خالی نہیں۔ انہیں برے محرکات کی وجہ سے فارسی کے اساتذہ یہ حصہ سکولوں میں نہیں پڑھاتے۔ خود اس کتاب کے مصنف، جو کافی عرصے تک اس طرح کے مدارس میں پڑھتا رہا ہے، یاد رہے کہ اس کے استاد مرزا محمود فاضل مراغی۔[1] نے یہ حصہ پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ تھا اس لئے اس نکتہ سے آگاہ نہ تھا۔ لیکن بعد میں جب مسائل سے میرا واسطہ پڑا تو اس کے نقصان کا مجھے اندازہ ہو گیا۔ قرآن کریم نے مختلف آیات میں قرآنی قصص کے مقاصد اس طرح بیان فرمائے ہیں:

(الف)۔ پند و نصیحت

قرآن نے قوموں اور ملتوں کی زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں درس عبرت دیا ہے کہ وہ کس طرح سعادت کی بلندی سے ذلت و بدبختی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئیں۔ اس طرح قرآن درسہائے عبرت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدۡ كَانَ فِيۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ○

''گذشتہ اقوام کے قصوں میں عقل مندوں کے لئے عبرت کا سامان ہے''۔ (یوسف۔111)

ایک اور آیت میں اس طرح کی سرگذشت کو یاد آوری کا باعث قرار دیتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] بے نظیر استاد و ماہر خوشنویس، جنہوں نے بہت میٹھے و ماہرانہ انداز میں سعدی کی کتابیں گلستان و بوستان، خطیب قزوینی مرحوم کی کتاب ابواب الجنازہ اور تاریخ معجم ، ۴۰ سال تک پڑھائیں۔ وہ محقق فاضل شیخ احمد مراغیؒ کے فرزند ہیں جو شیخ انصاری کے شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۳۱۰ھ میں ان کی رحلت ہوئی

وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾

”(ان واقعات میں) مومنین کے لیے یاددہانی ہے“۔(ہود۔120)

ان مستکبرین کے حالات زندگی بیان کرنے سے اس طرح درس عبرت حاصل ہوتا ہے، جنہوں نے دنیا کے زرق و برق سے فریب کھالیا اور ان کی گستاخی کی یہ حد ہوگئی تھی کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے تھے۔ اس طرح کے لوگوں کے سلسلہ میں قرآن کریم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان کی داستان لوگوں کے سامنے بیان کریں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٧٦﴾

”تم یہ قصے بیان کرتے رہو، تاکہ وہ غور کریں اور عبرت حاصل کریں“۔(اعراف۔176)

اگر انسان کی گھڑی ہوئی کہانیاں خیال کی قوت کو مضبوط کرتی ہیں تو قرآن غور و فکر کے ذریعہ انسان کی قوت متخیلہ کو قوی تر بناتا ہے۔

(ب)۔پیغمبروں کی دعوت کا مقصد واحد

قرآنی آیات گواہی دیتی ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے کیونکہ ان کے الہام کا سرچشمہ ایک ہی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ○

”ہم نے ہر امت میں ایک رسول مبعوث فرمایا تھا کہ (اے) لوگو! خدا کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش سے بچو“۔(نحل۔36)

اس بات کے اثبات کے لیے قرآن انبیاء کی زندگی سے متعلق گفتگو کرتا ہے اور واضح فرماتا ہے کہ ان کا ہدف و روش ایک ہی تھا اور ان کی تبلیغ کے لیے ایک مکمل و منظم طریق کار حکم فرما تھا۔ شیخ الانبیاء حضرت نوحؑ کی زندگی و جہاد کا مطالعہ، اس کا حضرات موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی بھرپور انقلابی زندگی سے موازنہ کرنے کے بعد ان کی تبلیغ اور مقصد کے ایک ہونے کو واضح طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے۔ قرآنی داستانوں کا ایک نامرئی نتیجہ ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان تمام امور پر ایک ہی روح حکم فرما اور ایک ہی فکر سایہ فگن تھی۔ ان کی دعوت کے سلسلہ میں کوئی دوگانگی اور منطق میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اسی لیے ان سب پر ایمان لانا اور ان کے درمیان اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

”تمام مومنین کا طریقہ ہی ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں میں فرق نہیں سمجھتے اور سب کو اللہ کی طرف سے مبعوث جانتے ہیں“۔(بقرہ۔285)

(ج)۔قلب پیغمبر کی تقویت

معلمین الٰہی کو تبلیغ ودعوت کے راستے کئی روحانی وجسمانی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ان کا واسطہ ہمیشہ جہلاء اوران کے اذیت ناک رویہ سے پڑتا۔سابقہ انبیاء پر آنے والے مصائب کا بیان ایک طرف تو پیغمبر اکرم ﷺ کے دل کو قوی کرتا جس سے انہیں سہارا ملتا تھا۔جب کہ دوسری طرف دوسرے مصلحین کی ہمت کا باعث بنتا،کیونکہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی ناکامی ان کی غلطی یا کوتاہی نہیں،بلکہ یہ سنت تو ہر جگہ حکم فرما تھی۔لہٰذا اگر کوئی غلطی تھی بھی تو وہ خود امتوں ہی کی تھی۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ

''اور ہم رسولوں کی خبروں میں سے سب کچھ تم سے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ اس سے تمہارا دل قوی کریں''۔(ہود۔120)

یہاں تک ہم قصص کے موضوعات اوران کے مقاصد سے آگاہ ہوئے ہیں،تیسری بات جو یہاں پر کرنا ضروری ہے وہ ان کی خصوصیات کا بیان ہے۔یہ بات خاصی اہمیت کی حامل ہے۔اگرچہ قصص کے موضوعات کے بیان سے قرآنی داستانوں کی خصوصیات بھی کسی حد تک واضح ہوجاتی ہیں لیکن قصص قرآن کی خصوصیات صرف ان کے موضوعات سے ہی مختص نہیں ہیں،بلکہ ان کی کچھ اور خصوصیات بھی ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

ا)۔قصص انبیاء کی واقعیت

چونکہ قرآن انبیاء اوران کی امتوں کے واقعات کو ہدایت کے ایک ذریعہ کے عنوان سے بیان کرتا ہے نہ کہ وقت گزارنے اور خیالی لذت کی تسکین کے لئے،اس لئے وہ ہمیشہ حقیقی اور سچی کہانیاں ہی بیان فرماتا ہے۔وہ ایسے واقعات کا ذکر فرماتا ہے جو تاریخ کی آزمائش گاہ میں نتیجہ بخش ثابت ہوئے ہیں اور جن کی تاثیر مسلم طور پر واضح ہوچکی ہے۔لہٰذا انسان ہی اس طرح کی کہانیاں پڑھنے سے جو حقائق پر مشتمل ہوں،یقینی طور پر متاثر ہوگا اوران کے اس کڑوے یا میٹھے نتیجہ کو جو ایک حقیقت رکھتا ہے،دل وجان سے قبول کرلے گا،جب کہ وہ دوسرے قصوں کے لیے اس شرط کا پابند نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے وہ ایک خیالی واقعہ بیان کرکے ایسا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہوں،جس کے تربیتی اثرات حقیقی داستان سے کم ہوں،کیونکہ اس کا سرچشمہ مصنف کی اپنی سوچ ہی ہوتی ہے۔

آج کی دنیا میں رومانٹک کہانیاں لکھنے کا ایک بڑا مقام ہے۔یہ معمولاً خیالی اور وہمی لذت کے ابھارنے کے لیے ہوتی ہیں اور اسی مقصد کی بنیاد پر انہیں قبول کیا جاتا ہے۔ان کے اثرات واضح طور پر محسوس کئے اور دیکھے جاسکتے ہیں۔لیکن ان کے معنوی اور تربیتی اثرات بہت کم ہیں کیونکہ پڑھنے والا بخوبی جانتا ہے کہ اس طرح کے حقائق اور نتائج مصنف کی سوچ کے علاوہ کسی جگہ موجود نہیں ہوتے۔اسی لئے انہیں

زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔اسی نکتہ کے پیش نظر قرآن نے اپنی کہانیوں کی تعریف ''بالحق'' کے لفظ کے ساتھ کی ہے اور فرمایا ہے:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ

''یہی ہیں صحیح اور سچے قصے؟'' (آل عمران۔62)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۝١٣

''ہم اصحاب کہف کی سچی سرگذشت تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں''۔(کہف۔13)

اس طرح قرآن حکیم واضح فرماتا ہے کہ یہ کہانیاں حقائق پر مشتمل ہیں،خیال وفکر کا کرشمہ نہیں ہیں۔

۲)۔تحریفات کی تصحیح

قرآن کی کہانیاں معمولاً تورات اور دوسری آسمانی کتابوں میں بھی آئی ہیں۔لیکن تورات میں انسان انبیاء اوران کی امتوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایسے مطالب دیکھتا ہے جو انبیائے الٰہی کی عظمت کے منافی ہیں،ہم ان مطالب کو آئندہ ذکر کریں گے اور قرآن کے حوالے سے ہر پیغمبر کی زندگی کا ذکر کرنے کے بعد تورات سے بھی کچھ اقتباسات لائیں گے۔پھر ان کا موازنہ کرنے کے بعد قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کو ثابت کریں گے۔

قرآن نے اپنے قصص بیان کرنے سے بلاواسطہ طور پر اصطلاحاً آسمانی کتابوں کے اندر پائی جانے والی تحریفات کی اصلاح کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور اپنے آپ کو حق کے معیار کے عنوان سے پیش کیا ہے۔کئی جگہوں پر اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ.........

''یعنی ہم نے تمہاری طرف یہ قرآن حق کے ساتھ نازل کیا جو گذشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ ان پر نگہبان بھی ہے''۔(مائدہ۔48)

آپ تورات میں حضرت آدمؑ کی داستان اور قرآن میں ان کی داستان کا موازنہ کرکے اس خصوصیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔

۳)۔ قصص کا انتخاب

قصہ گو اپنے مقصد کی خاطر پوری ہی داستان کو اول سے آخر تک تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں، کبھی تو آگے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور معمولی سی کہانی کو بہت بڑی داستان کا رنگ دے دیتے ہیں، جب کہ کہانیاں بیان کرنے سے قرآن کا مقصد امتوں کی ہدایت اور انہیں عبرت کا سامان فراہم کرنا ہے، اس لئے کبھی تو قرآن پوری داستان بیان کرتا ہے۔ اور کبھی صرف کہانی کا وہ حصہ ہی بیان کرتا ہے جس سے اس کا مقصد پورا ہوتا ہو، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قصہ یوسف ایک ہی جگہ پر ابتداء سے آخر تک آیا ہے، جب کہ حضرت آدمؑ کی داستان اور ان کی زندگی کے حالات پوری خصوصیات کے ساتھ ایک جگہ پر بیان نہیں ہوئے بلکہ مختلف سورتوں میں اس کے مختلف بیان ہوئے ہیں۔

اس بات سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہوجائے گا کہ قرآن نے آدمؑ، نوحؑ یا دوسرے انبیاء کے قصے مختلف سورتوں میں کیوں دھرائے ہیں، اس کی وجہ صرف لوگوں کی ہدایت اور انہیں آگاہ کرنا ہے۔ بلاغت کا تقاضا کبھی یہ ہوتا ہے کہ داستان کے بعض حصوں کی طرف اشارہ کیا جائے، تاکہ ان سے مطلوبہ نتیجہ حاصل کیا جاسکے۔ اگر حضرت آدمؑ کا نام تو نو سورتوں میں اور حضرت نوحؑ کا چودہ سورتوں میں بیان ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصد اس داستان کو گواہ بنانا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی داستان کے بعض حصوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ واضح اور مطلوبہ نتیجہ حاصل ہوجائے۔

لہٰذا قرآن نے کہانیاں بیان کرنے کے سلسلہ میں مختلف طرح کے طریقے اختیار کئے ہیں، ان تمام کا محور ہدایت اور عبرت کا سامان فراہم کرنا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر بعض کہانیوں کا تکرار یا ان کے بعض حصوں کا تکرار، ان کی ادبی عظمت اور بلاغت میں کمی کا باعث ہرگز نہیں بنتا، حالانکہ انسانی گفتگو میں اس طرح بات دہرانے سے بات کی اہمیت کم ہوجاتی ہے۔ یعنی دوسری مرتبہ بات پہلی بات جیسی اہمیت سے خالی ہوجاتی ہے۔

قصص کے بیان میں قرآن ایک ہمدرد استاد یا واعظ کی طرح ہے جو مختلف اوقات میں کہانی یا اس کا کچھ حصہ اپنی بات پر گواہ کے طور پر لاتا ہے تاکہ اس کا مقصد حاصل ہوجائے۔ اس طرح دہرانا نہ فقط یہ کہ بلاغت میں کمی کا باعث نہیں بنتا بلکہ کبھی کبھی بلاغت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

یہاں تک ہم قرآن کی کہانیوں کے موضوعات، اہداف اور ان کی خصوصیات سے مختصر طور پر آگاہ ہوئے۔ اب ہم اس پہلے انسان کی داستان بیان کرتے ہیں جس نے اس کرۂ خاکی پر قدم رکھا اور وہ ''ابوالبشر'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حجۃ الاسلام والمسلمین جناب آقائی شیخ ربانی گلپایگانی کے اس تعاون اور مدد کا شکریہ ادا کروں، جو انہوں نے قصص انبیاء کی تدوین کے سلسلے میں فرمایا ہے۔ میں خدا کے حضور ان کی توفیقات میں اضافہ اور ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ مؤسسہ امام صادقؑ قم۔ ۲۷ رجب ۱۴۱۳ھ

پیغمبر اول

ابوالبشر حضرت آدمؑ کی داستان

آپ کی زندگی کے آٹھ بنیادی پہلو

قرآن کی ۹ سورتوں کی ۲۵ آیات میں (۲۵) بار حضرت آدمؑ کا نام آیا ہے۔اجمالی طور پر ان کی فہرست یوں ہے:

بقرہ: آیات (۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۷)

آل عمران: آیات (۳۳، ۵۹)

مائدہ: آیہ (۲۷)

اعراف: آیات (۱۱، ۱۹، ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۳۵، ۱۷۳)

اسرائی: آیات (۶۱، ۷۰)

کہف: آیہ (۵۰)

مریم: آیہ (۵۸)

طٰہٰ: آیات (۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱)

یٰس: آیہ (۶۰)

ان داستان تفصیلی طور پر سورۂ ہائے، بقرہ اعراف، حجر، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں بیان ہوئی ہے۔

انبیاء کے سلسلے کی پہلی کڑی ابوالبشر حضرت آدمؑ ہیں۔موجودہ انسان کی بنیاد اور جسے انسان کہا جاتا ہے، اس کا سلسلہ آغاز ان ہی سے ہوا ہے۔جس طرح وہ اس سلسلہ سے متعلق پہلے انسان ہیں، اس طرح وہ خود پہلے پیغمبر بھی ہیں۔ہم بھی انبیاء کی زندگی کے اس تذکرے کی ابتداء ان ہی سے کرتے ہیں: خلقت کی ابتداء سے لے کر زمین پر اترنے کے سلسلہ میں حضرت آدمؑ کی زندگی کے جو آٹھ بنیادی پہلو قرآن نے بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱)۔انسان کی خلقت

۲)۔آدمؑ زمین پر اللہ کے خلیفہ

۳)۔آدمؑ کو اسماء کی تعلیم

۴)۔آدمؑ، فرشتوں کے مسجود

۵)۔بہشت میں آدمؑ کا مسکن اور ان کو درخت سے روکنا

۶)۔درخت سے رکنے کے سلسلہ میں حضرت آدمؑ کی خلاف ورزی اور ان کی عصمت کا مسئلہ

۷)۔آدمؑ کا زمین پر اترنا

۸)۔اولاد آدمؑ کا انجام

(۱)۔تخلیق آدمؑ

موضوع سے متعلق آیات

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (آل عمران۔۵۹)

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ ....)

اعراف۔۱۱)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ (حجر۔۲۸،۲۹)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (مومنون۔۱۲)

...وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ

مَّهِيْنٍ ﴿۸﴾ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ....(سجدہ۔۷تا۹)

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ

فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ (ص۔۷۱،۷۲)

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ (صافات۔۱۱)

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ (الرحمٰن۔۵۵)

آیات کا ترجمہ

۱)۔اللہ کے نزدیک عیسیؑ کی تخلیق آدمؑ کی تخلیق کی طرح ہے جس کو اس نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۲)۔ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

۳)۔ہم نے انسان کو سڑے ہوئے کیچڑ کی خشک سیاہ مٹی (کھنکھناتی ہوئی مٹی) سے پیدا کیا۔

۴)۔اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: ''میں سڑے ہوئے کیچڑ کی کھنکھناتی ہوئی تاریک مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں جب میں اسے صحیح طور پر بنا لوں (اس کے اعضاء مناسب شکل میں پیدا کردوں) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو اسے سجدہ کرو۔

۵)۔ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔

۶)۔ہم نے انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، اس وقت اس کی تخلیق اور اس کی نسل کو ایک حقیر ذلیل پانی کے خلاصہ سے قرار دیا، اس کے بعد ہم نے اس کی خلقت کو کمال کی حد تک پہنچا دیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

۷)۔جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: ''میں مٹی سے ایک انسان پیدا کروں گا جب میں اس کی تخلیق مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اسے سجدہ کرو''۔

۸)۔ہم نے اسے چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا۔

۹)۔انسان ٹھیکرے کی مانند خشک مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

آیات کی موضوعاتی حوالہ سے تفسیر

مجموعی طور پر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ کی تخلیق تین مراحل میں مکمل ہوئی:

۱)۔پہلا مرحلہ۔۔۔تبدیل ہونے والی مٹی

۱)۔خاک۔۲)۔مٹی۔۳)۔چپکنے والی مٹی۔۴)۔قالب میں ڈھائی ہوئی سیاہ رنگ کی مٹی (کیچڑ)۔۵)۔مٹی کا خلاصہ ۶)۔خشک مٹی جو کسی چیز سے ٹکرانے پر کھنکتی ہے مثلاً پیالہ یا ٹھیکرا۔

یہ چھ حالتیں ایک چیز کی مختلف صورتیں ہیں، ان تمام میں حقیقی مادہ ایک ہی ہے، ان چھ چیزوں سے متعلق آیات کے متن سے آگاہی

کے لیے ہم ہر ایک سے متعلق صرف ایک آیت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

۱)۔خاک

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰؑ کی تخلیق آدمؑ کی تخلیق کے مانند ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا اور پھر اس سے کہا: ''ہوجا'' ،لہٰذا وہ وجود میں آ گیا''۔(آل عمران۔59)

۲)۔مٹی

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷﴾

وہ (اللہ) جس نے ہر چیز کو بہترین طریقہ سے پیدا کیا اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا''۔(سجدہ۔7)

اسی موضوع پر سورۂ انعام آیہ ۲، سورۂ اعراف آیہ ۱۲، سورۂ اسراء آیہ ۶۱ اور سورۂ ص آیات ۷۱، ۷۶ کی طرف رجوع کریں۔

۳)۔چپکنے والی مٹی

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾

''ہم نے انہیں چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا''۔(صافات۔11)

۴)۔تاریک کیچڑ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

''ہم نے انسان کو سیاہ کیچڑ کی خشک شدہ مٹی (وہ مٹی جو کسی چیز سے ٹکرانے پر کھنکھناتی ہے) سے پیدا کیا''۔(حجر۔26)

نیز اسی سورۂ میں آیہ ۳۳ کی طرف رجوع کریں۔

۵)۔مٹی کا خلاصہ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

''ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا''۔(مومنون۔13)

٦)۔ٹھیکرے کی طرح خشک مٹی

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾

''ہم نے انسان کو ٹھیکرے کی مانند خشک مٹی سے پیدا کیا''۔(الرحمن۔14)

سورۂ حجر کی آیات ۲۶، ۲۸ اور ۳۳ بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔

یہ آیت تخلیق آدم کے سب سے پہلے مادہ اور ایک طرح تمام انسانوں کی تخلیق بیان کررہی ہے۔ یہ چھ چیزیں یقینی طور پر بلا واسطہ پہلے انسان، ابوالبشر آدمؑ کے مادہ سے متعلق ہیں اور قرآن حکیم ایک لحاظ سے سب کا تعلق انہیں سے بیان کررہا ہے، اور فرماتا ہے:

''خلقنٰکم من ترابٍ'' یا اس طرح ارشاد ہوتا ہے: ''خلقنٰھم من طین لازبٍ''

ان چھ حالتوں میں انسانی مادہ کیفیت کے لحاظ سے تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اس میں جوھری اور ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیلی کا عمل ہرگز واقع نہیں ہوا۔

البتہ قرآن علوم طبیعی کی کتاب نہیں ہے، تاہم تربیتی مقاصد کے پیش نظر وہ ان چھ حالات کو بیان کررہا ہے جو پہلے مادہ پر وقوع پذیر ہوتے ہیں، تاہم ایک مغرور وخود پرست انسان یہ جان لے کہ خدا کی قدرت اور رحمت نے اسے کیسے پست ترین حالات سے نکال کر بلند ترین درجہ تک پہنچا دیا ہے۔

۲)۔دوسرا مرحلہ۔۔۔صورت بنانا

قرآن آدمؑ کی صورت بنانے کو انسان کی تخلیق کا دوسرا مرحلہ قرار دیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾

''ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، ابلیس سے سوا سب نے سجدہ کیا۔۔۔''۔(اعراف۔11)

اب دیکھنا چاہیے کہ خلقت کے بعد صورت بنانے سے کیا مراد ہے؟ اس بات کی وضاحت کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیت میں خلقت سے کیا مراد ہے۔ لفظ ''خلق'' کبھی تو پیدا کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی تقدیر اور ناپنے کے معنی میں۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں: ''خلق الخیاط الثوب'' یعنی ''درزی نے کپڑا ناپا''۔ دوسرے معنی اگرچہ اپنی جگہ پر صحیح بھی ہوں تاہم اس آیت میں یہ معنی صحیح نہیں ہو سکتے کیونکہ اس سے مراد پیدا کرنا اور بنانا ہیں۔ اس کی دلیل ''خلقنٰکم '' کے جملہ کے بعد فرمایا ''ثم صورنا کم'' اور یہ بات بن کہے ہی واضح ہے کہ صورت بنانا پہلے مادہ کی تخلیق سے ہم آہنگ ہے نہ کہ علمی لحاظ سے ناپنے اور اندازہ لینے سے کہ یہ تو مادہ کے بغیر بھی ممکن ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ صورت بنانے سے کیا مراد ہے؟ تصویر کا مفہوم وہی ٹھیک کرنا ہے، جس کا ذکر ایک اور آیت میں اس طرح ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۲۸
فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝۲۹ (حجر۔28-29)[1]

ان دو آیات کا آپس میں موازنہ کرنے سے خلقت اور صورت بنانے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کیونکہ مذکورہ آیت میں ''خالق بشراً من صلصال'' کا جملہ ''انا خلقنٰکم '' کی تفسیر اور وضاحت کر رہا ہے۔ چنانچہ ''واذا سویته'' ''ثم صورنٰکم '' سے مختلف بیان ہے۔ دونوں آیات میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ حجر کی آیات کا محور آدم کی تخلیق ہے، جب کہ زیر نظر آیت (اعراف۔۱۱) میں تمام انسانوں کی تخلیق کا تذکرہ ہے۔ قرآن چونکہ آدم کی خلقت کو تمام انسانوں کی خلقت قرار دیتا ہے۔ اس لئے اس کی خلقت کے مراحل کو تمام انسانوں کی طرف منسوب فرماتا ہے۔ انسان کی خلقت سے متعلق آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔[2]

لہٰذا خشک مٹی سے انسان کی تخلیق جو کہ پہلا مرحلہ ہے، صورت بنانے اور درست کرنے کے مرحلہ سے آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہی انسان کی صورت بنانے اور انسان کی ظاہر شکل وصورت بنانے کا مرحلہ ہے۔ یہ انسان کے بدن میں روح پھونکنے سے پہلے کا معاملہ ہے، کیونکہ روح پھونکنا پیدائش کا تیسرا مرحلہ ہے، جسے ہم آگے بیان کریں گے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے سورۂ اعراف میں دوسرے مرحلہ کا ذکر ''ثم '' کے ساتھ کیا ہے۔ اور ارشاد فرمایا ہے: ''ولقد خلقنٰکم ثم صورنٰکم '' لیکن سورۂ حجر میں لفظ ''فاء'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ''۔۔من حماٍ مسنون فاذا سویته''

عبارت کے فرق سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں مرحلوں کا فاصلہ آپس میں کچھ زیادہ نہیں تھا۔ لہٰذا دونوں کے متعلق عطف کی دونوں اقسام سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کلمہ ''واؤ'' استعمال نہیں کیا بلکہ اس کی جگہ ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جو ترتیب پر دلالت

---

[1] دونوں آیات کا ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

[2] سورۂ سجدہ آیت ۸ کی طرف رجوع کریں۔

کرتے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خلقت ایک ہی بات نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس میں ترتیب کا خیال رکھا گیا تھا۔تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خلقت کی ان دو قسموں کے درمیان لاکھوں سال کا فاصلہ تھا کیونکہ یہ قرآن پر ایک طرح سے اپنی سوچ ٹھونسنے کے مترادف ہوگا۔صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ پیدائش کے ان دو مرحلوں کے درمیان صرف مبہم طور پر کچھ فاصلہ اور ترتیب موجود ہے۔

۳)۔تیسرا مرحلہ۔۔۔روح پھونکنے کا مرحلہ

تیسرا مرحلہ بدن میں روح پھونکنے کا ہے۔اگر انسان ایک افضل مخلوق ہے تو اس کی وجہ یہی مرحلہ ہے کہ اس نے اسے کئی پہلوؤں پر مشتمل ایک مخلوق قرار دیا ہے۔

ایک لحاظ سے تو وہ عقل،سوچ اور فکر رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ فرشتوں کے ہم پلہ ہو گیا ہے،دوسری طرف وہ ایسی نفسانی غرائز رکھتا ہے کہ اگر وہ انہیں اعتدال پر رکھنے کی کوشش نہ کرے تو وہ کمال کی بلندیوں سے ذلت کی گہرائیوں میں جا گرے گا۔قرآن نے تخلیق کے اس مرحلے کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٢٩﴾

''جب میں اسے درست کرلوں گا (اس کے اعضاء کو مناسب شکل دے دوں گا) اور اس میں روح پھونک دوں گا تو اس کو سجدہ کرنا''۔(حجر۔29)

سورہ ص کی آیت ۷۲ بھی یہی مضمون بیان کرتی ہے:

ہم سب جانتے ہیں کہ خدا کا نہ تو جسم ہے اور نہ روح،لیکن خدا نے انسان کی روح کو اس کی عظمت کے پیش نظر اپنی طرف نسبت دی ہے،جس طرح اس نے کعبہ کو اس کی عظمت کے پیش نظر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور کہا ہے:

أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ

''میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے بتوں سے پاک کردو''۔(بقرہ۔125)

اسلامی احادیث میں ماہ رمضان کو بھی اللہ کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔یہ ایک طرح کی اعزازی نسبت ہے جس کا رواج ہر زبان اور ملت میں پایا جاتا ہے،جس طرح ہمارے ملک میں قومی اسمبلی کو''قوم کا گھر'' کہا جاتا ہے۔

قرآن اس مرحلہ میں ابوالبشر آدمؑ کی خلقت کو مکمل قرار دیتا ہے اور اس الٰہی روح اور ان طرح طرح کی صلاحیتوں کے پیش نظر،جو اس میں مخفی ہیں،حکم دیتا ہے کہ سب خلقت کے اس شاہکار کو سجدہ کریں اور اس کا احترام کریں۔ان تین مراحل کے دوران ممکنہ طور پر رونما ہونے والے تبدیلیوں کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔اس لیے کہ قرآن پر کوئی چیز ٹھونسی نہیں جا سکتی،مذکورہ آیات میں غور و فکر کرنے سے انسان کی مستقل طور پر خلقت کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے جس کے مطابق انسان ایک ایسا وجود ہے جو دو گذشتہ مراحل سے گزر کر پہلے دن سے اپنے لیے

ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرا نظریہ یہ بھی ہے اور وہ انسان کے باقی حیوانوں کے ساتھ خلقت میں شریک ہونے کا نظریہ ہے کہ سب ایک اصل کی طرف لوٹتے ہیں اور زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے تکامل کے مراحل طے کئے ہیں، یہ وہی مشترک نظریہ ہے کہ یونان کے سائنسی علوم میں جس کی طرف ایک احتمال کے عنوان سے اشارہ ہوا ہے جس کی تائید بعد میں مغربی ماہرین نباتات اور ماہرین حیوانات مثلاً ''لامارک'' اور ڈراون کی طرف سے کی گئی ہے۔ اگر چہ اس عرصہ میں کئی نظریات سامنے آکر باطل ہو چکے ہیں۔ تاہم اصل نظریہ اشتراک اور دوسرے لفظوں میں ''تکامل انواع'' کا نظریہ موجود رہا ہے لیکن کیا قرآنی آیات کو اس نظریہ پر منطبق کیا جا سکتا ہے؟ اس سے متعلق ہم مختصر طور پر کہیں کہیں گفتگو کریں گے۔

نظریہ استقلال یا نظریہ اشتراک

انسان کے متعلق استقلال کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ازل سے ہی اسی موجودہ شکل وصورت میں تھا۔ اگر زمانہ گذرنے کے ساتھ اس میں کچھ تبدیلیاں آتی بھی ہیں تو یہ اس کے عوارض اور حالات سے متعلق ہیں، نہ یہ کہ یہ تبدیلیاں اس حد تک پہنچ چکی ہوں جو ایک نوع کو دوسری نوع میں تبدیل کر کے ایک نئی نوع سامنے لے آتی ہوں۔

اس کے برعکس انسان اور دوسرے حیوانات کے بارے میں اشتراک کا نظریہ یہ ہے کہ سب جاندار ایک یا چند محدود انواع کی طرف لوٹتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس نوع میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور آخر کار ایک نوع دوسری نوع میں تبدیل ہوگئی۔ اس طرح کئی انواع وجود میں آئیں۔

یہاں ہماری گفتگو قرآن سے متعلق ہے۔ علوم طبعی کے ماہرین کے آراء سے ہم گفتگو نہیں کرتے کیونکہ یہ گفتگو بات کو بڑھا دے گی اور ہمیں قرآنی گفتگو سے دور کر دے گی۔ مذکورہ آیات کا ظاہر اسی نظریہ استقلال کو بیان کرتا ہے۔ اگر چہ انسان اس مستقل راستہ کو طے کرنے کے لئے تین مراحل سے گذرا ہے۔ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

بعض لوگ آدمؑ کی خلقت سے متعلقہ آیات بالخصوص وہ آیات جو پہلے مادہ کو ''صلصال'' اور ''فخار'' کی مانند قرار دیتی ہیں۔ ان کے ذریعے پہلے مادہ پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ایک عکس پیش کرنا چاہتے ہیں، اس نظریہ میں وہ چند اشاروں اور تشبیہات سے مدد لے کر یہ کہتے ہیں کہ چینی اور برتن بنانے والے ایک پیالہ یا صراحی بنانے کے لیے مٹی کو ہاتھوں کے ذریعہ سینکڑوں شکلوں میں تبدیل کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی پسند کی شکل بن جاتی ہے۔ مختلف گلدانوں، صراحی، سبو، مٹی کا تھالی اور خمرہ وغیرہ کی شکل ابتداء میں ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ دوسری شکلیں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ بنانے والے کی پسند کی شکل وجود میں آجاتی ہے۔ خام اور کمزور مٹی تخریب کے عوامل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ گرمی کی وجہ سے سخت اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ لیکن مٹی کو تمام چیزوں کا ردعمل حرارت کے مقابلے میں یکساں نہیں ہوتا، ان میں بعض پگھل جاتی ہیں، یا ٹوٹ جاتی ہیں اور بعض وہ ہیں جن میں خالص مٹی نہیں ہوتی بلکہ ان کی مٹی خاص طور پر تیار کی جاتی ہے۔ وہ حرارت کے مقابلے میں مضبوط اور سالم رہ کر اپنا رنگ برقرار رکھتی ہیں۔

اس نظریہ کی بنیاد نظریہ قدیم پر ہے

آیات سے یہ مفہوم اخذ کرنے کی بنیاد انسانی تخلیق کے بارے میں اپنی طرف سے ایک فیصلہ لینے سے زیادہ نہیں ہے جس سے انسان کا تدریجی تکامل ثابت کرنا اوراسے ایک اورنوع سے اس نوع میں تبدیل ہونے والا سمجھنا مقصود ہے۔لہٰذا وہ کہتے ہیں: ''کوزہ گرایک کوزہ بنانے کے لیے مٹی سے پہلے سینکڑوں شکلیں اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔۔۔'' زندگی کے مختلف حادثات اورشرائط میں انواع کا وجوداس کی نظر میں اس مٹی کے کوزے کی طرح ہے جو بھٹی میں ہو،یعنی جس طرح مٹی کی چیزوں کا ردعمل حرارت کے مقابلے میں ایک طرح نہیں،اسی طرح مختلف حالات میں جانداروں کا ردعمل بھی ایک جیسا نہیں ہے۔لہٰذا کچھ جاندار تباہ ہوجاتے ہیں اوربعض دوسرے جو طاقت ور ہوتے ہیں اور زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں،باقی رہ جاتے ہیں۔اس طرح انسان جن انواع سے گذرکرآیا ہے وہ کمزوری کی وجہ سے تباہ ہوچکی ہیں اورصرف انسان ہی باقی بچا ہے۔

لیکن اگرہم اپنا ذہن ان مسائل سے خالی کرلیں توان آیات سے ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے کہ پہلے انسان کی شکل خشک مٹی کی طرح تھی،اللہ کے لطف وکرم کے باعث اُسے روح اورکمال سے نوازا گیا۔اس ہستی نے ہی اس حقیر موجودکو یہ سب کمالات عطا فرمائے۔وہ دوسری خصوصیات جو اس مصنف نے چینی کے مادہ مٹی کی چیزوں اورکمہار کے متعلق بیان کی ہیں اورپھرضمنی طورپر انسانی مادہ اوراسے بنانے والے کی طرف بھی ان کی نسبت دی ہے،وہ اس سے ہرگز ثابت نہیں ہوتیں۔

قرآن نے مٹی کی چیزوں کے اس مادہ کی تمام صفات میں سے صرف ایک خصوصیت ذکر کی ہے اوروہ یہ کہ ''ہم نے انسان کو چپکنے والی خشک مٹی سے پیدا کیا''۔[۱]

یہ بات واضح ہے کہ اگروہ مٹی چپکنے والی ہوتی تو اس کی دوشکل بن سکتی تھی جس میں روح پھونکی جاسکتی۔دوسرے الفاظ میں اس طرح ہے کہ مقصد انسان کے مادہ کو''ٹھیکرے''۔[۲]

سے تشبیہ دینا ہے،نہ یہ کہ اس کے خالق بنانے والے کو،چینی ساز کا کوزہ گر کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔مشبہ بہ کی نمایاں صفت کو مدنظر رکھا جاتا ہے،نہ کہ اس کی تمام خصوصیات کواگرہم کہتے ہیں کہ زید شیر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شجاعت میں شیر کی مانند ہے،نہ کہ گردن کے لمبے بالوں،موٹی گردن،دم یا منہ کی بدبووغیرہ میں۔

اگراس نظریہ پرکوئی دلیل نہیں تواس کے مقابل والا نظریہ بھی بغیر دلیل کے ہے کیونکہ پہلے مادہ کے تمام مختلف حالات ایک ہی دفعہ وجود میں آئے تھے اوران کے درمیان زمانی اعتبار سے فاصلہ نہیں تھا۔کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ حالات،جن کا نام ہم نے''پہلے انسان کے مادہ کے

---

[۱] انا خلقنٰھم من طین لازب (صافات۔۱۱)

[۲] خلق الانسان من صلصال کالفخار (الرحمن۔۱۴)

حالات'' رکھا ہے، زمانہ کے مختلف فاصلوں سے، (نہ زیادہ فاصلے سے) وجود میں آئے ہوں۔ بعض احادیث بھی۔ [۱] اس کی تائید کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآن اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہتا اور اس پر کوئی چیز ٹھونسی بھی نہیں جاسکتی۔ اپنی طرف سے پہلے سے فیصلہ کر لینے والے یہ لوگ کبھی بعض آیات میں۔ [۲]

لفظ ثم کے آنے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان دو مرحلوں (خلقت اور صورت بنانے) کے درمیان بہت فاصلہ تھا جو آدمؑ کی خلقت کے تدریجی ہونے کی تائید کررہا ہے۔ لیکن ہم نے پہلے ہی یہ بات کہہ دی ہے کہ یہ لفظ اگرچہ دو مرحلوں کے درمیان فاصلے کو بیان کررہا ہے۔ لیکن اس فاصلے کی طوالت ہرگز بیان نہیں کرتا۔ جس طرح یہ احتمال ہے کہ ان دو مرحلوں کے درمیان ہزاروں سال کا فاصلہ ہو اس طرح یہ احتمال بھی ہے کہ یہ فاصلہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ہو۔

مذکورہ آیات کے پیش نظر گویا تخلیق اور صورت بنانے کے درمیان وقفہ بہت کم تھا کیونکہ بعض آیات میں اس وقفہ کو بیان کرنے کے لیے لفظ ''فا'' کا استعمال ہوا ہے۔ا۔ جو خود ایسی ترتیب پر دلالت کرتا ہے جو وقفہ کے بغیر ہو۔ گویا یوں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی خاص وقفہ نہیں تھا کیونکہ ایک جگہ ''ثم'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دوسری جگہ کلمہ ''فا'' لایا'' گیا ہے۔

قرآن اور تحول انواع کے مدعی

بعض لوگ پہلے انسان کے متعلق اور ایسے مراحل ثابت کرنا چاہتے ہیں جو نظریہ تکامل کے طرف داروں کے مطابق ہوں یہ لوگ قرآنی آیات کو بھی ان پر منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے اہم آیت جس سے وہ استدلال کرتے ہیں یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً
بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں سے چن لیا، یہ ایک دوسرے کی نسل سے ہیں اور اللہ سب کچھ سننے، جاننے والا ہے۔ (آل عمران۔ 33-34)

اس آیت سے نظریہ تکامل پر طرز استدلال اس طرح قائم کیا جاتا ہے، اس آیت نے ''نوح'' اور ''ابراہیم'' کی طرح ''آدم'' کا نام ایک خاص شکل میں بیان کیا ہے۔ یہ آدمؑ کی پیدائش کے ماحول اور حالات کو بھی واضح طور پر بیان کرتی ہے کیونکہ ''اصطفی'' کے معنی چن لینا اور منتخب کر لینا ہے۔ ہر فرد کا انتخاب اس کے مانند باقی افراد کے درمیان سے ہی کیا جاسکتا ہے نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران ے منتخب شدہ افراد آیت کی تصریح کے مطابق اپنی قوم، یعنی وہ لوگ جن کے ساتھ یہ رہتے تھے، ان میں سے چنے گئے ہیں۔ واضح طور پر یہی بات حضرت آدمؑ

---

[۱] بحارالانوار جلد ۱۱ ص ۱۲۰ جس کو ابن طاؤس نے ''سعد السعود'' سے نقل کیا ہے۔

[۲] ولقد خلقنکم ثم صورنکم ثم قلنا للملٰئکۃ (اعراف۔۱۱)

کے متعلق بھی ہے، جن کے بارے میں آیت میں خاص حالات بیان کئے گئے، یعنی ان کا انتخاب بھی اپنی نوع کے ان افراد ہی میں سے ہوا ہے جو جسمانی لحاظ سے ان کی طرح ان کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے۔ [۱]

اس استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ اس آیت میں ''عالمین'' سے مراد آدمؑ کے ساتھ زندگی گذارنے والے افراد ہیں۔ اس صورت میں آدمؑ کے انتخاب کا لازمہ یہ ہوگا کہ اس کے دور میں اس کی نوع کے لوگ موجود ہوں گے، لفظ ''عالمین'' کی تفسیر اس کے لغوی اور قرآنی معنی کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن میں جہاں بھی لفظ ''عالمین'' سے عقل منداور باشعور موجودات مراد لئے گئے ہیں وہاں اس سے مراد وہ تمام انسان اور جہانوں والے ہیں جنھوں نے یہاں قدم رکھے ہیں نہ کہ مخصوص انسانوں کے ہم عصر لوگ، یہ حقیقت دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتی ہے، جنہیں ہم ذکر کرتے ہیں:

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

''اللہ عالمین میں کسی پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا''۔ (آل عمران۔108)

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

بے شک زمین پر لوگوں (کی عبادت) کے لئے جو پہلا گھر بنایا گیا ہے وہی مکہ کا گھر (خانہ کعبہ) ہے جس میں عالمین کے لئے برکت اور ہدایت ہے۔ ۲۔ (آل عمران۔96) [۲]

لہٰذا آدمؑ جیسے انسان کے انتخاب کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ خود اس کے زمانہ میں اس کے ہم نوع موجود ہوں، بلکہ ان تمام انسانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو بعد میں اس صفحۂ ہستی پر قدم رکھیں گے یہ انتخاب وجود میں آیا ہے۔ اس انتخاب سے مراد یہ ہے کہ جن کمالات و خصوصیات کے ساتھ انہیں پیدا کیا گیا ہے دوسرے انسانوں کے سلسلہ میں ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ آیت سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام ادوار اور زمانوں کے انسانوں میں سے بعض افراد کا انتخاب کیا ہے: نہ یہ کہ انہیں سابقہ انسانوں یا اپنے ہم عصر انسانوں میں سے چنا ہو۔

نظریہ تحول انواع کے طرف دار لوگ دیگر آیات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ [۳]

انہیں استدلال کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ صرف آیت پر اپنی رائے ٹھونسنے کے علاوہ کچھ نہیں۔

---

[۱] خلقت انسان۔ص ۱۰۵، ص ۱۰۶

[۲] اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ آیت ۲۵۱، سورۂ شعراء آیت ۱۶۵، سورۂ اعراف آیت ۱۴۰ اور سورۂ عنکبوت آیت ۲۹ کی طرف رجوع کریں۔ ان آیات میں عالمین سے مراد تمام انسان اور اہل جہان ہیں نہ کہ کسی خاص دور کے انسان۔

[۳] اس باب میں ہم نے ان آیات کی وضاحت کی ہے جن سے زیادہ تر استدلال کیا جاتا ہے۔ ایک تو یہی آیت اصطفا ہے اور دوسری آیت ہے جو انسان کی خلقت ''صلصال'' اور ''فخار'' سے قرار دیتی ہے۔ تیسری وہ آیت ہ جس میں صورت بنانے کے مرحلہ کو لفظ ''ثم'' کے ذریعہ عطف کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں تینوں استدلالات کی کمزوری بالکل واضح کردی گئی ہے۔

نتیجہ گفتگو

انسان اول کی خلقت سے متعلق آیات دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی آیات کا لحن یہ بتاتا ہے کہ خلقت انسان مستقل ہے۔ اگر آدمؑ کی خلقت میں خاک سے پہلا انسان بننے تک انواع کے تحول جیسے مراحل تھے بھی تو قرآن نے اس طرح کی انواع کی طرف بالکل اشارہ نہیں کیا۔ خصوصاً اس بات کے پیش نظر کہ تکامل انواع کے حامی لوگوں کے دلائل ایک نظریہ سے زیادہ کچھ ثابت نہیں کر سکے ہیں اور نہیں سو فیصد حد تک سائنسدانوں کے یقین و تائید کی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ دوسری طرف آیات کا مضمون اس طرح نہیں کہ جس کے ذریعہ ان مراحل کو واضح طور پر ٹھکرایا جا سکے کیونکہ یہ بات ممکن ہے۔ لہٰذا اگر کسی دن انسان اول کی خلقت کے بارے میں تکامل انواع کا نظریہ یقین اور اثبات کی حد تک پہنچ گیا تو قرآن اس سے متصادم نہیں ہوگا۔

انسان اول کی نسلی بقاء

قرآن نے انسان اول کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد اس کی نسل کے بقاء کا ذریعہ نر اور مادہ انسان کا آپس میں ملاپ قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف سورتوں میں متعدد آیات آتی ہیں۔ ہم مختصر طور پر ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝۸

"اور اس نے انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس نے اس کی نسل کو ایک بے اہمیت پانی سے قرار دیا"۔
(سجدہ۔ ۷، ۸)

قرآن نے اس نسل کی بنیاد کو بعض آیات میں "ما" اور بعض میں لفظ "نطفه" کے ذریعہ بیان کیا ہے۔[1]
رحم میں نطفہ کے تکامل کا طریقہ کار قرآن نے مختلف آیات میں بیان فرمایا ہے۔ سورۂ مومنون میں یہ تفصیلی طور پر جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم اس کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی یہاں ذکر کرتے ہیں:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ

---

[1] ان سورتوں کی طرف رجوع فرمائیں: فرقان ۵۴، سجدہ ۸، مرسلات۔ ۲۰، طارق۔ ۶، (ان سورتوں میں لفظ "ماء" آیا ہے) نیز ان سورتوں کی طرف رجوع فرمائیں: نحل ۴، کہف۔ ۳۷، حج۔ ۵، مومنون۔ ۱۳، ۱۴، مومن۔ ۱۱، یس۔ ۷۷، غافر۔ ۶۷، نجم۔ ۴۶، قیامت۔ ۳۷ دھر۔ ۲، عبس۔ ۱۹

الْخٰلِقِيْنَ ﴿١٤﴾

''پھر ہم نے نطفہ کو جمے ہوئے خون کی ایک پھٹکی بنا دیا، پھر اس جمے ہوئے خون کو ایک لوتھڑا، پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت پہنا دیا، پھر روح پھونکنے سے ہم نے اسے دوسری خلقت عطا کی، خدا کی قدرت پر آفرین کہ وہ سب پیدا کرنے والوں سے بہتر خالق ہے''۔ (سورۂ مومنون۔14)

یہ موجودہ انسان کا شجرۂ نسب ہے۔ اس شجرۂ نسب کا علم کسی انسان کے اندر نہ تو احساس حقارت پیدا کرتا ہے اور نہ اسے ناراض کرتا ہے۔ اس سے انسان کی تحقیر نہیں کی گئی۔ لیکن دیگر مکاتب جو انسان کو جانوروں کی پیداوار، اس سے پہلے بندر جیسی کسی چیز کو اور پھر انسان نما بندروں کی پیداوار سمجھتے ہیں، انہوں نے انسان کی بے توقیری کر کے اس کے اندر ایک احساس کمتری و حقارت پیدا کیا ہے۔

اگر قرآن نے آدمؑ کا نسب بتانے کے سلسلہ میں پہلے مراحل کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کا مقصد صرف تربیتی ہے تاکہ انسان اپنی آفرینش کے خالق کے بارے میں غور کرنے اور اپنے خدا کی تعظیم کرے۔ اسے غرور و گھمنڈ کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس وقت وہ شکر اور سپاس گذاری کے لیے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دے۔ اس سے متعلق ہم اس سرگذشت کے آخر میں نکات نصائح کے عنوان سے گفتگو کریں گے۔

۲)۔زمین پر حضرت آدمؑ کی خلافت

موضوع سے متعلق آیات

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا
مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ
قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ (بقرہ۔۳۰)

......وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ......(اعراف۔۶۹)

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ......(اعراف۔۷۴)

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ (اعراف۔۱۲۹)

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ.........(یونس۔۷۳)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ......(النور۔۵۵)

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ... (الحدید۔۷)

آیات کا ترجمہ

۱)۔اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: ''میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں'' انہوں نے کہا: ''کیا تو وہاں اسے خلیفہ مقرر کرنے لگا ہے جو فساد اور خون ریزی کرے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں، اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں'' اللہ نے کہا: ''بے شک میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

۲)۔اور وہ وقت یاد کرو جب نوح کی قوم کے بعد تمہیں ان کا جانشین بنایا گیا۔

۳)۔اور وہ وقت یاد کرو جب تمہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا گیا۔

۴)۔شاید تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اور تمہیں زمین میں ان کا قائم مقام بنادے۔

۵)۔انہوں نے (نوحؑ کو) جھٹلایا، پھر ہم نے اسے اور جو اس کے ساتھ کشتی میں سوار تھے نجات دے دی اور انہیں (زمین پر) خلیفہ بنایا۔

۶)۔تم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلفیہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے۔

۷)۔اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس میں تمہیں خلیفہ بنایا گیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

حضرت آدمؑ کی کہانی کا اہم حصہ زمین پر انہیں خلیفہ بنانا ہے۔وہ خلافت جس کا ذکر اللہ نے ان کی خلقت سے پہلے یا بعد میں۔[۱] فرشتوں کے سامنے کیا اور ان سے کہا:''میں زمین پر خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں'' اس وقت فرشتوں نے سوال کیا:''کیا تو زمین میں اسے جانشین بنائے گا جو وہاں فساد و خون ریزی کرے گا؟''

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں''، انہوں نے کہا:''کیا تو وہاں اسے خلیفہ مقرر کرنے لگا ہے جو فساد اور خون ریزی کرے گا، حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں''، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''جو کچھ میں جانتا ہوں یقیناً تم نہیں جانتے''۔(بقرہ۔۳۰)[۲]

حقیقت میں ان کا اعتراض نما سوال یہ تھا کہ یہ مخلوق اپنی اس کیفیت کے ساتھ جس سے ہم آگاہ ہیں، خلافت کے لائق نہیں ہے، اگر خلافت کا مقصد تسبیح اور پاکیزگی ہی بیان کرنا ہے تو ہم (جو اس مقصد کو عملی جامہ پہناتے ہیں) تیرا جانشین بننے کے زیادہ حقدار ہیں۔

یہاں اہم بات آدم کی جانشینی کے معنی معلوم کرنا ہے، نیز یہ کہ ان کی خلافت کس کی جانب سے ہے؟ کیا یہ خلافت اللہ کی جانب سے

---

[۱] اس سلسلے میں قرآن کی تعبیر''اِنِّی جَاعِلٌ'' ہے۔اگر بعض دوسری آیات کو قرینہ بنا کر''جعل'' کو''خالق'' کے معنی میں لیا جائے تو یہ گفتگو آدمؑ کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہوگی۔اور اگر''قرار دینے'' کے معنی میں ہیں تو پھر اس معنی کا احتمال ہے کہ گفتگو ان کی تخلیق کے بعد انجام پائی۔شاید دوسرا احتمال آیات کے ظاہر سے قریب تر ہے۔

[۲] حمد کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات جمال سے اور تسبیح و پاکیزگی کا بیان اس کی صفات جلال سے ہے۔اگر آپ کہیں کہ ایک کی تکمیل دوسری ہی سے لازم ہے یعنی قبولیت کے بغیر کافی نہیں تو پھر تو تسبیح و بیان پاکیزگی کی حمد و ثنا کے ساتھ ہی عمل میں آئیں گے۔

ہے یا ان سے پہلے موجودات کی طرف سے جو زمین پر زندگی بسر کرتے تھے؟ یہاں متعدد احتمال موجود ہیں جن میں اہم ترین یہی دو ہیں۔ دوسرے احتمالات۔[1] یادہ اہم نہیں ہیں۔

آدمؑ کی تخلیق سے متعلق مطالب اگرچہ قرآن میں کئی بار ذکر کئے گئے ہیں لیکن اس سے متعلق دو باتیں واضح طور پر قرآن میں صرف ایک بات ہی ذکر ہوئی ہیں ایک، ان کی خلافت کا مسئلہ ہے اور دوسرا انہیں اسماء کی تعلیم دینے کا موضوع ہے۔ اس لئے یہ دونوں موضوعات ابہام کا شکار ہیں۔

۱)۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانشینی

حضرت آدمؑ کی خلافت سے مراد زمین میں ان کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمائندہ ہونا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ وہ زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں، جس طرح اسلامی عقائد کے مطابق انبیاء وآئمہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے جانشین ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت آدمؑ یا ان کی تمام اولاد کی جانشینی، جس کا تذکرہ ہم آگے کریں گے مفہوم کے اعتبار سے اس جانشینی وخلافت سے بالکل جدا ہے جس کے حامل انبیاء اور آئمہ ہیں۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے۔[2] کہ اگر مراد اللہ تعالیٰ کی خلافت ہے تو اس خلافت کا محور مندرجہ ذیل باتوں میں سے ایک کو ہونا چاہیے:

۱)۔الوہیت میں جانشینی اور یہ کہ حضرت آدمؑ زمین پر معبود ہوں۔

۲)۔ربوبیت اور پروردگار ہونے میں ان کی جانشینی، نیز یہ کہ آدمؑ زمین کے رب، مدبر اور مدیر ہوں، یہ دونوں باتیں شرک اور قرآنی نکتہ نظر سے قابل مذمت ہیں۔

حضرت آدمؑ زمین پر ''معبود کس طرح ہو سکتے ہیں؟ جبکہ قرآن خود فرما رہا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ

''وہی ہے آسمان کا خدا اور زمین کا خدا''۔(زخرف۔84)

حضرت آدمؑ زمین کے مدبر اور پروردگار کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ تکوینی وتشریعی لحاظ سے حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے:

''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ''۔(انعام 57، یوسف 40، 67)

یہ دونوں احتمال پیش کرنا بڑی عجیب بات ہے کیونکہ جانشینی صرف ان دو باتوں ''ربوبیت'' اور ''الوہیت'' میں بھی منحصر نہیں کہ ان کی نفی کرنے سے اللہ کی جانب سے جانشینی کی بات ہی ختم ہو جائے، بلکہ حضرت آدمؑ کے خدا کی جانب سے خلیفہ ہونے کی کئی اور جہات بھی ہو سکتی ہیں

---

[1] یعنی ملائکہ یا جنات کی طرف سے جانشینی کا مطالبہ جو بعید از قیاس اور مفہوم آیت سے دور ہے اس لیے ہم نے صرف دو صورتوں کا متن میں ذکر کیا ہے۔

[2] الفرقان، ج۱ ص ۲۸۰

جن کو اب ہم بیان کرتے ہیں:

(الف)۔"نمائندگی" نمایاں کرنے کے مفہوم میں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدمؑ کی نمائندگی کا سرچشمہ تخلیق آدمؑ کا معیار ہے۔ وہ اپنے وجود اور اپنے اندر چھپے ہوئے کمالات اور آئندہ حاصل ہونے والے کمالات کی بناء پر اپنے خالق کے جلال و جمال کا عکس پیش کرسکتا ہے۔ لہٰذا ایک اعتبار سے وہ معرفت الٰہی کے لیے آئینہ بن سکتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ آدمؑ اپنی وجودی خصوصیات اور حالات کی وجہ سے اپنے خالق کے کمالات کا مظہر ہیں، اس لیے وہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ زمین میں اس کے خلیفہ ہوں اور صفات حق کا مظہر بنیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ ہر موجود اپنے وجودی مرتبہ کے مطابق کچھ کمالات کا حامل ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے خالق کے کمالات کا مظہر بھی ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ کمال و جمال کے اعتبار سے کوئی موجود بھی انسان کے برابر نہیں آسکتا اور صفات و افعال کے حوالے سے بھی جس طرح وہ اپنے خالق کے اوصاف و افعال کی حکایت کرتا ہے، کوئی دوسرا موجود اس طرح ان اوصاف و کمال کا مظہر نہیں ہوسکتا، اس لیے خلافت الٰہی کا مرتبہ حضرت آدمؑ کا عطا کیا گیا۔ یہاں تک کہ فرشتے بھی اس حمد و ثناء کرنے کے باوجود یہ مقام حاصل نہ کرسکے۔

یہاں شیخ محمد عبدہٗ نے خلافت کی اس قسم کی وضاحت کی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ یہاں بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"وحی اور عینی مشاہدات گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہان آفرینش میں مختلف طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں، لیکن انسان کے علاوہ یہ سب مخلوقات کمال وقدرت کے لحاظ سے مکمل طور پر محدود ہیں"۔ یعنی یہ اپنی مخصوص سرحد سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے وہ فرشتوں، جمادات، نباتات اور حیوانات کا ذکر کرتے ہیں۔

فرشتوں کی حقیقت سے ہم بالکل ناواقف ہیں، وحی نے ان کی فعالیت کا دائرہ محدود طور پر بیان کیا ہے اور ان کا ذکر اس طرح ہوتا ہے:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿٢٠﴾

"وہ دن رات، سستی کے بغیر، اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں"۔ (انبیاء۔20)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿١٦٥﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿١٦٦﴾

''اور ہم صف باندھنے والے ہیں اور ہم بھی تسبیح کرنے والے ہیں''۔ (صافات۔ 165، 166)

ان آیات اور سورۂ ''النازعات'' میں آنے والی دوسری آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کی کارکردگی محدود ہے۔ [۱]

حضرت امیر المومنین فرشتوں کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''بعض فرشتے سجدے کی حالت میں ہیں اور رکوع نہیں کرتے، بعض ہمیشہ رکوع کی حالت میں رہتے ہیں اور کھڑے نہیں ہوتے، بعض صف بنا کر کھڑے ہیں، ان کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی اور ان میں بعض تکان کا احساس کئے بغیر تسبیح کرتے رہتے ہیں، ان کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں ہوتا''۔ [۲]

محمد عبدۂ مزید لکھتے ہیں: ''جمادات علم کے فقدان کے باعث اپنے وجود کے دائرہ سے آگے نہیں بڑھتے، نباتات اگرچہ مختلف کارکردگی دکھلاتے ہیں۔ لیکن ان کی کارکردگی میں علم اور ارادہ (اگر علم اور ارادہ موجود ہو تو) کا اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے نباتات کی کارکردگی کو فعل الٰہی کی عظمت کا مظہر اور جلوہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حیوان اگرچہ علم و ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کی کارکردگی کا دائرہ بھی محدود ہے اور وہ یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اسے حق کے جمال و کمال کا مظہر قرار دیا جائے۔ لہٰذا صرف انسان ہی اللہ تعالیٰ کے جمال کا مظہر اور اس کے کمال کا جلوہ گر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، اگرچہ وہ بھی کمزور۔ [۳] وجاہل۔ [۴] پیدا کیا گیا ہے اور کمال کی طرف اس کی رفتار سست ہے۔ لیکن جب وہ کمال کی منزل تک پہنچ جاتا ہے تو خلقت میں اس کے تصرفات اور کائنات میں اس کی قدرت نمائی حیرت انگیز ہوتی ہے۔ وہ کائنات میں حیوانات و نباتات کو مسخر کرتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو کائنات سے خدمت لیتا ہے۔ اس تصرف کی صلاحیت، لیاقت اور معیار اس حد تک محدود و لامحدود ہے کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ اپنے علم و توانائی میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ لہٰذا اس طرح کا موجود ہی زمین پر اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور اپنے خالق کے علم کا ترجمان قرار پا سکتا ہے''۔ [۵]

انسان کو جو یہ صلاحیت و نعمت عطا کی گئی ہے جس سے یہ کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھا کر خلقت کے اسرار کو بیان کر سکتا ہے، ان کی وجہ سے ہی یہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کمال اور اس وسیع علم کی علامت بن سکتا ہے۔ یہ موجود جو احسن تقویم پیدا کیا گیا ہے۔ اس معنی میں زمین پر اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور اپنے اوصاف و افعال کے ساتھ حق کی نشانی بن سکتا ہے۔

---

[۱] المنار، ج ا، ص ۲۵۹، ص ۲۶۰

[۲] ''منهم سجود لا یر کعون، ور کوع لا ینتصبون، وصافون لا یتزایلون، ومسبحون لا یسأمون، لا یغشهم نوم العیون''۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ا)

[۳] وخلق الانسان ضعیفاً (نساء ۲۸)

[۴] ''واللہ اخرجکم من بطون امهاتکم لا تعلمون شیئًا''۔ (نحل۔ ۷۸)

[۵] المنار، ج ا ص ۲۵۹، ص ۲۶۰

لٰہذا انسان کی خلافت الوہیت یا اللہ تعالیٰ کے افعال کی تفویض میں جانشین بننے کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ ''نشانی'' ہونے کے معنی میں ہے یعنی مختلف جہات سے اس میں جمال پروردگار کے نشان پائے جاتے ہیں۔

(ب)۔اس کی ''نمائندگی'' کائنات میں تصرف کرنے میں

آپ اللہ تعالیٰ کی اس خلافت کی تفسیر ایک اور طرح بھی کر سکتے ہیں، جو حقیقت میں اس تصویر کا دوسرا رخ ہے، وہ یہ کہ اللہ نے کائنات پیدا کی اور اس میں نعمتیں قرار دیں۔ بے شک یہ نعمتیں وعطیات بے مقصد و بلا وجہ پیدا نہیں کئے گئے۔ یہ تیار زمین، یہ مختلف اقسام کے مفید حیوانات، کسی مقصد کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ مقصد اس صورت ہی میں پورا ہو سکتا ہے جب ان سے ایک بڑی مخلوق اللہ کی اجازت سے ان میں تصرف کرے۔ زمین کو آباد کرے اور اس کی پوشیدہ نعمتوں کو آشکار کرے بالخصوص چونکہ آدمؑ کو اللہ کی جانب سے اس کائنات میں تصرف کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زمین پر اللہ کے نمائندہ ہیں تاکہ زمین اور اس کے اندر مخفی خزانوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان میں تصرف کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت کتنے خوبصورت انداز میں بیان فرمائی ہے:

يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗؕ هُوَ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَاسۡتَعۡمَرَكُمۡ فِيۡهَا فَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ.........

''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس آباد کرنے کی ذمہ داری تمہیں سونپی، پس تم اس سے بخشش مانگو''۔ (ہود۔61)

اس آیت میں وہ جملے آئے ہیں جن میں ہر ایک زیر بحث آیت کے جملے کے مساوی ہوسکتا ہے:

۱)۔هُوَ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ یہ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ کے مساوی ہے۔

۲)۔وَاسۡتَعۡمَرَكُمۡ فِيۡهَا یہ خَلِيۡفَةً ------ کے مساوی ہے۔

ان دونوں جملوں کا آپس میں موازنہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آدمؑ کی جانشینی کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے، وہ اس طرح کہ وہ خدا کی طرف سے کائنات میں تصرف کرتا ہے اور اس کی نعمتوں سے اپنے مادی و معنوی کمال تک پہنچنے کے لیے استفادہ کرتا ہے۔ شاید ایک اور آیت کی نظر بھی اس معنی کی طرف ہو، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَكُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِيۡنَ فِيۡهِ

''اور جس میں تمہیں جانشین بنایا ہے اس میں خرچ کرو''۔ (حدید۔7)

یہ بات بغیر تشریح واضح ہے کہ اس جانشینی سے مراد اللہ کی طرف سے جانشین ہونا ہے اور اس کی نمائندگی کا دائرہ اس کی نعمتوں، نیز اس کائنات میں اللہ کی اجازت سے تصرف کرنا ہے۔ چونکہ یہ کائنات اور اس میں جو کچھ موجود ہے وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے اور انسان

اس کی اجازت سے ان میں تصرف کرتا ہے، اس لیے اللہ اپنے نمائندوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اس کی عطا کردہ چیزوں کو دوسروں پر خرچ کریں۔ مختصر یہ کہ یہاں اللہ تالیٰ کی طرف سے جانشین بنایا جا رہا ہے، آدمؑ زمین پر اللہ کے جانشین ہیں اور ان کی جانشینی کا معیار ان دو میں سے ایک یا دونوں باتیں ہوسکتی ہیں:

۱)۔اپنے کمالات کے ساتھ کمال حق اور جمال حق کے مظہر ہیں۔

۲)۔اللہ کی جانب سے خلیفہ ہونے کی وجہ سے انہیں یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ کائنات، اس کے اندر موجود نعمتوں میں تصرف اور اسے آباد کر سکتے ہیں۔ ہم ان دونوں بیانوں کو ایک نظریہ کے دورخ قرار دیتے ہیں۔ جو بات اس رائے کی تائید کرتی ہے وہ ایسے اجمالی اور تفصیلی جوابات ہیں جو آیت میں آئے ہیں۔

اجمالی جواب اس طرح دیا گیا ہے: ''میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم فرشتے نہیں جانتے ہو'' یعنی یہ جانشین اپنی زندگی میں فساد و خون ریزی کا شکار تو ہوگا لیکن اس کے اندر ایسے کمالات پائے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ وجود میں آیا ہے اور خلیفہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تفصیلی جواب جو بعد والی آیت میں آیا ہے، اس میں تعلیم اسماء کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی آدمؑ وہ اسماء سیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے جب کہ فرشتوں میں یہ لیاقت نہ تھی۔ ہم آگے چل کر ''تعلیم اسماء'' کے بارے میں گفتگو کریں گے، یہ خصوصیت بھی اس بات کا باعث بنتی ہے کہ آدمؑ لباس ہستی سے مزین ہوں اور اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بنیں۔ اگر مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلافت نہ ہو تو اس تفصیلی جواب کے بیان کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

یہاں ایک تیسرا نکتہ بھی ہے جو اللہ کی جانب سے آدمؑ کے نمائندہ ہونے کی وجہ بن سکتا ہے، وہ یہ کہ اگر یہ اس جانشین کی نسل میں بہت سے بڑے، خون ریزی کرنے والے انسان ہوں گے، لیکن اس کے صلب میں ایسے علیم و پاکدامن انسان بھی ہیں جو لوگوں پر اللہ کی حجت ہوں گے، اس پودے پر ایسے پھولوں کا مہکنا بھی اس بات کا سبب فراہم کر دیتا ہے کہ اللہ سے خلق فرما کر زمین پر اپنا خلیفہ بنائے۔[1]

یہاں تک کہ ہم پہلے نظریہ سے آگاہ ہوئے ہیں، اس کے دونوں بیانوں کے ساتھ اب دوسرا نظریہ بیان کرنے کا وقت آتا ہے۔

۲)۔سابقین کا جانشین

اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوالبشر آدمؑ اس صفحۂ ہستی پر قدم رکھنے والے پہلے انسان نہیں ہیں، بلکہ ان سے پہلے بھی اس زمین پر ایسے جاندار زندگی بسر کرتے تھے جو ذمہ دار بھی تھے اور مکلف بھی۔[2]

بعض وجوہات کی بناء پر وہ ختم ہوگئے، لہٰذا خلافت سے مراد اس گذشتہ گروہ کی جانب سے آدمؑ کی جانشینی ہے۔ اصولی طور پر خلافت کے معنی بھی ایک چلے جانا اور دوسرے کا آجانا، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] تفسیر قمی، ج۱ ص۳۷: اجعل من ذریته عباداً صالحین وآئمة مهدتین واجعلهم خلفاء

[2] روایات میں ان کا نام ''بنوالجان'' ذکر کیا گیا ہے۔ تفسیر برہان ج۱ ص ۷۴ حدیث ۷ کی طرف رجوع کریں۔

وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ خِلۡفَةً

وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین قرار دیا۔ (فرقان۔62)

اس صورت میں زیر بحث آیت سے مراد یہ ہوگی کہ اللہ نے فرشتوں سے فرمایا:

''میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے لگا ہوں جو گذشتہ موجودات کا جانشین ہوگا''۔ یہ حقیقت اس وقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ سمجھ لیں کہ قرآن نے ہر نئی قوم کو، جو پہلی قوم کے بعد آئی ہو، پہلی قوم کا جانشین کہا ہے، چنانچہ قوم نوحؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلۡنٰهُمۡ خَلٰٓئِفَ وَاَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا

''ہم نے نوح اور ان کے مومنوں کو جانشین بنایا اور اپنی آیات کو جھٹلانے والوں کو غرق کر دیا''۔ (یونس۔73)

قوم ہود کے متعلق ہم پڑھتے ہیں:

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَـكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ

''ہود نے اپنی قوم سے کہا: وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قوم نوح کے بعد اپنا جانشین بنایا''۔ (اعراف۔69)

قوم صالحؑ کے متعلق اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَـكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ

یاد کرو کہ اللہ نے تمہیں عاد کی تباہی کے بعد اپنا جانشین مقرر کیا۔ (اعراف۔74)

ان تین آیات میں ''خلئف'' اور ''خلفاء'' خلیفہ کی جمع کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور گذشتہ لوگوں کی جانشینی سے متعلق ہیں۔ اس نظریہ کی تائید وہ آیہ شریفہ بھی کرتی ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ

تم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا، جیسا کہ اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ (نور۔55)

اس آیت سے بھی زیادہ واضح حضرت موسیٰ کی وہ بات ہے جو انہوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمائی تھی:

عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يُّهۡلِكَ عَدُوَّكُمۡ وَيَسۡتَخۡلِفَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ

امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین میں ان کا قائم مقام بنادے

(اعراف۔129)

ان آیات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعد میں آنے والی قومیں سابقہ اقوام کی جانشین شمار کی جاتی ہیں۔لہٰذا مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آدمؑ کا جانشین بننا بھی بعد والی قوموں کے جانشین بننے کی طرح ہی ہے جو پہلے انسانوں کی نمائندہ تھیں،بعض روایات میں بھی یہی بات آئی ہے جس سے اس نظریہ کی تائید ہوسکتی ہے کہ فرشتے یہ دیکھ چکے تھے کہ گذشتہ لوگ زمین پر فساد اور خونریزی کرتے تھے۔[1]

البتہ اس تائید کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فرشتوں کا فیصلہ اور قضاوت ظنی قیاس کی بنیاد پر تھے تاکہ یہ کہا جائے کہ فرشتے ایک ظنی قیاس کو اپنے فیصلے کی دلیل کیسے بنا سکتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے ان دونوں موجودات کی حقیقت کے ایک ہونے سے آگاہ ہو چکے تھے،اس لیے اس قاعدہ کے تحت کہ ''حکم الامثال فیما یجوز وفیھا لا یجوز واحدًا'' انہوں نے اس طرح کی رائے قائم کی اور یہ سوچا کہ اگلی مخلوق بھی گذشتہ مخلوق کی طرح ہمت شکن جبلیات رکھتی۔لہٰذا یہ بھی طبیعت کے لحاظ سے قانون شکن ومفسد ہوگی۔چنانچہ سابقہ مخلوق نے بھی اس طرح کے مشترک عناصر ہونے کی وجہ سے فساد اور خون ریزی کی تھی۔

یہ بات اس وقت مزید واضح ہوجاتی ہے جب ہم یہ جان لیں کہ اللہ نے فرشتوں کو پہلے ہی تخلیق آدمؑ کے مادہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ خَالِـقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِيۡنٍ ﴿۷۱﴾

جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے بشر پیدا کرنے والا ہوں۔(ص۔71)

انہوں نے خاکی انسان کی فطرت سے آگاہی کی بنیاد پر جو غصہ وخواہشات کا حامل ہے، نیز اس بات کے پیش نظر کہ پہلے والے بھی ان دونوں قوتوں سے لیس تھے جن سے انہوں نے فساد برپا کیا تھا،فرشتوں نے انسان کی خلقت کے فلسفہ کے بارے میں اس طرح کی مخلوق کیوں پیدا کرنے لگے ہو اور اسے اپنا خلیفہ بنانے لگے ہو؟

حق تو یہ ہے کہ یہ دونوں نظریات آیات قرآن کے پیش نظر قابل قبول ہیں تاہم پہلا نظریہ زیادہ مضبوط نظر آتا ہے کیونکہ جس طرح ہم بیان کر چکے ہیں۔اللہ نے ''تعلیم اسماء'' کی بات کا ذکر اس کے بعد کیا ہے اور یہ کہ آدمؑ اس بات کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے کہ وہ اسماء سیکھ لیں، جب کہ فرشتوں میں اس طرح کی صلاحیت نہیں پائی جاتی تھی اس موضوع کو یہاں بیان کرنا اس بات پر واضح دلیل ہے کہ یہ خلافت اس عظیم خصوصیت کی وجہ سے الٰہی خلافت تھی نہ کہ ایک نوع کو دوسری نوع کا جانشین بنانا مقصود تھا، اگر اس طرح ہوتا تو اس موضوع کو بیان کرنا کچھ مناسب نہیں لگتا تھا، چنانچہ اللہ نے قوم ہودؑ کو قوم نوحؑ کی جانشین بنانے، قوم صالحؑ کو قوم ہودؑ کی جانشین بنانے کے سلسلے میں اس طرح کے اسباب بیان نہیں کئے ہیں اور ان کا ذکر بالکل نہیں کیا ہے۔جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ خلیفہ، جس کی تعریف آپ اس طرح کر رہے ہیں،خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ بھرپور صلاحیتوں کا حامل بھی ہے جن کی وجہ سے اللہ سے اسماء کی تعلیم حاصل کر سکتا

[1] تفسیر برہان ا ص ۷۴ حدیث ۳ (ہشام بن سالم) ''لولا انّھم قد کانوا رأوا من یفسد فیھا ویسفك الدماء''

ہے اور پھر فرشتوں کا استاد بن سکتا ہے۔اس لیے وہ اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ زمین پر اللہ کا جانشین ہوایسا چاہے کمال کا مظہر ہونے کی بنیاد پر ہو یا کائنات میں تصرف کرنے کے لحاظ سے ہو۔

جانشین نوع انسان ہے

اللہ تعالیٰ نے جو ملائکہ کی یہ بات رد نہیں کی کہ اس موجود کا انجام یہ ہوگا، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ خلافت حضرت آدمؑ کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ تو تمام انسانوں کے لیے ہے۔اس رائے کی مختصر تشریح اس طرح ہے۔:

جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: ''میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں''، تو فرشتوں نے اعتراض کرنے کے انداز میں سوال کیا: ''کیا اسے زمین میں خلیفہ بنائے گا جو فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا؟'' اگر خلیفہ سے مراد خود ابوالبشر ہوتے تو ایسا سوال کرنے کا موقع ہی نہیں تھا کیونکہ انہوں نے نہ تو کبھی فساد برپا کیا اور نہ ہی خون بہایا، بلکہ ان کی اولاد نے فساد و خونریزی کی۔اسی لیے انہوں نے اس طرح کا سوال کیا تھا۔

یہ بات اس وقت اور واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ جان لیں کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کے سلسلہ میں خود حضرت آدمؑ مسجود ملائکہ نہیں تھے، بلکہ نوع انسان کو سجدہ کرنا منظور نظر تھا۔اگر حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام بنی آدم کے نمائندہ تھے۔اس کرامت نے جو پوری نوع سے متعلق ہے، آدمؑ کو مسجود ملائکہ بنانے کے ساتھ ساتھ نوع انسان کو بھی زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنا دیا۔دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ معلول (بنی آدمؑ مسجود ملائکہ تھے) کی وسعت سے علت (تمام انسانوں کے اللہ کی طرف سے خلیفہ ہونے نہ صرف حضرت آدمؑ کے) کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اگر خلافت صرف حضرت آدمؑ سے متعلق ہوتی تو صرف انسان کا مسجود ہونا نامعقول سی بات محسوس ہوتی ہے۔البتہ یہ کہ کس دلیل سے مسجود ملائکہ پوری نوع انسان قرار پاتی ہے۔نہ صرف حضرت آدمؑ، تو اس کا ذکر ہم ایک مخصوص باب میں کریں گے۔

(۳)۔اسماء کا علم

موضوع سے متعلق آیات

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾ (البقرہ۔۳۱)

قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۳۲﴾ (البقرہ۔۳۱)

قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّـكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ (البقرہ۔۳۳)

وَمَآ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۵﴾ (بنی اسرائیل ۔ ۸۵)

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ ﴿۴﴾ (الرحمٰن۔۱ تا ۴)

آیات کا ترجمہ

۱)۔اللہ نے آدمؑ کو سب اسماء کا علم دے دیا۔ پھر ان سب کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا: ”اگر تم سچے ہو تو مجھے ان سب کے نام بتاؤ“۔

۲)۔انہوں نے کہا: ”تو پاک ہے، ہمیں تو سوائے اس کے جو کچھ تو نے ہمیں سکھایا ہے، کوئی علم نہیں ہے، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا اور بڑا اعظمت والا ہے“۔

۳)۔اللہ نے فرمایا: ”اے آدمؑ فرشتوں کو ان کے نام بتا دو“۔اس وقت آدمؑ نے فرشتوں کو ان کے نام بتا دیئے۔ اللہ نے فرمایا: ”کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ یقیناً میں آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ باتوں (رازوں) سے بھی

واقف ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو اس سے بھی آگاہ ہوں''۔

۴)۔اور تمہیں تو علم میں سے بہت ہی تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔

۵)۔خدائے رحمن نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا کیا اسے بیان کرنا سکھایا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

ابوالبشر حضرت آدمؑ کی زندگی کے واقعات میں ایک واقعہ اسماء کے علم کا ہے۔خلافت کی طرح قرآن میں اس حقیقت کا ذکر بھی صرف ایک بات سورۂ بقرہ میں آیات (۳۱، ۳۳) میں آیا ہے۔اگر کسی حد تک اس قرآنی معرفت کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوتیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ان آیات میں ہی واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، ان کی تفسیر زیر بحث آیت کے الفاظ میں غور وفکر، جملات میں تدبر اور صحیح روایات کے ساتھ ہی کی جاسکتی ہے۔''تعلیم اسماء'' کی دو طرح تفسیر کی جاسکتی ہے۔ہم قارئین کے سامنے دونوں طریقے پیش کرتے ہیں۔پہلے ہم ابتدائی آیات کے الفاظ کی وضاحت کرتے ہیں۔

آیات کے جملات اور کلمات کی وضاحت

۱)۔''اسماء''اسم کی جمع ہے۔لغت عرب میں موجودات کے نام کے معنی میں آتا ہے۔حقیقت میں یہ لفظ مادہ''وسم'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی''علامت'' ہیں۔اگرچہ عربی قواعد میں اسم، فعل اور حرف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، اس سے کوئی اور معنی مراد لئے جاتے ہیں، جو یہاں ہمارے لئے زیر بحث نہیں ہیں۔الاسماء کے الف ولام اس وقت استغراق کا فائدہ دے سکتا ہیں جب بعد کے جہات کو قرینہ بنا کر یہ مضاف الیہ کے بدلہ میں ہوں یعنی''اسماء المسمیات'' یا''اسماء الاشیاء

۲)۔''ثم عرضھم'' کے جملہ سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کو اسماء کا علم دینے کے بعد اللہ نے ان اسماء کے مسمیٰ اور ان کے حقائق فرشتوں کے سامنے پیش کئے۔ان مسمیٰ کے پیش کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بعد میں فرشتوں سے ان کے نام بیان کرنے کے بارے میں کہا جاسکے۔اگر یہ پیش نہ کئے جاتے تو ایسا حکم دینے کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔

۳)۔''ان کنتم صادقین'' کے متعلق ذکر نہیں ہوا، لیکن سابقہ آیت کے پیش نظر کہ فرشتوں نے ضمنی طور پر اپنے آپ کو خلافت کے قابل سمجھا تھا اور آدمؑ کی خلافت پر تعجب کا اظہار کیا تھا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس جملہ میں مقام خلافت کے متعلق ان کی صلاحیت کا دعویٰ ہے۔

۴)۔''یادم انبئھم باسمائھم'' کا جملہ اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت آدمؑ کو اللہ کا فرمان اس وقت ملا جب مسمیٰ دکھانے کا مرحلہ اسی طرح باقی تھا اور یہ ممکن تھا، ان کی طرف''باسمائھم'' کے کلمہ کے ساتھ اشارہ کیا جاتا۔

۵)۔''انی اعلم غیب السموات والارض'' کا جملہ اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ اس گفتگو میں ایک راز اور پوشیدہ بات تھی جو فرشتوں سے مخفی تھی اور اس طریقے سے وہ اس راز تک پہنچ گئے۔

۶)۔اللہ تعالیٰ کی اس بات ”واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون“ سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ فرشتوں کے ساتھ اللہ کی گفتگو کے وقت فرشتوں نے کچھ باتیں بیان کی تھیں اور کچھ باتیں چھپالی تھیں،آیت کے سیاق کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی خلافت پر ان کا تعجب ان کی باتوں کا واضح حصہ تھا جب کہ اپنے آپ کو حضرت آدمؑ سے زیادہ مستحق خلافت سمجھنا ان کی باتوں کا مخفی حصہ تھا۔

۷)۔حضرت آدمؑ کو اسماء سکھانا دو طریقوں سے ممکن تھا:

الف: مسمیٰ کو کسی لحاظ سے عالم تعلیم میں حاضر کیا جائے اور پھر ان کے نام اسماء معین کئے جائیں یعنی مسمیٰ کا مشاہدہ کرنے سے ان کے نام معین کئے جائیں۔

ب: اشیاء کے خواص اور آثار کو بیان کر کے بغیر اس کے کہ ان کے مسمیٰ دکھائے جائیں،ان کے نام متعین کر دیں اور یہ بتایا جائے کہ یہ لفظ فلاں موجود کے لیے ہے جو اس طرح کی خصوصیت رکھتا ہو۔

بادی النظر میں حضرت آدمؑ کے بارے میں تعلیم کی ان دونوں قسموں کا احتمال ہے،لیکن ان تین ضمیروں کی وجہ سے جو ان جملات ”عرضھم“،”انبئھم باسمائھم“،”فلما انبأھم باسمائھم“ میں ہیں۔نیز ”باسماء ھؤلآء“ کے جملے میں موجود اسم اشارہ کی بنیاد پر یہ کہنا چاہیے کہ تعلیم کے وقت مسمیٰ حاضر تھے لیکن یہ مقام چونکہ آدم کی فضیلت کا مقام ہے اس لئے نہ فقط یہ کہ آدمؑ کو مسمیٰ کے ناموں سے آگاہ کیا گیا بلکہ ان کے وجودی خصوصیت اور ان کے مخصوص آثار سے بھی مطلع کیا گیا۔بعض کی رائے میں اس طریقہ سے آدمؑ کو فرشتوں پر برتری حاصل ہوگئی۔

۸)۔یہ تین آیات یقینی طور پر خلافت کے لیے حضرت آدمؑ کی قابلیت بیان کر رہی ہیں۔لہٰذا اس قانون کے تحت اس کی تفسیر کرنا چاہیے۔دوسرے الفاظ میں یوں کہ حضرت آدمؑ میں کسی ایسی صلاحیت و برتری کی تلاش کریں کہ جو فرشتوں میں نہیں پائی جاتی تھی۔

یہاں حضرت آدمؑ کے لیے دو ایسی خصوصیات متصور کی جا سکتی ہیں جو فرشتوں میں نہیں پائی جاتیں،ان میں سے ہر خصوصیت ایک تفسیر کی بنیاد پر ہے جو ہم تفسیروں میں دیکھتے ہیں۔

(۱)۔یہ برتری خود حضرت آدمؑ اور ان مسمیٰ سے مربوط تھی،جو ملائکہ کے سامنے پیش کئے گئے۔

(۲)۔یہ برتری خود حضرت آدمؑ سے متعلق تھی (علمی برتری)۔

ان میں سے ہر ایک خصوصیت اس طرح آیت کی تفسیر کی بنیاد بن سکتی ہے جن کی تشریح اس طرح ہے:

۱)۔مسمیٰ کی برتری اور امتیاز

حضرت آدمؑ کو اسماء کا علم دینے کے بعد اللہ نے فرشتوں کے سامنے ان کے مسمیٰ پیش کئے جو اس کے ان پاک خلفاء کے نورانی قالب تھے،جن میں ہر ایک علم و عمل کے لحاظ سے عالی ترین مرتبہ تک پہنچ کر مثالی انسان بن چکے تھے۔اس لیے وہ ایسی خلافت کے کاملاً مستحق تھے۔

اس تفسیر میں حضرت آدمؑ کے لیے خلافت قرار دینے کی وجہ ان کے وجودی امتیاز کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے امتیاز بھی امتیازات بھی

ہیں، جوان کی نسل کو حاصل تھے اور ملائکہ کو ان کے بارے میں علم ہو گیا۔ اس وقت ان سب نے اپنے فیصلہ کی کمزوری کا اعتراف کر لیا اور اس خلافت کا راز پنہاں انہیں معلوم ہو گیا۔ اس نظریہ کی تائید آیت کا ظاہر کر رہا ہے۔ کیونکہ تین چیزوں نے مذکورہ اسم اشارہ کا ظاہر یہ ہے کہ یہ مسمیٰ باشعور موجودات اور مکمل طور پر نورانی قالب تھے۔ بعض مفسرین نے جوان مسمیٰ سے تمام انواع مراد لیا ہے اور عاقل وغیر عاقل دونوں کو ان میں شامل کیا ہے۔ یہ آیت کے ظاہر کے خلاف ہے۔ اگر اس وسعت پر کوئی دلیل ہو بھی تو مقام استعمال میں غیر عاقل کی برتری کی بنیاد پر اس کی تاویل کی جاسکتی ہے چنانچہ بعض آیات میں مفسرین نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔[1]

علاوہ ازیں بعض مستند اور معتبر احادیث بھی جو شیخ صدوقؒ نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہیں اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں کہ اللہ نے اپنی تمام حجتوں کے نام حضرت آدمؑ کو سکھا دیئے۔ اس کے بعد ان میں جو بھی ارواح تھے انہیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور پوچھا: ”مجھے ان کے نام بتاؤ، اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ تسبیح وتقدیس کی وجہ سے تم آدمؑ سے زیادہ خلافت کے لائق ہو“۔ فرشتوں نے کہا: ”تو پاک ہے! اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے“۔ پھر اللہ نے آدمؑ سے کہا: ”فرشتوں کو ان کے نام بتاؤ“۔ جب فرشتے ان کے ناموں سے آگاہ ہوئے اور اس تعلیم کے ذریعے مسمیٰ دکھانے کی وجہ سے ان پر (بنی آدم) کی عظمت ومرتبہ آشکار ہوا تو انہوں نے سجدہ کیا کہ وہ ہستیاں زمین میں اللہ کا خلیفہ بننے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کے بعد انہیں (مسمیٰ) کو فرشتوں کی نگاہوں سے چھپا دیا، ان کی ولایت ومحبت کا وعدہ فرشتوں سے لیا اور فرمایا: ”کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ یقینا میں آسمانوں اور زمینوں کے پوشیدہ امور سے واقف ہوں اور وہ کچھ جانتا ہوں جس سے تم آگاہ نہیں ہو؟“۔[2]

ممکن ہے کہا جائے کہ جو کچھ اس روایت میں آیا ہے وہ مسمیٰ کا واضح نمونہ ہے، وگرنہ مسمیٰ کا دائرہ تو ان چیزوں سے کہیں بڑھ کے ہے جن کا ذکر اس روایت میں آیا ہے۔ ضمیر کی مشکل بھی اس ”تغلیب“ کے ذریعہ حل ہو جاتی ہے۔ اتفاق طور پر بعض روایات نے بھی مسمیٰ کی وسعت اور حجج خدا سے بھی ان کے دائرہ کے پھیل جانے کا ذکر کیا ہے۔ ان روایات کا مضمون دوسرے نظریہ میں بیان کیا جائے گا۔[3]

لیکن یہ سوال پھر باقی رہ جاتا ہے کہ اگر آدمؑ کی برتری کا معیار ان کے ذاتی کمالات اور ان کی نسل میں موجود حجتوں کی ذاتی برتری تھی اور ان کے لیے ان کے چناؤ کا سبب بھی یہی تھا تو پھر مسمیٰ کی اتنی زیادہ تعلیم کا کیا فلسفہ ہے؟

شاید تعلیم کی اس برتری میں حکمت یہ ہو آدمؑ اور ان کی نسل میں آنے والی ایسی حجتیں زمین پر ہدایت کے ضمیر دار اور انسانی معاشروں کے راہنماؤں اور اس طرح کی ہدایت وراہنمائی کا لازمہ یہ ہے کہ وہ طبیعت کی منطق اور کائنات کے اسرار سے آگاہ ہوں۔ اس لیے نہ فقط یہ کہ

---

[1] وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ......(النور۔۴۵)

[2] برہان، ج ۱ ص ۷۳ حدیث ۲

[3] برہان ج ۱ ص ۷۵ حدیث ۹، ۱۰، ۱۱

آدمؑ کو یہ عظیم علم حاصل ہو بلکہ ان کی نسل کے اندر جو پاک نورانی ہستیاں ہیں، وہ بھی اس علم کی حامل ہوں۔

یہاں تک ہم پہلے نظریہ اور آیات کے ظاہر سے ان کے منطبق ہونے سے آگاہ ہوئے۔ اس تفسیر میں آدمؑ کی خلافت کا سبب ان کے وجودی فضائل اور ان کی اولاد کی برتری کا پتہ چل گیا۔ یہ برتری ایک تکوینی و وجودی برتری ہے، نہ کہ فرشتوں کے مقابلہ میں آدمؑ کا علم، چاہے کہ اس کا علم ایسی حجتوں کے اسماء کی تعلیم میں منحصر ہو یا ان سے وسیع تر ہو۔

۲)۔ فرشتوں پر آدمؑ کی علمی برتری

اس تفسیر کے مطابق فرشوں پر آدمؑ کو علمی برتری حاصل تھی۔ یہ بات دو طرح بیان کی جا سکتی ہے:

(الف)۔ موجودات کے اسماء کی تعلیم

اللہ نے آدمؑ کو اس دنیا کی موجودات کے نام سکھا دیئے۔ [1]

یہ نام اور اسماء کیسے تھے، قرآن اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے، یعنی دنیا میں کوئی ایسا وجود نہیں تھا جس کا نام آدمؑ نے نہ سیکھا ہو۔ گفتگو کے وقت انہوں نے وہ الفاظ استعمال کئے اور پھر اپنی نسل تک منتقل کئے۔ اسے معمولی بات نہ سمجھا جائے کیونکہ اگر انسانوں کے درمیان معنی کے لیے کوئی لفظ معین نہ کیا جاتا تو دوسروں کی بات سمجھنے میں دشواری کے ساتھ ساتھ پہلے لوگوں کے آثار بھی آئندہ آنے والی نسلوں تک منتقل نہ ہو سکتے۔ وہ آیت جو "بیان" کو اللہ کی ایک عظیم نعمت قرار دیتی ہے وہ بھی شاید یہی معنی بیان کر رہی ہے:

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾

"خدائے رحمن نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اسے بیان کرنا سکھایا"۔ (رحمن۔ 1 تا 4)

ابوالبشر کو موجودات کے نام سکھانے کے بعد اللہ نے وہ (موجودات) فرشتوں کے سامنے پیش کئے اور ان سے ان کے نام بتانے کو کہا۔ جب فرشتوں نے اپنے عجز کا اظہار کیا تو پھر آدمؑ کو حکم دیا کہ وہ انہیں ان موجودات کے ناموں سے آگاہ کریں۔ جب انہوں نے انہیں آگاہ کر دیا تو اللہ نے ان سے کہا: کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان و زمین کی پوشیدہ باتوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو اسے جانتا ہوں "۔ لہٰذا آدمؑ کی برتری اسماء سے آگاہ ہونے اور فرشتوں کو ان کی تعلیم دینے سے واضح ہو گئی۔

اس نظریہ پر جو اعتراض ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی موجودات کے اسماء اور ناموں کی تعلیم اگرچہ ایک طرح کی فضیلت و برتری

---

[1] بعض مرسل روایات میں آیا ہے کہ امامؑ نے اس سوال کہ خدا نے آدمؑ کو کیا سکھایا تھا؟ کے جواب میں فرمایا: مختلف مقامات، پہاڑ، درّے، بیابان پھر امامؑ نے اپنے فرش کی طرف دیکھا اور فرمایا: اسے اس کے متعلق بھی بتایا گیا تھا" ایک اور روایت میں لفظ "اسماء" کا اضافہ کیا اور فرمایا: "بیابانوں، درختوں اور پودوں اور زمین کے پہاڑوں کے بارے میں بھی اسے بتایا تھا" (برہان ج ۱ ص ۷۵ حدیث ۹، ۱۰، ۱۱)

ہے، تاہم یہ برتری فرشتوں پر آدمؑ کی فضیلت کا معیار نہیں بن سکتی کیونکہ اگر فرشتوں کو بھی یہ تعلیم دے دی جاتی تو فضیلت کے اعتبار سے وہ بھی آدمؑ کے برابر ہوجاتے اور دونوں میں کوئی فرق نہ رہتا۔ حقیقت میں یہ اسی طرح ہے کہ انسان دو افراد میں سے، جو دونوں سیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ایک کا انتخاب کر کے اسے تعلیم دے، پھر اسے کہے کہ تم دوسرے شخص کو پڑھاؤ، واضح ہے کہ اس صورت پہلا شخص کوئی حاضر فضیلت نہیں رکھتا ہوگا۔ اسے صرف اتنی ہی فضیلت حاصل ہوگی کہ استاد نے اسے دوسرے پر ترجیح دی۔ دوسری طرف یہ بات بالکل نہیں کہی جاسکتی کہ فرشتے لغات والفاظ سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے کیونکہ مفروض یہ ہے کہ آدمؑ نے انہیں ان کی تعلیم دی تھی۔

علاوہ ازیں خلافت قرار دینے کے باب میں اللہ سے ان کی گفتگو بھی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ الفاظ سے آشنا تھے اور چیزوں کو پہنچانتے بھی تھے، زمین پر سابقہ انسانوں اور ان کے فساد و خون ریزی سے آگاہ تھے، صرف اتنی سی بات ہے کہ وہ تمام موجودات کے ناموں سے واقف نہیں تھے، آدمؑ کے ذریعہ انہوں نے وہ بھی سیکھ لئے۔ لہٰذا آدمؑ کو اسماء کی تعلیم کوئی اتنی بڑی فضیلت نہیں ہے جس کی وجہ سے آدمؑ خلافت کے مستحق بنائے جائیں اور فرشتوں میں وہ صلاحیت نہ ہو۔

(ب)۔ اسرار ہستی کی تعلم اور موجودات کے آثار سے آگاہی

اس نظریہ میں اس بات پر تاکید کی گئی ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو جو کچھ سکھایا تھا وہ صرف موجودات کے نام نہیں تھے بلکہ ان موجودات کے خواص اور اسرار سے بھی اسے آگاہ کیا تھا۔ وجود ذہنی کے اعتبار سے وہ ایک دوسری دنیا شمار ہوتی ہے۔ آدمؑ کو اس کام کے لیے انتخاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان اسرار و خواص کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، جب کہ فرشتوں میں اس طرح کی صلاحیت نہیں پائی جاتی تھی کیونکہ انسان کی تخلیق مختلف جبلیات اور مختلف روحانی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ یہ مادی جہت رکھنے کے ساتھ ساتھ معنوی جہت کا حامل بھی ہے۔ اللہ نے اس میں حیوانی غرائز کے ساتھ عقل وخرد جیسا گوہر بھی رکھا ہے۔ وہ زندگی کا سفر ان دونوں پہلوؤں کے ساتھ طے کرتا ہے۔ وہ اس طرح کا عجیب آمیزہ ہے جو اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ کائنات کے اسرار و موجودات کے مخصوص اثرات سے آگاہ ہو سکے جب کہ فرشتے صلاحیت کے اعتبار سے فقط ایک پہلو رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیق ہی اس طرح ہوئی ہے کہ وہ صرف ایک کام ہی انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المؤمنینؑ کے کلام میں ان کے مخصوص وجودی پہلو کی وضاحت کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ آدمؑ کی ایک عجیب صلاحیت تھی جس نے اسے تعلیم کا موقع عطا کیا اور خلافت کے قابل بنا دیا۔ فرشتے تمام علوم اور اسرار کو سیکھنے کے سلسلے میں صلاحیت کے محدود ہونے کی وجہ سے اس سے محروم رہے۔ لہٰذا فرشتے جب اس طرح صلاحیت کے حوالے سے آدمؑ کی برتری سے آگاہ ہوگئے تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔

اس کے علاوہ آدمؑ کی زندگی کا ماحول یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس جہان میں پیدا ہونے والی موجودات کے اسرار سے آگاہ ہوں۔ جس دنیا میں زندگی گذارنے کے لیے وہ پیدا ہوئے ہیں تاکہ عملی طور پر وہ سنگین ذمہ داری پوری کرسکیں۔ جو زمین کو آباد کرنا اور اس کے رازوں سے پردہ اٹھانا ہے۔ یہ کام فرشتوں کے بس کا نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اپنی تخلیق کی خصوصیات کے پیش نظر زمین پر زندگی گذارنے کی ذمہ داری نہیں نبھا سکتے تھے۔

اس نظریہ کے مطابق بھی آدمؑ کی برتری اور خلافت کا معیار اس کے علم کو قرار دیا گیا ہے، اگر چہ اس کا علم بھی عمل کا مقدمہ اور زمین کو آباد کرنے میں اس سے کام لینا ہے۔ تاہم اس نظریہ میں کچھ ابہامات پائے جاتے ہیں، ہم ان میں سے چند نکات کا یہاں ذکر کرتے ہیں، شاید اہل نظر ان پر غور کریں:

ا)۔ یہ نظریہ آیت کے ظاہری معانی کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ آدمؑ کو ''اسماء'' سکھائے گئے، نہ کہ موجودات کے اسرار، اسرار موجودات کو یہ دلیل بنا کر بڑھانا کہ لفظ سکھانا زیادہ اہم نہیں ہے، آیت پر اپنا نظریہ ٹھونسنا ہوگا۔ آپ آیت کے جملات ملاحظہ فرمائیں اور پھر اس کے بعد یہ نظریہ ان کے سامنے پیش کریں۔

''علم آدم الاسمآء''، ''انبئونی باسمآء ھؤلآء''، ''انبئھم باسمآئھم'' اور ''انبا ئھم باسمآئھم'' کی بالکل واضح تعبیرات کے باوجود ان کی تفسیر اسرار موجودات کے ساتھ کرنا آیت کے مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

۲)۔ فرشتوں میں ایسے موجودات بھی پائے جاتے ہیں کہ قرآن نے ایک آیت میں جنہیں ''فلمدبرات امرًا'' [۱] کے عنوان سے یاد کیا ہے اور ان کے لیے ایسے کام ذکر کئے ہیں علم کے بغیر جن کا انجام ممکن نہیں ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ اس طرح کے موجودات زمین کے پوشیدہ اور اس کے دائرہ کار سے آگاہ نہ ہوں حالانکہ وہ اس کائنات کو چلانے والے ہیں؟ ایک اور جگہ انہیں ''جنوذ'' اور غیبی لشکر قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ [۲]

''یہ اللہ کے غیبی لشکر تھے، جو مومنین کی مدد کے لیے آئے تھے''۔ (مدثر۔31)

اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ دنیا کے رموز سے بے خبر ہوں؟

۳)۔ جبرئیل امین جو وحی الٰہی لانے والے ہیں، جو حقیقت میں ایسا راز ہے جس کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کے سلسلہ میں ابھی تک انسان عاجز ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک انسان جتنا بھی اسرار ہستی سے باخبر نہ ہوں؟

اس نظریہ میں ابہام اس وقت اور کھل کر سامنے آجاتا ہے جب ہم فرشتوں کو اس ہستی کے مبادیٔ فیض قرار دیں اور یہ کہیں کہ یہ ہستی جہان غیب سے ان کے ذریعہ اس عالم مادہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ کیا فیضان کے ان وسیلوں کو بے خبر کہا جاسکتا ہے؟

البتہ ممکن ہے کہ ان فرشتوں سے مراد زمین کے بعض فرشتے ہوں جن کا علم محدود ہے اور وہ فقط ایک ہی بات کے حامل ہیں، وہ اس طرح کے اسرار ہستی سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

۴)۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ آدمؑ نے جو کچھ اللہ سے بلا واسطہ سیکھا تھا فرشتوں نے وہ ان سے سیکھ لیا۔ پھر وہ ورطۂ حیرت سے نکل آئے

---

[۱] نازعات۔۵

[۲] توبہ۔۲۶، احزاب۔۹ اور انفال۔۱۳ کی طرف رجوع کریں۔

اوران کی صلاحیت کی تصدیق کردی۔ یہ خوداس بات پر گواہ ہے کہ جو کچھ بیان ہوا ہے دونوں اسے سیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

بعض مفسرین یہی کہتے ہیں کہ فرشتوں نے صرف نام ہی سیکھے تھے نہ کہ مسمیٰ اور نہ کہ ذات کے حقائق، کیونکہ ان کی تخلیق محدودیت کے لحاظ سے انہیں اس طرح کی تعلیم کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔[1]

لیکن اس طرح کی تفسیر کوئی قرآنی دلیل نہیں رکھتی۔

مختصر یہ کہ مفسرین نے یہ بات قطعی سمجھ لی ہے کہ فرشتوں پر آدمؑ کی برتری علمی اعتبار سے تھی اور اسماء کی تعلیم سے حاصل ہونے والی فضیلت نے انہیں خلافت کی لیاقت عطا کی۔ اس لیے وہ مجبور ہوئے ہیں کہ دوسرے نظریہ میں انہوں نے فضیلت کو اس طرح بیان کیا ہے۔ بہت سے پہلے اور موجودہ مفسرین نے اسی نظریہ کا انتخاب کیا ہے۔

یہ وہ نظریات ہیں جو ہم نے اس تفسیر کے سلسلے میں ذکر کئے ہیں۔ لہٰذا پہلا نظریہ جو برتری کا معیار نسل آدمؑ میں برتر انسانوں کا ہونا قرار دیتا ہے۔ وہ آیت کے ظاہر سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے ہم گفتگو کے اختتام میں اس آیت کی یاددہانی کراتے ہیں: ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلاً''۔ (اسراء۔85)

---

[1] الفرقان، ج۱ص ۲۸۹

(۴)۔ آدمؑ مسجود ملائکہ

موضوع سے متعلق آیات

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى
وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ (البقرہ۔۳۴)

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ (اعراف۔۱۱)

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ
وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (اعراف۔۱۲)

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (حجر۔۲۹)

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ
السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ (الحجر۔۳۰،۳۱)

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ
لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ (الحجر۔۳۲،۳۳)

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ (ص۔۷۲)

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ (ص۔۷۳)

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ
كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾ (ص۔۷۵)

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ط خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝٧٦ (ص۔ ۷۲ تا ۷۶)

آیات کا ترجمہ

۱)۔ جب ہم نے فرشتوں سے کہا: ’’آدمؑ کو سجدہ کرو‘‘۔ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جس نے سرکشی کی اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

۲)۔ ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا: ’’آدم کو سجدہ کرو‘‘۔ پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

۳)۔ اللہ نے ابلیس سے کہا: ’’کس چیز نے تجھے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے روکا؟ جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا‘‘ وہ بولا: ’’میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا‘‘۔

۴)۔ جب میں اس کی تخلیق مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کو سجدہ کرو۔

۵)۔ سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں ہونے سے انکار کر دیا۔

۶)۔ اللہ نے کہا: ’’اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا؟ کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا‘‘۔

۷)۔ ابلیس نے کہا: ’’میں ہرگز اس انسان کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے کیچڑ کی کھنکھناتی تاریک مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۸)۔ جب میں اس کی تخلیق مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اسے سجدہ کرو۔

۹)۔ سب فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔

۱۰)۔ سوائے ابلیس کے کہ اس نے تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

۱۱)۔ اللہ نے کہا: ’’اے ابلیس! کس چیز نے تجھے اس کو سجدہ کرنے سے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟ کیا تو نے تکبر کیا تو بلند مرتبہ والوں میں سے تھا‘‘۔

(۱۲)۔ اس نے کہا: ’’میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے‘‘۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

آدمؑ کو اسماء کی تعلیم اور فرشتوں کے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے آدمؑ کی فضیلت ثابت ہوگئی۔ اس مسلم برتری کے بعد اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔ متعدد سورتوں میں اس غیبی امر کی طرف مطلق طور پر اشارہ ہوا ہے لیکن سورۂ بقرہ میں یہ بات ''تعلیم اسمائی'' ''وعلم آدم الاسمآء'' کے بعد ذکر کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۤ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴

''اس وقت ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ جس نے سرکشی کی، تکبر کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔ (بقرہ۔34)'' [1]

اس آیت کے آغاز میں اگرچہ لفظ ''فا'' نہیں آیا، جو ان دو واقعات کے درمیان ترتیب کی علامت ہوتا، لیکن آیات کا سیاق اور مضمون کا تناسب اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم تعلیم اسماء کے بعد ہی دیا گیا تھا۔ فرشتوں کے آدمؑ کو سجدہ کرنے کی داستان، جس سجدے سے ابلیس نے انکار کیا تھا، ہم اس کی تشریح درج ذیل ترتیب سے کرتے ہیں:

۱)۔ کیا فرشتوں کا سجدہ آدمؑ کے لیے تھا؟

مفسرین کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے کہ کیا فرشتوں کا سجدہ آدمؑ کے لیے تھا یا اللہ کے لیے۔ اگر پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں کو ایک طرف رکھ دیں تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم سے آدمؑ کو سجدہ کیا'' اور آدمؑ کے لیے برتری کے طور پر ذکر فرماتا ہے ''لِاٰدم'' میں لفظ ''لام'' استعمال کرنا یہ بتا رہا ہے کہ یہ خضوع اگرچہ اللہ کے حکم سے تھا لیکن صرف آدم کے لیے تھا۔ جہاں بھی لفظ ''سجدہ'' کے بعد ''لام'' لایا جائے تو وہ اس بات پر گواہ ہوتا ہے کہ لام کا مدخول ہی مسجود ہے۔ لیکن آدمؑ کو سجدہ کرنا اس کی عبادت اور پرستش کے معنی میں نہیں کیونکہ عبادت صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے اور ہم سب کہتے ہیں:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ

''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں''۔

لیکن یہ بات کہ آدمؑ پر سجدہ اس کی عبادت کا باعث نہیں بنتا۔ اس کے لیے ''عبادت'' کے معنی کی وضاحت اور اس کی حدود کا بیان کرنا

---

[1] آدمؑ کے سامنے فرشتوں کے سجدہ کرنے کی بات ان سورتوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے: اعراف۔۱۱، بنی اسرائیل۔۶۱، کہف۔۵۰، طہ۔۱۱۶ اور ص۔۷۳، ۷۴

ضروری ہے کیونکہ ہر موجود کے سامنے جھکنا اس وقت مسجود کی عبادت کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے جب ساجد مسجود کے سامنے معبود اور رب کے عنوان سے جھکے، مسجود کی ربوبیت اور معبود ہونے کے سلسلے میں اس کا عقیدہ صحیح ہو خواہ باطل ہو جیسا کہ بت پرستوں کے اپنے بتوں کے بارے میں عقیدہ تھا۔ بہر حال اس کے عمل کا سرچشمہ مسجود اور پروردگار سمجھنا ہے۔ اگر اس کے علاوہ ہو تو پھر سجدہ کو تعظیم ہی کہا جاتا ہے۔ اور اس میں عبادت کا رنگ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ عمل نامشروع ہو، لیکن ہر نامشروع عمل عبادت و پرستش کے اعتبار سے شرک نہیں ہوتا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اقرار عظمت خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو اگر اللہ معبود کے ساتھ نہ ہو، سجدہ صرف اس نظریہ کا حامل ہو کہ مسجود فضل وکمال کا مالک ہے اور اس سجدہ کا مقصد صرف تکریم ہے تو یہ عمل ہرگز دائرہ عبادت میں نہیں ہوگا۔ مثلاً یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں نے یوسفؑ کے سامنے سجدہ کیا جسے قرآن نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا

''یوسف اپنے والدین کو تخت پر لے گئے اور سب نے انہیں سجدہ کیا''۔ (یوسف۔100)

لیکن اس سجدہ کو یوسفؑ کی عبادت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے یوسف کا احترام و اکرام قرار دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ جو چیز عبادی سجدہ کو تعظیمی سجدہ سے جدا کرتی ہے وہ مسجود کے بارے میں ساجد کا عقیدہ ہے، اگر وہ مسجود کے خدا یا پروردگار ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو تو پھر تھوڑی سی تعظیم اور حاجت کے متعلق مختصر سی درخواست بھی عبادت ہوگی۔ اگر اس طرح کا عقیدہ نہ ہو تو پھر بڑی سے بڑی تعظیم بھی عبادت نہیں ہوگی، اگرچہ وہ سجدہ کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔

اسلامی شریعت میں غیر خدا کو سجدہ ہر عنوان سے حرام ہے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ اس طرح کی عبادت کی شکل بھی غیر خدا کے سامنے انجام دی جائے۔ آدمؑ کے زمانہ اور یعقوبؑ کی شریعت میں اس طرح کی پابندی نہیں لگائی گئی تھی ورنہ وہاں بھی ایسا نہ ہوتا۔

جن لوگوں نے عبادت کی حقیقت نہیں پہچانی اور احترام سے اس کو جدا نہیں کر سکے۔ وہ ہمیشہ اس طرح کے موارد میں مشکل اور غلطی کا شکار رہے ہیں۔ جو بات وہ یہاں کہہ سکتے ہیں وہ صرف اتنی ہے کہ چونکہ آدمؑ کو سجدہ اللہ کے حکم سے تھا اس لیے وہ عبادت کی کیفیت نہیں رکھتا۔ اس طرح کی بات کا نتیجہ یہ ہے کہ اس عمل کی حقیقت عبادت ہی تھی لیکن چونکہ اللہ نے حکم دیا تھا اس لیے اس میں کوئی مشکل نہ تھی۔

یہ بات کہنے والا اپنی بات کے غلط نتائج سے بے خبر ہے، کیونکہ اگر ایک عمل حقیقت میں عبادت ہو تو اللہ کا حکم اس کی حقیقت تبدیل نہیں کرتا۔ اگر آدمؑ پر سجدہ اللہ کے حکم سے ہٹ کر عبادت ہو تو اللہ کا حکم موضوع کو تبدیل نہیں کر سکتا نہ ہی اسے عبادت کے زمرہ سے نکال سکتا ہے۔ مشرکین اپنے برے اعمال کی نسبت اللہ کی طرف دیتے اور کہتے تھے:

وَجَدۡنَا عَلَيۡهَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا

''ہم نے اپنے باپ داداؤں کو اسی طریق پر پایا تھا اور خدا نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے''۔ (اعراف۔28)

قرآن اس فکر کو ٹھکراتا ہے اور فرماتا ہے:

قُلْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾

''کہہ دیجئے کہ اللہ برائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کی طرف اس چیز کی نسبت دیتے ہو جسے تم نہیں جانتے ہو؟''۔

(اعراف۔28)

نتیجہ یہ کہ جب بھی مقصد عمل آدمؑ کی عبادت ہو تو یقینی طور پر وہ شرک ہوگا اور اللہ کے غیر کی عبادت برائی کے زمرہ میں آتی ہے، جب کہ مذکورہ آیت کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ اس طرح کے کام کا حکم نہیں دیتا۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ آدمؑ کو سجدہ جو اس کے خدا ہونے کے عقیدہ کے ساتھ نہیں تھا، عبادت نہ تھا۔ اسی لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ دراصل اللہ کو سجدہ اور اس کی اطاعت آدمؑ سے اظہار محبت کے طور پر تھی [1]

یہ نظریہ قتادہ، علی بن عیسیٰ امالی اور بعض دوسرے مفسرین سے منقول ہے۔ [2]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سجدہ بذات خود عبادت ہے۔ لہٰذا غیر خدا کے لیے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے قرآنی آیات میں سجدہ کو اپنے ساتھ مخصوص سمجھنا قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ﴿۲۰۶﴾ السجدة ۱۲

''جو لوگ تیرے پروردگار کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت کے بارے میں تکبر نہیں کرتے، اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسے سجدہ کرتے ہیں''۔ (اعراف۔206)

یہ مفسرین مجبور ہیں کہ ''اسجدو الادم'' کی دو طرح تفسیر کریں، ایک یہ کہ ''لا'' یہاں پر غایت کے لئے ہے، یعنی سجدہ کے لیے تھا، وہ آدمؑ جسے اللہ نے فرشتوں کا استاد مقرر فرمایا۔ دوسری یہ کہ یہ لام انتفاع کے لیے ہے، یعنی آدمؑ کی تعظیم کے لیے سجدہ کرو۔ [3]

یہاں اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ سجدہ بذات خود عبادت نہیں بلکہ اسے عبادت کی ایک قسم کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا اس بات میں کوئی مانع نہیں کہ سجدے دو قسم کے ہوں، عبادت کے لیے سجدہ اور احترام کے لیے سجدہ جو شرک کا باعث بنتا ہے وہ پہلی قسم کا سجدہ ہے۔ نہ کہ دوسری قسم کا۔ دو آیات جو سجدہ کو اللہ کے لیے مخصوص قرار دیتی ہیں ان کی نظر اس سجدہ کی طرف ہے جو عبادت کے عنوان سے ہے اس بات پر

---

[1] نور الثقلین۔ ج ا ص ۴۹

[2] مجمع البیان۔ ج ا ص ۸۱۰

[3] لفظ ''ابلیس'' کے بارے میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ عربی کا لفظ ہے یا عربی زبان میں کسی دوسری زبان سے آیا ہے۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ ابلیس ابلاس سے مشتق ہے جو دور کرنے یا پرے دھکیلنے کے معنی میں ہے۔ اس سلسلے میں مجمع البیان ج ا ص ۸۱ کی طرف رجوع کریں۔

شاید یہ ہے کہ اسی آیت میں "وله یسجدون" کے جملے سے پہلے "لا یستکبرون من عبادته" کا جملہ لایا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ احترام کے عنوان سے بھی سجدہ حرام ہے کیونکہ روایات اس کی بھی تائید کرتی ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے:

وما ینبغی بشر ان یسجد ولو صح بشر ان یسجد لبشر لامرات المرأة ان تسجد لزوجها من عظم حقها

کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو سجدہ کرے۔ اگر انسان کا انسان کے لیے سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، خاوند کے بیوی پر بہت بڑے حق کی وجہ سے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان مفسرین نے آدمؑ کے قبلہ ہونے کو قبول نہیں کیا جب کہ دوسری طرف اس کے سامنے سجدہ کو بھی شرک قرار دیا ہے۔ اس لیے مجبور ہو کر انہوں نے دو ایسی تاویلیں کی ہیں جو آیت کے ظاہر سے دور ہیں، ایک یہ کہ "اسجدوا لادم" میں لام غایت کے لیے ہے، یعنی چونکہ اللہ نے اس طرح کی نعمت ہمیں دی ہے، اس لیے اس کے لیے سجدہ کر رہے ہیں۔

اس طرح کی تفسیر آیت کے ظاہر کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ ان دوسری آیات سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے جن میں اللہ نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ اللہ نے آدمؑ کی پیدائش سے پہلے اور اس سے پہلے کہ فرشتوں کے سامنے اس کا استاد ہونا واضح ہوتا، آدمؑ کے لیے سجدہ کرنے کی بات کی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝۲۸
فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ۝

"وہ وقت یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں کیچڑ کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا جب میں اس کی تخلیق مکمل کر لوں گا (اس کے اعضاء کو مناسب شکل دے دوں) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے سامنے سجدہ کرنا"۔ (حجر۔ 28، 29)

یہ اس وقت کی بات ہے جب فرشتوں کے سامنے آدمؑ کا نعمت ہونا واضح نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود ارشاد ہوتا ہے: "**فقعوا له**"، لام یہاں بھی استعمال ہوا ہے۔

بعض اوقات یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اصولی طور پر یہ سجدہ اللہ کے لیے تھا اور آدمؑ کے قبلہ کے طور پر معین کئے گئے تھے۔ لیکن یہ نظریہ آدمؑ کے لیے کسی خاص کرامت کی نشاندہی نہیں کرتا، جس کی وجہ سے ابلیس آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا، کیونکہ اسے قبلہ بنانے کا مقصد افراد کو ایک جہت عطا کرنا تھا کہ وہ سب ایک سمت میں اللہ کو سجدہ کریں، آدمؑ کی اتنی سی فضیلت ابلیس کے انکار کا باعث نہیں بن سکتی، اس کے ساتھ ساتھ

یہ تفسیر آیات کے ظاہر کے بھی خلاف ہے۔

۲)۔کیا سجدہ آدمؑ کے لیے تھا؟

بعض آیات کا ظاہر بتاتا ہے کہ فرشتوں کا سجدہ صرف آدمؑ کے لیے تھا جب کہ بعض دوسری آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ تمام انسانوں کے نمائندہ ہونے کے حوالہ سے تھا مثلاً یہ آیت:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪

''ہم نے تمہیں پیدا کیا، اس کے بعد تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جو سجدہ کرنے والوں میں سے نہیں تھا''۔(اعراف۔11)

اس آیت سے استفادہ کرنے کا طریقہ کار کہ یہ سجدہ پوری نوع انسان کو تھا، نہ صرف آدمؑ کو، یہ ہے کہ اس آیت میں آدمؑ کی تخلیق اور اس کی تکمیل کو تمام انسانوں کی تکمیل قرار دیا گیا ہے، اس پر شاید یہ بات ہے کہ محور سخن اگرچہ ابوالبشر آدمؑ کی تخلیق ہے اس کے باوجود یہاں جمع کی ضمیر لائی گئی ہے اور فرمایا ہے ''صورنکم'' اور ''خلقنکم''، لہٰذا فطرتاً یہ کہنا چاہیے کہ آدمؑ کو سجدہ تمام انسانوں کو سجدہ تھا۔

دوسری آیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ آدمؑ کے زمین پر اترنے کو تمام انسانوں کا زمین پر اترنا اور زمین میں اس کی زندگی و موت کو تمام انسانوں کی زندگی و موت قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ معنی ذہن میں آتے ہیں کہ آدمؑ کے لیے جو حکم ہوا ہے وہ تمام انسانوں کے لیے تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ㉔

''سب اتر جاؤ جب کہ تم میں سے بعض بعض کے دشمن رہو گے اور تمہارے لئے ایک معین وقت تک زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور فائدہ اٹھانا ہے''۔(اعراف۔24)

علیٰ ہذا القیاس ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ㉕

''تم زمین پر زندہ رہو گے، وہیں مرو گے اور وہیں سے اٹھائے جاؤ گے''۔(اعراف۔25)

یہ تمام باتیں اور خطاب اس وقت ہوئے تھے جب انسانوں میں آدمؑ و حواؑ کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا، یہی دونوں ایسے خطاب و

پیغام کا جواز فراہم کرتے ہیں، اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کی اساس بھی یہی تھی۔
یہاں اس بات پر ایک اور دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ یہ سجدہ آدمؑ کے ساتھ مخصوص نہیں تھا وہ یہ کہ آدمؑ کو سجدہ کا معیار وہ صلاحیتیں و فضائل تھے جو ان کی نسل میں پائے جاتے ہیں یا اس کا معیار آدمؑ کی فرشتوں پر علمی برتری ہے۔ ان دونوں معیارات میں سے کوئی بھی آدمؑ سے مخصوص نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا معیار ایک محدود دائرے میں اور دوسرا وسیع تر دائرے میں ہے، اگرچہ آدمؑ اور ان کی اولاد کے علم میں فرق موجود ہے۔

۳)۔ بارگاہ الٰہی سے دھتکارا ہوا ابلیس

آدمؑ کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دے دیا گیا، تمام فرشتوں نے اللہ کا حکم دل و جان سے تسلیم کر لیا، سوائے ابلیس کے کہ اس نے اس سلسلہ میں نافرمانی اور تکبر کیا، پھر اس نے آدمؑ پر اپنی برتری کو اس نافرمانی کی تاویل قرار دیا اور کہا: ''تو نے آدمؑ کو مٹی سے اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے''۔ اس وقت اسے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا اور بہشت سے اس کے نکل جانے کا حکم صادر ہو گیا۔ اس نے بھی اللہ سے قیامت تک کی مہلت کی درخواست کی، اس کی درخواست ''الی یوم وقت المعلوم'' کے عنوان سے مان لی گئی۔ اس وقت اس نے قسم کھائی کہ قیامت تک وہ اولاد آدمؑ کو گمراہ کرنے میں مصروف رہے گا۔ مندرجہ ذیل آیات ان مطالب کو بیان کر رہی ہیں:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

''وہ وقت یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں کیچڑ کی کھنکتی تاریک مٹی سے انسان پیدا کروں گا''۔ (حجر۔28)

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

''پھر جب میں اس کو مکمل کرلوں (اس کے بدن کو مناسب شکل دے دوں) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اسے سجدہ کرنا''۔ (حجر۔29)

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

''سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، جس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو''۔ (حجر۔30-31)

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

"اللہ نے فرمایا: اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں نہ ہوا"۔ (حجر۔۳۲)

ابلیس نے کہا:

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

میں ہرگز اس انسان کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے کیچڑ کی کھنکھناتی ہوئی تاریک مٹی سے پیدا کیا ہے"۔ (حجر۔33)

اللہ نے فرمایا:

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾

بہشت سے نکل جا کیونکہ تو ہماری بارگاہ سے دھتکارا ہوا ہے اور تو قیامت کے دن تک (ہمیشہ کے لیے) ہماری رحمت سے دور رہے گا"۔ (حجر۔34-35)

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾

"ابلیس نے کہا: پروردگار! مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیدے"۔ (حجر۔36)

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

"اللہ نے فرمایا: تجھے وقت معلوم تک مہلت دی جاتی ہے"۔ (حجر۔37،38)

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا
عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

"ابلیس نے کہا: پروردگار تو نے چونکہ مجھے گمراہ کیا ہے (آدمؑ کو سجدہ کرنے کے بارے میں تیرا حکم میری گمراہی کا باعث بنا ہے) میں زمین میں اولاد آدمؑ کے لیے باطل کو بنا سنوار کر پیش کروں گا سوائے تیرے پاک اور خالص بندوں کے"۔ (حجر۔39،40)

اللہ نے فرمایا:

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا
مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾

"یہ میرا سیدھا راستہ (دائمی قانون) ہے یقینا جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، سوائے ان

کے جو گمراہ ہونے والوں میں سے تیری پیروی کریں گے''۔(حجر۔41،42)

۴)۔کیا ابلیس فرشتہ تھا؟

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ابلیس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ،اس لیے اسے سجدہ کرنے والوں کے زمرہ میں شمار نہیں کیا گیا۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خطاب کے موضوع میں ابلیس بھی شامل تھا یا نہیں۔پہلی صورت میں اسے فرشتوں میں سے ہونا چاہیے جب کہ بعض آیات اسے ''جنوں'' میں سے قرار دیتی ہیں،ارشاد ہوتا ہے:

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ

''پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ جنوں سے تھا اور وہ اپنے پروردگار کی اطاعت سے نکل گیا''۔(کہف۔50)

چنانچہ اگر وہ خطاب میں شامل ہی نہیں تھا تو سجدہ کا حکم اس کے لیے کیسے ہوگا؟

قرآن مجید سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہیں تھا کیونکہ قرآن نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ جن تھا۔''کان من الجن''اس کے علاوہ اور آیات بھی اس مطلب پر گواہی دیتی ہیں۔قرآن ایک جگہ فرشتوں کی اس طرح توصیف فرماتا ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝۲۶ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝۲۷

''وہ ہرگز اللہ کی اولاد نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے ایسے معزز بندے ہیں جو گفتگو میں اس سے بات میں سبقت نہیں کرتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں''۔(انبیاء۔27)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۵۰ ۩ السجدة

''فرشتے اپنے پروردگار سے، جو ان سے برتر ہے، ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے''۔(نحل۔50)

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝۲۰

''دن رات اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور سستی سے کام نہیں لیتے''۔(انبیاء۔20)

یہ آیات فرشتوں کی خصوصیات بیان کرتی ہیں، ان آیات کالحن ایسا ہے جو تخصیص کے قابل نہیں ہے۔ ایک دوسرا شاہد یہ ہے کہ ابلیس کی اولاد ہے جو نر و مادہ کے باہمی ملاپ کا نتیجہ ہوسکتی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ

''کیا تم نے شیطان اور اس کی اولاد کو میری جگہ سر پرست بنالیا ہے؟''۔(کہف۔50)

ایک اور آیت انہیں مردوں اور عورتوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ

''اور انسانوں میں سے کچھ مرد جنوں کے کچھ مردوں سے پناہ مانگتے ہیں''۔(جن۔6)

ہم یہ جانتے ہیں کہ فرشتوں کے سلسلہ میں نر و مادہ، نیز ان کے آپس میں ملاپ کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی اولاد بھی نہیں ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ [1]

''فرشتے جو خدائے مہربان کے بندے ہیں، ان کو لڑکیاں کہتے ہیں، کیا انہوں نے ان کی خلقت خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، ان کی گواہی لکھی جارہی ہے اور ان سے پوچھا جائے گا''۔(زخرف۔19)

یہ آیات شیطان کے بارے میں اس طریقہ سے فیصلہ کرتی ہیں گویا اسے فرشتوں کے مقابل قرار دیتی ہیں، اب سوال سامنے آتا ہے، اگر ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا تو اللہ کے حکم میں وہ کیسے شامل ہوگیا حالانکہ مخاطب فرشتے تھے، یہاں دو جواب دیئے جاسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ملائکہ کے ساتھ رہنے کے لیے شیطان کو خصوصی حکم دیا گیا تھا، چنانچہ آیت کا ظاہر اس بات پر شاہد ہے:

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ

''کس چیز نے تجھے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھے اس کا حکم دیا؟''۔(اعراف۔12)

شیطان نے بھی یہ بات تسلیم کی اور اس کے بعد بہانہ پیش کرنے لگا۔ دوسرے یہ کہ فرشتوں کو اس وقت مخاطب کیا گیا، جب وہ اپنے مخصوص مقام (مقام قدس) پر تسبیح و تعریف میں مصروف تھے اور شیطان بھی ان کے ساتھ ان میں مصروف تھا۔ اللہ کا حکم اس طرح تھا کہ وہ ان

[1] سورۂ صافات کی آیت ۱۸۰، اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۰ بھی یہی مضمون بیان کررہی ہے۔

تمام کو شامل تھا جو اس جگہ موجود تھے۔[1]

جن لوگوں نے دوسری رائے اپنائی ہے انہوں نے اس آیت کے ظاہری تفسیر میں غلط تاویلیں کی ہیں جو کہتی ہیں کہ شیطان جنوں میں سے تھا۔ مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ جن سے مراد کوئی غیر مرئی چیز ہے، نہ کہ جن نامی کوئی مخصوص مخلوق، فرشتے بھی یہ خصوصیت غیر مرئی رکھتے تھے؟ کبھی انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جن بھی فرشتوں ہی کی ایک جماعت تھے[2] حالانکہ قرآن میں ''جن'' سے جو کچھ ذہن میں آتا ہے وہ وہی موجودات ہیں جو فرشتوں کے مقابلہ میں ہیں نہ کہ وہ چیز جو آنکھوں سے اس طرح پنہاں ہو کہ ملائکہ بھی اس کے زمرہ میں آ جائیں، نہ ہی ان کی کوئی خاص جماعت مراد ہے۔ اس لحاظ سے پہلا نظریہ زیادہ صحیح و مستحکم ہے۔

۵) تکبر اللہ کے مقابلہ میں تھا یا آدمؑ کے

ابلیس کے انکار سے متعلق تمام آیات یہ بتاتی ہیں کہ اس نے اپنے انکار کا راز اس طرح بیان کیا ہے:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

''میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدمؑ کو مٹی سے''۔ (اعراف۔12)

(اور آگ نورانیت و کارکردگی میں اس تاریک کیچڑ پر فضیلت رکھتی ہے جو صرف شکل ہی قبول کرنے والا ہے)۔ اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

''میں ہر گز اس بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جو کیچڑ کی تاریک کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے''۔ (حجر۔33)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اس نے نکار کیا، تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا''۔ (بقرہ۔34)

اب یہ دیکھنا ہو گا کہ شیطان کا انکار و تکبر اللہ کے سامنے تھا یا آدمؑ کے سامنے؟ آیات کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ اس نے آدمؑ کے سامنے تکبر و گھمنڈ کیا اور اپنی تخلیق کو آدمؑ کی تخلیق سے افضل قرار دیا۔ اگر آدمؑ کا واقعہ درمیان میں نہ ہوتا تو اللہ کی عبادت و پرستش اسی طرح ہمیشہ کے لیے جاری رکھتا۔ حضرت امیر المومنینؑ نے شیطان کی عبادت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

---

[1] المیزان، ج ۱، ص ۲۳۸

[2] مجمع البیان، ج ۳، ص ۴۷۵، المنار ج ۱ ص ۲۶۵

"فاعتبروا ماکان من فضل اللہ بابلیس اذأخبط عملہ الطویل وجھدہ الجھید وکان قد عبد اللہ ستۃ آلاف سنۃٍ لا یدری من سنیّ الدنیا أم سنیّ الآخرۃ عن کبر ساعۃٍ واحدۃٍ"۔ [1]

ابلیس کے عمل سے عبرت حاصل کرو، اللہ نے اس کے طویل عمل اور مسلسل کوشش کو بے وقعت فرمادیا، اس نے چھ ہزار سال اللہ کی عبادت کی اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ اس دنیا کے سالوں (جو کہ ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے) میں سے تھا یا آخرت کے سالوں میں سے، لیکن ایک لحظہ کے تکبر کی وجہ سے اس کا یہ طویل عمل رائیگاں ہوگیا۔

امامؑ کے کلام کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے تکبر نہیں کیا تھا بلکہ اس نے آدمؑ کے مقابلہ میں غرور کیا تھا جس کے سامنے اللہ نے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہوئی ہے آیا ہے:

"جب اللہ نے ابلیس کو سجدہ کا حکم دیا تو اس نے جواب میں کہا: میرے پروردگار! مجھے تیری عزت کی قسم! اگر تو مجھے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے معاف رکھے تو میں تیری ایسی عبادت کروں جس کی اب تک مثال نہ ملے گی"۔ [2]

دوسرا قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اگر ابلیس کے اندر تکبر وغرور نہ ہوتا تو وہ ہرگز اپنی آگ سے تخلیق اور آدمؑ کی مٹی سے تخلیق کو اللہ کے فرمان سے انکار کا بہانہ نہ بناتا۔ درست ہے کہ اس نے آدمؑ کے مقابلہ میں تکبر کا اظہار کیا، لیکن اس تکبر کی روح اور اس کا یہ گھمنڈ اللہ کے مقابلہ میں تھا، اس لئے جب اس نے اللہ سے یہ درخواست کی کہ اسے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے معاف رکھے تو اس کے بدلہ میں وہ بے مثال عبادت کرے گا، تو جواب آیا:

انی احب ان اطاع من حیث ارید

میں وہ اطاعت پسند کرتا ہوں جو میں خود چاہتا ہوں۔

اگر اس میں اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی روح ہوتی تو چاہیے تھا کہ وہ اللہ کا حکم کسی چون وچرا کے بغیر بجالاتا، کیونکہ آدمؑ کی پرواہ نہ کرنا ایک طرح سے اللہ کی توہین ہے۔ اسی لیے قرآن کریم انبیاء وآئمہ کی تکذیب کو خدا کی تکذیب قرار دیتا ہے۔ اگرچہ تکذیب کرنے والا بظاہر اللہ کی تکذیب نہ بھی کررہا ہو لیکن آخرکار یہ بات اللہ ہی کی تکذیب کی طرف لوٹتی ہے۔ چنانچہ قرآن ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۲ (قاصعہ)

[2] بحارالانوار، ج ۱۱ ص ۱۴۵ حدیث ۱۴

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴿۳۳﴾

ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تمہیں غمگین کر دیتی ہیں لیکن جان لے کہ وہ تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔(انعام۔33)

آدم کو سجدہ کے متعلق آیات اوراس سے ابلیس سے انکار سے متعلق آیات سے بھی ویسے شواہد سامنے آتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ اس نے مقام کبریائی کے سامنے تکبر و گھمنڈ کیا تھا۔

۱)۔کیونکہ اس نے مقدس مقام اور ملائکہ کے بلند درجہ سے آواز دی ''اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ'' اوراس نور مطلق کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کا نعرہ بلند کیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے تکبر سے کام لیا تھا وگرنہ حق تو یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے تکبر کو ایک طرف رکھ کے اس نور مطلق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا۔لہٰذا قرآن نے اس کی مذمت کرتے ہوئے یہ بات بھی یاد دلائی ہے کہ جو اس پاک مقام پر ہوا سے تکبر سے کام نہیں لینا چاہیے۔اس لیے اسے اللہ نے اپنی بارگاہ سے دھتکارا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ﴿۱۳﴾

حکم ہوا کہ اس مقام سے نیچے آ۔ تجھے وہاں تکبر سے کام لینے کا حق حاصل نہیں ہے پس نکل جا کہ تو رسوا ہونے والوں میں سے ہے۔(اعراف۔13)

۲)۔سجدہ کے حکم اور ابلیس کی مخالفت کے وقت قرآن نے دو نکتوں کی یاد دلائی ہے:

الف۔خدا کے حلم کا تذکرہ آدمؑ میں اپنی روح پھونکنے سے پہلے کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴿۷۲﴾

......جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اسے سجدہ کرنا۔(ص۔72)

حقیقت میں آدمؑ میں روح پھونکنے کی نسبت اللہ تعالیٰ خود اپنی طرف دیتا ہے اوراس طرح اسے کرامت عطا فرماتا ہے:

ب۔ابلیس کی مذمت کرتے وقت آدمؑ کو خود اپنی بنائی ہوئی چیز قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ﴿۷۵﴾

اے ابلیس! کس چیز نے تجھے اس کو سجدہ کرنے سے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟ کیا تو نے

تکبر کیا یا تو بلند مرتبہ والوں میں سے ہے۔ (ص۔75)

''خَلَقْتُ بِيَدَيَّ'' [1] کا کلمہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ موجود بلا واسطہ میری بھی مخلوق ہے، مجھ سے ہی متعلق ہے۔ اسے سجدہ کرنے کے سلسلہ میں تیرا انکار میری نافرمانی اور میری کبریائی کے مقابلہ میں اظہار تکبر ہے۔

آخر کار شیطان نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کی مخالفت کا سبب اس طرح بیان کیا:

لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

میں ہرگز اس بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے کیچڑ کی کھنکھناتی ہوئی تاریک مٹی سے پیدا کیا ہو۔ (حجر۔33)

ایک اور آیت میں وہ اپنے اور آدم کے وجود کی بنیاد بیان کرتے ہوئے اسی حوالہ سے اپنی برتری کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے:

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ

مجھے تو نے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (اعراف۔12)

اس سرکش نے اس طرح کا اعتراض کر کے کفر کی راہ اپنائی اور اپنی بنیاد پر غرور کر کے تعصب کا راستہ اختیار کیا۔ اس طرح اس نے اپنے آپ کو پہلا گنہگار اور اپنے گناہ کا پہلا قدم تکبر قرار دیا۔ قرآن میں اس کی باتوں کی واضح تردید بیان نہیں ہوئی۔ البتہ (نعوذ باللہ) اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے مقام پر سچا تھا بلکہ قرآنی آیات میں اس کی باتوں کی تردید کے بارے میں چند اشارے ملتے ہیں کیونکہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم، اس کی فضیلت کی بنیاد اور اس کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ یہ تو ان خصوصیات کی وجہ سے تھا جو آدمؑ کے اندر موجود تھیں۔ وہ خصوصیات یہ ہیں:

ا)۔ اللہ نے اس کے قالب میں خود اپنی روح پھونکی اور فرمایا:

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ

اور جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے سامنے سجدہ کرنا۔ (ص۔72)

۲)۔ اس کی خلقت پر اللہ کی عنایت تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ

کس چیز نے تجھے اس کو سجدہ کرنے سے منع کیا جسے میں نے اپنے ہاتھ سے خلق کیا؟ (ص۔75)

---

[1] ہم سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ اس طرح کے دوسرے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آدمؑ بلا واسطہ میری مخلوق ہے، نہ یہ کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں، جن سے اس نے آدم کی تخلیق کی ہے۔ تمام انسان زندگی میں اپنے تمام کاموں کی نسبت اپنے ہاتھوں کی طرف دیتے ہیں اگرچہ یہ کام دوسرے اعضاء کے ذریعے انجام پائے ہوں۔ اسی لیے قرآن نے تمام گناہوں کو 'ہاتھوں' کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد ہے: ''ذٰلك بما قدمت يداك وان الله ليس بظلامٍ للعبيد'' (حج۔۱۰) یعنی ''یہ سب کچھ تیرا ہی کیا دھرا ہے اور اللہ تو اپنے بندوں پر کبھی زیادتی نہیں فرماتا''۔

۳)۔اسماء کا علم سکھلانے یا عظیم انسانوں کا نقطہ آغاز بنانے کی وجہ سے انہیں ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔یقینی طور پر اس لحاظ سے وہ تمام فرشتوں اور شیطان پر برتری رکھتے تھے۔

علاوہ ازیں بنیاد کبھی بھی برتری کا معیار نہیں بن سکتی، بلکہ ہر موجود کے متعلق اس کے ذاتی کمالات دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیے۔مشک کی بنیاد ہی خون، الماس کی بنیاد کاربن گیس اور کوئلہ، جب کہ خوشبودار پھل کھاد کے مرہون منت ہوتے ہیں۔اگر معیار یہی ہو تو پھر یقین کے طور پر آدمؑ فرشتوں اور ابلیس پر برتری رکھتے تھے۔

٦)۔ابلیس کی مہلت کی درخواست

ابلیس نے دھتکارے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور درخواست کی کہ اسے قیامت کے دن تک کی مہلت دی جائے۔اللہ تعالیٰ نے ایک لحاظ سے اس کی درخواست قبول فرمالی اور ارشاد کیا:

اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ

تجھے ایک وقت معینہ تک مہلت ہے۔(اعراف۔15)

لیکن دوسری آیات میں اس مہلت کی مدت کو محدود کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

معین وقت تک مہلت دی جاتی ہے۔(حجر۔37، 38)

سورہ ص کی آیات ۷۸ اور ۷۹ بھی یہ مضمون بیان کرتی ہیں اسے قیامت تک مہلت نہ دینے کا سبب یہ ہے کہ دنیا کی تمام موجودات پہلی دفعہ صور پھونکنے کے وقت مرجائیں۔پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو وہ زندہ ہوجائیں گی۔

۷)۔دھتکارے ہوئے شیطان کا ردعمل

ابلیس کو اس مقام سے دھتکار دیا گیا، شاید اس کی سابقہ عبادت کی وجہ سے اسے وقت معین تک کی مہلت دی گئی اس لیے اس نے آدمؑ سے اپنی دشمنی کا اعلان کیا اور قسم کھائی کہ میں اولاد آدمؑ کے راستے پر بیٹھ کر انہیں جادۂ حق پر چلنے سے روکوں گا۔یہ بات مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔سورۂ حجر میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

اس نے کہا: ''پروردگار! تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، اس وجہ سے میں زمین پر ان کے لیے باطل کو سجا بنا کر پیش کروں

گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے پاک اور مخلص بندوں کے۔ (حجر۔39،40)

ایک اور سورۃ میں اس کے تسلط کی کیفیت اس طرح بیان ہوئی ہے:

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷

ابلیس نے کہا: ''میں ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے سے اور ان کے بائیں سے ان پر وارد ہوں گا (اور انہیں گمراہ کروں گا) اور تو ان میں سے اکثر کو شکرگذار نہیں پائے گا۔ (اعراف۔17)

ایک سورۃ میں یہی مطلب دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے:

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝۱۱۸ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ

ابلیس نے کہا: ''میں تیرے بندوں کا ایک معینہ حصہ ضرور لوں گا۔ انہیں گمراہ کروں گا۔ انہیں بڑی بڑی امیدیں بھی دلاؤں گا اور انہیں حکم دوں گا کہ جانوروں کے کان ضرور چھیدا کریں (جانوروں سے متعلق مشرکین کے بعض کاموں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر سورۂ مائدہ آیت ۳۰ میں آیا ہے) اور اس طرح اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو تبدیل کر ڈالیں''۔ (یعنی خدا پرستی کو بت پرستی میں بدل دوں گا)۔ (نساء۔118-119)

۸)۔ شیطان کا محدود تسلط

اگرچہ شیطان انسان کو گمراہ کرنے کا بڑا شیدائی ہے لیکن وہ خود بھی یہ جانتا ہے کہ تمام اولادِ آدمؑ پر اسے اختیار حاصل نہیں، وہ ان سب کو گمراہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے اس نے اللہ کے سامنے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے۔ بعض لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا اور ان کا ذکر ''مخلصین'' کے عنوان سے کیا ہے یعنی

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۴۰ (حجر۔40)

گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ مخلصین کے علاوہ دوسرے لوگوں پر اسے ایک قسم کا تسلط حاصل ہے لیکن اس کا تسلط (تفسیر جس طرح سے بھی کیا جائے) غیر مخلصین پر بھی بطور مطلق نہیں ہے۔ بلکہ شیطان سے محبت کرنے اور اس کی پیروی کرنے سے مشروط ہے۔ یعنی اگر یہ لوگ اس کی پیروی میں قدم بڑھائیں گے تو وہ اپنا تسلط استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان پہلے دن سے ہی اس کی بندگی و اطاعت کا طوق گلے میں نہ

ڈالے تو اس پر شیطان کا کسی قسم کا تسلط نہیں ہوگا۔ آیات میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے:

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾

ا)۔ تو میرے بندوں پر تسلط حاصل نہیں کر سکے گا۔ سوائے ان گمراہوں کے جو تیری پیروی کریں۔[۱] (حجر۔42)

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

۲)۔ جو مومن ہیں اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں ان پر وہ مسلط نہیں ہوسکتا۔

۳)۔ اس کا تسلط فقط ان لوگوں پر ہے جو اس کی ولایت قبول کرتے ہیں اور اسے اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ (نحل۔ 99۔ 100)

اس کا تسلط محدود ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پیروکار افراد پر بھی اس کا تسلط اس طرح نہیں ہے کہ وہ گمراہ بندوں کا اختیار بالکل اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یہ تسلط باطل کو سنوار کر پیش کرنا، برے کاموں کی طرف بلانا اور ان کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس طرح کا تسلط اگرچہ احساسات وغرائز کو ابھارنے میں مؤثر ہے لیکن قطعی طور پر اس طرح نہیں کہ ان کے عنان اختیار پر قبضہ کر لے۔ قرآنی آیات اس طرح ہی کے تسلط پر گواہ ہیں۔

قرآن نے بنی آدمؑ پر ابلیس کے تسلط کی کیفیت بیان کرنے کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کئے ہیں:

''لا زنین لهم الارض''، ''یوسوس فی صدور الناس''، ''ما کان لی من سلطنٍ الا ان دعوتکم''، ''قل رب اعوذبك من همزات الشیٰطین''، اور اس طرح کے دوسرے الفاظ جو سب کے تسلط کا دائرہ باطل کو بنا کر پیش کرنے اور ان کی طرف بلانے کی حد تک بیان کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ انسان کے بدن و روح پر قبضہ کر کے انہیں مغلوب بنا لے۔[۲]

آخر میں اس نکتہ کی یاددہانی ضروری ہے کہ قرآنی نصوص کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ آدمؑ کی سرگذشت کا مجموعی طور پر تعلیم اسماء سے لے کر ان مسائل تک جو بعد میں بیان کئے گئے ہیں جو عین حقائق ہیں تمام گفتگو و مذاکرات کو ان حقائق کا مناسب عکس سمجھیں جو دوسرے جہان میں موجود ہیں۔

---

[۱] ''ان عبادی لیس لك علیهم سلطن و کفیٰ بربك و کیلاً'' (بنی اسرائیل۔۶۵)۔ ''ما کان لی علیکم من سلطنٍ الا دعوتکم فا ستجبتم لی۔ (ابراہیم۔۲۲)

[۲] اس طرح کی آیات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل سورتوں کی طرف رجوع کریں۔ حجر۔۴۰، ابراہیم ۲۲ اور مومنون۔۹۸۔

بعض لوگ جو قرآن کے بلند مفاہیم میں غور و فکر کی توانائی نہیں رکھتے، وہ اس طرح کے موارد میں قرآنی حقائق سے استفادہ کرنے کی بجائے ان حقائق کو سمجھنے کا کام غیب کی دنیا کے سپرد کر دیتے ہیں اور ان پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں، گویا یہ بات متشابہات میں سے ہیں کہ بعض کے عقیدہ کے مطابق ان میں مطلوب ان کے وجود پر اور مقام وحی سے ان پر صادر ہونے پر ایمان لانا ہے۔

بعض دوسرے لوگ علوم طبیعی اور منطق حسی سے متاثر ہونے کی بناء پر تمام غیبی حقائق کو مادیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ اصولی طور پر شیطان کے حقیقت ہونے کا انکار کر چکے ہیں اور اس کی تفسیر انہوں نے نفس وانسانی جبلیات کے ذریعہ کر کے ان اختلافات ایک تمثیل قرار دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے وحی الہی کے کچھ حصوں کی تاویل کی ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہم تمام مفاہیم کو صحیح مناسبت سے جہان غیب کا ترجمان قرار دیں اور فرشتوں کے وجود، خدا کے انہیں حکم دینے ابلیس کے ایک حقیقی چیز ہونے اور اس کے ردعمل پر ایمان وعقیدہ رکھیں۔ جس نکتے کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ الفاظ چند غیبی حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ یہ تمام حقائق اس مقام کے مناسب تھے اور اس حد تک تفویض انسانی فکر وفہم کے معرفت سے معطل ہوجانے کا باعث نہیں بنتی۔ جو انسان بھی قرآن سے کسی قدر واقف ہو وہ یہ جانتا ہے کہ قرآن نے فرشتوں کے حقیقی وجود اور ابلیس کے حقیقی وجود کی تصریح فرمائی ہے۔ اس نے شیطان کو جبلت اور اندرونی تمایلات اور فرشتوں کو دنیا پر حکم فرما طبیعی قوانین قرار نہیں دیا۔ اگر کسی جگہ پر لفظ ''ملك'' ''طبیعی طاقتوں کے معنی میں استعمال ہوا بھی ہے تو وہ مجازی طور پر لایا گیا ہے۔ اس معنی میں نہیں ہے کہ سب جگہ اس کی اسی طرح تفسیر کی جائے۔

(۵) بہشت میں آدمؑ کی سکونت

موضوع سے متعلق آیات

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ (بقرہ۔۳۵)

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ (اعراف۔۱۹)

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾
فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾
اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾
وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ (طہ۔۱۱۷تا۱۱۹)

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ
مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ
الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ (اعراف۔۲۰)
وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾
فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (اعراف۔۲۰تا۲۲)

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا
يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ (طہ۔۱۲۰)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اور ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم اور تمہاری زوجہ بہشت میں سکونت اختیار کر لو اور تم دونوں اس میں بافراغت کھاؤ جہاں سے تمہارا دل چاہے لیکن اس درخت کے نزدیک نہ جاؤ ورنہ تم بے عمل کام کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

۲)۔اے آدمؑ تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور جہاں سے تم دونوں چاہو کھاؤ۔لیکن اس درخت کے نزدیک نہ جانا وگرنہ تم دونوں ستم گاروں میں سے ہو جاؤ گے۔

۳)۔ہم نے اس سے پہلے ہی آدمؑ سے عہد لیا تھا لیکن وہ بھلا بیٹھے اور ہم نے اسے عزم میں پختہ نہ پایا۔

۴)۔ہم نے کہا: اے آدمؑ! یہ (شیطان) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔پس کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے باہر نہ نکال دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔

۵)۔جنت میں تم نہ تو بھوکے ہو گے اور نہ ہی برہنہ۔

۶)۔نہ تمہیں وہاں پیاس لگے گی اور نہ گرمی کی اذیت پہنچے گی۔

۷)۔شیطان نے آدمؑ اور اس کی بیوی کو وسوسہ دلایا تاکہ ان دونوں کے ستر، جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھے، ظاہر کر دے ان سے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا مگر اس لیے کہ تم دونوں کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، یا ہمیش رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

۸)۔اس نے ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ تم دونوں کے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

۹)۔دھوکہ اور فریب کے ذریعہ انہیں اس درخت کی نشان دہی کی۔

۱۰)۔شیطان نے آدمؑ کو وسوسہ کیا اور کہنے لگا: اے آدمؑ کیا میں تمہیں ہمیشگی کے درخت اور ایسے ملک کی خبر دوں جو کبھی پرانا نہ ہو گا؟

آیات کی موضوعاتی تفسیر

یہاں تک فرشتوں پر آدمؑ کی برتری ثابت ہوگی اور شیطان بھی نافرمانی کے باعث اس بلند مقام سے نکال دیا گیا۔[۱]
اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے احترام اور عظمت کے پیش نظر سے یہ اجازت دے دی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہشت میں زندگی بسر کرے اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو، لیکن اسے ممنوعہ درخت کے نزدیک نہ جانا چاہیے۔

۱)۔ بہشت میں آدمؑ کی سکونت

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آدمؑ کی تخلیق کہاں کی گئی تھی؟ کیا انہیں بہشت کے علاوہ کسی اور جگہ لباس وجود زیب تن کیا تھا۔ پھر فرشتوں کے سجدہ کرنے اور شیطان کی نافرمانی کے بعد بہشت میں داخل ہوئے۔ یا یہ کہ پہلے دن سے ہی ان کی خلقت جنت میں ہوئی تھی اور سجدے کے بعد احترام کے طور پر انہیں مخاطب کیا گیا تھا کہ اسی مقام پر سکونت اختیار کر کے اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں؟ آیت کا ظاہر دوسرے نظریہ کی تائید کرتا ہے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: ''اُسْكُنْ'' یہ نہیں کہا جاتا ''اُدْخُلْ''۔
بعض کا خیال یہ ہے کہ ان کی تخلیق بہشت کے علاوہ کسی اور جگہ پر ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ بہشت میں داخل ہوئے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ ان کی تخلیق بہشت میں ہی ہوئی ہوتی تو پھر ''اُسْكُنْ'' کہنا درست نہ تھا کیونکہ مفروضہ یہ ہے کہ وہ وہیں رہ رہے تھے۔[۲]
اس نظریہ کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ بہشت میں رہنے کے حوالہ سے آدمؑ کی ذمہ داری واضح نہیں تھی اور اس سے پہلے وہ اسماء کی تعلیم فرشتوں کے سجدے اور شیطان کی نافرمانی کے وقت وہیں پر تھے۔ جب یہ واقعات مکمل ہوگئے تو ''اُسْكُنْ'' کے خطاب کے ذریعہ آدمؑ کی صورت حال واضح ہوگئی۔ لہٰذا وہ اسی بہشت میں رہنے لگے جس میں ان کی تخلیق ہوئی تھی۔
یہاں ممکن ہے ایک اور سوال سامنے آئے اور وہ یہ کہ جس بہشت میں آدمؑ کی تخلیق ہوئی تھی کیا وہ آخرت والی بہشت ہے یا دنیوی جنت۔ دوسرے مفروضہ کی بناء پر کیا وہ زمین میں تھی یا آسمان میں؟ اخروی بہشت کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے پہلے احتمال کی نفی ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن نے آخرت والی بہشت کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

اہل بہشت کو کوئی دکھ نہیں پہنچے گا اور وہ اس سے باہر نہیں آئیں گے؟ (حجر۔48)

---

[۱] پہلے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ شیطان اس مقدس مقام اور فرشتوں کی محفل سے نکال دیا گیا تھا۔ نہ کہ بہشت سے لیکن جب اس نے آدمؑ کو دھوکہ دیا تو پھر سب بہشت سے نکال دیئے گئے۔

[۲] تفسیر فرقان۔ ج ۱ ص ۳۱۳

پھر ارشاد ہوتا ہے:

لَّهُمۡ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿٢١﴾

ان کے لیے بہشت میں جاوداں نعمتیں ہیں۔ (توبہ۔21)

آئمہ معصومین کی روایات بھی اسی رائے کی تائید میں فرماتی ہیں۔ جب حسن بن بسام نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے آدمؑ کی بہشت کی حقیقت کے متعلق سوال کیا تو امام نے فرمایا:

''وہ دنیا کے باغات میں سے تھی اور اس پر سورج و چاند طلوع ہوتے تھے۔ اگر وہ آخرت کی بہشت ہوتی تو وہ ہرگز اس سے باہر نہ نکلتے۔''[1]

اس بات کے پیش نظر کہ یہ بہشت دنیا کے باغات میں سے تھی یہ کہنا ہوگا کہ زمین پر نہ تھی کیونکہ اللہ کے حکم کے خلاف ورزی کے بعد انہیں خطاب کیا گیا۔

اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿٣٦﴾

سب کے سب زمین کی طرف چلے جاؤ اس حالت میں کہ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن ہوگے۔ زمین تمہاری ایک مدت معین کے لیے قرارگاہ اور فائدہ اٹھانے کا وسیلہ ہے۔ (بقرہ۔36)

نتیجہ یہ کہ آدمؑ دنیاوی بہشت میں زمین کے علاوہ کسی اور جگہ پیدا کئے گئے اور انہیں وہیں ٹھہرایا گیا۔ اس کے بعد اللہ کے حکم کے خلاف ورزی کے باعث زمین پر اتار دے گئے۔ ان دونوں طرح کے ماحول کا فرق سورۂ طٰہٰ میں بیان کیا گیا ہے۔ جس بہشت میں وہ رہتے تھے اگرچہ دنیا ہی میں تھی، تاہم نعمتوں کی وسعت کے طفیل وہ کبھی بھی مشکل، بھوک اور پیاس کا شکار نہیں ہوئے، نہ ہی برہنہ ہوئے اور نہ سورج کی تپش کا انہیں سامنا کرنا پڑا، جب کہ دوسرے ماحول کی زندگی میں انہیں کئی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِيۡهَا وَلَا تَعۡرٰى ﴿١١٨﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَلَا تَضۡحٰى ﴿١١٩﴾

جنت میں تم نہ تو بھوکے ہوگے اور نہ ہی برہنہ نہ تمہیں وہاں پیاس لگے گی اور نہ گرمی پہنچے گی۔ (طہ۔۱۱۸،۱۱۹)

یہ آیات جو بہشت میں زندگی گذارنے کی خصوصیات بیان کر رہی ہیں، اس بات کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ دوسرے ماحول میں زندگی پہلے ماحول میں زندگی کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۱۷ میں لفظ ''تشقٰی'' اسی بات کو بیان کر رہا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] برہان۔ ج ۱ ص ۸۰ حدیث ۳۷۲

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

ہم نے کہا: اے آدمؑ! یہ (شیطان) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔ بس کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے باہر نہ نکلوا دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ (طٰہٰ۔۱۱۷)

اس بیان پر توجہ کرنے سے بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر اللہ فرشتوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ ارشاد فرماتا ہے کہ:

''اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً'' تو یہ زمین کے علاوہ کسی اور جگہ پر آدمؑ کی تخلیق سے منافات نہیں رکھتا کیونکہ یہ آیت آدم کی زندگی کے انجام کو بیان کر رہی ہے جس سے اللہ واقف تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آدمؑ اور ان کی اولاد کی تخلیق کا مقصد نہیں زمین پر ٹھہرانا تھا جس کے لیے ان مراحل کا طے کرنا ضروری تھا۔ ان مراحل کے طے کرنے میں بھی کئی رموز ہیں جو آدمؑ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوجاتے ہیں۔ اسے اپنے دشمن کو پہچان لینا چاہیے۔ اسے اور اس کی بیوی کو دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار ہوجانا چاہیے تاکہ دوبارہ اس کے دھوکہ کا شکار نہ ہوسکیں۔ نیز انہیں یہ بھی معلوم ہوجائے کہ عظیم انسان کا ٹھکانہ وہی بہشت ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی نہ کرے اور اگر ایسا کرے بھی تو توبہ اسے دوبارہ پہلے کمال کی طرف لوٹا سکتی ہے، یہ تمام تجربات آدم کے ان مراحل کے طے کرنے کے دوران حاصل ہوئے۔

۲)۔ درخت سے روکنا اور اللہ کا خبردار کرنا

آدمؑ کو خطاب ہوا کہ بہشت میں رہو۔ اس میں سب نعمتیں موجود تھیں۔ لیکن بعض مصلحتوں کی بناء پر آدمؑ کو ایک درخت کے نزدیک جانے سے روک دیا گیا۔ یہ درخت کیا تھا، اس کی حقیقت ہمارے لیے واضح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مختلف اقوال (تقریباً سولہ) بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ وہ علم و معرفت کا درخت نہیں تھا۔ اگر تورات [1] میں اسے شجرۂ علم و معرفت کہا گیا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ سابقہ آیات کے مطابق آدمؑ تمام اسماء کا علم حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے وہ علم و معرفت کے حوالہ سے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ لہٰذا یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ انہیں علم کے درخت کے قریب ہونے سے روک دیا گیا تھا؟ بعض تفاسیر میں اس درخت کی تشریح، انگور کی بیل، کھجور کے درخت، لیموں کے درخت اور گندم کے خوشے وغیرہ۔۔۔۔ کے ساتھ کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ سب رحمت و برکت ہیں۔ ہمارے لیے اہم بات یہ جاننا ہے کہ اس درخت سے دوری اختیار کرنے میں کیا مصلحت تھی گویا اس سے استفادہ کرنے پر کچھ مخصوص اثرات مرتب ہوئے جن کی طرف ہم آگے چل کر اشارہ کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے نہ فقط یہ کہ اسے درخت کے پاس سے منع کیا اور ''لتشقی'' کے جملے کے ذریعہ اس کے برے اثرات ذکر فرمائے بلکہ ان محرکات کا ذکر بھی کر دیا جو اسے (آدمؑ کو) دلدل کی طرف لے جاسکتے تھے اور فرمایا: اے آدمؑ! یہ (شیطان) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے

---

[1] تورات کی عبارات آخر میں ذکر ہوں گی۔

کہیں یہ تمہیں بہشت سے نکلوا نہ دے۔ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

۳)۔شیطان کا وسوسہ اور اس کا نتیجہ

شیطان نے اللہ سے گفتگو میں جس طرح بیان کیا تھا ،اسی طرح وہ آدمؑ اور اس کی بیوی کے سلسلہ میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔انہیں درخت سے استفادہ کرنے پر ابھارا اور اس طرح اس نے اپنی دشمنی کا مظاہرہ کیا۔اس کا استدلال یہ تھا کہ اس درخت سے استفادہ کرنا بہشت میں ہمیشہ رہنے کا باعث بن جائے گا۔اس نے اس پر ہی اکتفانہ کیا بلکہ قسم کھائی کہ وہ ان کا خیر خواہ و ہمدرد ہے۔قرآن نے شیطان کا یہ ہتھکنڈہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾

شیطان نے آدمؑ اور اس کی بیوی کو وسوسہ دیا تا کہ ان دونوں کے ستر، جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھے، ظاہر کر دے اور ان سے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا مگر اس لیے کہ تم دونوں کہیں فرشتہ نہ بن جاؤ، یا یہاں ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں۔(اعراف۔۲۰،۲۱)

یہاں آدمؑ کے دھوکہ کھانے کی کیفیت دو باتوں کے ذریعہ بیان کی جاسکتی ہے:

ا)۔شیطان نے اس راستے سے دھوکہ دیا جس کے نتیجے سے آدمؑ محبت رکھتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے بہشت میں رہے۔اللہ نے بھی ضمنی طور پر آدمؑ سے اس بات کا وعدہ فرمایا تھا:

اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

یہ شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے کہیں یہ تمہیں بہشت سے نہ نکلوا دے کہ تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔(طہ۔۱۱۷)

شیطان نے بھی اسی راستے سے حملہ کیا اور کہا:

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں ہمیشگی کے درخت اور ایسی حکومت کی خبر دوں جو کبھی فنا نہ ہوگی۔ (طٰہٰ۔۱۲۰)

حقیقت میں شیطان نے آدمؑ کی پسندیدہ چیز کو پہچان کر اسی کے ذریعہ دھوکہ دیا۔

سورۂ اعراف میں موضوع مزید وضاحت سے اس طرح بیان ہوا ہے:

''تم جو ہمیشہ رہنے والی زندگی اور فنا ناپذیر حکومت چاہتے ہو تو ان کے حصول کے لیے اس درخت کا پھل کھاؤ اور اگر اللہ نے تمہیں اس سے روکا تو اس کی وجہ بھی یہی کہ تم اپنی اس آخری آرزو تک نہ پہنچ پاؤ''۔

قرآن نے اس کی بات اس طرح بیان کی ہے:

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰

تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے اس لیے روکا ہے کہ تم دونوں کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا عمر جاوداں نہ پالو۔ (اعراف۔۲۰)

اس کے بعد اس نے اپنے فریب کے ساتھ قسم بھی کھائی۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۱

اور اس نے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیرخواہ ہوں۔ (اعراف۔۲۱)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آدمؑ کے دھوکہ کھانے کا سبب کیا تھا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس تصریح کے باوجود کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔

۱)۔ ایک جاوداں زندگی اور فرشتوں کی طرح فنا ناپذیر حکومت آدمؑ کا مطمع نظر تھا اور شیطان بھی اسی راہ سے وارد ہوا

۲)۔ شیطان نے اپنے ہمدرد ہونے پر قسم کھائی جب کہ آدمؑ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے۔

یہ دونوں باتیں سابقہ حالت نسیان کا زینہ ہموار کرتی ہے۔ قرآن نے اس نسیان کا تذکرہ دو طرح سے کیا ہے۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۝

دھوکہ اور فریب سے ان کی راہنمائی اس درخت کی طرف کی۔ (اعراف۔۲۲)

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝۱۱۵

ہم نے اس سے پہلے آدمؑ سے عہد لیا تھا لیکن اس نے بھلا دیا اور ہم نے اس میں عزم مستقل نہ پایا۔ (طہ۔۱۱۵)

۳)۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ کا وہ عہد کیا تھا جسے شیطان نے دھوکہ کے ذریعے بھلا دینے کی راہ ہموار کی؟ یہ عہد ان تین باتوں میں سے ایک ہوسکتی ہے:

(الف)۔ درخت کے پاس جانے سے روکنا۔ ''وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ''۔ (بقرہ ۳۵)

(ب)۔ شیطان کی دشمنی کے متعلق اللہ کا خبردار کرنا۔ ''اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ''۔ (طٰہ۔۱۱۷)

(ج)۔ شیطان کی قطعی اطاعت نہ کرنے کے سلسلہ میں انسان کو خبردار کرنا۔ ''اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (یس۔۶۰)

پہلا احتمال بہت بعید ہے کیونکہ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آدمؑ اللہ کی نہی کو بھلا بیٹھے ہوں حالانکہ شیطان نے آدمؑ کو فریب دینے کی راہ ہموار کرتے ہوئے اللہ کی یہ نہی بھی یاد دلائی تھی۔ ''مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا''

آدمؑ کی داستان سے متعلق آیات کے لحاظ سے دوسرا احتمال حقیقت کے قریب تر ہے کیونکہ یہ ایک خصوصی عہدہ تھا بلکہ عمومی، خصوصی عہد دراصل آدمؑ اور ان کی بیوی سے شیطان کی دشمنی تھی، اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ، اگر ہم اس بات پر خصوصی توجہ کریں کہ سورۂ طٰہ میں اس عہد کو بھلانے کا تذکرہ کرنے والی آیت کے بعد شیطان کی دشمنی کا ذکر کیا گیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: ''اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ'' اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ معتبر ہونے کے حوالہ سے تیسرا احتمال دوسرے درجے پر ہے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ اللہ کا اتنا پختہ عہد ہونے کے باوجود آدمؑ نے شیطان کی بات کیسے مان لی حالانکہ اللہ نے اسے خبردار کیا تھا کہ ''فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى'' اس نے اس بات پر توجہ نہ کی اور شیطان کی اس بات پر توجہ کی جس نے یہ کہا: ''هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى''

گذشتہ بات سے اس کا جواب بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ آدمؑ پاک فطرت کے ساتھ پیدا کئے گئے تھے جب ان کا سامنا شیطان کے اس فریب سے ہوا جو اس کی پسندیدہ شئ کے بارے میں بتاتا ہے۔ تو عبودیت کے باعث لامحالہ طور پر نسیان، فراموشی اور بے توجہی کی کیفیت ان پر طاری ہوگئی اور وہ درخت کے نزدیک چلے گئے۔ وہ درخت آدمؑ کی مصیبت اور دکھ کا باعث بنا کیونکہ اس درخت کا پھل کھانے کے بعد آدمؑ اور ان کی بیوی کا بہشتی لباس اتر گیا۔ ان دونوں کے ستر ظاہر ہوگئے اور یہ ان کے جنت سے نکل جانے کا باعث بنا۔

(٦) نصیحت الٰہی کی مخالفت

موضوع سے متعلق آیات

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ (بقرہ۔٣٦)

......فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ (اعراف۔٢٢)

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ۖ (طٰہٰ۔١٢١)

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ (البقرہ۔٣٧)

آیات کا ترجمہ:

١)۔شیطان نے ان دونوں (آدم وحوا) کو پھسلا یا اور جس نعمت میں وہ تھے اس سے انہیں نکال دیا۔

٢)۔جب اس درخت کے پھل کو چکھا تو ان دونوں کے ستر کھل گئے اور وہ دونوں جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے،ان کے پروردگار نے ان کو آواز دی:''کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور تم سے نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟''۔

٣)۔دونوں نے اس درخت کے (کے پھل میں سے) کھا لیا تو ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہوگئیں اور وہ دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانپنے لگے۔اس طرح آدمؑ نے اپنے پروردگار کے حکم کی خلاف ورزی کی اور پریشان ہوا۔

۴)۔آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کلمات سیکھے اور اس طرح اس نے توبہ کی اللہ یقیناً توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

آدمؑ کی داستان سے متعلق آیات سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ آدمؑ نے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے سے متعلق اللہ کی نہی کی خلاف ورزی کی۔یہ حقیقت مختلف تعبیرات کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں،مثلاًذاقا الشجرۃ(اعراف۔۲۲)،فاکلا منھا (طٰہٰ۔۱۲۱)،عصیٰ اٰدم ربہ(طٰہٰ۔۱۲۱)،بہرحال انبیاء کی عصمت کے جو لوگ قائل نہیں ہیں آدمؑ کی یہ داستان ان کے لیے بہت بڑا ثبوت ہے۔جو چیزیں ان کے لیے استدلالوں کا کام دے سکتی ہیں وہ یہ ہیں:

الف۔عصمت اور قرب درخت سے روکنا:

۱)۔آدم نے اللہ کی ممانعت:"وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کی خلاف ورزی کی اور مؤلد نہی کی مخالفت گناہ کا باعث بنتی ہے جو عصمت کے منافی ہے۔

اس استدلال کے جواب میں اس بات کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ نہی الٰہی اس کے امر کی طرح دو قسم پر ہے:

۱)۔وہ حکم دینے والے اور روکنے والے حاکم کے عنوان سے بات کرتے ہیں اور مخاطب کو محکوم قرار دیتے ہیں۔ان حالات میں ان امر و نہی مولیٰ ہونے کی حیثیت سے ہوتے ہیں۔اگر یہ نہی مؤکد ہو تو اسے "مولوی تحریمی" اور اس کے علاوہ اگر ہو تو اسے مولوی تنزیہی(کرامت) کہا جاتا ہے۔اکثر اوامر اور نواہی اسی طرح ہیں۔"نہی مولوی تحریمی" کی مخالفت عتاب کا باعث بنتی ہے۔جب کہ "نہی مولوی تنزیہی" کی مخالفت روح وقلب کی تاریکی کا باعث بنتی ہے لیکن اس کا نتیجہ عذاب کی صورت میں نہیں نکلتا۔

۲)۔حکم دینے والا اور روکنے والا وعظ ونصیحت کرنے کے عنوان سے بات کرے اور یہ کوشش کرے کہ وعظ ونصیحت کے ذریعہ اور عمل کے طبعی اثرات کا ذکر کرکے ایک کام کی طرف بلائے یا اس سے روکے۔اس صورت میں امر و نہی کو ارشادی کہتے ہیں۔اس کا اثر بھی صرف عمل کا طبیعی نتیجہ ہی ہوگا؟عذاب کا باعث بھی نہیں بنتی۔

اب یہ دیکھنا ہوگا کہ"وَلَا تَقْرَبَا" کی آیت میں آنے والی نہی کس قسم کی ہے؟کیا اللہ نے مولیٰ اور حاکم ہونے کے حوالے سے آدمؑ کو روکا یا وعظ ونصیحت اور راہنمائی کے حوالے سے؟اگر پہلے عنوان سے ہو تو اس کی نہی کی مخالفت عصمت کے منافی ہوگی اور گناہ کا باعث بنے گی۔لیکن اگر دوسرے عنوان سے ہو تو اس کی مخالفت کا نتیجہ لفظ عمل کا طبعی اثر ہی ہوگا،اس کے علاوہ اس کا نتیجہ کچھ اور نہ ہوگا،نہ ہی یہ گناہ کا باعث ہوگی اور عصمت کے منافی بھی نہیں ہوگی۔

درخت سے روکنے کے بارے میں جو آیات ہیں ان میں ایسے شواہد پائے جاتے ہیں،جو واضح طور پر یہ بتاتے ہیں کہ گفتگو کا لہجہ

نصیحت والا ہے نہ کہ حاکمیت اور مولیٰ کے عنوان سے گفتگو کرنے والا، وہ شواہد یہ ہیں:

۱)۔سورۂ طٰہٰ میں جب اللہ نے اسے (آدمؑ کو) اس کام سے روکا تو ارشاد فرماتا ہے:

يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

ہم نے کہا کہ اے آدمؑ یہ (شیطان) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے کہیں یہ تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے کہ تم مشکل میں گرفتار نہ ہو جاؤ، (اب یہ نعمت نصیحت تمہارے پاس ہے کہ) بہشت میں تم ہرگز بھوکے نہ ہو گے اور نہ برہنہ رہو گے۔(طٰہٰ۔۱۱۷ تا ۱۱۹)

یہ تینوں آیات سورۂ بقرہ کے اس جملے ''ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظلمين ''(اس درخت کے قریب مت جانا کہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے) کہ جگہ لیتی ہیں دونوں آیات میں مقصد کے ایک ہونے کی بناء پر یہاں ظلم سے مراد ایک بے جا کام ہے، نہ کہ قانون شکنی اور غیر کی حدود کو توڑتا۔

دوسری آیت کا مطلب سورۂ طٰہٰ کی تین آیات سے حاصل کیا جا سکتا ہے، یہ تینوں آیات یہ بیان کر رہی ہیں کہ کلام الٰہی کا لہجہ مکمل طور پر ناصحانہ ہے، نہ کہ نہی مولوی والا۔اس سے بالاتر محبت آمیز لہجہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے:

الف۔اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ

ب۔فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ

ج۔فَتَشْقٰى

یہ جملات اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ اس نہی کا اثر بہشت سے نکلنا اور مصیبت و دکھ بھری زندگی میں داخل ہونا ہے۔اس وقت بہشت میں موجود نعمتوں کو گننے سے دنیوی مشکلات کو جو بھوک و ننگ، پیاس اور سورج کی گرمی پر مشتمل ہیں واضح ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا ان جملات کے پیش نظر یہ کہنا چاہیے کہ ''وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ'' ایک نصیحت آمیز بات ہے اور ظالمین سے مراد بے محل کام کرنے والا ہے جس کا نتیجہ مشکل اور تکلیف ہے، لفظ ''ظالم'' کے متعلق ہم آگے مزید گفتگو کریں گے۔

۲)۔اس بات پر دوسرا شاہد کہ اللہ نصیحت و راہنمائی کے مقام پر تھا نہ کہ وہ نہی مولوی تھی شیطان کی گفتگو ہے، جو قرآن نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾

شیطان نے ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارا شفیق و ہمدرد ہوں۔(اعراف۔۲۱)

۳)۔جب آدمؑ اور حوا نے درخت کے پھل کو چکھا اور ان کا بہشتی لباس اتر گیا تو اللہ نے انہیں پکار کر کہا:

اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلۡ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ○

کیا میں نے تمہیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔(اعراف۔۲۲)

اس گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نہی کا مقصد یہ تھا کہ ان کو اس طرح کے حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب انہوں نے اپنے عمل کا نتیجہ دیکھا تو پھر ایک شفقت بھری ناصحانہ آواز ان کے کانوں میں پڑی کہ کیا میں نے تمہیں یہ کھانے سے روکا نہیں تھا؟ کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے؟

۴)۔قرآن نے آدمؑ اور حوا کا تذکرہ اس طرح بیان کیا ہے:

شیطان نے ان دونوں (آدمؑ اور حوا) کو پھسلایا اور انہیں آسائش سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔(بقرہ۔۱۳۶)

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس نعمت سے محروم ہو گئے۔ گویا جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا وہ ہو گیا۔

یہ تمام شواہد اس بات پر گواہ ہو سکتے ہیں کہ یہ نہی ارشادی تھی۔ جو لوگ اس نہی کو مولوی تنزیہی (کراہت) قرار دینا چاہتے ہیں ان کی بات آیت میں آنے والی تاکید کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

بعض نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ مخالفت گناہ نہیں ہے یوں کہا ہے: اگر وہ خلاف ورزی واقعی گناہ ہوتی تو توبہ کے ذریعہ اس کا اثر ختم ہو جانا چاہیے تھا اور آدمؑ اور حوا کو توبہ کے بعد دوبارہ بہشت میں آ جانا چاہیے تھا۔[۱]

ان لوگوں کے جواب میں یہ کہنا چاہیے کہ توبہ فقط حساب کتاب کو ختم کرتی ہے نہ کہ عمل کے طبعی اثر کو بھی۔ لہٰذا بہشت سے نکلنا ایک طبعی اثر تھا۔ نہ کہ اللہ کی طرف سے مواخذہ۔

ب۔عصمت اور آدمؑ کی لغزش

سورۂ بقرہ میں آدمؑ کے عمل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے یہ جملہ آیا ہے: ''فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ''۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ عصمت کا لغزش کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح مولیٰ کی نہی کی مخالفت لغزش سمجھی جاتی ہے اسی طرح ناصح کی نصیحت کی مخالفت بھی لغزش کے زمرے میں ہی آتی ہے۔

---

[۱] المیزان ج ا ص ۱۳۲۔ تہرا چاپ

ج۔عصمت اور ’’ظلمنا انفسنا‘‘ کا جملہ [1]

پشیمانی کے وقت آدمؑ اور حوا کی یہ بات بھی عصمت کے مخالفین کے ہاتھوں ایک ثبوت کے طور پر سمجھی گئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ کس طرح معصوم ہو سکتے ہیں حالانکہ انہوں نے خود اپنے ظلم کا اقرار کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں ظلم حد سے بڑھ جانے اور چیز کو بے محل [2] جگہ پر رکھنے کو کہتے ہیں۔حضرت آدمؑ کا فعل اس کی تفسیر جس طرح بھی کریں ایک طرح اپنی حد سے تجاوز اور بے موقعہ کام تھا۔اس کے معنی یہ نہیں کہ آدمؑ نے اللہ کے قانون کی خلاف ورزی کی اور گنہگاروں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔اس بیان سے سورۂ بقرہ آیت ۳۵ میں آنے والے جملے ’’فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ‘‘ کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔البتہ مروجہ اصطلاح میں ظالم وستمگر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو قانون شکنی کر کے حدود الٰہی سے تجاوز کرے یا دوسروں کے حقوق کو پامال کرے۔جن آیات نے ظالم کی مذمت کی ہے وہ بھی اسی طرح کے مظالم کا تذکرہ کرتی ہیں اگرچہ لغت عرب میں ظلم اس قسم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔عربی زبان کے شاعر عرب کے مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے نے اپنے باپ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وبآبه اقتدى عدى فى الكرم
ومن يشابه ابه فما ظلم

عدی نے اپنے باپ (حاتم) کی پیروی کی ہے اور جو اپنے باپ جیسا ہو اس نے ظلم نہیں کیا۔

مراد یہ ہے کہ اس کی تخلیق مکمل طور پر ایک مطلوب بہ آفرینش تھی اور اس میں کوئی بے محل کام نہیں ہوا۔

یہ بات اس وقت مزید واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ جان لیں کہ آدمؑ کے متعلق نفس پر ظلم کی بات کی گئی ہے۔قرآن نے برے کام کے مقابلہ میں نفس پر ظلم کرنے کو قرار دیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١١٠﴾

جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔(نساء۔۱۱۰)

د۔عصمت اور ’’عصیٰ، غویٰ اور تاب‘‘ جیسے الفاظ

---

[1] اعراف۔۲۳

[2] لسان العرب۔مادہ عرب

بعض لوگوں نے الفاظ کے مروجہ معانی سے دھوکہ کھاتے ہوئے یہ تصور کیا ہے کہ آدمؑ نے عصمت کے مخالف کام کیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی اپنے بنیادی معنی، نہ کہ وہ معنی جواب ذہن میں ہیں، کے پیش نظر ان کے گنہگار ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

عصیان: لغت عرب میں مخالفت کے معنی میں ہے۔ اونٹ کا وہ بچہ جو اپنی ماں سے جدا ہو جاتا ہے اسے عربی زبان میں 'عاصی' کہتے ہیں۔ کہ ہر مخالفت کو اصطلاح میں گناہ نہیں کہا جاتا کیونکہ جب انسان ناصح کی بات نہیں سنتا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے ناصح کی باتوں کی مخالفت کی ہے حالانکہ اسے گنہگار کہا جاتا۔[1]

غوی: لغت عرب میں نقصان، خسارے، محرومیت، مایوسی، گمراہی اور بھٹکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سے آپ جو معنی بھی لے لیں اس کا لازمہ گناہ نہیں ہے۔ فرض کیجئے غوی ''غی'' سے ماخوذ ہے جو ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ○

صحیح راستہ ٹیڑھے راستہ سے جدا اور آشکار ہو چکا ہے۔ (بقرہ۔۲۵۶)

جب کہ ہدایت کے خلاف ہر کام کو گناہ نہیں کہا جاتا۔ جو شخص تعلیم، کاروبار، ملازمت، شادی، یا خاندان کی تشکیل کے سلسلے میں ناصح کی بات پر کان نہ دھرے وہ مطلوبہ مقصد تک نہ پہنچنے کی وجہ سے یقیناً گمراہ تو ہوگا لیکن گنہگار نہیں۔

جو بھی آدمؑ کی کہانی کا بغور مطالعہ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر خلیفہ کے طور پر پیدا کیا، اسے اسماء کی تعلیم دی، فرشتوں کا استاد بنایا اور سب کو یہ حکم دیا کہ اسے سجدہ کریں، شیطان کو اس لیے دھتکار دیا کہ اس نے آدمؑ کا احترام کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے بعد اسے نعمت سے معمور ایک جگہ پر ٹھہرایا اور اسے شیطان کی دشمنی سے آگاہ کیا۔ پھر یہ دیکھا کہ یہ شیطان کے دھوکہ میں آکر اس درخت کا پھل کھا چکا ہے۔ لہٰذا فرماتا ہے کہ وہ تمام نعمتیں کھو دینے کی وجہ سے گھاٹا کھانے والا ہو گیا۔ اس نے اپنی متاع ضائع کر دی اور فائدہ کے راستے پر گامزن نہ ہوا۔

۳)۔ آدمؑ کی توبہ بھی مخالفین عصمت کے ہاتھوں میں ایک دلیل بن گئی ہے۔ حالانکہ توبہ عمل گناہ کے ساتھ عام ہے۔ بعض اوقات انسان ایسا کام کرتا ہے جو اس کے مرتبہ کے مطابق نہیں ہوتا پھر وہ پشیمان ہو جاتا ہے اور اس سے توبہ کر لیتا ہے۔ ان تمام باتوں کے مدنظر آدمؑ کے مقام و مرتبہ کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ سے کئے گئے عہد کو نہ بھلاتے۔ اب جو انہوں نے اپنے مرتبہ کے مطابق کام نہ کیا، اگر وہ عمل ذاتی طور پر حرام نہیں تھا، تو اب بہتر یہی تھا کہ نادم و پشیمان ہو کر توبہ کرتے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ایک حدیث یوں ہے:

ان رسول اللہ کان یتوب الی اللہ عزوجل کل یومٍ من غیر ذنبٍ

[1] لسان العرب میں لکھتے ہیں: العصیان خلاف الطاعۃ، العاصی: الفصیل اذا لم یتبع امہ (ج ۱۰ ص ۱۶۷)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز اللہ کے حضور کسی گناہ کے بغیر توبہ کرتے تھے۔[1]

ھ۔عصمت اور لفظ 'غفران'

آدمؑ کی داستان میں انبیاء کی عصمت کے مخالفین کے پاس ''غفران کا موضوع'' ایک اور ثبوت بن گیا ہے۔قرآن میں یہ اس طرح بیان ہوا ہے:

وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾

اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔(اعراف۔۲۳)

حضرت آدمؑ کے مقام کی عظمت اور ان کے مناسب کام نہ کرنے کی جگہ پر اس طرح کی تعبیرات بے عمل تو نہیں لیکن ہر گز گناہ پر دلیل بھی نہیں بن سکتیں۔عظیم و پاکیزہ انسان ''ترک اولیٰ'' پر بھی اس طرح گریہ زاری کرتے ہیں کہ گویا ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو، جب کہ ایک عارف سے ترک اولیٰ اس کی معرفت کی وجہ سے عرفانی گناہ تو ہے اگرچہ شریعت کے لحاظ سے وہ کوئی گناہ نہیں۔لہٰذا حق تھا کہ آدمؑ اس عظیم لطف و کرم کے مقابلہ میں نادم و پشیمان ہوتے ،ندامت کا اظہار کرتے ہوئے توبہ کا راستہ اپناتے اور یہ فیصلہ کر لیتے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کی بات نہیں مانیں گے۔

آدمؑ کی توبہ کی کیفیت

اب بات جب یہاں تک آ پہنچی ہے تو ہم یہ بھی بتائے چلیں کہ آدمؑ نے اپنے نقصان کا اندازہ لگا کر ندامت کا اظہار کیا اور توبہ کا راستہ اختیار کیا۔اس کام کے لیے انہیں ایک ایسے وسیلہ کی ضرورت تھی جس کے طفیل وہ اپنی گذشتہ حالت (مقام ربوبی سے قرب) پر لوٹ آتے۔اللہ نے یہ وسیلہ آدمؑ کو عطا فرمایا، ارشاد ہوتا ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾

آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے اور ان کے وسیلہ سے توبہ کی، اور اللہ یقیناً توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔(بقرہ۔۳۷)

اب دیکھنا یہ ہوگا کہ ''کلموں'' سے کیا مراد ہے؟ ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ ان سے مراد آدمؑ و حوا کی درخواست ہے جو انہوں نے اللہ کے حضور پیش کی یعنی ''رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا'' یہ تصور آیت کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ اس گفتگو کا سرچشمہ خود آدمؑ اور حوا کی اپنی سوچ ہے۔حالانکہ کلمات اللہ کی جانب سے عطا کئے گئے تھے۔یہاں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جو ہمارے لیے ان کلمات کی تشریح کرے؛ اس لیے

[1] سفینۃ البحار۔چاپ جدید، ج۶ ص ۶۶۱، ص ۶۶۲

حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

فریقین سے مروی روایات گواہی دیتی ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق کا واسطہ دیا اور اس طرح عرض کیا:

اسئالك بحق محمدٍ الا غفرت لی [1]

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس نے یوں عرض کیا:

عملت سوءاً و ظلمت نفسی فتب علی انك انت التواب الرحیم [2]

ابن نجار نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے: میں نے رسول اللہ سے ان کلمات کے بارے میں پوچھا جو آدمؑ نے اپنے پروردگار سے دریافت کئے۔ آنحضرت نے فرمایا:

سئال بحق محمد وعلی وفاطمة والحسن والحسین الا تب علی فتاب علیه [3]

اس بات کے پیش نظر کہ قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ کو کلمہ اور دنیا کی تمام موجودات کو اللہ تعالیٰ کے کلمات قرار دیا ہے۔ ان روایات کی تائید بھی قرآن پاک سے ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ

اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے۔ (آل عمران۔ ۴۵)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ ....

کہہ دیجئے اگر سمندر اللہ کے کلمات لکھنے کے لیے سیاہی بن جائیں تو میرے اللہ کے کلمات مکمل ہونے سے پہلے سمندر کا پانی خشک ہوجائے گا۔ (کہف۔ ۱۰۹)

کیا شیطانی وسوسہ اور اس کا گمراہ کرنا عمومی ہے؟

قرآنی آیات کے ظاہر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیطان وسوسہ عمومیت رکھتا ہے اور سب انسان اس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ایک آیت

[1] الدرالمنثور سیوطی ج ا ص ۵۸

[2] الدرالمنثور، سیوطی ج ا ص ۶۰، ص ۶۱۔ تفسیر برہان ج ا ص ۸۶ روایت ۲

[3] الدرالمنثور، سیوطی ج ا ص ۶۰، ص ۶۱، تفسیر برہان، ج ا ص ۸۶ روایت ۲

میں ارشاد ہوتا ہے:

يُوَسۡوِسُ فِيۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۝۵

جو انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ (الناس۔ ۵)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَلَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝۴۰

میں زمین پر اولاد آدمؑ کے سامنے باطل کو بنا سنوار کر پیش کروں گا اور سب کو گمراہ کروں گا، سوائے تیرے پاک اور مخلص بندوں کے۔ (حجر۔ ۳۹،۴۰)

آیت کا ظاہر یہ ہے کہ اس استثناء کا تعلق آخری جملہ سے ہے اور پہلا جملہ جو بڑے اعمال کو بنا کر پیش کرنے سے متعلق ہے عمومیت رکھتا ہے۔

البتہ گمراہی ان کے لیے ہے جو اس کی اطاعت کریں گے۔ یہ مخلصین کے دامن تک نہیں پہنچے گی۔ اس لیے جہاں گمراہی کا تذکرہ کیا ہے وہاں مخلصین کو مستثنیٰ کر دیا ہے مثلاً پہلے والی آیت اور سورہ ص کی آیت ۸۲ اور ۸۳ میں۔ [۱]

اس بیان سے ایک اور سوال کا جواب بھی سامنے آجاتا ہے وہ یہ کہ آدمؑ انبیاء میں سے تھے اور مخلصین کے زمرے میں شامل تھے اس کے باوجود کیسے شیطان کے فریب کا شکار ہو کر اس کے بہلانے میں آگئے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝۱۲۱

اور (آخرکار) آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ (طٰہٰ۔ ۱۲۱)

کیونکہ جب وہ شیطان کے بہلانے میں آئے تو اس وقت تک مخلصین کی صف میں نہیں آئے تھے کیونکہ مخلص بندگان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں غیر خدا کے لیے جگہ ہی نہیں اور مقام ربوبی سے ان کی توجہ ذرہ بھر بھی نہیں ہٹتی۔ جب آدمؑ بہلانے میں آئے تو اس وقت انہیں یہ مقام حاصل نہیں تھا بلکہ انہیں بعد میں یہ مرتبہ عطا کیا گیا۔ اس بات پر شاہد اسی سورۂ طٰہٰ میں شیطان کے فریب میں آنے کا ذکر کے بعد والی گفتگو ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى ۝۱۲۲

---

[۱] فبعزتك لاغينهم اجمعين۔ الا عبادك منهم المخلصين

پھر اللہ نے اسے چن لیا، اس پر رحمت کا دریچہ کھول دیا اور اس کی ہدایت فرمائی۔ (طٰہٰ۔ ۱۲۲)

آدمؑ کو چن لینے سے کیا مراد ہے بعد والی بحث میں ہم اس کا ذکر کریں گے۔ بعض لوگوں نے یہاں آدمؑ کے چناؤ کو نبوت کے معنی میں لیا ہے لیکن یہ صرف احتمال ہی ہے، کیونکہ قرآن میں چناؤ فقط انبیاء کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔[۱]

حضرت آدم کا چناؤ

قرآن کریم نے آدمؑ کو منتخب شدہ افراد میں سے قرار دیا ہے۔ اور انہیں نوحؑ، آل عمران اور آل ابراہیمؑ کی صف میں قرار دیتے ہوئے اس طرح فرمایا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾

اللہ نے آدمؑ، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو عالمین سے چن لیا۔ (آل عمران۔ ۳۳)

مذکورہ آیہ مبارکہ کی وضاحت میں ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن میں ''اَصطفا'' دو طرح استعمال ہوا ہے کبھی تو کسی کے ساتھ موازنہ کئے بغیر یا کبھی کسی شخص کی صفت کے طور پر لایا گیا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ○

اور اس دنیا میں جب ہم نے اسے منتخب کیا۔ (بقرہ۔ ۱۳۰)

یا حضرت مریمؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ

تجھے چنا اور تجھے پاک کیا۔ (آل عمران۔ ۴۲)

ان موارد میں مراد یہ ہے کہ خود انہیں ہی مخلص بنایا گیا۔

عربی لغت میں صفی ہر خالص، ممتاز اور برگزیدہ چیز کو کہتے ہیں، قرآن نے موم سے خالص شہد کو مصفّٰی کہا ہے اور فرمایا ہے:

مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ○

صاف وشفاف شہد۔ (محمد۔ ۱۵)

اس طرح کی تعریف مطلق انتخاب اور مرتبہ کے بلند ہونے کی علامت ہے۔

بعض جگہوں پر موازنہ کرتے ہوئے چناؤ کا تذکرہ ہوتا ہے، چنانچہ ہم طالوت کے متعلق پڑھتے ہیں:

---

[۱] سورۂ انعام آیت ۸۷ اور سورۂ مریم آیت ۵۸ کی طرف رجوع کریں۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ

اسے اللہ نے تم میں سے (برتری کی بنیاد پر) چنا ہے۔(بقرہ۔۲۴۷)

حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي ○

میں نے تجھے لوگوں سے منتخب کیا ہے، اپنی رسالتیں دی ہیں اور اپنے ساتھ کلام کا شرف بخشا ہے۔(اعراف۔۱۴۴)

حضرت مریمؑ کے متعلق پہلی طرح کے انتخاب کے ساتھ ساتھ اس دوسری طرح کے چناؤ کا بھی ذکر فرمایا ہے:

وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور تمام جہان کی عورتوں پر تجھے برتری اور فضیلت دی۔(آل عمران۔۴۲)

اس طرح کے موارد میں ممکن ہے اس شخص یا اشخاص میں کوئی خصوصیت ہو جو دوسروں میں نہ ہو۔ اگر چہ وہ پہلی طرح کے منتخب ہونے والوں میں سے ہوں۔حسن اتفاق سے آدمؑ کے سلسلہ میں بات اسی طرح ہے، کیونکہ ''عَلَى الْعٰلَمِيْنَ'' کے جملہ کو دیکھتے ہوئے ان کا چناؤ دوسری قسم کا ہے اور یقینی طور پر آدم تحقیقی اعتبار سے اسماء کی تعلیم کے حوالے سے اور فرشتوں کے سجدہ کرنے کے باعث ایسی خصوصیات کے حامل تھے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔[1]

آیت میں نوحؑ کا تذکرہ آیا ہے۔ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے، حقیقت میں وہ نسل انسان کے دوسرے باپ شمار کئے جاتے ہیں اور اس بات کا احتمال ہے کہ ان کی خصوصیت صاحب شریعت انبیاء کی پہلی کڑی ہونا ہو۔ آل ابراہیمؑ کے متعلق بھی بات اسی طرح ہے کیونکہ ابراہیمؑ کی نسل چند خصوصیات کی حامل ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں بہت سے نبی مبعوث ہوئے، تین بڑے انبیاء حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ بھی ان ہی سے تھے۔ ان کا ذکر مستقل طور پر نہیں آیا۔ اگر آیت کے آخری حصے میں آل عمران (مراد حضرت مریم کے باپ ہیں نہ کہ حضرت موسیٰ کے باپ) کا ذکر آیا تو اس کی وجہ فرزند عمران (مریمؑ) کی سرگذشت بیان کرنے کے لیے اساس فراہم کرتا ہے جو بعد کی آیات میں تفصیلی طور پر بیان ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ آدمؑ اور حوا کی پوری زندگی کا تذکرہ ہم نے چھ سلسلوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہر سلسلہ میں خود کئی چھوٹے موضوعات شامل تھے۔ اب زمین پر آدمؑ کے اترنے کا تذکرہ کرنے کی باری آتی ہے۔

---

[1] اس بیان کے مطابق آدمؑ کے چناؤ کا معیار ان کی نبوت نہیں تھی، بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ قرآن مجید میں طالوت کے متعلق ''اصطفاء'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو اللہ کی طرف سے مامور تھے، لیکن نبی نہیں تھے۔ لیکن ان کا ''اجتبا'' ایک معیار کی بنیاد پر ہونا چاہیے جو توبہ کی قبولیت کے بعد حاصل ہوا ہو۔ اس لیے بعید نہیں ہے کہ اس کا معیار ان کی نبوت ہی ہو۔

(۷) حضرت آدمؑ کا زمین پر اترنا

اس کے باوجود کہ اللہ رحیم ہے اور اس نے آدمؑ کی توبہ قبول فرمالی تھی تاہم شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے کا طبعی اثر توبہ کے بعد بھی اپنی جگہ باقی رہا کیونکہ توبہ بارگاہ الٰہی سے دوری کم کرنے میں مؤثر ہے لیکن آدمؑ کے عمل کا طبعی اثر اپنی جگہ باقی رہا۔ گذشتہ مباحث میں ہم نے اس عمل کے طبعی اثر کی بقاء کو اس بات پر گواہ بنایا ہے کہ یہ نہی ایک ارشادی نہی تھی؟ لہٰذا اس مخالفت کا عملی اثر توبہ اور معافی کے بعد بھی اپنی جگہ برقرار رہا۔ اس کا تکوینی (طبعی) اثر بہشت سے نکلنا اور زمین پر اترنا تھا۔ ان آیات میں اس واقعہ کا ذکر آیا ہے:

موضوع سے متعلق آیات

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾
فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ [1]
قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ (البقرہ۔۲۶تا۳۸)
قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾
قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى
حِيْنٍ ﴿۲۴﴾
قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ (الاعراف۔۲۳تا۲۵)
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

---

[1] توبہ سے متعلق آیات کو یہاں بیان کرنا اگرچہ موضوع گفتگو سے متعلق نہیں ہے تاہم ان کا ذکر یہاں ایک نکتہ کے پیش نظر کیا جارہا ہے جو "ھبوط" سے متعلق آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے واضح ہوجائے گا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ (طٰہ۔ ۱۲۲، ۱۲۳)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔پس شیطان نے ان دونوں (آدمؑ وحوا) کو پھسلا دیا، جس آسایش میں وہ تھے اس سے انہیں نکال دیا اور ہم نے کہا تم نیچے اتر جاؤ، تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور ایک مقررہ وقت تک تمہیں زمین میں ٹھہرنا ہے۔

۲)۔آدمؑ نے اپنے پروردگار سے بعض کلمات سیکھے اور ان کے وسیلہ سے توبہ کی یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

۳)۔ہم نے کہا کہ سب بہشت سے اتر جاؤ اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۴)۔انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم یقیناً گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

۵)۔اللہ نے فرمایا کہ نیچے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور ایک مقررہ مدت تک زمین تمہارے ٹھہرے رہنے کی جگہ ہے۔

۶)۔اللہ نے فرمایا کہ زمین میں تم زندگی بسر کرو گے، اسی میں تم مرو گے اور اسی سے اٹھائے جاؤ گے۔

۷)۔پھر اللہ نے آدمؑ کو برگزیدہ کر دیا، پھر اس پر رحمت کے دریچے سے نظر ڈالی اور اسے ہدایت فرمائی۔

۸)۔اس نے کہا کہ سب بہشت سے اتر جاؤ، تم سب آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے، اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ ہی بد بخت رہے گا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

پہلی نظر میں سورۂ بقرہ کی آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آدمؑ کو دوبارہ زمین پر اتارا گیا غلطی کے بعد اور توبہ کے بعد، پہلی مرتبہ اترنے

کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ ....

ہم نے کہا کہ تم بہشت سے نیچے اتر جاؤ تم میں ایک دوسرے کا دشمن ہوگا زمین میں ایک وقت معینہ تک تمہیں رہنا ہوگا۔ اگر میری طرف سے تمہارے لیے ہدایت آئی تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لیے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ (بقرہ۔ ۳۶)

سورۂ اعراف میں لفظ ایک بار اترنے کا ذکر ہوا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ آدمؑ کو توبہ اور اظہار ندامت رَبَّنَا ظَلَمْنَا کے بعد یہ حکم دیا گیا: ''اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ ....'' (سورۂ اعراف۔ ۲۴)

اب دیکھنا یہ ہے کہ آدمؑ دو بار زمین پر اترے تھے یا ایک بار؟ اس بات کے پیش نظر کہ یہ اترنا زمین ہی پر تھا، کہا جا سکتا ہے کہ ایک بار ہی اترے تھے، کیونکہ پہلی مرتبہ اترنے سے متعلق آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى

یہ بات بن کہے ہی واضح ہے کہ بنی آدمؑ کی طرف راہنما کا بھیجنا زمین پر ہی ہوگا۔۔ بالخصوص سورۂ اعراف کے مطابق جو دوسری بار اترنے سے متعلق ہے۔ لفظ ''فِي الْاَرْضِ'' صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ ......

دوبارہ دہرانے میں شاید یہ نکتہ ہو کہ دوسری بار اترنے سے متعلق آیت گویا پوری داستان کے متعلق مجموعی طور پر ایک نتیجہ سامنے لانا چاہتی ہے اور یہ کہنا چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلقت کے آغاز میں جو یہ بیان کیا تھا کہ ''اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً'' وہ پورا ہو گیا ہے۔ آدمؑ زمین پر اتر آئے اور ان کی اولاد میں لڑائی جھگڑا و کشمکش شروع ہو گئی۔

دوسرے الفاظ میں یوں ہے کہ پہلا 'ھبوط'' کہانی کا جزو اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے لیکن دوسرے ھبوط سے متعلق کہانی کے خاتمہ پر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کہانی کی ایک مجموعی تصویر پیش کرتا ہے۔

اولاد آدمؑ کا لڑائی جھگڑا ایک الگ موضوع ہے جس کے بارے میں ہم مناسب جگہ پر گفتگو کریں گے۔ قرآن نے بھی آدمؑ اور حوا کے اترنے کو تمام انسانوں کا اترنا قرار دیا ہے اور خطاب میں جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، چنانچہ ان دونوں کی تخلیق کو بھی تمام انسانوں کی تخلیق قرار دیا ہے۔ گذشتہ مباحث میں ہم اس سلسلے میں گفتگو کر چکے ہیں۔

نکات اور نصائح

آدمؑ کی داستان سے مختلف تربیتی نکات سامنے آئے ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

۱)۔قرآن نے تخلیق آدمؑ کی بنیاد مٹی اور خاک قرار دیا ہے اس طرح وہ اسے اپنی اصلیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے اور تکبر و غرور سے روکنا چاہتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کو بھی بیان کر دیا ہے اور اس کے اندر احساس تشکر کے جذبات ابھارنا چاہتا ہے۔

۲)۔قرآن نے تخلیق آدمؑ کی بنیاد کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کرامت کو بھی محفوظ رکھا ہے کیونکہ مٹی اور پانی ہی فطرت کے حسن اور اس کے جلوؤں کا سرچشمہ ہیں، جب کہ سائنسی نظریات ،جنہوں نے انسان کی بنیاد کو کیڑے یا بندر قرار دیا ہے نے اس کی کرامت کو مخدوش کر دیا ہے اس سے بڑھ کر اس کی کیا عظمت ہوسکتی ہے کہ اسے اسماء سکھائے ،فرشتوں کا استاد بنایا اور مسجود ملائکہ قرار دیا۔گذشتہ مباحث میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سجدہ صرف آدمؑ کو نہیں کیا گیا بلکہ وہ تو اپنی اولاد کے نمائندہ تھے۔

۳)۔ملائکہ نے اس خلقت آدمؑ اور اس کی خلافت کے راز کے متعلق جو سوال کیا وہ بذات خود اس بات پر گواہ ہے کہ اسرار خلقت کے متعلق بحث کرنا ایک پسندیدہ بات ہے اور جب انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں آدمؑ پر اپنی برتری کا اظہار کیا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں راجح پر مرجوح کو ترجیح دینا اچھی بات نہیں ہے۔اس لیے اللہ نے" اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کے جملے کے ذریعہ اس بات کی یاددہانی کرائی کہ اس کی تخلیق وخلافت سے اس اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی بلکہ اس کام میں کئی راز مخفی ہیں جن سے تم آگاہ نہیں ہو۔اس نکتے کی یاددہانی سے اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ وہ برے کام کا ارتکاب نہیں کرتا۔

۴)۔یہ داستان بتاتی ہے کہ انسان کے علم ودانش کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔اولاد آدمؑ کے پاس جتنا بھی علم ہے اس کا سرچشمہ اللہ ہی کا نامتناہی علم ہے۔

۵)۔شیطان انسان کا بہت بڑا دشمن ہے۔انسان جس مقام اور مرتبہ پر بھی ہو شیطان اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس پر اپنے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔اس لیے قرآن حکیم نبی اکرمؐ کو ہدایت کرتا ہے کہ شیطانی ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ میں آجائیں اور کہیں:

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

اور کہہ دیجئے کہ اے میرے پالنے والے! میں شیطان کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ شیاطین میرے قریب آئیں۔(مومنون۔۹۷،۹۸)

۶)۔غرور و تکبر گناہوں کا سرچشمہ ہیں۔زمین پر جو گناہ بھی کیا جاتا ہے ایک لحاظ سے اس کی بنیاد تکبر میں آتا ہے۔اس موضوع کا

تجزیہ مفکرین کے لیے مشکل نہیں ہے۔[1]

۷)۔بہشت میں اللہ کی تمام نعمتیں آدمؑ کے اختیار میں تھیں لیکن ان کے اندر ایک مخصوص طمع ولالچ اس بات کا باعث بنا کہ وہ تمام نعمات ہاتھ سے کھو بیٹھے۔اس لیے انسان کو زندگی میں روحانی عظمت کا خیال رکھتے ہوئے بلند نظر رہنا چاہیے۔

۸)۔زندگی میں مایوسی و ناامیدی ہی ہمیشہ کے خسارے کا باعث بنتی ہیں۔انسان پر توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، چنانچہ آدمؑ توبہ کے ذریعہ مقام ''اجتباء'' تک پہنچ گئے۔

---

[1] اس سلسلے میں راقم کی کتاب انسان کامل ص ۲۲۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

(۸)۔ اولادِ آدمؑ کی سرگذشت

زمین پر اترنا اولادِ آدمؑ کے پیدا ہونے اور بڑھنے کا باعث بنا۔ اللہ نے انہیں ''ہابیل'' اور ''قابیل'' نامی دو بیٹے عطا کئے جو

''اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ''

کے مظہر تھے ان کے درمیان اختلاف اور لڑائی جھگڑا یہاں تک پہنچ گیا کہ قابیل نے ہابیلؑ کو قتل کر دیا۔ قرآن کریم نے آدمؑ کے ان بیٹوں کی داستان اس طرح بیان فرمائی ہے:

موضوع سے متعلق آیات

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ۚ

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ۚۛ

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ○ (مائدہ۔ ۲۷ تا ۳۲)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔آدمؑ کے دو بیٹوں کی سرگذشت بیان کرو۔ جب ان دونوں نے اللہ کے حضور قربانی کی تو ایک قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ اور دوسرے بھائی نے اپنے بھائی سے کہا: میں تمہیں ضرور قتل کروں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ صرف پرہیزگاروں سے (قربانی) قبول کرتا ہے۔

۲)۔اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر مجھے قتل کردے گا تو میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں۔ سب جہانوں کے پروردگار سے ڈرتا ہوں۔

۳)۔میں چاہتا ہوں کہ تو گناہ (میرے قتل) اور (اپنے پہلے) گناہ کے ساتھ اللہ کی طرف جائے تاکہ جہنمیوں میں سے ہو جائے، یہ ظلم کرنے والوں کی سزا۔

۴)۔اس کی نفسانی خواہش نے اسے بھائی کے قتل پر ابھارا۔ چنانچہ اس نے بھائی کو قتل کردیا ور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگیا۔

۵)۔اللہ نے ایک کوا بھیجا کہ وہ زمین کھودے اور اسے سکھائے کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے۔ اس نے کہا: "وائے ہو مجھ پر کہ میں اپنے بھائی کی لاش چھپانے کے لیے اس کوے سے بھی زیادہ عاجز ہوں"۔ پھر وہ اپنے عمل پر پشیمان ہوگیا۔

۶)۔اسی لیے ہم نے بنی اسرائل پر لازم قرار دیا کہ جو بھی کسی دوسرے شخص کو قتل کردے۔۔۔ قصاص اور زمین پر فساد پھیلانے کے عنوان سے نہیں۔۔تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کردیا اور جس شخص نے ایک جان کو بھی زندہ کیا، تو ایسا ہی ہے گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ کیا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

آدمؑ اور ان کی زوجہ نافرمانی کرنے کی وجہ سے زمین پر اتار دیئے گئے۔ انہوں نے مشترکہ زندگی شروع کی اور ان کے کئی بچے ہوئے جن میں بعض کا انجام بہت عبرت ناک ہے۔ قرآن مجید نے مذکورہ آیات میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا واقعہ صحیح صحیح بیان کریں۔ اللہ نے "بالحق" کیوں کہا ہے؟ شاید یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گذشتہ امتوں میں یہ

داستان غلط پیرائے میں بیان کی جاتی تھی جس وجہ سے اس کی حقیقی تصویر چھپ گئی تھی۔ اس بات کے پیش نظر کہ قرآن دوسری آسمانی کتابوں پر "مھیمن" ہے۔[1]

اس لیے اس داستان کے حقائق کو ان مذکورہ باتوں سے الگ کر کے بیان کرتا ہے اور اس کی ابتداء کرتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

آیت میں آدمؑ سے مراد ہی قرآن مجید کے متعارف کردہ آدمؑ ہیں کوئی اور انسان نہیں یہ احتمال بے بنیاد ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائل کا کوئی آدمی تھا جس کے بیٹوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، کیونکہ داستان کے متن میں اس کے خلاف شواہد موجود ہیں۔ اس میں واضح ترین قرینہ یہ ہے کہ قتل کے بعد قاتل کو معلوم نہیں تھا کہ لاش کے ساتھ کیا کرے۔ چنانچہ دو کووں کی لڑائی کے بعد اپنے بھائی کے لاش کو دفن کرنا اس نے سیکھا۔ یہ بات ابتدائی انسان کی حالت کے ساتھ ہم آہنگ ہے، نہ کہ بنی اسرائیل کی حالت کے ساتھ جو پہلے ہی ایک عظیم تمدن کے گہوارے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر یہ بات بیان فرمائی ہے کہ ان دونوں بھائیوں نے اللہ کے حضور قربانی پیش کی "اذقربا قربانا" یہ دو قربانیاں کیا تھیں اس پر خود آیت میں کوئی موجود نہیں ہے۔ لغت عرب میں قربانی ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب تلاش کرتا ہے۔ لیکن روایات اور آسمانی کتابوں میں اس کی تفسیر جانور اور گندم کے ساتھ کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کی قربانی قبول نہ کی "فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاٰخر" ان دو بھائیوں کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کی قربانی قبول ہوئی یا قبول نہیں ہوئی۔ قرآن میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن قصص انبیاء سے متعلق کتابوں میں آتا ہے کہ اگر آگ آ کر قربانی کو جلا دیتی تو یہ اس قربانی کے قبول ہونے کی علامت ہوتی تھی۔ ان دو بھائیوں کی قربانی کے سلسلہ میں آگ آئی اور اس نے صرف ایک کی قربانی جلا دی۔ بنی اسرائیل کے درمیان اس طریقے اور رسم کا موجود ہونا بھی ہی اسی موضوع کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ

انہوں (اہل کتاب) نے کہا کہ اللہ نے ہم سے عہد کیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائیں مگر یہ کہ وہ ہمارے سامنے ایک ایسی قربانی پیش کرے جسے آگ جلا دے۔۔۔۔

---

[1] مائدہ۔۴۸ "بالحق" ممکن ہے کسی اور معنیٰ کی طرف اشارہ ہو، وہ یہ کہ یہ ایک حقیقی کہانی ہے، تمثیل خیال پروازی نہیں ہے۔

قرآن نے بھی یہ بات ٹھکرائی نہیں بلکہ ایک اور طریقے سے جواب دیا ہے اور پیغمبر کو یہ حکم دیا کہ وہ کہیں مجھ سے پہلے انبیاء ایسے دلائل وعلامات کے ساتھ وہ جو تم کہتے تھے آئے، اگر تم سچے ہو تو پھر تم نے ان کی پیروی کرنے کی بجائے انہیں قتل کیوں کیا:

قُلْ قَدْ جَآءَ كُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(اے رسول ان سے) کہہ دو کہ یقیناً تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول کھلی دلیلیں لے کر آئیں ہیں اور وہ بھی (لائے) جو تم نے کہا اور پھر تم نے ان کو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو

جس بھائی کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی اس وقت اس نے حسد کی وجہ سے دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دی اور کہا: ''لَاَقْتُلَنَّكَ''

لیکن اس متقی اور پرہیز گار بھائی کی ہدایت کے لیے تین موضوعات کی طرف اشارہ کیا۔ قرآن نے وہ تینوں موضوعات بیان کئے ہیں:

۱)۔''اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ'' اللہ تعالیٰ نیک کام صرف پرہیز گاروں سے قبول فرماتا ہے یعنی اگر تیرا عمل قبول نہیں ہوا اور تیرے اندر فطرت کے شعلے بھڑک رہے ہیں تو اس کا سبب تو خود اپنے اندر ہی اور اپنی زندگی میں تلاش کر۔ تیرا عمل تقویٰ سے خالی ہونے کی وجہ سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ لہٰذا مجھے قتل کی دھمکی دینے سے بہتر ہے کہ تو اپنی اصلاح کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کہ ''اپنے آپ کو درست کرو، آئینہ کا توڑنا غلط ہے''۔

۲)۔''لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ'' اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا تو میں ہرگز تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا کہ میں سب جہانوں کے پروردگار سے ڈرتا ہوں۔

''ما انا بباسط یدی۔۔۔'' سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو نے مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر بھی لیا ہے تب بھی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا اور اپنا دفاع نہیں کروں گا؟ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو نے مجھے قتل کرنے کا ارادہ کر بھی لیا ہے تو میں تیرے قتل کا ارادہ نہیں کروں گا، نہ ہی اپنا دفاع کروں گا؟ اس جملہ ''مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ'' میں غور وفکر کرنے سے دوسری بات کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ میں تیری طرف ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، یہ نہیں کہتے کہ ''مَآ اَنَا بِدَافِعٍ'' یعنی ''میں دفاع نہیں کروں گا''۔

متقی بھائی نے اپنے رکنے کی وجہ اللہ کو خوف قرار دیا ''اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ' اس سے مقام ربوبیت کے بارے میں ان کی معرفت کا پتہ چلتا ہے۔ قرآن نے بھی خوف علماء کی خصوصیت قرار دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ثواب وعذاب سے آگاہ عالم کبھی بھی گناہ کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ معمولاً گناہ کا باعث مقام ربوبیت کے بارے میں انسان کی جہالت ونا آگاہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

ماسوا اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں عالم لوگ ہی ڈرتے ہیں۔ (فاطر ۲۸)

۳)۔''اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ'' یعنی میں چاہتا ہوں کہ تو (میرے قتل کے) گناہ اور

(اپنے پہلے) گناہ کے ساتھ اللہ کے سامنے جائے تاکہ دوزخیوں میں سے ہو جائے۔

''میرے گناہ کو اپنے کندھوں پر لے کر جاتے'' سے کیا مراد ہے؟ اس طرح کی درخواست شروع ہی سے یقینی طور پر تقویٰ کے خلاف ہے حالانکہ وہ تو متقین میں سے تھا۔ اس بات کے پیش نظر کہ دوسرے بھائی نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا اور اپنے بھائی کی باتوں پر کان نہ دھرے، تو اس کے اس فیصلہ کا طبعی لازمہ یہ ہے کہ وہ دونوں گناہوں کے ساتھ جائے اور دوزخی ہو جائے۔

ہمارے درمیان اس طرح کی گفتگو کا رواج عام ہے، ایک ناصح باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے اسے فضول اور برے کاموں سے روکتا ہے، لیکن وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی باتوں نے بیٹے پر کوئی اثر نہیں کیا اور وہ اپنی سابقہ روش پر چلنا چاہتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں باپ یہ کہتا ہے کہ یہ بات اساسی نہیں ہے، بلکہ یہ تو بیٹے کے فیصلہ کا لازمہ ہے۔ حقیقت میں وہ چاہے یا نہ چاہے، اس طرح کا نتیجہ نکلنا تو لازم ہے۔

آخر کار متقی بھائی کی نصیحتیں دوسرے بھائی کو روکنے میں مؤثر ثابت نہ ہوئیں۔ اس کے اندر برادری کے جذبات اور حسد کی آگ میں کشمکش شروع ہوگئی۔ آخر کا حسد نے بھائی کی محبت کے جذبات پر غلبہ پالیا۔ اس نے اسے قتل کر دیا اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگیا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ

اس کے نفس نے اس کے بھائی کے قتل کو اس کے لیے بنا سنوار پیش کیا جس کے نتیجہ میں اس نے بھائی قتل کر دیا اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔

''طوعت'' کا لفظ اسی روحانی کشمکش کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

وہ سرکش انسان جس نے تکبر و حسد کی بناء پر اپنے بھائی کو ختم کرنے کا یہ فیصلہ کر لیا۔ اپنی اصلاح کرنے کی بجائے اور اپنی قربانی قبول نہ ہونے کی وجہ تلاش کرنے کی بجائے اپنے ہاتھ سے اپنے بھائی کا لہو بہا دیا۔ لیکن قتل کے بعد وہ اتنا عاجز ہوگیا کہ اسے یہ سمجھ بھی نہ آئی کہ بھائی کی لاش کا کیا کرے، یہاں تک کی بعض روایات میں سے آیا ہے کہ وہ کافی عرصہ تک اپنے بھائی کی لاش اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا رہا۔ درندوں نے اس پر حملہ کر دیا کہ اس سے لاش چھین لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس خود پرست انسان کو سکھانے کے لیے دو کوے بھیجے تو آپس میں لڑنے لگے۔ ایک نے دوسرے کو مار دیا۔ کامیاب ہونے والے کوے نے اپنی چونچ سے ایک گڑھا کھودا اور مردہ کوے کو اس میں دبا دیا۔ اس وقت یہ نادان انسان ان دونوں کووں کے کام پر حیران ہوا اور اسے اپنی جہالت و نادانی کا علم ہو گیا۔ پس اس نے کہا کہ میں کتنا عاجز و کمزور ہوں کہ اس کوے جیسا کام بھی نہ کر سکا۔ قرآن نے اس واقعے کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبۡحَثُ فِى الۡاَرۡضِ لِيُرِيَهٗ كَيۡفَ يُوَارِىۡ سَوۡءَةَ اَخِيۡهِ‌ ؕ قَالَ

يٰوَيۡلَتٰٓى اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوۡءَةَ اَخِىۡ‌ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِيۡنَ ‌ۛۚ‏ ﴿۳۱﴾

اللہ نے ایک کوا بھیجا کہ وہ زمین کو کھودے تا کہ دوسرے کوے کو اس میں دبا دے، اسے طرح اس سکھائے کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش چھپائے۔ اس نے کہا کہ وائے ہو مجھ پر کہ میں اپنے بھائی کی لاش چھپانے میں اس کوے سے بھی کمزور ہوں، پھر وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوا۔ (مائدہ۔۳۱)

نکات اور نصائح

۱) قرآن نے ان آیات میں آدمؑ کے دو بیٹوں کی سرگذشت بیان کی ہے لیکن ان کے نام ذکر نہیں کئے۔ لیکن حدیث وتاریخ میں ان دونوں بھائیوں کے نام ہابیل وقابیل ذکر کئے گئے ہیں، نیز کہتے ہیں کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ [1]

۲)۔ عبادت اور تقرب الٰہی عمل کی روح خالص ہے۔ چونکہ ہابیل اخلاص رکھتے تھے اس لیے ان کی قربانی قبول ہوگئی اور قابیل کی قربانی ٹھکرا دی گئی۔ ہابیل جانوروں کی پرورش کرتے تھے۔ انہوں نے سب سے اچھا جانور اللہ کے حضور پیش کیا جب کہ قابیل کسان تھا اور وہ ناقص غلہ قربانی کے طور پر لایا تھا۔

۳)۔ انسانوں کے درمیان گناہ کا سب سے پہلا محرک حسد تھا ۔ قابیل بھی اس محرک کے جال میں گرفتار تھا۔ اس نے اپنی اصلاح کرنے کی بجائے اپنے بھائی کو ختم کرنے کا سوچ لیا۔ اس لیے دو افراد یا دو گروہوں کے درمیان رقابت کے وقت پیچھے رہ جانے والے فرد یا گروہ کو اپنی پسماندگی کا سبب تلاش کرنا چاہیے کہ اس کی تلافی کرے، نہ کہ اپنے رقیب کو فنا کرنے پر کمر باندھ لے۔

۴)۔ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اسے درس زندگی میں اپنے سے کم تر مخلوق سے سیکھنا چاہیے کیونکہ پوری کائنات اللہ کی کتاب اور صفحہ زندگی ہے۔ اس عظیم زندگی کے ہر صفحہ پر غور وفکر انسان کے لیے عبرت کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی وکمال کا باعث بھی ہے۔

۵)۔ قرآن نے اس داستان کے آغاز میں لفظ 'بالحق' ذکر کر کے اس موضوع کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی داستان ایک حقیقت ہے، نہ کہ افسانہ، حقیقت ہونے کے باوجود یہ حقیقت اس بات سے مانع نہیں کہ ہابیل ایسے پاک دل لوگوں کا ترجمان ہو کہ جن پر بعض اوقات تقویٰ ونیکی کی وجہ سے حسد کیا جاتا ہے اور ان کی زندگی چھین لی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں قابیل ایسے ظالم انسانوں کی نظیر ہے جن میں تجاوز طلبی کی روح اتنی سرایت کر چکی ہے کہ اپنے بھائی پر بھی رحم نہیں کرتا، اگرچہ آخر کار وہ نادم اور پشیمان ہوتا ہے لیکن اس وقت یہ

[1] تورات میں ''قابیل'' کی بجائے ''قابن'' آیا ہے۔

پشیمانی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

۶)۔اگر ہم یہ کہیں کہ عمل میں اخلاص نہ ہونے کی بناء پر قابیل سب سے پہلے گناہ کا مرتکب ہوا تھا تو قتل سب سے پہلا گناہ ہوگا جو انسان (بنی آدم) سے سرزد ہوا ہے۔

۷)۔قرآن نے اس داستان سے ایک اور نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ یہ کہ ایک بے گناہ انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔اسی طرح ایک انسان کا زندہ کرنا گویا سب انسانوں کا زندہ کرنا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا

اس لیے ہم نے بنی اسرائیل پر لازم قرار دیا کہ اگر ایک انسان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، یا فساد کیا ہو، قتل کردے، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کوئی بھی اس طرح کے انسان کو زندہ کردے تو گویا تمام انسانوں کو زندہ کیا۔(مائدہ۔۳۲)

اب یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک انسان کا قتل یا اسے زندہ کرنا، کیسے تمام انسانوں کے قتل یا انہیں زندہ کرنا ہے۔اسی سلسلہ میں مفسرین [1] نے مختلف وجوہات بیان کی ہیں۔ان میں سے ہم مندرجہ ذیل وجوہات کی وضاحت کرتے ہیں:

۱)۔چونکہ تمام انسانوں کو قتل کرنے یا ان تمام کو زندہ کرنے سے مراد پاک و بے گناہ انسان ہیں۔نہ کہ ظالم و سنگدل انسان، وہ قاتل جو کسی بے گناہ انسان کو قتل کرتا ہے تو اس کے لیے یہ دوسرے انسان کی بات نہیں ہے وہ اپنے مفادات کے لیے کسی انسان کو بھی قتل کرسکتا ہے۔بات اتنی ہے کہ ان تمام کو قتل کرنے کی طاقت یا ایک فعل محرک اس کے اندر نہیں پایا جاتا، لیکن محرک ہونے کے وقت اور طاقت رکھنے کے وقت وہ تمام انسانوں کو قتل کرسکتا ہے۔اس لیے ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنا تمام انسانوں کے قتل کرنے کے برابر ہے دوسرے الفاظ میں اس طرح ہے کہ قاتل کی روح اور دل میں اس طرح کے کام کی راہ ہموار ہے، ایک انسان کو زندہ کرنے کے سلسلے میں بھی بات اسی طرح ہے۔

۲)۔اگر کوئی شخص کسی انسان کو تباہی و ہلاکت سے بچاتا ہے تو یہ اس کی انسانی شرافت کی وجہ سے ہے۔اور یہ بات تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے۔لہٰذا اگر اس سے ہوسکے، یا حالات اسے اجازت دیں تو وہ تمام انسانوں کو زندہ کرے گا۔گویا ایک انسان کو زندہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تمام انسانوں کو زندہ کرنے کا جذبہ رکھتا ہے البتہ زندہ کرنے کا ظاہر اگرچہ وہی مادی لحاظ سے زندہ کرنا ہے لیکن بعض روایات میں اس کی تفسیر اس سے وسیع تر معنی کے ساتھ کی گئی ہے۔

امام محمد باقرؑ نے ڈوبنے اور جلنے سے بچانے کا ذکر کرنے کے بعد اس طرح فرمایا:

---

[1] مجمع البیان۔ج ۲ص ۱۶۷ پر یہ پانچوں وجوہات ذکر کی گئی ہیں۔

واعظم من ذٰلك كلما يخرجها من ضلالت الٰی هدی

اس سے بڑھ کے یہ ہے کہ کسی بھٹکے ہوئے انسان کی راہنمائی کی جائے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

من استخرجها من الکفر الی الایمان [۱]

حضرت آدمؑ کی زوجہ کی خلقت کی بحث

قرآن مجید نے آدمؑ کی زوجہ کی تخلیق کے متعلق فقط ایک بار اس طرح گفتگو فرمائی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً...............

اے لوگو! اپنے رب کی مخالفت کرنے سے بچو، وہ اللہ جس نے تمہیں ایک فرد سے پیدا کیا، اس کی زوجہ کو بھی اس کی جنس سے پیدا کی اور ان دونوں سے (زمین پر) بہت سے مرد عورتیں پھیلا دیئے۔ (نساء۔۱)

اس آیت میں ''خلق منها'' میں جو لفظ ''من'' آیا ہے وہ جنس کے بیان کے لیے ہے یعنی ہم نے آدمؑ کی زوجہ بھی اسی کی جنس سے پیدا کی، زمین پر موجود انسانوں کا شجرہ نسب ایک عورت اور مرد تک پہنچتا ہے، وہ بھی ایک جیسے ہی تھے اور مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ آدمؑ کی زوجہ کو اس پر عطف کرنے سے اس کی تخلیق اور اس کے مراحل بھی آدمؑ کی طرح ہی ہوں گے، آیت کا مقصد تبعیض سے مقابلہ کرنا ہے کیونکہ تمام انسان ایک جیسے مرد عورت سے پیدا کئے گئے ہیں کسی کو کسی پر اس حوالے سے فضیلت حاصل نہیں ہے۔

مذکورہ لفظ بھی تبعیض اور جزئیت کے معنی میں لیا گیا ہے اور اس کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے:

آدمؑ کی زوجہ آدمؑ کے اجزاء میں سے کسی جزو سے پیدا کی گئی ہے اور بعض غیر معتبر روایات ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا۔ اس بات پر دلیل بنایا گیا ہے۔

یہ تفسیر دو حوالوں سے کمزور ہے:

تمام انسانوں کی بیویوں کی تخلیق کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان میں بھی اس طرح کا جملہ استعمال کیا گیا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا۔ [۲]

---

[۱] تفسیر برہان، ج ۱ ص ۴۶۵، حدیث نمبر ۱۴

[۲] سورہ نحل آیت۔ ۷۲، سورہ شوریٰ آیت ۱۱ اور سورہ ذاریات آیت ۴۹ کی طرف رجوع کریں۔

اس کی نشانیوں میں یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بی بیاں پیدا کردیں تا کہ تم ان کی طرف تسکین پاؤ۔(روم۔۲۱)

اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہاری نوع سے بیویاں پیدا کیں جن کی طرف میلان سے تم آرام پاتے ہو۔لہٰذا ہماری بیویوں کی تخلیق کی کیفیت اور آدمؑ کی زوجہ کی تخلیق کی کیفیت یکساں ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

آدم کی پسلی سے اس کی زوجہ کی تخلیق کا ذکر تورات [1] میں آیا ہے۔

اس طرح کی احادیث علمائے یہود نے گھڑ کے اسلامی احادیث میں شامل کردی ہیں ہماری روایات میں اس طرح کی تخلیق کو مکمل طور پر غلط قرار دیا گیا ہے۔[2]

اولاد آدمؑ کے ازدواج کی کیفیت

یہاں ایک خاص موضوع سامنے آتا ہے اور وہ آدمؑ وحوا کے بچوں کی شادیاں ہیں جب کہ وہ سب آپس میں بہن بھائی تھے۔اس سلسلے میں روایات اور علماء کے اقوال میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔یہاں ہم ان کو کسی ترجیح کے بغیر ذکر کرتے ہیں:

۱)۔ان کی آپس میں شادیاں ہوئی تھیں اور اس کا جواز آغاز خلقت کی ضرورت اور دوسرے ساتھی کے نہ ہونے سے فراہم ہوجاتا ہے۔

۲)۔اللہ تعالیٰ نے ہر بیٹے اور بیٹی کے لیے فرشتوں میں سے ان کے لیے ساتھی پیدا کئے اور ان کی اولاد آپس میں چچازاد تھی۔اس طرح نسل کا سلسلہ آگے بڑھا۔

۳)۔انہوں نے گذشتہ انسانوں کی باقی رہنے والی نسل سے شادی کی ،یہ درست ہے کہ موجودہ انسان کا شجرہ نسب ابوالبشر آدمؑ تک پہنچتا ہے لیکن آدمؑ اس زمین پر قدم رکھنے والے پہلے انسان نہیں، بلکہ ان سے پہلے بھی زمین پر کچھ انسان زندگی بسر کرتے تھے، جو ختم ہوگئے [3] ان کی نسل کسی حد تک زمین پر باقی رہی اور اس نے تکثیر نسل میں مدد کی۔

چونکہ یہ موضوع ماقبل تاریخ سے متعلق ہے لہٰذا اس سلسلے میں کوئی یقینی رائے پیش کرنا بہت مشکل ہے۔

---

[1] تورات، سفر تکوین، فصل دوم، جملہ ۲۱ مطبوعہ لندن، فاضل خانی بہ تاریخ ۱۸۵۶ عیسوی مطابق ۱۲۷۲ھ،ق

[2] تفسیر عیاشی، ج ا، ص ۲۱۶ حدیث ۷

[3] صدوق: خصال ص ۲۳۹

دوسرے پیغمبر

بانی تحریر حضرت ادریس علیہ السلام

یہاں تک ہم نے حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں کی داستان معلوم کی۔قرآن نے آدمؑ اور نوحؑ کے درمیان اس فترت (فاصلہ) میں کسی پیغمبر کا نام واضح طور پر نہیں لیا۔صرف تاریخی منابع یہ بتاتے ہیں کہ اولاد آدمؑ میں سے بہت پیغمبر آئے اور چلے گئے، جن میں ایک حضرت ادریس تھے جو حضرت شیثؑ کے بعد تشریف لائے۔ان کا نام بھی قرآن میں آیا ہے ارشاد ہوتا ہے:ـ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۵۶ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝۵۷

قرآن میں ادریسؑ کا تذکرہ کرو، وہ بہت سچے نبی تھے ،اور ہم نے انہیں بہت بلند مرتبہ عطا فرمایا۔(مریم،۵۶،۵۷)

اگر مؤرخین کی باتیں درمیان میں نہ آتیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادریس علیہ السلام متاخر انبیاء میں تھے اور بنی اسرائیل کے دور سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ قرآن نے ایک اور جگہ انہیں اسمٰعیل وذوالکفل جیسے انبیاء کے زمرے میں شمار کیا ہے، بالخصوص جب کہ ان کا نام حضرات سلیمانؑ وایوب کی داستان کے بعد آیا ہے۔[1]

یہاں ہم دو باتوں کی یاددہانی کراتے ہیں:

۱)۔اس بات کے پیش نظر کہ قرآن نے حضرت نوحؑ کا تعارف پہلے صاحب شریعت نبی کے عنوان سے کرایا ہے، یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس فاصلے کے دوران جو انسان دنیا میں رہے وہ کس شریعت کی پیروی کرتے تھے؟

جواب: ابتدائی انسان پراگندہ ہونے اور مزاحمت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے انہیں فطری وعقلی ادراکات پر عمل کرتا تھا۔اس دور میں عقل کی راہنمائی سالم زندگی کے لیے کافی تھی۔جو پیغمبر اس دوران آئے وہ بھی آسمانی شریعت کے حامل نہیں تھے، بلکہ وہ نصیحتوں اور فطرت و عقل کے حکم کے مطابق لوگوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

۲)۔مؤرخین نے ادریسؑ کا تذکرہ بہت عظیم اور اچھے الفاظ میں کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ وشیثؑ کے بعد وہ تیسرے نبی ہیں، قلم سے لکھنے والے وہ پہلے انسان ہیں۔انہیں ''هر مس الهرامسه'' بھی کہا جاتا ہے۔بعض نے ان کی جائے پیدائش مصر اور بعض نے بابل ذکر کی ہے۔لیکن چونکہ یہ سب کچھ ماقبل تاریخ سے متعلق ہے، لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ہم ان سے متعلق صرف اتنی بات کہہ سکتے ہیں جتنی قرآن نے فرمائی ہے۔مؤرخین نے جو کچھ مجموعی طور پر کہا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ علم کے رہنماء اور انسانی معاشرہ کے تفکر و

[1] سورۂ انبیاء۔۸۵:''واسمٰعیل وادریس وذوالکفل کل من الصبرین

استدلال کی راہ پر لانے والی شخصیت تھے۔[1]

بعض روایات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صحیفہ بھی رکھتے تھے اور اس صحف کے بعض مضامین کا تذکرہ سید ابن طاؤس نے اپنی کتاب ''سعد السعود'' میں کیا ہے۔[2]

---

[1] شائقین ان کی تفصیلی زندگی معلوم کرنے کے لیے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں: تاریخ طبری ج ا ص ۱۰۲، ص ۱۰۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت تاریخ ابن کثیر، ج ا ص ۹۲، ص ۹۳ قصص الانبیاء، ابن راوندی ص ۷۳، بحار الانوار ج ۱۱ ص ۲۷۰، ص ۳۸۴

[2] بحار الانوار ج ۱۱ ص ۲۷۷، ص ۳۸۲

تیسرے پیغمبر

شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوحؑ کی زندگی کے سات پہلو

حضرت آدمؑ کے بعد سلسلہ انبیاء کی دوسری کڑی حضرت نوحؑ ہیں جو موجودہ نسل کے پدرِ ثانی شمار ہوتے ہیں۔
قرآن کی ۲۸ سورتوں میں ۴۳ [1]
مرتبہ ان کا نام ذکر ہوا ہے۔ ان کی سرگذشت کا تفصیلی تذکرہ ان قرآنی سورتوں میں ملتا ہے: اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر اور نوح۔
حضرت نوحؑ کی زندگی کے ساتھ پہلو جو ان کی شخصیت، ان کی قوم کے درمیان زندگی، قوم کو دعوت حق دینا، قوم کا انکار، اور آخر کار طوفان کے ذریعہ ان کے تباہ ہونے کو مندرجہ ذیل عنوانوں میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱)۔ حضرت نوحؑ کے معنوی مقامات
۲)۔ آپ پر تہمتیں اور اعتراضات
۳)۔ ان تہمتوں اور الزامات پر حضرت نوحؑ کا جواب
۴)۔ حضرت نوحؑ کا دعوت حق دینے کا طریقہ اور مستقل مزاجی، ان کی قوم کا انکار اور ہٹ دھرمی
۵)۔ عذاب کی درخواست، ہمہ جانبہ طوفان اور کافروں کی غرقابی
۶)۔ حضرت نوحؑ کا اپنے غرق ہونے والے بیٹے کنعان کے متعلق سوال
۷)۔ نکات اور نصائح

(۱)۔ حضرت نوحؑ کے معنوی مقامات

قرآن مجید کی نو آیات میں شیخ الانبیاء حضرت نوحؑ کے معنوی مقامات کا تذکرہ ملتا ہے اور انہیں ایک مثالی انسان کے عنوان سے پیش

---

[1] آل عمران ۔ ۲۳، انعام ۔، ۸۴، اعراف ۔ ۵۹، ۶۹ توبہ ۔ ۷۰، یونس ۔ ۷۰، ہود ۔ ۲۵، ۳۲، ۳۶، ۴۲، ۴۵، ۵۶، ۵۸، ۷۹، ابراہیم ۹، اسراء ۔ ۲، ۱۲، مریم، ۷۸، انبیاء ۔ ۷۶، حج ۔ ۴۲، مومنون ۔ ۲۳، فرقان ۔ ۳۷، شعراء ۔ ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۶، عنکبوت ۔ ۱۴، احزاب ۔ ۷، صافات ۷۵، ۷۹۔
ص ۔ ۱۲، مومن ۔ ۵، شوریٰ ۔ ۱۳، ق ۔ ۱۴، ذاریات ۔ ۴۶، نجم ۔ ۵۲، قمر ۔ ۹ ۔ حدید ۔ ۲۶، تحریم ۔ ۱۰، نوح ۔ ۱، ۲۱، ۲۶۔

کیا گیا ہے۔ آیات کے مضامین سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد ہم ہر قسم کی تفسیر و وضاحت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، سوائے ان آیات کے جن کی تفسیر ہم مناسب مقامات پر آگے چل کر پیش کریں گے۔

موضوع سے متعلق آیات

إِنَّ اللهَ اصْطَفَىٰٓ اٰدَمَ وَنُوحًا وَّاٰلَ إِبْرٰهِيمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿۳۳﴾ (آل عمران۔ ۳۳)

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ......

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّينِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا ...... (شوریٰ۔ ۱۳)

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوحٍ .... (الاحزاب۔ ۷)

إِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ﴿۳﴾ (الاسراء۔ ۳)

إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۱﴾ (الصّٰفّٰت۔ ۸۱)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا......... (العنکبوت۔ ۱۴)

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِينَ ﴿۷۸﴾

سَلٰمٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعٰلَمِينَ ﴿۷۹﴾ (الصّٰفّٰت۔ ۷۸، ۷۹)

آیات کا ترجمہ

۱)۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ، نوحؑ اور ابراہیمؑ و عمران کے خاندانوں کو عالمین سے چن لیا اور انہیں برتری عطا فرمائی۔

۲)۔ ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد والے انبیاء کی طرف بھیجی تھی۔

۳)۔ تمہارے لیے ہم نے اس دین کی تشریع کی جس کی سفارش نوحؑ کو کی گئی تھی۔

۴)۔ جب ہم نے انبیاء سے تم سے اور نوحؑ سے عہد و پیمان لیا۔

۵)۔وہ اللہ کے شکر گزار بندے تھے۔

۶)۔وہ مومن بندوں میں سے ہیں۔

۷)۔ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم (کی ہدایت کے لیے) بھیجا، پس وہ ان کے درمیان ایک ہزار سے پچاس سال کم رہے۔

۸)۔ہم نے اس کا نیک نام آئندہ آنے والوں میں زندہ رکھا۔

۹)۔(تمام) جہانوں والوں میں نوحؑ پر درود ہو۔

مذکورہ آیات سے مجموعی طور پر حضرت نوحؑ کی زندگی کا اجمالی سا خاکہ سامنے آجاتا ہے اور واضح ہوجاتا ہے کہ وہ:

اللہ کے برگزیدہ بندہ تھے اور ان پر وحی نازل ہوئی تھی۔

وہ سب سے پہلے صاحب شریعت الٰہی کے حامل انسان تھے۔

بڑے انبیاء سے لیا گیا عہد و پیمان اس عظیم شخصیت سے بھی لیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی مومن اور شکر گذار بندہ کے طور پر توصیف فرمائی ہے۔

آیت میں ان کی طولانی عمر کا ذکر ہوا ہے۔

نیک اعمال کے باعث ان کا ذکر پاک ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آخرکار (اللہ تعالیٰ نے) ان پر اپنے درود و رحمت خصوصی کے نزول کا ذکر فرمایا ہے۔

آپ کی اس طرح کی شخصیت، ان خصوصیات کے ساتھ، تاریخ انبیاء کے سلسلہ کی ایک عظیم کڑی اور انسانوں کی پدر ثانی کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی ہے۔اب ان کی زندگی کے سات قرآنی پہلوؤں میں دوسرے پہلو کا تذکرہ کرنے کا موقعہ آن پہنچا ہے۔

(۲)۔حضرت نوحؑ کے خلاف تہمتیں اوراعتراضات

موضوع سے متعلق آیات

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ (الاعراف۔۶۰)

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ (ہود۔۲۷)

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ (مومنون۔۲۴،۲۵)

قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (الشعراء۔۱۱۱)

فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ﴿۹﴾ (الشعراء۔۱۱۶)

آیات کا ترجمہ

۱)۔اس کی قوم کے بڑوں نے کہا کہ ہم نے تجھے واضح گمراہی میں پاتے ہیں۔

۲)۔اس کی قوم کے کافر اشراف نے کہا کہ ہم نے تجھے اپنے جیسا بشر ہی پاتے ہیں، تیری پیروی صرف مفلس اور گمنام لوگوں نے ہی کی ہے۔ بلکہ ہم تو تجھے جھوٹوں میں شمار کرتے ہیں۔

۳)۔اسکی قوم کے اشراف نے جو کافر تھے، کہا یہ نوح تمہاری طرح ہی کا ایک بشر ہے، جو تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ نے نبی ہی بھیجنا تھا تو فرشتوں میں سے بھیجتا۔ جو باتیں یہ کہتا ہے ہم نے وہ اپنے آباؤاجداد

سے نہیں سنیں۔ یہ شخص تو صرف ایک پاگل کے سوا کچھ نہیں۔

۴)۔نوحؑ کی قوم میں سے اس کے مخالفوں نے کہا کہ کیا، ہم تم پر ایمان لائیں جب کہ تمہارے پیروکار سب مفلس اور گمنام لوگ ہیں۔

۵)۔انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ اگر تو اپنی تبلیغ سے دستبردار نہ ہو گا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے۔

۶)۔ ہمارے بندہ کو انہوں نے جھٹلایا اور کہا کہ یہ دیوانہ اور آسیب زدہ ہے، قوم نوح کی باتوں کو مجموعی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱)۔الزامات

۲)۔اعتراضات

حضرت نوحؑ پر جو چار الزام لگائے گئے ہیں وہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان میں معاشرتی یا اخلاقی کمزوری نہیں پائی جاتی تھی، اگر ان میں کوئی سماجی یا اخلاقی نقص ہوتا تو یقیناً اس کے بارے میں الزام لگایا جاتا لیکن ان کی زندگی اتنی شفاف تھی کہ وہ ان پر اس طرح کی تہمت نہ لگا سکے۔لہٰذا مجبور ہو کر وہ ایسے الزامات لگاتے تھے جن سے دنیا کا کوئی مصلح بھی نہیں بچا، ایسے الزامات جن کو ثابت کرنا یا ان کی تردید کرنا مشکل ہوتا ہے۔

الف: تہمتیں

سب سے پہلے صاحب شریعت نبی پر تہمتیں باندھی گئیں۔

۱)۔دیوانگی کا اتہام

فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ﴿٩﴾

ہمارے بندہ کو انہوں نے جھٹلایا اور کہا کہ یہ دیوانہ اور آسیب زدہ ہے۔(قمر۔۹)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٢٥﴾

اس کی قوم کے اشراف نے کہا: ”وہ ایک دیوانہ ہے، صبر کرو جب تک اس کی زندگی ختم نہ ہو جائے“۔(مومنون۔۲۵)

یہ اتہام حضرت نوحؑ ہی سے مخصوص نہیں ہیں کیونکہ دیوانگی و جادو کی تہمت تو اکثر انبیاء پر لگائی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

كذلك ما اتى الذين من قبلهم من رسولٍ الا قالوا ساحرا و مجنون

اسی طرح پہلی امتوں کے پاس کوئی بھی رسول نہیں آیا ، مگر یہ کہ انہوں نے کہا وہ جادوگر یا دیوانہ ہے۔(الذاریات۔۲۵)

پیغمبر اسلام پر دیوانگی کا الزام لگانے کا تذکرہ متعدد آیات میں آیا ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے مصلحین کو ہمیشہ دیوانہ اور مخبوط الحواس کہا جاتا رہا ہے کیونکہ لوگوں کی نگاہ میں عقل وخرد کا معیار معاشرہ کے افکار کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہی ہے چاہے وہ افکار درست ہوں یا غلط۔لہٰذا جو شخص معاشرہ میں تبدیلی لانے کی کوشش کرے اور سختیوں کا مقابلہ کرے ان کی نظر میں وہ دیوانہ ہے۔

۲)۔دروغگوئی کا الزام

فَضۡلٍۭ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ ﴿۲۷﴾

ہم تو تمہیں دورغ گو خیال کرتے ہیں۔(ہود۔۲۷)

لیکن کس دلیل سے اور کیوں؟ اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔

۳)۔گمراہی کی تہمت

قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰٮكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۶۰﴾

اس کی قوم کے اشراف نے کہا کہ ہم تو تمہیں واضح گمراہی میں پاتے ہیں۔(اعراف۔۶۰)

کیونکہ اکثر افراد ہمیشہ اپنے مخالفین پر گمراہی وضلالت کا الزام لگاتے ہیں تا ہم ان کی بات اس وقت ہی قابل قبول ہوسکتی ہے جب وہ الزام کے ساتھ ثبوت بھی پیش کریں۔

۴)۔برتری طلب کرنے کا الزام

وَمَا نَرٰى لَكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ

ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی برتری نہیں دیکھتے۔(ہود۔۲۷) نیز

فَقَالَ الۡمَلَؤُا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ...... يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتَفَضَّلَ عَلَيۡكُمۡ

اس قوم کے کافر اشراف نے کہا کہ نوحؑ تو چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔(مومنون۔۲۴)

یہاں تک ہم نے ان الزامات کا تذکرہ کیا جو سب معنوی و روحانی اعتبار سے ہیں، اب ان کے سطحی الزامات کا ذکر کرتے ہیں۔

ب: اعتراضات

١)۔ انسان ہونا

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

ہم تو تجھے اپنے جیسا بشر ہی پاتے ہیں۔ (ہود۔27)

نیز ایک اور سورہ میں یہ تہمت اس طرح لگائی گئی ہے:

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

اس کی قوم کے اشراف نے کہا کہ یہ (نوحؑ) تو تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہے۔ (مومنون۔24)

انسان ہونے پر اعتراض کرنا ایک خاص طرز فکر کی نشان دہی کرتا ہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اللہ کے نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے نہ کہ بشر۔ دیوانگی کی طرح یہ الزام بھی حضرت نوحؑ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ یہ الزامات دوسروں پر بھی لگایا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

جب لوگوں کی طرف ہماری ہدایت آئی تو انہیں ایمان لانے سے اس بات کے علاوہ کسی چیز نے نہ روکا کہ انہوں نے اعتراض کیا کہ کیا اللہ نے انسان ہی کو رسول کے طور پر برگزیدہ کر دیا ہے۔ (اسراء۔94)

یہ تنگ نظر لوگ اس بات سے غافل تھے کہ ہدایت کرنے والے اور ہدایت پانے والے کے درمیان استاد و شاگرد کی طرح ایک تعلق ہوتا ہے تا کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور باہم متوجہ ہو سکیں۔

٢)۔ مفلس اور گمنام پیروکاران

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ

ہم واضح طور پر تیرے پیروکار غریب اور غیر معروف لوگوں کو ہی پاتے ہیں، اشراف اور سردار تیرے پاس نظر نہیں

آتے۔(ہود۔27)

ایک اور جگہ پر یہی اعتراض اس طرح بیان کیا گیا ہے:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

نوحؑ کی قوم میں اس کے مخالفوں نے کہا کہ کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں جب کہ تیرے ماننے والے مفلس اور گمنام لوگ ہیں؟۔(شعراء۔111)

لیکن کیا پیروکاروں کا مفلس وگمنام ہونا ایک دین کے بے بنیاد ہونے کی دلیل ہے؟ یہ دیکھنا چاہیے کہ نوحؑ نے اس اعتراض کا کیا جواب دیا!

حضرت نوحؑ کے مخالفین نے الزامات کی بوچھاڑ کے بعد ایک اور قدم اٹھایا اور انہیں جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دے دی، قرآن نے ان کی دھمکی کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ اگر تو اپنی تبلیغ سے باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے۔(شعراء۔116)

ان نادان اور متعصب لوگوں سے یہ اعتراضات والزامات بعید نہیں ہیں جو دین الٰہی کی تبلیغ کے وقت اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اور کپڑے سے منہ ڈھانپ لیتے تھے کہ نوحؑ کی بات نہ سن سکیں۔طوفان سے پہلے کے واقعات میں ان کے تعصب کا تفصیلی ذکر آئے گا۔یہاں تک ہم قوم نوحؑ کے اعتراضات اور تہمتوں سے آگاہ ہوئے۔اب حضرت نوحؑ کے جواب کا جائزہ لینا ہوگا۔

(۳)۔الزامات واعتراضات کے سلسلہ میں حضرت نوحؑ کا جواب

موضوع سے متعلق آیات

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰىنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ
فَعُمِّيَتۡ عَلَيۡكُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ ﴿۲۸﴾
وَيٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَلٰـكِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾
وَيٰقَوۡمِ مَنۡ يَّـنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ طَرَدْتُّهُمۡ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳۰﴾
وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَـكُمۡ عِنۡدِىۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّىۡ مَلَكٌ وَّلَاۤ
اَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ تَزۡدَرِىۡۤ اَعۡيُنُكُمۡ لَنۡ يُّؤۡتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيۡرًا ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡۤ
اَنۡفُسِهِمۡ ۖۚ اِنِّىۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾ (ھود۔۲۸ تا ۳۱)
قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ ضَلٰلَةٌ وَّلٰـكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶۱﴾
اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنۡصَحُ لَـكُمۡ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۲﴾
اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ وَلِتَتَّقُوۡا
وَلَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۶۳﴾ (الاعراف۔۶۱ تا ۶۳)
قَالَ وَمَا عِلۡمِىۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنۡ حِسَابُهُمۡ اِلَّا عَلٰى رَبِّىۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾
وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۱۵﴾ (الشعراء۔۱۱۲ تا ۱۱۵)

آیات کا ترجمہ

۱)۔اس نے کہا کہ اے قوم! مجھے بتاؤ، اگر میں اللہ کی جانب سے برہان ودلیل کے ساتھ آیا ہوں اور اس نے مجھے

اپنی رحمت (نبوت) کا اعزاز عطا فرمایا ہو، جو تم سے مخفی ہے، تو کیا پھر بھی میں دروغ گو یا گمراہ ہوں؟ کیا میں تمہیں ایمان لانے پر مجبور کر سکتا ہوں جب کہ تم اسے پسند نہیں کرتے ہو؟

۲)۔اے قوم! میں اپنی تبلیغ کے بدلہ میں تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا صلہ تو اللہ کے پاس ہے، میں باایمان لوگوں کو دھتکارتا نہیں ہوں، وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرتے ہیں، اپنے اعمال کی جزا پاتے ہیں میں تو تمہیں ایک نادان قوم پاتا ہوں۔

۳)۔اے قوم! اگر میں ان پاک اور خدا پرست لوگوں کو اپنے سے دور کردوں (تو اللہ مجھ سے ناراض ہوجائے گا) تو کس کی مدد سے (اللہ کی ناراضگی) سے نجات پاؤں گا۔

۴)۔میں نہیں کہتا کہ اللہ کے خزانے میرے پاس ہیں یا میں غیب کے رازوں سے آگاہ ہوں، نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، تم جنہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو میں ان کے بارے میں بھی یہ نہیں کہتا کہ اللہ انہیں جزائے خیر نہیں دے گا۔ اللہ ان کے اندر سے زیادہ آگاہ ہے، اگر میں ان کے ساتھ ایسا سلوک کروں تو ظالمین میں سے ہوجاؤں گا۔

۵)۔اس نے کہا کہ اے قوم! میں گمراہ یا بھٹکا ہوا نہیں ہوں، میں تو تمام جہانوں کے رب کی طرف سے پیغام لانے والا ہوں۔

۶)۔میں اس کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں تمہیں نصیحت کرتا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

۷)۔کیا تم اس بات پر حیران ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے کلام تم ہی میں سے ایک شخص پر آیا ہے، تا کہ وہ تمہیں ڈرائے، پس تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔

۸)۔اس نے کہا کہ میں ان کے کاموں سے آگاہ نہیں ہوں جو انہوں نے پہلے انجام دیئے ہیں، ان کے اس طرح کے اعمال کا حساب میرے پروردگار کے پاس ہے۔ اگر تم جانتے ہو، میں مومن افراد کو اپنے پاس سے دور نہیں کروں گا، میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

الف: حضرت نوحؑ نے دروغ گوئی اور اپنے بشر ہونے کے اعتراض کا جامع جواب دیا، ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

مجھے بتاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل برہان کے ساتھ آیا ہوں اور اس نے مجھے اپنی اس رحمت (نبوت) سے، جو تم سے مخفی ہے، نوازا ہے (تو کیا پھر بھی میں دروغ گو اور گمراہ ہوں)؟ کیا میں تمہیں ایمان لانے پر مجبور کر سکتا ہوں جب کہ تم اسے پسند نہیں کرتے؟ (ہود۔28)

حضرت نوحؑ نے اس جواب میں یہ یاددہانی کرائی ہے کہ مجھ پر جھوٹا ہونے کا الزام کیوں کر لگاتے ہو، حالانکہ میں خدا کی طرف سے دلیل و معجزہ لے کر آیا ہوں جو جہان غیب کے ساتھ میرے رابطہ کو واضح طور پر ثابت کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میں تم جیسا بشر ہوں تاہم اگر تمہاری جانب اللہ کی طرف سے کوئی بشر رحمت اور نبوت لے کر آئے اور اپنی نبوت پر اس کے پاس دلیل بھی ہو اور تم اپنے تعصب، ہٹ دھرمی کی بناء پر اس پر توجہ نہیں کرتے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے پر کوئی دلیل نہ ہوئی۔ تمہیں اس کی دلیل و برہان کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کے بعد فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر تم یہ طریقہ نہیں اپناتے تو جان لو کہ ہم تمہیں ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے، کیونکہ ایمان ایک قلبی حقیقت ہے اور اس کے لیے مخصوص مقدمات کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ مختصر یہ کہ مجھ پر دروغ گوئی کا الزام اور بشر ہونے کو اپنی دلیل بنانا تمہاری حقانیت کا ثبوت نہیں ہے حالانکہ میری حقانیت پر بینہ اور معجزہ دلیل کے طور پر موجود ہیں۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو ان کے متعلق اظہار رائے کرو۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾

کیا تم اس بات پر حیران ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم میں سے ہی ایک شخص تمہاری طرف آئے، وہ تمہیں ڈرائے تاکہ تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (اعراف۔63)

یعنی انسان ہونا نہ فقط یہ کہ پیغمبر ہونے سے متصادم نہیں ہے بلکہ یہ تو اس کی شرائط میں سے ہے۔ شاید ''رجل منکم'' کا جملہ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ب: گمراہی کے خصوصی الزام کی تردید اس طرح فرماتا ہے:

قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ ضَلٰلَةٌ وَّلٰـكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ‏ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنۡصَحُ لَـكُمۡ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ‏ ﴿۶۲﴾

اے قوم مجھ میں ضلالت وگمراہی نہیں ہے میں تو تمام جہانوں کے رب کی طرف سے پیغام لانے والا ہوں، اس کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں ، تمہیں نصیحت کرتا ہوں ، اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔(اعراف۔61)

یہاں تک ہم حضرت نوحؑ پر دروغگوئی وگمراہی کے لگنے والے الزامات اور بشر ہونے کے اعتراض کا جائزہ لے کر انہیں رد کر چکے ہیں۔اب ان کے حامیوں کے مفلس اور گمنام ہونے کے اعتراض کا جائزہ لیتے ہیں۔

ج: پیروکاروں کے مفلس اور غیر معروف افراد ہونے کے اعتراض کے بارے میں حضرت نوحؑ نے تین جواب دیئے ہیں:

ا)۔میں مال اور ثروت والا پیغمبر نہیں ہوں کہ مالدار لوگوں کو اپنے پاس بلاؤں اور مفلس لوگوں کو دھتکاردوں، میں اللہ کا رسول ہوں اور تمام طبقات کے لوگوں کی ہدایت کے لیے آیا ہوں۔یہی وجہ ہے کہ تم سے کوئی اجر و پاداش طلب نہیں کرتا۔لہٰذا تمہاری درخواست رسالت کے اہداف کے سلسلہ میں تمہاری جہالت کی دلیل ہے۔

قرآن نے اس جواب کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

وَيٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَلٰـكِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ‏ ﴿۲۹﴾

اے قوم! میں اپنی تبلیغ کے بدلہ میں تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میری جزا تو اللہ کے ذمہ ہے۔میں ایمان لانے والے لوگوں کو دھتکارتا نہیں، وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے (اپنے اعمال کی جزا پائیں گے) میں تو تمہیں ایک ناسمجھ قوم پاتا ہوں۔(ہود۔29)

۲)۔مکتب الٰہی میں انسان کی اہمیت اس کے ایمان سے ہے۔جنہیں تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، اپنے ایمان کی وجہ سے اللہ کے نزدیک ان کا مقام بلند ہے اور اللہ ان کے باطن سے آگاہ ہے۔قرآن نے اس جواب کی طرف اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَـكُمۡ عِنۡدِىۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّىۡ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ تَزۡدَرِىۡۤ اَعۡيُنُكُمۡ لَنۡ يُّؤۡتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيۡرًا ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۖۚ اِنِّىۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ‏ ﴿۳۱﴾

تم جنہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہتا کہ اللہ انہیں جزا نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے باطن سے زیادہ باخبر ہے، اگر میں ان کے ساتھ ایسا سلوک کروں گا تو ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔ (ہود۔31)

۳)۔ اگر یہ لوگ مجھ پر ایمان لانے سے پہلے تمہاری نظروں میں برے کام کر چکے ہیں تو یہ اس بات کا باعث بن سکتا ہے کہ اب جب کہ مومنین کی صف میں شامل ہو چکے ہیں تو میں انہیں دھتکار دوں۔ گویا حضرت نوحؑ نے اپنے اس جواب کے ذریعہ رسول اکرمؐ کے اس فرمان گرامی کی طرف اشارہ کیا ہے:

الاسلام یجب ما قبلہ

اسلام انسان کا رابطہ گذشتہ دور سے قطع کر دیتا ہے۔

قرآن نے حضرت نوحؑ کے اس جواب کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا ہے:

قَالَ وَمَا عِلۡمِیۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنۡ حِسَابُہُمۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّیۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۱۵﴾

میں ان کے اعمال سے آگاہ نہیں ہوں جو وہ پہلے کر چکے ہیں، ان کے اس طرح کے اعمال کا حساب میرے پروردگار کے پاس ہے۔ اگر تم جانتے ہوتو میں مومن لوگوں کو اپنے سے دور نہیں کروں گا۔ میں تو صرف آشکار طور پر ڈرانے والے سے زیادہ نہیں ہوں۔ (شعراء۔112 تا 115)

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے والے اکثر سرفہرست لوگ غالباً مفلس، کمزور اور غیر معروف افراد ہوتے ہیں۔ ثروت، دولت پر اگر قابو نہ پایا جائے تو یہ برائی اور تکبر کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا طبیعی طور پر اس طرح کے لوگ پیغمبروں کے اصلاحی طریق کار کی مخالفت کرتے ہیں اور اپنے شیطانی منصوبوں سے دست بردار نہیں ہوتے۔ غریب طبقہ میں چونکہ برائی کے ذرائع نہیں ہوتے اس لیے ان میں انبیاء کی طرف رجحان کا جذبہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ جب بھی کوئی آواز سنتے ہیں تو اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں، پیغمبر اکرمؐ اور باقی انبیاء کے دور کے سرمایہ داروں نے بھی ان سے وہی مطالبہ کیا جو حضرت نوحؑ سے کر چکے تھے۔

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے:

”قریش کے بڑے لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کے اردگرد صہیب رومی، بلال حبشی، خباب، عمار اور دوسرے غریب اور مستضعف لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو آنحضرتؐ سے کہا: ”کیا تم نے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا ہے اور اپنی قوم کو

ہاتھ سے کھو بیٹھے ہو؟ کیا ہم ان کی پیروی کریں؟ اگر تم ان کو اپنے پاس سے ہٹا دو تو شاید ہم تمہارے پیروکار بن جائیں۔"

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ عرب کے بعض مشہور لوگوں نے پیغمبرؐ کو مدینہ میں بلال، صہیب، عمار اور دوسرے مستضعف لوگوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا: اگر تم انہیں اپنے پاس سے دور کر دو تو ہم تمہاری محفل میں آن بیٹھیں گے کیونکہ عرب کے اشراف آپؐ کی طرف آتے ہیں تو ہمیں شرم آتی ہے کہ وہ ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھیں۔ جب ہم محفل سے اٹھ جائیں تو پھر انہیں دوبارہ بے شک بلا لو۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے اہداف رسالت سے متضاد افکار کا جواب اس طرح دیا ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

جو لوگ صبح و شام اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی نیت سے اسے پکارتے ہیں، انہیں اپنے سے دور نہ کرو، ان کے حساب میں سے نہ کچھ تم پر ہے اور نہ تمہارے حساب میں سے کچھ ان پر ہے (اگر اس طرح کرو گے تو) تم ظالموں میں ہو جاؤ گے اس طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ (ثروت مند کو فقیر کے ذریعہ، مولیٰ کو غلام کے ذریعہ) آزمایا، جس کے نتیجہ میں انہوں نے کہا کہ کیا یہ کمزور لوگ ایسے ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ (خدا کا ان پر کرم ہوا ہے) کیا اللہ شکر گذاروں کو خوب جاننے والا نہیں ہے؟ (انعام۔ 52، 53)

ہم اس گفتگو کو حضرت امیر المومنینؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

من اتی غنیًّا وتواضع لغناہ ذھب ثلثا المدینہ[2]

جو ثروت مند کا ہم نشین بنے اور اس کی دولت کی وجہ سے ان کے سامنے جھکے تو اس نے گویا اپنا دو تہائی دین ختم کر

---

[1] مجمع البیان، ج ۲ ص ۳۰۵،۳۰۶

دیا۔[1]

د: ادعائے نبوت کے ذریعہ برتری طلب ہونے کے الزام کا جواب حضرت نوحؑ نے اس طرح دیا ہے یعنی برتری طلب کرنے کا معیار ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات ہے:

۱)۔اپنی تخلیق کو دوسروں کی تخلیق سے جدا سمجھے اور یہ کہے کہ میں فرشتہ ہوں اور تم انسان ہو۔

۲)۔اپنے آپ کو غیب اور کائنات کے رازوں کو جاننے والا قرار دے۔اس طرح کہ اس علم کا محور بھی اپنی ذات ہی کو قرار دے۔

۳)۔اپنے آپ کو اللہ کی دولت کے خزانوں کا مالک سمجھے اور کہے کہ یہ سب میرے پاس ہیں، جب کہ میں نے ان میں سے کسی چیز کا ادعا بھی نہیں کیا۔

قرآن نے حضرت نوحؑ کی دلیل کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میرے پاس ہیں، میں غیب سے آگاہ ہوں اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔(ہود۔31)

سورۂ انعام کی آیات سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہمارے نبی اکرمؐ پر اس طرح کے الزامات واعتراضات کئے گئے تھے لہٰذا اللہ نے انہیں یہ حکم دیا:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ............... (انعام۔50)

یہاں تک ہم نے حضرت نوحؑ پر لگنے والے اتہامات اور ان پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ حضرت نوحؑ کے جواب سے بھی آگاہی حاصل کی۔اب تبلیغ کے سلسلہ میں ان کی مستقل مزاجی اور ان کی قوم کی ہٹ دھرمی کا جائزہ قرآنی نکتہ نظر سے لینے کا موقع آن پہنچا ہے۔

---

[1] مجمع البیان۔ج ۲،ص ۳۰۷

(۴)۔حضرت نوحؑ کا دعوت حق دینے کا طریقہ، مستقل مزاجی اور قوم کا انکار وہٹ دھرمی

موضوع سے متعلق آیات

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝١٠ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ
مِّدْرَارًا ۝١١ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ
اَنْهٰرًا ۝١٢ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝١٣ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝١٤ اَلَمْ تَرَوْا
كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝١٥ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ
الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝١٦ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝١٧ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا
وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝١٨ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝١٩ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا
سُبُلًا فِجَاجًا ۝٢٠ (نوح۔۱۰تا۲۰)

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝٥ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝٦
وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا
ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝٧ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝٨ ثُمَّ
اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝٩ (نوح۔۵تا۹)

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ۝٣٢ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝٣٣ وَلَا
يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ
هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٣٤ (ہود۔۳۲تا۳۴)

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ﴿۱۱۶﴾ (الشعراء۔۱۱۲)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔میں نے ان سے کہا کہ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، یقیناً وہ بڑا بخشنے والا ہے تاکہ وہ آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش برسائے تمہاری مال و اولاد سے مدد کرے وہ تمہارے باغات پیدا کرے اور نہریں جاری فرمائے، تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے، حالانکہ اس نے تمہیں طرح طرح کا پیدا کیا ہے۔کیا تم نہیں دیکھتے (جانتے نہیں ہو) کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کئے، چاند کو ان میں منبع نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین سے سبزے کی طرح اگایا پھر وہ تمہیں اسی میں دوبارہ لوٹا دے گا پھر نکال کر باہر لائے گا۔اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی مانند بچھا دیا تاکہ تم اس کے کشادہ راستوں اور دروں سے گذر سکو۔

۲)۔نوحؑ نے کہا: اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو دن رات تیری طرف بلایا، لیکن میری پکار نے سوائے ان کے بھاگنے کے کوئی نتیجہ نہ دیا۔میں جب بھی انہیں پکارتا (کہ ایمان لاؤ) تاکہ تو ان کے گناہ بخش دے تو وہ اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ڈال لیتے۔اپنے سروں پر کپڑے اوڑھ لیتے اور بڑی ہٹ دھرمی سے تکبر کرتے۔(قوم کی اس ہٹ دھرمی کے باوجود) میں نے انہیں علی الاعلان دعوت دی، پھر میں نے انہیں کھلم کھلا اور پوشیدگی میں تیری جانب بلایا (بعض کو علی الاعلان اور بعض کو چھپ کر دعوت دی)۔

۳)۔انہوں نے کہا: اے نوحؑ! یقیناً تو ہم سے بحث کر چکا، پھر تو نے ہم سے بہت جھگڑا کیا، لہٰذا اگر تو سچوں میں سے ہے تو جس عذاب کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے وہ ہم پر لے آ۔نوحؑ نے جواب دیا: ”جب اللہ تعالیٰ چاہے گا اس کا عذاب نازل ہوگا۔تم اسے عاجز نہیں کر سکتے، نہ ہی میری نصیحت تمہیں فائدہ نہیں دے گی اگرچہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ تمہیں نصیحت کروں، جب کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تمہیں گمراہی پر سزا دے، وہ تمہارا پروردگار ہے۔اور تم اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

۴)۔انہوں نے کہا: ”اے نوحؑ! اگر تو اپنی باتوں سے باز نہ آیا تو ضرور سنگسار ہونے والوں میں سے ہو جائے گا۔

ہدایات و نصائح

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کی ہدایت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ کیا اور انہیں یاددہانی کرائی کہ ممکن ہے تمہارے گناہ اس فیض الٰہی کے دوام کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بارش برسے گی، تمہارے مال واولاد میں اضافہ ہوگا، باغات لہلہائیں گے اور چشمے پھوٹ نکلیں گے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲

میں نے ان سے کہا کہ اپنے رب سے بخشش طلب کرو کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے، تاکہ موسلا دھار بارش تمہارے لیے بھیجے، مال واولاد کے ساتھ تمہاری مدد کرے اور باغات و بہنے والی نہریں تمہارے سپرد کرے۔ (نوح۔10، 12)

حضرت نوحؑ نے اس بیان میں ایک مخفی نکتہ سے پردہ اٹھایا ہے جو نعمتوں کی تباہی کفر وگناہ اور ایمان و پاکیزگی کے قریبی تعلق پر مشتمل ہے۔

یقیناً مادی زندگی اس رابطہ غیبی سے آگاہ نہیں ہے، اسلامی روایات میں زنا کے پھیلنے کو معاشرے میں ناگہانی اموات کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ گناہ کسی اور سے سرزد ہو لیکن اس کا نتیجہ کہیں اور ظاہر ہو۔ یہ روابط غیبی روابط ہیں اور چونکہ بشر ان تعلقات سے آگاہ نہیں ہے اس لیے قانون گزاری کا حق اللہ کو ہے جو ان تمام مخفی رازوں سے آگاہ ہے۔

علاوہ ازیں کفر وگناہ کا نتیجہ ہمیشہ گناہ شکنی اور دوسرے انسانوں کے حقوق کا خیال نہ کرنا ہے۔ وہ معاشرہ جو اس طرح کے گناہوں میں آلودہ ہو بے نظمی کی وجہ سے انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ مادی لحاظ سے بھی ترقی نہیں کر پاتا۔ اس طرح کے گنہگار معاشرہ میں اگر نعمتوں کی فراوانی نظر آ رہی ہو تو وہ ان بعض اخلاقی وسماجی اصولوں کی مرہون منت ہوتی ہے جن کا حکم آسمانی شریعتوں نے بھی دیا ہے۔ بہرحال قرآن مجید نے ایک اور آیت میں بھی اسی اصول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ

اگر آبادیوں کے لوگ ایمان لائیں، تقویٰ اختیار کریں، تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ (اعراف۔96)

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے تورات وانجیل پر عمل کرنے کو بھی نعمتوں میں اضافہ کا باعث قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ

اگر وہ تورات، انجیل اور جو کچھ ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے، اس پر عمل کرتے تو زمینی و آسمانی نعمتوں سے مالا مال ہو جاتے۔ (مائدہ۔66)

کیا اس سے مراد اصلی تورات و انجیل ہیں جن میں انسان نے کوئی قطع و برید نہیں کی یا یہی موجودہ تورات و انجیل ہیں جن میں اتنی زیادہ تحریف ہو چکی ہے کہ اگر دوسری کتب مراد ہوں تو یہ بھی اس لیے کہ ان کے بعض حصوں میں ایسے الٰہی قانون باقی ہیں جن پر عمل کرنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی اس سلسلہ میں فرمایا ہے:

قد جعل الله سبحانه الاستغفار سببًا لرود الرزق ورحمة الخلق فقال: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا [1]

اللہ سبحانہ نے استغفار کو رزق میں اضافہ اور مخلوق پر رحمت کا سبب قرار دیا ہے، نیز فرمایا ہے کہ اللہ سے بخشش طلب کرو کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے، وہ آسمان سے بابرکت بارش تم پر نازل فرمائے گا۔

اس کے بعد حضرت نوحؑ نے ان (اپنی قوم) کی توجہ توحید اور اللہ کی قدرت سے متعلق نشانیوں کی طرف مبذول کراتے ہوئے ان کو ایسے عظیم پروردگار کی عبادت کرنے کی نصیحت فرمائی جس نے سورج و چاند پیدا کر کے پوری کائنات کو مزین کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾

تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کو کیوں نہیں مانتے ہو حالانکہ اس نے تمہیں طرح طرح کا پیدا کیا ہے؟ کیا تم نے دیکھا

---

[1] مجمع البیان۔ ج ۲، ص ۳۰۷

نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا، چاند کو ان میں ذریعہ نور بنایا اور سورج کو چمکتا ہوا چراغ بنایا، اللہ سبحانہ نے تمہیں سبزے کی طرح زمین سے اگایا، پھر وہ تمہیں اس میں لوٹا دے گا اور دوبارہ نکال کر باہر لائے گا۔ اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی مانند بچھایا تا کہ تم اس کے کشادہ راستوں اور درّوں سے گذر سکو۔ (نوح۔13، 20)

جیسا کہ بعد کی آیات کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ بت پرست تھی۔ کائنات کے خالق کی عبادت کرنے کی بجائے وہ حقیر و کمزور موجودات کی عبادت کرتے تھے۔ ان (نوحؑ) کی ہدایت کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال کا تذکرہ فرماتے، اس کی نعمتیں یاد دلاتے تا کہ اس ذریعہ سے ان کی فکر اس پست دنیا سے اس برتر بالا ہستی کی طرف مبذول ہو، پھر اس سلسلہ میں اس قدرت کے مظاہر، سات آسمانوں اور سورج و چاند کا انتخاب کر کے ان کے متعلق گفتگو کرتے تا کہ وہ دیکھیں اور غور کریں کہ کیا اس عظیم نظام کا خالق عبادت کے لائق ہے یا بے جان و بے روح بت؟ اس کے بعد زمین پر موجود بے شمار نعمتوں کا تذکرہ فرماتے جو انسان کی زندگی کو شکل دیتی ہیں یعنی یہ کہ زمین اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس کے راستوں اور درّوں سے گذر سکتا ہے اور فاصلے طے کر سکتا ہے کیا اس طرح کا منعم عبادت کے لائق ہے یا بے جان بت؟

قابل غور بات یہ ہے کہ ان آیات میں حضرت نوحؑ نے سورج کو چراغ اور چاند کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ سورج کا نور ہے جو اس کا اپنا ہے اور اس کے اندر سے پھوٹتا ہے جب کہ چاند کا نور سورج کے نور کا پرتو ہے۔ اپنی گفتگو میں انہوں نے قیامت کا ذکر بھی فرمایا ہے تا کہ یہ بات واضح کریں کہ انسان کی آفرینش لغو و بیکار نہیں ہے بلکہ اس پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کا حساب اس سے دوسری دنیا میں لیا جائے گا۔

انہوں نے اگرچہ اللہ تعالیٰ کا پیام بڑے محبت بھرے انداز میں ان کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ میں اللہ کا امین [1] رسول ہوں، اپنی تبلیغ کے لیے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا [2] پھر قوم کا اپنے آپ کو ہمدرد [3] بتایا، اس کے باوجود ان کی قوم نے ان کے مقابلہ میں بڑی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور اتنی سختی کا مظاہرہ کیا کہ ان کی بات سننے پر بھی تیار نہ ہوئے۔ وہ جب بھی بات شروع کرتے تو یہ لوگ اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں دے لیتے، سر پر کپڑے ڈال لیتے، تا کہ ان کے کانوں سے حضرت نوحؑ کی ذرا بھی آواز نہ ٹکرانے پائے۔ یہ بات بذات خود بہت بڑی دشمنی اور تعصب کی علامت ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورۂ شعراء۔ ۱۰۷

[2] سورۂ شعراء۔ ۱۰۹، سورۂ ہود۔ ۲۹

[3] سورۂ اعراف۔ ۶۲

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَ اَصَرُّوۡا وَ اسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا ۚ﴿۷﴾

نوحؑ نے کہا: میں نے اپنی قوم کو دن رات تیری طرف بلایا، لیکن میری پکار نے سوائے ان کے بھاگنے کے کوئی نتیجہ نہ دیا۔ میں جب بھی انہیں پکارتا (ایمان لاؤ) تاکہ تو ان کے گناہ بخش دے تو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے اپنے سر پر کپڑے اوڑھ لیتے اور بڑی ہٹ دھرمی سے تکبر کرتے۔ (نوح۔5،7)

تبلیغ حق میں مستقل مزاجی

قرآن مجید نے ان کی تبلیغ و رسالت کی مدت ۹۵۰ سال بتائی ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے نہایت مستقل مزاجی سے تبلیغ کی اور ذرہ بھر بھی نہیں گھبرائے۔ یہ حقیقت اس آیت مبارکہ میں بیان ہوئی ہے:

ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُہُمۡ جِہَارًا ۙ﴿۸﴾ ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَہُمۡ وَ اَسۡرَرۡتُ لَہُمۡ اِسۡرَارًا ۙ﴿۹﴾

(قوم کی اس ہٹ دھرمی کے باوجود) میں انہیں علی الاعلان دعوت دیتا، پھر میں نے انہیں کھلم کھلا اور کبھی چھپ کر بھی تیری طرف بلایا (بعض کو علی الاعلان اور بعض کو چھپ کر دعوت حق دی) لیکن میری اس مستقل مزاجی کے مقابلہ میں انہوں نے اسی طرح کی شدید ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے کو تاکید کی کہ کہیں اپنے خداؤں کو چھوڑ کر ودّ، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر نامی بت کی عبادت سے دستبردار نہ ہونا۔ (نوح۔8،9)

یہ قوم نوح کے پانچ بت تھے۔ لیکن بعد میں نامعلوم عوامل کے باعث یہ نام عرب معاشرہ میں بھی آگئے اور ان میں سے ہر ایک عرب مشرکین کے قبیلوں کا بت بن گیا۔ [۱]

قرآن نے قوم نوحؑ کے تعصب اور ہٹ دھرمی کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی انہیں "کور دل" "کَانُوۡا قَوۡمًا عَمِیۡنَ" [۲]

، گنہگار لوگ "کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ" [۳]

---

[۱] مجمع البیان، ج ۵، ص ۳۶۴

[۲] اعراف۔ ۶۴

[۳] ۳ذاریات۔ ۴۶

ظالم اور باغی، ”کَانُوْا ھُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی“ [۱]

اور مغرور و متکبر ”اِسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا“ [۲]

قرار دیا ہے۔ ہم یہاں سے اس طرح کی امتوں کے مقابلہ میں انبیاء کی کوششوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

---

[۱] نجم۔ ۵۲

[۲] نوح۔ ۷

(۵)۔ ہمہ گیر طوفان اور کفار کی نابودی

موضوع سے متعلق آیات

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ
يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ (نوح۔۲۶،۲۷)

حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ
وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَا اٰمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٤٠﴾
وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٤١﴾
وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ...... وَقِيلَ يٰأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيٰسَمَاءُ
أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ۝ .... قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ
وَعَلٰى أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۭ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ
أَلِيمٌ ﴿٤٨﴾ (ہود۔۴۰،۴۱،۴۲،۴۴،۴۸)

فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ۙ فَاسْلُكْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ
إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم
مُّغْرَقُونَ ﴿٢٧﴾ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنتَ وَمَن مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِي نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ﴿٢٨﴾ وَقُل رَّبِّ أَنزِلْنِي مُنزَلًا مُّبٰرَكًا وَّأَنتَ
خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٢٩﴾ (المومنون۔۲۷تا۲۹)

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِينَ ﴿٧٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِينَ ﴿٧٨﴾ (الصّٰفّٰت۔

۷۷،۷۸)

فَفَتَحۡنَاۤ اَبۡوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنۡهَمِرٍ ۝۱۱ وَّفَجَّرۡنَا الۡاَرۡضَ عُیُوۡنًا فَالۡتَقَی الۡمَآءُ
عَلٰۤی اَمۡرٍ قَدۡ قُدِرَ ۝۱۲ وَحَمَلۡنٰهُ عَلٰی ذَاتِ اَلۡوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝۱۳ تَجۡرِیۡ بِاَعۡیُنِنَا ۚ جَزَآءً
لِّمَنۡ کَانَ کُفِرَ ۝۱۴ (قمر۔۱۱ تا ۱۴)
اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰکُمۡ فِی الۡجَارِیَۃِ ۝۱۱ (الحاقہ۔۱۱)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔میرے پروردگار! روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو اسی حالت پر چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور گنہگار کافروں کے علاوہ کچھ پیدا نہیں کریں گے۔

۲)۔یہ حالت اسی طرح رہی یہاں تک کہ ہمارا حکم آن پہنچا اور تنور جوش مارنے لگا۔ ہم نے نوحؑ سے کہا کہ اس کشتی میں ہر جوڑ (نر اور مادہ) میں دو دو سوار کر لو اور اسی طرح اپنے کنبہ کو بھی سوائے اس کے جس کے لیے ہلاکت کا حکم پہلے ہی ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے۔

۳)۔اس نے کہا کہ کشتی پر سوار ہو جاؤ، حرکت اور لنگر ڈالتے وقت اللہ کا نام زبان پر لاؤ کہ میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے۔ کشتی پہاڑ جیسی اونچی لہروں میں چلی جا رہی تھی۔۔۔زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنے پانی کو جذب کر لے اور آسمان کو حکم دیا گیا کہ تو تھم جا، پس پانی دونوں میں جذب ہو گیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل ہوا اور کشتی کوہ جودی پر جا کر ٹھہر گئی اور حکم دیا گیا کہ ظالم نابود ہو جائیں۔ کہا گیا کہ اے نوحؑ! تو سلامتی اور برکتوں کے ساتھ (کشتی سے) اتر جا، (سلامتی ہو) تجھ پر جو تیرے ساتھ مومن ہیں اور وہ امتیں جو بعد میں آئیں گی۔ لیکن آنے والی امتوں نے بھی گذشتہ امتوں کی طرح اگر کفر اختیار کیا تو ان پر بھی اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔

۴)۔اللہ کا حکم صادر ہو گیا اور تنور جوش مارنے لگا (عذاب کی علامت تنور سے آب کا پھوٹنا تھا) ان حالات میں ہر نوع سے ایک جوڑا اور اپنے کنبے کو کشتی پر سوار کر، سوائے ان کے جن کی نابودی یقینی ہے اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کر کہ وہ غرق ہونے والوں میں سے ہیں، جب کشتی پر سوار ہو جاؤ اور تمہیں سکون مل جائے تو

اللہ کا شکر کرنا نہ بھولنا، اس بات پر شکر کہ اس نے تمہیں ظالموں سے نجات بخشی۔

۵)۔ہم نے زمین پر اس کی اولاد کو باقی رکھا اور آنے والوں میں اس کی نیک نامی باقی رکھی۔

۶)۔ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے ساتھ کھول دیئے اور زمین پھاڑ کر کوئی چشمے جاری کر دیئے۔اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق یہ دونوں پانی ایک دوسرے سے مل گئے اور ہم نے نوحؑ کو تختوں اور کیلوں والی کشتی پر اٹھالیا جو ہماری نگرانی میں چلتی رہی تاکہ اس طرح کافر اپنے اعمال کی سزا دیکھ لیں۔

قوم نوحؑ کی ہٹ دھرمی اور تعصب حد سے بڑھ گیا، اس طرح کے متعصب انسان خلقت کے اہداف کی تکمیل نہیں کر سکتے لہٰذا باغبان کے بیلچے کا شکار ہونے والے خشک درخت کی طرح نیست و نابود ہو جانا چاہیے۔اتفاقاً اس دور کے طبیب حضرت نوحؑ جس نے یہ حقیقت جان لی تھی، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

پروردگار! روئے زمین پر کافروں کی ایک فرد بھی باقی نہ رہنے دے۔اگر تو نہیں اس حالت میں رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور گنہگار و کافر اولاد کے سوا کچھ نہیں جنیں گے۔(نوح۔26،27)

حضرت نوحؑ نے اس گفتگو میں عذاب کی درخواست کی وجہ بیان کر دی اور کہا ہے کہ وہ برائی میں غرق ہو چکے ہیں، ان کا وجود صرف تلخ ثمر ہی لا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت نوحؑ کی تائید کی اور ان سے کہا:

ہم نے نوحؑ سے کہا کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا کوئی ایمان نہیں لائے گا، لہٰذا ان کے کردار سے رنجیدہ خاطر نہ ہونا۔(ہود۔36)

زمین و آسمان میں عذاب کی نشانیاں

حضرت نوحؑ کی بددعا قبول کر لی گئی اور مشیت الٰہی اس چیز سے متعلق ہوئی کہ زمین کو کافروں کے وجود سے پاک کر دیا جائے۔اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہو گیا اور اس نے پہلے ہی عذاب کی یہ علامتیں بتا دیں، یعنی عذاب کی علامت تنور سے پانی کا پھوٹنا ہوگا۔اس صورت میں ہر نوع سے ایک جوڑا اور اپنے کنبہ کو کشتی پر سوار کر لو، سوائے ان کے جن کی ہلاکت یقینی ہو چکی ہے اور ظالموں کے متعلق مجھ سے بات نہ کرو کیونکہ وہ غرق ہونے والے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَإِذَا جَآءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ۙ فَاسْلُكْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۖ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٢٧﴾ (مومنون۔27)

ان حالات میں اچانک زمین نے اپنے اندر مخفی پانی کو باہر نکالنا شروع کر دیا، آسمان کے دروازے کھل گئے، موسلا دھار بارش شروع

ہوگئی۔ بجلی کی کڑک آنکھوں اور کانوں کو اذیت دے رہی تھی، اندھے اور بہرے انسان سوچنے لگے کہ باران رحمت ان پر نازل ہو رہی ہے ،لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ تنور تک سے پانی جوش مار رہا ہے تو سمجھ گئے کہ کوئی برا واقعہ پیش آنے والا ہے۔قرآن نے اس عذاب کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾

پس ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار پانی کے لیے کھول دیئے اور زمین کو پانی کے چشموں کے لیے پھاڑ دیا ۔اللہ کے حکم سے یہ پانی آپس میں مل گئے اور ہم نے نوحؑ کو تختوں اور کیلوں والی کشتی پر سوار کر دیا جو ہماری زیر نگرانی چلتی رہی حتیٰ کہ اس طریقے سے کافروں نے اپنے اعمال کی سزا دیکھ لی۔ (قمر۔11 تا 14)

قرآن مجید نے ''باعیننا'' کے کلمہ کو نوحؑ کی داستان میں دو جگہ استعمال کیا ہے،ایک کشتی بناتے وقت اور دوسرے کشتی کے چلتے وقت کہ دونوں اللہ کے کرم کے محتاج تھے۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ پانی نے سطح زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور نوحؑ کی کشتی حرکت میں آ گئی، جو مومن کشتی کے اردگرد تھے حضرت نوحؑ نے ان کو حکم دیا کہ جلدی سے کشتی پر سوار ہو جائیں اور ہر قسم کے حیوانات سے جو ایک جوڑا منتخب کیا تھا،انہیں بھی کشتی پر لے گئے اور مومنوں کو مخاطب کر کے کہا:

ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

کشتی پر سوار ہو جاؤ، کشتی کے چلتے وقت اور لنگر ڈالتے وقت اللہ کا نام زبان پر جاری کرو کہ میرا خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ (ہود۔41)

پانی کی سطح اتنی بلند ہوگئی کہ اس نے تمام آبادیوں، بلندیوں، چوٹیوں اور پہاڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پانی اتنا زیادہ تھا کہ اس میں تھوڑی سی ہلچل بھی کوہ پیکر موجیں وجود میں لے آتی، کشتی نوحؑ پانی کی سطح پر ہچکولے کھانے لگی اور پانی اسے ادھر سے ادھر لے جاتا۔ اللہ نے یہ کیفیت اس طرح بیان فرمائی ہے:

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ (ہود۔42)

نیز حکم دیا کہ جب تم کشتی پر سوار ہو جاؤ اور تمہیں ایک طرح سے سکون مل جائے تو اللہ کا شکر کرنا مت بھولو، اس بات پر شکر کہ اس نے تمہیں ظالموں سے نجات دی، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ (مومنون۔28)

طوفان کے بعد سکون

اب وقت آ گیا تھا کہ ایک بار پھر انسان کی نسل اترے اور کشتی والے کشتی چھوڑ کر زمین پر زندگی بسر کریں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین کے ماحول کو زندگی گذارنے کے لائق ہونا چاہیے تھا کہ پانی دوبارہ اپنی جگہ پر واپس چلا جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوا کہ زمین اپنا پانی جذب کر لے اور آسمان بارش بند کر دے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

زمین کو حکم ہوا کہ اپنا پانی جذب کر لے، آسمان کو حکم دیا گیا کہ بارش بند کر دے، پس پانی زمین میں جذب ہو گیا، قضائے الٰہی پوری ہو گئی، کشتی کوہ جودی پر ٹھہر گئی اور حکم ہوا کہ ظالم نابود ہو جائیں۔ (ہود۔44)

جس وقت زمین کسی حد تک زندگی گذارنے کے قابل ہو گئی تو کشتی سے نکلنے کا حکم صادر ہوا اور کشتی پر سوار افراد سے کہا گیا کہ سلامتی کے ساتھ کشتی سے نکل آؤ، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

کہا گیا کہ اے نوحؑ! ہماری سلامتی اور برکتوں کے ساتھ ان مومنین کو لے کر جو تیرے ساتھ ہیں اتر پڑ، البتہ وہ امتیں جو بعد میں آئیں گی، اگر ان آنے والی امتوں نے بھی گذشتہ امتوں کی طرح کفر اختیار کیا تو ان پر بھی اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ (ہود۔48)

آخری جملے سے مراد قوم عاد و ثمود ہیں جو قوم نوحؑ کے جانشین بنیں اور عذاب میں گرفتار ہوئیں۔ قوم عاد ہوا کی آندھی اور قوم ثمود ایسے زلزلے کے ذریعہ تباہ ہوئی جس میں بجلی کی کڑک بھی شامل تھی۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ نوحؑ سے ہم نے کہا کہ کشتی سے اترتے وقت اللہ کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں ظالموں کے چنگل سے نجات دلائی اور اس سے دعا کرو کہ وہ تمہیں ایک بابرکت زمین پر اتارے اور اللہ بہترین جگہ دینے والا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا

مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

کہو اس اللہ کی تعریف ہے جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دلائی نیز کہو کہ پروردگار! مجھے بابرکت جگہ پر اتار کہ تو بہترین جگہ دینے والا ہے۔ (مومنون۔ 28،29)

آخر کار کشتی سے اترنے کے بعد صرف نوحؑ کی اولاد ہی باقی رہی،، گویا دوسرے افراد سے بالکل بچے پیدا ہی نہ ہوئے تھے یا باقی نہ رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾

اس کی اولاد کو ہم نے زمین پر باقی رکھا اور آئندہ آنے والے لوگوں میں ہم نے اسے نیک نامی عطا فرمائی۔ (صافات۔ 77،78)

پس اگر حضرت نوحؑ کو موجودہ انسان کا پدر ثانی کہا جاتا ہے تو اس کی دلیل یہی آیت ہے۔

تاریخ میں بھی یہی آیا ہے کہ موجودہ انسان کی تمام نسل حضرت نوحؑ ہی کی اولاد ہے۔ ان کے ایک بیٹے سام تھے جو عربی و عجمی نسل کے باپ ہیں۔ ان کے ایک اور بیٹے ''یافث'' تھے جو ترکوں اور خزر کے باپ سمجھے جاتے ہیں اور ان کے تیسرے بیٹے حام سوڈان (سیاہ فام لوگوں) کے باپ ہیں۔

بہر حال حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے مومنین جو کشتی سے اترے تھے ان کی کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی یا ان کی اولاد باقی نہ رہی۔ نیز ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ عربی زبان میں ''طوفان'' بہت زیادہ پانی کو کہا جاتا ہے۔ لفظ فعل طاف (گھومنا، گردش کرنا) کو مصدر ہے، اس کا اطلاق جو سیلاب اور تیز ہوا پر ہوتا ہے تو یہ بھی ان دونوں میں موجود گردش اور گھیراؤ کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔

(٦)۔اولاد نوحؑ کی سرگذشت

موضوع سے متعلق آیات

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ إِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٧﴾ (المومنون۔٢٧)

وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ
مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ
الْمُغْرَقِيْنَ ○......وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ
الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ○ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ
غَيْرُ صَالِحٍ ڶ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ
الْجٰهِلِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا
تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٤٧﴾ (ہود۔ ٤٢، ٤٣، ٤٥ تا ٤٧)

آیات کا ترجمہ:

١)۔ظالموں (یہاں تک کہ اپنے نا اہل بیٹے) کے بارے میں مجھ سے بات نہ کر (اور ان کے متعلق کوئی درخواست نہ کر کہ) وہ سب ڈوبنے والے ہیں۔

٢)۔نوحؑ نے اپنے اس بیٹے کو جو اپنے باپ سے دور تھا، آواز دی اور کہا کہ میرے بیٹے! میرے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ مت رہ۔اس نے کہا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔فرمایا کہ آج کسی کو بھی اللہ کے فرمان (طوفان) سے بچانے والا کوئی نہیں ہے، پانی کی لہریں ان دونوں کے درمیان آ گئیں اور وہ غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا، نوحؑ نے اپنے پروردگار کو آواز دے کر عرض کیا کہ خدایا!

میرا بیٹا میرے کنبہ کا فرد ہے اور (میرا کنبہ بچانے کے متعلق) تیرا وعدہ حق ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے برتر ہے۔ خطاب ہوا کہ تیرا بیٹا تیرے خاندان سے نہیں ہے اس کا عمل غیر صالح ہے جو تو نہیں جانتا اس کے متعلق درخواست نہ کر۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تا کہ جاہلوں میں سے نہ ہو جائے۔ نوحؑ نے کہا خدایا! میں پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو مجھے معاف نہ کرے گا، مجھ پر رحم نہ کرے گا تو میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

طوفان کی ابتداء میں جب کشتی پر چڑھنے کا حکم ملا اور نوحؑ، مومنین اور نوحؑ کا خاندان سوار ہو گئے تو نوحؑ کا بیٹا کنعان باپ سے دور تھا۔ باپ نے اسے آواز دے کر کہا کہ جلدی سے کشتی پر سوار ہو جا، اپنے آپ کو نجات دلا اور کفار کی صف میں کھڑا نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادٰى نُوۡحُ ۨابۡنَهٗ وَكَانَ فِىۡ مَعۡزِلٍ يّٰبُنَىَّ ارۡكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنۡ مَّعَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۴۲﴾

نوحؑ نے اپنے بیٹے کو جو باپ سے دور تھا آواز دی اور کہا میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی پر سوار ہو جا اور کافروں میں سے نہ ہو۔ (ہود۔42)

اس نے یہ سوچتے ہوئے کہ طوفان ایک طبیعی واقع ہے اور زمین پر جاری ہونے والے عام سیلابوں کی طرح ہے، لہٰذا اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر وہ پہاڑ کے دامن میں یا پہاڑ کی چوٹی پر پناہ لے گا تو ڈوبنے سے بچ جائے گا۔ پس اس نے باپ کو جواب دیا کہ:

سَاٰوِىۡۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعۡصِمُنِىۡ مِنَ الۡمَآءِ

میں پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ (ہود۔43)

باپ نے جن کا دل اس وقت شفقت پدری سے معمور تھا، بیٹے سے کہا کہ اپنے ذہن میں اس خیال خام کو جگہ مت دے۔ آج کوئی اس عذاب سے بچ نہیں سکتا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ لَا عَاصِمَ الۡيَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ

نوحؑ نے کہا کہ آج کسی کے لیے اللہ کے حکم (طوفان) سے بچاؤ نہیں ہے۔ (ہود۔43)

پانی کی تیزی اور بہاؤ اتنا زیادہ تھا کہ اس نے نوحؑ کو دوبارہ بات کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ جلد ہی پانی کی لہروں نے نوحؑ کے بیٹے کو

اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ○

ان دونوں کے درمیان پانی کی لہریں حائل ہوگئیں اور وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا۔ (ہود۔43)

یہ دلخراش منظر جس نے یقینی طور پر پدری جذبات کو ابھار دیا تھا، اس نے نوحؑ کو اس بات پر مجبور کیا کہ اللہ سے اپنے بیٹے کے غرق ہونے کا راز پوچھے، چنانچہ اس نے کہا:

رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ○

خدایا! میرا بیٹا میرے خاندان سے ہے، میرے خاندان کو بچانے کے بارے میں تیرا وعدہ برحق ہے اور تو سب فیصلہ

کرنے والوں میں سے برتر ہے۔ (ہود۔45)

اللہ کے وعدے سے کیا مقصود ہے؟

حضرت نوحؑ نے جس وعدہ کی بات کی ہے اس سے کون سا وعدہ مراد ہے؟ یہاں اس سلسلہ میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

ا)۔ اللہ تعالٰی نے حضرت نوحؑ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اور تیرا خاندان طوفان کے خطرے سے محفوظ رہو گے۔ چنانچہ حضرت لوطؑ کے متعلق بھی اس طرح ملتا ہے:

اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ

ہم تجھے اور تیرے خاندان کو نجات دیں گے۔ (عنکبوت۔33)

یہ احتمال کچھ بعید لگتا ہے اگر اس طرح کا وعدہ مستقل طور پر کیا گیا ہوتا تو قرآن میں اس کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔

۲)۔ حضرت نوحؑ ''احمل فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ'' کے جملے اور ''اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ'' (سوائے ان کے جن کی نابودی یقینی ہے) کے ذریعہ اپنے کنبہ کی نجات سمجھ چکے تھے ورنہ اس آیت کے اس حصہ کے علاوہ کوئی مستقل وعدہ اس سلسلے میں نہیں ملتا۔ ان حالات میں انہوں نے اللہ تعالٰی کے حضور عرض کیا:

''میرا بیٹا میرے کنبہ سے تعلق رکھتا ہے اور تیرا وعدہ حق ہے، لہٰذا وہ پانی میں کس طرح ڈوب گیا؟''

خطاب ہوا وہ تم سے صرف جسمانی تعلق رکھتا ہے جب کہ تیرے بیٹے اور کنبہ کی نجات کے لیے فقط جسمانی تعلق کافی نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ‌ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ‌ ۖ فَلَا تَسۡــَٔلۡنِ مَا لَـيۡسَ لَـكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۴۶﴾

تیرا بیٹا تیرے خاندان سے نہیں ہے، اس کا عمل غیر صالح ہے جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے متعلق درخواست مت کر، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تاکہ تو جاہلوں میں سے نہ ہو جائے۔ (ہود۔46)

یہاں تک اس سوال کا کہ اللہ کے وعدہ سے کیا مراد ہے جواب واضح ہو گیا کہ حضرت نوحؑ کے خاندان کی نجات کے متعلق کوئی الگ سا وعدہ نہیں کیا گیا تھا، بلکہ انہیں کشتی پر سوار کرنے کے حکم سے ان کی نجات کا استفادہ ہوتا ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ''عمل غیر صالح'' قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کفار میں سے تھا۔ لہٰذا اس صورت میں اس کی نجات کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ بات ہرگز نہیں کہی جا سکتی کہ اللہ کا پیغمبر اپنے بیٹے کے کفر سے آگاہ نہیں تھا اس کے باوجود اس کی نجات کی توقع رکھتا تھا، وہ پیغمبر جو اللہ کے حضور یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا! روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ (نوح۔26) وہی کیسے یہ توقع کر سکتا ہے کہ اس کا بیٹا کافر ہونے کے باوجود زمین پر باقی رہے گا؟ بلکہ نوحؑ کا بیٹا ظاہری طور پر مومن اور باطنی طور پر کافر تھا۔ اسی لیے جب حضرت نوحؑ نے اپنے کنبہ کو کشتی پر سوار ہونے کو کہا اور فرمایا:

يّٰبُنَىَّ ارۡكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنۡ مَّعَ الۡكٰفِرِيۡنَ ○

میرے بیٹے کشتی پر سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ (ہود۔42)

آیت کے الفاظ ''ولا تکن مع الکفرین'' یہ نہیں کہ ''وَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡكٰفِرِيۡنَ'' اس بات پر شاہد ہیں کہ اس نے ظاہری طور پر اپنے آپ کو مومن بنا رکھا تھا لیکن کشتی پر سوار نہ ہونے کی وجہ سے کافروں کی صف میں شمار ہو گیا۔ لہٰذا اس صورت میں یہ بالکل برمحل تھا کہ نوحؑ اپنے اس خیال کے مطابق اپنے بیٹے کے غرق ہونے کا راز دریافت کرے۔ اللہ تعالیٰ کے جواب نے انہیں حقیقت حال سے آگاہ کر دیا، وہ یہ کہ بیٹا جو ظاہری طور پر مومن ہے، حقیقت میں ایک کوردل منافق ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہے۔

خائن زوجہ

جب قرآن اچھے و برے انسانوں کی مثالیں پیش کرتا ہے تو ہمیشہ نمایاں افراد کا ذکر کرتا ہے، جب تقویٰ و پاکیزگی کے شہکاروں کا ذکر کرتا ہے تو فرعون کی زوجہ آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم[1] کا نام لیتا ہے۔ جب برائی اور خیانت کے نمونوں کی باری آتی ہے تو وہ دو صالح

---

[1] سورۂ مریم۔۱۱، ۱۲

انسانوں نوحؑ اور لوطؑ کی ازواج کا نام لیتا ہے۔ وہ دونوں نورانی و پاکیزگی کے ماحول میں رہتی تھیں لیکن اس کے باوجود ان کی روح وقلب پر ظلمت وتاریکی حکم فرما تھی۔ نیک لوگوں سے ان کا ظاہری اور جسمانی تعلق تو تھا لیکن یہ ان کی نجات کا باعث نہ بنا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝۱۰

اللہ نے کافروں کے لیے نوحؑ اور لوطؑ کی ازواج کی مثالیں دی ہیں، وہ ہمارے دو نیک بندوں کے تحتِ فرمان تھیں ان دونوں سے انہوں نے خیانت کی اور دو صالح بندوں کی صحبت نے انہیں عذاب الٰہی سے نجات نہ دلائی ،ان سے کہا گیا کہ جہنمیوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاوٴ۔ (تحریم۔10)

یہ تھی حضرت نوحؑ کی سرگذشت جو ہم نے ان کی تبلیغ کے روز اول سے لے کر ان کی کشتی سے زمین پر اترنے اور زمین پر نئی زندگی کے شروع کرنے کے بارے میں مختصر طور پر بیان کی۔ ہم نے یہ سرگذشت قرآنی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کی ہے۔

یقینی طور پر قرآن نے اس داستان کو تربیتی مقاصد کے پیش نظر ذکر کیا ہے۔ ہم ان کے ساتھ چند اور خصوصیات کا اضافہ کر کے بیان کرتے ہیں۔

(۷)۔نکات ونصائح

حضرت نوحؑ کی داستان حیات میں چند نکات اور نصیحت آموز باتیں پائی جاتی ہیں، اب ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے نکات کا تذکرہ کرتے ہیں:

۱)۔مشہور ہے کہ حضرت نوحؑ سب سے پہلے صاحب شریعت پیغمبر تھے، ان سے پہلے آنے والے انبیاء فقط کتاب اور صحیفے رکھتے تھے۔ ان کے پاس کوئی شریعت نہیں تھی جس میں واجبات، محرمات اور حقوق افراد وفرائض مشخص کئے گئے ہوتے۔ اشارۃً کہا جاتا ہے کہ سورۂ شوریٰ کی مندرجہ ذیل آیت اس بات پر دلیل ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ.........

تم پر ہم نے وہ چیز مقرر کی جس کی نصیحت ہم نے نوحؑ کو کی تھی جس کی آپ پر وحی کی ہے اور ابراہیمؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ کو بھی اس کی نصیحت کی تھی، وہ یہ کہ دین (توحید) کو قائم کرو اور اس میں گروہ گروہ نہ بن جاؤ، آپ کی یہ دعوت مشرکین پر (کہ متعدد خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کی طرف آئیں) بڑی گراں ہے۔ (شوریٰ۔13)

اس آیت میں اس بات پر کوئی معمولی سا شاہد بھی موجود نہیں ہے کہ حضرت نوحؑ صاحب شریعت تھے جب کہ یہ بات تو بالکل ہی الگ ہے کہ ان کی شریعت سب سے پہلی آسمانی شریعت ہو۔ آیت کا مفاد وہ وحی یا تاکید ہے جو پانچ پیغمبروں کو کی گئی ہے کہ توحید کو قائم کریں اور تفرقہ سے دوری کی بات کریں۔ [۱]

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور نبی اکرمؐ صاحب شریعت پیغمبر تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی شریعت نے اپنے پہلے کی شریعت کو منسوخ کر دیا۔ یہ انبیاء کے سردار اور ان کی بنیاد ہیں۔ ۲

حاشیہ کا نوٹ: ۲۔ مجمع البیان، ج ۵ ص ۸۴، سورۂ احقاف کی آیت ۳۵ کے ذیل میں: "فاصبر کما اولوا العزم من الرسل"

اس حدیث سے استدلال بھی اس وقت درست ہوگا جب ناسخ ہونے کی بات آخری چار کے متعلق سمجھی جائے نہ کہ سب کے متعلق۔ اگر اس طرح نہ ہو تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ حضرت نوحؑ سے پہلے بھی ایک شریعت تھی، جو حضرت نوحؑ کی شریعت کے ذریعے منسوخ ہوگئی۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دور تک حضرت نوحؑ کے بعد جو نبی بھی آیا وہ حضرت نوحؑ کی شریعت پر ہی کاربند تھا، اس طرح حضرت موسیٰؑ کے دور تک حضرت ابراہیمؑ کے بعد آنے والے انبیاء حضرت ابراہیمؑ کی شریعت پر عمل کرتے تھے وعلیٰ ہذا۔۔۔۔ [۲]

یہ روایت حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ۔۔۔ کی شریعت کو مرکزی شریعت قرار دیتی ہے لیکن اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ حضرت نوحؑ سے پہلے بھی کوئی شریعت تھی۔

۲)۔ کیا حضرت نوحؑ کی رسالت جہانگیر تھی؟ یہ سوال پہلے سوال سے مختلف ہے۔ گذشتہ سوال حضرت نوحؑ کی شریعت کے پہلی شریعت ہونے یا نہ ہونے سے متعلق تھا، جب کہ یہ سوال ان کی شریعت کے پوری دنیا کے لیے ہونے سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں دو نظریات سامنے آتے ہیں:

۱)۔ حضرت نوحؑ کی رسالت صرف ان کی اپنی قوم کے لیے تھی

حضرت نوحؑ کی شریعت صرف ان کی قوم کے لیے تھی جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] مجمع البیان، ج ۴ ص ۲۷۸، المیزان ج ۱۲ ص ۱۱۸

[۲] بحار الانوار، ج ۱۵ ص ۵۴۱۔ کافی ج ۲۔ باب الشرائع ص ۱۷

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖۤ (نوح۔1)

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اَنَّهٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ (ہود۔36)

علاوہ ازیں عالمگیر رسالت کا پہنچانا اس بات پر موقوف ہے کہ مختلف اقوام کے درمیان تمدن موجود ہو اور ان کے درمیان آمد و رفت کے وسائل موجود ہوں۔رسول اکرمؐ کے دور میں اگر چہ مکہ میں کوئی خاص وسائل موجود نہیں تھے تاہم مکہ و مدینہ و یمن سے لے کر شام تک کی تجارت کے لیے چار مرکزی راستے تھے، نبی اکرمؐ کی بعثت سے کئی سال قبل مشرق و مغرب کے درمیان رابطہ کے وسائل اور رابطہ برقرار تھا۔ان وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے نبی اکرمؐ اپنی آواز دنیا والوں کے کانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔لیکن حضرت نوحؑ کے دور میں اس طرح کی ترقی اور اس طرح کے وسائل موجود نہیں تھے جن کی مدد سے وہ عالمگیر نبی کے عنوان سے دنیا بھر میں اپنے قاصد و ہرکارے روانہ کرتے اور اپنی عالمگیر رسالت لوگوں تک پہنچاتے۔تاہم اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں زمین پر صرف ان کی ہی قوم آباد تھی تو اس صورت میں وہ قومی رسالت یا عالمگیر رسالت ایک ہی مانی جائے گی۔

لیکن یہ بات صرف ہمارا ذہنی حساب ہے اور حضرت نوحؑ کے دور کو سو فیصد اس طرح نہیں کہا جا سکتا جس طرح ہم نے تصور پیش کیا ہے۔

۲)۔طوفان کا پوری دنیا پر آنا ان کی رسالت کے عالمگیر ہونے کی دلیل ہے

حضرت نوحؑ کے طوفان نے پوری دنیا کو لپیٹ لیا تھا اور یہ عالمگیر طوفان تھا۔دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اتمام حجت کے بغیر کافروں کو نابود کرنا سنت الٰہی کے خلاف ہے۔[۱]

طوفان کے عمومی ہونے کی دلیل حضرت نوحؑ کی بد دعا ہے جو انہوں نے کی تھی کہ خدایا زمین پر ایک بھی کافر باقی نہ رہنے دے۔[۲]

لفظ ''ارض'' وسیع معنیٰ کا حامل ہے جو پورے کرۂ ارض کو شامل ہے۔دوسری دلیل حضرت نوحؑ کو اللہ تعالیٰ کی یہ تاکید ہے کہ ہر نوع سے ایک جوڑا کشتی پر سوار کر لو۔[۳]

اگر یہ طوفان پوری دنیا پر نہ ہوتا تو حیوانوں کی نسل بچانے کے لیے اس کام کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمین سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پر ان کی قوم آباد تھی۔یہ بات عام استعمال سے ہٹ کے نہیں ہے۔قرآن

---

[۱] وما کان ربك مهلك القریٰ حتیٰ یبعث فی امها رسولاً۔(قصص۔۵۹)

[۲] رب لا تذر علی الارض من الکٰفرین دیّارًا۔(نوح۔۲۶)

[۳] قلنا احمل فیها من کل زوجین اثنین۔(ہود۔۴۰)

فرماتا ہے:

فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ

اس طرح ہر قسم کے حیوان کا ایک جوڑا کشتی میں بٹھانے کا مقصد ان کے اپنے ماحول میں ان حیوانوں کی نسل کی بقا تھی نہ کہ پوری دنیا میں کیونکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ حیوانات کو لے جانے میں بڑا عرصہ لگ جاتا ہے۔ مجموعی طور پر آیات سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی شریعت ان کے اپنے ایک وسیع علاقے سے متعلق تھی اور طوفان بھی اس وسیع علاقے میں آیا تھا۔ البتہ کچھ لوگوں نے طوفان کو (ان کی رسالت کے عالمگیر ہونے سے قطع نظر) پوری دنیا کے لیے قرار دیا ہے اور اس پر شاہد پہاڑوں پر پائے جانے والے مردہ حیوانات کے اثرات کو قرار دیا ہے، ان پہاڑوں کی چوٹیوں اور بلندیوں پر حیوانات کے جانے کا سبب طوفان نوحؑ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

۳)۔ آخر میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اس طوفان میں معصوم بچے بھی نابود ہو گئے تھے؟ اور ان کی ہلاکت اللہ کے عدل کے ساتھ کیسے ہم آہنگ ہے؟

یہاں مفسرین نے متعدد جوابات دیئے ہیں جن میں ہر ایک اس سوال کا جواب بن سکتا ہے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ہلاکت انتقام یا سزا کے طور پر نہیں تھی، بلکہ ان کی موت کے لیے ایک طبیعی عامل تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھی کے ہاتھوں بچے کا قتل، جس پر حضرت موسیٰؑ نے اعتراض کیا تھا، حالانکہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھی کے ہاتھوں یہ قتل انتقام کے طور پر نہیں تھا، بلکہ اس سے تو ایک عامل کے طور پر استفادہ کیا گیا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس ہر روز ہزاروں بچے مہلک بیماریوں اور موذی جراثیم کے ذریعہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، تاہم کوئی اسے اللہ کے عدل کے خلاف قرار نہیں دیتا۔ پس اصول یہ ٹھہرا کہ اگر جہان طبیعت میں کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خشک و تر کو نہیں پہچانتی۔ زلزلہ کے وقت مکانات منہدم ہوجاتے ہیں۔ چھوٹے، بڑے سب ان کے ملبوں تلے دب جاتے ہیں، اسی طرح سیلاب آنے اور آسمانی بجلی گرنے کے وقت بھی یہی کچھ ہوتا ہے، اس بات کی توقع رکھنا کہ ہر مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ معصوم بچوں و بے گناہ افراد کو اس سے بچالے اور اس عذاب کا نشانہ صرف گنہگار لوگ ہی بنیں ایک بے جا توقع ہے جو طبیعی قوانین اور ایسے طریقۂ کار سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اگر اس طرح ہوتا تو یہ دنیا طبیعی دنیا نہ رہتی بلکہ طبیعت اور مافوقِ طبیعت کا مرکب بن جاتی۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ قوم نوحؑ کی عورتیں طوفان سے چالیس سال پہلے بانجھ ہوگئی تھیں اور ان عورتوں سے بچے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ تباہی کے وقت کوئی بے گناہ بچہ غرق نہ ہو۔[1] نکات سے متعلق گفتگو یہاں ختم ہوتی ہے۔ اب ہم نصیحت آموز باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کی داستان حیات میں مصلحین اور دیگر تمام انسانوں کے لیے کئی نصیحت آموز باتیں پائی جاتی ہیں۔ ہم ان کی طرف مختصر طور پر اشارہ کرتے ہیں:

۱)۔ برتری وفضیلت کا معیار ایمان اور تقویٰ ہے، جب حضرت نوحؑ سے کہا جاتا ہے کہ غریب اور غیر معروف لوگوں کو جو طبعًا کسان

---

[1] توحید صدوق، باب ۶۱ روایت ۲

اور مزدور لوگ تھے، اپنے اردگرد سے بھگا دو تو وہ پورے وثوق سے اس کام کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اس طرح کروں تو ظالموں میں سے ہوجاؤں گا۔ (ہود۔۳۱)

۲)۔حضرت نوحؑ کی ۹۵۰ برس کی ثابت قدمی مصلحین کے لیے بہت بڑا درس ہے کہ انہیں جلد ہی تھک ہار کر بیٹھ نہیں جانا چاہیے، مصیبتوں و مشکلات پر ہمت نہیں ہارنا چاہیے، بلکہ ان کے دلوں میں امیدوں کا چراغ ہمیشہ روشن رہنا چاہیے۔

۳)۔حضرت نوحؑ کا غرق ہونے والا بیٹا ''يُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَيِّ'' (روم۔۱۹) کا مصداق ہے۔[۱]

۴)۔ یہ گنہگار بیٹا سوچتا تھا کہ پہاڑ اس کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوسکتا ہے۔لیکن وہ اس بات سے غافل تھا کہ نہ فقط زمین و پہاڑ بلکہ یہ پوری دنیا اللہ کے حکم کے سامنے انسان کی محافظ و پناہ گاہ ثابت نہیں ہوسکتی۔اللہ تعالیٰ کے علاوہ یہ سب کمزور سہارے ہیں۔انسان کو ہمیشہ سہارا لینا چاہیے اور ان طبعی وسائل کو فقط ایسے زرائع سمجھنا چاہیے جو اللہ نے اس کے اختیار میں دیئے ہیں۔

۵)۔طوفان نوحؑ جس نے تمام کافروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، ایک سزا ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی ماحول کو ایک طرح سے پاک کرنا بھی اس کا مقصد تھا۔ہر معاشرہ جب برائی کے حوالہ سے اس حد تک بڑھ جائے کہ خلقت کے اہداف کی عکاسی نہ کرسکے تو یہ کسی عامل کے ذریعہ تباہ ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ اچھے، پاکیزہ عناصر لے لیتے ہیں۔ یہ افراد بھی اگر کچھ عرصہ بعد اسی طرح کے ہوجائیں تو پھر بھی اللہ کا عذاب نازل ہوجاتا ہے۔[۲]

۶)۔حضرت نوحؑ کی زوجہ اگرچہ حضرت نوحؑ جیسے عظیم نبی کے ساتھ زندگی گذار رہی تھی، اس کے باوجود وہ نجات پانے کے لائق نہیں تھی۔ جو لوگ صرف نیک لوگوں کی ہمراہی انبیاء کے نور کے شعاعوں میں آجانے کا مصاحبین کی نیکی و پاکیزگی پر دلیل قرار دیتے ہیں اور پیغمبر کے تمام صحابہ کے تقدس و عدالت کا یقین کرلیتے ہیں انہیں حضرت نوحؑ کی زوجہ کی زندگی سے درس حاصل کرنا چاہیے کہ وہ اس طرح کے فیصلوں سے دست بردار ہوجائیں اور نیک لوگوں کے مصاحبین کو دو حصوں میں تقسیم کریں، ایک متقی و پرہیزگار اور دوسرا گنہگار و عاصی۔

۷)۔قوم نوحؑ کی پوری داستان حیات یہ بتاتی ہے کہ یہ دنیا سب لوگوں کے لیے امتحان کی جگہ ہے اور خدا انفرادی طور پر آزمانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی طور پر بھی لوگوں کا امتحان لیتا ہے۔لہٰذا حضرت نوحؑ کی داستان حیات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے:

اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنۡ كُنَّا لَمُبۡتَلِيۡنَ ۝۳۰

اس سرگذشت میں نشانیاں ہیں اور ہم امتحان میں ڈالنے والے ہیں۔ (مومنون۔30)

اس لحاظ سے قرآن حکیم نے حضرت نوحؑ کی سرگذشت کو دنیا والوں کے لیے نشانی اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے یاددہانی کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

---

[۱] ان آیات کی طرف رجوع کریں: عنکبوت ۱۵، قمر ۱۵، الحاقہ۔۱۲

[۲] قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝۴۸ (ہود۔۴۸)

چوتھے پیغمبر

حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد کے درمیان

اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ مشیت یہ ٹھہری کہ اولاد آدمؑ کی آسمانی خلافت کا سلسلہ زمین پر مستقلاً جاری رہے اور ان کی ہدایت کے لیے انبیاء مبعوث کئے جاتے رہیں۔ اس لیے قوم نوحؑ کی بربادی نسل انسانی کے منقطع ہونے کا باعث نہ بنی۔ بلکہ مذکورہ مشیت کے پیش نظر اللہ نے ایک اور نسل پیدا فرمادی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ○

ہم نے قوم نوحؑ کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور اس کے بعد ایک اور نسل پیدا کر دی۔ (انعام۔6)

ان نئی نسلوں کی ہدایت کے لیے انبیاء مبعوث کئے گئے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

نوحؑ کے بعد ان قوموں کے لیے انبیاء مبعوث کئے اور وہ دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے۔ [1]

حضرت نوحؑ کے بعد قرآن نے جس نبی کا نام لیا ہے وہ حضرت ہودؑ ہیں، جو قوم عاد کی ہدایت کے لیے مبعوث کئے گئے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ......وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ

قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا اللہ کی عبادت کرو۔۔۔۔اور یاد کرو کہ تمہیں قوم نوحؑ کا جانشین بنایا۔ (اعراف۔65 تا 69)

اسی طرح حضرت ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ.........وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا، اس نے ان سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو۔۔۔اور یاد کرو کہ تمہیں قوم

---

[1] سورۂ مومنون کی آیت ۳۱ بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

عاد کا جانشین قرار دیا گیا۔ (اعراف۔ 73، 74)

اس طرح حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ اور ان کے بعد حضرت صالحؑ مبعوث کئے گئے۔

حضرت ہودؑ حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی اولاد سے ہیں جن کا شجرہ نسب مؤرخین نے اس طرح ذکر کیا ہے:

ہود۔۔عبداللہ۔۔رباح۔۔الخلود۔۔عاد۔۔عوص۔۔ارم۔۔سام۔۔نوحؑ [۱]

باقی آسمانی کتابوں میں قوم عاد کی داستان حیات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ صرف قرآن پاک نے یہ داستان بیان فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں مستند ثبوت بھی یہی آسمانی کتاب قرار پاتی ہے۔ قرآن پاک نے ان کی سرزمین کا نام احقاف [۲] ذکر کیا ہے۔

جو حضرموت کے شمال اور عمان کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں ''ربع الخالی'' واقع ہے۔ آج کل یہ سرزمین ایک صحراء کی شکل میں ہے جہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ تمدن شناس اور قدیم تہذیبوں کا مطالعہ کرنے والے افراد نے ابھی تک اس سرزمین پر کام نہیں کیا۔ اگر اس سلسلہ میں کام کریں تو ممکن ہے انہیں ایسا تمدن مل جائے جو اپنے دور میں بے مثال رہا ہو۔ بہر حال قرآن میں عاد کا نام ۲۴ مرتبہ [۳]

اور ہود کا نام سات بار آیا ہے [۴]

حضرت ہودؑ کی سرگذشت میں قرآن نے مجموعی طور پر جن پہلوؤں کا ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہیں:

۱)۔ قوم ہودؑ کی خصوصیات

۲)۔ تبلیغ کے مطالب اور طریق کار

۳)۔ قوم عاد کی تہمتیں اور اعتراضات، حضرت ہودؑ کا جواب

۴)۔ عذاب کے نزول سے متعلق تہدید

۵)۔ عذاب کا نازل ہونا اور ان کی بربادی

۶)۔ نکات اور قوم ہود کی داستان حیات کی نصیحت آموز باتیں۔

اب ہم اولین پہلو سے گفتگو کرتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ یعقوبی، ج ۱ ص ۲۲ مطبوعہ دار صادر، بیروت

[۲] سورۂ احقاف، آیت ۲۱

[۳] اعراف۔ ۵۶، ۴۷، توبہ۔ ۷۰، ہود۔ ۵۰، ۵۹، ۶۰، ابراہیم۔ ۹، حج۔ ۴۲، فرقان۔ ۳۸، شعراء۔ ۱۲۳، عنکبوت ۔ ۳۸، ص۔ ۱۲، غافر ۔ ۳۱، فصلت۔ ۱۳، ۱۵، احقاف، ۲۱، ق۔ ۱۳، ذاریات۔ ۴۱، قمر۔ ۱۸، نجم۔ ۵۰، حاقہ۔ ۴، فجر۔ ۶

[۴] اعراف۔ ۶۵، ہود۔ ۵۰، ۵۳، ۵۸، ۶۰، ۸۹، شعراء۔ ۱۲۴

(۱)۔قوم ہود کی زندگی کی خصوصیات

موضوع سے متعلق آیات

وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً ۚ فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ (الاعراف۔۶۹)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿٦﴾ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿٧﴾ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا
فِي الْبِلَادِ ﴿٨﴾ (الفجر۔۶تا۸)

اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾ (الشعراء۔۱۲۸،۱۲۹)

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (الاحقاف۔۲۶)

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿١٣٠﴾ (الشعراء۔۱۳۰)

وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ
قُوَّةً ؕ (حم السجدۃ۔۱۵)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اللہ تعالیٰ نے تمہیں عظیم اور طاقت ور پیدا کیا، پس اس کی نعمات کو یاد کرو۔

۲)۔کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ ارم، نامی شہر میں جس میں ستون تھے اور شہروں میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

۳)۔کیا تم ہر بلندی پر عمارت بناتے ہو، محلات اور مضبوط قطع تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ ان میں رہنا ہے؟

۴)۔اللہ تعالیٰ نے چوپایوں، اولاد، باغات اور چشموں کے ساتھ تمہاری مدد کی۔

۵)۔ہم نے قوم عاد کو وہ مالی اور جسمانی توانائی عطا فرمائی جو تم (مکہ کے لوگوں) کو عطا نہیں کی۔

۶)۔جب تم سزا دیتے ہو تو ظالموں کی طرح سزا دیتے ہو۔

۷)۔انہوں نے کہا ہم سے کون زیادہ طاقتور ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جس خدا نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ توانا ہے؟

اس قوم کی زندگی سے متعلق داستان گو افراد نے ایسے ایسے افسانے گھڑے ہیں جنہیں عقل قبول نہیں کرتی۔ان افسانوں کا راوی "وہب بن منبہ" [1] ہے قابل افسوس بات یہ ہے کہ مسلمان اس کی داستان سرائی کے جال میں آ گئے ہیں اور انہوں نے یہ افسانے تفسیر تک کی کتابوں میں ذکر کر دیئے ہیں۔ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اہل کتاب سے تھا، بعد میں ظاہری طور پر مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کے درمیان اس نے اسرائیلیات پھیلانی شروع کر دیں۔اس قوم کی زندگی کی خصوصیات کے متعلق (وثوق کے ساتھ) صرف وہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو قرآن نے اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔ہم اس کا ذکر ترتیب سے کرتے ہیں:

۱)۔خلقت و پیدائش کے حوالے سے وہ مضبوط اور طاقتور لوگ تھے۔اسی لیے حضرت ہودؑ نے ان سے کہا:

وَّزَادَكُمۡ فِى الۡخَلۡقِ بَصۜۡطَةً‌ ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَاۤءَ اللّٰهِ

اللہ تعالیٰ نے تمہیں جسمانی طور پر مضبوط و طاقتور پیدا کیا، پس اس کی نعمات کو یاد کرو۔(اعراف۔69)

اس قوم کی ہلاکت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو منتشر شدہ کھجور کے درختوں سے تشبیہ دی جو ان کے قد کی بلندی اور جسم کی طاقت کی علامت ہے۔اس سے متعلق آیات بعد میں آئیں گی۔

۲)۔گھروں کی تعمیر سے متعلق ان کی صورت حال قرآن نے دو جگہ اس طرح بیان کی ہے:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ‏ ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۙ‏ ﴿۷﴾ الَّتِىۡ لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِى الۡبِلَادِ ۙ‏ ﴿۸﴾

کیا تم نہیں جانتے ہو کہ قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ ارم نامی شہر میں جس میں ستون تھے اور شہروں میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔(فجر۔6 تا 8)

یعنی وہ بلند ستونوں والے بڑے بڑے محلات میں رہتے تھے اس دور تک انسان کسی اور جگہ ان جیسے محلات نہیں بنا سکا تھا۔ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِيۡعٍ اٰيَةً تَعۡبَثُوۡنَ ۙ‏ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ‌ ۚ‏ ﴿۱۲۹﴾

کیا تم اپنی ہوس کو مطمئن کرنے کے لیے ہر بلندی پر عمارت بناتے ہو اور مستحکم محلات اور مضبوط قلعے بناتے ہو گویا تم ان میں ہمیشہ رہو گے۔(شعراء۔128، 129)

---

[1] وہ یمن کا رہنے والا تھا، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری ایام میں وہ اسلام لایا اور ۱۱۴ھ میں فوت ہوا۔

۳)۔ان کو بہت سی نعمتیں ملی ہوئی تھیں، مثلاً چوپائے، چشمے اور سرسبز باغات، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَمَدَّكُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّبَنِيۡنَ ۝١٣٣ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ۝١٣٤

اللہ تعالیٰ نے تمہاری چوپایوں، بیٹوں، باغات اور چشموں کے ساتھ امداد فرمائی۔(شعراء۔133، 134)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ مَكَّنّٰهُمۡ فِيۡمَاۤ اِنۡ مَّكَّنّٰكُمۡ فِيۡهِ

ہم نے قوم عاد کو مالی اور جسمانی طاقت عطا فرمائی جو تم (مکہ کے لوگوں) کو عطا نہیں کی۔(احقاف۔26)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَاَتۡرَفۡنٰهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا

ہم نے دنیوی زندگی میں انہیں بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں۔(مومنون۔33)

۴)۔سزا دیتے وقت ان کا طریقہ کار بڑا ہی ظالمانہ ہوتا تھا، چنانچہ ارشاد ہورتا ہے:

وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِيۡنَ ۝١٣٠

جب تم سزا دیتے ہو تو ظالموں کی طرح دیتے ہو۔(شعراء۔130)

۵)۔یہ سرکش قوم دنیاوی نعمتوں میں مست ہو چکی تھی، یہ اللہ کے پیغمبر کے سامنے اپنی طاقت وقدرت پر گھمنڈ کرتے تھے، لیکن اس بات سے غافل تھے کہ ان کا خالق ان سے زیادہ طاقتور ہے اور ایک لحظہ میں ان سے یہ سب کچھ لے کر انہیں نیست و نابود کر سکتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ؕ (فصلت۔15)

ان تمام خصوصیات سے مجموعی طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ سمندر کے کنارے اس صحراء میں جسمانی و مالی طاقت کے اعتبار سے زیر زمین پانیوں اور زرخیز زمین کی وجہ سے بہت اچھی جگہ پر رہتے تھے۔افسوس کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی بجائے وہ کفران نعمت پر کمربستہ ہو گئے۔چنانچہ اس نبی کے ساتھ جو خود ان کے درمیان سے ہی مبعوث ہوتے تھے، انہوں نے مجادلہ شروع کر دیا اور مستقلاً نوحؑ والی باتیں دھرانے لگے۔حقیقت میں دونوں گروہوں کی منطق ایک ہی تھی۔اب ضروری ہے کہ حضرت ہودؑ کی تبلیغ کے مطالب کا تذکرہ کیا جائے اور پھر دیکھیں کہ اس سلسلہ میں ان کی قوم کا ردعمل کیا تھا۔

(۲) ۔تبلیغ کے مطالب اور حضرت ہودؑ کی تبلیغ کا طریقہ کار

موضوع سے متعلق آیات

يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُفۡتَرُوۡنَ۝۵۰ (ہود۔۵۰)

اِنِّيۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ۝۱۳۵ (الشعراء۔۱۲۵)

اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّيۡ وَاَنَا لَكُمۡ نَاصِحٌ اَمِيۡنٌ۝۶۸ اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ ؕ وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ...... (الاعراف۔۶۸،۶۹)

يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ۝۵۱ (ہود۔۵۱)

وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ۝۵۲ (ہود۔۵۲)

فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ۝۶۹ (الاعراف۔۶۹)

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖۤ اِلَيۡكُمۡ ؕ وَيَسۡتَخۡلِفُ رَبِّىۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ۚ وَلَا تَضُرُّوۡنَهٗ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَفِيۡظٌ۝۵۷ (ہود۔۵۷)

آیات کا ترجمہ

۱)۔اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تم بتوں کی عبادت کے ذریعہ اللہ پر بہتان باندھتے ہو۔

۲)۔میں تمہارے بارے میں قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۳)۔میں تمہارے لیے رسول ہوں۔

۴)۔میں اللہ تعالیٰ کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں میں ایک امین ناصح ہوں۔کیا تم اس پر حیران ہو کہ تمہارے ہی قبیلے کے ایک شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتا کہ وہ تمہیں ڈرائے؟ یاد کرو کہ تم قوم نوحؑ کے جانشین ہو، (کہیں عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہو جانا)۔

۵)۔اے قوم! میں تم سے کوئی جزا نہیں مانگتا، میری جزا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟

۶)۔اے میری قوم! اللہ سے مغفرت طلب کرو، اس کی طرف رجوع کرو تا کہ تمہارے لیے موسلا دھار بارش بھیجے تمہاری توانائی میں اضافہ کرے اور مجرموں کی طرح اللہ تعالیٰ سے منہ نہ موڑو۔

۷)۔اللہ کی نعمات کو یاد کرو، شاید اس طرح فلاح پاجاؤ۔

۸)۔اگر تم میری دعوت سے منہ موڑ لو تو میں نے تو اپنی رسالت کو پورا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اٹھا لے گا اور دوسری قوم کو تمہارا جانشین بنا دے گا، اللہ تعالیٰ کو اس میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا میرا پروردگار ہر چیز سے آگاہ ہے۔

حضرت ہودؑ کی دعوت سے متعلق آیات سے مجموعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے تین باتوں پر تاکید فرمائی تھی:

۱)۔عبادت اور پرستش میں توحید

۲)۔قیامت کے دن اللہ کے عذاب سے خوف

۳)۔میں اللہ تعالیٰ کا امین پیغمبر ہوں۔

اس طریقہ سے انہوں نے آسمانی شریعتوں میں مشترک اصولوں کی تشریح کی۔پہلے اصول کے متعلق اس طرح فرمایا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ۝۵۰

اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔بتوں کی عبادت کر کے تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو۔(ہود۔50)[1]

دوسرے اصول کے بارے میں اس طرح فرمایا:

---

[1] مومنون۔۳۲ اور احقاف ۲۱ میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٣٥﴾

میں تمہارے بارے میں قیامت کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (شعراء۔135) [1]

تیسرے اصول کی وضاحت اس طرح فرمائی:

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ (شعراء۔125)

نیز ارشاد فرمایا:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ

میں اللہ تعالیٰ کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں، میں امانت دار اور ڈرانے والا ہوں، کیا تم صرف اس پر حیران ہو کہ تمہارے ہی قبیلہ کے ایک شخص پر اللہ کی وحی نازل ہو کہ وہ تمہیں ڈرائے؟ یاد کرو کہ تم قوم نوحؑ کے جانشین ہو (کہیں عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہو جانا)۔ (اعراف۔68،69)

تبلیغ کا طریق کار

یہاں تک ہم ان کی تبلیغ کے پہلوؤں سے آشنا ہوئے، تبلیغ کے سلسلہ میں انہوں نے یہ طریقے اختیار کئے:

۱)۔ اعلان کیا کہ اپنی تبلیغ پر ان سے کسی اجر کی توقع نہیں رکھتے، چنانچہ فرمایا:

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٥١﴾

اے قوم! میں تم سے (اپنی تبلیغ کے لیے) اجر نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ تو اس پروردگار کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟ (ہود۔51) [2]

۲)۔ انہیں خوشخبری سنائی کہ وہ شرک سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف آجائیں تو ان پر رحمت کے دروازے کھل جائیں گے چنانچہ

---

[1] احقاف۔۲۱ بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

[2] سورۂ شعراء۔۱۲۷ کا بھی یہی مضمون ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

اے میری قوم! اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو، اس کی طرف رجوع کرو تا کہ تمہارے لیے موسلا دھار بارش بھیجے تمہاری قوت میں اضافہ کر دے اور مجرموں کی طرح خدا سے منہ نہ موڑو۔ (ہود۔52)

۳)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کا تذکرہ کریں اور اس کا شکر ادا کریں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

اللہ تعالیٰ کی نعمات کو یاد کرو، شاید اس طرح فلاح پا جاؤ۔ (اعراف۔69) [1]

۴)۔ آخر کار یہ یاد دلایا کہ اللہ کا جو عذاب گذشتہ لوگوں پر نازل ہوا ہے اس سے عبرت حاصل کریں ارشاد ہوا:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ

یاد کرو کہ تم قوم نوحؑ کے جانشین ہو، (کہیں عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہو جاؤ)۔ (اعراف۔69)

ایک اور آیت میں فرمایا:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

اگر تم میری دعوت سے منہ موڑ لو تو میں نے تو اپنی رسالت کو پورا کر ہی دیا ہے اللہ تمہیں اٹھا لے گا اور دوسری قوم کو تمہارا جانشین بنا دے گا، اللہ تعالیٰ کو اس میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، میرا پروردگار ہر چیز سے آگاہ ہے۔ (ہود۔57)

یہاں تک ہم نے تبلیغ کے تین پہلوؤں اور حضرت ہودؑ کی تبلیغ کے چار طریقوں کا مطالعہ کیا، اب دیکھنا چاہیے کہ اس پر حضرت ہودؑ کی قوم نے کیا ردِ عمل ظاہر کیا۔

---

[1] شعراء۔ ۱۳۲، ۱۳۴ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

(۳)۔تہمتیں، اعتراضات اوران کے جوابات

موضوع سے متعلق آیات

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝۶۶

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ...... (ہود۔۵۳، ۵۴)

مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ۝۳۳

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۝۳۴ (مومنون۔۳۳، ۳۴)

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝۱۴ (حم السجدہ۔۱۴)

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَاۤ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ۝۱۳۶ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ۝۱۳۷ (الشعراء۔۱۳۶، ۱۳۷)

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۷۰ (الاعراف۔۷۰)

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝۶۷ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ۝۶۸ (الاعراف۔۶۷، ۶۸)

قَالَ اِنِّيْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْۤا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۝۵۴ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ۝۵۵

اِنِّیۡ تَوَکَّلۡتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۶﴾ (ہود۔ ۵۴، ۵۵، ۵۶)

تُجَادِلُوۡنَنِیۡ فِیۡۤ اَسۡمَآءٍ سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُکُمۡ مَّا نَزَّلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ (الاعراف۔ ۷۱)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اس کافر قوم کے بڑوں نے کہا کہ ہمیں تو تمہارا کام احمقانہ لگتا ہے ہمارے خیال میں تم جھوٹوں میں سے ہو۔

۲)۔اپنی دعوت کے ثبوت کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳)۔ہم تمہارے بارے میں یہ ہی کہتے ہیں کہ ہمارے بعض معبودوں کی جانب سے تمہیں نقصان پہنچا ہے۔

۴)۔یہ شخص (ہودؑ) تمہاری طرح بشر ہی ہے جو کچھ تم کھاتے ہو یہ وہی کھاتا اور پیتا ہے اگر تم اپنے جیسے ہی بشر کی اطاعت کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔

۵)۔انہوں نے کہا کہ اگر ہمارا پروردگار چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتے بھیجتا ہم تمہاری رسالت کا انکار کرتے ہیں۔

۶)۔انہوں نے کہا کہ چاہے تم ہمیں نصیحت کرو یا نہ کرو، ہم تمہاری باتوں پر کان نہیں دھریں گے، ہمارا راستہ پہلے لوگوں والا راستہ ہی ہے۔

۷)۔انہوں نے کہا کہ تم اس لیے آئے ہو کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں، تم ہمیں جس عذاب سے ڈراتے ہو وہ لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

۸)۔اس نے کہا اے قوم! مجھ میں کوئی بے عقلی نہیں ہے۔میں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے پیغام لانے والا ہوں، اپنے پروردگار کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے ایک امین ناصح ہوں۔

۹)۔میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں اللہ کے سوا تمہارے معبودوں سے بیزار ہوں، تم کھڑے ہو جاؤ کوئی مکر اختیار کرو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔

۱۰)۔میں اللہ پر توکل کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے روئے زمین پر جتنے چلنے والے ہیں ان کی چوٹی اسی

کے ہاتھ میں ہے میرا پروردگار صراط مستقیم پر ہے۔

۱۱)۔کیا تم میرے ساتھ ان معبودوں پر جھگڑا کرتے ہو جن کو تمہارے آباء نے معبود کا نام دیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نہیں بھیجی۔

حضرت ہودؑ کی دعوت سے انکار کے بالمقابل قوم عاد بھی قوم نوحؑ کی طرح بڑی دور کی کوڑی لائی ،کبھی تو انہوں نے اللہ کے رسول پر اتہامات لگائے، اور کبھی بچگانہ اعتراضات کئے، پہلے ہم الزامات کا جائزہ لیتے ہیں اس کے بعد اعتراضات زیرِ غور لائیں گے۔

الف۔اتہامات

۱)۔احمقانہ دعوت

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ۝۶۶

ان کی قوم کے ایک گروہ نے جو کافر تھے، یہ کہا کہ (اے ہودؑ) ہم تم کو نادانی میں دیکھتے ہیں۔(اعراف۔66)

۲)۔دروغگوئی کی تہمت

وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ۝۶۶

اور ہم تم کو یقیناً جھوٹوں میں گمان کرتے ہیں۔(اعراف۔66)[۱]

اس قوم کے اشراف نے جو کافر تھے کہا کہ ہمیں تمہارا کام احمقانہ لگتا ہے اور ہمارے خیال میں تو تم جھوٹوں میں سے ہو۔

۳)۔جنون کی تہمت

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ

ہم تمہارے بارے میں کہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کی جانب سے تمہیں نقصان پہنچا ہے۔(ہود۔54)[۲]

---

[۱] آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت نوحؑ کی قوم نے بھی ان پر دروغگوئی کا الزام لگایا تھا۔(ہود۔۲۷)

[۲] حضرت نوحؑ کے مخالفین نے ان پر جنون کا الزام لگایا تھا۔(قمر۔۵۴)

اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہودؑ عقلی توازن کھو بیٹھے ہیں۔
دوراندیش لوگوں کی نظر میں یہ سب الزامات حضرت ہودؑ کی پاکدامنی پر دلیل ہیں، ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ تمام مصلحین پر اس طرح کے فضول الزامات لگتے رہے ہیں، یعنی ایسی تہمتیں جن کا اثبات نفی دونوں مشکل ہیں، اگر ان تہمتوں کے علاوہ حضرت ہودؑ میں کوئی اخلاقی یا سماجی برائی پائی جاتی تو وہ یقیناً اس کا ذکر بھی کرتے، لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی انہیں ان تین بے بنیاد الزامات کے علاوہ کوئی چیز نظر نہ آئی۔

ب۔اعتراضات

ا۔وہ محض ایک بشر ہے:

مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۙ يَاۡكُلُ مِمَّا تَاۡكُلُوۡنَ مِنۡهُ وَيَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۳۳﴾
وَلَٮِٕنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَكُمۡ ۙ اِنَّكُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

یہ شخص (ہودؑ) تمہاری طرح ہی ایک بشر ہے جو کچھ تم کھاتے پیتے ہو، یہ بھی وہی کھاتا پیتا ہے لہٰذا اگر تم اپنے جیسے بشر کی اطاعت کروگے تو خسارے میں رہوگے۔ (مومنون۔33،34)

قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓٮِٕكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

انہوں نے کہا کہ اگر ہمارا پروردگار چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتے بھیجتا، ہم تمہاری رسالت سے انکار کرتے ہیں۔ (فصلت۔14)

زمانہ سابق کا انسان ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ اللہ کے رسولؑ کو فرشتہ ہونا چاہیے۔ اس لیے اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء کو اس اعتراض کا سامنا کرنا پڑا۔[1]

۲۔دلیل اور ثبوت نہیں رکھتا۔

قَالُوۡا يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ

تم اپنی دعوت کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں رکھتے۔ (ہود۔53)

۳۔کبھی یہ اعتراضات دشمنی و تعصب کی شکل اختیار کر لیتے جس سے معلوم ہوتا کہ وہ دلیل سے بات نہیں کرتے، بلکہ اپنے آباؤاجداد کی سیرت کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔ قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

---

[1] ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت نوحؑ کو بھی اسی طرح اعتراض کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ (ہود۔۲۷)

قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَكُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِيۡنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾

انہوں نے کہا کہ چاہے ہمیں نصیحت کرو یا نہ کرو، ہم تمہاری باتوں پر کان نہیں دھریں گے، ہمارا راستہ پہلے لوگوں والا ہی ہے۔ (شعرا۔136،137)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰهَ وَحۡدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا‌ ۚ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۷۰﴾

انہوں نے کہا کہ تم اس لیے آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کریں اور اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں، اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ، جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ (اعراف۔70)

یہاں تک ہم نے ان لوگوں کے بچگانہ اعتراضات والزامات سے واقفیت حاصل کی، اب یہ دیکھنا ہوگا کہ حضرت ہودؑ نے انہیں کیا جواب دیا، جواب میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے بڑے حوصلہ وسکون سے ان لوگوں سے بات کی جو اصلاح ونفوذ پیدا کرنے کی بنیادی شرط ہے، حضرت ہودؑ نہ تو غصے میں آئے اور نہ ہی سخت الفاظ استعمال کئے۔

حضرت ہودؑ کے جوابات

پہلے دوالزامات (کہ تمہارا کام احمقانہ ہے اور تم دروغگو ہو) کا جواب اس طرح دیا:

يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ سَفَاهَةٌ وَّلٰـكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنَا لَـكُمۡ نَاصِحٌ اَمِيۡنٌ ﴿۶۸﴾

اے میری قوم! مجھ میں سفاہت نہیں ہے میں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے پیغام لانے والا ہوں، اپنے پروردگار کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے ایک امین ناصح ہوں۔ (اعراف۔67،68)

ان دو آیات کے مضمون پر غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت ہودؑ نے بالکل سکون ومتانت سے پہلے اعتراض کا جواب دیا، اس کے بعد دروغگوئی کے الزام کا جواب ''نَاصِحٌ اَمِيۡنٌ'' کے جملہ کے ذریعے دیا کہ میں امین و ناصح ہوں اور امین شخص جھوٹ نہیں بولتا، اس طرح کے الزامات کا جواب یہی ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر حضرت ہودؑ حکماء کو جمع کرتے کہ وہ ان کے دماغی

توازن کے صحیح ہونے کی تائید کریں یا اپنی صداقت پر شواہد لاتے، تو یہ خود ان الزامات کو ایک طرح کی اہمیت دینے کے مترادف ہوتا، حالانکہ ان الزامات پر انہوں نے سعت صدر کا مظاہرہ کرتے ہوئے چشم پوشی سے کام لیا۔ اس طرح کی دانشمندی مخالف کے وجدان کو خود اس کے خلاف بھڑکا دیتی ہے کہ وہ اصلاح کے لیے کیسی بردباری اور تحمل سے کام لے رہا ہے۔

جنون جیسے الزامات کا جواب دیتے ہوئے حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تمہارے خداؤں نے مجھے آسیب زدہ کر دیا ہے، وہ بھی اس لیے کہ میں انہیں برا بھلا کہتا ہوں، تو اب میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں ان سے متنفر ہوں، اگر تم یہ کہنے میں سچے ہو کہ انہوں نے مجھے آسیب زدہ کیا ہے، تو تم اور تمہارے خدا اکٹھے ہو کر مجھے نقصان پہنچا لو اور میری زندگی کا چراغ گل کر دو، اگر تم نے دیکھا کہ تمہارے خدا مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے ہیں اور میں راہ حق میں ثابت قدمی سے کھڑا ہوں تو پھر جان لینا کہ تمہارے خدا اس سے بہت کمزور تر ہیں کہ کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں، چنانچہ اور ارشاد ہوتا ہے:

اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۵۴﴾ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَکِیۡدُوۡنِیۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾

میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں اللہ کے سوا تمہارے تمام معبودوں سے بیزار ہوں تم اٹھو، پوری کوشش کر لو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔ (ہود۔ 54، 55)

اس کے بعد اپنی طاقت اور ثابت قدمی کا سرچشمہ خدائے عظیم کو قرار دیا، وہ پروردگار جو ہر انسان سے حساب لیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنِّیۡ تَوَکَّلۡتُ عَلَی اللّٰهِ رَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (ہود۔ 56) [1]

چونکہ ان کے اعتراضات دشمنی اور تعصب پر مبنی تھے اس لیے حضرت ہودؑ نے ان میں سے بعض کو جواب نہ دیا کیونکہ جواب دینے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ آخر کار انہوں نے اپنی گفتگو کا اختتام ایک جامع جملہ پر اس طرح کیا کہ یہ تمہارے معبود صرف نام کے خدا ہیں اور یہ نام بھی تم نے ہی انہیں دیا ہے۔ ان کے معبود ہونے پر خدا کی طرف سے کوئی دلیل نہیں آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَتُجَادِلُوۡنَنِیۡ فِیۡۤ اَسۡمَآءٍ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُکُمۡ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ (اعراف۔ 71)

---

[1] حضرت نوحؑ نے بھی اپنے مخالفین کو بالکل یہی جواب دیا تھا: فَعَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَکُمۡ وَشُرَکَآءَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُنۡ اَمۡرُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ غُمَّةً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَیَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾ (یونس۔ ۷۱) اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ کو بھی بالکل جواب تعلیم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: قُلِ ادۡعُوۡا شُرَکَآءَکُمۡ ثُمَّ کِیۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۱۹۵﴾ (اعراف۔ ۱۹۵)

(۴)۔نزول عذاب کا خوف دلانا اور عذاب کی درخواست

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسے مقاصد کے لیے پیدا کیا ہے جو اس کے کمال کے حصول میں معاون ہوں، جب تک وہ اس کمال کے راستہ پر گامزن ہے اور اس تک پہنچنے کا احتمال جب تک اس کے وجود پر حکم فرما ہے اس وقت تک طبیعی زندگی کے عوامل اس کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ رہیں گے اور اس کی زندگی کا سلسلہ جاری رہے گا، لیکن جونہی اس نے تخلیق کے ہدف سے دوری اختیار کر لی اور ہدف تک پہنچنے کی امید اس کے اندر مرجھا گئی تو اس وقت زندگی کے عوامل کی اس سے ہم آہنگی ایک فضول بات ہوگی، تو لازم ہوگا کہ جلدی مزاحم عناصر گھاس پھوس کی طرح اس کی جڑیں کاٹ دیں۔

حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، ان کی ہدایت کے لیے مختلف طریقے اختیار کر لیے لیکن ان کے اندر انسانی حقیقت اس حد تک مرچکی تھی کہ وہ عذاب الٰہی کے تقاضا ہی کرتے رہے۔

موضوع سے متعلق آیات

قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ .... فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ۝۷۱ (الاعراف۔۷۱)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ۝۵۷ (ہود۔۵۷)

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۲۲ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ڮ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ۝۲۳ (الاحقاف۔ ۲۲،۲۳)

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ۝۳۹
قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ۝۴۰ۚ (المومنون۔۳۹،۴۰)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اللہ تعالیٰ کا غضب اور عذاب تم پر لازم ہو چکا ہے،انتظار کرو کہ میں بھی انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

۲)۔اگر تم میری دعوت (حق) سے منہ موڑ لو گے تو میں نے اپنی رسالت تم تک پہنچا دی ہے۔میرا پروردگار تمہیں نیست و نابود کر کے دوسرے لوگوں کو تمہارا جانشین بنا دے گا اور تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، میرا پروردگار ہر چیز کی حفاظت کرنے والا ہے۔

۳)۔اگر تم سچ کہتے ہو تو جس عذاب کا تم نے وعدہ کیا ہے وہ لے آؤ،حضرت ہودؑ نے کہا کہ عذاب نازل ہونے کا وقت اللہ ہی کو معلوم ہے، میں اپنی رسالت کی ذمہ داری پوری کروں گا جب کہ میں تمہیں نادان قوم پاتا ہوں۔

۴)۔پروردگار! مجھے جھٹلایا گیا ہے پس میری مدد فرما۔

۵)۔خطاب ہوا کہ جلد ہی وہ اپنے جھٹلانے پر پشیمان ہوں گے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت ہودؑ کی قوم نے جو ان کی توہین کی اور ان پر الزامات لگائے، حضرت ہودؑ نے ان پر صبر، بردباری اور حوصلے سے کام لیا، جس سے اس قوم کی جرأت بڑھ گئی، چنانچہ اپنے آپ کو قوی اور طاقت ور سمجھنے اور حضرت ہودؑ کو کمزور و ناتوان سمجھ کر ان سے کہا: ''اپنی دھمکی پر عمل کرو''۔ حضرت ہودؑ کبھی کبھی خدا کے عذاب نازل ہونے کی بات کرتے اور ان سے کہتے کہ اگر تم نے آیات الٰہی کا انکار کر دیا تو تمہارا یہ کفر ردِ عمل کے بغیر نہیں رہے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اگر تم میری دعوت سے منہ موڑ لو گے تو میں نے اپنی رسالت تم تک پہنچا دی ہے۔ پروردگار نیست و نابود کر کے

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّآ أُرْسِلْتُ بِهٖٓ إِلَيْكُمْ ط وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ط إِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٥٧﴾

دوسرے لوگوں کو تمہارا جانشین بنا دے گا، تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، میرا پروردگار ہر چیز کی حفاظت کرنے والا ہے۔ (ہود۔57)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ.........فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ﴿۷۱﴾

اللہ تعالیٰ کا غضب و عذاب تم پر لازم ہو چکے ہیں، انتظار کرو کہ میں بھی انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔(اعراف۔71)

وہ لوگ بیدار ہونے اور اللہ کی طرف پلٹنے کی بجائے اور جری ہو گئے اور نزول عذاب کی درخواست کرتے ہوئے کہنے لگے:

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴿۲۲﴾

اگر سچ کہتے ہو تو جس عذاب کا تم نے وعدہ کیا ہے وہ لے آؤ۔(احقاف۔22)

حضرت ہودؑ کو معلوم تھا کہ ان پر عذاب الٰہی نازل ہوگا، اس کے باوجود انہوں نے فرمایا:

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ﴿۲۳﴾

نزول عذاب کا وقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے، میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے اور تمہیں ایک نادان قوم پاتا ہوں۔(احقاف۔23)

یقیناً ایسے لوگ زمین پر اللہ کے نمائندہ نہیں رہ سکتے، اور خلقت کے اہداف کی تکمیل نہیں کر سکتے، زمین کو اس طرح کے لوگوں کے وجود سے پاک بھی ہو جانا چاہیے اور یہاں نئی نسل کو آ جانا چاہیے تا کہ وہ اپنے دامن میں نیک و پاکدامن لوگ پروان چڑھائے، اگر چہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس راستے پر چلنے میں انہیں بھی کچھ نقصانات اٹھانا پڑیں۔

اب وہ وقت آ گیا کہ حضرت ہودؑ دعا کریں اور ان کی دعا قبول ہو جائے۔ گویا حضرت ہودؑ نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتے ہوئے عرض کیا:

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ﴿۳۹﴾

پروردگار! مجھے جھٹلایا گیا ہے، میری مدد فرما۔(مومنون۔39)

ارشاد ہوا:

قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ﴿۴۰﴾

جلد ہی وہ اپنے اس جھٹلانے پر پشیمان ہوں گے۔(وہ پشیمانی انہیں کوئی فائدہ نہ دے گی)۔(مومنون۔40)

(۵)۔نزول عذاب اور ان کی کیفیت

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کو مختلف طریقے سے برباد کیا ہے۔قوم نوحؑ کو غرق کر کے،قوم عاد کو ہوا کے ذریعہ قوم ثمود کو چنگھاڑ کے ذریعے ۔۔۔وغیرہ،شاید اس سلسلہ میں ان کے گناہوں اور عذاب کی نوعیت کے درمیان کوئی تعلق پایا جاتا ہو اور عذاب کی کیفیت کا انتخاب ایسی مصلحتوں کی بنیاد پر ہو جن کا علم ہمیں نہیں ہے۔تاہم مسلم ہے کہ جان لیوا ہوا کے جھکڑ چلنے سے قوم ہوؑد بے روح جسموں کے ساتھ لکڑیوں کی طرح زمین پر گر گئی۔قرآنی آیات نے ان کی حالت کو کئی تعبیرات کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

موضوع سے متعلق آیات

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَمَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۴ (الاحقاف۔۲۴)

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۲۵ (الاحقاف۔۲۵)

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝۱۶ (حم السجدہ۔۱۶)

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸ (الحاقہ۔۶تا۸)

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝۱۹ (قمر۔۱۹)

وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝۴۱ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝۴۲ (الذاریات۔۴۱،۴۲)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۱

(مومنون۔۴۱)

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿١٣﴾

(حم السجدہ۔۱۳)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔جب انہوں نے آسمان پر چلتے ہوئے بادل کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ بادل ہم پر برسے گا، بلکہ یہ تو وہی عذاب ہے جس کے نزول میں تم جلدی کر رہے تھے، یعنی ایسی ہوا جس میں دردناک عذاب ہے۔

۲)۔ایسی ہوا جو اللہ کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالتی ہے۔پس سب نابود ہو گئے، ان کے گھروں کے سوا ان میں کچھ باقی نہ بچا، ہم مجرم قوم کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

۳)۔ہم نے نحس دنوں میں قوم عاد پر تیز آندھی بھیجی تا کہ اس دنیا کی زندگی میں ذلت آمیز عذاب کا مزہ انہیں چکھائیں جب کہ آخرت کے عذاب کی ذلت اس دنیا کے عذاب سے بہت زیادہ ہے۔وہاں کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

۴)۔قوم عاد تیز تباہ کن آندھی کے ذریعے نیست و نابود ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے سات راتیں اور آٹھ دن ان پر تباہ کرنے والی آندھی مسلط فرمائے رکھی، تم زمین پر ان کے جسم کھجور کے خشک تنوں کی طرح بکھرے ہوئے دیکھتے ہو، کیا تمہیں ان کا کوئی نشان نظر نہیں آتا؟

۵)۔ہم نے ان کے لیے تیز آندھی (سرد) اس دن بھیجی جس دن کی نحوست مدام تھی۔

۶)۔قوم عاد کے متعلق (یہ ہے کہ) جب ہم نے ان کے لیے تباہ کن ہوا کو بھیجا تو وہ تیز آندھی جس پر سے گذرتی اسے بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں تبدیل کر دیتی۔

۷)۔انہیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔پس ہم نے سب کو خشک درختوں کی طرح کر دیا، ظالم قوم رحمت حق سے دور ہو۔

۸)۔اے اللہ کے رسولؐ! قریش سے کہہ دو کہ اگر اللہ کے فرمان سے روگردانی کرو گے تو میں تمہیں قوم عاد اور ثمود

پر گرنے والی بجلی سے ڈراتا ہوں۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

مذکورہ آیات ان پر نازل ہونے والے عذاب کی کیفیت بیان کرتی ہیں، کبھی اس کا وقت بتاتی ہیں اور ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝٦ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝٧ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝٨

قوم عاد تیز تباہ کن آندھی کے ذریعہ نابود ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے سات راتیں اور آٹھ دن ان پر ویران کن آندھی مسلط رکھی، تم زمین پر ان کے جسم کھجور کے خشک درختوں کی طرح بکھرے ہوئے دیکھتے ہو، کیا تمہیں ان کا کوئی نشان نظر نہیں آتا؟۔ (حاقہ۔6 تا 8)

ایک اور آیت میں عذاب کی مدت کو متعین کئے بغیر فقط ''اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ'' کا جملہ استعمال ہوا ہے جو منحوس دنوں کے معنی میں ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝١٦

ہم نے منحوس ایام میں قوم عاد پر تیز آندھی بھیجی تا کہ اس دنیا کی زندگی کے ذلت آمیز عذاب کا مزہ انہیں چکھائیں، جبکہ آخرت کے عذاب کی ذلت اس دنیا کے عذاب سے کہیں زیادہ ہے، وہاں کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔ (فصلت۔16)

اس بات کے پیش نظر کہ پہلی آیت میں آٹھ دنوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، تو اس آیت میں بھی، ''دنوں'' سے مراد وہی سات راتیں اور آٹھ دن ہیں، گویا طلوع صبح کے وقت آندھی چلنا شروع ہوئی اور سات راتیں گذرنے کے بعد آٹھویں دن غروب کے وقت جا کر تھمی۔

تیسری آیت میں ''یوم نحسٍ مستمر'' کا جملہ استعمال ہوا ہے اور اس دن کی نحوست کو استمراری قرار دیا گیا ہے، یہ بات اس بات پر شاہد ہوگی کہ یہاں ''یوم'' سے مراد رات کے مقابلہ میں دن نہیں ہے، بلکہ وقت کا وہ حصہ ہے جو پہلی آیت میں آنے والے عدد پر منطبق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّآ أَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيحٗا صَرۡصَرٗا فِي يَوۡمِ نَحۡسٖ مُّسۡتَمِرّٖ ﴿١٩﴾

ہم نے ان پر تیز (سرد) آندھی اس دن بھیجی جس دن کی نحوست مسلسل جاری تھی۔ (قمر۔19)

چوتھی آیت میں ہلاکت کا عامل ''ریح عقیم'' کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَفِي عَادٍ إِذۡ أَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الرِّيحَ الۡعَقِيمَ ﴿٤١﴾ مَا تَذَرُ مِن شَيۡءٍ أَتَتۡ عَلَيۡهِ إِلَّا جَعَلَتۡهُ كَالرَّمِيمِ ﴿٤٢﴾

قوم عاد کے متعلق یاددہانی کراؤ، ہم نے ان پر منحوس ہوا بھیجی کہ جس چیز پر وہ چلتی تھی اسے مردہ و بوسیدہ کر دیتی تھی۔ (ذاریات۔41،42)

یہاں تک عذاب کا عامل بادِ ''صرصر'' یا ''ریح عقیم'' کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن دوسری آیات میں چنگھاڑ اور آسمانی بجلی کو اس کا عامل قرار دیا گیا ہے۔ چنگھاڑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَأَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ بِالۡحَقِّ فَجَعَلۡنَٰهُمۡ غُثَآءٗۚ فَبُعۡدٗا لِّلۡقَوۡمِ الظَّٰلِمِينَ ﴿٤١﴾

انہیں ایک ہیبت ناک چنگھاڑ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، پس ہم نے سب کو خشک درختوں کی طرح کر دیا ستم گر قوم اللہ کی رحمت سے دور ہو۔ (مومنون۔21)

آسمانی بجلی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنۡ أَعۡرَضُواْ فَقُلۡ أَنذَرۡتُكُمۡ صَٰعِقَةٗ مِّثۡلَ صَٰعِقَةِ عَادٖ وَثَمُودَ ﴿١٣﴾

اگر تم میری دعوت سے منہ موڑ لو گے تو میں تمہیں قوم عاد و ثمود پر گرنے والی بجلی کی مانند عذاب سے ڈراتا ہوں۔ (فصلت۔13)

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ لفظ ''صرصر'' ان تیز ہواؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کبھی گرم اور کبھی سرد ہوتی ہیں، اور مہیب تیز آواز کے ساتھ چلتی ہیں، اس صورت میں وہ آیات جن میں ''صرصر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہ ضمنی طور پر چیخ پر ہی دلالت کرتی ہیں، چونکہ ان آیات میں ''صاعقہ'' کا بھی ذکر ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہوا گرم تھی اور بجلی پیدا کرتی تھی کہ کبھی اسے ''صرصر'' اور کبھی ''صاعقہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کے عذاب کی کیفیت سے متعلق آیات کی جمع بندی کی جا سکتی ہے اور یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ آٹھ دن تک گرم، تیز اور خوفناک ہوا چلنے کے بعد قوم عاد ہلاک و برباد ہو گئی۔

حیرت ناک بات یہ ہے کہ ان سرکش لوگوں نے جب بادلوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو یہ سوچا کہ یہ ہوائیں بارش کے آنے کی

نوید دے رہی ہیں، لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ یہی وہ عذاب ہے جس کے لیے وہ جلدی کر رہے تھے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۴ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۲۵

جب انہوں نے آسمان میں بادلوں کو چلتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ ابرِ رحمت ہے، لیکن نہیں جانتے تھے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کے نزول کے لیے وہ جلدی کر رہے تھے یعنی ایسی ہوا ہے جس میں دردناک عذاب ہے جو اللہ کے حکم سے سب چیزوں کو نابود کر دے گا، آخر کار وہ برباد ہو گئے اور ان کے گھروں کے سوا کچھ بھی نہ بچا، ہم گنہگار قوم کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ (احقاف۔24،25)

آخر کار اگر چہ اس مہلک ہوا نے سب گنہگاروں کو ہلاک کر دیا، لیکن ہودؑ اور مومنین اس سے محفوظ رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۷۲

ہودؑ اور جو اس کے ساتھ تھے، اپنی رحمت کے ذریعے ہم نے ان کو نجات دی اور جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے ان کی ہم نے جڑ کاٹ دی، کیونکہ وہ مومن نہیں تھے۔[1] (اعراف۔72)

(۶)۔نکات اور عبرت آمیز باتیں

۱)۔حضرت ہودؑ کی تبلیغ کا طریقہ مبلغین کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے کہ انہیں جاہل افراد کے مقابلہ میں کس طرح ہمت، حوصلے، اور استقامت سے کام لینا چاہیے۔

۲)۔حضرت ہودؑ نے تبلیغ کے وقت لوگوں کے جذبات کو ابھارا ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلا کر ان کے وجدان کو پیدا کیا ہے اور اسے ان کے سرکش نفس کے خلاف ابھارا ہے، اس طرح استغفار و نزول نعمت کے درمیان وجود غیبی تعلق کی بات کی اور مبلغین کو سمجھایا ہے، تمام غیبی مسائل کو مادی قالبوں میں بیان نہیں کرنا چاہیے، یعنی ماوراء مادہ دنیا کو محسوسات اور تجربہ کی حد تک نیچے نہ لائیں۔

۳)۔بات کرتے وقت باقی انبیاء کی طرح حضرت ہودؑ بھی اگر چہ نرم خوئی اور لچک سے کام لیتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی

[1] ہود۔۵۸ میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔

قاطعیت اپنی جگہ برقرار رہتی۔تردید تذبذب اور دوزخی گفتگو ان کا طریقہ کار نہیں تھا، وہ بلند آواز سے کہتے:

میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔(

تمام انبیاء کی گفتگو اور پیغمبر اسلامؑ کی گفتگو میں دوٹوک انداز بالکل واضح طور پر نظر آتا ہے۔قرآن انہیں اس طرح کہنے کی تعلیم دیتا ہے:

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ (کافرون۔1)

۴)۔حضرت ہودؑ کی تبلیغ سے ان کی قوم کی روگردانی کرنے کی ایک وجہ نعمتوں کی فراوانی تھی جو بعض لوگوں کو متکبر بنا دیتی ہے۔دولت اگرچہ اللہ کی نعمت ہے اس کے باوجود اگر یہ ایمان سے تہی دست افراد کے ہاتھ میں آجائے تو انہیں مغرور و متکبر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ كَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ وَاَتۡرَفۡنٰهُمۡ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ

اس قوم کے اشراف جو کفر اختیار کر چکے تھے اور آخرت کا انکار کرتے تھے، ہم نے انہیں دنیاوی زندگی میں نعمت عطا فرمائی۔(مومنون۔33)

جس طرح ہم نے بیان کیا ہے زیادہ دولت متکبر و مغرور بننے کا باعث بنتی ہے۔تکبر عقلی تفکر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِي الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ (فصلت۔15)

آخر میں ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ثروت، فضول خرچی تکبر اور آیات الٰہی کے انکار پر مشتمل زندگی عذابوں اور مصیبتوں کا باعث بنتی ہے، تاہم ممکن ہے اس امت پر عذاب کی کیفیت گذشتہ امتوں پر عذاب کی کیفیت سے مختلف ہو۔

پانچویں پیغمبر

قوم ثمود کے لیے حضرت صالح علیہ السلام

حیثیت الٰہی یہ ٹھہری ہے کہ انسان کو رہبران آسمانی کے ذریعے نیکی کا راستہ دکھائے۔ اگر نافرمانی کی وجہ سے کوئی قوم عذاب میں مبتلا ہوتو دوسری قوم اس کی جگہ لے لے اور زمین پر انبیاء کی بعثت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیضان جاری رہے۔

حضرت صالحؑ پیغمبر جو ہدایت بشر کے لیے اللہ کی جانب سے مبعوث کئے گئے، اگر حضرت آدمؑ کی نبوت کو سامنے نہ رکھیں جن کو رسالت نہیں ملی تھی اور صرف رسولوں کے سلسلہ کو ہی مدنظر رکھیں تو سب سے پہلے رسول حضرت نوحؑ، دوسرے حضرت ہودؑ اور تیسرے حضرت صالحؑ ہیں۔ اب ہم حضرت صالحؑ کی داستان حیات بیان کرتے ہیں۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت ہودؑ کا نسب تین واسطوں سے "عادؑ" سے ملتا ہے اور حضرت صالحؑ میں چھ واسطوں سے عاد سے ملتے ہیں۔ حضرت نوحؑ تک باقی سلسلہ نسب سب کا ایک ہی ہے۔[1]

قوم صالحؑ کی سرگذشت متعدد سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔ مثلاً اعراف، ہود، حجر، نحل، فصلت، ذاریات، نجم، قمر، حاقہ اور شمس۔ قرآن میں حضرت صالحؑ کا نام نو بار آیا ہے۔[2]

حضرت صالحؑ کی سرگذشت میں قرآن نے مجموعی طور پر جو پہلو ذکر کئے ہیں، وہ اس طرح ہیں:

۱)۔ قوم صالحؑ (ثمود) کی خصوصیات

۲)۔ ان کی تبلیغ کے مطالب اور طریقہ کار

۳)۔ حضرت صالحؑ کا قابل بحث معجزہ

۴)۔ مخالفین اور مخالفت کے محرکات

۵)۔ عذابِ الٰہی یا مخالفت پر ردعمل

۶)۔ نکات اور نصیحت آموز باتیں

---

[1] حضرت صالحؑ کے نسب کی نگارش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ قصص قرآن راوندی ص ۱۹۵ اور مجمع البیان ج ۲ ص ۴۴۰ کی طرف رجوع کریں۔

[2] اعراف۔ ۷۳، ۷۵، ۷۷، ہود۔ ۶۱، ۶۲، ۶۶، ۸۹، شعراء۔ ۱۴۲، نمل۔ ۴۵، فصلت۔ ۱۷، ذاریات۔ ۴۳، نجم۔ ۵۱، قمر۔ ۲۳، ۳۱، حاقہ۔ ۵، شمس۔ ۱۱، ۱۵

(۱)۔قوم صالحؑ کی خصوصیات

موضوع سے متعلق آیات

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾ (الاعراف۔۷۴)

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ○............وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ (الحجر۔۸۰تا۸۳)

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ (الشعراء۔۱۴۲تا۱۴۹)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔یاد کرو کہ اللہ نے تمہیں قوم عادؑ کا جانشین قرار دیا اور زمین ٹھہرایا، زمین کے ہموار حصوں پر تم محلات بناتے ہو اور پہاڑوں میں گھر بناتے ہو، پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

۲)۔سرزمین حجر کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔۔۔وہ پہاڑوں کے اندر اپنے امن و امان والے گھر تراشتے تھے۔

۳)۔کیا تم گمان کرتے ہو کہ اس دنیا میں ان نعمتوں کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں تم محفوظ ہو اور موت و عذاب سے بچ جاؤ گے؟ ان باغات چشموں، کھیتوں اور نازک شگوفوں کے درمیان تم باقی رہو گے؟

مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم صالحؑ نے قوم ہودؑ کے بعد نشوونما پائی۔تمدن کے حوالہ سے انہوں نے اتنی ترقی کی کہ ہموار زمینوں پر محلات بنائے اور پہاڑوں میں بھی اپنے لیے گھر بنائے۔شاید گرمی کے موسم میں وہ محلات میں زندگی بسر کرتے تھے اور سردیوں میں پہاڑوں کے دامن میں آجاتے تھے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ

یاد کرو کہ اللہ نے تمہیں قوم عاد کا جانشین بنایا اور زمین میں ٹھہرایا۔ زمین کے ہموار حصوں پر تم محلات بناتے ہو اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو۔ (اعراف۔ ۷۴)

دوسری آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ حضرت لوطؑ سے پہلے کے دور میں زندہ تھے، جو حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر تھے۔ اس پر شاید یہ امر ہے کہ دو جگہوں پر (سورۂ اعراف و شعراء) قوم ثمود کی داستان حیات ذکر کرنے کے بعد قوم لوطؑ کے بعد قوم لوطؑ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔[۱]

ایک جگہ پر (سورۂ ہود) قوم ثمود کی داستان حیات ذکر کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ پر فرشتوں کے نازل ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔[۲] ان آیات کا سیاق یہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت ابرہیم اور لوطؑ سے پہلے ایک دور میں رہتے تھے، اس طرح حضرت صالحؑ رسولوں کے سلسلہ کی تیسری کڑی قرار پاتے ہیں۔

مذکورہ آیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کی سرزمین کا نام ''حجر'' تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾

سرزمین حجر کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ (حجر۔ 80)

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم کے لیے مبعوث ہونے والے واحد حضرت صالحؑ ہی ہیں لیکن چونکہ تمام انبیاء کا لائحہ عمل ایک ہے لہٰذا ایک کو جھٹلانا سب کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اس لیے ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ○ (شعراء۔ 141)

پھر ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ (قمر۔ 23)[۳]

اس سلسلہ میں ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

مفسرین نے اس قوم کو عرب اقوام میں شمار کیا ہے اور اسے ''عرب بائدہ'' کا نام دیا ہے یعنی نابود شدہ اس کے مقابلہ میں ''عربی'' ہیں

---

[۱] اعراف۔ ۸۰ ''ولوطا اذقال لقومه......'' ۔شعراء۔ ۱۶۰ ''کذبت قوم لوط المرسلین......''

[۲] اعراف۔ ۸۰ ''ولوطا اذقال لقومه............'' ۔شعراء۔ ۱۶۰ ''کذبت قوم لوط المرسلین............''

[۳] نذر جمع ہے نذیر کی، جو ڈرانے والے کے معنی میں ہے، یہ انذار یعنی ڈرانے کے معنی میں نہیں ہے۔

جو قوم ابراہیمؑ کے بعد آگے بڑھی ہے اور ''قحطان'' و ''عدنان'' گروہوں میں تقسیم ہوئے۔اہل یمن کو قحطانی اور اہل حجاز کو عدنانی کہا جاتا ہے۔ چونکہ انہیں قوم عاد کے بعد زمین پر جانشین بنایا گیا اس لیے ''حجر'' نامی سرزمین کو عرب علاقے میں ہونا چاہیے ارشاد ہوتا ہے:

''اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ''

اس بیان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا علاقہ عاد کے علاقے کے نزدیک ہی تھا جو ان کی حالت سے کسی حد تک آگاہ تھے۔اس لیے حضرت صالحؑ نے انہیں ایسے خراب انجام میں گرفتار ہونے سے ڈرایا۔قوم ہود کی سرزمین احقاف[1] کی سرزمین تھی۔احقاف بھی عربی علاقہ ہی ہے جو حضر موت کے شمال اور عمان کے مشرق میں واقع ہے۔لہٰذا طبیعی طور پر قوم ثمود کا علاقہ بھی انہیں علاقوں کے آس پاس ہی ہونا چاہیے۔بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ قرآن نے یہ یاددہانی کرائی ہے کہ عصر رسالت کے لوگوں میں ان کا علاقہ مشہور و معروف تھا اور شاید وہ شام و حجاز کی طرف اپنے سفر میں اس کے پاس سے گذرتے تھے۔اگر وہ آگاہ لوگ ہوتے تو اس سے عبرت حاصل کرتے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَتِلۡکَ بُیُوۡتُہُمۡ خَاوِیَۃًۢ بِمَا ظَلَمُوۡا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۲﴾

یہ منہدم گھر انہی کے ہیں جو ظلم کی وجہ سے اس حالت کو پہنچے، یہ علم رکھنے والوں کے لیے نشانی ہیں۔(نمل۔52)

ان کا ذریعہ معاش زراعت و باغبانی تھا۔آیت بتاتی ہے کہ اس علاقہ میں باغات، کھیت اور نخلستان پائے جاتے تھے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَتُتۡرَکُوۡنَ فِیۡ مَا ہٰہُنَاۤ اٰمِنِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوۡعٍ وَّ نَخۡلٍ طَلۡعُہَا ہَضِیۡمٌ ﴿۱۴۸﴾

کیا تم گمان کرتے ہو کہ اس دنیا میں ان نعمتوں کے ساتھ جو اللہ نے تمہیں دی ہیں تم محفوظ ہو اور موت و عذاب سے بچ جاؤ گے؟ ان باغات، چشموں، کھیتوں اور نرم و نازک شگوفوں والے کھجور کے درختوں میں تم باقی رہو گے؟(شعراء۔146 تا 148)

حضرت صالحؑ اور ان کے مخالفین کے درمیان پانی پر جو جھگڑا ہوا اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں زراعت اور پانی سے استفادہ کا طریق کار بڑا مؤثر تھا۔اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

[1] احقاف۔۲۱ ''واذکر اخا عادٍ اذ انذر قومہ بالاحقاف''

(۲) تبلیغ کے مطالب اور طریقۂ کار

قوم ثمود کی خصوصیات سے ہم آگاہ ہوئے۔ اب صالحؑ کی تبلیغ کے مطالب اور ان کی تبلیغ کے طریقہ کار کا جائزہ لیتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ (الاعراف۔۷۳)

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ......

فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ﴿۷۴﴾ (الاعراف۔۷۳، ۷۴)

وَاِلٰى ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ هُوَ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَاسۡتَعۡمَرَكُمۡ فِيۡهَا فَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ قَرِيۡبٌ مُّجِيۡبٌ ﴿۶۱﴾ (ہود۔۶۱)

اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّىۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۴۵﴾ وَلَا تُطِيۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيۡنَ يُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا يُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾ (الشعراء۔ ۱۴۲ تا ۱۴۵، ۱۵۱، ۱۵۲)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہای طرف دلیل آچکی ہے۔

۲)۔ یاد کرو جب قوم عاد کے بعد تمہیں ان کا جانشین بنایا گیا۔

۳)۔اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

۴)۔قوم ثمود کی جانب ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔اس نے تمہیں زمین (مٹی) سے پیدا کیا اور تم سے اسے آباد کرنے کو کہا۔اس سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو۔میرا پروردگار قریب ہے اور دعائیں قبول فرماتا ہے۔

۵)۔جب ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا: تم اللہ کی مخالفت سے بچتے کیوں نہیں ہو؟ میں تمہارے لیے رسول امین ہوں، اللہ کی مخالفت سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، میں تبلیغ کے بدلہ میں تم سے کسی اجرت کا طلبگار نہیں ہوں ، میری اجرت تو صرف تمام جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے۔۔۔فساد پھیلانے والوں کی اطاعت نہ کرو، وہ لوگ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح کی تبلیغ کے مطالب اور ان کی تبلیغ کا طریقہ کار دوسرے رسولوں کی طرح ہی تھا۔ان کے درمیان مشترک نکات یہ ہیں:

۱)۔دوسروں کی طرح ان کو بھی ایک ایسی بت پرست قوم کا سامنا کرنا پڑا جو جھوٹے معبودوں کی عبادت کرتی تھی، اس لیے انہوں نے اپنی قوم کو توحید پرستی کی طرف بلایا اور فرمایا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (ہود۔61)

۲)۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ بت پرستی تقویٰ سے دوری کا موجب ہوتی ہے، بالخصوص اگر یہ قیامت کے انکار کے ساتھ ہو، ہم جس طرح بیان کریں گے، قوم صالح قیامت کا بھی انکار کرتی تھی اس لیے انہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی دعوت دی گئی اور فرمایا:

''اَلَا تَتَّقُوْنَ'' و ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنَ''

۳)۔مذکورہ آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قوم صالح خود بھی مفسد تھی اور مفسدین کی پیروی بھی کرتی تھی۔حضرت صالح نے انہیں اس غلط طرزعمل پر ٹوکا، ارشاد فرماتے:

''وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ'' ''وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ''

''الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ''

یعنی''۔۔۔اسراف کرنے والوں کی پیروی نہ کرو جنہوں نے زمین میں تباہی پھیلائی اور اصلاح نہیں کی۔(شعراء۔151،152)

اپنی ذمہ داری پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کے لیے انہوں نے خاص طریقہ ہائے کار کو اپنایا۔

الف: قوم عاد کے عبرت ناک انجام کی یاددہانی، جو کسی حد تک انہوں نے خود دیکھا تھا، یعنی اگر تم بھی انہی کے راستہ پر چلو گے اور اللہ کے پیغمبر کی تکذیب کرو گے تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ

یاد کرو جب قوم عاد کے بعد تم زمین پر ان کے جانشین بنے۔ (اعراف۔74)

ب: اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلانا جس کا تقاضا اللہ کا شکر ادا کرنا ہے، نہ کہ اس سے روگردانی کرنا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ (اعراف۔74)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ

اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور اسے آباد کرنے کی ہمت عطا فرمائی، اتنی بڑی نعمت کے لیے حق تو یہ بنتا ہے کہ اس کی عبادت کرو نہ کہ بتوں کی اپنے گذشتہ اعمال کی معافی مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو، میرا اللہ تمہارے نزدیک ہے اور تمہاری دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ (ہود۔٦١)

ج: دوسرے انبیاء کی طرح حضرت صالحؑ کا بھی اپنی تبلیغ میں خلوص کی علامت، اس پر اجر و پاداش کا نہ مانگنا ہے۔ یہ تمام انبیاء کا طریقہ کار رہا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (شعراء۔145)

(۳)۔ حضرت صالحؑ کا معجزہ

یہاں تک ہم نے حضرت صالحؑ کی تبلیغ کے مطالب اور ان کی تبلیغ کے طریقہ کار سے واقفیت حاصل کی۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام رسول تبلیغ حق پر یقین رکھنے اور دین کے ایسے استحکام جس پر عقل بھی گواہی دیتی ہے کے ساتھ ساتھ معجزہ بھی رکھتے تھے، اور ان کی دعوت ہمیشہ ''تحدی'' کے ساتھ ہوتی تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت صالحؑ کا معجزہ کیا تھا۔ اس موضوع سے متعلق یہ آیات ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ (الاعراف۔۷۳)

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ (الشعراء۔۱۵۵،۱۵۶)

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ (قمر۔۲۷،۲۸)

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾ (الشمس۔۱۳)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری ایک واضح دلیل آئی ہے یہ ناقہ الہٰی تمہارے لیے نشانی ہے، اسے آزاد چھوڑ دو تا کہ اللہ کی زمین پر وہ چرتی رہے۔ اس کے ساتھ برا سلوک مت کرنا مبادا کہیں دردناک عذاب تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے۔

۲)۔ اس نے کہا: یہ اونٹنی ہے، پانی میں ایک دن اس کا حصہ اور دوسرے دن تمہارا۔ اس کے ساتھ برا سلوک نہ کرنا، کہیں عظیم دن کے بڑے عذاب میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔

۳)۔ہم اونٹنی امتحان کے طور پر ان کی طرف بھیج رہے ہیں، تم ان کے کام کو دیکھتے رہو اور صبر کرو اور خبر دے دو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے۔ ہر (باری والے کو) اپنی باری پر ہی آنا چاہیے۔

۴)۔ان سے کہا: کہیں اللہ کی اونٹنی کے پاس نہ جانا اور نہ اس کے پانی پینے میں رکاوٹ بننا۔

قرآنی آیات پر تحقیق کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبوت کے دعویداروں نے ہمیشہ اپنی بات کی سچائی پر معجزہ کے ذریعہ استدلال کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنی تبلیغ کے ابتداء میں ہی معجزہ دکھاتے اور کبھی لوگوں کے مطالبے پر معجزہ دکھاتے تھے۔ حضرت صالحؑ کے معجزہ سے متعلق آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کی درخواست کے بعد معجزہ لائے۔ اس طرح کا معجزہ لوگوں کی درخواست قبول کرنے کی بنیاد پر ہی تھا۔[1]

یہ صحیح ہے کہ معجزہ کو اس دور میں مروج ہنر کے مطابق ہونا چاہیے، لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب مدعی نبوت پہلے معجزہ دکھائے اور لوگوں کو مقابلہ کی دعوت دے۔ جہاں لوگ کسی خاص معجزے کا مطالبہ کریں وہاں ایسا نہیں ہوتا۔ حضرت صالحؑ کا معجزہ دوسری قسم سے متعلق ہے۔

مادیت کے اصولوں کے مطابق مٹی اور پتھر کا کسی جاندار چیز میں تبدیل ہونا یا چٹانوں سے کسی زندہ وجود سے نکالنا ممکنات سے نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والے ان افراد کی نظر میں جو اس کی قدرت کو ان قوانین سے بالاتر سمجھتے ہیں یہ آسان کام ہے۔

حضرت صالحؑ نے ان کی درخواست کو عملی جامہ پہنایا، انہیں تنبیہ کی کہ اس معجزے کی تکریم ملحوظ خاطر رکھیں، اس جانور کے ساتھ دیگر حیوانات جیسا سلوک نہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ اس اونٹنی کے احترام میں لغزش دوسرے جانوروں کے احترام کے خلاف تجاوز کی مانند ہے، بلکہ چونکہ یہ اونٹنی اللہ تعالیٰ کی خاص نشانی ہے (اگرچہ کائنات کی تمام موجودات اس کے وجود کی آیت اور نشانی ہیں) اس لیے یہ خاص احترام اور عظمت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ ہٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمۡ اٰیَۃً فَذَرُوۡہَا تَاۡکُلۡ فِیۡۤ اَرۡضِ اللّٰہِ وَلَا تَمَسُّوۡہَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَکُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۳﴾

تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل تمہاری طرف آئی، یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے۔ اسے زمین پر چرنے پھرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو، اس کے ساتھ برا سلوک نہ کرو تاکہ تمہیں دردناک عذاب اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ (اعراف۔73)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] تفسیر برہان، ج ۲ ص ۲۵ تفسیر عیاشی اور ان آیات سے متعلق جو اس گفتگو میں زیر بحث آئی ہیں۔

اِنَّا مُرۡسِلُوا النَّاقَةِ فِتۡنَةً لَّهُمۡ فَارۡتَقِبۡهُمۡ وَاصۡطَبِرۡ ۝۲۷

ہم نے اونٹنی امتحان کے طور پر ان کی طرف بھیجی۔ ان کے کام پر نگاہ رکھو اور بردباری سے کام لو۔ (قمر۔27)

لوگوں کی درخواست کے بعد معجزہ

سورۂ قمر کی آیت ۲۷ اور اسی طرح سورۂ شعراء کی آیت ۱۵۴ کا جس کی تشریح بعد میں آئے گی، ظاہر یہ بتاتا ہے کہ حضرت صالحؑ نے پہلے دن سے ہی معجزے کے ذریعہ کوئی تقاضا نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس وقت معجزہ لائے جب ان سے معجزہ کا مطالبہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

''ہم نے اونٹنی امتحان کے طور پر ان کی طرف بھیجی تم ان کے کام پر نظر رکھو''، اگر ان کے پاس پہلے ہی سے معجزہ ہوتا تو پھر طرز تکلم اور ہوتا۔ چنانچہ موسیٰؑ کی داستان میں گفتگو اور طرح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِذۡهَبَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ ....قَدۡ جِئۡنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰى ۝۴۷

سرکش فرعون کی طرف جاؤ۔۔۔کہو کہ ہم تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی و معجزہ لے کر آئے ہیں، ہدایت کے پیروکاروں پر سلامتی ہو۔ (طہ۔43 تا 47)

اسی طرح سورۂ شعراء سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت صالحؑ نے اس وقت معجزہ پیش کیا جب قوم نے معجزہ کا مطالبہ کیا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۖۚ فَاۡتِ بِاٰيَةٍ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۝۱۵۴

تم ہماری طرح ہی بشر ہو، اگر سچ کہتے ہو تو معجزہ لاؤ۔ (شعراء۔154)

پہاڑ کے سینے سے اونٹنی کا پیدا ہونا، اللہ تعالیٰ کا معجزہ تھا۔ اس کی زندگی بھی امتحان کا سبب تھی کیونکہ اللہ نے حضرت صالحؑ کو حکم دیا کہ ان سے کہیں کہ چشمہ کا پانی ایک دن کے لیے قوم صالحؑ کے لیے ہے اور دوسرے دن اونٹنی کے لیے مخصوص ہے۔ وہ اس بات پر پریشان نہ ہوں کہ ایک دن کا پانی اونٹنی کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور اس پر زیادتی نہ کریں، کیونکہ یہ حکم امتحان کے طور پر ہے۔ ہر قسم کا امتحان اور آزمائش انسان کے لیے کچھ پریشانی و تنگی کا باعث تو بنتی ہے ورنہ وہ امتحان ہی نہیں ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرۡبٌ وَّلَكُمۡ شِرۡبُ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۚ ۝۱۵۵ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ عَذَابُ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝۱۵۶

یہ اونٹنی ہے جس کے لیے پانی سے ایک دن کا حصہ اور تمہارے لیے دوسرے دن کا حصہ ہے۔اس کے ساتھ برا سلوک نہ کرنا، کہیں عظیم دن کے بڑے عذاب میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔(شعراء۔155، 156)

اونٹنی کے لیے ایک دن کا پانی مخصوص کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا واقعاً وہ پورے چشمہ کا ایک دن کا پانی پی جاتی تھی یا ایک حیوان جتنا ہی پانی پیتی تھی؟ یہ بات معلوم نہیں ہے لیکن طے کر دیا گیا تھا کہ جو دن اونٹنی کے لیے مخصوص ہے اس دن قوم صالح اس چشمہ سے استفادہ نہیں کرے گی، اور ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾

انہیں آگاہ کر دو کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہوگا، ہر حصے کا مالک اپنے وقت پر (پانی پینے) آئے گا۔(قمر۔28)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾

رسول خدا نے ان سے کہا: کہیں اللہ کی اونٹنی کے نزدیک نہ ہونا، نہ اس کے پانی پینے میں رکاوٹ بننا۔(شمس۔13)

ان آیات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح کا حتمی معجزہ وہ اونٹنی ہی تھی جو غیر معمولی طور پر پیدا کی گئی تھی۔اس کی زندگی قوم صالح کے لیے امتحان کا باعث تھی تا کہ وہ ثابت کریں کہ اللہ کی اطاعت کے راستے وہ اپنے مادی مفادات سے کس حد تک دستبردار ہونے کے لیے تیار ہیں، یہ نکتہ اس وقت واضح ہوتا ہے جب ہم یہ جانیں کہ اس علاقہ میں پانی کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔اس لیے ایک چشمہ کے پانی سے ایک مہینے میں پندرہ دن دستبردار ہونا ایک کسان کے لیے آسان کام نہیں ہے۔

مذکورہ آیات کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ حضرت صالح کے پاس صرف ایک ہی معجزہ تھا، لیکن بعض آیات سے اس کا تنوع ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾

سرزمین حجر کے باشندوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور ہم نے اپنے دلائل و معجزات انہیں (رسولوں کو) دیئے، لیکن سرزمین حجر کے رہنے والوں نے ان سے روگردانی کی۔(حجر۔80، 81)

اگر ہم کہیں کہ ''مرسلین'' سے مراد فقط ''صالح'' ہے اور جمع کے صیغہ کے بجائے مفرد کا صیغہ اس لیے آیا ہے کیونکہ صالح کو جھٹلانا تمام

رسولوں کو جھٹلانے کے مترادف تھا، تو اس صورت میں دوسری آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس اور معجزات بھی تھے۔ لیکن اگر ہم کہیں کہ ''مرسلین'' سے مراد انبیاء ہیں جو اس قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث کئے گئے تھے۔ لیکن قرآن نے ان میں سے صرف ایک کا نام لیا ہے۔ اس صورت میں تعدد آیات رسولوں کے تعدد کی وجہ سے ہے، تو اس صورت میں حضرت صالحؑ کے پاس صرف ایک ہی معجزہ تھا۔

(۴)۔ مخالفین اور مخالفت کے محرکات

گذشتہ اقوام کی طرح قوم صالح ع بھی سوائے چند لوگوں کے حضرت صالحؑ کے لائحہ عمل کی مخالف تھی اور بڑی ہٹ دھرمی سے کام لیتی تھی، درج ذیل آیات ان کی ہٹ دھرمی کا تذکرہ کرتی ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۝۷۵ (اعراف۔۷۵)

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ۝۶۲ (ہود۔۶۲)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ۝۶۳ (ہود۔۶۳)

قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ۝۱۵۳ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۱۵۴ (الشعراء۔ ۱۵۳، ۱۵۴)

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ۝۴۷ (النمل۔۴۷)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ

يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ (النمل۔۴۵)

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ (النمل۔۴۸)

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ (النمل۔۴۹)

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۲۴﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ (القمر۔۲۳تا۲۵)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اس کی قوم کے متکبر اشراف نے بعض مستضعف لوگوں سے، جو صالحؑ پر ایمان لا چکے تھے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ صالحؑ خدا کا رسول ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔

۲)۔انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! اس سے پہلے تو ہماری امید تھا، تو ہمیں ہمارے آباء کی راہ و روش سے کیوں روکتا ہے تو جس چیز کی طرف ہمیں بلاتا ہے ہمیں اس میں شک ہے۔

۳)۔صالحؑ نے کہا! اے میری قوم: اگر تم جانتے ہو کہ میں اپنے اللہ کی طرف سے ہوں تو میں اس پر دلیل و برہان رکھتا ہوں اور اس کی جانب سے میری طرف رحمت آئی ہے (تم مجھے اس کی ممانعت کی طرف کیسے بلاتے ہو؟) پس کون میری مدد کرے گا، اگر میں اس کی مخالفت کروں؟ تمہاری اس تجویز کا نتیجہ نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۴)۔انہوں نے کہا کہ تجھ پر تو جادو کر دیا گیا ہے۔ تو ہماری طرح ایک بشر ہی تو ہے، اگر سچا ہے تو معجزہ لے آ۔

۵)۔انہوں نے کہا کہ ہم نے تم سے اور تم پر جو ایمان لائے ہیں ان سے برا شگون پایا ہے۔صالحؑ نے کہا کہ تمہاری بدشگونی اور بدبختی کے عوامل کا علم اللہ کے پاس ہے۔تم ہمیشہ سے آزمائش سے گذر رہے ہو۔

۶)۔ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا، ان سے کہا گیا کہ اللہ کی عبادت کرو، اچانک وہ دو دشمن

جماعتوں میں تبدیل ہو گئے (یعنی) بعض مؤمن اور بعض کافر ہو گئے۔

۷)۔شہر میں نو قبیلے تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

۸)۔انہوں نے کہا کہ قسم کھاؤ کہ رات کو صالحؑ اور اس کے کنبہ پر شب خون ماریں اور اس کے بعد اس کے والی وارث سے کہہ دیں کہ ہم لوگ ان کے گھر والوں کے ہلاک کے وقت موجود نہ تھے اور ہم لوگ تو یقیناً سچے ہیں۔

۹)۔قوم ثمود نے آیات الٰہی کی تکذیب کی اور کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کریں؟ اس صورت میں ہم بہت بڑی گمراہی میں ہوں گے۔

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اکثریت نے حضرت صالحؑ کی مخالفت کی اس کے باوجود چند لوگ ان پر ایمان بھی لائے۔ چند لوگوں کا ایمان لانا بھی مخالفین کو اس بات پر ابھارتا تھا کہ ان کے مقابلہ میں غلط تبلیغ کریں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ﴿۴۵﴾

قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ وہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے ،ان میں سے ایک گروہ فطری طور پر مؤمنین کا تھا اور دوسرا کفار کا (اگرچہ کفار کی تعداد مؤمنین سے زیادہ تھی)۔(نمل۔45)

قرآن نے نو مفسد گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا طبیعی طور پر دسواں گروہ مؤمنین کا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ﴿۴۸﴾

شہر میں نو قبیلے تھے جو ہمیشہ زمین میں فساد کرتے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔(نمل۔48)

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کی مخالفت کا طریق کار کیا تھا۔ حضرت صالحؑ کی مخالفت کے لیے انہوں نے خاص ہتھکنڈے استعمال کئے جو مندرجہ ذیل طریقوں پر مشتمل تھے:

۱)۔کبھی اس کی نبوت میں شک کا اظہار کرتے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ﴿۶۲﴾

تم ہمیں جس چیز کی طرف بلاتے ہو، ہمیں اس میں شک ہے۔(ہود۔62)

صالحؑ نے ان کے انکار کا جواب اس طرح دیا:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

صالحؑ نے کہا اے میری قوم! اگر تم جانتے ہو کہ میں اپنے اللہ کی جانب سے دلیل و برہان رکھتا ہوں اور اس کی جانب سے میری طرف رحمت آئی ہے (تو پھر مجھے تم اس کی مخالفت کی طرف کیوں بلاتے ہو؟) تو کون میری مدد کرے گا اگر میں اس کی مخالفت کروں؟ تمہاری یہ تجویز نقصان کے سوا کچھ نہیں رکھتی۔ (ہود۔63)

گفتگو کا خلاصہ یہ کہ اگر چہ تمہیں شک ہے لیکن مجھے اپنے طریق کی حقانیت کا پورا پورا یقین ہے اور اس یقین کا سرچشمہ برہان و دلیل ہے۔ شکی انسان صاحب یقین انسان پر اعتراض نہیں کرسکتا۔

۲)۔ قابل تعجب بات یہ ہے کہ وہ شک کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ساتھ مؤمنین کو منحرف کرنے میں لگے رہے۔ قرآن اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

اس کی قوم کے متکبر اشراف نے صالحؑ پر ایمان لانے والے کمزور لوگوں سے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ صالحؑ اللہ کے رسول ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ان کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ (اعراف۔75)

۳)۔ کبھی حضرت صالحؑ کے جذبات بھڑکا کر ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ تم ہماری امید تھے، اب ہم سے جدا کیسے ہو گئے ہو؟

يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ (ہود۔62)

۴)۔ دیگر اقوام کی طرح قوم صالحؑ بھی اللہ کے رسول کے سامنے اپنے اسلاف کے طریقہ کار پر اتراتی تھی اور کہتی تھی:

اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا

تم ہمیں ہمارے آباؤ اجداد کے طریق سے کیوں روکتے ہو؟۔ (ہود۔62)

۵)۔ انبیاء کے مخالفین کے مشہور حربہ سے کام لیتے ہوئے انہوں نے حضرت صالحؑ کو دیوانہ وسحرزدہ قرار دیا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (شعراء۔153)

۶)۔کبھی ان پر دروغگوئی کا الزام لگاتے:

۷)۔اسے متکبر اور خودخواہ کہتے۔ارشاد ہوتا ہے:

بَلۡ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ

کل وہ سمجھیں گے کہ دروغگو اور خودخواہ کون ہے؟۔(قمر۔25)

۸)۔اسے بشر ہونے کا طعنہ دیتے۔گویا ان کے بشر ہونے اور اللہ کی رسالت میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔مذکورہ آیات میں یہ بات دو مرتبہ آئی ہے:

ا۔مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا (شعرا۔154)

ب۔اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ (قمر۔24)

۹)۔کبھی وہ بہت زیادہ ریاکاری سے کام لیتے ہوئے کہتے کہ تمہاری پیروی کرنا تو گمراہی و دیوانگی کے سوا کچھ نہیں:

اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (قمر۔24)

۱۰)۔آخرکار بڑے فریب سے کام لیتے ہوئے کہتے کہ کیا وجہ ہے کہ ہم میں سے فقط تمہاری طرف ہی وحی آئی ہے:

ءَاُلۡقِیَ الذِّكۡرُ عَلَيۡهِ مِنۡۢ بَيۡنِنَا (قمر۔25)

جس طرح آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں ان کی کمزوری اور فضول سوچ گذشتہ اقوام کی طرح ہی تھی،گذشتہ انبیاء کی داستان حیات میں ہم نے اسی طرح کے الزامات کا جائزہ لیا ہے۔

(۵)۔ عذاب الٰہی یا مخالفت پر ردِ عمل

اس نظام ہستی میں ہر عمل کا ایک ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے جو عمل کی حقیقت سے متناسب ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں قوم صالح کی مسلسل ہٹ دھرمی اس بات کا باعث بنی کہ ان سے رحمت الٰہی دور ہوجائے اور تباہ کن عذاب ان کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ اس حصے سے متعلق آیات اس طرح ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾ (الاعراف۔۷۷ تا ۷۹)

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ (ہود۔۶۵ تا ۶۸)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ (الحجر۔۸۳، ۸۴)

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ (الشعراء۔۱۵۷، ۱۵۸)

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ

اَهۡلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ۝۴۹ وَمَكَرُوۡا مَكۡرًا وَّمَكَرۡنَا مَكۡرًا وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ۝۵۰
فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكۡرِهِمۡ ۙ اَنَّا دَمَّرۡنٰهُمۡ وَقَوۡمَهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ۝۵۱
فَتِلۡكَ بُيُوۡتُهُمۡ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوۡا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ۝۵۲
وَاَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ۝۵۳ (النمل۔۴۹ تا ۵۳)
وَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَهَدَيۡنٰهُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰى عَلَى الۡهُدٰى فَاَخَذَتۡهُمۡ صٰعِقَةُ
الۡعَذَابِ الۡهُوۡنِ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ۝۱۷ وَنَجَّيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا
يَتَّقُوۡنَ۝۱۸ (حم السجدہ۔۱۷، ۱۸)
وَفِىۡ ثَمُوۡدَ اِذۡ قِيۡلَ لَهُمۡ تَمَتَّعُوۡا حَتّٰى حِيۡنٍ۝۴۳ فَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهِمۡ فَاَخَذَتۡهُمُ
الصّٰعِقَةُ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ۝۴۴ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مِنۡ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوۡا مُنۡتَصِرِيۡنَ۝۴۵
(الذاریات۔۴۳ تا ۴۵)
فَنَادَوۡا صَاحِبَهُمۡ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ۝۲۹ فَكَيۡفَ كَانَ عَذَابِىۡ وَنُذُرِ۝۳۰ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا
عَلَيۡهِمۡ صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوۡا كَهَشِيۡمِ الۡمُحۡتَظِرِ۝۳۱ (القمر۔۲۹ تا ۳۱)
فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُهۡلِكُوۡا بِالطَّاغِيَةِ۝۵ (الحاقہ۔۵)
كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِطَغۡوٰٮهَاۤ۝۱۱ اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰٮهَا۝۱۲ فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ نَاقَةَ
اللّٰهِ وَسُقۡيٰهَا۝۱۳ فَكَذَّبُوۡهُ فَعَقَرُوۡهَا ۙ فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِذَنۡۢبِهِمۡ
فَسَوّٰٮهَا۝۱۴ وَلَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا۝۱۵ (الشمس۔۱۱ تا ۱۵)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ان لوگوں نے حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی کونچیں اور پیر کاٹ ڈالے۔اس طرح اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی اور کہنے لگے کہ اے صالحؑ! اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے ہم لوگوں کو ڈراتے ہو، اب لے آؤ، تب

انہیں زلزلہ نے لے ڈالا اور وہ لوگ اپنے گھروں میں زانو پر سر رکھے بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور ہلاک ہو گئے۔اس کے بعد صالح ان سے ملے اور کہا کہ اے میری قوم! میں نے تو اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچا دیا تھا اور تمہاری خیر خواہی کی تھی،لیکن تم سمجھانے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

۲)۔انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور ان سے کہا گیا کہ تم تین دن اپنے گھر میں گذار لو۔(تین دن کے بعد تم برباد ہو جاؤ گے)۔یہ اللہ کا ایک قطعی وعدہ ہے جب ہمارے (عذاب کا) فرمان آ پہنچا تو ہم نے صالح اور ان لوگوں کو جو اس پر ایمان لا چکے تھے اپنی رحمت سے نجات دے کر اس دن کی رسوائی سے بچا لیا۔بے شک تیرا پروردگار قوی و غالب ہے۔جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت چنگھاڑ نے لے ڈالا۔تو وہ لوگ اپنے گھروں میں اندھے پڑے رہ گئے اور اس طرح ہلاک ہو گئے گویا ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔آگاہ رہو کہ قوم ثمود نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔قوم ثمود دھتکاری ہوئی ہے۔

۳)۔آخر ان کو صبح ہوتے ہوتے ایک بڑی چنگھاڑ نے لے ڈالا۔پھر جو کچھ وہ اپنی حفاظت کی تدبیریں کیا کرتے تھے کچھ بھی کام نہ آئیں۔

۴)۔صالح کی اونٹنی کی انہوں نے کونچیں کاٹ ڈالیں لیکن رات گذرنے کے بعد صبح وہ پشیمان ہو گئے۔انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب نے گھیر لیا۔اس کام میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے علامت اور نشانی ہے۔ان میں اکثر مومن تھے۔

۵)۔ان لوگوں نے کہا کہ باہم قسم کھاؤ کہ ہم لوگ صالح اور اس کے خاندان پر شب خون ماریں گے۔اس کے بعد اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم لوگ ان کے گھر والوں کے ہلاک ہوتے وقت (اور بطریق اولیٰ صالح کے قتل کے وقت) موجود ہی نہ تھے،اور ہم لوگ تو یقیناً سچے ہیں۔پس ان لوگوں نے ایک مدت تک تدبیریں کیں اور ہم نے بھی ایک تدبیر کر لی (ان کے منصوبے پر پانی پھیر دیا) جس کی ان کو خبر تک نہ ہوئی،دیکھو کہ ان کی تدبیر کا کیا انجام ہوا۔ہم نے ان کو اور ان کی ساری قوم کو ہلاک کر ڈالا،یہ ان کے تباہ شدہ گھر ہیں جو ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ویران پڑے ہیں،اس میں شک نہیں کہ اس میں واقف کار لوگوں (سوچنے والوں) کے لیے عبرت ہے۔اور ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے تھے اور پرہیز گار تھے،بچا لیا۔

۶)۔البتہ ثمود ہم نے ان کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی۔انہوں نے اندھے پن کو بینائی پر ترجیح دی۔رسوا کرنے والی چنگھاڑ نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو آلیا۔ہم نے مؤمن اور پرہیزگاروں کو نجات دی۔

۷)۔جب ثمود سے کہا گیا کہ ایک محدود وقت تک عیش کرلو(یہ عبرت اور ایک نشانی ہے) انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی، جب کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ چنگھاڑ نے انہیں آلیا، وہ اٹھ بھی نہیں سکتے تھے، اور ان کی مدد بھی نہ کی گئی۔

۸)۔قوم ثمود نے اپنے دوست کو پکارا، اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں دیکھو کہ میرا عذاب اور تہدید کیسی رہی، تم نے ان پر چنگھاڑ مسلط کردی، اور وہ خشک بھس کی طرح ہو گئے۔

۹)۔البتہ ثمود نافرمانی کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئے۔

۱۰)۔قوم ثمود نے نافرمانی سے ہمارے پیغمبر کو جھٹلایا۔جب ان میں ایک بدبخت ترین شخص اٹھ کھڑا ہوا(تاکہ ناقۂ صالح کو پے کرے) اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔اس کے پانی پینے (سے تعرض نہ کرنا) مگر ان لوگوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔پس ان کے گناہوں کے سبب اللہ کے عذاب نے ان کو آن پکڑا اور وہ نیست و نابود ہو گئے۔

قوم ثمود کی ہٹ دھرمی

قوم ثمود کی ہٹ دھرمی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور قرآن کے مطابق ''وعتوا عن امر ربھم'' حد سے بڑھ گئی۔اونٹنی کو جس کا معجزہ کے طور پر صالح سے مطالبہ کیا گیا تھا انہوں نے پے کردیا۔حالانکہ حضرت صالح نے ان سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ برا سلوک نہ کرنا کیونکہ اس کا انجام نزول عذاب ہوگا۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے معجزہ کے ساتھ برا سلوک کیا بلکہ اس کے اور اس کے خاندان کے قتل کا منصوبہ بنایا کہ رات کو کمین لگا کر بیٹھیں اور اسے قتل کردیں پھر اس قتل پر اس کے رشتہ داروں نے کچھ کہا تو قسم کھائیں گے کہ یہ لوگ اس کے قتل کے شاہد نہیں ہیں۔

قوم ثمود نے اونٹنی کے متعلق اپنی ناپاک نیت پر عمل کیا، قرآن نے یہ بات متعدد آیات میں مختلف مناسبتوں سے بیان کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهِمۡ

انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اللہ کے فرمان سے تجاوز کیا۔ (اعراف۔77)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ

قوم ثمود اپنی سرکشی کی وجہ سے تباہ ہوئی۔ (حاقہ۔5)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ⑪ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ⑫ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ⑬ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ⑭

قوم ثمود نے نافرمانی کر کے اپنے پیغمبر کو جھٹلایا۔ ان سب سے زیادہ شقی و بد بخت کھڑا ہوا (تاکہ صالحؑ کی اونٹنی کو پے کر ڈالے) صالحؑ نے ان سے کہا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اسے چھوڑ دو، اس کے اور اس کے پانی کے درمیان رکاوٹ نہ بنو، انہوں نے اس بات کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر اسے مار ڈالا۔ (شمس۔11 تا 14)

وہ حضرت صالحؑ اور ان کے خاندان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ عذاب خدا ان پر نازل ہو گیا اور انہیں مہلت نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سازش کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ

انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم کہ رات کو اس کے اور اس کے خاندان پر شب خون ماریں گے۔ اس کے بعد اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم لوگ تو اس کے خاندان کے قتل (اور صالحؑ کے قتل سے بطریق اولیٰ) بے خبر ہیں اور ہم اس بات میں سچے ہیں۔ (نمل۔49)

یہ حالات تھے جن میں اللہ کے رسول نے انہیں نزول عذاب سے خبردار کیا۔ خود صالحؑ نے بھی اپنی قوم کو ہلاکت کی خبر دی اور کہا:

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ

صالحؑ نے ان سے کہا کہ اپنے گھروں میں تین دن رہ لو، (تین دن کے بعد) تمہاری ہلاکت یقینی ہے اور یہ اللہ کا

قطعی وعدہ ہے۔(ہود۔65)

ان کی سنگدلی و بدبختی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے حضرت صالحؑ کی تہدید پر گستاخی کی اور عذاب کے نازل ہونے کا مطالبہ کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝

اے صالحؑ! اگر تم رسولوں میں سے ہو تو جس (عذاب) کی تم نے دھمکی دی ہے وہ لے آؤ۔(اعراف۔77)

لیکن ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹنی کو مار ڈالنے کے بعد وہ نادم و پشیمان ہو گئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ (شعرا۔157)

طبعی طور پر وہ مختلف حالتوں میں تھے، ایک خطرناک حالت تھی اور دوسری پریشانی و ندامت کی حالت ان کی گستاخی اونٹنی کو قتل کرنے کے بعد ہے اور ان کی پشیمانی و ندامت عذاب کے آثار دیکھنے کے بعد ظاہر ہوئی۔ روایت بھی تدریجی طور پر عذاب کی علامتیں ظاہر ہونے کے متعلق بتا رہی ہے۔[1]

ان کی بربادی کی کیفیت کے سلسلہ میں مختلف عوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے:

۱)۔رجفه: (شدید زلزلہ)

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ

شدید زلزلہ نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں ہی ہلاک ہو گئے۔(اعراف۔78)

۲)۔صيحه: (خوفناک چنگھاڑ)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ

صبح سویرے خوفناک چنگھاڑ نے انہیں آلیا۔(حجر۔83)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً

ہم نے ان پر ایک مہیب چنگھاڑ مسلط کر دی۔(قمر۔31)

۳)۔صاعقه: (بجلی کا کڑکا)

---

[1] راوندی، قصص الانبیاء ص ۱۹۸، طبری مجمع البیان ج ۱ ص ۴۴۳

فَاَخَذَتۡهُمۡ صٰعِقَةُ الۡعَذَابِ الۡهُوۡنِ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ

ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کو بجلی نے آلیا جو ذلیل کرنے والا عذاب تھی۔ (فصلت۔17)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ۝۴۴ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مِنۡ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوۡا مُنۡتَصِرِيۡنَ۝۴۵

انہیں ایک چنگھاڑ نے لے ڈالا جب کہ وہ دیکھ رہے تھے اور بیدار تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہ پائے اور نہ ہی کسی جگہ سے ان کو مدد پہنچی۔ (ذاریات۔44،45)

ان آیات کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے کیونکہ اگر عذاب آسمانی بجلی کے ذریعے تھا تو اس سے چنگھاڑ بھی پیدا ہوتی ہے اور شدید لرزہ بھی طاری ہوتا ہے۔ حقیقت میں ان میں سے ہر تعبیر عذاب الٰہی کے ایک پہلو کو بیان کر رہی ہے جس نے ان کو ہلاک کیا۔

اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا جس نے ان سے زندگی و حرکت کو چھین لیا اور وہ خشک گھاس کی طرح ہو گئے جو جانوروں کا چارا بن جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَكَانُوۡا كَهَشِيۡمِ الۡمُحۡتَظِرِ (قمر۔31)

عربی زبان میں ''ھشیم'' خشک گھاس کو کہتے ہیں اور ''محتظر'' اس گھر کو کہتے ہیں جہاں جانوروں کو رکھا جاتا ہے۔ یعنی نزول عذاب کے بعد ان کے جسم اس طرح خشک ہو گئے جس طرح خشک گھاس گودام میں پڑی ہوتی ہے اس کے باوجود قرآن نے مومنین کی نجات کے ذکر کو نظر انداز نہیں فرمایا اور اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَمِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ۝۶۶

جب عذاب سے متعلق ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے صالح اور اس پر ایمان لانے والوں کو اس ذلیل کرنے والے عذاب سے اپنی رحمت کے ذریعہ اس دن نجات دی۔ بے شک تمہارا پروردگار عزیز و توانا ہے۔ (ہود۔66)

وَاَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ (نمل۔53)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَنَجَّيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ

ہم نے مومنین کو جو متقی تھے، نجات دی۔ (فصلت۔18)

حضرت صالحؑ نے ان لوگوں کے خشک شدہ جسموں کو جنہوں نے ایک عرصہ تک ان کی اور ان کے ماننے والوں کی زندگی کو اجیرن بنائے رکھا تھا، نفرت سے دیکھا اور انہیں اس طرح مخاطب فرمایا:

لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ

میں نے تو اپنے پروردگار کی رسالت تم تک پہنچا دی اور تمہیں نصیحت کی لیکن تم نصیحت کو پسند نہیں کرتے۔ (اعراف۔79)

(٦)۔ نکات اور عبرت آمیز باتیں

ثمودیوں کی زندگی قوم عاد کی طرح کئی نکات اور عبرت آمیز باتیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، جن میں بعض باتیں مشترک ہیں ۔اجمالی طور پر ہم ان میں بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱)۔ مادی ذرائع (مال و دولت)، اگرچہ زندگی کا ذریعہ ہیں اس کے باوجود اگر ان کو صحیح طریقہ سے استعمال نہ کیا جائے تو تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ باغات، زراعت، محلات اور پہاڑوں کے دامن میں گھروں جیسے مادی ذرائع رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بجائے بتوں کی عبادت کرتے تھے، اور اصلاح کی جگہ فساد پھیلاتے تھے۔ ان کے نبی انہیں ہمیشہ خبردار کرتے اور کہتے رہے کہ:

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (اعراف۔74)

۲)۔ مستکبرین ہمیشہ شورش کرتے رہے زیر سرپرستی لوگوں کو راہ حق سے روکتے رہتے اور انہیں مصلحین کے خلاف ابھارتے رہتے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (اعراف۔75)

۳)۔ مستکبرین کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے جذبات کو ابھار کر مصلحین کو ان کے مقصد سے روکتے رہتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ہود۔62)

۴)۔ انبیائے الٰہی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایسے واقعات کی خبر دیتے رہتے ہیں جن کو مستقبل میں ظہور پذیر ہونا ہوتا ہے۔ اس طرح کا اکتسابی علم غیب اللہ تعالیٰ کے علم غیب کے منحصر ہونے سے متصادم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ (ہود۔65)

۵)۔موت زندگی کا اختتام نہیں۔قوم ثمود کی ہلاکت کے بعد ان کے پیغمبر حضرت صالحؑ ان کی ارواح سے باتیں کرتے تھے،قرآن نے ان کی بات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (اعراف۔79)

جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ عالم برزخ سے ہمارا واسطہ منقطع ہے، یا وہ مردوں کے لیے کسی قسم کی زندگی کے قائل نہیں، یہ آیت ان کے افکار کو جھٹلا رہی ہے۔

٦)۔نعمتیں اور مصائب، کامیابیاں و ناکامیاں اگرچہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں لیکن ان میں عمل بھی بلاواسطہ طور پر مؤثر ہوتا ہے، قوم ثمود کی سرگذشت سے متعلق قرآن ارشاد فرماتا ہے:

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿١٥﴾

اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے برباد کر دیا، ان سب کو عذاب نے گھیر لیا اور اللہ کو ان کے بدلہ کا کوئی خوف تو ہے نہیں۔(شمس۔14،15)

۷)۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور توانائی لامحدود ہے۔وہ آگ کے مرکز میں بھی کچھ لوگوں کو زندہ رکھ کر نقصان سے بچا سکتا ہے۔اس تباہ کرنے والی بجلی میں بھی اس نے مومنین کو محفوظ رکھا۔قرآن نے یہ بات بتلانے کے لیے مومنین کی نجات کا ذکر کرنے کے بعد اس طرح فرمایا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (ہود۔66)

چھٹے پیغمبر

نمائندہ توحید حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ [1] خلیلؑ چوتھے پیغمبر ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ایک لحاظ سے آپ انبیاء کے اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہیں جنہیں شریعت وکتاب عطا کی گئی۔ کئی انبیاء ان کی شریعت کی ترویج کے لیے مبعوث کئے گئے ہیں۔ نیز آپ ان پیغمبروں سے ہیں جو مقام نبوت ورسالت کے ساتھ ساتھ مقام امامت پر بھی فائز ہوئے۔

قرآن پاک کی پچیس (۲۵) سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کا نام انہتر (۶۹) بار درج ذیل تفصیل کے ساتھ آیا ہے:

سورۂ بقرہ میں ۱۲ مرتبہ، ان آیت میں: ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰، ۲۵۸، ۲۶۰

سورۂ آل عمران میں ۷ مرتبہ، آیات: ۳۳، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۸۴، ۹۵، ۹۷

سورۂ نساء میں ۳ مرتبہ، آیات: ۵۴، ۱۲۵، ۱۶۳

سورۂ انعام میں ۴ مرتبہ، آیات: ۷۴، ۷۵، ۸۳، ۱۶۱

سورۂ توبہ میں ۲ مرتبہ، آیات: ۷۰، ۱۱۴

سورۂ ہود میں ۴ مرتبہ، آیات: ۶۹، ۷۴، ۷۵، ۷۶

سورۂ یوسف میں ۲ مرتبہ، آیات: ۶، ۳۸

سورۂ ابراہیم میں ۱ مرتبہ، آیت: ۲۶

سورۂ حجر میں ۱ مرتبہ، آیت: ۵۱

سورۂ نحل میں ۲ مرتبہ، آیات: ۱۲۰، ۱۲۳

سورۂ مریم میں ۳ مرتبہ، آیات: ۴۱، ۴۲، ۵۸

سورۂ انبیاء میں ۴ مرتبہ، آیات: ۵۱، ۶۰، ۶۲، ۶۹

سورۂ حج میں ۳ مرتبہ، آیات: ۲۶، ۴۲، ۷۸

سورۂ شعراء میں ۱ مرتبہ، آیات: ۶۹

سورۂ عنکبوت میں ۲ مرتبہ، آیات: ۱۶، ۳۱

---

[1] کیونکہ قرآن میں حضرت آدمؑ اور حضرت ادریسؑ کی نبوت کے بارے میں کچھ نہیں ملتا۔

سورۂ احزاب میں ا مرتبہ، آیات: ۷

سورۂ صافات میں ۳ مرتبہ، آیات: ۸۳، ۱۰۴، ۱۰۹

مندرجہ ذیل سوروں میں بھی علیٰ الترتیب ایک ایک بار ان کا ذکر آیا ہے: ص، شوریٰ، ذاریات، نجم، حدید، ممتحنہ، اعلیٰ۔ یہ تذکرہ ان آیات میں ہے: ۴۵، ۱۳، ۲۴، ۲۶، ۳۷، ۲۶، ۴، ۱۹

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی داستان حیات کا ذکر کرنے سے پہلے آیئے قرآنی زاویہ نظر سے ان کی شخصیت کا جائزہ لیتے چلیں۔ قرآن مجید نے بہت کم انبیاء کی تعریف حضرت ابراہیمؑ کی طرح کی ہے اور ان کی بلند صفات اور عالی کمالات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہی جاننا کافی ہے کہ قرآن کریم نے ان کا تذکرہ ان صفات کے ساتھ کیا ہے:

حَنِیۡفًا، مُوۡقِنًا، صِدِّیۡقًا، نَبِیًّا، عَبۡدًا، مُؤۡمِنًا، مُحۡسِنًا، ذُوۡقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ، اِمَامًا اور صَالِحًا

یہ صفات ان آیات میں بیان کی گئی ہیں جن کا ہم اب تذکرہ کریں گے۔ آیات میں مجموعی طور پر ان کی شخصیت کا خاکہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

۱)۔ ابتدائے زندگی سے ہی آپ ایک عاقل، آگاہ، خداجو اور خداپرست انسان تھے، ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اِبۡرٰهِیۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِیۡنَ ﴿۵۱﴾

ہم نے موسیٰؑ سے پہلے ہی ابراہیمؑ کو ہدایت کا سامان (سالم اور راہنما فطرت) عطا فرمادیا ہوا تھا اور (اس کی صلاحیت واستعداد) سے آگاہ تھے۔ (انبیاء۔51)

۲)۔ اس دنیا میں آپ ایک برگزیدہ انسان تھے اور دوسری دنیا کے صالحین سے ہیں:

وَلَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰهُ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾

اور اس دنیا میں ہم نے انہیں منتخب کیا اور دوسرے جہان میں بھی وہ صالحین سے تھے۔ (بقرہ۔130)

۳)۔ وہ پہلے دن سے ہی توحید کے سیدھے راستے پر گامزن تھے اور انہوں نے کبھی بھی شرک کا راستہ اختیار نہیں کیا، چنانچہ مشرکین سے مناظرہ اور ان کے عقیدہ کو باطل بتاتے وقت انہوں نے کہا:

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۷۹﴾

میں نے تو اپنا رخ اس ہستی کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے میں اپنے ایمان میں مخلص ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ (انعام۔79)

۴)۔کمال کے حوالہ سے وہ اس بلند مرتبہ پر پہنچ گئے کہ انہوں نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مظاہرہ اپنے دیدۂ دل سے کیا۔ ان کا ایمان محکم تھا۔ ملکوت سے مراد اس کائنات کا اپنے خالق سے وابستہ ہونا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝۷۵

اور اس طرح ہم نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت ابراہیمؑ کو دکھائے تا کہ وہ اہل یقین میں سے ہوجائیں۔ (انعام۔75)

۵)۔آپ گفتار و کردار کے اعتبار سے ایک صدیق نبی تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۝۴۱

(اس) کتاب میں ابراہیمؑ کو یاد کرو۔ وہ اللہ کا بہت ہی سچا نبی تھا۔ (مریم۔41)

۶)۔آپ اللہ کے مومن اور نیک بندوں میں سے تھے:

سَلٰمٌ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ۝۱۰۹ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۝۱۱۰ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ۝۱۱۱

ابراہیمؑ پر سلام ہو ہم نیکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے ہے۔ (صافات۔109 تا 111)

۷)۔آپ قلب سلیم (شرک سے مبرا) رکھتے تھے:

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۝۸۴

جب وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں آیا۔ (صافات۔84)

۸)۔عبادت کے سلسلہ میں قوی اور لوگوں کی بھلائی کے خواہاں تھے۔

۹)۔ایسے بابصیرت انسان تھے جن کے فکر میں کوئی کمی نہ تھی۔

۱۰)۔ایک خاص خلوص کے حامل تھے اور ہمیشہ آخرت کی یاددہانی کراتے تھے۔

۱۱)۔آپ منتخب افراد میں سے تھے۔

۱۲)۔آپ نیک لوگوں میں سے تھے۔

ان پانچ آخری صفات کا تذکرہ مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾

اور ہمارے بندوں میں ابراہیمؑ، اسحاق، یعقوب کو یاد کرو جو (طاقتور) ہاتھوں والے اور (بینا) آنکھوں والے تھے، ہم نے انہیں خاص خلوص کے ساتھ خالص کیا تھا، اور یہ آخرت کی یاد آوری تھی، اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے تھے۔(ص۔45 تا47)

۱۳)۔مقام نبوت اور رسالت حاصل کرنے کے بعد وہ امامت جیسے مرتبہ پر فائز ہوئے۔اس امامت سے کیا مراد ہے؟اور یہ مقام نبوت و رسالت سے کیسے بلند تر ہے اس کے لیے الگ گفتگو کی ضرورت ہے[1]:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ط قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط

اور وہ وقت یاد کرو جب خدا نے ابراہیمؑ کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان سے عمدگی سے عہدہ برآ ہوئے تو خدا نے ان سے کہا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام و رہبر قرار دیا۔(بقرہ۔124)

۱۴)۔ایک ایسے اولوالعزم پیغمبر ہیں جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل سورتوں میں کیا ہے:

احزاب آیت۔۷،شوریٰ آیت۔۱۳،اعلیٰ آیت ۱۸،۱۹۔ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ص وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۷﴾

جب ہم نے انبیاء سے آپ سے نوح سے، ابراہیمؑ سے موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے عہد لیا اور ان سے محکم عہد لیا۔(احزاب۔7)

۱۵)۔انہیں صحیفہ اور آسمانی کتاب عطا کی گئی۔

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾

---

[1] اس سلسلہ میں نے منشور جاوید ج ۵ ص ۲۲۸،ص ۲۶۲ میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔اس جلد میں بھی اس کا تذکرہ آئے گا۔

کتاب ابراہیمؑ وموسیٰ۔ (اعلیٰ۔19)

۱۶)۔بت پرستوں سے مناظرہ کرتے وقت ان کے پاس ایسی محکم دلیل تھی جس کی بدولت ان کا درجہ بلند ہوا۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۸۳

بت پرستوں کے ساتھ ابراہیمؑ کے مناظرہ کے بارے میں آپ نے جو سنا، (جس کی تفسیر بعد میں آئے گی) وہ ہماری دلیل وبرہان تھی جو ہم نے ابراہیمؑ کو عطا فرمائی تھی، ہم جس کے مرتبے کو چاہتے ہیں بلند کرتے ہیں، تمہارا پروردگار حکمت والا، باخبر ہے (کسی وجہ کے بغیر کسی کا مقام بلند نہیں کرتا)۔(انعام۔83)

۱۷)۔ انہیں نمایاں صفات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اور ان کی اولاد میں سے بعض کے بارے میں فرمایا:

وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۸۷

ان کے باپ، داداؤں اور ان کی اولاد (جن کا ذکر پہلے ہو گیا ہے) انبیاء کے بھائی بندوں میں سے افراد کو برتری دی، ان کو منتخب کیا اور انہیں سیدھی راہ کی ہدایت فرمائی۔(انعام۔87)

اس آیت کا مطلب اس وقت واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے جب ہم یہ جان لیں کہ اس سورۃ میں آیت ۸۳ سے ۸۷ تک گفتگو کا محور حضرت ابراہیمؑ ہیں۔لہٰذا یہ انتخاب اور ہدایت بطریق اولیٰ حضرت ابراہیمؑ کے شامل حال بھی ہوں گے۔

۱۸)۔رسول اکرمؐ کے زمانہ میں یہود ونصاریٰ سے سب حضرت ابراہیمؑ کو اپنے میں سے قرار دیتے تھے۔اس خام خیال کو باطل کرنے کے لیے قرآن مجید فرماتا ہے: ''ابراہیمؑ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی بلکہ وہ موحد اور مسلمان تھے''۔نیز فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ کے نزدیک ترین وہ لوگ ہیں جو اس دور میں ان کی پیروی کرتے تھے اسی طرح اس کے سب سے زیادہ نزدیک پیغمبر اسلام اور وہ مومن ہیں جو اس کے راستہ پر گامزن ہیں''۔اس صورت میں یہودی ونصاریٰ کو انہیں اپنے میں نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ ان کے ساتھ کسی قسم کا فکری وروحانی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ابراہیمؑ موحد تھے جب کہ یہ لوگ شرک کے راستہ پر گامزن ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۶۷ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَھٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۸

ابراہیمؑ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ مخلص موحد اور مسلمان شخص تھے اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہیں۔ ابراہیمؑ سے اولیت اور زیادہ نسبت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں اور (اسی طرح) یہ پیغمبر اور وہ لوگ جو (اس پر) ایمان لائے ہیں وہ اللہ مومنین کا ولی و سرپرست ہے۔ (آل عمران۔ 67، 68)

یہ بات جن کا ہم نے مختصر طور پر جائزہ لیا ہے۔ خدا کے عظیم نبی کا بلند مرتبہ بیان کر رہی ہیں جو حضرت نوحؑ کے بعد راہ توحید کے سالکین کے راہنما تھے اور ان سے ہدایت حاصل کرتے تھے، اور الہامی احکام ان سے حاصل کرتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ بابل میں

تاریخی حوالے سے حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف: بابل میں ان کی زندگی۔

ب:۔ فلسطین کی طرف ہجرت اور ہجرت کے بعد رونما ہونے والے واقعات

ان میں سے ہر حصہ مختلف زاویوں پر مشتمل ہے جن کی وضاحت تدریجاً کی جائے گی۔ اب ہم پہلے حصہ کے مختلف زاویوں کو زیر گفتگو لاتے ہیں۔

الف: حضرت ابراہیمؑ کی بابل میں زندگی

قرآن کی آیات سے مجموعی طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں چار مناظرے اور ایک انقلابی کام سرانجام دیا۔ اس کام کا عکس العمل بڑا شدید تھا جس کے نتیجے میں انہیں سرزمین فلسطین کی طرف ہجرت کرنا پڑی:

الف: آزر کے ساتھ آپ کا مناظرہ

ب: ستارہ پرستوں کے ساتھ آپ کا مناظرہ

ج: بت پرستوں کے ساتھ مناظرہ

د: بت پرستوں کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ کا محاکمہ

ھ: اس اقدام کے خلاف بت پرستوں کا ردعمل

و: بابل کے حکمران سے حضرت ابراہیمؑ کا مناظرہ

ان مراحل میں ہر ایک سے متعلق آیات آئی ہیں ہم ہر ایک کو زیر بحث لاتے ہیں۔

الف: آزر کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا مناظرہ

موضوع سے متعلق آیات

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۷۴ (الانعام۔۷۴)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۴۱ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝۴۲ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝۴۳ (مریم۔۴۱ تا ۴۳)

يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝۴۴ (مریم۔۴۴)

يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝۴۵ (مریم۔۴۵)

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝۴۶ (مریم۔۴۶)

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝۴۷ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝۴۸ (مریم۔۴۷،۴۸)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝۱۱۴ (التوبہ۔ ۱۱۴)

...... اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ

شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ (الممتحنہ۔۴)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔جب انہوں نے اپنے باپ (مربی) آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو اپنا پروردگار مانتے ہو؟ میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

۲)۔اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے آزر سے کہا کہ آپ ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سن سکتی ہے ،نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ تمہاری کوئی ضرورت پوری کرسکتی ہے؟ بابا جان! مجھے وہ علم عطا کیا گیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔آپ میری پیروی کریں تا کہ میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں۔

۳)۔اے بابا جان! شیطان کی پرستش نہ کیجئے شیطان اللہ کا نافرمان ہے۔

۴)۔اے بابا! میں اس سے ڈرتا ہوں جب اللہ کی طرف سے تم پر کوئی عذاب نازل ہو اور تم شیطان کے ساتھ بن جاؤ۔

۵)۔آزر نے کہا: (ابراہیم) تم مجھے میرے خداؤں سے روکتے ہو۔اگر تم اپنی تبلیغ سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا،اے ابراہیم کچھ عرصہ کے لیے تم مجھ سے دور ہو جاؤ۔

۶)۔ابراہیمؑ نے کہا کہ آپ پر میرا اسلام ہو،میں اپنے پروردگار سے آپ کی بخشش کی دعا کروں گا،بے شک وہ بڑا مہربان ہے۔اس کے باوجود میں آپ سے اور ان سے جن کی آپ اللہ کے علاوہ عبادت کرتے ہیں دوری اختیار کرتا ہوں اور اپنے اللہ کی عبادت کرتا ہوں،امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت اور تبلیغ کے ذریعہ بد بخت نہیں ہوں گا۔

۷)۔ابراہیمؑ کا اپنے (مربی) باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنا صرف اس وعدہ کی بنا پر تھا جو انہوں نے اپنے (مربی) باپ سے کرلیا تھا۔لیکن جب یہ واضح ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے (اور تعصب و ہٹ دھرمی رکھتا ہے) تو وہ اس سے دور ہوگئے،یقیناً ابراہیمؑ ہر شخص کے لیے مہربان و بردبار تھے۔

۸)۔ابراہیمؑ کے اپنے باپ سے یہ بات ہوئی کہ میں تیرے لیے مغفرت طلب کروں گا،لیکن تیرا انجام میرے

اختیار میں نہیں ہے، (خدا ان کو بخشتا ہے جو اس کی طرف توجہ کرتے ہیں نہ کہ جو اس سے مکمل طور سے غافل ہو جائیں)۔

مبلغ توحید نے سرزمین بابل میں آنکھیں کھولیں جہاں ہر طرف بتوں اور بت پرستی کا دور دورہ تھا، یہاں تک کہ ان کا سب سے نزدیک ترین شخص (آزر) بھی بت پرست تھا۔ طبیعی اقدار کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اصلاح کا آغاز اپنے گھر سے کرتے اور اس شخص کی ہدایت کرتے جو ان سے سب سے زیادہ قریب تھا۔ اس کے بعد عوام کے پاس جاتے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں بتوں کے بہرے و اندھے ہونے کا ذکر کر کے ان کی عبادت کو شیطان کی عبادت قرار دیا اور کہا:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے آزر سے کہا کہ وہ ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے، نہ دیکھتی ہے اور نہ تیری کوئی ضرورت ہی پوری کر سکتی ہے؟ اے بابا! مجھے وہ علم عطا کیا گیا ہے جو تیرے پاس نہیں ہے میری پیروی کرتا کہ میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں۔ (مریم۔42،43)

ابراہیمؑ بت پرستی کو ایک طرح شیطان کی پرستش قرار دیتے تھے کیونکہ شیطان ہی انسان کو گمراہ کرتا ہے اس کے بعد انہوں نے اسے خدا کے عذاب سے ڈرایا اور فرمایا:

يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

اے بابا! شیطان کی پرستش نہ کر۔ شیطان اللہ کا نافرمان ہے۔ اے بابا! میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اللہ کی طرف سے تجھ پر کوئی عذاب نازل ہو اور تو شیطان کا ساتھی بن جائے۔ (مریم۔44،45)

حضرت ابراہیمؑ کی محکم و مضبوط منطق نے آزر پر کوئی اثر نہ کیا۔ لہٰذا وہ بت پرستی سے باز نہ آیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بات پر غور و فکر کرنے کی بجائے اس نے انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔ مفکرین اور مصلحین کے خلاف جاہل کی روش ہمیشہ یہی رہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾

آزر نے کہا: (ابراہیم) تو مجھے میرے خداؤں سے روکتا ہے۔ اگر تو اپنی تبلیغ سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا، اے ابراہیم! کچھ عرصے کے لیے تو مجھ سے دور ہوجا۔ (مریم۔46)

آزر کی غصہ بھری گفتگو کے مقابلہ میں حضرت ابراہیمؑ کے اخلاق پر نظر ڈالو۔ انہوں نے آزر کو یہ جواب دیا:

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝

ابراہیمؑ نے کہا کہ تجھ پر میرا سلام ہو، میں اپنے پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے اس کے باوجود میں تجھ سے اور ان سے جن کی تو اللہ کے سوا عبادت کرتا ہے دوری اختیار کرتا ہوں اور اپنے اللہ کی عبادت کرتا ہوں، امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت اور تبلیغ کے سلسلہ میں بدبخت نہیں ہوں گا۔ (مریم۔47،48)

آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوشخبری

ان جملوں میں بت پرست آزر کے مقابلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اخلاق بالکل واضح ہے۔ اس کی ہدایت سے مایوس نہ ہونے کے باوجود اسے یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ وہ اللہ تعالی کے حضور اس کی بخشش کے لیے دعا کریں گے۔ اپنے (مربی) باپ کے سامنے ادب کا اظہار کرنے کے لیے یہ تک نہیں کہتے کہ میں سعادت مند ہوں اور تو بدبخت ہے، بلکہ کہتے ہیں کہ شاید میں اللہ کی پرستش کی بناء پر بدبخت و نامراد نہ بنوں گا۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس توقع پر آزر سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے ایمان لانے سے ابھی تک مایوس نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جب مایوس ہو گئے تو پھر انہوں نے اس سے دوری اختیار کر لی اور اس کے لیے مغفرت کی دعا نہ کی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے (مربی) باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا صرف اس وعدہ کی بناء پر تھا جو انہوں نے آزر سے کر لیا تھا۔ لیکن جب یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے (اور تعصب اور ہٹ دھرم بھی ہے) تو وہ اس سے دور ہو گئے۔ یقیناً ابراہیم مہربان و بردبار تھے۔ (توبہ۔114)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے (مربی) باپ سے کہا:

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ

میں تیری مغفرت طلب کروں گا لیکن تیرا انجام میرے اختیار میں نہیں ہے (اللہ ان کو بخشتا ہے جو اس کی طرف توجہ کرتے ہیں نہ کہ جو اس سے مکمل طور پر غافل ہوجاتے ہیں)۔ (ممتحنہ۔4)

یہاں ایک تاریخی نکتہ یہ آتا ہے کہ عصر رسالت کے مسلمانوں کی یہ تمنا تھی کہ وہ اپنے ان مشرک والدین کے لیے طلب مغفرت کریں جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے مغفرت طلب کرنا تھا۔

قرآن اس موازنہ کو قبول نہیں کرتا اور فرماتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا استغفار اس وقت تک قابل قبول تھا جب تک وہ اس کی ہدایت کی امید رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ وہ اس سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ جب اس سے مایوس ہو گئے تو اس کے بعد اس کے لیے مغفرت طلب نہ کی، جب کہ تم مسلمان ایسے لوگ کے لیے مغفرت طلب کرتے ہو جو اس دنیا سے مشرک ہی چلے گئے، یا ان کی ہدایت کے بارے میں کسی قسم کی امید باقی نہیں ہے۔

آذر حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہ تھا

یہاں ایک نکتہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ تھا یا ان کا رشتہ داروں میں سے تھا، جس نے ان کی پرورش اپنے ذمہ لے رکھی تھی؟ اکثر مفسرین نے ان آیات میں لفظ ''اب'' کو باپ کے معنی میں لیا ہے اور اسے حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی والد قرار دیا ہے۔

اس بات سے دو اعتراض سامنے آتے ہیں:

۱۔ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ''تارح'' ذکر کیا گیا نہ کہ ''آذر''۔ قصص قرآن کے مؤلف عبدالوہاب نجار مصر نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار کر لفظ ''آزر'' کے متعلق ایسے احتمالات ذکر کئے ہیں [1]

جو ذوق سلیم سے میل نہیں کھاتے۔

۲۔ شیعہ عقیدے کے مطابق انبیاء کے آباؤاجداد کم از کم ان کے والدین سب کے سب موحد تھے، مشرک نہ تھے۔ اس صورت میں آذر جو بت پرست تھا، وہ حضرت ابراہیم کا باپ کیسے ہوسکتا ہے؟

یہ دو اعتراض ایک اور طریقے سے حل کئے جا سکتے ہیں وہ یہ کہ عربی زبان میں لفظ ''اب'' اور لفظ ''والد'' کے درمیان بہت واضح فرق پایا جاتا ہے۔ پہلا لفظ غیر حقیقی باپ کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے جب کہ لفظ ''والد'' صرف حقیقی باپ کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ یعنی کیا تم توحید کے راستے سے منحرف ہوجاؤ گے یا

---

[1] قصص قرآن، عبدالوہاب نجار، ص ۷۰

نہیں؟ انہوں نے جواب دیا:

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے کہا کہ ہم تمہارے خدا اور تمہارے آباء ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاق کے خدا کی عبادت کریں گے، جو خدائے واحد ہے اور ہم سب اس کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ (بقرہ۔133)

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے حضرت اسمٰعیل کو بھی اپنے آباء میں قرار دیا ہے حالانکہ وہ ان کے چچا تھے۔ لیکن لفظ ''والد'' میں اس قسم کی وسعت نہیں ہے۔ یہ لفظ حقیقی باپ کے متعلق ہی استعمال ہوتا ہے۔ آزر کے متعلق قرآن کی تمام تعبیرات میں لفظ ''اب'' آیا ہے نہ کہ ''والد'' لہٰذا بعید نہیں ان موارد میں ''اب'' سے مراد کا سرپرست ہو، جیسے چچا یا پالنے والا۔

جو چیز اس مطلب کو یقینی بتاتی ہے وہ جوانی اور بابل میں سکونت کے دوران حضرت ابراہیمؑ کا اس کے لیے طلب مغفرت کرنا ہے۔ جب اس کی صورت حال واضح ہوگئی تو فلسطین کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے ہی اسی دن سے انہوں نے اس سے تعلقات ختم کر لئے اور اس کے لیے طلب مغفرت نہ کی، جب کہ ہم ایک اور آیت میں دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے بڑھاپے میں بھی اپنے باپ کے لیے دعا کی ہے اور ان کی مغفرت کے طالب ہوئے ہیں، جیسا کہ فرماتے ہیں:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

پروردگار! مجھے، میرے والدین کو اور مومنین کو قیامت کے دن بخش دے۔ (ابراہیم۔41)

وہ اللہ کے حضور اپنے والد کی بخشش کے لیے اس وقت دعا کرتے ہیں، جب پہلے اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو خانہ کعبہ کے پاس چھوڑ آئے اور ان کے متعلق یہ دعا کی:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ......

خدایا! میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسی سرزمین میں چھوڑا ہے جو بے گیاہ ہے............ (ابراہیم۔37)

اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ نامی دو بیٹے عطا فرمائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ......

اس اللہ کے لیے حمد ہے جس نے بڑھاپے میں مجھے اسمٰعیل و اسحاق عطا فرمائے............ (ابراہیم۔39)

اس بات کے پیش نظر کہ حضرت ابراہیمؑ نے آزر سے بابل میں ہی جوانی کے دوران تعلقات ختم کر دیئے تھے اور اس کے بعد اس

کے لیے مغفرت کی دعا نہ کی، دوسری طرف یہ کہ بڑھاپہ میں انہوں نے اپنے والدین کے لیے مغفرت کی دعا کی، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ آزر جو بت پرست تھا اور حضرت ابراہیمؑ جوانی میں اسے چھوڑ چکے تھے، وہ حضرت ابراہیمؑ کے اس والد کے علاوہ تھا جس کے بارے میں آپ آخر عمر تک دعا کرتے رہے اور اس کے لیے مغفرت طلب کرتے رہے۔

ان دو اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن و تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کے نام کا اختلاف بھی حل ہو جاتا ہے (اگرچہ موجودہ تورات معتبر، قابل اہمیت نہیں ہے) اسی طرح حضرت ابراہیمؑ جیسے پیغمبر کے والد کے بت پرست ہونے کا اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ب: ستارہ پرستوں کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا مناظرہ

اپنے جائے پیدائش کے لوگوں کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے مناظرہ سے متعلق آیات یہ بتاتی ہیں کہ بابل کے تمام لوگ، یا ان کی اکثریت، خدا کے علاوہ کسی اور چیز کی عبادت کرتے تھے، ان کا روشن فکر طبقہ ستاروں اور چاند و سورج کی پرستش کرتا تھا جب کہ دوسرا طبقہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کرتا تھا۔ انسان میں بت پرستی کے رواج پانے کے محرکات ہم فی الحال زیر بحث نہیں لاتے، لیکن اجمالی طور پر یہ بتاتے چلیں کہ تمام انسانوں پر خدا جوئی کی فطرت حاکم رہی ہے اور اب بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ جن فطرتوں کی راہنمائی کی گئی وہ حقیقی پروردگار تک پہنچ گئی ہیں اور اس راستے سے منحرف نہیں ہوتیں، لیکن وہ فطرتیں جنہیں راہنمائی نصیب نہیں ہوئی وہ حقیقت کی جگہ مجاز اور خدا کی جگہ بندہ کی عبادت کرنے لگتی ہیں۔ دنیا کے تمام بت پرست فطرت کی بنیاد پر معبود کی تلاش میں ہیں، لیکن چونکہ انہیں ایک سمجھدار اور آگاہ کرنے والا راہنما نہیں ملا اس لیے وہ فطرت کے راستہ پر چلنے سے قاصر رہے ہیں اور خالق کی بجائے مخلوق کی عبادت شروع کر دیتے ہیں۔ وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ مخلوق کی پرستش انسان کو خالق کی پرستش سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہاں اہم نکتہ یہ نظر آتا ہے کہ بت پرستوں سے غلطی کہاں سرزد ہوئی اور ان کی فطرت کا تعلق کہاں کمزور ہوا؟

بت پرستی کی تاریخ گواہ ہے کہ اس نظام حکومت میں ذات واجب الوجود کی توحید کا موضوع کبھی بھی مورد انکار نہیں رہا، بلکہ سب کی نظر میں اس کائنات کا خالق وہی خدائے واحد ہے [1]

اس لیے حقیقت تو یہ تھی کہ اس کائنات کے خالق کی عبادت ہی کی جاتی، لیکن جو چیز انہیں اس کائنات کے خالق کی عبادت سے روکتی تھی وہ یہ ہے کہ وہ توحید کے دوسرے مراتب میں شرک کا ارتکاب کرتے تھے، یعنی یہ سوچتے تھے کہ اللہ نے کائنات بنائی ہے لیکن ربوبیت اور تدبیر جہاں کا کام یا اس کا کچھ حصہ ستاروں، چاند اور سورج جیسی مخلوق کے سپرد کر دیا ہے۔ اس لیے وہ انہیں اس کائنات کا ''رب'' سمجھتے تھے نہ کہ اس کا خالق۔ عربی زبان میں رب مالک اور صاحب کے معنی میں ہے مثلاً باغ کا مالک، کھیت کا مالک اور حیوان و جانداروں کا مالک۔ لیکن وہ ان کا خالق نہیں ہوتا، جبکہ ان کی دیکھ بھال اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ حقیقت میں ''رب'' سے استفادہ کیا ہے نہ کہ لفظ ''اللہ'' یا ''خالق'' سے۔۔ یہاں تک ''الہٰ'' سے بھی۔ اس سے خود یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بابل کے بت پرست توحید ذات کے حوالہ سے واجب الوجود کی وحدت اور خالق کائنات کی توحید کے حوالہ سے مکمل طور پر موحد تھے لیکن ان سے نچلے مراتب یعنی ربوبیت اور تدبیر میں توحید کی نظر سے شرک کا شکار تھے۔ اسی وجہ سے انہیں عبادت میں بھی شرک کر بیٹھے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی منطق اور مناظرہ میں ان کی ربوبیت کو باطل قرار دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ آسمانی اجرام اتنی توانائی و صلاحیت نہیں رکھتے کہ زمین اور اس میں موجود انسانوں کے رب یا راہنمائی کرنے والے ہوں۔

[1] (زخرف۔۹) یعنی ''اگر آپ ان سے سوال کریں گے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ خداوند قادر و علیم ہی نے انہی پیدا کیا ہے۔

موضوع سے متعلق آیات

وَكَذٰلِكَ نُرِىٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿٧٥﴾

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿٧٦﴾

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِىْ رَبِّىْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿٧٧﴾

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٨﴾

اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٧٩﴾

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّىْ فِى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّىْ شَيْــًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّىْ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٠﴾

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨١﴾

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٨٢﴾

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٨٣﴾ (الانعام ۔ ۷۵ تا ۸۳)

آیات کا ترجمہ

۱)۔اس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا نظام دکھا دیا تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائے۔

۲)۔جب اسے رات کی تاریکی نے ڈھانپ لیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اور کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو کہا کہ میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۳)۔جب چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے۔لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو بولے کہ اگر میرا پروردگار میری راہنمائی نہ کرے تو میں گمراہ ہونے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔

۴)۔جب چمکتے ہوئے سورج کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا پروردگا ہے یہ(ستاروں اور چاند سے) بڑا ہے۔لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو کہا اے قوم! جن کو پروردگار کا شریک قرار دیتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔

۵)۔میں خالص ایمان کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

۶)۔اس کی قوم نے اس کے ساتھ مجادلہ کیا، ابراہیمؑ نے کہا کہ کیا تم پروردگار کے متعلق میرے ساتھ مناظرہ کرتے ہو حالانکہ اس نے میری ہدایت فرمائی ہے اور تم جن بتوں کو اس کا شریک مانتے ہو میں ان (کے نقصان پہنچانے) سے ڈرتا نہیں ہوں، مگر یہ کہ میرا پروردگار اللہ ایسا چاہے۔میرے پروردگار کا علم بہت وسیع ہے۔تم نصیحت کیوں نہیں مانتے؟

۷)۔اور جنہیں تم الہ کا شریک بتاتے ہو میں ان سے کیوں ڈروں جب تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کا شریک ایسی چیزوں کو بنایا ہے جن کی اللہ نے تم پر کوئی سند نازل نہیں فرمائی۔ہم دونوں فریقوں میں امن قائم رکھنے کا زیادہ حقدار کون ہے؟

۸)۔جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اپنے ایمان کو انہوں نے ظلم (شرک) کے ساتھ آلودہ نہیں کیا، انہیں کے لئے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

۹)۔ یہ ہمارے دلائل تھے جو ہم نے ابراہیمؑ کو دیئے۔ ہم جس کے مرتبہ کو چاہتے ہیں بلند کردیتے ہیں، تمہارا پروردگار حکمت والا باخبر ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دلائل کی وضاحت چند مطالب کے ذریعہ

۱)۔ دیکھنا چاہیے کہ اس برہان سے حضرت ابراہیمؑ کا کیا مقصد ہے؟ کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ ستارے، چاند اور سورج اس کائنات کے خالق نہیں ہیں، یا ان کی مراد یہ ہے کہ یہ ممکن موجودات مخلوق ہیں اور اس کائنات کے خالق سے وابستہ ہیں، یعنی یہ مخلوقات ارضی کے رب و مدبر نہیں ہوسکتے، جن میں سے ایک خود انسان ہے۔

بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ابراہیمؑ کی گمراہی کی پہلی بات یہ تھی کہ وہ یہ سوچتے تھے کہ یہ آسمانی اجرام ہی واجب الموجود ذات وخالق ہیں، اس لیے انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے دلائل کی تفسیر یہ کی ہے:

انہوں نے تین مراحل میں ان اجرام کے چھپنے اور غروب ہونے کو ان کے امکان وحدوث پر گواہ قرار دیا ہے کیونکہ افول اور غروب موجودات میں ایک طرح کی تبدیلی وتغیر پایا جاتا ہے جو امکان وحدوث کی علامت ہیں۔ اگر یہ اجرام واجب الوجود ہوتے تو ان میں کسی طرح تغیر کی کیفیت واقع نہ ہوتی جو ذات یا حالت میں تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے جب کہ فلاسفہ کے بقول ''واجب الوجود ممکن اور حادث نہیں ہوسکتا''[1]

لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دلائل کی روش اس طرح کے مفروضے کو جگہ نہیں دیتی۔ اس دلیل کے پیش نظر کہ انہوں نے 'رب' کا عنوان ذکر کیا ہے اور ان موجودات کے مدبر ہونے کی بات کی ہے، نہ کہ ان کے خائف وواجب الوجود ہونے کی، وہ ان کے افول و غروب کو جس بات پر شاہد بنانا چاہتے ہیں وہ کائنات وانسان پر حاوی نہیں ہیں۔ ان کے خالق یا واجب الوجود ہونے کی طرف حضرت ابراہیمؑ کی نظر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کے برہان کی تفسیر کسی اور طریقے سے کرنا ہوگی۔

اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ 'الہٰ'، 'رب'، 'تدبیر'، اور 'عبادت' جیسے قرآنی مفاہیم صحیح طریقے سے بیان نہیں کئے گئے اور اکثر مفسرین ان مفاہیم پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے گذر گئے ہیں، یہاں تک کہ بہت سی تفسیروں اور علم کلام کی کتابوں میں توحید کے مراتب واضح طور پر بیان نہیں کئے گئے۔ اسی وجہ سے تدبیر اور خالقیت میں توحید کے بارے میں شبہات اسی طرح پیدا ہوگئے جس طرح حاکمیت میں تصور توحید کے ساتھ وضع قوانین میں تصور توحید مخلوط ہوگیا۔

۲)۔ حضرت ابراہیمؑ کے دلائل کو ان اجرام کی ربوبیت کے بطلان پر وارد کرنا چاہیے۔ اس برہان کی روح یہ ہے کہ مدبر اور جس چیز کی وہ تدبیر کرتا ہے، کے درمیان ایک تکوینی رابطہ وتعلق ہے۔ انسان پانی زندگی اور نشوونما میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مدبر حقیقی سے بے نیاز نہیں۔

---

[1] مفاتیح الغیب، رازی، مطبوعہ، مصر ۱۳۰۸ھ، ج ۴، ص ۳۸۰

اس مدبر کے فیضان کا سلسلہ تمام لحات زندگی میں اس تک پہنچنا ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوا تو انسانی زندگی اور زمین کا چراغ حیات گل ہو جائے گا۔ اس طرح کی دائمی احتیاج کا دارومدار مدبر کی دائمی موجودگی اور اس کے دائمی تعلق کی برقراری پر ہی ہے۔ یہ اس صورت میں ہی ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ حاضر و ناظر ہو اور غروب و زوال کا شکار نہ ہو۔ اگر اس طرح نہ ہوا تو جس امر کی تدبیر ہو رہی ہے اس کی زندگی کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکے گا اور اس کی زندگی کی شمع خاموش ہو جائے گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ چاند، ستارے یہاں تک کہ سورج بھی، کچھ عرصہ کے لیے نور افشانی کرتے ہیں، اور انسان سے ان کا تعلق محفوظ رہتا ہے۔ لیکن جب وہ غروب ہو جاتے ہیں تو یہ تعلق ممکنہ طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسے انسان کا رب کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے جو ہمیشہ اپنے رب کا محتاج ہے؟

ان تین ستاروں کی ہستی واجب الوجود ہستی نہیں ہو سکتی جس کے متعلق حضور و غیاب کا تصور ہی ممکن نہیں، بلکہ وہ تو ہمیشہ ممکن الوجود اشیاء کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ (حدید۔4)

بلکہ ان اجرام کے مادی و جسمانی ہونے کے ساتھ تدبیر کی یہ شرط لازم ہے کہ اپنے مورد تدبیر کے ساتھ ان کا حضور ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو۔ اگر اس طرح نہ ہو تو ان کے درمیان تعلق ختم ہو جائے گا اور ان کے امکان کی تدبیر بھی باقی نہیں رہے گی۔

اب جب کہ یہ اجرام انسان اور موجودات ارضی کے لیے مکمل و استمراری حضور نہیں رکھتے، یہ ان کے مدبر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ایسے موجود کی تلاش کو جاری رہنا چاہیے جس کا حضور مطلق ہو، وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہو اور جن کی وہ تدبیر کر رہا ہے ان سے اس کی غیبت کا بالکل تصور ہی ممکن نہ ہو۔ لہٰذا پہلے ستارہ، چاند اور پھر سورج کے مدبر ہونے کا مفروضہ پیش کر کے پھر ان کے غروب و افول کے ذریعہ ہر ایک کا ابطال کر کے مورد تدبیر اشیاء کے ساتھ ان کے دائمی حضور کی نفی کرتے ہوئے فطرت کو اس کائنات کے خالق کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا ہے:

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۷۹

میں نے اس خالق کی طرف رخ کیا ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ (انعام۔79)

اس دلیل کی محکم بنیادیں اس وقت واضح ہو جاتی ہیں جب ہم یہ جان لیں کہ اس کائنات میں تدبیر کائنات خلقت و آفرینش سے جدا نہیں ہے، انسان فیضان کے مسلسل حصول کے ذریعہ ہر لحظہ راہنمائی حاصل کر رہا ہے اور اس طرح کی تدبیر مدبر کے دائمی حضور کے بغیر ممکن

نہیں ہے۔

۳)۔ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ کرۂ ارض پر باغبان، کسان اور چرواہے جیسے مدبرین موجود ہیں، باغ، کھیت اور جانوروں کی تدبیر کے لیے جن کا جزئی حضور بھی کافی ہے۔اس بات میں کیا مانع ہے کہ انسان اور زمین کی تدبیر کے سلسلہ میں ان آسمانی اجرام کا حضور بھی اسی طرح ہو؟

اس تصور کا باطل پن بالکل واضح ہے، کیونکہ مذکورہ اشیاء کے لیے مذکورہ مدبروں کی تدبیر جزئی وناقص تدبیر ہے، جو دیگر تکوینی عوامل کی ہمراہی سے تکمیل پاتی ہے۔اگر دوسرے عوامل سے نظریں ہٹالی جائیں تو باغبان اور چرواہے کی سرپرستی درخت اور حیوان کی زندگی کے دوام کے لیے کافی نہیں ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ کی منطق میں جس 'رب' کی بات ہورہی ہے وہ رب مطلق ہے تمام جزئی اسباب جس تک منتہی ہوتے ہیں۔

اس اعتبار سے اس مدبر کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا رابطہ ان چیزوں سے منقطع نہ ہو جن کی وہ تدبیر کر رہا ہے، اگر جزئی مدبروں کا تعلق دائمی نہ بھی ہو تو اس کا تعلق وحضور دائمی ہونا چاہیے۔ایسا اس وقت ہی ممکن ہے جب حقیقی مدبر جسم وجسمانیت سے مبرا ہوتا کہ اس کے بارے میں فنا وغروب کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔

۴)۔مذکورہ آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ گفتگو ان لوگوں کے سامنے کی جو ان آسمانی اجرام کی پرستش کرتے تھے۔یہاں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

الف: حضرت ابراہیمؑ نے اپنی منطق ایک رات میں ستارے کے طلوع سے لے کر خورشید کے طلوع ہونے تک بیان کی ہے جب کہ ہر حصہ میں ان کا سامنا ایسی قوم سے تھا جو ان میں سے کسی ایک کی عبادت کرتی تھی۔

ب: حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دلیل تین مرحلوں میں بیان فرمائی۔لہٰذا ہر مرحلہ ایک رات میں بیان ہوا۔قرآن نے تینوں مرحلوں میں لفظ فا (فلما) استعمال کیا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دلیل سال کی راتوں میں ایسی رات میں بیان فرمائی ہے جس میں ستارے کے غروب ہوتے ہی چاند طلوع ہوگیا اور چاند کے غروب ہوتے ہی سورج طلوع ہوگیا۔

اس صورت میں احتمال یہ ہے کہ اس دلیل میں مذکورہ ستارہ سے مراد، جیسا کہ روایات میں آیا ہے، ستارہ زہرہ ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد مغربی افق پر نمایاں ہوتا ہے اور ایک دو گھنٹے بعد غروب ہوجاتا ہے۔اس کے بعد چاند چمکنا شروع ہوجاتا ہے۔[1]

۵)۔بعض مفسرین کو ''ھذا ربی'' کے جملے میں مشکل آئی ہے کہ یہ جملہ حضرت ابراہیمؑ نے تین بار ستارے، چاند اور سورج کے متعلق دہرایا ہے جب کہ یہ بات ان کے موحد ہونے کے لیے درست نہیں۔اگر ہم کہیں کہ انہیں شک تھا اور وہ حقیقت کی تلاش میں تھے تو یہ ان

---

[1] بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین گروہوں کے ساتھ مناظرہ کیا۔ایک گروہ زہرہ کی، دوسرا چاندکی، اور تیسرا سورج کی پرستش کرتا تھا۔تفسیر برہان۔ج ۱ص ۵۳۱

کے مقام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

لیکن اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔حضرت ابراہیمؑ نہ تو اجرام کی ربوبیت کا عقیدہ رکھتے تھے اور نہ انہیں اس بات میں کوئی شک ہی تھا بلکہ وہ صحیح ہادی تھے، ہادی کو گمراہ کی ہدایت کے لیے مختلف طریقے اپنانے پڑتے ہیں تا کہ ان کے جذبات اس کے خلاف نہ ابھریں۔اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ابتداء ہی میں ان کی مخالفت نہ کی جائے تا کہ اس طرح وہ اسے اپنے میں سے ہی ایک فرد سمجھیں اور اس کی بات پر کان دھریں۔اگر حضرت ابراہیمؑ ابتداء سے ہی مشرکین کے مقابلہ میں آجاتے تو ان کی بات کے مؤثر ہونے کے امکانات کم ہوجاتے۔لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ''ھٰذا ربی'' کے جملہ کو تین مرحلوں میں ایک ہی طرح بیان کیا ہے۔کبھی ایک کے مقابلہ میں دوسرے کے متعلق عقیدہ کے رجحان کو بیان کیا، لہٰذا خورشید کے متعلق کہا: ''ھٰذا ا کبر'' یعنی اگر طے پائے کہ ان تین موجودات میں سے ہی ایک رب و مدبر ہے تو پھر سورج سب سے بڑا ہے، فروزاں ترین ہے اور سب سے زیادہ امر کا سزاوار ہے۔

اس نکتہ کی اہمیت یہ ہے کہ ابتدائی لحات سے ہی وہ اپنے آپ کو صف مقابل میں کھڑا نہ کرلیں تا کہ مشرکین کی ہدایت کے لیے بنیاد فراہم ہوسکے۔

قرآنی طرز استدلال میں ہمیں بالکل یہی طریقہ نظر آتا ہے۔اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرمؐ کو تعلیم فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

ہم اور آپ میں ایک ہی ہدایت پر ہے یا گمراہی میں ہے۔(سباء۔24)

۶)۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دلیل کے آغاز میں ''لا یحب الاٰفلین'' کا جملہ ذکر کیا ہے جب کہ بعد کے مراحل میں لفظ ''حب'' نہیں لائے ''فلما افل'' یا ''فلما افلت'' کہنے پر اکتفا کیا ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس دلیل کی بنیاد ان آسمانی اجرام کا غروب ہونا ہے تو پھر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دلیل کے پہلے حصہ میں اس بات پر کیوں تاکید کی ہے کہ میں اس موجود کو جو غروب و زوال کا شکار ہو پسند نہیں کرتا۔

شاید اس میں نکتہ یہ ہو کہ رب اور مربوب کے درمیان ایک تکوینی تعلق ہوتا ہے، خصوصاً اگر مربوب باشعور و بافہم ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی زندگی و تقدیر اس کے رب کے اختیار میں ہے، اس صورت میں وہ یقینی طور پر اپنے اندر جحت و عشق کا احساس کرے گا۔

جب بھی انسان فطرت سلیم کے ذریعہ کسی دوسرے موجود کے بارے میں محبت کا احساس نہ کرے تو یہ بات اس پر گواہ بن سکتی ہے کہ وہ اس کا رب اور اس کی زندگی کا مدبر نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ اس کا رب ہوتا تو پھر یہ ممکن نہ تھا کہ یہ اس کے فیض وسیع سے احساسِ مہربانی نہ کرتا۔ لہٰذا دلیل کی بنیاد ہی غروب و زوال قرار پاتا ہے، مہربانی نہ کرنے کا احساس بھی اس امر کی تائید کرتا ہے کہ وہ شئ رب و مدبر انسان نہیں ہے۔

۷)۔کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق آنے والی آیات کا لہجہ، آزر سے ان کی گفتگو، اپنے رشتہ داروں اور اجرام سماوی کی پوجا کرنے والوں سے ان کا طرز کلام اس شخص کی طرح کا ہے جس کا سامنا پہلی مرتبہ ان اجرام اور ان کی پرستش سے ہوا ہو، اور جس نے تدریجاً

تحقیق کی ہو؛ مثلاً جب وہ آزر کو بتوں کے سامنے دیکھتے ہیں تو اس سے اس طرح کہتے ہیں:

اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ﴿۷۰﴾ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰکِفِیۡنَ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلۡ یَسۡمَعُوۡنَکُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ﴿۷۲﴾ اَوۡ یَنۡفَعُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَضُرُّوۡنَ﴿۷۳﴾ قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ﴿۷۴﴾

جب اس نے اپنے (مربی) باپ اور رشتہ داروں سے پوچھا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت پر قائم ہیں، (حضرت) ابراہیمؑ نے کہا کہ جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا وہ سنتے ہیں یا تمہیں نفع ونقصان پہنچاتے ہیں؟ (جواب میں ٹال مٹول کر گئے) انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء اجداد کو اسی عمل پر پایا ہے۔ (شعراء۔70 تا74)

اس طرح بات کرنا تو ایسے انسان کا انداز ہوتا ہے جس نے نہ کبھی بت دیکھا ہو اور نہ ہی بت پرست۔ اجرام سماوی کی پوجا کرنے والوں کے ساتھ بھی ان کا طرز گفتگو اسی طرح کا ہے، کیونکہ قرآن اس کا تذکرہ اس طرح فرماتا ہے:

"جب اس نے ایک ستارہ دیکھا تو کہا کہ یہ میرا خدا ہے، لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا، جب اس نے ماہ فروزاں کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا خدا ہے، لیکن جب وہ غروب ہونے لگا تو کہا کہ اگر میرا پروردگار میری ہدایت نہ کرتا تو میں گمراہ ہو جاتا۔ پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے یہ تو اس دوسرے سے بڑا بھی ہے، لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ تم خدا کے ساتھ جس کو شریک ٹھہراتے ہو میں اس سے بیزار ہوں"۔

اس طرح گفتگو کرنا (یہ میرا خدا ہے، نہیں یہ میرا خدا ہے، نہیں، یہ جو بڑا ہے یہ میرا خدا ہے) ایسے آدمی سے ملتی ہے جس نے ایک محدود ماحول میں زندگی بسر کی ہو اور باہر کی دنیا سے آگاہ نہ ہو۔ چنانچہ بعض روایات بھی اسی بات کی تائید کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ ایک غار میں رہا کئے کیونکہ اس کی ولادت وہیں پر ہوئی، جوان ہونے تک وہ وہاں سے باہر نہ نکلے، جب وہ تیرہ سال کے ہوئے تو انہوں نے اپنی والدہ سے درخواست کی کہ انہیں باہر لے جائیں، جب سورج کے غروب ہونے کے بعد افق پر زہرہ ستارہ نمایاں ہوا تو ان کی ماں انہیں غار سے باہر لائیں، اس کے بعد انہوں

نے اس قوم کے ساتھ گفتگو کی"۔[1]

اگر یہ روایت صحیح ہے تو حق تو یہی ہے جو کہا گیا اور اگر ہم کہیں کہ اس طرح کی آیات میں خبر واحد کافی نہیں، تو اس صورت میں ایک اور احتمال موجود ہوگا، وہ یہ کہ اپنے (مربی) والد و قوم کے ساتھ ان کا طرز گفتگو ان کے معبودوں کی تحقیر کے لیے تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے اپنے (مربی) باپ سے ادب کے ساتھ پیش آنے سے متصادم نہیں ہوتا کیونکہ آزر کا احترام اور باطل خداؤں پر تنقید دو الگ باتیں ہیں۔

البتہ اجرام سماوی کی پوجا کرنے والوں کے ساتھ ان کا طرز گفتگو دونوں نظریوں سے ہم آہنگ ہے۔ یعنی یہ جو کہتے ہیں: "فَلَمَّا رَاٰ کَوْکَبًا" تو یہ اس لیے نہیں تھا کہ انہوں نے اس دن تک ستارہ دیکھا ہی نہ تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خاص ستارہ دیکھا، یہ خصوصیت یا تو زہرہ کی درخشندگی کے باعث تھی یا اس کی پرستش کی وجہ سے تھی۔

جو چیز دوسرے نظریہ کی تائید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن ستارہ پرستوں کے ساتھ ان کے مناظرہ کا ذکر کرنے سے پہلے آزر کے ساتھ ان کی گفتگو اس طرح بیان فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّىْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو اپنا خدا مانتے ہو؟ میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو واضح گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ (انعام۔74)

یہ ایسے شخص کی گفتگو ہے جو اپنے مخاطب سے ایک عرصہ تک مانوس رہا تھا اور اس کے اعمال سے واقف تھا اس لیے تنقید کر رہا تھا، چونکہ ستارہ پرستوں کے ساتھ مناظرہ کا تزکرہ آزر کے ساتھ ان کی گفتگو کے بعد آیا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ فطرتاً اجرام سماوی سے ناواقف اور غیر مانوس شخص نہ تھے۔ ہم اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک عرصہ تک غار میں رہے، اور تیرہ سال کی عمر میں اس تاریک مقام سے باہر نکلے، پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مورد بحث آیات اور اسی طرح ان سے پہلی آیت ان کی زندگی کے اس حصہ سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ ان کی زندگی کے بعد والے نشیب وفراز سے متعلق ہیں۔

۸)۔ جب چاند بھی غروب ہو گیا اور حضرت ابراہیمؑ کی نظر چمکتے ہوئے سورج پر پڑی، تو قرآن نے اس وقت ان کی بات اس طرح نقل فرمائی ہے: "ھٰذا اکبر" یعنی ان دو ستاروں اور چاند پر اور سورج کی ربوبیت کو ترجیح حاصل ہے، کیونکہ یہ بڑا ہے۔ عربی زبان میں "شمس" مؤنث مجازی ہے، اور "قمر" مذکر مجازی ہے۔ لہٰذا پہلے کی طرف اشارہ کے لیے ضمیر مؤنث اور دوسرے کی طرف اشارہ کے لیے ضمیر مذکر لائی جاتی ہے۔ پس ضروری تھا کہ حضرت ابراہیمؑ لفظ "ھذا" کے بجائے "ھذہ" کہتے۔ آخر ضمیر مؤنث کی جگہ ضمیر مذکر کیوں لائے؟

[1] تفسیر برہان، ج ا ص ۵۳۳ اس آیت کی تفسیر میں: "فلمّا جنّ علیه اللیل......"

مفسرین نے اس کے لیے مختلف وجوہات ذکر کی ہیں۔علامہ طباطبائیؒ مرحوم نے اپنی تفسیر میں ان سب کو بیان کیا ہے۔[1]
لیکن خود انہوں نے ایک اور وجہ کا انتخاب کیا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی بات اس شخص کی بات ہے جس نے ابھی تک سورج کو اچھی طرح پہچانا نہیں تھا اور اس کی خصوصیت سے آگاہ نہ تھا۔اس لیے انہوں نے لفظ 'ھذا'' اس شخص کے مانند استعمال کیا ہے جو ایک انسان کو دور سے دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ مرد ہے یا عورت، لہٰذا کہتا ہے: ''من ھذا''؟[2]
شاید ان کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نگاہ باہر کی دنیا پر پڑی تو انہوں نے ستارہ، چاند اور سورج کو دیکھا، لیکن یہ کہ اس جرم کا نام سورج ہے، انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ اشارہ کے وقت اس کی تانیث کا خیال رکھتے۔مقام توصیف میں جو بازغًا کی جگہ بازغۃ آیا ہے اور سورج کے غروب ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے أفل کی جگہ ''أفلت'' استعمال ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں نہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اگرچہ یہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے حال کی وضاحت کر رہے ہیں۔ان دونوں جملوں میں تانیث کا خیال رکھنا گذشتہ گفتار کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔
ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان عربی تھی، لیکن اس زبان کے قواعد تدریجاً مکمل ہوئے اور ترتیب پائے ہیں۔شاید سورج و چاند سے متعلق تانیث و تذکیر کا فرق حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نہ تھا اور ایسا بعد میں ہوا۔اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے لفظ 'ھذا'' استعمال کیا ہے۔یہ قوانین نزول قرآن کے دور میں مکمل ہوئے ہیں۔اس لیے قرآن نے سورج کی تابانی اور اس کے غروب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس عقلانی اعتبار کا خیال رکھا ہے۔
یہ احتمال بہت کمزور ہے کیونکہ قرآن کریم نے جب نمرود کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے مناظرہ کا تذکرہ خود ان کی زبانی کیا ہے تو ''شمس'' کی تعبیر کے وقت ضمیر مؤنث استعمال کی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (بقرہ۔258)

سادہ جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی گواہی کے مطابق دونوں وجوہات جائز ہیں۔ہمیں قواعد کا جائزہ قرآن کی نظر سے لینا چاہیے نہ کہ ہم قرآن کو قواعد کے مطابق جانچنے کی کوشش کریں۔
۹)۔قرآن حکیم نے حضرت ابراہیمؑ کی دلیل نقل کرنے سے پہلے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا ہے:

وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ ٱلْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾

ہم نے اس طرح ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھائے تاکہ وہ اصحاب یقین کے زمرے میں سے

---

[1] المیزان۔ج ۷،ص ۱۸۸
[2] المیزان۔ج ۷،ص ۱۶۴

ہو جائیں۔(انعام۔75)

ملکوت، جبروت کی مانند ملک و جبر میں مبالغہ کو ظاہر کرتا ہے اور یہ صیغے ان ہی موارد میں استعمال ہوتے ہیں۔اب دیکھنا ہوگا کہ آسمانوں اور زمین کے ملکوت سے کیا مراد ہے؟ یہ بات اس نتیجہ سے واضح ہوجاتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دلیل سے نکالا ہے، کیونکہ انہوں نے آسمانی اجرام کی ربوبیت کو باطل کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ میرا پروردگار ہے جس نے آسمان، زمین اور یہ آسمان اجرام پیدا کئے ہیں یہ سب اس کی مخلوق اور اس کے قائم کردہ ہیں، اس صورت میں آسمانوں اور زمین کے ملکوت سے مراد حضرت ابراہیمؑ کا اس بات تک پہنچنا ہے کہ یہ کائنات قدرت مطلقہ سے وابستہ ہے، نیز ماسوئ اللہ، وہ جزء ہو یا کل، اسی حکم میں آتا ہے حقیقت میں ملکوت آسمان و زمین وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے دوسری آیات میں بیان فرمائے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ (آل عمران۔26)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (مائدہ۔17)

اسی طرح ایک اور آیت میں ارشادو ہوتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝ (ملک۔1)

ان آیات میں مالکیت سے مراد اعتباری مالکیت نہیں جو مفروضات کی مدد سے ثابت ہوجاتی ہے، یا ٹھکرائی جاتی ہے، بلکہ اس سے ایسی مالکیت مراد ہے جس کا سرچشمہ اس کے خالق کی ذات ہے جو امکانی موجودات ہر کمال سے تہی دست ہونے کے لحاظ سے وجود میں اپنے خالق سے وابستہ ہے اور کبھی وہ اس کی وابستگی کے دائرے سے نہیں نکل سکتی۔برہان کے ذریعہ وابستگی کا ادراک آسمانوں اور زمین کا ملکوت ہے، جس کا مشاہدہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دیدۂ عقل سے کیا، عارف بشتری کے بقول۔

سیہ روی ز ممکن در دو عالم
جدا ہرگز نشد واللہ اعلم

۱۰)۔قرآن مجید نے ملکوت کا یہ نظارہ دکھانے کا مقصد حضرت ابراہیمؑ کا یقین رکھنا ذکر کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ

تاہم یہ صفت حضرت ابراہیمؑ سے مخصوص نہیں ہے۔اکثر یا تمام انبیاء یہ مقام رکھتے تھے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ڛ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝۲۴

اور ہم نے انبیاء میں سے امام منتخب کئے جو ہمارے فرمان کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، جب وہ صبر کرتے تھے،

اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ (سجدہ۔24)

اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ یقین کے مختلف درجات ہیں۔ یہاں یقین سے مراد علم کا وہ بلند مرتبہ ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کی مثال مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق درخواست میں آئے گی۔

۱۱)۔ حضرت ابراہیمؑ نے تحقق اور مطلوبہ یقین کے حصول کے بعد اپنے رب کی وحدانیت کی تصریح کرتے ہوئے مشرکین کے معبودوں سے بیزاری کا اعلان فرمایا۔ یہ بات مشرکین کو ناگوار گذری، لہٰذا انہوں نے آپ سے مجادلہ شروع کر دیا، انہوں نے یہ جواب دیا:

اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰىنِ ۭ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّیْ شَيْــــًٔـا ۭ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۸۰

اللہ تعالیٰ کے بارے میں تم میرے ساتھ مجادلہ کے لیے کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہو، حالانکہ اس نے میری ہدایت فرمائی ہے اور میں تمہارے معبودوں سے ڈرتا نہیں ہوں مگر یہ کہ میرا پروردگار میرے لیے کوئی چیز چاہے، میرے پروردگار کا علم ہر چیز پر محیط ہے تم نصیحت کیوں نہیں لیتے؟ (انعام۔80)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۸۱

تم نے جسے اللہ کا شریک قرار دیا ہے میں اس سے کیوں ڈروں جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کا شریک بنالیا ہے، ایسا شریک جس کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی دلیل و برہان نہیں آئی؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون امن کا سزاوار ہے، اگر تم جانتے ہو؟ (انعام۔81)

ان دونوں آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم ابراہیمؑ نے انہیں اپنے معبودوں کے غیظ و غضب سے ڈرایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ تمہیں ڈرنا چاہیے نہ کہ مجھے۔ مجھے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیے اس لیے کہ تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ مردہ و بے جان مخلوق ہیں جو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ جس مخلوق کی قدرت و حکمرانی پر کوئی دلیل نہیں ہے تم نے اسے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا اور پھر اس کی عبادت کر رہے ہو۔

آخر میں انہوں نے نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ

مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۸۲﴾

وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اسے ظلم (شرک) سے آلودہ نہیں کیا،، وہ امن وسکون میں ہیں۔ (انعام۔82)

قرآن حکیم نے یہاں پر مادہ ''بس''، ''لم یلبسوا'' سے استفادہ کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا جوئی اور خدا پرستی انسانی فطرت کا حصہ ہے جب کہ شرک و دوگانہ پرستی ایسی بیماری ہے جو جہالت کی وجہ سے فطرت کو ڈھانپ لیتی ہے،لیکن یہ اس کی بنیاد کو نقصان نہیں پہنچاسکتی۔اسی لیے انبیاء و دیگر راہنماؤں کی تعلیمات اور اس پردے کے ہٹانے کے ذریعہ خدا پرستی حقیقی چہرہ دکھاتی ہے۔

قرآن مجید نے آیات کے اختتام پر حضرت ابراہیمؑ کے علم و دانش کو دوسروں پر برتری کی وجہ قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَتِلۡكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيۡنٰهَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ عَلٰى قَوۡمِهٖ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ ﴿۸۳﴾

یہ ہماری حجت و برہان تھی جو ہم نے حضرت ابراہیمؑ کو سکھلائی تا کہ وہ اپنی قوم سے مناظرہ کریں،ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں،تمہارا پروردگار حکمت والا، جاننے والا ہے (یعنی درجے کی بلندی لیاقت اور معیار کے مطابق ہوتی ہے)۔(انعام۔83)

(۳)۔ حضرت ابراہیمؑ کا بت پرستوں سے مناظرہ

موضوع سے متعلق آیات

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝٥٢ قَالُوْا
وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝٥٣
قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٥٤
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝٥٥
قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ
مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝٥٦ (الانبياء۔ ۵۲ تا ۵۶)
وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝٦٩
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝٧٠
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝٧١
قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝٧٢
اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝٧٣
قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝٧٤
قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝٧٥ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝٧٦
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٧٧
الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝٧٨
وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝٧٩

وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ ۝۸۰
وَالَّذِىۡ يُمِيۡتُنِىۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡنِ ۝۸۱
وَالَّذِىۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ يَّغۡفِرَ لِىۡ خَطِيۡٓــئَتِىۡ يَوۡمَ الدِّيۡنِ ۝۸۲ (الشعراء۔۶۹ تا ۸۲)
وَاِبۡرٰهِيۡمَ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوۡهُ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ
تَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۶
اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا وَّتَخۡلُقُوۡنَ اِفۡكًا‌ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ
دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَمۡلِكُوۡنَ لَـكُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ وَاعۡبُدُوۡهُ
وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ ؕ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝۱۷ (عنکبوت۔۱۶،۱۷)
وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيۡنِكُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ ۚ
ثُمَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكۡفُرُ بَعۡضُكُمۡ بِبَعۡضٍ وَّيَلۡعَنُ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا وَّمَاۡوٰٮكُمُ
النَّارُ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ۝۲۵ (عنکبوت۔۲۵)
وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖۤ اِنَّنِىۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ ۝۲۶ اِلَّا الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ
فَاِنَّهٗ سَيَهۡدِيۡنِ ۝۲۷ (زخرف۔۲۶،۲۷)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے اپنے (مربی) باپ اور قوم سے کہا کہ یہ بت کیا ہیں تم جن کی عبادت کررہے ہو؟

۲)۔انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔(ہمارے آباؤ اجداد ان کی عبادت کرتے تھے۔

۳)۔اس نے کہا کہ بے شک تم اور تمہارے آباء کھلی گمراہی میں ہو۔

۴)۔انہوں نے کہا کہ کیا تم حق کی بات لائے ہو یا جادوگر ہو (سنجیدہ بات نہیں کررہے)؟

۵)۔اس نے کہا: (وہ خدا جس کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں) تمہارا، آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اور اسی نے ان کو پیدا کیا ہے، نیز آگاہ رہو کہ میں اس بات پر گواہی دے رہا ہوں۔

۶)۔لوگوں کے لیے ابراہیمؑ کی سرگذشت کو بیان کرو۔

۷)۔جب اس نے اپنے (مربی) باپ اور رشتہ داروں سے کہا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟

۸)۔انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان کی عبادت پر قائم ہیں۔

۹)۔اس نے پوچھا کہ جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری بات سنتے ہیں۔

۱۰)۔کیا وہ تمہیں نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں؟

۱۱)۔انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو اس کام پر پایا ہے (اور یہ دین ہمیں میراث میں ملا ہے)

۱۲)۔اس نے کہا کہ ان سب کو جان لو جن کو تم پوجتے ہو۔

۱۳)۔تم اور تمہارے سابقہ آباؤاجداد۔

۱۴)۔وہ سب میرے دشمن ہیں، سوائے عالمین کے رب کے۔

۱۵)۔وہ پروردگار جس نے مجھے پیدا کیا اور ہدایت کی ہے۔

۱۶)۔وہی جو مجھے رزق دیتا اور سیراب کرتا ہے۔

۱۷)۔وہ کہ اگر میں بیمار ہوجاؤں تو مجھے شفا دیتا ہے۔

۱۸)۔وہ جو مجھے موت دیتا ہے اور پھر دوبارہ زندہ کرے گا۔

۱۹)۔وہ جس کے متعلق مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میری خطائیں معاف فرمادے گا۔

۲۰)۔اس وقت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس (کی مخالفت) سے بچو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

۲۱)۔اس نے کہا کہ تم اللہ کے علاوہ بتوں کی عبادت کرتے ہو، اس طرح بہتان باندھتے ہو (یعنی) انہیں معبود نہیں جانتے، اللہ کے سوا تم جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو وہ تمہارے رزق کی مالک نہیں ہیں، پس اللہ تعالٰی سے روزی طلب کرو اور اس کی عبادت کرو، اس کا شکر ادا کرو کہ تمہیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور رسول

کا کام تو صرف واضح پیغام پہنچانا ہی ہے۔

۲۲)۔ تم نے اللہ کے بجائے بتوں کو چن لیا ہے تا کہ وہ دنیا کی زندگی میں تمہارے درمیان دوستی کا وسیلہ بنیں، پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے سے انکار کرو گے۔ ایک دوسرے پر لعنت کرو گے، تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے، اور کوئی تمہارا مددگار نہیں ہوگا۔

۲۳)۔ جب ابراہیمؑ نے اپنے (مربی) باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے تمام معبودوں سے بیزار ہوں سوائے اس کے جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری راہنمائی کرتا ہے۔

بت پرستی کی مذمت میں حضرت ابراہیمؑ کی منطق

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے بڑی دلنشین فطری دلائل کا سہارا لیا اور دو باتوں پر زور دیا، اگر چہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی حامل، ایک ہی چیز کی طرف پلٹتی ہیں اور وہ یہ کہ معبود ربوبیت کے معیار پر پورے نہیں اترتے:

ا)۔ تمہارے معبود اندھے اور بہرے ہیں اور تمہیں نفع ونقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ﴿٧١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿٧٢﴾ أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴿٧٣﴾

لوگوں کے سامنے ابراہیمؑ کی داستان حیات بیان کیجئے، جب اس نے اپنے (مربی) باپ اور قوم سے پوچھا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور ان کی عبادت پر قائم ہیں۔ تو اس (ابراہیمؑ) نے جواب دیا، کہ جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں، کیا تمہیں نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں۔ (شعراء۔ 69 تا 73)

اس سے واضح تر کون سی دلیل ہوسکتی ہے کہ انسان کا پروردگار وہ ہے جو انسان کی احتیاج کو پورا کرے اور اسے نفع ونقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو، جو موجود اس خصوصیت سے تہی دست ہو ہرگز یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ عظیم انسان اس کے سامنے خشوع کرے۔

شاید گفتگو کے آغاز میں ان کے معبودوں کے متعلق ''ماتعبدون'' کا سوال جو حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا، ان کے معبودوں کی تحقیر کی بنیاد ہو جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

۲)۔ پروردگار وہ ہے جس کے اختیار میں انسان کی تقدیر ہو، اسے رزق دیتا ہو تا کہ وہ اپنی زندگی کا سلسلہ قائم رکھ سکے۔ اگر وہ یہ چیز اس سے چھین لے تو اس کی زندگی کا چراغ خاموش ہو جائے۔ جب کہ یہ بت اس طرح کا کوئی کمال نہیں رکھتے، لہٰذا ان خدا نما چیزوں کو چھوڑ کر اس پروردگار کی عبادت کرنا چاہیے جو دیکھتا ہے، سنتا ہے اور انسان کے رزق کا مالک ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

ابراہیمؑ کو یاد کرو کہ جب اس نے اپنے رشتہ داروں سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس (کی مخالفت) سے باز آؤ، اگر تم جانتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ لیکن اس کے برعکس تم اللہ کے سوا بتوں کی عبادت کرتے ہو اور بہتان باندھتے ہو (یہ کہ انہیں معبود مانتے ہو) اللہ کے سوا تم جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو وہ تمہارے رزق کی مالک نہیں ہیں۔ لہٰذا اللہ سے رزق طلب کرو، اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو کہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔ (عنکبوت۔ 16،17)

بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بتوں کی پرستش کے ساتھ ساتھ خدا کی عبادت بھی کیا کرتے تھے، اسی لیے جب حضرت ابراہیمؑ ان کے معبودوں سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں تو اللہ کو مستثنیٰ کر دیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾

جب ابراہیمؑ نے اپنے (مربی) باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے معبودوں سے بیزار ہوں، سوائے اس کے کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور میری ہدایت فرمائے گا۔ (زخرف۔ 26،27)

حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے میں ان کی قوم کی منطق

حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ کے مقابلہ میں وہ صرف ایک ہی منطق پیش کرتے تھے، اور وہ اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کی منطق تھی۔ وہ یہ سوچتے ہی نہیں تھے کہ کیا ان کے آباؤ اجداد کا راستہ درست تھا یا باطل۔ حضرت ابراہیمؑ جب بھی ان سے بات کرتے تو وہ اسی چیز کا سہارا لیتے۔

مذکورہ آیات میں یہ باطل منطق بالکل واضح دکھائی دیتی ہے۔

وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيۡنَ ﴿۵۳﴾

انہوں نے کہا کہ ہم تو اپنے آباؤاجداد کو انہی بتوں کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔(انبیاء۔53)

علیٰ ہذا القیاس:

بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۴﴾

بلکہ ہم نے تو اپنے آباؤاجداد کو اسی طریقے پر چلتے ہوئے دیکھا ہے۔(شعراء۔74)

حضرت ابراہیمؑ اس جواب کو ٹھکراتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا نے تمہیں عقل وخرد دی ہے۔ تمہیں ان کے راستے پر غور وفکر کرنا چاہیے۔ اگر تمہاری عقل اس راستے کو جھٹلائے تو تمہیں اس پر نہیں چلنا چاہیے، چنانچہ فرماتے ہیں:

لَقَدۡ كُنۡتُمۡ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۵۴﴾

تم اور تمہارے آباؤاجداد کھلی گمراہی میں ہو۔(انبیاء۔54)

اپنے دور کے بت پرستوں کے مقابلہ میں پیغمبر اکرمؐ کی روش بھی یہی رہی ہے، قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـئًا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

جب بھی ان سے کہا جاتا کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤاجداد کو پایا ہے (کہہ دیجئے) اگرچہ ان کے آباؤاجداد عقل سے کام نہیں لیتے تھے اور ہدایت یافتہ نہیں تھے۔[1] (بقرہ۔170)

آخر کار حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ یہ بت جن کی تم اور تمہارے آباؤاجداد پرستش کرتے ہو، انسان کی بدبختی کا باعث ہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ان کی پرستش چھوڑ دو اور اس معبود کی عبادت کرو جس کے قبضہ وقدرت میں خلقت وآفرینش، ربوبیت، مغفرت وبخشش ہے۔ یہ حقیقت مندرجہ ذیل آیات میں بیان ہوئی ہے:

قَالَ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۷۵﴾ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمُ الۡاَقۡدَمُوۡنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمۡ

[1] سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۴ بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

عَدُوٌّ لِّيْ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٧﴾ [1]
الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿٧٩﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ
فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ
خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾

تم دیکھ رہے ہو کہ تم اور تمھارے آباؤ اجداد جن کی ہمیشہ عبادت کرتے رہے ہو وہ میرے دشمن ہیں (تمھاری بدبختی کا باعث ہیں) سوائے عالمین کے رب کے، یعنی جس نے مجھے پیدا کیا ہے، پھر ہدایت کی ہے، جو مجھے کھانے پانی سے سیراب کرتا ہے، جب بیمار ہوتا ہوں تو شفا دیتا ہے، جو مجھے مارتا ہے، پھر زندہ کرے گا وروہ جس سے میں قیامت کے دن اپنے گناہوں کی بخشش کا امیدوار ہوں گا۔ (شعراء۔ 75 تا 82)

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ پرستش کا سبب دو چیزیں قرار دی گئی ہیں:

۱)۔ خالقیت: وَالَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ

۲)۔ ربوبیت: وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ

ان کے جھوٹے معبود دونوں کمالات سے تہی دست تھے۔

آخر کار حضرت ابراہیمؑ ان کی بت پرستی سے پردہ اٹھاتے ہیں اور اشارہ کرتے ہیں کہ پرستش کے لیے ان بتوں کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں وہ دوستی ومحبت کا وسیلہ بنیں، گویا کچھ لوگ کاروان زندگی کا ساتھ دینے کے لیے اور معاشرے کی تائید کی غرض سے بت پرستوں کے ساتھ مل جاتے ہیں، اوران کی پیروی کرتے ہیں تاکہ سماجی فوائد سے بہرہ مند ہوسکیں۔ حقیقت میں ان کے بزرگ بت پرست تھے اور دوسرے لوگ جو اپنے مفادات کا حصول ان کی پیروی میں دیکھتے تھے، وہ بھی مجبوراً بت پرستی سے چمٹے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بجائے بتوں کی عبادت کرتے تھے۔

اس گفتگو سے ایک اصول سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ بڑے معاشروں میں جہاں ایک مکتب فکر حکمران ہوتا ہے اور انسان یہ سوچتا ہے کہ سب لوگ اسی فکر وسوچ سے متاثر ہیں، حالانکہ حقیقت میں اس طرح نہیں ہوتا بلکہ مفادات کی حفاظت انہیں اس پر ابھارتی ہے کہ وہ اس فکر کے گرویدہ ہوں۔ اگر چہ حقیقت میں وہ اس سے کوسوں دور کیوں نہ ہوں۔ مثلاً کیمونزم کے اصول کی ایک سوچ تھی جس کے قائل فقط بڑے لوگ تھے، لیکن لاکھوں لوگ اس کے حلقۂ اثر میں آ گئے۔ یہ لوگ عقیدہ کی بنیاد پر نہیں آئے تھے بلکہ اپنے سماجی مفادات کے تحفظ کے لیے انہوں نے ایسا کیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کتنے خوبصورت انداز میں فرماتے ہیں:

---

[1] اس استثناء کا نکتہ سورۂ زخرف۔ آیت ۲۶ ''انی براء مما تشرکون'' میں گذر چکا ہے۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

ابراہیمؑ نے کہا کہ تم نے اللہ کے سوا بتوں کو برگزیدہ مان لیا ہے تا کہ یہ تمہاری دنیاوی زندگی میں محبت کا سبب بنیں، پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ (عنکبوت۔25)

یعنی قیامت کے دن تمہاری بت پرستی سے پردہ اٹھ جائے گا جو لوگ ایک دوسرے کے فریب کا شکار ہوتے ہیں وہ نفرین ولعنت کریں گے اور یہ کمزور تعلقات جو اس دنیا میں برقرار ہوئے تھے، ٹوٹ جائیں گے، پھر ایک دوسرے پر سلامتی و محبت کا اظہار کرنے کی بجائے وہ ایک دوسرے سے بیزاری کا اعلان کریں گے۔

دوسری آیات میں بھی آیا ہے کہ خود ان کے معبود بھی ان کے عمل کا انکار کریں گے اور ان کے دشمن بن جائیں گے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ...

جن کی وہ عبادت کرتے تھے وہ ان کے عمل کا انکار کریں گے اور ان کے دشمن بن جائیں گے۔

(۴)۔ بت شکنی کا عزم

حضرت ابراہیمؑ نے منطقی ومحکم دلائل سے اپنی قوم کوراہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن یہ سب کچھ بے سود رہا، اب انہوں نے ان کے انکار میں تبدیلی کے لیے ایک اور منصوبہ بنایا، وہ یہ کہ جب بابل کے لوگ مراسم کی ادائیگی کے لیے شہر سے باہر جائیں گے تو یہ بت خانہ میں جا کر بتوں کو توڑ ڈالیں گے اور اس طرح انہیں بتلائیں گے کہ اگر وہ واقعاً ہی ان کے حقیقی معبود ہوتے تو کم از کم انہیں اپنا دفاع تو کرنا چاہیے تھا۔کلہاڑے سے ان کا ٹوٹ پھوٹ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ہر قسم کی قدرت وصلاحیت سے خالی ہیں۔

ممکن ہے اس کام کا مقصد یہ ہو کہ فساد کی بنیادوں کو ہی اکھاڑ دیا جائے۔کبھی جزوی علاج ایک سرطانی غدود کی تباہی کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ تیز دھار آلے سے جراح اسے بنیاد ہی سے کاٹ پھینکتا ہے۔لیکن پہلا محرک واضح تر معلوم ہوتا ہے۔

اس سے متعلق آیات یہ ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا
كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ
عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾
فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى
رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ (الانبیاء۔۵۷ تا ۶۷)

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ
اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا

بِالْيَمِينِ﴿۹۳﴾ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ﴿۹۴﴾ قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ﴿۹۵﴾ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴿۹۶﴾ (الصافات۔۸۸ تا ۹۲)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔خدا کی قسم! میں تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے بتوں کے خلاف منصوبہ بناؤں گا۔آخر کار بڑے بت کے علاوہ تمام بتوں کے ٹکڑے کر دیئے تا کہ وہ اس بت کے پیچھے آئیں۔

انہوں نے کہا کہ جس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ یقیناً ظالم ہے۔

انہوں نے کہا کہ ہم نے ابراہیمؑ نامی ایک جوان کو ان کا تذکرہ کرتے سنا ہے۔اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تا کہ وہ گواہی دیں۔انہوں نے پوچھا کہ اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا شاید ان میں سب سے بڑے نے یہ کام کیا ہو! اگر یہ بولتے ہیں تو خود ہی ان سے پوچھ لو۔وہ اپنے ضمیر کی طرف لوٹے اور بولے کہ حق تو یہ ہے کہ تم خود ہی ظالم ہو۔پھر انہوں نے شرمندہ ہو کر کہا کہ تم یقیناً جانتے ہو کہ یہ تو بولتے ہی نہیں، اس نے کہا کہ تم اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کیوں کرتے ہو جو تمہیں نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتی؟ میں تم سے اور اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو، بیزار ہوں، تم غور کیوں نہیں کرتے؟

۲)۔ستاروں کی طرف اس نے نگاہ کی اور کہا کہ میں بیمار ہوں، پس اس سے انہوں نے منہ پھیر لیا اور اس کی طرف پشت کر لی۔وہ چھپ کر ان کے معبودوں کے پاس گئے اور کہا کہ تم کوئی چیز دکھاتے کیوں نہیں؟ تم بات کیوں نہیں کرتے؟ پھر اپنے ہاتھ سے ان پر سخت ضرب لگائی، وہ لوگ جلدی سے اس کے پاس آئے۔اس نے کہا کہ کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جو تم نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اور ان چیزوں کو بھی پیدا کیا ہے جو تم خود بناتے ہو۔

عربی زبان میں لفظ ''کید'' خفیہ منصوبہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اصطلاح میں اسے ''حیلہ'' کہتے ہیں اس سے مراد وہ خفیہ منصوبہ ہوتا ہے جس سے دوسرا فریق آگاہ نہ ہو۔اس میں سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابراہیمؑ نے یہ جملہ ''وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ'' (خدا کی قسم! میں تمہارے بتوں کی تباہی کے لیے منصوبہ بناؤں گا، جب تم شہر سے باہر چلے جاؤ گے) خود ان سے کہا تھا اور بعض نے یہ سنا بھی تھا یا یہ کہ یہ ان کا مخفی منصوبہ تھا اور خود انہوں نے اپنے آپ سے یہ جملہ کہا تھا؟

ممکن ہے پہلے نظریہ کی تائید کی جا سکے اس پر دلیل یہ ہے کہ جب وہ شہر میں واپس آئے اور صورتِ حال ملاحظہ کی تو کہا کہ "سَمِعۡنَا فَتًى يَّذۡكُرُهُمۡ يُقَالُ لَهٗۤ اِبۡرٰهِيۡمُ" "یعنی" ہم نے ابراہیمؑ نامی جوان کو ان کے بارے میں برا بھلا کہتے سنا ہے"

ممکن ہے کہا جائے کہ اگر وہ یہ جملہ نہ بھی کہتے تب بھی سب کو معلوم تھا کہ وہ بتوں کا مخالف ہے کیونکہ وہ کئی سال سے انہیں خدائے واحد کی طرف بلا رہا تھا۔ لہٰذا اس کی گرفتاری اس بات پر دلیل نہیں بن سکتی کہ انہوں نے یہ جملہ دوسروں سے کہا تھا۔

بت شکنی:

مفسرین سے منقول ہے کہ قوم ابراہیمؑ مراسم کی ادائیگی کے لیے شہر سے باہر جا رہی تھی، انہوں نے ابراہیمؑ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ لیکن اس نے ستاروں کی طرف دیکھا (فنظر نظرۃ النجوم) اور کہا میں بیمار ہوں۔ (فقال انی سقیم) انہوں نے اس کے عذر کو قبول کر لیا اور خود شہر سے باہر چلے گئے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:

۱)۔ ستاروں کی طرف دیکھنے کا کیا مقصد تھا؟

۲)۔ انہوں نے کیسے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ کہا جاتا ہے کہ وہ بیمار نہ تھے؟

اس سلسلے میں مفسرین نے کئی احتمالات پیش کئے ہیں۔ سب کے ذکر سے بات طولانی ہو جائے گی لیکن دونوں سوالوں کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بات کے خلاف کوئی دلیل نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ بیمار نہ تھے۔ اگر بعض ایسی روایات آئی بھی ہے کہ وہ بیمار تھے تو وہ روایات خبر واحد ہیں اور آیت کی تفسیر میں ان کا سہارا نہیں لیا جا سکتا۔ اگر وہ بیمار نہیں تھے تو کسی اور چیز کا عذر پیش کر سکتے تھے۔ جھوٹ بولنے یا حقیقت کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ انسان کی زندگی میں بیسیوں ایسے کام ہوتے ہیں جن میں سے کسی ایک کو وہ شہر سے باہر نہ جانے کا بہانہ بنا سکتا ہے۔

نیز یہ کہ ستارے کی طرف دیکھا تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں خاص قسم کی بیماری تھی، جو ستارے کے طلوع و غروب ہونے سے ان پر عارض ہوئی تھی۔[1]

بعید نہیں ہے کہ انہوں نے رات کو شہر چھوڑا ہو، رات کی ٹھنڈی ہوا اور نسیم صبح گاہی سے لطف اندوز ہوئے ہوں۔ ممکن ہے ان کی عید گرمی کے موسم میں ہو کہ اس صورت میں رات مراسم کی ادائیگی کے لیے زیادہ مناسب ہوتی ہے۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بابل کے لوگ ستارہ شناس تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے بت بھی ستاروں کی شکل ہی میں تراشتے تھے اور ستاروں کی چال و احوال کے مطالعہ سے حوادث سے آگاہ ہوتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی ان کو مطمئن کرنے کے لیے واقعاً

---

[1] المیزان۔ ج ۱۷، ص ۱۴۸

مریض، ستاروں کی طرف دیکھا اور اپنی بیماری کی پیش گوئی کی۔

اہل بابل شہر سے باہر چلے گئے اور شہر سے باہر مراسم عید ادا کئے۔ حضرت ابراہیمؑ کافی عرصہ سے مناسب موقع کی تلاش میں تھے تا کہ ان کے جھوٹے خداؤں پر کاری ضرب لگائیں۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور کلہاڑے سے سب بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ صرف ایک کو صحیح رہنے دیا۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے عمل کی کیفیت کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾

ان کے معبودوں کی طرف رخ کیا (اور حقارت سے) انہیں کہا کہ تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟ تم بات کیوں نہیں کرتے؟ پھر پوری طاقت سے انہیں پاش پاش کر دیا۔ (صافات۔ 91 تا 93)

دوسری آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

بتوں کو (کلہاڑے سے) ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، سوائے بڑے بت کے کہ شاید وہ لوگ اس کی طرف پلٹیں! قوم ابراہیمؑ جب شہر میں واپس آئی اور شکر ادا کرنے کے لیے بت خانے میں گئی تو انہوں نے عجیب منظر دیکھا؛ کہنے لگے کہ جس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ ظالم ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے ابراہیمؑ نامی جوان کو بتوں کو برا بھلا کہتے سنا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ اسے لوگوں کے سامنے حاضر کرو تا کہ وہ اس بات پر گواہی دیں۔ (انبیاء۔58 تا 61)

ان آیات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے بڑے بت کو نہیں توڑا تھا۔ روایات اور تاریخ میں آیا ہے کہ انہوں نے کلہاڑا اس بڑے بت کے کاندھے پر رکھ دیا۔ قرآن نے اس کی حکمت اس طرح بیان فرمائی ہے:

اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ

سوال یہ ہے کہ ''الیه'' کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ کیا لفظ ''کبیرا'' اس کا مرجع ہے یا ابراہیمؑ، یا دونوں؟ یہاں دو احتمال پیش کئے گئے ہیں:

ایک یہ کہ بڑے بت کو اس کا مرجع قرار دیں جس کا ذکر ''الا کبیر الھم '' کے جملہ میں آیا ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ سمجھیں دونوں صورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کو بیچ میں لانا ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بڑا ایسا کام کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ تو کسی انسان ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ ''لعلھم الیہ یرجعون '' کا جملہ سبب کے طور پر لایا گیا ہے۔ دونوں احتمالوں کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی طرف رجوع کرنے کی خاطر انہوں نے اس بات کو بہانہ بنا کر عام محفل میں بحث اور مناظرہ کا افتتاح کرنے کی ابتداء کی۔

(۵)۔حضرت ابراہیمؑ پر کھلی عدالت میں مقدمہ

حضرت ابراہیمؑ فاتحانہ انداز میں بت خانے سے نکلے۔لوگ شہر میں واپس آ گئے، اپنی سلامتی پر شکر ادا کرنے کے لیے بت خانہ میں گئے تاکہ ایک واجب امر کی ادائیگی ہو جائے۔انہوں نے دیکھا کہ سب بت ٹوٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے پر گرے پڑے ہیں۔وہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ ہمارے معبودوں پر یہ مصیبت کس نے نازل کی ہے۔ان کو یاد آیا کہ ایک جوان ہمیشہ ان بتوں کو برا بھلا کہتا ہے۔قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس حصہ کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

موضوع سے متعلق آیات

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْــَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْــًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ (الانبیاء۔ ۵۹ تا ۶۷)

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ (الصافات۔ ۹۴ تا ۹۶)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔انہوں نے کہا کہ کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟ یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔

۲)۔انہوں نے کہا کہ ہم نے ابراہیمؑ نامی جوان کو سنا ہے کہ وہ ان بتوں کو برا بھلا کہتا تھا۔

۳)۔انہوں نے کہا کہ اسے لوگوں کے سامنے پیش کرو تا کہ اس بات پر گواہی دیں۔

۴)۔(ابراہیمؑ کو لایا گیا) کہنے لگے: اے ابراہیمؑ! کیا ہمارے خداؤں کے ساتھ تو نے یہ سلوک کیا ہے؟

۵)۔اس نے کہا کہ یہ تو بڑے بت کا کام ہے۔تم خود ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں؟

۶)۔اس پر ان لوگوں نے اپنے دل میں سوچا اور کہنے لگے کہ تم لوگ خود ہی ظالم ہو۔

۷)۔پھر انہوں نے (شرمندگی سے) سر جھکا لیے اور ابراہیمؑ سے کہا تم تو جانتے ہو کہ یہ یہی بولتے نہیں۔

۸)۔ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔

۹)۔تف ہے تم پر اور اس چیز پر جسے تم اللہ کی بجائے پوجتے ہو۔تم سوچتے کیوں نہیں؟

۱۰)۔جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ ابراہیمؑ کا کام ہے تو وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئے۔

۱۱)۔ابراہیمؑ نے کہا جو چیز تم نے خود تراشی ہے اس کی عبادت کیوں کرتے ہو؟

۱۲)۔اللہ نے تمہیں اور ان بتوں کو بھی پیدا کیا ہے، جو تم نے خود بنائے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ سے باز پرس کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ان کے اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان سوال و جوابات کا تبادلہ ہوا جن کی تفصیل یہ ہے:

۱)۔ارکان کمیٹی: ابراہیمؑ کیا یہ کام تو نے کیا ہے؟

ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ

۲)۔ابراہیمؑ: یہ بڑے بت کا کام ہے۔گواہی کے طور پر ان ٹوٹے ہوئے بتوں سے پوچھ لو۔اگر وہ بول سکتے ہیں۔

بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ

۳)۔ارکان کمیٹی نے سر نیچے جھکا لیے اور شرمندہ ہو کر حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ تم جانتے ہو کہ یہ بول نہیں سکتے۔پھر کیسے کہتے ہو کہ

ان سے پوچھیں؟

ثُمَّ نُكِسُوا عَلٰى رُءُوسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ

۴)۔حضرت ابراہیمؑ نے آخری تبلیغی حملہ کرنے کے لیے موقع مناسب پاتے ہوئے ان سے کہا کہ تم اس چیز کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان؟ تم پر اور تمہارے معبودوں پر تف ہو۔تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے ہو؟

۵)۔ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۗ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

تم بتوں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ حالانکہ یہ تم نے بنائے ہیں اور خود تمہیں بھی اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے:

اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝۹۵ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ

یہاں حضرت ابراہیمؑ پوری صراحت سے کہتے ہیں کہ ان بتوں کو بڑے بتوں نے توڑا ہے اور اپنے کلام کے لیے انہوں نے کوئی قید یا شرط بھی ذکر نہیں کی۔کیا اس بات میں انہوں نے جھوٹ بولا ہے یا کچھ چھپایا ہے؟ یا ان کا کلام ان دونوں پہلوؤں میں کوئی بھی نہیں رکھتا، کیونکہ سچ اور جھوٹ یا خفا اس متکلم کے کلام کی صفات ہوتے ہیں جو سنجیدگی سے بات کرنا چاہتا ہو، فریق مقابل کو کوئی چیز سمجھانا چاہتا ہو، لیکن حضرت ابراہیمؑ اس طرح کی بات نہیں کرتے بلکہ وہ تو یہ گفتگو طنزیہ انداز میں کر رہے تھے۔خود وہ اور ان کے مخاطب بھی جانتے تھے کہ وہ یہ بات سنجیدگی سے نہیں کر رہے ہیں۔

اس بات کا مقصد یہ تھا کہ ان سے اعتراف کروایا جائے اور وہ جواب دیں کہ ابراہیم تم کیا کہتے ہو! کیا ہمارا مذاق اڑا رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔پھر ہم کیسے کہیں کہ یہ بڑے بت کا کام ہے اور دوسرے اس پر گواہ ہیں؟ اس طنزیہ گفتگو سے حضرت ابراہیمؑ کا مقصد اصلی یہی تھا کہ وہ لوگ ایسی باتیں کہیں تا کہ حضرت ابراہیمؑ کو موقع ملے اور وہ اس بھرے مجمع میں ان پر اپنا آخری حملہ کریں، کیونکہ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو ایسا موقع نہیں ملنا تھا۔

یہ بیان ہمیں حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو کی تفسیر کے سلسلہ میں بہت سے مفسرین کی باتوں سے بے نیاز کر دیتا ہے:

۱)۔کبھی کہتے ہیں کہ انہوں نے بڑے بت کی طرف توڑنے کی نسبت مشروط طور پر دی تھی، نہ کہ وثوق کے ساتھ اور چونکہ شرط موجود نہیں تھی لہٰذا طبیعی طور پر بھی محقق نہیں ہوئی، انہوں نے کہا:

بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ

ان کا دعویٰ ہے کہ ''اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ'' کی قید ہے۔حالانکہ ادبی حوالے سے مذکورہ شرط ''فَسْـَٔلُوْهُمْ'' کے لیے قید ہے نہ کہ ''بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ'' کے لیے لازم ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہے۔ان (شکستہ بتوں) سے پوچھو، اگر یہ

بولتے ہیں۔

اسی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بڑے بت کی طرف توڑنے کی نسبت انہوں نے کسی قید و شرط کے بغیر دی تھی، بلکہ ان کی گواہی کو ان کے بولنے کے ساتھ مشروط کیا تھا۔

۲) اہل سنت حضرات نے اس آیت کی تفسیر میں ابو ہریرہؓ سے پیغمبر اکرمؐ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ابراہیمؑ نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے اور وہ تین جگہیں یہ ہیں:

ا)۔ جب انہیں شہر سے باہر چلنے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے کہا: انی سقیم یعنی میں بیمار ہوں۔

ب)۔ جب یہ کہا: "بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا "یعنی بڑے بت نے یہ کام کیا ہے۔

ج)۔ جب وہ مصر آئے تو اپنی بیوی سائرہؓ کا تعارف اپنی بہن کے طور پر کروایا کیونکہ وہ حسین خاتون تھیں اور مصر کا بادشاہ انہیں غلط نظروں سے دیکھ رہا تھا، اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ سارہؓ حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ ہیں تو وہ حضرت ابراہیمؑ کو قتل کر دیتا۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے سارہؓ سے کہا کہ اپنا تعارف میری دینی بہن کے طور پر کراؤ۔

پہلے موقع پر ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی بات کے جھوٹا ہونے کے بارے میں ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا اس بات کا مستقل احتمال ہے کہ وہ واقعی مریض تھے۔

دوسرے موقع کے بارے میں بھی بالکل ظاہر ہے کہ انہوں نے جھوٹ نہیں بولا، کیونکہ جھوٹ کا تعلق اس چیز سے ہوتا ہے جس میں سنجیدگی محرک ہو، جب کہ وہ طنزیہ انداز میں بات کر رہے تھے۔

اس طرح کی روایات ابو ہریرہؓ نے کعب الاحبار جیسے لوگوں سے لی ہیں، لیکن چونکہ کعب نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہی نہیں تھا لہٰذا وہ آنحضرتؐ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ابو ہریرہؓ جس نے تین سال کے لگ بھگ عرصہ آنحضرتؐ کی صحبت میں گذارا تھا، بڑے آرام سے آپؐ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتا تھا، یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں کہ اس نے انبیاء پر ایسا بہتان باندھا ہو۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی گفتگو میں بتوں کے مخلوق ہونے کا تذکرہ کیا اور فرمایا:

اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝۹۵ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ

اللہ نے تمہیں اور ان بتوں یعنی دونوں کو خلق کیا ہے جو تم نے بنائے ہیں، لہٰذا ان کا خالق عبادت کے لائق ہے نہ کہ یہ خود۔

شیخ اشعری نے مذکورہ آیات کو ایک کلامی نظریہ پر دلیل بنایا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اعمال اللہ کی مخلوق ہیں۔ [1]

لیکن یہ آیت مذکورہ بحث کے ساتھ ذرہ بھر بھی تعلق نہیں رکھتی کیونکہ "ما تعملون" میں "ما" موصول سے مراد بت ہیں نہ کہ انسان

[1] الابانہ، ص ۲۰

کے افعال و اعمال۔ حضرت ابراہیمؑ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بت اللہ کی مخلوق ہیں لہٰذا خدا ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ تمہارے مصنوع بت جو اس کی مخلوق ہیں کیونکہ اس صورت میں آیت کا مضمون ان کے مقصد سے بالکل بیگانہ ہو جائے گا۔

وہ بت جو انہوں نے کئی سال سے بنا رکھے تھے، ان کی ہولناک حالت، پھر حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات کہ خود ان بتوں سے پوچھو کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے، اور اندر سے ان کی اس بات پر آ گہی کہ یہ تو اتنے کمزور و ناتواں ہیں کہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے، ان تمام باتوں نے ان کی روح اور دل میں اس طرح انقلاب برپا کیا کہ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم خود ہی ظالم و ستم کار ہیں جو ان بے وقعت موجودات کی پوجا کرتے ہیں نہ کہ وہ جس نے انہیں توڑا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب انہوں نے بت خانہ کا وہ دلخراش منظر دیکھا تو بولے:

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

جس نے بھی یہ کام کیا ہے وہ ظالموں میں سے ہے۔ (انبیاء۔ 59)

اس مرتبہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی منطق کے مقابلہ میں اتنے ذلیل ہوئے کہ کہنے لگے:

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

اپنے وجدان کی طرف انہوں نے رجوع کیا اور کہنے لگے کہ یقیناً ہم ظالم ہیں نہ کہ بتوں کو توڑنے والا۔ (انبیاء۔ 64)

اس سے بڑھ کے اور ظلم کیا ہوگا کہ ان ذلیل و بے وقعت بتوں کو اس عظیم خدا کا شریک قرار دے کر وہ ان کے سامنے جھک رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا ضمیر بیدار ہو چکا تھا، لیکن اپنے مادی مفادات کی خاطر جنہیں حضرت ابراہیمؑ نے گذشتہ آیات میں "مودة بینکم"[1] کے جملے کے ذریعے بیان فرمایا ہے، دوبارہ شکست کھا گیا۔ جو لوگ دین کی جگہ ضمیر کو دینا چاہتے ہوں ان کے لیے اس طرح کے واقعات قابل غور اور مقامات عبرت ہیں۔

انسانی ضمیر معلم اور معقول ترین ناصح ہے لیکن دوسرے عوامل کے مقابلہ میں اتنا ثابت قدم نہیں ہے۔ خائن لوگوں کی تاریخ اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ ان کا ضمیر کبھی کبھی انہیں جھنجھوڑتا اور وعظ و نصیحت کرتا ہے، جس کی وجہ سے کبھی انہیں عارضی طور پر پشیمانی و ندامت بھی ہوتی ہے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے وہی غلط کام دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں۔

اب دیکھتے ہیں کہ بابل کے بت پرستوں نے حضرت ابراہیمؑ کی منطق پر کیسے ردعمل کو ظاہر کیا؟

---

[1] انما اتخذتم من دون اللہ اوثانا مودة بینکم فی الحیوة الدنیا (عنکبوت۔ 125)

(٦)۔اس اقدام پر بت پرستوں کا ردعمل

بت شکن کے لیے نمائندہ کا قیام اور معاشرہ میں بت پرستوں کے عمل کی مذمت کرنے کا کام یقینی طور پر ردعمل کے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص لوگوں کی عدم موجودگی میں ان کے معبد میں داخل ہو، ان کے چھوٹے بڑے بتوں کو پاش پاش کر ڈالے اور اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہ ہو؟ ہیت فصفه کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو نے انہیں شرمندہ کر دیا اور انہوں نے دل کی گہرائیوں سے جان لیا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دلیل محکم و مضبوط ہے، لیکن وہ کیا کرتے کہ وہ معاشرے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مجبور تھے۔

آخر کار عدالت غرود نے اپنا فیصلہ سنایا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں جلا کر بھسم کر دیا جائے۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس پہلو کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

موضوع سے متعلق آیات

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ (الانبیاء۔ ٦٨ تا ٧١)

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿٩٧﴾

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿٩٨﴾ (الصافات۔ ٩٧، ٩٨)

آیات کا ترجمہ:

١)۔ انہوں نے کہا کہ ابراہیمؑ کو جلا دو اس طرح اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم کوئی کام کرنا ہی چاہتے ہو۔

٢)۔ ہم نے کہا اے آگ! ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا۔

٣)۔ انہوں نے مکر سے کام لیا، ہم نے بھی انہیں مغلوب کر دیا۔

٤)۔ ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کو نجات دی اور انہیں ایسی سرزمین کی طرف بھیج دیا جسے ہم نے بابرکت

بنایا ہے۔

۵)۔انہوں نے کہا کہ ایک مکان تیار کرواور اسے اس دوزخ میں ڈال دو۔

۶)۔انہوں نے مکر سے کام لیا اور ہم نے انہیں مغلوب کر دیا۔

ابراہیم علیہ السلام آگ میں

عدالت نے یہ فیصلہ سنایا کہ ابراہیمؑ کو کڑی سے کڑی سزا دی جائے۔اس سے سخت سزا اور کیا ہوسکتی ہے کہ انہوں نے ایک مکان بنانے کا حکم دیا کہ اسے آگ سے بھر کر ایک جہنم کی صورت بنا دیا۔اس کے بعد اس میں ابراہیمؑ کو پھینکنے کا فیصلہ کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿٩٧﴾

ایک مکان تیار کرواور اسے دوزخ میں پھینک دو۔(صافات۔97)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ﴿٦٨﴾

انہوں نے کہا کہ ابراہیمؑ کو جلا دو اور اس طرح اپنے معبودوں کی مدد کرو، اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو۔(انبیاء۔68)

انہوں نے یہ کام مکمل کر دیا۔اس مصنوعی دوزخ کی تیاری پر انہوں نے بہت وقت صرف کیا۔اور ایک عظیم مجمع میں انہوں نے اس نمائندۂ توحید کو منجنیق میں ڈال کر اس آگ کی طرف پھینک دیا جس کے شعلے دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔

وہ کچھ اور چاہتے تھے لیکن اللہ کی مرضی مختلف تھی، وہ اس علمبردار توحید کو جلا کر ندائے توحید کو ختم کرنا چاہتے تھے۔جب کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اپنے پیغمبر کے لیے آگ کو گلستان بنا دے اور ان کے منصوبے کو خاک میں ملا دے، ابراہیمؑ کو غالب اور انہیں مغلوب کر دے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴿٧٠﴾

ہم نے کہا کہ اے آگ ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہوجا اور سلامتی بن جا۔انہوں نے ابراہیمؑ کے لیے منصوبہ بنایا تھا لیکن

ہم نے ان سب کو بدترین خسارے میں رہنے والا بنا دیا۔(انبیاء۔69،70)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

فَاَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَسۡفَلِیۡنَ ﴿۹۸﴾

پس انہوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ مکر سے کام لیا، لیکن ہم نے انہیں مغلوب کر دیا۔ (صافات۔98)

متعصب ترین لوگ

جب ان لوگوں نے اپنے معبودوں کی ناتوانی کا مشاہدہ خود کرلیا، ان کے بیدار ضمیروں نے انہیں سرزنش کی اور انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ تعالی نے کس طرح نمائندہ توحید کو آگ کے دریا سے بچالیا، ان کی دوزخ کو گلستان میں تبدیل کر دیا تو حق تو یہ تھا کہ یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اور ان کے دین کی پیروی کرتے۔ اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہوسکتا تھا لیکن اندھی تقلید نے اپنا اثر قائم رکھا اور وہ اپنے فساد و ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کی ہدایت سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ بابل سے ہجرت کر کے ان کی ملاقات کسی ایسی قوم سے ہو جائے جو حق کی بات پر کان دھرے۔

(۷)۔ حضرت ابراہیمؑ کا بابل کے حکمران سے مناظرہ

سرزمین بابل سے نکلنے سے پہلے قرآن نے بابل کے حکمران کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے مناظرے کا ذکر کیا ہے۔ تاریخی حوالہ سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ مناظرہ کب ہوا تھا؟ کیا یہ ان کے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کے فیصلہ سے پہلے ہوا یا اس کے بعد؟ اگرچہ واقع کی اہمیت یہ تقاضا کر رہی ہے کہ اس کا حضرت ابراہیمؑ سے مناظرہ اس وقت ہوا جب ان کا نام لوگوں کی زبان پر تھا اور یہ نام نمرود کے دربار تک بھی پہنچ چکا تھا۔

یہ مناظرہ اس طرح ہوا:

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾

اللہ آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے۔ (اگر تم سچے ہو) تو اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ (یہاں) وہ کافر مبہوت ہو گیا اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (بقرہ۔258)

بابل کا حکمران کہ جسے حکومت و فرمانروائی جیسی نعمت عطا کی گئی تھی، حق تو یہ تھا کہ اس نعمت کے مقابلہ میں ''رب الملك'' کے سامنے سرتسلیم خم کرتا، لیکن افسوس کہ وہ غرور کا شکار تھا۔ اس نے ابراہیمؑ سے اللہ کی ربوبیت کے سلسلہ میں مجادلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کے مناظرہ کو اس طرح بیان فرما رہا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے معاملہ میں مجادلہ کیا، وہ جسے اللہ نے حکومت عطا فرمائی تھی، یعنی اس نے شکر کی جگہ کفر سے کام کیا۔ (بقرہ۔258)

جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کی بابت کوئی اختلاف نہ تھا اور سب اللہ تعالیٰ کو خالق جانتے تھے، حضرت ابراہیمؑ بھی اسی پروردگار خالق کو رب اور مدبر جانتے تھے، جبکہ اہل بابل اجرام آسمانی کی ربوبیت اور بعض ان بتوں کی ربوبیت پر عقیدہ رکھتے تھے جو آسمانی اجرام کی شکل میں بنائے گئے تھے ان کا حکمران بھی خود کو ''رب'' کہتا تھا حالانکہ اس کے باوجود دوسروں کی طرح پروردگار عالم کو ''رب الارباب'' کہتا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دلیل میں موت و حیات کی بات پیش کی، وہ یہ کہ میرے پروردگار کی قدرت یہ ہے کہ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، موت و حیات سے ان کی مراد وہی طبیعی موت و حیات تھی، جس کا آغاز انسان جنین سے کرتا ہے اور بڑھاپہ کے آخر میں مرجاتا ہے۔

نمرود نے فوراً مغالطہ پیدا کیا اور حضرت ابراہیمؑ نے جس موت وحیات کو کائنات کے پروردگار کی خصوصیت قرار دیا تھا، اس کی تفسیر دوسری طرح کی۔ اس سے مجازی معنی مراد لئے اور کہا کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ قرآن نے اگرچہ اس سلسلہ میں تفصیل نہیں بتائی تاہم تاریخ وروایات بتاتی ہیں کہ اس نے دو قیدی بلائے ایک کو آزاد کر دیا اور دوسرے کو قتل کر دیا، اس طرح اس نے آزاد کرنے کو زندہ کرنے اور قتل کرنے کو مرنے کے معنی میں لیا۔

حضرت ابراہیمؑ اس کے مغالطہ پر خاموش رہے، شاید سامعین کی قوت ادراک حضرت ابراہیمؑ کے جواب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی، کیونکہ ظاہر ہے کہ نمرود کا عمل صرف ایک مغالطہ پر مبنی تھا۔ موت وحیات جو ربوبیت کی خصوصیت میں سے ہیں، ان سے مراد ہی طبعی موت وحیات ہے، نہ کہ اجتماعی زندگی کہ جو قید سے آزاد کرنے یا موت کسی خاص ہتھیار کے ذریعے مارنے کے معنی میں ہو۔

حاضرین کے فہم کا درجہ کمزور ہونے کے باعث حضرت ابراہیمؑ نے اس کی غلط فہمی کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنی دلیل کو ایک اور انداز میں پیش کر کے کہا کہ میرا پروردگار اس کائنات کا مدبر ہے، وہ خورشید کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو اس کائنات کا حقیقی رب ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔

یہاں نمرود مبہوت ہو گیا، اس نے حضرت ابراہیمؑ کو اور اپنے ارد گرد دیکھا، لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہ لایا بلکہ اپنے کفر پر ڈٹا رہا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ نمرود نے یہ کیوں کہا کہ یہ میرا ہی کام ہے نہ کہ تیرے رب کا! اس کا جواب یہ ہے کہ بات واضح تھی کہ ایسا مسلسل کام، جب سے کائنات کا وجود ہے، جاری ہے، اس کی علت انسان کا ارادہ نہیں ہو سکتا، جو چند دن کے لیے تخت سلطنت پر بیٹھا ہو۔ اگر وہ اس طرح کا دعویٰ کرتا تو وہ فقط ایک مذاق ہی ہوتا۔ قرآن نے اس مناظرہ کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۵۸

جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، (نمرود نے) کہا کہ میں (بھی) زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ یقیناً میرا پرودگار سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ وہ خدا کی ربوبیت کا انکار کرتے ہوئے بھی مبہوت ہو گیا، بے شک اللہ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا۔ (بقرہ۔ 258)

علمبردار توحید کی زندگی کا دوسرا حصہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فلسطین کی طرف ہجرت

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے پہلے حصے سے ہم آگاہ ہوئے۔ جو واقعات اس حصہ میں رونما ہوئے اور قرآن نے بھی ان کا ذکر کیا ہے، ہم نے وہ بیان کئے۔ اب ان کی زندگی کے دوسرے حصہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

یہ حصہ حضرت ابراہیمؑ کی بابل سے سرزمین فلسطین کی طرف ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی ہجرت کا محرک بھی واضح ہے کیونکہ جب ایک مصلح اپنے ماحول کو تبلیغی کام کے لیے مناسب نہیں سمجھتا تو پھر مجبور ہو کر کسی مناسب تر سرزمین کا رخ کرتا ہے اس لیے انہوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۹۹﴾

میں اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہوں، وہ جلد ہی میری راہنمائی فرمائے گا۔ (صافات۔ 99)

شاید یہاں اس جگہ کی طرف راہنمائی مراد ہے جہاں تبلیغ کی توفیق اور تاثیر دونوں ممکن ہوں۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾

ہم نے اسے اور لوطؑ کو (جو ابراہیمؑ کے رشتہ دار تھے) نجات دی اور انہیں ایسی سرزمین کی طرف روانہ کیا جسے ہم نے عالمین کے لیے بابرکت قرار دیا تھا۔ (انبیاء۔ 71)

اس جملہ سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فلسطین کی طرف ہجرت کی۔ کیونکہ قرآن کریم نے جہاں مسجد اقصیٰ کا ذکر کیا ہے وہیں اس سرزمین کے بارے میں اسی طرح فرمایا ہے:

الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ

جس کا ماحول بابرکت ہے۔ (بنی اسرائیل۔ 1)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۲۶﴾

لوطؑ اس پر ایمان لائے اور کہا کہ میں رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ (عنکبوت۔ 26)

واقعی قابل تعجب بات ہے کہ علمبردار توحید اس صبر استقامت، ان پختہ براہین ومحکم دلائل کے ساتھ بھی لوگوں کی کسی کثیر تعداد کو خدا پرستی کے راستے پر نہ لا سکے۔قرآن کریم نے جو فقط لوطؑ کا نام لیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیروکار بہت کم تھے۔حضرت لوطؑ بھی ایک پیغمبر ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے دین پر ہی تھے اور ان کے ساتھ وہ دوسری جگہ ہجرت کر کے گئے تھے،جس کی تفصیل بعد میں آئے گی،البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی ان کی دعوت پر لبیک کہا ہو لیکن ان کی تفصیل کچھ زیادہ نہیں ورنہ قرآن مجید ان کا بھی ذکر فرماتا۔

اس حصے میں حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی کے بنیادی پہلو یہ ہیں:

۱)۔اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کی ولادت

۲)۔اپنے بیٹے اسماعیلؑ کی مدد سے کعبہ کی تعمیر نو

۳)۔بہت بڑی آزمائش الہٰی

۴)۔حضرت ابراہیمؑ اور مردوں کو زندہ کرنا۔

۵)۔حضرت ابراہیمؑ اور مقام امامت

۶)۔حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں

۷)۔حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ

حضرت ابراہیمؑ کے دو علیم وحلیم بیٹے اسماعیل واسحاق

قرآن کریم میں حضرت کو دو علیم وحلیم بیٹوں کی خوشخبری فرشتوں کے ذریعے سنانے کا تذکرہ ملتا ہے ان کی صفات اس طرح بیان کی گئی ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ
اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾
فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا
تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿ؕ۷۰﴾
وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾
قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾
قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ
حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ (ہود۔۶۹ تا ۷۳)

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ
الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿ۚۖ۳۱﴾ (العنکبوت۔۳۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ وَهَبَ لِىْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّىْ لَسَمِيْعُ
الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ (ابراہیم۔۳۹)

رَبِّ هَبْ لِىْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾
فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ (الصافات۔۱۰۰،۱۰۱)

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾ (الصافات۔۱۱۲،۱۱۳)

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ (الانعام۔۸۴)

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝۴۹ (مریم۔۴۹)

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝۷۲ (الانبیاء۔۷۲)

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۲۷

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ہمارے پیغام بر (فرشتگان) ابراہیمؑ کے پاس آئے اور اسے بشارت دیتے ہوئے سلام کہا۔اس نے ان کو سلام کیا، (میزبانی میں) تاخیر نہ کی اور ان کے لیے بچھڑا بھون کر لایا۔

۲)۔جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ ان کا ہاتھ کھانے تک نہیں بڑھ رہا (وہ کھا نہیں رہے) تو وہ پریشان ہو گئے اور دل میں خوف زدہ ہونے لگے۔مہمانوں نے ابراہیمؑ کے خوف کو دیکھ کر کہا کہ ڈرو نہیں، ہم قوم لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

۳)۔(یہ جملہ انہوں نے کہا) اور اس کی بیوی جو وہیں کھڑی تھی، ہنس پڑی، ہم نے اسے اسحاقؑ کی اور اس کے بعد یعقوب کی ولادت کی خوشخبری دی۔

۴)۔ابراہیمؑ کی بیوی نے کہا: اے ہے! کیا میں اس بڑھاپے میں بچہ پیدا کروں گی، حالانکہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے؟ یہ بات تو بڑی عجیب ہے۔

۵)۔پیغام لانے والے (فرشتوں) نے کہا: کیا تو اللہ کے کام پر تعجب کرتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں خاندان پر، وہ پروردگار جو قابل حمد اور بلند مرتبہ ہے۔

۶)۔جب فرشتے (اسحاقؑ نامی بیٹے کی ولادت کی) خوشخبری لے کر ابراہیمؑ کے پاس آئے تو کہا: ہم اس سرزمین (سرزمین لوطؑ) کے باشندوں کو نابود کر دیں گے۔یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

۷)۔سب تعریب ہے اس پروردگار کے لیے جس نے مجھے بڑھاپہ میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ عطا فرمائے، میرا خدا

دعا سننے والا ہے۔

۸)۔ پروردگار! مجھے صالح اولاد عطا فرما۔

۹)۔ ہم نے اسے ایک بردبار (حلیم) بیٹے کی خوشخبری دی۔

۱۰)۔ ہم نے اسے اسحاقؑ نامی بیٹے کی بشارت دی، جو پیغمبر اور صالحین میں سے تھا۔ ہم نے اسے، اسحاق کو اور دونوں کی اولاد کو برکت دی، ان کی اولاد میں سے کچھ نیک اور کچھ دوسرے جان بوجھ کر اپنی جان پر ظلم کرنے والے بن گئے۔

۱۱)۔ ہم نے اسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا فرمائے اور ہر ایک کو ہدایت دی۔

۱۲)۔ جب ابراہیمؑ اپنی قوم اور اس سے جس کو وہ اللہ کے علاوہ پوجتے تھے، جدا ہو گئے تو ہم نے انہیں اسحاقؑ و یعقوبؑ کی ولادت کی بشارت دی اور ہر ایک کو پیغمبر بنایا۔

۱۳)۔ ہم نے اسے انعام میں اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا فرمائے اور ہر ایک کو صالحین میں سے قرار دیا۔

۱۴)۔ ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ و یعقوبؑ عطا فرمائے اور اس (ابراہیمؑ) کی اولاد میں نبوت و کتاب رکھی۔ اس دنیا میں اسے جزا دی اور دوسری دنیا میں وہ صالحین میں سے ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

وہ سرزمین جوازل سے بابرکت و بانعمت تھی، ابراہیمؑ کو اس میں ہم نے دو فرزند عطا کئے جب کہ حضرت ابراہیمؑ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایک بیٹے کا نام اسماعیلؑ تھا اور دوسرے کا نام اسحاقؑ، دونوں نبی تھے۔ یعقوبؑ کے والد حضرت اسحاقؑ بنی اسرائیل کے انبیاء کے سلسلہ کے حلقۂ اول ہیں۔ اسی طرح اسماعیلؑ عدنانی عرب کے باپ اور پیغمبر اسلامؐ کے جد بزرگوار ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ (ابراہیم۔39)

آیت کا مفہوم بتلا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اولاد کی دعا کی تھی اور اللہ نے بھی ان کی دعا قبول فرمائی تھی۔

ان آیت میں حضرت اسماعیلؑ کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ حلیم و بردبار تھے اور راہ خدا میں ذبح ہوتے وقت انہوں نے جس صبر و مقاومت کا مظاہرہ کیا، وہ ان کے حلم کی علامت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

پروردگار! مجھے فرزندِ صالح عطا فرما، پس ہم نے اسے بردبار بیٹے کی بشارت دی۔ (صافات۔ 100، 101)

اس آیت کا ابتدائی حصہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا اظہار کر رہا ہے، جو انہوں نے اللہ کے حضور بیٹے کے لیے کی تھی۔

البتہ ان آیات میں حضرت اسحاقؑ کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ ان کی نسل میں سلسلہ نبوت جاری رہے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ (عنکبوت۔ 27)

اگرچہ آیت یہ صراحت کر رہی ہے کہ نبوت حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں رکھی گئی لیکن آیت کے آغاز میں اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا نام اس بات پر شاہد ہے کہ اس اولاد کا سرچشمہ اسحاقؑ و یعقوبؑ ہیں۔ اس کے باوجود آل سے عام معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ اس صورت میں پیغمبر اکرمؐ بھی اس میں شامل ہوں گے جن کے جد اعلیٰ اسمٰعیلؑ جو حضرت ابراہیمؑ کے فرزند ہیں۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے بعد والے تمام انبیاء کے مورث اعلیٰ ہیں چاہے وہ نسل اسحاقؑ سے ہوں یا نسل اسماعیلؑ سے۔

حضرت اسحاقؑ یقیناً حضرت اسماعیلؑ کے بعد پیدا ہوئے بلکہ سورۂ صافات کی آیات کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اسحاقؑ کعبہ کی تعمیر اور حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے حکم کے بعد پیدا ہوئے کیونکہ جہاں ذبح اسماعیلؑ کا تذکرہ ہے اور حضرت ابراہیمؑ کی تعریف کی گئی ہے وہاں ارشاد ہوتا ہے:

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

ہم نے اسحاقؑ نامی بیٹے کی بشارت دی جو کہ پیغمبر صالحین میں سے ہے۔ (صافات۔ 112)

اگر آیات کے سیاق کو ہی حجت تسلیم کر لیا جائے، یہ حجت ہی ہے کیونکہ اس کے خلاف کوئی دلیل قاطع نہیں اس طرح حضرت اسحاقؑ کی ولادت ذبح اسماعیلؑ کے واقع کے بعد ہی لازم آتی ہے۔

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ سورۂ مریم کی آیت 49 یعنی

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ

جب ابراہیمؑ اپنی قوم سے اور ان سے جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے، جدا ہو گئے تو ہم نے انہیں اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت دی۔

اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ نے سرزمین بابل سے نکلنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ عطا فرمائے، تاہم کیا اسحاقؑ فوراً ہی عطا کر دیئے گئے یا کچھ عرصہ گذرنے کے بعد؟ یہ تفصیل آیات کے ذیل میں تلاش کرنا ہوگی۔

سورۂ ہود اور سورۂ عنکبوت کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ولادت قوم ہود کی بربادی کے بعد ہوئی، کیونکہ مذکورہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ نے اکٹھے سرزمین بابل کو چھوڑا تھا۔ حضرت ابراہیم فلسطین میں آ گئے جب کہ حضرت لوطؑ کسی اور سرزمین پر چلے گئے جہاں کئی سال تک تبلیغ اور لوگوں کی ہدایت میں مصروف رہے، جب اللہ نے اس بدکار قوم کو تباہ کرنے کے لیے فرشتوں کو بھیجا کہ انہیں سنگسار کردیں تو یہ فرشتے راستے میں حضرت ابراہیمؑ، کے پاس انسانی شکل میں آئے اور حضرت ابراہیمؑ نے بھنے ہوئے گوشت سے ان کی تواضع کی تو انہوں نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی زوجہ کو حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی۔ (آیات سورۂ ہود۔ 69 تا 73)

موضوع سے خارج دو نکات

۱)۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے مہمانوں سے (جب) انہوں نے کھانا نہ کھایا، آزردہ خاطر کیوں ہوئے؟ یہاں مفسرین نے کئی وجوہات ذکر کی ہیں، جن میں سے ایک کی تو تفصیل یہ ہے:

تفسیر کی کتابوں میں آیا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں میں رواج تھا کہ جب کسی کے پاس کوئی مہمان آتا تو وہ اس کی تواضع کرتا۔ اگر کسی ظاہری عذر کے بغیر وہ کھانا نہ کھاتا تو یہ بات اس کی نیت کے شر اور برا ہونے پر دلالت کرتی تھی۔ شاید حضرت ابراہیمؑ نے یہی بات محسوس کی تھی جس سے پریشان ہوئے۔

۲)۔ قوم لوطؑ کی بربادی سے متعلق فرشتوں کی ماموریت سن کر ان کی بیوی کیوں ہنسی؟ یہ خوشی کی ہنسی نہیں تھی، بعض اوقات انسان ایک دہشت ناک خبر اور دلخراش واقعہ سن کر ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔ ممکن ہے ان کی اس ہنسی کی وجہ ایسی ہی ہو، کیونکہ وہ اس قوم کی بداعمالی سے باخبر تھیں لہٰذا ان کی تباہی پر خوش ہوئیں، تاہم یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن نے لفظ ''اہل بیت'' ابراہیمؑ کے خاندان کے لیے استعمال کیا ہے اور فرماتا ہے کہ تم اہلبیت ع پر ہمیشہ اللہ کی رحمت ہے۔ یہ مسلسل رحمت آنحضرتؐ تک جاری ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے ہیں۔

(۲)۔اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی مدد سے کعبہ کی تعمیر نو

کعبہ اصل توحید[1] کے لیے بننے والا سب سے پہلا گھر ہے۔آئمہ اہل بیت سے مروی روایات میں آیا ہے کہ یہ گھر حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا تھا۔حضرت نوحؑ کے طوفان میں اسے نقصان پہنچا،لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اس کی تعمیر نو کریں۔اس کی ابتداء یہاں سے ہوئی۔

حضرت ابراہیمؑ کی دو ازواج تھیں۔پہلی زوجہ حضرت سارہؑ تھیں جو حضرت اسحاقؑ کی والدہ ہیں،جب بڑھاپے تک ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی تو جب حاکم مصر نے انہیں ہاجرہ تحفہ کے طور پر دی جو ایک کنیز تھی۔تو ان سے حضرت اسماعیلؑ نامی فرزند پیدا ہوئے۔حضرت سارہؑ کو اس سے صدمہ ہوا۔حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے ہاجرہؑ اور ان کے بیٹے کو مکہ لے گئے اور انہیں اس جگہ چھوڑ دیا جہاں خانہ کعبہ تھا۔یہ ایک ایسی سرزمین تھی جہاں نہ سبزہ تھا اور نہ پانی۔لیکن کیا کیا جائے کہ یہ اللہ کا فرمان اور مقام امتحان تھا۔حضرت ابراہیمؑ ایسے مخلص بندے تھے جو اللہ کے حکم کی تعمیل میں تن و من کی پرواہ نہیں کرتے تھے،لہٰذا خدائے مہربان نے بھی اس بے آب و گیاہ بیابان میں ان دونوں کے زندہ رہنے کا وسیلہ فراہم کر دیا۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ پر پیاس نے غلبہ پالیا،ان کی مادر مہربان دو پہاڑوں،(صفا اور مروہ) کے درمیان سات بار بے انتہا اور پریشانی کی حالت میں چکر لگاتی رہیں تا کہ اپنے بچے کے لیے پانی فراہم کر سکیں لیکن مایوسی ہوئی،اس اثناء میں انہوں نے دیکھا کہ پانی اسمٰعیلؑ کی ایڑیوں کے پاس سے جوش مار رہا ہے۔بی بی اور بچہ ایسی سرزمین پر اللہ کی غایات کے زیر سایہ رہنے لگے۔حضرت اسماعیلؑ بڑے ہو گئے،کعبہ کے پاس ''جرہم'' نامی قبیلہ اقامت پذیر ہوا۔ایک دوسرے سے واقفیت کی بناء پر انہوں نے ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو ایک بھیڑ دے رکھی تھی کہ وہ اس کے دودھ اور اون سے استفادہ کریں۔

جب حضرت اسمٰعیل جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ سرزمین مکہ کو واپس جائیں اور اپنے بیٹے کی مدد سے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کریں۔اس سے متعلق آیات یہ ہیں؛

موضوع سے متعلق آیات

وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـًٔا وَّطَهِّرۡ بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ۝۲۶

وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ

[1] ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھدًی للعلمین (آل عمران۔92)

عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾ (الحج۔۲۶،۲۷)

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿١٢٥﴾ (البقرہ۔۱۲۵)

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾ (البقرہ۔۱۲۷ تا ۱۲۹)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے کعبہ کے مقام کو ظاہر کیا۔کیونکہ حوادث کے باعث کعبہ تباہ ہو چکا تھا اور اس کی اصل جگہ معلوم نہ تھی، پھر ہم نے حکم دیا کہ ہمارے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ہمارے گھر کا طواف کرنے والوں،نماز پڑھنے والوں،رکوع کرنے والوں اور سجدہ گذاروں کے لیے پاک کردو۔

۲)۔اور لوگوں کو فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے آواز دو تا کہ تمہاری جانب پیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر، جو دور دراز فاصلے طے کر کے آئی ہوں گی، آن پہنچیں۔

۳)۔اس وقت کو یاد کرو جب میں نے خانہ کعبہ کو انسانوں کے لیے مرجع اور امن کی جگہ قرار دیا (اور حکم دیا کہ) مقام ابراہیمؑ کو اپنے لیے نماز کی جگہ بنالو اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کا طواف کرنے والوں، نماز پڑھنے والوں، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کردو۔

۴)۔اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ’’خدا

ہمارے اس عمل کو قبول فرما، بے شک تو ہی سننے والا، جاننے والا ہے''۔

۵)۔اے ہمارے پالنے والے ہمیں اپنا فرمانروا بندہ بنادے اور ہماری اولاد سے ایک گروہ (پیدا فرما)، جو تیرا فرمانبردار ہو اور ہم کو ہماری عبادت کی جگہ دکھادے اور ہم پر اپنی رحمت نازل فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

۶)۔اے ہمارے پالنے والے! ہماری اولاد میں ایک رسول کو بھیج جوان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کو برائیوں سے پاک کردے۔ بے شک تو ہی غالب، صاحب حکمت ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

۱)۔تمام آیات کے ترجمہ سے مندرجہ ذیل اہداف سامنے آتے ہیں:

واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں کعبہ کا مقام واضح نہ تھا۔طوفان اور سیلابوں نے اس عمارت کو تباہ کردیا تھا۔حضرت ابراہیمؑ کو وحی کے ذریعہ اس جگہ کا پتہ چلا۔

۲)۔ یہ گھر ازل سے ہی اللہ کا گھر تھا۔کعبہ کا مقام واضح کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو جو سب سے پہلے خطاب ہوا وہ ''لا تشرك''(شرک مت کرو) ہے۔

۳)۔کعبہ کی یہ تعمیر نوان موحد لوگوں کے لیے ہے جو طواف، قیام اور رکوع وسجود کے ذریعہ اللہ کی عبادت کریں گے۔

۴)۔متمکن لوگوں پر اس گھر کی زیارت واجب ہے، چاہے وہ پیادہ، چاہے سواری پر آئیں۔

یہ چار نکات مندرجہ ذیل آیت سے ماخوذ ہیں:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے خانہ (کعبہ) کی جگہ ابراہیمؑ پر ظاہر کی، (کیونکہ حوادث کے باعث کعبہ تباہ ہو چکا تھا اور اس کی جگہ معلوم نہ تھی) اس کے بعد ہم نے حکم دیا کہ میرے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، نماز پڑھنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو، نیز لوگوں کو

فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے خبر کرو تاکہ وہ ہر دوردراز مقام سے پیادہ یا سوار ہو کر تمہاری طرف آئیں۔(حج۔26،27)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ خانہ کعبہ کو پاک کریں۔(طهر بيتي)۔احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اسے ظاہری کثافتوں سے پاک کردیں کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیلاب و تیز آندھیوں کی وجہ سے خانہ کعبہ کثیف ہو گیا تھا، یہ بھی احتمال ہے کہ مراد معنوی تطہیر ہو، یعنی خانہ کعبہ کو بتوں اور بت پرستوں سے پاک کردو، اگرچہ اس زمانہ میں خانہ کعبہ میں ابھی بظاہر مشرک موجود نہ تھے، تاہم اس کے باوجود اس بات کی اجازت نہ دو کہ بعد میں خانہ کعبہ بت پرستی اور شرک کا مظہر بن جائے۔

مذکورہ آیات میں جو یہ چار عنوان ایک ساتھ ذکر کئے گئے یعنی "طائفین"، "قائمین"، "رکع" اور "سجود" تو اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خانہ کعبہ کے پاس سب سے بڑی عبادت یہی چار عمل ہیں یعنی خانہ کعبہ کا طواف، نماز کے لیے قیام، اور اللہ کے لیے رکوع و سجود۔

ایک اور آیت میں انہی اہداف کا تذکرہ ایک اور انداز میں کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ لِلطَّآٮِٕفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں کے لیے مرجع اور امن کی جگہ قرار دیا (اور حکم دیا کہ) مقام ابراہیمؑ کو اپنے لیے نماز کی جگہ بنائیں، نیز ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کا طواف کرنے والوں، نماز اعتکاف کرنے والوں رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاکیزہ کردیں۔(بقرہ۔125)

بعض آیات میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں [1] کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے:

وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ۖ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ

[1] حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں اور مناجات دوسرے باب میں آئیں گی۔

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کیں اور عرض کیا پروردگار! ہمارا یہ عمل قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔ پروردگار! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد سے ایک گروہ (پیدا کر) جو تیرا فرمانبردار ہو، نیز ہمیں ہماری عبادت کی جگہ دکھا دے اور ہماری توبہ کو قبول فرما۔ بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پالنے والے! ہماری اولاد میں ایک رسول پیدا فرما جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاکیزہ کر دے۔ بے شک تو ہی غالب، صاحب حکمت ہے۔ (بقرہ۔ 127 تا 129)

حضرت ابراہیمؑ کی اس آخری دعا نے اس وقت جامہ قبولیت پہنا جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ قرآن وحکمت کے ساتھ فرزندانِ اسمٰعیلؑ کی طرف تشریف لائے حقیقت میں باپ اور بیٹا آئین محمدیؐ کی بشارت دینے والے تھے۔ اسی دور میں انہوں نے آپؐ کی بعثت کی بشارت دی۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان دعاؤں کا سرچشمہ الہام خداوندی ہی تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی عظمت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے مقام کو اللہ کی عبادت کا مرکز قرار دیا گیا۔ قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اسی جگہ پر نماز پڑھی جائے:

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (بقرہ۔ 125)

پھر مقام ابراہیمؑ کو اللہ کی آیات میں سے قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ (آل عمران۔ 97)

آخر مقام ابراہیمؑ سے کیا مراد ہے؟ ظاہری طور پر وہی پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کے نشان ہیں۔ مقام ابراہیمؑ آیات الٰہی میں سے ہے جب کہ دوسری آیات حجر اسود، حطیم [۱]، عرفات، مشعر اور منیٰ ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت ہاجرہؑ کی طہارت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ نے پانی کی تلاش کے لیے ان کی جستجو کو محل عبادت قرار دیا اور فرمایا کہ خانہ کعبہ کے زائرین کو دو پہاڑوں (صفا اور مروہ) کے درمیان باقاعدگی سے سعی کرنا چاہیے۔ [۲]

---

[۱] حطیم سے مراد حجر الاسود اور کعبہ کے درمیان کا حصہ ہے اسے حطیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں دباؤ پڑتا ہے اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے والے حاجی اس بات کو واضح محسوس کرتے ہیں۔

[۲] ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما (بقرہ۔ 158)

ابراہیم علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش بزرگ

موضوع سے متعلق آیات

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾
فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا
تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾
فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾ۚ
وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ۙ
قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗـؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾
وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾
وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ۖ (الصافات۔۱۰۱تا۱۰۸)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ہم نے اسے ایک بردبار بیٹے کی خوشخبری دی۔

۲)۔جب وہ (اسمٰعیلؑ) بالغ ہوگئے اور اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے لگے، تو ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھے راہ خدا میں ذبح کر رہا ہوں، تیری اس میں کیا رائے ہے؟ اس نے کہا بابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کیجئے اللہ نے چاہا تو مجھے آپ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

۳)۔جب باپ اور بیٹا دونوں تیار ہوگئے اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیل کو ماتھے کے بل لٹا دیا۔

۴)۔آواز آئی کہ اے ابراہیمؑ!

۵)۔جو کچھ تو نے خواب میں دیکھا ہے اس پر عمل کر دیا ہے۔ہم نیکی کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں۔

۶)۔یہ یقیناً بڑا سخت اور واضح امتحان تھا۔

۷)۔ہم نے اسمٰعیلؑ کا فدیہ ایک ذبح عظیم پر اٹھا رکھا۔

۸)۔اور ہم نے ان کا چرچا بعد کو آنے والوں میں باقی رکھا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

لوگوں کی صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے ان سے عام امتحان لیا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔وہ اپنے بندوں کی گذشتہ، موجودہ اور آئندہ صلاحیت و کیفیت سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔اس لیے اس کے امتحان کے محرکات کچھ اور ہوتے ہیں جن میں سے ایک اپنے قابل و لائق بندوں کو کمال کے مراحل تک پہنچانا ہوتا ہے۔یعنی ان میں قوت و توانائی کی جو صلاحیتیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں انہیں آشکار کرنا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ میں خلوص و فداکاری کی صلاحیت بالقوۃ موجود تھی، لیکن یہ صلاحیت کے حکم سے اپنے فرزند دلبند کو قربان کرنے کے باعث عظیم ترین مرتبہ تک پہنچ گئی۔اس لیے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں ذبح کریں۔انہوں نے یہ بات اپنے بیٹے کے سامنے رکھی۔دونوں نے سر تسلیم خم کر لیا اور اس طرح باپ بیٹے نے حکم الٰہی کے سلسلہ میں اپنے اخلاص کا مظاہرہ کیا۔

قرآنی آیات میں اس محرک کے متعلق کئی اشارے ملتے ہیں۔اس مجموعے کے پہلے حصے میں آزمائش الٰہی کے عنوان سے ہم نے ان کا تذکرہ کیا ہے[۱]

حضرت امیر المومنین کے کلمات میں بھی اس محرک کی طرف اشارے ملتے ہیں۔آپؑ فرماتے ہیں:

وان کان سبحانه اعلم بهم من انفسهم ولكن لتظهر الافعال التى بها يستحق الثواب والعقاب[۲]

اگر چہ اللہ تعالیٰ انسان کو خود اس سے بھی زیادہ پہنچانتا ہے، تاہم ثواب و عقاب کا معیار بننے والے اعمال کے ظاہر کرنے کے لیے انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے۔

البتہ امتحان الٰہی کا محرک صرف صلاحیتوں کو آشکار کرنا اور مخفی قوتوں کے منصۂ شہود پر لانا ہی نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں اور بھی کئی محرک

---

[۱] منشور جاوید، ج ا ص ۱۵۰، ص ۱۷۱

[۲] نہج البلاغہ۔کلمات قصار، شمارہ ۹۳

ہیں، جن کی تفصیل اس مجموعے کے پہلے حصے میں بیان کی گئی ہے لیکن حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے میں صرف یہی محرک کارفرما تھا۔ لہٰذا جب وہ آمادہ ہو گئے اور چاہا کہ ذبح کے عمل کو پورا کیا جائے تو خطاب ہوا کہ:

اتنا ہی کافی ہے، تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا یعنی جو کچھ میں چاہتا تھا وہ پورا ہو گیا۔ اس طرح تم نے راہ خدا میں اپنا خلوص ثابت کر دیا ہے۔ اس سے متعلق آیات اس طرح ہیں:

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝١٠٠ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝١٠١ (الصافات۔۱۰۰،۱۰۱)

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّيْٓ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝١٠٢ فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝١٠٣ وَنَادَيْنٰهُ أَنْ يّٰٓإِبْرٰهِيْمُ ۝١٠٤ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٠٥ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝١٠٦ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝١٠٧ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝١٠٨ سَلٰمٌ عَلٰٓى إِبْرٰهِيْمَ ۝١٠٩ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝١١٠ إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١١١ وَبَشَّرْنٰهُ بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝١١٢ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى إِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ۝١١٣ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝١١٤ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝١١٥ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝١١٦

پروردگار! مجھے ایک صالح بیٹا عطا فرما، ہم نے اسے ایک بردبار بیٹے کی خوشخبری دی، جب اسمٰعیلؑ بالغ ہو گئے اور اپنے پدر گوار کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے لگے، (بڑے ہو گئے کہ اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کام کریں، درحقیقت ان کے مددگار ہو گئے) تو ابراہیمؑ نے ان سے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھے راہ خدا میں قربان کر رہا ہوں، غور کرو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا کہ بابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کیجئے۔ اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ چنانچہ جب باپ و بیٹا دونوں تیار ہو گئے اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو ماتھے کے بل لٹا دیا تو آواز آئی کہ اے ابراہیمؑ! جس امر کا خواب میں تمہیں حکم ہوا تھا تم نے اس پر عمل کر دیا ہے، ہم بھی نیکی کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں۔ یہ یقیناً بڑا سخت و صریح امتحان تھا۔ پس ہم نے

اسمٰعیلؑ کا فدیہ ایک ذبح عظیم قرار دیا اور ہم نے ان کا نام بعد میں آنے والوں میں باقی رکھا۔(صافات۔102 تا 112)

پہلی آیت میں اس نوجوان کو حلیم کی صفت سے یاد کیا گیا ہے۔دیگر اوصاف کے ساتھ اس صفت کا تذکرہ قربانی کے لیے ان کے تیار ہونے کے بناء پر کیا گیا۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ

حضرت ابراہیمؑ کو جب حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تو وہ جوان ہو چکے تھے۔باپ کی طرح کام کر سکتے تھے، لہٰذا اس طرح کے بیٹے کو قربان کرنا ان کے خلوص کی علامت ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:فلمّا بلغ معه السعي

مذکورہ آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کے تمام خواب حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتے ہیں ان کے خواب دراصل ان کی نبوت کا حصہ ہوتے ہیں۔انہوں نے خواب میں حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا اور سمجھ گئے کہ انہیں اس قربانی کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ

لفظ''ارٰی'' بیان کر رہا ہے کہ انہوں نے خواب میں ایک بار سے زیادہ مرتبہ بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ورنہ''انی رأیت'' کہتے:

اس کے بعد انہوں نے اس خواب کا تذکرہ اپنے صاحبزادے سے کیا اور ان سے رائے طلب کی تو انہوں نے بھی باپ کی طرح ہی اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ارشاد ہوتا ہے:

اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ۝۱۰۲(صافات۔102)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی پیشانی زمین پر رکھی تا کہ رسم ذبح پوری کریں۔قرآن نے یہ حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے:''وتله للجبين'' یہاں جبین سے مراد پیشانی ہے۔لفظ''تله'' کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کا چہرہ ایک بلند جگہ پر رکھا۔[1]

چونکہ اصلی مقصد حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنا نہ تھا بلکہ باپ اور بیٹے کو اس کام کے لیے آمادہ کرنا تھا لہٰذا جب یہ مقصد پورا ہو گیا تو خطاب آیا کہ تم نے اپنی ماموریت کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ۝۱۰۴ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۝۱۰۵ (صافات۔104،105)

[1] راغب مفردات میں کہتے ہیں:''تل'' عربی زبان میں بلند جگہ کو کہتے ہیں، اگر اس سے فعل بنایا جائے جیسے''تله'' تو یہ بلندی پر گرانے کے معنی میں ہوگا، اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اس کا چہرہ اونچی جگہ پر رکھا۔

قرآن مجید نے اس حکم کو ایک صریح امتحان قرار دیا ہے:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ (صافات۔106)

بعض آیات میں ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو چند باتوں کے ذریعہ آزمایا، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ

جب ہم نے ابراہیمؑ کو چند کلمات کے ذریعہ آزمایا اور انہوں نے اسے مکمل کر دیا۔ (بقرہ۔124)

اس واقعہ کے ذیل میں ''اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ'' کا جو جملہ آیا ہے اور سورۂ بقرہ کی آیت میں ''واذبتلی'' آیا ہے اس سے واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان باتوں (کلمات) میں سے ایک بات جس کے ذریعہ امتحان لیا گیا حضرت ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے کی قربانی کے لیے آمادہ ہونا ہے۔

یہاں مفسرین اور بعض علمائے اصول نے بہت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس تفصیلی انداز کو بیان کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں۔ وہ گفتگو یہ ہے کہ کیا انہیں اس عمل کا حکم دیا گیا تھا؟ اس صورت میں نسخ واقع ہو گیا۔ لیکن بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ انہیں اسی بات کا حکم دیا گیا تھا جس پر دلیل یہ ہے کہ جب اس نے یہ کام انجام دے دیا تو خطاب فرمایا: ''قد صدقت الرؤیا'' یعنی کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہیں ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا کہ وہ اسمٰعیلؑ کی جگہ ایک حیوان کو ذبح کریں ''وفدینه بذبح عظیم''، ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حقیقت میں انہیں اس کام کی انجام دہی کا حکم دیا گیا تھا لیکن ظاہری طور پر انہیں اپنے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، چنانچہ جب یہ کام انجام نہ پایا تو اللہ نے اس کی تکمیل کے لیے ایک گوسفند بھیج دیا تا کہ اسے اسمٰعیلؑ کی جگہ ذبح کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ''وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ'' ہم نے اس کا فدیہ ذبح عظیم قرار دیا۔ کیا یہ عظمت ذبح ہونے والے کے حوالے سے ہے، یا وہ عمل جو راہ خدا میں انجام پایا ہے وہ اس عظمت و رفعت کا مالک ہے؟ پہلے احتمال کی بنیاد پر ''ذبح'' کے معنی مذبوح، ہیں، جب کہ دوسرے احتمال کے مطابق یہ مصدر کے معنی میں ہے، یعنی ذبح کرنا۔

حضرت ابراہیمؑ کی قربانی اتنی قابل تعریف ہے کہ قرآن نے فرمایا ہے کہ ہم نے بعد میں آنے والی امتوں میں ان کا نام نیکی سے باقی رکھا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ پر درود و سلام بھیجا اور فرمایا:

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ

جب یہ ندا آئی کہ تم نے ہمارے حکم کے مطابق عمل کر دیا ہے تو ارشاد ہوا: كذٰلك نجزی المحسنين اس بات کو دہرانے کا مقصد کیا ہے؟

''قد صدقت الرؤیا'' کے بعد اس جملے کو لانے کا مقصد یہ ہو کہ ہم نیک لوگوں کو اسی طرح جزاء دیتے ہیں، یعنی انہیں آزمائش میں ڈالتے ہیں، جب وہ اپنی قابلیت ظاہر کرتے ہیں تو ہم انہیں جزاء دیتے ہیں لیکن ''وتر کنا علیه فی الاٰخرین'' کے بعد اس جملہ کو لانے کا

مقصد یہ ہے کہ ہم اس طریقہ سے (امتوں میں اس کا تذکرہ کرنے سے) نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں۔

ان تمام آیات کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کے مطابق ''ذبیح'' حضرت اسمٰعیلؑ ہیں نہ کہ حضرت اسحاقؑ، یہ بات موجودہ تورات اور یہودیوں کے عقیدہ کے برعکس ہے کیونکہ ذبح اسمٰعیلؑ کی داستان سے پہلے ارشاد ہوتا ہے:

فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيۡمٍ (صافات۔101)

اس کے بعد اس بردبار بیٹے کو ذبح کرنے کے متعلق حضرت ابراہیمؑ کی ماموریت کا تذکرہ ہے اور جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو کر نکلے تو انہیں اسحاقؑ نامی فرزند کی بشارت دی گئی جو انبیاء میں سے ہوگا، ارشاد ہوتا ہے:

وَبَشَّرۡنٰهُ بِاِسۡحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ

اس صورت میں وہ بردبار بیٹا جو منیٰ کی قربانی گاہ میں لے جایا گیا وہ اسحاقؑ کے علاوہ ہے۔ اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری اس واقعہ کے بعد دی گئی ہے۔ چونکہ قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کے صرف دو بیٹوں کا تذکرہ کیا ہے، اس لیے وہ فرزند ذبیح اسمٰعیلؑ ہی ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے:

انا ابن الذبیحین

میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔

ایک حضرت اسمٰعیلؑ اور دوسرے آنحضرتؐ کے والد گرامی حضرت عبداللہؑ ہیں۔ حضرت عبداللہؑ کی داستان بھی حضرت اسمٰعیلؑ ہی کی طرح ہے۔ اس کی تفصیل ''فروغ ابدیت''[1] میں ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] فروغ ابدیت۔ ج ۱ ص ۹۵، سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۲

(۴)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مردہ کو زندہ کرنا

مفسرین اسلام سے منقول ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ایک دریا کے پاس سے گذر رہے تھے، آپ نے ایک مردار دیکھا جس کا آدھا حصہ دریا کے اندر تھا اور آدھا دریا کے باہر، خشکی و آبی حیوانات دونوں نے اس پر ہجوم کر رکھا تھا، اسے کھا رہے تھے اور اس کے جسم کے ٹکڑے بکھیر رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر ان کا ذہن قیامت کی طرف چلا گیا کہ انسان کا جسم اس مردار کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، دوبارہ کیسے زندہ ہو گا۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے اللہ کے حضور درخواست کی کہ انہیں اجزا کے پراگندہ ہونے کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت دکھائے۔ اس سے متعلق آیات یہ ہیں:

موضوع سے متعلق آیت

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنۡ لِّيَطۡمَـئِنَّ قَلۡبِىۡ ؕ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶۰﴾

آیت کا ترجمہ:

اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے عرض کیا: پروردگار! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: کیا تیز اس پر ایمان نہیں ہے؟ ابراہیمؑ نے عرض کیا: کیوں نہیں! لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل (اس کا مشاہدے کر کے) مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: چار پرندے لے اور جب وہ تجھ سے مانوس ہو جائیں تو انہیں ذبح کر ڈال (پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں ملا دے) پھر ہر ٹکڑے کو پہاڑ پر رکھ دے اور انہیں پکار! (تو دیکھے گا کہ وہ زندہ ہو گئے ہیں) اور تیری طرف تیزی سے بھاگے آتے ہیں، یقیناً اللہ قادر، حکمت والا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل و وحی کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ قیامت پر مکمل ایمان و اعتقاد رکھتے تھے، اور وجود قیامت سے آگاہ تھے، لیکن ذہنی خدشات دور کرنے کے لیے جو اہل یقین کے لیے بھی پریشانی کا باعث ہوتے ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ

اپنی آنکھوں سے مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ قیامت کے متعلق ان کا یقین اعلیٰ ترین منزل تک پہنچ جائے یعنی ان کا ''علم الیقین''، ''عین الیقین'' میں بدل جائے۔

قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی درخواست اور اللہ کے جواب کا تذکرہ سورۂ بقرہ کی آیت 260 میں اس طرح ہوا ہے:

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى‌ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ‌ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنۡ لِّيَطۡمَٮِٕنَّ قَلۡبِىۡ‌ؕ

اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا کہ پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے (اللہ نے) فرمایا: کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ ابراہیمؑ نے جواب دیا: کیوں نہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے (اور تکلیف وذہنی خدشات دور ہو جائیں)۔

''ولکن لیطمئن قلبی'' کا جملہ اسی مذکورہ نکتہ کی یاد دہانی کے لیے ہے کہ صاحبان ایمان ویقین افراد کے دل میں بھی کبھی کبھی ایسے خدشات پیدا ہوتے ہیں جو صرف واقعہ کو آنکھوں سے دیکھ کر دور ہوتے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا حکم دیا:

قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا‌ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶۰﴾

(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: چار پرندے لے، جب وہ تجھ سے مانوس ہو جائیں تو انہیں ذبح کر کے (ان کے ٹکڑے کر کے آپس میں ملا دے) ہر ٹکڑے کو ایک پہاڑ پر رکھ دے، پھر انہیں پکار! (تو دیکھے گا کہ وہ زندہ ہو گئے ہیں (اور تیزی سے تیری طرف بھاگے آرہے ہیں، یقیناً اللہ قادر، حکمت والا ہے؛ (اللہ تعالیٰ پرندوں کے بدن کے ذرات تک سے آگاہ ہے اور انہیں زندہ لوٹانے پر بھی قادر ہے)۔ (سورۂ بقرہ۔ 260)

گفتگو کے آغاز میں جو شان نزول ذکر کی گئی ہے، نیز اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو جو مذکورہ طریقہ سے چار پرندے لے کر ذبح کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ کا مقصد صرف مردے کو زندہ ہوتے دیکھنا ہی نہیں تھا۔ اگر مقصد صرف اتنا ہی ہوتا تو اس کے لیے صرف ایک مردے کو زندہ کرنا کافی تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو ان مقدمات کی فراہمی کا حکم دینے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ ان کا مقصد تو ہر حیوان کے بدن کے اجزاء کو ان کے اصلی بدن کی طرف آنے کا مشاہدہ کرنا تھا۔ اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ کئی پرندے ذبح کریں اور ان کو آپس میں ملا دیں۔

یہ مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا تھا جب چاروں پرندے مختلف قسم کے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اصلی بدن کی طرف اجزاء کے پلٹنے کا

مقصد پورا نہ ہوتا۔اسی لیے روایات میں آیا ہے کہ یہ چار پرندے مور، کبوتر، مرغ، اور کوا تھے۔ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی مخصوص صفات کا مظہر ہوتا ہے۔مور خود نمائی کا، مرغ شدیدی جنسی تمایلات کا، کبوتر کھیل کود کا اور کوا ذکاوت وفراست کا مظہر ہوتا ہے۔

ایک سوال کا جواب

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ آیت سے اس بات سے بالکل یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کا پرندے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا کیونکہ لفظ فصرھن اگر چہ ٹکڑے کرنے کے معنی میں تو آیا ہے تاہم اس میں دلیل یہ ہے کہ لفظ ''فصرھن'' کے بعد ''الیك'' کا لفظ آیا ہے اور یہ لفظ دوسرے معنی سے زیادہ ہم آہنگ ہے پہلے معنی سے نہیں۔اس صورت میں آیت کے معنی تبدیل ہوجائیں گے اور مراد یہ ہوگا کہ یہ چار پرندے پکڑ لو، انہیں اپنے ساتھ مانوس کرلو اور انہیں زندہ ہی پہاڑ پر چھوڑ دو، پھر انہیں بلاؤ، تاکہ وہ تمہارے پاس آئیں یعنی تمہارا بلانا باعث بنے کہ وہ وہاں سے تمہارے پاس آئیں۔بالکل اسی طرح قیامت کے دن مردوں کو اللہ تعالیٰ کا بلانا باعث بنے گا کہ مردوں کے منتشر اجزاء اکٹھے ہوکر میدان محشر میں مکمل انسانوں کی صورت میں ظاہر ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کام تمہارے پرندوں کو بلانے اور ان کے پاس تمہارے آنے سے زیادہ آسان ہے۔[1]

جواب

یہ تفسیر ان وجوہات کی بناء پر باطل ہے:

۱)۔حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے مردوں کو زندہ ہوتے دیکھنے کی درخواست کی تھی تاکہ ان کے دل سے ہر قسم کے شبہات دور ہوجائیں۔یہ بات مردوں کو زندہ کرنے کا عمل دکھائے بغیر ممکن نہ تھی۔اس سلسلہ میں تشبیہ و تمثیل اور منتشر پرندوں کو بلانے کی طرح اللہ کا مردوں کو بلانا صادق آتا۔اس تشبیہ کا اثر وحی سے تو زیادہ نہ تھا۔قیامت پر ایمان اور یقین تو انہوں نے وحی کے ذریعہ ہی حاصل کرلیا تھا۔

۲)۔اگر آیت کے معنی یہ ہیں کہ چاروں پرندوں میں ہر ایک کو زندہ ایک ایک پہاڑ پر چھوڑ دو اور پھر انہیں اپنے پاس بلاؤ، تو پھر یہ کیوں فرمایا گیا:

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا

ہر پہاڑ پر ان کا ایک حصہ رکھ دو۔(بقرہ۔260)

بلکہ یہ کہنا چاہیے تھا:

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ وَاحِدًا

---

[1] المنار، عبدہ، ج ۳، ص ۵۴ تا ص ۵۶

ہر پہاڑ پران میں سے ایک کو رکھ دو۔

لفظ''جزء ''اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ اس نے پرندوں کو آپس میں ملا دیا تھا اور یہ ملانا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور ان ٹکڑوں کو آپس میں ملا دینے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۳)۔لفظ''فصرهن ''عربی زبان میں ٹکڑے کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے اور لفظ''اليك ''اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ یہ لفظ اس معنی کے ساتھ ساتھ مانوس کرنے اور اپنی طرف مائل کرنے جیسے دوسرے معانی بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔گویا جملہ کے معنی یہ ہیں کہ انہیں مانوس کرکے ذبح کردو اور ٹکڑے ٹکڑے کردو۔

اس سے واضح ہوگیا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر انسان کے جسم کے اجزاء کو اس کے اصلی جسم کی طرف لوٹائے گا اگر چہ وہ اجزاء کسی اور انسان یا حیوان کے جسم کا حصہ ہی کیوں نہ بن چکے ہوں۔وہ ایک مکمل انسان بنائے گا،اجزاء کا اختلاط ہر جزء کے اپنے اصلی بدن کی طرف لوٹنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

جو چیز حضرت ابراہیمؑ کے دل میں کھٹکتی تھی وہ یہی تھی۔انہوں نے دیکھا کہ ایک مردہ جس کا کچھ حصہ خشکی پر ہے اور کچھ پانی میں،جس پر زمینی اور دریائی مخلوقات نے حملہ کر رکھا ہے،کچھ دیر بعد اس کا جسم ان حملہ آور حیوانوں کے اجسام کا حصہ بن جائے گا،اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے درخواست کی کہ انہیں حیوانات کے ہر حصہ کے اپنے اصلی جسم کی طرف آنے کا مشاہدہ کرایا جائے۔اس لیے چار پرندوں کو ذبح کرنے،ان کے اجزاء کو آپس میں ملانے کے ذریعہ یہ عمل مجسم کیا گیا،پھر ان کے زندہ ہونے اور ہر جزء کے اپنے اصلی بدن کی طرف لوٹنے کا نظارہ کرکے اس خدشے کا خاتمہ کیا گیا۔

(۵)۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مقام امامت

حضرت ابراہیمؑ کی عظیم شخصیت کئی امتحانوں سے گذرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کے زیر سایہ آ گئی، لہٰذا خطاب ہوا کہ اللہ تجھے لوگوں کا امام بنانا چاہتا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ فیضان کا یہ سلسلہ ان کی اولاد میں بھی برقرار رہے۔ اس وقت خطاب ہوا کہ ظالم وستمگر یہ مقام نہیں پاسکیں گے۔ قرآن نے اس بلند مقام کا تذکرہ ایک آیت میں فرمایا ہے:

موضوع سے متعلق آیت

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ
قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

آیت کا ترجمہ:

وہ وقت (یاد کرو) جب ابراہیمؑ کے رب نے اسے چند کلمات کے ذریعہ آزمایا اور اس نے انہیں مکمل کیا (اور امتحان میں کامیاب ہو گئے) تو انہیں خطاب ہوا کہ میں تجھے عوام الناس کا امام بنا تا ہوں۔ ابراہیمؑ نے پوچھا کہ کیا یہ مقام میری اولاد کو بھی ملے گا؟ اللہ نے فرمایا کہ ظالموں تک میرا یہ حکم نہیں پہنچے گا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

اس آیت کی تفسیر میں مندرجہ ذیل نکات تشریح طلب ہیں:

۱)۔کلمات سے کیا مراد ہے؟

اگر چہ عربی زبان میں ''کلمہ'' اس لفظ کو کہتے ہیں جو کسی معنی پر دلالت کرے تاہم کبھی کبھی عربی زبان میں یہی لفظ خارج میں موجود اشیاء کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىْ
وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

کہہ دو اگر سمندر کے پانی میرے پروردگار کے کلمات لکھنے کے لیے سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا

قبل اس کے کہ میرے پروردگار کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ اس جیسے سمندر کے پانی کو بھی اس کی مدد کے لیے حاصل کریں۔ (کہف۔109)

یہاں کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جس سے صفحۂ وجود تشکیل پا رہا ہے۔ اس بناء پر موردِ گفتگو آیت میں کلمات سے مراد بعض ایسے امور ہیں جن کے ذریعہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا:

قرآن میں اگرچہ یہ "کلمات" واضح انداز میں بیان نہیں ہوئے تاہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ امور جن کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا گیا تھا ان میں سے ایک اپنے بیٹے کو ذبح کرنا تھا۔ اگر اس بات کو چھوڑ دیں تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بتوں کو توڑنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ کا قیام ہر قسم کے ردعمل کا سامنا کرنے کے لیے ان کی آمادگی جس کا نتیجہ انہیں آخر کار آگ میں پھینکنے کی صورت میں نکلا، یہ بھی "کلمات" کے مصادیق میں سے ہے، اسی طرح اپنے بیٹے اور زوجہ کو بے آب و گیاہ سرزمین پر چھوڑنا بھی اس کے مصادیق میں سے ہے۔ یہ اور اسی طرح دوسری باتیں، جن کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا گیا حضرت ابراہیمؑ کے لیے سونے کو کٹھالی میں پگھلا کر کندن کی شکل اختیار کرنے کے مترادف تھے۔ حضرت ابراہیمؑ وہ کندن بنے جنہیں زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اپنے خلوص کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرنا تھا، اس طرح ان کی تخلیق میں راہ خدا میں خلوص کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دے۔ یہ کمال زحمت، کوشش، مصائب اور تکالیف کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ گویا یہ مصائب آگ کی وہ بھٹی تھے جو انسان کے وجود سے ملاوٹوں کو دور کر کے اسے کندن بنا دیتے ہیں۔

۲)۔"اماما" سے کیا مراد ہے؟

یہ آیت حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے ایک خلوص زمانہ کا ذکر کر رہی ہے جب وہ مقام نبوت و رسالت حاصل کر کے صاحب اولاد ہو چکے تھے۔ امتحان میں کامیابی پر اللہ تعالیٰ نے جو انہیں یہ رتبہ عطا کیا ہے یقیناً نبوت و رسالت کے علاوہ ہے۔ جن لوگوں نے اس منزلت کی تفسیر [1] ان دونوں مقامات کے ساتھ کی ہے، وہ حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ حیات سے ناواقف ہیں، کیونکہ قرآنی دلائل واضح طور پر بتاتے ہیں کہ جب انہیں مقام امامت کی خوشخبری دی گئی تو وہ پیغمبر تھے۔ ان دلائل کی تشریح اس طرح ہے:

ا)۔وحی کے مخاطب ہونے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ پیغمبر تھے۔

۲)۔حضرت ابراہیمؑ نے یہاں اپنی اولاد کی بات کی ہے اور اللہ سے دعا کی ہے کہ ان کی اولاد کو بھی یہ رتبہ حاصل ہو۔ اولاد کے لیے ان کی یہ دعا اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب ان کی کوئی اولاد ہو۔ صاحب اولاد ہونے سے پہلے انہیں رسالت مل چکی تھی کیونکہ قرآن یہ صراحت کر رہا ہے کہ جب وہ بوڑھے تھے اور ان کی اولاد کو کافی عرصہ گزر چکا تھا اس وقت اللہ کی مشیت سے صاحب اولاد ہوئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] مفاتیح الغیب، ج۱ ص۴۰۹، المنار۔ ج۱ ص۴۵۵

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَسَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے بڑھاپہ میں مجھے اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ نامی بیٹے عطا فرمائے، بے شک وہ اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ (ابراہیم۔ 39)

۳)۔ جوانی کے عالم میں حضرت ابراہیمؑ بابل میں تھے اور مقام نبوت پر فائز ہو چکے تھے کیونکہ اسی زمانہ سے متعلق مشرکین کی گفتگو کا تذکرہ قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

قَالُوۡا سَمِعۡنَا فَتًی یَّذۡکُرُہُمۡ یُقَالُ لَہٗۤ اِبۡرٰہِیۡمُ ﴿ؕ۶۰﴾

انہوں نے کہا کہ ہم نے ابراہیمؑ نامی جوان کو ان (بتوں) کی برائی کرتے ہوئے سنا ہے۔ (انبیاء۔ 60)

لہٰذا اس آیت میں امامت کی تفسیر نبوت اور رسالت کے ذریعہ نہیں کی جاسکتی۔ یہاں مفسرین نے کئی احتمالات ذکر کئے ہیں جن میں دو زیادہ قوی ہیں:

۱)۔ انبیاء کے سردار

حضرت ابراہیمؑ کو ایسی کتاب و شریعت عطا کی گئی تھی جو ان سے بعد میں آنے والے انبیاء کے ذریعہ منسوخ بلکہ بعض رسول اس کی نبوت، رسالت اور شریعت کے زیر سایہ قرار پائے اور ہمیشہ ان کے تابع رہے۔ اس طرح انبیاء میں ان کو بہت بلند مرتبہ حاصل ہوا جو ان کی امامت و سرداری کی علامت ہے۔

ہم حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ، کے بارے میں بھی اس طرح کی سرداری کے قائل ہیں کیونکہ ان کی شریعت و کتاب کی شعائیں بھی کئی دیگر انبیاء پر پڑیں جو حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی ترویج کرتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کی کتاب کو "امام" قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً

پیغمبر اسلام سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب امام اور رحمت تھی۔ (ہود۔ 17)

سابقہ انبیاء کا موازنہ کرتے ہوئے قرآن نے جو صرف حضرت موسیٰؑ کا نام لیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دو رسولوں کے درمیان کوئی ایسا نبی مبعوث نہیں ہوا جو مقام امامت تک پہنچا ہو، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ بھی ایک معنی میں حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی ترویج کرتے تھے، سوائے چند محرمات کے جو انہوں نے بنی اسرائیل کے لیے حلال کیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

لِاُحِلَّ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ

تا کہ تمہارے لیے بعض محرمات کو حلال کروں۔ (آل عمران۔50)

گویا حضرت عیسیٰؑ کی ذمہ داری شریعت تورات میں ایک طرح کی نظر ثانی کرنا تھی کہ اس دور کے تقاضوں کے مطابق بعض محرمات کو انہوں نے حلال قرار دیا۔

اس کے باوجود یہ احتمال بھی رکھا ہے کہ مقام موازنہ میں موسیٰؑ اور کتاب کو امام کے عنوان سے لایا گیا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر نہیں آیا۔اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ مخاطب مدینہ کے یہودی تھے۔اگر اس طرح نہ ہوتا تو حضرت عیسیٰؑ کا ذکر بھی ضرور آتا۔

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ اس معنی میں پیغمبر گرامی اسلامؐ بھی امام تھے۔یہ بات صحیح ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی یا انبیاء نہیں آئے جو ان کی شریعت کے دائرہ کار میں کام کرتے۔لیکن چونکہ ان کی نبوت عالمگیر اور دائمی ہے اور قیامت تک ہر دور کا انسان ان کی کتاب و شریعت کے زیر سایہ ہے،اس لیے حقیقت میں وہ لوگوں کے امام قرار پاتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن ان کے بعد ایسے محدث انسان آئے ہیں جن سے فرشتے گفتگو کرتے ہیں،یہ سب لوگ آنحضرتؐ کی نبوت اور شریعت کے پیروکار تھے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بہت بڑا رتبہ ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے یہ مقام کتنی تکالیف جھیلنے،امتحانات کی بھٹی سے گذرنے اور کئی کٹھن آزمائشوں کو کامیابی کے ساتھ طے کر کے حاصل کیا اور پھر اپنے بعد آنے والے انبیاء کے سردار ٹھہرے۔

۲)۔مطاع فرمانروا

بعض انبیاء کو حکمرانی اور فرمانروائی کا مقام بھی حاصل تھا۔یہ مقام ان کی نبوت و رسالت سے علیحدہ تھا ان تینوں مراتب میں امتیاز کے لیے ان کو واضح طور پر الگ الگ بیان کرنا ضروری ہے۔

لفظ ''نبی'' ''نبا'' سے ماخوذ ہے جو اہم خبر کے معنی رکھتا ہے۔وہ انسان جس کا رابطہ عالم بالا سے ہو اور اس کی اطلاعات و سرچشمہ وہ عالم ہی ہو،اس شخص کے عمل کو ''نبوت'' اور ایسے بندہ کو ''نبی'' کہا جاتا ہے۔

دوسرے لفظ میں یوں کہنا چاہیے کہ جو انسان روحانی قدرت و نفسانی کرامت کے اعتبار سے اس قدر بلند ہو کہ وہ عالم بالا سے ارتباط قائم کر سکتا ہو تو اس کے دل پر پیام الٰہی نازل ہو سکتے ہیں۔اس مقام کو نبوت اور اس پر فائز شخص کو ''نبی'' کہتے ہیں۔

اس حوالے سے کہ جو شخص دوسرے لوگوں تک پیغام پہنچانے کی ذمہ داری رکھتا ہے اور اپنی طرف سے کوئی امر و نہی عائد نہیں کر سکتا، رسول ہے اس کا مرتبہ رسالت ہے۔اسی لیے قرآن میں رسول اور رسالت کا استعمال ایسے لفظوں یا افعال کے ساتھ ہوا ہے جو مادہ تبلیغ سے مشتق ہیں۔

اس مقام پر نبی و رسول اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتے بلکہ ایک رابطہ کی طرح ہوتے ہیں جو ایک بڑے مقام کی طرف سے ذمہ داریاں لے کر لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔بعض آیات نے پیغمبر کو ''منذر'' اور ''بشیر'' سے زیادہ قرار نہیں دیا۔ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (اعراف۔188)

یا ارشاد ہوتا ہے:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (مائدہ۔99)

یہ دونوں آیات اسی کیفیت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب اس طرح کا نبی و رسول اپنی زندگی میں امتحان کے مراحل سے گذر کر اپنے اندر موجود کمالات کو منصۂ شہود پر لاتا ہے تو پھر معاشرہ کی زمام اس کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

یہ پیغام وصول کرنے اور اسے آگے پہنچانے کے ساتھ ساتھ رہبری کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے، خود امر و نہی کرتا ہے تو اسے لوگوں کا امام کہا جاتا ہے۔حقیقت میں پیغام الٰہی کے زیر سایہ اسے صحیح قیادت و رہبری کا منصب میسر آتا ہے۔اس مقام پر فائز شخص کو امام کہتے ہیں۔

امامت سے مراد معاشرہ کا نظم و نسق سنبھالنا اور معاشرہ کی زمام کا اس کے ہاتھ میں ہونا ہے۔اس پر دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لیے اس منصب کے حصول کی درخواست کی تو اللہ نے اس کی اولاد کے بارے میں مثبت جواب دیا جو ظالم نہ ہوں۔دوسری آیات میں اولاد ابراہیمؑ کی تعریف ان تین اوصاف کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔اعطاء کتاب، حکمت اور ملک عظیم۔اس ملک عظیم سے مراد وہی امامت ہے جس کی درخواست حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لیے کی تھی۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰـىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

کیا وہ اللہ کے خاص بندوں سے اس فضل کی وجہ سے حسد کرتے ہیں جو انہیں اللہ نے عطا فرمایا ہے؟ پس ہم نے ابراہیمؑ کی آل کو کتاب، حکمت اور عظیم سلطنت عطا فرمائی۔(نساء۔54)

اس میں شک نہیں کہ ''الناس'' جن پر یہودی حسد کرتے تھے، سے مراد خود آنحضرتؐ کی ذات گرامی ہے۔جو لوگ پیغمبر کی پیروی کرتے ان پر حسد کا کیا جانا ایک عارضی امر ہے۔اسی طرح آل ابراہیمؑ کو اللہ نے جنہیں کتاب، حکمت اور عظیم ملک عطا فرمایا ہے، سے مراد حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے افراد ہیں، وہ نسل اسحاقؑ سے ہوں یا نسل اسمٰعیلؑ سے۔

کتاب و حکمت، نبوت و رسالت، کی علامت ہیں جب کہ ملک عظیم امامت کی نشانی ہے۔یہودیوں کی، جو آنحضرتؐ پر رشک کرتے تھے کہ انہیں کتاب و حکمت بھی عطا کی ہے اور جزیرۂ نمائے عرب میں انہوں نے حکومت کی بنیاد بھی رکھ دی ہے، قرآن نے ان کی مذمت کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم بلا وجہ حسد کر رہے ہو۔ہم نے ابراہیمؑ کی اولاد کو بھی تینوں چیزیں عطا فرمائیں۔

جب ہم اولادِ ابراہیمؑ کا جائزہ قرآنی حوالے سے لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت کم لوگ حاکمیت و فرمانروائی کے حامل

تھے جب کہ مقام نبوت و امامت پر ان میں سے بہت سے لوگ فائز ہوئے جن کی مثالیں یہ ہیں:

۱)۔حضرت یوسفؑ کو جب حکمرانی ملی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے اس طرح راز و نیاز کی:

قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡکِ وَ عَلَّمۡتَنِیۡ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ.........

پروردگارا! مجھے تو نے حکومت عطا فرمائی اور تعبیر خواب کا علم دیا......(یوسف۔101)

حقیقت میں تعبیر خواب کا علم ان کو نبوت عطا کرنے کی طرف اشارہ ہے اور قدرت سے عطا کرنا ان کی امامت و حکومت کی علامت ہے۔

۲)۔حضرت داؤدؑ کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡکَ وَ الۡحِکۡمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُ

اللہ نے اسے حکومت و حکمت عطا کی اور جو کچھ چاہا اس میں اسے سکھایا۔(بقرہ۔251)

۳)۔حضرت سلیمانؑ اللہ کے حضور اس طرح درخواست گذار ہیں:

وَهَبۡ لِیۡ مُلۡکًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

پروردگارا! مجھے وہ ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے شایان شان نہ ہو۔(ص۔35)

۴)۔قرآن مجید نے طالوت کی زندگی اور جالوت سے متعلق ان کی نبرد آزمائی کا تذکرہ فرمایا ہے۔اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ایک شخص کے پاس تھی جب کہ حکومت دوسرے کے پاس اور وہ دونوں اللہ کی طرف سے مبعوث کئے گئے تھے۔[1]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی رحلت کے بعد بنی اسرائیل کے بعض لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک سردار کا انتخاب کر دو تا کہ ہم اس کی زیر قیادت راہ خدا میں جہاد کریں۔اس سلسلے میں وحی نازل ہوئی:

وَ قَالَ لَهُمۡ نَبِیُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡهُ وَ لَمۡ یُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىهُ عَلَیۡکُمۡ وَ زَادَهٗ بَسۡطَةً فِی الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ ؕ وَ اللّٰهُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَهٗ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۷﴾

اللہ تعالیٰ نے تم پر حکمرانی کے لیے طالوت کو مقرر کیا ہے۔بنی اسرائیل نے کہا کہ وہ ہمارا حاکم کیسے بن سکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ حقدار ہیں۔اس کے پاس زیادہ دولت بھی نہیں ہے۔پیغمبر نے ان سے کہا کہ اس کا

[1] گذشتہ گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ دین سیاست سے جدا ہے۔

انتخاب تمہارے لیے اللہ نے کیا ہے، اسے زیادہ علم وجسمانی قوت عطا کی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا فرماتا ہے (اور اللہ کا احسان) وسیع ہے اور (وہ لوگوں کی صلاحیت سے) آگاہ ہے۔(بقرہ۔247)

قرآن مجید نے طالوت کو حاکم ومعاشرے کا سربراہ بتایا ہے کیونکہ حکمرانی کی سب سے بڑی شرط علم ودانش اور جسمانی قوت ہے، اسی لیےان دونوں شرائط کا تذکرہ بھی فرمادیا ہے۔[1]

۵)۔بنی اسرائیل کو جونعمتیں عطا کی گئی ہیں ان میں سے ایک ان کے درمیان حکمرانوں کا ہونا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا

اللہ نے تمہیں جونعمتیں عطا کیں ہیں ان کو یاد کرو، تم میں انبیاء مبعوث فرمائے اور زمین پر حکمران بنائے۔(مائدہ۔20)

ان سب کو حکمران کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی خاندان میں سے ایک شخص کسی عظیم مرتبے تک پہنچ جائے تو اس منصب کی نسبت پورے خاندان کی طرف دی جاتی ہے۔

مذکورہ گفتگو سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو نبوت کے بعد امامت سے نوازا تو انہوں نے اپنی اولاد کے لیے بھی اس عہدہ کی درخواست کی۔خطاب آیا کہ یہ عظیم منصب تیری اولاد میں سے ان لوگوں کے لیے ہے جو عادل ہوں گے۔

دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوسفؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ جیسے لوگ، جو ان کی اولاد میں سے تھے، انہیں مقام نبوت کے ساتھ ساتھ مقام امامت اور لوگوں کی رہبری کا کام بھی سونپا گیا۔

یہ دونوں باتیں سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو امامت اللہ نے اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمائی ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے بھی جس کی التجاء اپنی اولاد کے لیے کی ہے اس سے مراد وہی حکومت وحکمرانی ہے جو معاشرہ میں تمام حوالوں سے شریعت کا نفاذ کرسکتی ہے اور معاشرہ کو مطلوبہ کمال تک پہنچا سکتی ہے۔جب لفظ ملک یا حکمران یا فرمانروا زبان یا قلم پر آتا ہے تو جو لوگ موجودہ حکومتوں سے راضی نہیں ہوئے اور حکمرانی کو ہمیشہ تکبر کا دوسرا نام دیتے ہیں وہ امامت کی تفسیر حکمرانی کے ساتھ نہیں کرتے حالانکہ قوانین الٰہی کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاشرہ کی رہبری کا مقصد نبوت ورسالت کے اہداف کی تکمیل کرنا ہی ہوتا ہے۔

شرح این ہجران و این خون جگر
این زمان بگذار تا وقت دگر

یعنی ”اس ہجر اور خون دل کی تفصیل بتانے کے لیے کسی اور وقت کی ضرورت ہے“۔

---

[1] وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

(٦)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف مواقع پر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں اور التجاء کی ہیں یعنی پروردگار عالم کے حضور درخواستیں پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ دعائیں اللہ کے حضور دعا کرنے کا سلیقہ سکھلاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی سکھلاتی ہیں کہ انسان اپنی لامحدود خواہشوں میں سے اللہ کے حضور کس چیز کو طلب کرے اور پہلے کیا چیز مانگے۔

ہم یہاں ان آیات کا ترجمہ وتفسیر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کی ترجمان ہیں:

انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور التجاء کی کہ سرزمین مکہ کو امن کی جگہ بنادے تاکہ تیری توحید کے پرستار اطمینان خاطر سے خانہ کعبہ کا طواف اور عبادت کرسکیں۔ ان کے لیے اللہ سے رزق کی بھی درخواست کرتے ہیں۔ قرآن نے یہ دعا ان الفاظ میں ذکر فرمائی ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اور جب ابراہیمؑ نے کہا کہ پروردگارا! اس مقام کو امن کا شہر قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، پھلوں سے رزق عطا فرما۔ (بقرہ۔126)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿٣٥﴾

اور جب ابراہیمؑ نے کہا کہ پروردگارا! اس شہر کو امن کی جگہ قرار دے دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچالے۔ (ابراہیم۔35)

خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے وقت انہوں نے اللہ کے حضور اس طرح دعا کی:

پروردگارا! ہم سے یہ عمل قبول فرما، مجھے اور میری امت کو مسلمان بنا اور اپنی رحمت کے زیر سایہ لے لے نیز اپنی طرف سے ایک ایسا رسول بھیج دے جو ان کو اپنے نزدیک لیاقت وشائستگی کے کمال تک پہنچا دے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ إِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً

مُّسۡلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۲۹﴾

جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانہ (کعبہ) کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو کہہ رہے تھے کہ پروردگارا! ہمارے اس عمل کو قبول فرما، یقیناً تو سننے والا، جاننے والا ہے۔ پروردگارا! ہم کو اپنے سامنے تسلیم ہونے والوں میں سے قرار دے، ہماری ذریت میں سے فرمانبردار امت قرار دے، ہمیں عبادت کی راہیں دکھا اور ہماری طرف مہربانی کے ساتھ نظر کرم فرما بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔ پروردگارا! ان کے درمیان ایک ایسا پیغمبر مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق سنوارے۔ بے شک تو طاقت والا، حکمت والا ہے۔ (بقرہ۔127 تا 129)

حضرت ابراہیمؑ کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ایک بے آب وگیاہ سرزمین پر چھوڑ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ سے التجاء کرتے ہیں کہ انہیں اس جگہ پر عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور موحد لوگوں کے دلوں کو اس مقام کی طرف متوجہ فرمائے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

رَبَّنَاۤ اِنِّيۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

پروردگارا! میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب وگیاہ بیابان میں تیرے محترم گھر کے پاس چھوڑا ہے۔ خدایا! تاکہ نماز قائم کریں، پس بعض لوگوں کے دل ان کی طرف پھیر دے اور ان کو پھلوں سے رزق عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکرگذار ہوں۔ (ابراہیم۔37)

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اللہ کے لامحدود علم کا ذکر کرتے ہیں اور یہ کہ زمین وآسمان میں کوئی چیز اللہ سے مخفی نہیں ہے (اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انسان دعا وحاجت طلب نہ کرے)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، جو اللہ نے انہیں بڑھاپے میں عطا فرمائیں۔ پھر اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں اور ان کی اولاد کو نماز گذاروں میں قرار دے۔

وہ اس طرح مناجات کرتے ہیں:

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِيۡ وَمَا نُعۡلِنُ ؕ وَمَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ وَهَبَ لِىۡ عَلَى الۡكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجۡعَلۡنِىۡ مُقِيۡمَ الصَّلٰوةِ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

بارِالٰہا! ہم جو کچھ چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں تو اسے خوب جانتا ہے زمین اور آسمان میں کوئی چیز اللہ سے چھپی ہوئی نہیں۔ تعریف ہے اس پروردگار کے لیے جس نے بڑھاپہ میں مجھے اسمٰعیلؑ واسحاقؑ عطا فرمائے۔ میرا پروردگار بندوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ پروردگارا! مجھے اور میری اولاد کو بھی نماز قائم کرنے والوں میں سے قرار دے۔ پروردگارا! (میری) یہ دعا قبول فرما۔ (ابراہیم 38 تا 40)

آخر میں اپنے لیے اور اپنے ان والدین کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں جن کی زحمتوں کے اثر کے لیے ان کا وجود مرہون منت ہے۔ عرض کرتے ہیں:

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِىۡ وَلِـوَالِدَىَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾

پروردگارا! مجھے، میرے والدین اور مومنین کو قیامت کے دن بخش دے۔ (ابراہیم۔ 41)

چھٹے پیغمبر

(۷)۔ حضرت خلیل اللہ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السّلام [۱]

حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور ان انبیاء میں سے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کو رواج دینے والے تھے۔ قرآن مجید نے بارہ آیات میں ان کا نام بارہ مرتبہ ذکر فرمایا ہے۔ بہت سے انبیاء کے ناموں کے ساتھ ان کے نام کا ذکر ہونے سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ ان کے متعلق لفظ ''وحی'' اور ''نزول'' بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

ہم نے (وحی) نازل فرمائی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب پر۔ (بقرہ۔136) [۲]

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

اور ہم نے وحی فرمائی ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب پر۔ (نساء۔163)

حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیات سے متعلق جو آیات گذر چکی ہیں ان سے حضرت اسمٰعیلؑ کے اوصاف بھی معلوم ہو جاتے ہیں، مثلاً خانہ کعبہ کی تعمیر میں ان کی شراکت، ان کی بردباری اور راہِ الٰہی میں ان کا خلوص لیکن قرآن مجید نے سورۂ مریم (آیات 54، 55) میں حضرت اسمٰعیلؑ کا نام لیا ہے اور ان کی خصوصیات ذکر فرمائی ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

اور قرآن میں اسمٰعیلؑ کا ذکر کرو، وہ وعدہ وفا کرنے والا انسان تھا، رسول اور پیغمبر تھا، اپنے اہل بیت کو نماز زکوٰۃ کا

---

[۱] چونکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی زندگی کا دور ان کے والد بزرگوار حضرت خلیل اللہ کی زندگی کے ساتھ ملا ہوا ہے اور اپنے باپ کی زندگی میں حضرت اسمٰعیلؑ کا بہت بڑا کردار ہے۔ اس لیے ہم نے حضرت اسمٰعیلؑ کے تذکرہ کے لیے اس کتاب میں نئے باب کا اضافہ نہیں کیا اور حضرت ابراہیمؑ سے متعلق باب میں جو کچھ حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق ذکر کیا گیا ہے اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اس کے باوجود اسمٰعیلؑ نامی پیغمبر سے متعلق نازل ہونے والی آیات کے بارے میں ہم نے موجودہ باب کا اضافہ کیا ہے۔ شاید اس سے مراد وہی اسمٰعیلؑ ہوں جو حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے فرزند ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی اور اسمٰعیلؑ نامی پیغمبر ہوں۔

[۲] سورۂ آل عمران کی آیت 84 بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

حکم دیتا تھا اور اللہ اس سے راضی تھا۔ (مریم۔ 54، 55)

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس اسمٰعیلؑ سے مراد وہی ابراہیم خلیل اللہ کے فرزند اسمٰعیلؑ ہیں جن کی خصوصیات کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے یا اس سے مراد اسمٰعیلؑ بن حزقیل نامی ایک پیغمبر ہیں۔ یہاں دو احتمال ذکر کئے گئے ہیں اور ہر ایک کے لیے قرائن بھی موجود ہیں۔

ممکن ہے اس سے مراد وہی مشہور اسمٰعیلؑ ہوں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ ان کا نام گیارہ بار قرآن میں آیا ہے اور اس سے مراد وہی حضرت ابراہیمؑ کے فرزند ہیں۔ اگر ان دو آیات میں اس کے علاوہ کوئی اور اسمٰعیل مراد ہوتے تو یقیناً اس مشہور اسمٰعیل سے ان کے فرق کی طرف اشارہ کیا جاتا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد کوئی اور اسمٰعیلؑ ہوں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سورہ میں پہلے (آیات۔ 41 تا 50) حضرت ابراہیمؑ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد آیات (51 تا 53) میں حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ ہے پھر اس کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ سے متعلق آیات لائی گئی ہیں۔ اگر ان دو آیات میں اسمٰعیلؑ سے مراد حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے ہی ہوتے تو بہتر یہ ہوتا، ان کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد اور حضرت موسیٰؑ کی سرگذشت سے پہلے کیا جاتا۔

بہر حال یہ اسمٰعیلؑ نبی و رسول ہونے کے ساتھ ساتھ ان تین خصوصیات کے حامل بھی تھے:

۱۔ اگر کوئی وعدہ کرتے تو اپنے وعدے پر عمل کرتے، یہاں تک کہ روایات میں ہے کہ انہوں نے کسی سے وعدہ کیا تھا اور عرصہ دراز تک وہیں بیٹھے رہے۔

۲۔ اپنے گھر والوں کو نماز کی تاکید کرتے تھے۔

۳۔ انہیں زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیتے تھے۔

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں فرائض سابقہ شریعتوں میں بھی موجود تھے، اگرچہ اسلام میں ان کے طریقہ کار میں کسی قدر فرق ہے۔

آٹھویں پیغمبر

حضرت لوط علیہ السلام سرزمین اُردن پر

حضرت لوطؑ ان لوگوں میں سے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لائے تھے۔[1]

بابل سے حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت میں انہوں نے بھی ہجرت کی اور دونوں الگ الگ اپنے اپنے مقام پر چلے گئے۔ حضرت لوطؑ نے ''مؤتفکات''[2] نامی سرزمین کی طرف ہجرت کی جو سدوم، عمورہ، صوغر اور صبوعیم نامی چار شہروں پر مشتمل تھی۔

موجودہ سرزمین اُردن ''بحرالمیت'' نامی ایک دریا ہے۔ یہ جگہ پہلے خشک تھی۔ زلزلوں سے یہاں گڑھے پڑ گئے اور دریا کا پانی یہاں تک پہنچ گیا۔ قوم لوطؑ کے شہر اس سمندر کے کنارے ابھی دریافت ہوئے ہیں۔[3]

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں حضرت لوطؑ کا نام (27) بار آیا ہے۔[4]

ان کی شخصیت کے تعارف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ دوسرے انبیاء کی مانند حکمت و علم رکھتے تھے اور اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ہم نے لوطؑ کو حکمت و علم عطا کئے اور اسے اس سرزمین سے نجات دی جس میں برے کام کئے جاتے تھے وہ لوگ

---

[1] عنکبوت۔ 26

[2] مؤتفکات سے متعلق آیات سورۂ توبہ۔ 70، نجم۔ 53 اور حاقہ۔ 9، میں آئی ہیں، فرق یہ ہے کہ پہلی اور تیسری سورتوں میں یہ جمع کی شکل میں آئی ہے جب کہ سورۂ نجم میں یہ مفرد شکل میں ذکر ہوئی ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ سرزمین مؤتفکہ وہی سرزمین لوطؑ ہے۔ یہاں کے رہنے والے ہی قوم لوطؑ کے افراد ہیں۔

[3] قصص الانبیاء۔ عبدالوہاب۔ نجار، ص ۱۱۳

[4] انعام۔ ۶۸، اعراف۔ ۸۰، ہود۔ ۷۰، ۷۴، ۸۰، ۸۱، ۸۹، حجر۔ ۵۹، ۶۱۔ انبیاء۔ ۷۱، ۷۴، حج۔ ۴۳، شعراء۔ ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۷، نمل۔ ۵۶، ۵۶، عنکوت۔ ۲۶، ۲۸، ۳۱، ۳۴، صافات۔ ۱۳۳، ص۔ ۱۳، ق۔ ۱۳، قمر۔ ۳۳۔ ۳۴، تحریم۔ ۱۰

(برے کام کرنے والے) برے اور تباہ کار تھے ہم نے اسے اپنی رحمت میں داخل کرلیا۔ وہ صالحین میں سے ہے۔(انبیاء۔74، 75)[1]

اس پیغمبر کے بارے میں نازل ہونے والی آیات مندرجہ ذیل موضوعات پر گفتگو کرتی ہیں:

۱)۔تبلیغ کا تاکیدی پہلو

۲)۔ان کی قوم کا ردعمل

۳)۔عذاب کے فرشتوں کا نزول اور قوم لوطؑ سے ان کا ٹکراؤ

۴)۔علاقہ کی تطہیر اور اس کی کیفیت

۵)۔نزول عذاب کا وقت

۶)۔عذاب کی کیفیت

۷)۔نجات پانے والے

۸)۔نصیحت آموز باتیں اور نکات

اب ہم ہر موضوع سے متعلق آیات کے پیش نظر ان کی تشریح کرتے ہیں:

---

[1] سورۂ تحریم کی آیت ۱۰ میں حضرت لوطؑ کو حضرت نوحؑ کے ساتھ نیک بندوں میں سے قرار دیا گیا ہے۔"عبدین من عبادنا صالحین"

(۱) تبلیغ کا تاکیدی پہلو

بابل کا مرض بت پرستی تھا۔ اس کے برعکس اس سرزمین میں ہم جنسی پرستی جیسا عمل قبیح رائج تھا۔ لہٰذا حضرت لوطؑ کی تبلیغ کا زیادہ زور بھی اس عمل کی مذمت پر تھا۔

موضوع سے متعلق آیات

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۶۰﴾

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۶۱﴾

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۶۲﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۶۳﴾

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۴﴾

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۵﴾

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿۱۶۶﴾

(الشعراء۔ ۱۶۰ تا ۱۶۶)

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۸۰﴾

إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُونَ ﴿۸۱﴾ (اعراف۔ ۸۰، ۸۱)

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۲۸﴾

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۙ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ

اَلْمُنْکَرَ (عنکبوت۔۲۸،۲۹)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔قوم لوطؑ نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلایا۔

۲)۔جب ان کے بھائی لوطؑ نے ان سے کہا کہ تم گناہ سے پرہیز کیوں نہیں کرتے؟

۳)۔میں تمہارے لیے امین رسول ہوں۔

۴)۔اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے پرہیز کرو اور میری پیروی کرو۔

۵)۔میں تمہاری رہنمائی کرنے پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔میرا اجر تو عالمین کے پالنے والے کی طرف سے ہے۔

۶)۔تم انسانوں میں مردوں کے پاس ہی جاتے ہو۔

۷)۔اور جو بیویاں اللہ نے تمہارے لیے پیدا فرمائی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو۔تم حد سے گذر جانے والی قوم ہو۔

۸)۔لوطؑ کو یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسا قبیح کام کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی انسان نے نہیں کیا۔

۹)۔تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور عورتوں کو چھوڑے ہوئے ہو؟تم حد سے گذرنے والی قوم ہو۔

۱۰)۔لوطؑ کو یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔

۱۱)۔تم مردوں کی طرف گرتے ہو، رہزنی کرتے ہو اور تم لوگ اپنی محفلوں میں قبیح عمل کرتے ہو۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

دوسرے انبیاء کے برعکس حضرت لوطؑ ایسی قوم میں مبعوث ہوئے جو بڑے قبیح اعمال، انجام دیتی تھی ،جنس مخالف سے تعلقات قائم کرنے کے بجائے وہ لوگ ہم جنس بازی کا شکار تھے۔یہ خاص بیماری ان میں سرایت کر چکی تھی۔بعض تفاسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان کے علاقہ سے گذرتے تھے یہ انہیں پکڑ لیتے تھے اور ان کے ساتھ یہ قبیح فعل کرتے تھے۔[1]

---

[1] مجمع البیان، ج۴ ص۲۸۰

لہٰذا طبیعی طور پر حضرت لوطؑ کی تبلیغ کا محور بھی یہی ہوگا۔ جب کہ دوسرے انبیاء کی تبلیغ کا محور شرک و بت پرستی کی مخالفت تھا۔ حضرت لوطؑ معاشرہ کو لواط جیسے قبیح فعل سے پاک کرنے پر متمرکز تھے۔ یہ بات ان آیات میں واضح طور پر نمایاں ہے:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطِ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿١٦٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٦١﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٦٢﴾ فَٱتَّقُوا ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٦٣﴾ وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٦٤﴾ أَتَأْتُونَ ٱلذُّكْرَانَ مِنَ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُم مِّنْ أَزْوَٰجِكُم ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿١٦٦﴾

قوم لوطؑ نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلایا، جب ان کے بھائی لوطؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم گناہ سے پرہیز کیوں نہیں کرتے؟ میں تمہارے لیے امین رسول ہوں۔ اللہ کی مخالفت سے بچو اور میری پیروی کرو، میں تمہاری راہنمائی کرنے پر تم سے اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت تو عالمین کے رب کے پاس ہے۔ تم انسانوں میں مردوں کے پاس ہی جاتے ہو جب کہ اللہ نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں، انہیں چھوڑ دیتے ہو تم حد سے گذر جانے والی قوم ہو۔ (شعراء۔ 160 تا 166)

ان آیات میں حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو حد سے گذر جانے والی قوم قرار دیا ہے جو قانون خلقت کو پامال کر کے بیویوں کے ساتھ ہمبستری کرنے کے بجائے مردوں کے پیچھے جاتی تھی۔ یہ بات خلقت کے قوانین سے قطعی تجاوز ہے۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے: بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ

اور کبھی ارشاد ہوتا ہے: بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ

دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ "مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ" کے جملہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس جنسی انحراف کی بنیاد قوم لوطؑ نے رکھی تھی۔

"وتقطعون السبیل" کی آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم جنسی بازی کی طرف آنے اور عورتوں سے دوری اختیار کرنے کی بنیاد پر نسل منقطع کر رہے ہو۔ [1]

جب کوئی عورتوں کے پاس نہیں جائے گا تو اولاد کا سلسلہ بھی آگے نہیں چلے گا۔ اس قبیح فعل میں وہ اتنے غرق ہو چکے تھے کہ اپنی محفلوں میں بھی یہی بد فعل کرتے تھے "وتاتون فی نادیکم المنکر" کا جملہ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اگرچہ اس کی تفسیر میں اور احتمال بھی

---

[1] مجمع البیان، ج ۴ ص ۲۸۰

ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے مندرجہ ذیل جملے اختیار کئے۔

۱۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ

۲۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ

۳۔ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ

۴۔ مَاسَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ

۵۔ وَتَأْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ

ان آیات سے مجموعی طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ جنسی انحراف میں ان کا یہ عالم تھا کہ وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پیچھے جاتے، یہ عمل ایک متعدی مرض کی طرح سوائے حضرت لوطؑ کے ماننے والوں کے، تمام لوگوں میں سرایت کر چکا تھا۔

(۲)۔قوم لوطؑ کا ردِ عمل

موضوع سے متعلق آیات

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ (اعراف۔۸۲)

(اعراف۔۸۲،سورۂ نمل۔۵۲۔فرق یہ ہے''وما کان'' کی بجائے''فما کان'' آیا ہے)

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾

قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ (الشعراء۔۱۶۸،۱۶۷)

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ (عنکبوت۔۳۰،۲۹)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔لوطؑ کی تبلیغ کو جواب اس کی قوم نے صرف یہ دیا کہ لوطؑ کو اپنے شہر سے نکال دو کیونکہ وہ طاہر و پاک لوگ بنتے ہیں۔

۲)۔انہوں نے کہا کہ اے لوطؑ! اگر تم اپنی تبلیغ سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں شہر سے باہر نکال دیں گے۔

۳)۔انہوں نے کہا کہ میں تمہارے کام کے خلاف ہوں۔

۴)۔(طنزیہ انداز میں) ان کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ۔

۵)۔لوطؑ نے دعا کی اور کہا کہ پروردگارا! مجھے مفسدین پر کامیابی عطا فرما۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

یہاں تک ہم نے فطرت سے متصادم قوم لوطؑ کے عمل اور حضرت لوطؑ کی تبلیغ کے اساسی نکتہ سے واقفیت حاصل کی۔ اب اس کے خلاف ان کی قوم کے ردِعمل کا جائزہ لیتے ہیں۔ گذشتہ انبیاء کی اقوام کی طرح قوم لوطؑ نے بھی مخالفت، دھمکی اور نزولِ عذاب کے تقاضے کے ذریعہ اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔ وہ برائی اور گمراہی میں اس قدر غرق ہو چکی تھی کہ حضرت لوطؑ کے خاندان کے علاوہ کسی نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا۔

حضرت لوطؑ کے واقعات میں جتنی آیات آئی ہیں ان میں ان کی اولاد کے علاوہ کسی کے مومن ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔ لہٰذا قرآن نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے: ''فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ''

یہ بات حضرت لوطؑ کی تبلیغ کے مقابلہ میں قوم کے لاتعلق ہونے کی علامت ہے۔ اقوامِ سابقہ کی طرح انہوں نے بھی صرف یہی ردِ عمل ظاہر کیا کہ انہیں اپنی سرزمین سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

ان کی قوم کا جواب یہی تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ لوطؑ اور اس کی اولاد کو شہر سے باہر نکال دو کیونکہ یہ پاک اور طاہر بنتے ہیں۔ (اعراف۔82)

''اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ'' کے جملہ میں ایک اہم نکتہ ہے، وہ یہ کہ وہ لوگ حضرت لوطؑ کے پیروکاروں کی فضیلت کو عیب سمجھتے تھے۔ خاندان لوطؑ کا اس قبیح عمل سے دور رہنا گویا ان کی ایک کمزوری تھی۔ اس لیے انہوں نے کہا باہر نکال دو کیونکہ یہ گناہ کی طرف نہیں آتے۔ گویا ان کی نظر میں ان کی بدفعلی نیکی کا روپ اختیار کر چکی ہے۔

کبھی انسان گناہ میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ اس کو برائی اچھائی لگتی اور اچھائی برائی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن اس طرح فرماتا ہے: ''وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ'' (نمل۔24)

آخری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ نے انہیں اللہ کے عذاب کی دھمکی دی تھی لیکن گذشتہ قوموں کی طرح انہوں نے بھی اللہ کے پیغمبر کی وعید پر کان نہ دھرے اور اس سے کہا:

ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

اگر تم سچ کہتے ہو تو ہم پر اللہ کا عذاب نازل کر دو۔ (عنکبوت۔29)

پیغمبر ہمیشہ اپنی قوم کو سیدھے راستے کی طرف بلاتے تھے۔ لیکن جب ان کی ہدایت پانے سے مایوس ہو جاتے اور یہ جان لیتے کہ ان سرطانی غداروں کا کام صرف معاشروں کو نابود کرنا ہی ہے تو پھر وہ اللہ کے حضور ان پر اپنی کامیابی کی دعا مانگتے اور عذاب نازل کرنے کی

درخواست کرتے۔ حضرت لوطؑ سے متعلق آیات میں یہ حقیقت نظر آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾

پروردگارا! ان مفسدوں کے خلاف میری مدد فرما۔ (عنکبوت۔ 30)

(۳)۔عذاب کے فرشتوں کا آنا اور گنہگاروں سے ان کا ٹکراؤ

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ٹھہری کہ یہ گنہگار قوم صفحہ ہستی سے نابود ہو جائے اور ان کی نسل ختم ہو جائے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان کو بھی نجات دلائی جائے اور یہ کام عذاب کے فرشتے بھیجنے کے ذریعے ہو جو انہیں سنگسار کریں۔فرشتوں نے آتے ہوئے راستے میں پہلے حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کی اور یہ ماجرا انہیں سنا کر کہا کہ ہم لوطؑ کی قوم کو برباد کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔انہوں نے جواب میں حضرت لوطؑ کا ذکر کیا کہ قوم کے درمیان وہ ایک نیک و صالح شخص ہیں۔فرشتوں نے بتایا کہ یہ بات وہ جانتے ہیں کہ حضرت لوطؑ وہیں ہیں اور کہا کہ ہم انہیں بچا لیں گے۔[1]

اس کے بعد وہ حضرت ابراہیمؑ کے گھر سے چلے اور خوبصورت انسانوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کی سرزمین پر آئے اور سیدھے ان کے گھر گئے۔قرآن مجید نے یہ داستان اس طرح بیان فرمائی ہے:

موضوع سے متعلق آیات

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا [2]
وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ﴿۷۷﴾
وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِؕ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِؕ قَالَ
يٰقَوۡمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡؕ اَلَيۡسَ
مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ ﴿۷۸﴾
قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِىۡ بَنٰتِكَ مِنۡ حَقٍّ‌ۚ وَاِنَّكَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِيۡدُ ﴿۷۹﴾
قَالَ لَوۡ اَنَّ لِىۡ بِكُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِىۡۤ اِلٰى رُكۡنٍ شَدِيۡدٍ ﴿۸۰﴾ (ہود۔۷۷ تا ۸۰)
فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ اۨلۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۶۱﴾

---

[1] ''قال ان فیہا لوطاً قالوا نحن اعلم بمن فیہا التجینۃ واھلہ الا امراتہ کانت من الغبرین ''(عنکبوت۔۳۲)

[2] اونٹ کے دو قدموں کے درمیان فاصلے کو عربی زبان میں ''ذرع'' کہتے ہیں۔جب اونٹ پر زیادہ وزن ہو تو اس کے قدموں کا فاصلہ کم ہو جاتا ہے اور عرب کہتے ہیں: ضاق ذرعہ۔اس کے بعد یہ جملہ مناسبت کے لحاظ سے پریشانی اور دلی گھبراہٹ کے لیے استعمال ہونے لگا۔

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾

وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ (الحجر۔۶۱ تا ۶۴)

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾ (الحجر۔۶۷ تا ۷۱)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوطؑ کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے رنجیدہ اور تنگدل ہوئے اور کہا: ''آج سخت مصیبت کا دن ہے''۔

۲)۔اور ان کی قوم تیزی سے ان کے گھر کی طرف آئی۔وہ لوگ اس سے پہلے بھی بڑے کام کرتے تھے۔۔لوطؑ نے (مہمانوں کے ساتھ برائی کو روکنے کے لیے) ان سے کہا: ''یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ ترہیں (ان سے شادی کرلو)، اللہ کی مخالفت سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو۔کیا تمہارے درمیان کوئی بھی سمجھدار آدمی نہیں ہے؟

۳)۔انہوں نے جواب دیا: ''تم جانتے ہو ہمیں تمہاری لڑکیوں سے کوئی کام نہیں ہے اور (یہ بھی) جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔

۴)۔لوطؑ نے کہا: ''کاش مجھ میں تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی، یا میرا مضبوط سہارا اور پشت پناہ ہوتا، (جس کی مدد سے میں تمہارے ساتھ لڑتا)!''

۵)۔جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوطؑ کے گھر میں داخل ہوئے۔

۶)۔لوطؑ نے ان سے کہا: ’’تم اجنبی ہو!‘‘

۷)۔آنے والوں نے کہا: ’’ہم عذاب لے کر آئے ہیں جس کے بارے میں تمہاری قوم شک وتردید کا شکار ہے‘‘۔

۸)۔’’ہم قطعی عذاب کے ساتھ اس طرف آئے ہیں اور اس بات میں سچے ہیں‘‘۔

۹)۔شہر کے لوگ ایک دوسرے کو خوش خبری سناتے ہوئے لوطؑ کے گھر کی طرف آئے۔

۱۰)۔لوطؑ نے ان سے کہا: ’’یہ میرے مہمان ہیں اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہ کرو‘‘۔

۱۱)۔’’خدا کے عذاب سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو‘‘۔

۱۲)۔انہوں نے اس سے کہا: ’’ہم نے تمہیں کہا تھا کہ مہمان نہ ٹھہرانا‘‘۔

۱۳)۔لوطؑ نے کہا: ’’یہ میری بیٹیاں ہیں۔اگر چاہو (تو ان سے شادی کرلو)‘‘۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

ان آیات میں گفتگو کا محور تین چیزیں ہیں:

فرشتوں کے خوبصورت نوجوانوں کی شکل میں آنے پر حضرت لوطؑ کا ردعمل۔

قوم لوطؑ کا مہمانوں کی موجودگی سے مطلع ہونا اور حضرت لوطؑ پر ان کا دباؤ ڈالنا۔

حضرت لوطؑ کی اپنی قوم کی نصیحت۔

پہلی بات کے متعلق ہم بتاتے چلیں کہ انبیاء کا مقام یہ ہے کہ وہ مہمان کا استقبال خندہ پیشانی سے کریں۔جب کہ حضرت لوطؑ نے ان مہمانوں کا، جنہیں وہ انسان تصور کررہے تھے، خندہ روئی سے استقبال نہ کیا۔قرآن مجید نے اس کا تذکرہ ایسے جملوں میں کیا ہے جو میز بان کی پریشانی اور ناراضگی ظاہر کررہے ہیں۔

۱۔’’سِیْٓءَ بِہِمْ ‘‘۔۔۔۔وہ رنجیدہ ہوگئے۔

۲۔’’وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا‘‘۔۔۔تنگدل ہوگئے۔

۳۔’’هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ‘‘۔۔۔۔یہ مصیبت کا دن ہے۔

۴۔’’اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ‘‘۔۔۔۔وہ سب اجنبی ہیں۔

دوسری بات کے متعلق ہم بتاتے چلیں کہ اس طرح کے مہمانوں کی آمد کی خبر کا یہ اثر یہ ہوا کہ برے لوگوں نے اس خانہ عصمت وتقدس

پر دھاوا بول دیا اور تقاضا کیا کہ مہمان ان کے حوالے کر دیئے جائیں۔قرآن مجید نے اس خبر کے پھیلنے کا ذکر اس طرح بیان فرمایا ہے:

۱۔وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ

اس کی قوم تیزی سے اس کے گھر کی طرف آئی۔وہ لوگ اس سے پہلے بھی برے کام کیا کرتے تھے۔(ہود۔78)

۲۔وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ

شہر کے لوگ ایک دوسرے کو خوشخبری سناتے ہوئے لوطؑ کے گھر کی طرف آئے۔(الحجر۔67)

تیسری بات سے متعلق حضرت لوطؑ صرف پند و نصیحت کے علاوہ کچھ نہ کر سکتے تھے پس انہوں نے کہا:''مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہ کرو''۔اگر تم جنسی لذت ہی کی تکمیل چاہتے ہو تو میری باعفت بیٹیاں حاضر ہیں، ان سے شادی کر لو۔کیا تمہارے درمیان کوئی بھی سمجھدار آدمی نہیں ہے؟ اے کاش مجھ میں تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا یا پشت پناہ ہوتا''۔لیکن افسوس کہ انہوں نے بڑی بے شرمی سے کہا:''لڑکیاں ہمارے کام کی نہیں ہیں''ہم تو کچھ اور چاہتے ہیں''۔اس سلسلہ کی آیات اس طرح ہیں:

۱۔قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ

لوطؑ نے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں، اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رسوانہ کرو۔کیا تمہارے درمیان کوئی بھی سمجھدار آدمی نہیں ہے؟(ہود۔78)

۲۔قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ

اے کاش! مجھ میں اتنی قوت ہوتی یا میرا مضبوط سہارا و پشت پناہ ہوتا۔(ہود۔80)

۳۔اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

یہ میرے مہمان ہیں۔مجھے ان کے سامنے رسوانہ کرو۔(الحجر۔68)

اس طرح کی نصیحتوں اور درخواستوں کے جواب میں قوم لوطؑ نے کہا:

تم جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی مطلب نہیں ہے اور یہ بھی جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔(ہود۔79)

کبھی ان پر اعتراض کرتے کہ تم نے یہ مہمان اپنے پاس کیوں ٹھہرائے ہیں اور کہتے:

اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ

اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ کے جملہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے حضرت لوطؑ کو ہر قسم کی میزبانی اور مہمانوں کو اپنے پاس

ٹھہرانے سے روک رکھا تھا۔ جب انہوں نے اس مرتبہ یہ مہمان اپنے پاس ٹھہرائے تو انہوں نے اعتراض کیا اور کہا: ''کیا ہم نے تمہیں مہمان ٹھہرانے سے روکا نہیں تھا؟'' اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے حضرت لوطؑ کو ایسا کرنے سے منع کیوں کیا تھا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ یہ کارِ بد مسافروں کے ساتھ بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ کبھی حضرت لوطؑ کے گھر پناہ لے لیتے تا کہ ان کے ساتھ زیادتی نہ ہو کیونکہ حضرت لوطؑ کا ہر حال ایک احترام و مقام تھا۔ اس لیے انہوں نے حضرت لوطؑ کو مہمان ٹھہرانے سے روک رکھا تھا تا کہ وہ ان کے برے کام کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

اس مرتبہ جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت لوطؑ نے اپنے گھر مہمان ٹھہرا لیے ہیں تو اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگے: اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الصّٰلِحِيۡنَ

لفظ ''العٰلمین'' کے سلسلہ میں مفسرین نے مختلف اقوال ذکر کئے ہیں:

سورۂ حجر اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ کی آیت اور سورۂ اعراف میں آیت ۸۰ اور عنکبوت میں آیت ۲۸، اس بات پر گواہ ہیں کہ قرآن مجید کی آیات میں ''العٰلمین'' سے مراد صرف انسان ہیں۔ لہٰذا ان دونوں آیات میں بھی اس سے مراد انسان ہی ہیں نہ کہ جن اور فرشتے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے عزائم کی تکمیل کیوں نہ کر پائے؟ سورۂ قمر میں اس کی وجہ بیان کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ رَاوَدُوۡهُ عَنۡ ضَيۡفِهٖ فَطَمَسۡنَاۤ اَعۡيُنَهُمۡ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِىۡ وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾

اس سے انہوں نے تقاضا کیا، مہمان ان کے حوالے کر دیں۔ لیکن ہم نے انہیں اندھا کر دیا اور کہا کہ ہمارے عذاب اور سزا کا مزہ چکھو۔ (قمر۔ 37)

ان اندھے تباہ کاروں نے حضرت لوطؑ کا گھر چھوڑ دیا اور اپنی قوم کے پاس گئے۔ حق تو یہ تھا کہ اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتیں اور دوسروں کو بھی یہ بیدار کرتے، لیکن وہ بدی میں اتنا غرق ہو چکے تھے کہ ان کے اندھے پن نے بھی کسی کو بیدار اور بینا نہ کیا۔

پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ قوم لوطؑ کبھی اپنے پیغمبر کے وعدہ کا مذاق اڑاتی اور اس سے کہتی:

ائۡتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۲۹﴾

اگر تم سچ کہتے ہو تو اللہ کے عذاب کو لے آؤ۔ (عنکبوت۔ 29)

یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو شک و تردید کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اللہ کی طرف سے آنے والے فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے کہا: ہم وہ عذاب لے کر آئے ہیں جن کے بارے میں وہ شک و تردید کا شکار تھے۔

بَلۡ جِئۡنٰكَ بِمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ

بعد والی آیت میں اس عذاب کا نام انہوں نے عذاب حق رکھا ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَاَتَيۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۶۴﴾ (الحجر۔ 64)

حق سے مراد وہ عذاب ہے جو قابل واپسی ہو۔ چنانچہ ایک دوسری آیات میں جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قوم لوط پر نازل ہونے والے عذاب کا تذکرہ کیا تو اس طرح کہا ہے:

اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ

تیرے پروردگار کا حکم آ گیا ہے اور ان پر نا قابل واپسی عذاب نازل ہوگا اور سب اس کا شکار بنیں گے۔

سورۂ قمر میں اسے عذاب مستقر قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

عَذَابٌ مُّسۡتَقِرٌّ (قمر-38)

(۴)۔علاقہ کی تطہیر یا نزول عذاب

اب اس علاقے کو ان منحرف بدکاروں کے نجس وجود سے پاک ہوجانے کا وقت آن پہنچا تھا، تاہم پاک لوگوں کا عذاب سے محفوظ رہنا بھی ضروری تھا۔ دوسرے لفظوں میں خشک وتر کو اکٹھے زیر عذاب نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس لیے انسان کی شکل میں آنے والے ان فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو حکم دیا کہ وہ اپنے خاندان کو لے کر جلدی سے جلدی اس شہر سے نکل جائیں اور اس علاقہ میں چلے جائیں جس کا حکم انہیں وحی میں دے دیا گیا تھا، کیونکہ شہر میں رہنے والے باقی لوگوں کو نابود ہوجانا تھا، حیرت ناک بات یہ ہے کہ ان کی بیوی بھی ہلاک ہوجانے والوں میں سے تھی۔

موضوع سے متعلق آیات

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝۸۱ (ھود۔۸۱)

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ۝۶۵

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ۝۶۶

(الحجر۔۶۵،۶۶)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔مہمانوں نے کہا: ”اے لوطؑ! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، وہ تجھ تک ہرگز نہیں پہنچ پائیں گے۔ تو اپنے خاندان سمیت رات کو اس شہر سے نکل جا اور تم میں سے کوئی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھے۔ مگر تمہاری بیوی یقیناً اسی عذاب کی لپیٹ میں آئے گی۔ ان کے متعلق وعدہ کا وقت صبح کا ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے؟“

۲)۔رات کے وقت تم اپنے گھروالوں سمیت اس شہر سے نکل جاؤ، تم خود ان کے پیچھے پیچھے چلو، تم میں سے کوئی مڑ

کر نہ دیکھے اور جہاں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہاں چلے جاؤ۔

۳)۔اور ہم نے لوطؑ کو مطلع کیا کہ صبح ہوتے ہوئے ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت لوطؑ کے اپنے قوم سے مجادلہ اور گفتگو کو مہمانوں نے بھی سن لیا۔انہوں نے حضرت لوطؑ سے کہا:

اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ يَّصِلُوۡۤا اِلَيۡكَ

ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔وہ تم تک ہرگز نہیں پہنچ پائیں گے۔(ہود۔81)

بلکہ ہم تک بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔انہوں نے یہ کیوں کہا کہ وہ تجھ تک نہیں پہنچ پائیں گے حالانکہ انہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔شاید اس میں نکتہ یہ ہو کہ مہمانوں تک پہنچ جانا ایک لحاظ سے حضرت لوطؑ کی توہین تھی۔لہٰذا انہوں نے میزبان کو یہ یقین دلایا کہ تم تک ایسی کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی۔اس نوید سے یہ بتلانا بھی مقصود تھا کہ وہ ان تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے کہا: آدھی رات کو اپنے خاندان کو ساتھ لے کر اس شہر سے باہر نکل جاؤ۔یہ اضافہ بھی کیا:''وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ''یعنی''تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے''سوال یہ ہے کہ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنے میں کیا نکتہ ہے؟ کیا یہ بھی اللہ کے احکام میں ایک حکم تھا یا مقصد یہ تھا کہ ان میں سے کوئی اپنے مال ومتاع کے پیچھے نہ جائے، یا سب شہر سے باہر آجائیں اور کوئی پیچھے نہ رہے۔یہاں علامہ طباطبائی نے ایک احتمال ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ''اَلَيۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِيۡبٍ''کا جملہ''وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ''کا مطلب بیان کرتا ہے۔مراد یہ ہے کہ جلدی اور سستی نہ کرو کیونکہ نزول عذاب کا وقت قریب ہے، ادھر، ادھر توجہ کرنے سے سفر کا سلسلہ رک جائے گا۔

''وَّامۡضُوۡا حَيۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ''کے جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ اور ان کے گھر والوں کا ٹھکانہ معین ہو چکا تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس سرزمین سے اس سرزمین شام کی طرف روانہ ہو جائیں۔

آیت میں''الا امراتك''کا استثنیٰ آیا ہے۔اس سے پہلے دو جملے آئے ہیں، ایک''فاسر باهلك''اور دوسرا''وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ''۔مطالب کا تقاضا یہ ہے کہ یہ بات پہلے جملہ سے الگ ہے۔یعنی حضرت لوطؑ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام لوگوں کو شہر سے باہر نکال لے جائیں سوائے اپنی بیوی کے۔اس استثنیٰ کو دوسرے جملہ سے جوڑنا بہت بعید ہے کیونکہ دوسرا جملہ خبریہ نہیں ہے بلکہ توجہ نہ کرنے کا حکم دے رہا ہے۔اس بات پر دوسرا شاہد کہ استثنیٰ پہلے جملے سے خبریہ نہیں ہے، یہ کہ سورۂ عنکبوت میں یہی استثناء''انا منجوك واهلك''کے جملہ کے بعد آیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا مُنَجُّوۡكَ وَاَهۡلَكَ اِلَّا امۡرَاَتَكَ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ

یہاں غابرین سے مراد عذاب میں باقی رہ جانے والے ہیں۔

(۵)۔نزول عذاب کا وقت

نزول عذاب کے وقت سے متعلق یہ آیات وارد ہوتی ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

اِنَّ مَوۡعِدَهُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ ﴿۸۱﴾ (ہود۔۸۱)

وَقَضَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِیۡنَ ﴿۶۶﴾ (الحجر۔۶۶)

وَلَقَدۡ صَبَّحَهُمۡ بُكۡرَةً عَذَابٌ مُّسۡتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ۚ (قمر۔۳۸)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ان کے وعدہ کا وقت صبح کا ہے۔کیا صبح قریب نہیں ہے؟

۲)۔ہم نے اسے مطلع کیا کہ صبح کو ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

۳)۔صبح ہوتے ان پر عذاب نازل ہو گیا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

یہ تینوں آیات بتا رہی ہیں کہ نزول عذاب کا وقت صبح کا تھا،لیکن سورۂ حجر میں ارشاد ہوتا ہے:''فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّیۡحَةُ مُشۡرِقِیۡنَ'' (حجر۔73) سورج طلوع ہوتے ہی انہیں آسمانی چنگھاڑ نے آلیا۔لیکن اس سے مراد طلوعِ آفتاب نہیں ہے کیونکہ سورۂ قمر میں لفظ 'بکرہ' آیا ہے جو صبح کے معنی میں ہے۔اس سے مراد طلوع آفتاب سے پہلے سورج کی شعاعوں سے پھوٹنے والی روشنی ہے۔

عذاب کی کیفیت

موضوع سے متعلق آیات

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ط فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾
(اعراف۔ ۸۴)

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ (الشعراء۔ ۱۷۳)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ط وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ (ہود۔ ۸۲، ۸۳)

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ (الحجر۔ ۷۴)

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ (الذاریات۔ ۳۳، ۳۴)

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا (قمر۔ ۳۴)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (ہود۔ ۸۲)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ (الحجر۔ ۷۳، ۷۴)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ (الحجر۔ ۷۵)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ (الحجر۔ ۷۷)

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ﴿٧٦﴾ (الحجر۔۷۶)

وَاِنَّكُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿١٣٧﴾

وَبِالَّيۡلِ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿١٣٨﴾ (الصافات۔۱۳۷،۱۳۸)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ہم نے ان پر بارش برسائی، دیکھو! گنہگاروں کا انجام کیا ہوا؟

۲)۔ہم نے ان پر بارش برسائی، جن کو ڈرایا گیا تھا ان پر یہ کیسا برا مینہ برسا!

۳)۔ہم نے ان پر مٹی بھرے پتھروں کی بارش کی۔

۴)۔ان پتھروں پر تیرے پروردگار کی طرف سے نشان لگے ہوئے تھے اور ایسی سزا ظالموں سے کچھ دور نہیں ہوتی۔

۵)۔ہم نے ان پر مٹی بھرے پتھروں کی بارش کی۔

۶)۔تا کہ ان پر مٹی کے پتھر برسائیں۔

۷)۔یہ پتھر پروردگار کی طرف سے حد سے نکل جانے والوں کے لیے نشان کئے ہوئے تھے۔

۸)۔پتھروں کا طوفان ہم نے ان پر برسایا۔

۹)۔جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے کا حصہ بنا دیا۔

۱۰)۔پس انہیں سورج نکلتے ہی ایک چیخ نے آن پکڑا۔

۱۱)۔پھر ہم نے اس جگہ کو اوپر نیچے پلٹ دیا اور ہم نے ان لوگوں پر مٹی بھرے پتھر برسائے۔

۱۲)۔اس عذاب میں سمجھداروں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۱۳)۔حجر کا شہر مسافروں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۱۴)۔حجر کا شہر مسافروں کے راستے میں ہے اور اب بھی اس کے آثار باقی ہیں۔

۱۵)۔تم صبح و شام ان کی سرزمین سے گذرتے ہو۔

۱۶)۔رات کے وقت تم (اس بارے میں) سوچتے کیوں نہیں ہو؟

آیات کی موضوعاتی تفسیر

قوم لوطؑ کی ہلاکت متعدد عوامل کے ذریعے ہوئی جو یہ ہیں:

۱)۔پتھروں کی بارش

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ ؕ فَانْظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ﴿۸۴﴾

ہم نے ان پر بارش برسائی۔ دیکھو! گنہگاروں کا انجام کیا ہوا۔(اعراف۔84)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ (شعراء۔173)

دوسری آیات میں اس بارش کی حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ‌ ؕ وَمَا هِىَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ﴿۸۳﴾

ہم نے ان پر مٹی بھرے پتھروں کی بارش کی۔ وہ پتھر جن پر تیرے پروردگار کی طرف سے نشان لگے ہوئے تھے اور وہ سزا ظالموں سے دور نہیں۔(ہود۔82،83)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ﴿۷۴﴾ (حجر۔74)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

لِنُرۡسِلَ عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ طِيۡنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ لِلۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۳۴﴾

ہم نے ان لوگوں پر مٹی کے پتھر برسائے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے حد سے نکل جانے والوں کے لیے نشان کئے ہوئے تھے۔(ذاریات۔33،34)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا

ہم نے ان پر پتھروں کا طوفان برسا دیا۔ (قمر۔34)

۲)۔شدید زلزلہ

ایسا زلزلہ جس نے ان کی سرزمین کو الٹ کر رکھ دیا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا

جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے ان کو الٹ کر رکھ دیا۔ (ہود۔82)

۳)۔گذشتہ دونوں عذابوں کے ساتھ آسمانی چنگھاڑ

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّیۡحَةُ مُشۡرِقِیۡنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلۡنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ﴿۷۴﴾

انہیں سورج نکلتے ہی ایک چیخ نے آن پکڑا۔ پھر ہم نے اس جگہ کو اوپر نیچے پلٹ دیا اور ہم نے ان لوگوں پر مٹی بھرے پتھر برسائے۔ (حجر۔73،74)

بعض آیات میں لفظ ''رجزًا''[۱]

آیا ہے جو عذاب کے معنی میں ہے۔ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قوم لوطؑ کی ہلاکت میں دو طرح کے لوگوں کے لیے واضح نشانی موجود ہے۔

الف)۔سمجھدار اور اہل فراست کے لیے جو بھی ظواہر دیکھ کر حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ﴿۷۵﴾ (حجر۔75)

اس داستان میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور سامان عبرت بھی۔

ب)۔مومنین کے لیے ''اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ'' (حجر۔77)

شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''متوسم'' سے مراد ہی مومنین ہیں اور حقیقت میں سچے مومن وہی ہوتے ہیں جو علامتوں کے آثار سے صاحبان آثار تک پہنچ جاتے ہیں۔ گویا ایمان اور فراست کے درمیان ایک نزدیکی تعلق ہے۔ سورۂ عنکبوت میں اس داستان کو عقلمندوں کے لیے

---

[۱] ''انامنزلون علی اھل ھذہ القریة رجزًا من السماء بما کانو یفسقون'' (عنکبوت۔۳۴)۔یعنی اس آبادی کے باشندوں پر اطاعت سے نکل جانے کی وجہ سے ہم آسمان سے عذاب نازل کرتے ہیں۔

عبرت کا سامان قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (عنکبوت۔35)

ان کی ویرانیوں سے ہم نے عقلمندوں کے لیے واضح نشانیاں چھوڑی ہیں۔ عقلمند لوگ وہی ''متوسمین'' ہیں۔

قوم لوطؑ کے آثار سے عبرت پکڑنے کے لیے اللہ نے یاددہانی کرائی ہے کہ ان کے کھنڈرات ابھی تک تمہارے راستے میں موجود ہیں، تم ان ویرانیوں کو دیکھ کر ان کے بارے میں غور وفکر کرسکتے ہو، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

''وانها البسبيل مقيم'' یعنی قوم لوطؑ کا شہر اس راستہ پر موجود ہے جہاں لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ اب بھی اس کے آثار باقی ہیں۔ (مقیم) مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وہی ''سدوم'' نامی شہر ہے جو مدینہ اور شام کے درمیان ہے۔ ایک اور آیت میں عرب کے مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

تم صبح اور رات کو ان کے پاس سے گذرتے ہو۔ (صافات۔137، 138)

حضرت لوطؑ کے واقعات بیان کرتے ہوئے اللہ نے پیغمبر اکرمؐ کی جان کی قسم کھائی ہے اور فرمایا ہے:

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

تیری جان کی قسم، اے محمدؐ! یہ لوگ شہوت کی مستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ (حجر۔72)

پیغمبر کی جان کی قسم خورشید وقمر کی قسم جیسی نہیں ہے۔ دوسری طرح کی قسم کا مطلب جہاں طبیعت کے اسرار میں مطالعہ کرنے کی دعوت دینا ہے۔ جب کہ یہاں پر قسم پیغمبر اکرمؐ کی فضیلت اور عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ اسی لیے ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خدا کے نزدیک کوئی ذی نفس بھی پیغمبر اکرمؐ سے عزیز تر نہیں ہے۔ اللہ نے ان کے علاوہ کسی کی جان کی قسم نہیں کھائی، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (حجر۔72)

(۷)۔ ہلاک ہونے والے اور نجات پانے والے

موضوع سے متعلق آیات

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۴﴾ (الشعراء۔ ۱۷۴)

فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۶﴾ (الذاریات۔ ۳۶)

اِذْ نَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۳۵﴾ (الصافات۔ ۱۳۴، ۱۳۵)

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّیْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ (قمر۔ ۳۴)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ﴿۱۰﴾ (التحریم۔ ۱۰)

آیت کا ترجمہ:

۱)۔ اور ان (قوم لوطؑ)، میں اکثر ایمان نہیں لائے تھے۔

۲)۔ پس ہم نے اس تمام شہر میں سوائے لوطؑ کے، جو مسلمان اور خدا پرست تھے کوئی دوسرا گھر نہ پایا۔

۳)۔ پھر ہم نے لوطؑ اور اس کے خاندان کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے جو ہلاک ہونے والوں میں باقی رہ گئی۔

۴)۔ قوم لوطؑ نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔

۵)۔ یقیناً ہم نے ان پر پتھروں کا مینہ برسایا، سوائے لوطؑ کی اولاد کے کہ ہم نے انہیں صبح کے وقت نجات دی۔

۶)۔ جو لوگ کافر ہو گئے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے نوحؑ اور لوطؑ کی زوجہ کی مثال بیان کی۔ وہ دونوں ہمارے صالح بندوں کے تحت تھیں۔ لیکن ان دونوں نے ان دونوں کے ساتھ خیانت کی۔ پس ان دونوں نے اللہ کے عذاب سے بچانے میں ان دونوں کی کوئی مدد نہ کی اور ان سے کہا گیا کہ وہ دوسرے گنہگاروں کی طرح آگ

میں داخل ہوجائیں۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ جب اللہ فاسد قوموں کو ہلاک کرتا ہے تو مومنین کے نجات پانے کا ذکر بھی کرتا ہے۔حضرت ہودؑ وصالحؑ کی اقوام کے واقعات اور مومنین کے نجات پانے کا ذکر واضح طور پر آیا ہے۔

حضرت لوطؑ کی داستان میں تین قرآنی تعبیرات ملتی ہیں جن سے نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف ان کا خاندان ہی ان پر ایمان لایا تھا،اس میں بھی ان کی بیوی شامل نہیں۔قرآن کی یہ تین تعبیرات اس طرح ہیں۔

۱۔وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (سورۂ شعراء۔174)

۲۔فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾

پس ہم نے اس میں سوائے لوطؑ کے جو مسلمان وخدا پرست تھے گھر کے سوا کوئی دوسرا گھر نہ پایا۔(الذارایت۔36)

۳۔اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ (صافات۔134،135)

اسی سے ملتا جلتا مضمون سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۳۳ میں بھی آیا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (عنکبوت۔33)

ان آیات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ کے بچے ہی ان پر ایمان لائے تھے۔

یقیناً ایک آسمانی مصلح کے لیے ایک ایسی قوم کے درمیان زندگی گذارنا بڑا مشکل تھا جو پوری کی پوری جنسی انحراف میں مبتلا تھی۔فقط عظیم لوگ ہی ان حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت لوطؑ اوران کی اولاد کو فجر سے پہلے نجات دی گئی۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۢ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾

قوم لوطؑ نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔ہم نے ان پر پتھر کا مینہ برسایا سوائے آل لوطؑ کے جنہیں ہم نے صبح کے وقت نجات دی۔(قمر۔33،34)

حالانکہ ان کی قوم صبح ہی کے وقت مورد ہلاک ہوئی۔

حضرت لوطؑ کی زوجہ کو ان کی صحبت نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا جس طرح حضرت نوحؑ کی زوجہ کو اپنے شوہر کی صحبت سے کوئی فائدہ نہ پہنچا

تھا۔ یہاں نقص ان عورتوں میں تھا ورنہ دونوں پیغمبروں کے کمال میں کوئی شک نہیں، ارشاد ہوتا ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝۱۰

جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے نوحؑ اور لوطؑ کی ازواج کی مثال بیان فرمائی ہے۔ وہ دونوں ہمارے صالح بندوں کے تحت تھیں۔ لیکن دونوں نے ان دونوں کے ساتھ خیانت کی۔ پس دونوں انبیاء کی مصاحبت نے اللہ کے عذاب سے بچانے میں ان دونوں کی کچھ مدد نہ کی اور ان سے کہا گیا کہ دوسرے گنہگاروں کی طرح آگ میں داخل ہو جاؤ۔ (تحریم۔10)

جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ میں پیغمبر کے ساتھ ایک دن یا دو دن رہنے اور انہیں دیکھنے سے روحانی انقلاب برپا ہو گیا جس سے وہ سب عادل ہو گئے، انہیں اس آیت میں غور و فکر کرنا چاہیے۔

نویں پیغمبر

حضرت اسحاق بن ابراہیم علیہ السّلام

موضوع سے متعلق آیات

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ؀ (الانبیاء۔۷۲)

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؀ (صافات۔۱۰۰)

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ؀ (صافات۔۱۱۲)

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓي اِسْحٰقَ (صافات۔۱۱۳)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔اور ہم نے اسے (ابراہیمؑ کو) اسحاقؑ (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا فرمایا جن میں ہر ایک کو (مقام نبوت) کے لائق قرار دیا۔

۲)۔خداوند مجھے صالح فرزند عطا فرما۔

۳)۔ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی جو انبیائے صالحین سے تھا۔

۴)۔ابراہیمؑ اور اسحاقؑ کو ہم نے برکت عطا فرمائی۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اسحاقؑ نویں [1]

---

[1] اس بنیاد پر کہ حضرت آدمؑ بھی پیغمبر تھے۔

پیغمبر ہیں جن کا نام قرآن نے ذکر فرمایا ہے۔ لیکن ان کی زندگی کے کوئی حالات بیان نہیں کئے۔ قرآن میں ان کا نام سترہ بار[1] آیا ہے۔ آیات سے مجموعی طور پر پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ سے چھوٹے تھے۔ ان کی ولادت کی خوشخبری فرشتوں کی ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کو پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ قرآن نے ان کو صالح نبی قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (صافات۔112)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾

ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ (اور ان کا پوتا) یعقوبؑ انعام (کے طور پر) عطا فرمایا۔ (انبیاء۔72)

لفظ ''نافله'' اضافہ کے معنی میں ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے بیٹے کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ سورۂ صافات کی آیت ۱۰۰ ''رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ'' اسی بات کو بیان کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں کافی تھا کہ اللہ انہیں حضرت اسمٰعیلؑ ہی عطا فرماتا لیکن اللہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ انہیں حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ نامی پوتے سے بھی نوازا۔

لہٰذا لفظ ''نافله'' حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی صفت کے طور پر آیا ہے۔

نیز اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ

ہم نے ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ کو برکت عطا فرمائی۔ (صافات۔112)

---

[1] بقرہ۔ ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۰، آل عمران۔ ۸۴، نساء۔ ۱۶۳، انعام۔ ۸۴، ہود۔ ۷۱ (دوبار)، یوسف۔ ۶، ۳۸، ابراہیم۔ ۳۹، مریم۔ ۴۹، انبیاء۔ ۷۲، عنکبوت۔ ۲۷، صافات۔ ۱۱۲، ۱۱۳، ص۔ ۴۵

دسویں پیغمبر

حضرت یعقوب ابن اسحاق علیہ السلام

حضرت یعقوبؑ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ یہ انبیاءِ الٰہی میں سے اور بنی اسرائیل نامی ملے کر سربراہ ہیں۔ ان کا ایک نام اسرائیل بھی ہے۔ قرآن میں ان کا تذکرہ سولہ بار یعقوب کے نام سے۔[1]
اور دوبار اسرائیل کے نام سے ہوا ہے۔[2]

موضوع سے متعلق آیات

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَـكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؁ (البقرہ۔ ۱۳۲)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ؁ (البقرہ۔ ۱۳۳)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ (آل عمران۔ ۹۳)

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ؁ (یوسف۔ ٦٨)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو توحید پرستی (ملت ابراہیمؑ) کی وصیت اور یعقوبؑ نے کہا: اے میرے

---

[1] بقرہ۔ ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳٦، ۱۴۰، آل عمران۔ ۸۴، نساء۔ ۱٦۳، انعام۔ ۸۴، ہود۔ ۷۱، یوسف۔ ٦۱
[2] آل عمران۔ ۹۳، مریم۔ ۵۸

بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے دین توحید پسند فرمایا ہے۔ پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہوتے ہوئے۔

۲)۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے باب داداؤں ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود خدائے واحد کی عبادت کریں گے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔

۳)۔ ہر قسم کا کھانا بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا سوائے اس کے جو اسرائیل نے خود اپنی ذات پر حرام قرار دے لیا تھا۔

۴)۔ اور یقیناً وہ صاحب دانش تھا۔ اس لیے کہ ہم نے اسے علم عطا فرمایا تھا لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یعقوبؑ کی داستان حیات کا کچھ حصہ ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کی داستان زندگی میں بھی آئے گا کیونکہ دونوں کی زندگی آپس میں مرتبط ہے۔ یہاں وہ کچھ بیان ہوگا جو حضرت یوسفؑ کی داستان سے ہٹ کر بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس طرح ہے:

۱)۔ قرآن فرماتا ہے کہ دو انبیاء نے اپنی اولاد کو توحید پرستی کی وصیت کی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؁۱۳۲

ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو توحید پرستی (ملت ابراہیمؑ) کی ہدایت کی اور یعقوبؑ نے کہا: اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے دین توحید پسند فرمایا ہے۔ پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہوتے ہوئے۔ (بقرہ۔132)

بعد والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے آئین توحید کا اقرار لیا شاید یہ اقرار لینا اس مکمل نصیحت کے بعد ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ؁۱۳۳

کیا تم اے یہودیو! اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی اور اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ داداؤں ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور

اسحاقؑ کے معبود خدائے واحد کی عبادت کریں گے۔ (بقرہ۔133)

۲)۔قرآن نے ان کے علم ودانش کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

وہ صاحب دانش ہے کیونکہ ہم نے اسے دانش عطا فرمائی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (یوسف۔68)

۳)۔انہوں نے بعض چیزیں اپنے اوپر حرام قرار دے رکھی تھیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ

ہر قسم کی خوراک بنی اسرائیل کے لیے حلال تھی سوائے اس کے جو اسرائیل نے خود اپنی ذات پر حرام قرار دے رکھی تھی۔ (آل عمران۔93)

کون سا کھانا انہوں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا اور اس کا محرک کیا تھا۔ قرآن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں آیا۔ تحریم کی نسبت خود اسرائیل کی طرف دی گئی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحریم ایک قسم کے زہد اور دنیاوی لذائذ سے دوری کی خاطر تھی۔

یہاں تک ہم حضرت یعقوبؑ کی خصوصیات سے کسی حد تک آگاہ ہوئے ہیں جب کہ ان کی زندگی کا کچھ حصہ ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کی داستان حیات میں بھی آئے گا۔

گیارہویں پیغمبر

حضرت یوسف علیہ السّلام [1]

مقدمہ

حضرت یوسف علیہ السّلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں جو خود جناب یعقوبؑ کے زمانے ہی میں مصر میں درجہ نبوت پر فائز ہوئے۔ مجموعی طور پر آپ کا اسم مبارک قرآن مجید میں ۲۷ بار آیا ہے۔ ۲۵ مرتبہ سورۂ یوسف میں، ایک مرتبہ سورۂ انعام کی ۸۴ ویں آیت میں اور ایک مرتبہ سوئرہ غافر کی ۳۴ ویں آیت میں۔

جناب یوسفؑ کی روحانی و معنوی خصوصیات آپ کی سرگذشت سے، جو سورۂ یوسف میں بیان ہوئی ہے، واضح ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ ہم اس مقدمہ میں ان چیزوں کو تحریر کریں۔ یہاں ہم صرف ان دو آیتوں کا ذکر کرتے ہیں جو دوسرے سوروں میں آئی ہیں۔ اور آپ کی خصوصیات کو بیان کرتی ہیں۔ قرآن مجید نے انہیں حضرت ابراہیمؑ کے فرزندوں میں شمار کیا ہے اور فرماتا ہے: وَمِنۡ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡسُفَ (انعام۔ 84)۔ من ذریته کی ضمیر جناب ابراہیمؑ کی طرف پلٹتی ہے۔ درحقیقت جناب یوسفؑ جناب ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ ان کا نسب اس طرح ہے: یوسف بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ۔ آپ (یوسفؑ) کے پدر بزرگوار جناب یعقوبؑ انبیائے بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ ہیں۔

سورۂ غافر کی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قیام مصر کے دوران ہی مقام نبوت پر فائز ہو گئے تھے اور صاحب معجزات بھی تھے۔ اگرچہ حکومت وقت اور اس کے پیروکار آپ کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے جیسا کہ سورۂ مذکورہ میں آیا ہے اور مومن آلِ فرعون کی زبانی اس طرح نقل کیا گیا ہے: وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ يُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَيِّنٰتِ فَمَازِلۡتُمۡ فِيۡ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمۡ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلۡتُمۡ لَنۡ يَّبۡعَثَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رَسُوۡلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُ ۚ (غافر۔34) یعنی اس سے پہلے یوسفؑ تمہارے پاس واضح دلیلوں کے ساتھ آیا۔ پس جو کچھ وہ لے کر تمہارے پاس آیا تم اس سے شک ہی میں رہے تا اینکہ جب وہ مرگیا تو تم نے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ہرگز کوئی رسول مبعوث نہیں کرے گا جو حد سے نکلنے والا شک کرنے والا ہو، اس پر اللہ تعالیٰ اسی طرح گمراہی کا حکم لگا دیتا ہے۔

جناب یوسفؑ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی سرگذشت قرآن میں ایک دفعہ اور ایک ہی جگہ پر مستقل طور پر ذکر ہوئی ہے جب کہ دوسرے انبیاء کے واقعات مختلف جگہوں پر اور الگ الگ مکرر بیان کئے گئے ہیں۔ شاید یہ اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ سننے والے اس کو

---

[1] سورۂ یوسف کی تفسیر کے سلسلہ میں ہم نے جناب آقائے حاج شیخ عباس علی براتی سے استفادہ کیا ہے جس کے لیے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جب سنیں تو ایک نتیجہ اخذ کرلیں کیونکہ اگر اس کے علاوہ قرآن مجید دوسری صورت اختیار کرتا تو سننے اور پڑھنے والے اس سرگذشت سے اپنے مقاصد تک نہ پہنچ پاتے۔ ہر شخص سورۃ کے مطالعہ سے ایک خاص فائدہ اٹھاتا ہے۔

۱)۔ جب کوئی اللہ کا نیک وعارف بندہ اس تمام سورۃ کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ولایت خدا اس کے ایسے مخلص اور خاص بندہ میں جس میں خدا کی محبت کے علاوہ کسی کی محبت نہیں پائی جاتی ہے، سے اپنے دل میں ایک نورانی کیفیت پاتا ہے۔ وہ یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ جب اس کا کوئی بندہ مصیبت وآلام میں مبتلا ہوتا ہے تو خداوند تعالیٰ اسے ہر مشکل سے کس طرح نجات دیتا ہے۔

آپ کی زندگی کی ابتداء حاسد بھائیوں کے درمیان سے شروع ہوتی ہے جو آپ کو سیر وتفریح کے بہانہ سے اپنے پدر بزرگوار سے لے کر آپس میں مشورہ کر کے کنویں میں پھینک دیتے ہیں لیکن عنایت الٰہی آپ کو کنویں سے باہر نکالتی ہے لیکن ابھی چند روز ہی نہیں گذرتے کہ آپ ایک قیدی بنا کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں۔ وہاں سے بھی اللہ کے لطف وکرم سے آپ کو رہائی مل جاتی ہے اور جلد ہی ایک طرح کی برأت ایک گواہی کے باعث وجود میں آتی ہے، لیکن دوسری دفعہ جب اس کے بھانے پر آپ اس کی طرف مائل نہیں ہوتے تو وہ آپ کو زندان میں بھیج دیتی ہے۔ آپ مدت تک زندان میں زندگی گذارتے ہیں حتیٰ کہ پھر زندان سے آزاد ہو کر بادشاہ کے خزانچی بن جاتے ہیں۔ اس طرح سورۂ یوسف کے مطالعہ سے حضرت یوسفؑ پر بندۂ خالص کے طور پر ولایت الٰہی کی تجلی نظر آتی ہے جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتی ہے۔

۲)۔ علمائے اخلاق اس واقعہ پر اپنے نقطۂ نظر سے غور وفکر کرتے ہیں اور وہاں وہ آزادی وجوانی کی عفت کو دیکھتے ہیں، جہاں ایک ایسا شہوانی طوفان جس سے بڑے بڑے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جاتے ہیں، اس کے مقابل آپ کھڑے نظر آتے ہیں، اپنے دامن کو داغدار نہیں ہونے دیتے، اور جو آپ کے دامن کو آلودہ کرنے کے لیے زمین ہموار کرتا ہے، اس کو نصیحت کرتے ہیں۔

۳)۔ مؤرخین اس داستان میں چند صاحبان قوت کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ایک دن حضرت یوسفؑ کی ضد میں انہیں کنویں میں پھینک دیتے اور اس کے بعد پیچ ڈالتے ہیں، لیکن آخر میں ان کی عظمت کے سامنے یہی لوگ سجدہ کرتے ہیں اور پہاڑ جیسی طاقت رکھتے ہوئے ذلت کی گہرائیوں میں آگرتے ہیں۔ بے شک مذکورہ بالا لوگ اس واقعہ سے مثبت نتیجہ اخذ کرتے ہیں لیکن آلودہ افراد نے اس واقعہ سے منفی نتیجہ نکالا ہے، یعنی بعض اوقات اس واقعہ کو عاشقانہ فلمیں یوسفؑ وزلیخا کے نام سے بنالیتے ہیں جب کہ بعض بڑے شعراء بھی اس واقعہ پر ایک داستان کی شکل میں یوسفؑ و زلیخا کے نام سے نظم کر کے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن اہم ترین چیز یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس واقعہ کو احسن القصص یعنی بہترین قصص قرار دیا ہے۔ حالانکہ تمام قرآن کا تمام قرآن احسن القصص ہی ہے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان احسن القصص وابلغ الموعظة وانفع التذكر كتاب الله عزّ ذكرهٗ[1]

بے شک اچھی داستانیں (اچھے واقعات) اور کامل ترین نصیحتیں اور سب سے زیادہ نفع بخش یاددہانی کتاب خدا ہے کہ اس کا ذکر سربلند رہے۔

---

[1] نور الثقلین۔ ج ۲ ص ۴۰۹

زندگانی جناب یوسف علیہ السلام کا پہلا دور

حضرت یوسف علیہ السلام کا بچپن

سرزمین کنعان میں حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب واقعہ نما

موضوع سے متعلق آیات

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿١﴾

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢﴾

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٣﴾

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿٤﴾

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٥﴾

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦﴾ (یوسف۔ ۱ تا ۶)

آیات کا ترجمہ:

۱)۔ الر۔ یہ واضح و روشن کتاب کی آیات ہیں۔

۲)۔ہم نے اس کتاب (قرآن) کو عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم اس میں غور کرو۔

۳)۔(اے رسولؐ) ہم تم پر یہ قرآن نازل کر کے تم سے عمدہ ترین قصہ بیان کرتے ہیں اگرچہ تم اس کے پہلے اس سے بالکل ناواقف تھے۔

۴)۔وہ وقت یاد کرو جب یوسفؑ نے اپنے پدر بزرگوار سے کہا: ''بابا جان! میں نے گیارہ ستاروں اور سورج و چاند کو (خواب میں) دیکھا ہے کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

۵)۔یعقوبؑ نے کہا: بیٹا! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ بتانا مبادا کہ وہ تمہارے لیے مکاری کی تدبیریں کرنے لگیں گے۔اس میں تو شک ہی نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

۶)۔''اور (جو تم نے دیکھا ہے) ایسا ہی ہوگا، تمہارا پروردگار تم کو (نبوت سے) برگزیدہ کرے گا، خوابوں کی تعبیر سکھائے گا اور جس طرح اس سے پہلے تمہارے دادا، پردادا، ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ پر اپنی نعمتیں پوری کر چکا ہے، اسی طرح تم پر اور یعقوبؑ کی اولاد پر اپنی نعمت پوری کرے گا۔بے شک تمہارا پروردگار واقف حکمت والا ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

خدائے عزوجل نے اس سورۃ کا آغاز حروف مقطعہ سے کیا ہے۔اگرچہ مفسرین نے حروف مقطعات کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے، لیکن ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان حروف کا ایک مقصد قرآن کے اعجاز کو واضح کرنا ہے کہ انہیں حروف سے قرآن کی تشکیل دی گئی ہے جس کے سامنے دنیا کے تمام لوگوں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔اگر تصور کیا جائے کہ یہ انسان کے بنائے ہوئے ہیں تو اٹھو اور انہی حروف سے جو قرآن کے معانی کی بنیاد ہیں، مثال لے آؤ! اس تفسیر کا مدعا یہ ہے کہ ہر سورۃ میں جہاں بھی حروف مقطعہ آئے ہیں ان کے بعد قرآن کے بارے میں بات شروع ہوتی ہے۔چنانچہ اس سورۃ میں بھی ارشاد ہوتا ہے: تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ

معجزہ قرآن

سکیت نے امام ہادی علیہ السلام سے پوچھا: ''خداوند عالم نے جناب موسیٰ بن عمران کو عصاء، ید بیضا اور اس طرح کے معجز نما کاموں کو جو جادوگروں کے مانند تھے، جناب مسیح علیہ السلام کو طبابت اور مریضوں کو شفا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فصیح اور بلیغ کلام کے ذریعہ بلند (اور ہر ایک نبی کا مختلف معجزہ قرار دیا)؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: جب خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ کا رسالت کے لیے انتخاب فرمایا تو اس زمانہ میں سب سے اچھا رائج فن جادو تھا۔اللہ نے ان کو اسی زمانہ کے رائج فن کے مطابق معجزہ عطا فرمایا جس کے مقابلے کی کسی کو طاقت نہ تھی۔آپ نے

اپنے معجزہ کے ذریعہ تمام جادوگروں کے جادوؤں کو باطل کر دیا اور اپنی حجت کو ان لوگوں پر تمام فرما دیا۔ اسی طرح جب جناب عیسیٰ علیہ السلام کو خداوند عالم نے نبی بنا کر بھیجا تو اس وقت سب سے بڑا فن جو رائج تھا وہ طبابت تھی۔ خداوند عالم نے اسی وجہ سے اس زمانہ کے مطابق ان کو معجزہ عطا فرمایا جس کا مقابلہ کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے مردوں کو زندہ کر کے، اندھوں کو بینا کر کے، کوڑھیوں کو شفا دے کر اپنی حجت ان لوگوں پر تمام کی۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا تو اس وقت کا سب سے رائج فن خطابت اور فصاحت و بلاغت تھا۔ پس آپ خداوند عالم کی طرف سے ایسے مواعظ و حکمت لے کر تشریف لائے جن کا مقابلہ کرنا لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ (ان تمام مواعظ و نصائح کو آپ نے فصیح و بلیغ کلام میں پیش کیا)۔ آنحضرتؐ نے الٰہی حجت کو ان پر برتری و ناقابل مقابلہ پیش کر کے ان کے قول کو باطل قرار دیا۔[1]

خداوند عالم سورۃ یوسفؑ کے شروع میں مقطعات کے بعد اس کتاب آسمانی کو لفظ ''تلک'' (جو دور کے اشارہ کے لیے آتا ہے) سے بیان فرماتا ہے جس کا مطلب دور کے ذریعہ ایک طرح کی (عظمت و بلندی پر) تعظیم و تکریم مراد ہوتی ہے جیسا کہ ہم خود اردو زبان میں بھی تعظیماً یا کسی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں وہ دادا، وہ عادل حکمران وغیرہ۔ اس کے بعد قرآن مجید کو کتاب مبین کہا گیا ہے۔ مُبِین ''بیّن'' کے معنی میں آتا ہے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ قرآنی آیات واضح ہیں۔ گر ''مُبیّن'' کے معنی میں ہوں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ آیات قرآن کے معنی شکار کرنے والے حقائق کے ہیں۔ البتہ قرآن کے واضح ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں تدبر اور تعقل حتیٰ کہ معلم کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اسے مراد یہ ہے کہ یہ کتاب بہت ہی واضح طور پر لکھی گئی ہے اور اس میں کسی قسم کا معمہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: ''الر ۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ''

بعد والی آیت میں یاد دلایا جا رہا ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے تا کہ تم اس میں غور و فکر کرو، بے شک قرآن صرف عربی زبان والوں کے لیے ہی مخصوص نہیں ہے لیکن کیونکہ اس کے مخاطب محمدؐ عربی اور اس زمانہ کے افراد عربی زبان رکھتے تھے اس لیے فطرتاً قرآن کو عربی زبان ہی میں نازل ہونا چاہیے تھا۔

دوسرے زمانوں کے افراد کو چاہیے کہ اس کے ترجمہ سے استفادہ کریں کیونکہ یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے کہ قرآن اس زبان میں نازل ہوتا کہ نہ حامل قرآن اس زبان کو جانتا ہوتا اور نہ ہی وہ امت جس کو خطاب کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا خداوند عالم فرماتا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ'' آخری جملہ ''لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ'' عربی میں قرآن نازل ہونے کا سبب بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ سب سے پہلے مخاطب افراد کے لیے قرآن تفکر کے قابل ہرگز نہ ہوتا۔

''قصہ'' لغت میں ایسی داستان کو کہتے ہیں جو جڑی ہوئی ہوتا کہ انسان اس کا پہلا حصہ سن کر نتیجہ کی جستجو میں رہے۔ قرآن مجموعی طور پر ''احسن القصص'' ہے، بہترین واقعات کو مخاطب کرتا ہے لیکن ان میں واقعہ حضرت یوسفؑ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1] اصول کافی، ج ۱ کتاب العقل والجہل، روایت ۲،

حضرت یوسفؑ کا واقعہ توریت میں مفصل طور سے بیان کیا گیا ہے، لیکن قرآن کی آیتیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ اس سے آگاہ نہیں تھے اور یہاں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ وحی کے ذریعہ سے ہے۔ اور توریت سے آگاہی نہ ہونے کا سب سے واضح سبب یہ تھا کہ توریت میں اختلاف پایا جاتا ہے اور دو طرح کی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ہم بعد میں قرآن اور توریت کے مقابلہ کی جگہ اس موضوع پر تفصیلی تحقیق کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب

قرآن حضرت یوسفؑ کی داستان کو ان کے خواب سے شروع کرتا ہے۔ آپ خواب میں دیکھتے ہیں کہ گیارہ ستارے، سورج چاند سمیت ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ حضرت یوسفؑ اپنے اس بچپن ہی میں اس خواب سے اپنی رفعت و بلندی کو سمجھ جاتے ہیں کیونکہ آسمانی مخلوق کا سجدہ کرنا، وہ بھی سورج، چاند مع ستاروں کے، اور اس کا کوئی حقیقت نہ رکھنا، بے معنی ہوتا۔ اسی وجہ سے آپ نے اپنے خواب کو صرف اپنے والد محترم سے نقل کیا یہ بذاتِ خود ان کی معرفت کی سب سے بڑی دلیل ہے جیسا کہ فرماتے ہیں:

اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِاَبِيهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۔ آپ کا 'یابت' کہہ کر خطاب کرنا اپنے پدر بزرگوار سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ خواب دیکھنے کے مسئلہ کو دوبار تکرار کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کہتے ہیں 'رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ ......' اور دوسری بار کہتے ہیں 'رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ......' پہلے جملہ سے خود ان لوگوں کا دیکھنا مراد ہے جب کہ دوسرے جملہ میں ان کا اظہار خضوع مراد ہے۔ اس وجہ سے آپ فعل کا تکرار کرتے ہیں۔

جب جناب یوسفؑ نے اپنے خواب کو اپنے پدر بزرگوار کے سامنے بیان کیا تو آپ کے والد ماجد نے خواب کو بھائیوں کو بتانے سے منع فرمایا، جیسا کہ فرماتے ہیں: قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔

اس آیت سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس خواب کی تعبیر کسی نہ کسی جہت سے حضرت یوسفؑ، ان کے پدر بزرگوار اور بھائیوں کو معلوم تھی، ورنہ اسے بیان نہ کرنے کی دوسری کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

قرآن مجید اس آیت میں شیطان کو انسان کا دشمن کہہ کر تعارف کرواتا ہے، جب کہ ظاہراً حضرت یوسفؑ کے دشمن ان کے بھائی تھے۔ لیکن چونکہ شیطان انہیں فساد کی دعوت دیتا ہے اس لیے شیطان کو ان کا دشمن شمار کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے جب جناب یوسفؑ کے خواب کی تعبیر سامنے آتی ہے اور ان کے بھائی ان کی عظمت کے سامنے سجدہ کرتے ہیں تو جناب یوسفؑ فرماتے ہیں کہ حقیقت میں شیطان ہی تھا جس نے عداوت کا بیج تم لوگوں کے دلوں میں بویا تھا جیسا کہ فرماتے ہیں: مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ (یوسف۔100) یعنی (اس کے بعد جب شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد کو جگہ دی اور انہیں میری مخالفت کی تحریک کی)۔

جناب یعقوبؑ کی گفتگو اپنے بیٹے کے ساتھ شاید ایک طرح کی الجھن کا سبب بن گئی اور انہوں نے جان لیا کہ حضرت یوسفؑ کے

بھائی ان کے خلاف سازش کریں گے۔ اس چیز کے ثبوت میں بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح خداوند عالم نے تمہیں یہ خواب دکھایا ہے، اس سے تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ خدا تجھے ایک بلند مقام عطا کرنے والا ہے (درجہ نبوت پر فائز فرمائے گا) تعبیر خواب کی نعمت بھی تجھے عطا کرے گا اور اپنی نعمت کو تجھ پر اور خاندان یعقوبؑ پر تمام کرے گا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(یوسف۔6)

ا)۔ ''یجتبیك ربك'' اس جملہ کا مطلب حضرت یوسفؑ کا نبوت کے لیے انتخاب ہے۔ مادہ ''اجتباء'' قرآن مجید میں اس معنی میں زیادہ تر آیا ہے۔ مثلاً ''وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ'' (انعام۔87)

اس آیت میں انبیاء علیہم السلام جیسے اسحاقؑ، داوٗدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ اور دیگر گروہ انبیاء کے نام لیے گئے ہیں۔

۲)۔ ''يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ'' یہاں حدیث سے مراد خواب ہے۔ یعنی نفس انسان خود انسان سے بات کرتا ہے۔ رویا کو ''حدیث'' کہنے کی علت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ خواب حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔

۳)۔ ''يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ'' تمام دنیوی و اخروی نعمات تمہارے اور یعقوبؑ کے خاندان کے اختیار میں قرار دیتا ہے، جیسا کہ پہلے ابراہیمؑ اور اسحاقؑ کے بارے میں فرما چکا ہے۔

نیتجتاً یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ ایسی شخصیتوں کے لیے انجام دیتا ہے وہ بغیر ملاک کے نہیں ہوتا۔ اس کی ابتداء بنیادِ حکمت اور شائستگی پر رکھی گئی ہے اس لیے فرماتا ہے: ''رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ''

خواب۔۔۔ عالم غیب کا ایک دریچہ

خواب کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ ان تمام کو اسرار آمیز غیبی دنیا کا دریچہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ان میں بعض کو واقعی اسرار آمیز دنیا کا دریچہ کہا جاسکتا ہے۔ ہم خواب کی اس نوع کو الگ دکھانے کے لیے خواب کی اقسام کا ذکر کرتے ہیں:

ا)۔ پریشان خیالی کبھی بیداری کی حالت میں اور زیادہ تر خواب میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اکثر حساس لوگ ان خوابوں سے بیمار ہوجاتے ہیں۔

۲)۔ عام افکار اور روزانہ کے کام جو سطح ذہن پر موجود ہوتے ہیں، عالم خواب میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ امتحان گاہ میں، مقابلہ اور مقروض افراد چک اور ہنڈیوں کا خواب دیکھتے ہیں۔

۳)۔ بعض خواب انسان کے مخفی اسرار کے بارے میں ہوتے ہیں جو کبھی بغیر شکل بدلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اکثر خاص علتوں کی

بناء پر بدلے ہوئے ہوتے ہیں اور انسان کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس قسم کے خواب روحانی تجربہ و تحلیل میں علمی اہمیت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ بعض انسانوں کے مخفی حالات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ یہاں تک مفکرین میں ایسے سمجھدار لوگ بھی ہوئے ہیں، جو افراد کے افکار کو پڑھ سکتے ہیں۔

۴)۔ یہ تین قسم کے خواب ہمارے موضوع بحث نہیں ہیں، بلکہ ہمارا موضوع چوتھی قسم سے تعلق رکھتا ہے جو ذہن و فکر سے ہٹ کر واقعیت کو بیان کرتا ہے۔ اس قسم کے خواب کو الٰہی خواب کہتے ہیں اور یہ ہمیں خارجی دنیا سے منسلک کرتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم نے انہیں رویائے صادقہ شمار کیا ہے اور آپ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: "ان الرویاء الصادقه جزءٌ من سبعین جزءً من النبوة" یعنی سچا خواب نبوت کے ستر اجزاء میں سے ایک ہوتا ہے۔ [1]

مادی دنیا اس قسم کے خوابوں کی منکر ہے، حالانکہ یہ انکار ایک بیہودہ انکار کے علاوہ کچھ نہیں، یہاں تک کہ آج کے زمانہ میں بھی بہت سے لوگ اپنی زندگی میں اس طرح کے خوابوں سے ناواقف نہیں ہیں۔

قرآن سچے خوابوں کے چند نمونے نقل کرتا ہے جن کے ظاہر ہونے میں کسی طرح کی غلطی نہیں پائی گئی، مثال کے طور پر:

۱)۔ جناب ابراہیم علیہ السلام کا یہ خواب کہ اللہ کے حکم سے وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں۔ (سورۂ صافات۔102)

۲)۔ جناب یوسف علیہ السلام کا خواب کہ ان کے تمام، بھائی اور ماں باپ انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ (سورۃ یوسف۔4)

۳)۔ قید خانہ میں جناب یوسفؑ کے دو ساتھیوں کے خواب، جن کی شرح آئندہ آئے گی۔ (سورۂ یوسف۔36)

۴)۔ بادشاہ مصر کا خواب جس کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی۔ (سورۃ یوسف۔43)

۵)۔ فتح مکہ کے بارے میں پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کا خواب۔ (سورۃ فتح۔27)

یہ تمام خواب ایسے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بعد میں اپنے اپنے زمانہ میں وجود پذیر ہوئے۔ لہٰذا اس طرح کے خواب قابل انکار نہیں ہوتے۔ ہم یہاں بعض خوابوں کے نمونے پیش کرتے ہیں جنہیں ہم نے خود دیکھا ہے یا موثق افراد سے سنا ہے:

۱)۔ استاد علامہ طباطبائیؒ اہل فکر و نظر افراد کے لیے ایک واقعہ اس طرح نقل کرتے ہیں:

قم میں سردی کے زمانہ میں ایک دن ہمارا ایک لڑکا جو نابالغ تھا دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کمرے میں جا کر سو گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ نیند کی حالت میں بڑبڑا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ "ڈاکیہ دو خط لے کر آیا ہے، اٹھو اور انہیں لے لو" ہم نے اس کی بڑبڑاہٹ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ لیکن کچھ دیر نہ گذری تھی کہ اچانک دق الباب ہوا، ڈاکیہ دو خط لے کر آیا اور دے کر چلا گیا۔

۲)۔ ہمارے مفکر و دانشمند دوست جناب علی اصغر مدرس نے جو ملک کے ایک عالم و فاضل اور مصنف شمار کئے جاتے ہیں، جنہوں نے "تاریخ جاپان"، "حق اور قانون"، "اسلام سے پہلے عرب کے اجتماعی حالات کی تاریخ" وغیرہ لکھی ہیں۔۔ مصنف کے لیے اس طرح نقل

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۹ ص ۲۸۳

کیا ہے:

میں ۱۳۴۰ھ میں معالجہ کے لیے ترکیہ سے ہو کر آلمان جا رہا تھا کہ راستے میں ''ازمیر'' میں چند روز کے لیے رک گیا اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر آلمان کی طرف روانہ ہوا۔ رات کو جہاز میں سو گیا۔ صبح کی نماز کے لیے بیدار ہوا اور نماز پڑھ کر دوبارہ سو گیا۔ ایک شخص خواب میں بہت صریح و واضح الفاظ میں، جو ابھی تک مجھے یاد ہیں، کہتا ہے کہ اپنی والدہ کے بارے میں فکر نہ کرو، انہیں آرام ہو گیا ہے۔ ایک شخص نے ان پر قرآن پڑھا اور انہیں آرام ہو گیا۔ اس نے بالکل یہی جملہ کہا تھا۔ یہ واقعہ ماہ تیر کی ۲۸ اسی تاریخ کو واقع ہوا۔ میں نیند سے بیدا ہوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

مسافرت کے ایام ختم ہوئے اور تبریز کی طرف لوٹا تو دیکھا کہ گھر والوں کے طور طریقے مجھ سے غیر معمولی ہیں اور وہ اس فکر میں ہیں کہ والدہ کے انتقال کی خبر مجھے کیسے دیں۔ میں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں بس اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ ان کا انتقال کب اور کس طرح ہوا؟

انہوں نے کہا کہ ان کا انتقال ماہ تیر کی ۲۸ تاریخ کو ہوا۔ ایک شخص کو بلایا گیا ہے کہ ان کے سرہانے قرآن پڑھا کرے، اس وقت اپنی ڈائری نکالی اور ملایا تو واقعہ بالکل اسی دن کا تھا جب میں نے خواب دیکھا تھا اور قرآن خوانی وغیرہ بالکل ڈائری میں رقم کردہ یادداشت کے بالکل مطابق تھی۔

اس طرح کے خوابوں کی کس طرح تفسیر کی جاسکتی ہے؟ کیا انہیں ایک قسم کا اتفاق کہا جائے یا ان کو ایک طرح کی باطنی تجلی کہہ سکتے ہیں؟ یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کو انسان کی روحانی کیفیت کا ظاہری دنیا سے تعلق کی تفسیر کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

۳)۔ مؤلف ۱۳۳۰ شمسی میں قم کی گرمی سے گھبرا کر اپنے وطن چلا گیا۔ جب گرمی کم ہوئی اور سال تعلیم شروع ہوا تو قم واپس چلا آیا لیکن اپنے استاد[1] کی نوٹ بک جو مطالعہ کے لیے وطن لے گیا تھا، بھول آیا۔ ان دنوں شہروں کے درمیان آمد و رفت بہت مشکل تھی، ساتھ ہی یہ بھی کہ قلمی نسخہ ہر آدمی کے ذریعہ بھی بھیجا نہیں جاسکتا تھا۔ اس وجہ سے والد محترم کو خط لکھا کہ کسی معتبر آدمی کے ذریعہ قلمی نسخہ بھیج دیں۔ کچھ دن گذر گئے اور یہ بات بالکل ذہن سے نکل گئی۔ ناگہاں خواب میں دیکھا کہ والد محترم آئے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھ وہ نسخہ بھی لائے ہیں۔ ظہر کے وقت دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں اپنے ساتھی سے یہ خواب بیان کر رہا تھا کہ اچانک والد محترم وارد ہوئے اور فرمایا: ''میں شہر جا رہا ہوں، تمہارا قلمی نسخہ لے آیا ہوں''۔

مؤلف نے اس طرح کے کئی خواب دیکھے ہیں جن کے وقوع میں غلطی نہیں پائی۔

۴)۔ ایک خاتون انتقال کر گئی۔ ایک آدمی متوفیہ کا کافی رقم کا مقروض تھا۔ جس کی تحریر اس خاتون کے پاس تھی، چند ماہ بعد مرنے والی کے متعلقین مقروض کے پاس رقم لینے گئے تو اس نے تحریر طلب کی اس خاتون کی بیٹی نے پورے گھر میں جہاں جہاں اس تحریر کے پائے

---

[1] امام خمینی قدس سرہ الشریف

جانے کا امکان تھا، تلاش کیا لیکن مایوسی ہوئی۔ مقروض بھی تحریر دیکھے بغیر رقم واپس کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایک دن صبح کے وقت گھر کی خادمہ نے متوفیہ کی بیٹی سے کہا کہ میں نے گذشتہ رات تمہاری ماں کو خواب میں دیکھا، بہت خوشحال تھیں۔ مجھ سے کہا کہ تم سے کہہ دوں کہ تحریر قرض فلاں کی جیب میں ہے۔ اس لڑکی نے وہ لباس تلاش کیا جس طرح خادمہ نے بتایا تھا وہیں تحریر مل گئی۔ [۱]

ان خوابوں کی روحانی تجزیہ وتحلیل کے اصول سے تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ یہ خواب خادمہ کے باطن میں چھپی ہوئی چیز کو ظاہر نہیں کرتا کیونکہ خادمہ بنیادی طور سے تحریر قرض کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس طرح کے خواب کا عنوان الگ ہے۔ جس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کی حدیث ہے (بشری من اللہ) یعنی خوشخبری اللہ کی طرف سے۔ [۲]

اس طرح کے خواب ایک طرح کے الہام ہیں جو بہت زیادہ ہیں۔ اگر ہر زمانہ کے اس طرح کے دیکھے گئے خوابوں کو اکٹھا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔

خواب یوسفؑ کے بارے میں قرآن اور توریت میں اختلاف

قرآن واضح الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ جناب یوسفؑ کو ان کے والد محترم نے بھائیوں کو خواب بتانے سے منع کیا تھا اور ضروری ہے کہ معصوم حضرت یوسفؑ نے اپنے والد کے منع کرنے پر ان کی اطاعت کی لیکن توریت میں اس کے خلاف آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جناب یوسفؑ نے اپنے خواب کو اپنے بھائیوں کو بتادیا تھا جس کی وجہ سے ان کے بھائیوں نے حسد کیا۔ [۳]

اس کے بعد توریت کہتی ہے ''جناب یوسفؑ نے ایک اور خواب بھی دیکھا اور اسے اپنے بھائیوں سے بیان کیا کہ یہ دوسری مرتبہ خواب دیکھا ہے کہ آفتاب و ماہتاب اور گیارہ ستارے ہمارے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ جب یہ خواب اپنے باپ اور بھائیوں کو سنایا تو ان کے باپ ان کو ناراض ہوئے اور کہا یہ جو خواب دیکھا ہے یہ کیا ہے؟

کیا یہ ممکن ہے کہ میں، تمہاری ماں اور تمہارے بھائی تمہارے سامنے سر جھکائیں؟ اس کے بعد ان کے بھائی ان سے حسد کرنے لگے۔ لیکن باپ نے اس بات کو اپنے ذہن میں رکھا۔ [۴]

سجدہ کا مقصد

حضرت یوسفؑ نیند سے بیدار ہوئے۔ ان کے ذہن میں تھا کہ 11 ستارے اور سورج، چاند انہیں سجدہ کر رہے ہیں جب کہ حقیقت

---

[۱] کودک، ۱، ۳۸۷

[۲] بحار الانوار۔ ج ۶۱، ص ۱۹۲

[۳] بحار الانوار۔ ج ۶۱، ص ۱۹۲

[۴] توریت، سفر تکوین، فصل ۳۷ آیات ۹ تا ۱۲

میں انہوں نے یہ دیکھا تھا کہ ان کے ۱۱ بھائی، ماں باپ کے ساتھ ان کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوئے تو خواب کی اصلی صورت قوائے نفس کے تصرف کے اثر سے مناسب شکل اختیار کر چکی تھی اور آفتاب و ماہتاب و ستاروں کی شکل میں آ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان آسمانی اجرام کے سجدہ کا مقصد ان کا خضوع تھا کیونکہ اصطلاحی معنی میں سجدہ کا ان کے لیے تصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن سجدہ کا مقصد یہاں اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ ماں باپ اور بھائیوں کا سجدہ ہی ہے اور یہی حقیقت بھی تھی۔

بعد کے حصہ میں قرآن ان کے سجدہ کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''**وخروا له سجدا**'' (یوسف۔100) یعنی ''سواری سے اترے اور ان کے سامنے سجدہ کیا''۔

اس بات کا تصور بھی نہ ہونا چاہیے کہ حضرت یوسفؑ کے سامنے ان لوگوں کا سجدہ جناب یوسفؑ کی عبادت تھی کیونکہ سجدہ عبادت خضوع اور احترام کے درمیان ایک مشترک عمل کا نام ہے اور اس کا تعین سجدہ کرنے والوں کی نیت پر ہے۔ جب بھی وہ اس نیت سے سجدہ کرے کہ اس کا مسجود خدا اور اس جہان کا خالق اور مربی ہے، ایسا سجدہ عبادت کے عنوان سے ہوتا ہے لیکن اگر سجدہ اس عنوان سے ہو کہ وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور اس کی عنایت خاص اس کے لیے ہے تو ایسا عمل عبادت میں شمار نہ ہوگا اگرچہ عین عبادت نہ ہونے میں بھی ممکن ہے کہ یہ ایک فعل حرام ہو، جیسا کہ ہماری شریعت میں اس قسم کے سجدہ کو بھی حرام کہا گیا ہے۔ لیکن گذشتہ شریعت میں یہ فعل جائز تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا منصوبہ خیانت

موضوع سے متعلق آیات

لَقَدۡ كَانَ فِىۡ يُوۡسُفَ وَاِخۡوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيۡنَ ﴿۷﴾
اِذۡ قَالُوۡا لَيُوۡسُفُ وَاَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيۡنَا مِنَّا وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِىۡ
ضَلٰلٍ مُّبِيۡنِ ۚۖ ﴿۸﴾
اۨقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡهُ اَرۡضًا يَّخۡلُ لَـكُمۡ وَجۡهُ اَبِيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ
قَوۡمًا صٰلِحِيۡنَ ﴿۹﴾
قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ
السَّيَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ وَاِنَّا لَهٗ
لَنٰصِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾
اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۲﴾
قَالَ اِنِّىۡ لَيَحۡزُنُنِىۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَاَخَافُ اَنۡ يَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَاَنۡتُمۡ عَنۡهُ
غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳﴾
قَالُوۡا لَئِنۡ اَكَلَهُ الذِّئۡبُ وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾
فَلَمَّا ذَهَبُوۡا بِهٖ وَاَجۡمَعُوۡۤا اَنۡ يَّجۡعَلُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ ۚ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ
لَـتُنَـبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا وَهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵﴾ (یوسف۔۷ تا ۱۵)

آیات کا ترجمہ:

۷)۔اے رسولؐ! یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والے (یہودی) کے لیے (تمہاری نبوت کی

یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔

۸)۔(جب یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا:) باوجودیکہ ہماری بڑی جماعت ہے تاہم یوسفؑ اور اس کا حقیقی بھائی (بنیامین) ہمارے والد کو بہت زیادہ پیارے ہیں۔اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے والد یقیناً صریح غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔

۹)۔(لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یا تو) یوسفؑ کو مار ڈالیں یا (کم از کم) اس کو کسی جگہ پھینک آئیں تاکہ والد کی توجہ صرف تمہاری طرف ہی ہو جائے۔اور اس کے بعد تم سب کے سب (باپ کی توجہ بنے) اچھے آدمی ہو جاؤ گے۔

۱۰)۔ان میں سے ایک کہنے والا بول اٹھا کہ یوسفؑ کو جان سے تو نہ مارو،البتہ اگر تم کو ایسا ہی کرنا ہے تو اس کو کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو۔کوئی راہ گیر اسے نکال کر لے جائے گا اور تمہارا مطلب حاصل ہو جائے گا۔

۱۱)۔پس سب نے (یعقوبؑ سے کہا): ابا جان! آخر کیا وجہ ہے کہ آپ یوسفؑ کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے،حالانکہ ہم لوگ تو اس کے خیر خواہ ہیں۔

۱۲)۔آپ اس کو کل ہمارے ساتھ بھیج دیں کہ ہمارے ساتھ کھیلے کودے،اور ہم لوگ خود اس کے نگہبان ہوں گے۔

۱۳)۔یعقوبؑ نے کہا تمہارا اس کو لے جانا میرے لیے سخت صدمہ کا باعث ہے اور میں ڈرتا ہوں مبادا تم سب کے سب اس سے بے خبر ہو جاؤ اور اسے بھیڑیا کھا لے۔

۱۴)۔وہ کہنے لگے: ہماری بڑی جماعت ہے،اس کے باوجود اگر اس کو بھیڑیا کھا جائے تو ہم لوگ یقیناً گھاٹا (اٹھانے والے) ٹھہریں گے۔

۱۵)۔غرض یوسفؑ کو جب یہ لوگ لے گئے اور اس پر اتفاق کر لیا کہ اس کو اندھے کنوئیں میں ڈال دیں،تو ہم نے یوسفؑ کو وحی کی کہ (گھبراؤ نہیں ہم عنقریب تمہیں بڑے مرتبہ پر پہنچائیں گے) اور تم ان کو اس فعل سے متنبہ کرو گے جب انہیں اس کا کچھ دھیان بھی نہ ہوگا۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

شروع کی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جناب یوسفؑ کے بھائیوں کے تعلقات ان سے اور ان کے بھائی سے بہت کشیدہ تھے۔ یہ حالات پڑھنے والوں میں اندیشہ پیدا کرتے ہیں اور اس چیز کے منتظر ہوجاتے ہیں کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ دوسرے یہ کہ ان کے والد محترم کی یہ بات: ''اس خواب کو اپنے بھائیوں سے نہ کہنا کیونکہ ہوسکتا ہے وہ لوگ تمہارے ساتھ کوئی فریب کریں''۔ پڑھنے والے کے دل میں تجسس پیدا کرتا ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اس خاندان کا انجام آخر کیا ہوا؟ اسی لحاظ سے قرآن پڑھنے والوں کا خیال رکھا ہے اور واقعہ کو یہیں سے شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ یعنی ''کوئی شک نہیں کہ حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی زندگی کے دوران جستجو کرنے والوں کا وجود پایا جاتا ہے''۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں کچھ لوگ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے تھے اور واقعۂ یوسفؑ کے متعلق آنحضرتؐ سے پوچھا تھا۔ اس وجہ سے آیت میں لفظ ''سائلین'' آیا ہے۔ یہ سوال کرنے والے لازمی طور پر اہل کتاب تھے۔ جنھوں نے مکہ کے حالات کے دوران مشرکوں کے اہم لوگوں سے کہا تھا کہ محمد ﷺ سے پوچھو کہ فرزندان یعقوب شام سے مصر کیوں گئے تھے اور یوسفؑ کا واقعہ کیا ہے؟ خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی لیکن عبرانی زبان میں نہیں، بلکہ عربی زبان میں، تاکہ مومن اور مشرکین دونوں اس آیت سے درس عبرت حاصل کریں۔

ان آیات سے وہی نکات اور درس عبرت سامنے آتے ہیں، جو پورے سورۃ میں شروع سے آخر تک پائے جاتے ہیں۔

ایک طرف بھائیوں اور دوسرے حوادث نے ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا اور دوسری طرف یہ کہ ابھی بھائیوں کے بے رحمانہ سلوک سے فارغ نہیں ہو پائے تھے کہ دوسری مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔۔ جب کہ تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کی عنایات ان کے شامل حال رہی اور تمام واقعہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ صاحب تقویٰ اور سچے لوگوں کی زندگی ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے، جیسا کہ خود یوسفؑ فرماتے ہیں: اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۹۰ (یوسف۔90)

حسد کی آگ

جناب یعقوبؑ کی حضرت یوسفؑ اور ان کے ایک بھائی جس کا نام تاریخ میں بنیامین آیا ہے، سے محبت کی وجہ سے ان کے سب بھائی بہت پریشان تھے۔ ان دونوں بیٹوں کی محبت باپ کے دل میں اتنی زیادہ کیوں تھی، اس بات کو ہم بعد میں بتائیں گے، لیکن کچھ بھی رہا ہو اس کا انجام یہ ہوا کہ اس محبت کی وجہ سے حسد کی آگ ان بھائیوں کے دلوں میں بھڑک اٹھی اور انہوں نے اس سلسلہ میں مل کر مشورہ کیا اور ہر ایک نے اپنے دل کی بات کہی جس سے تین باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱)۔یوسفؑ اور اس کا بھائی ہم سے زیادہ باپ کو محبوب ہیں۔
۲)۔ان سے باپ کی زیادہ محبت یقیناً غلط ہے، کیونکہ ہم وہ طاقت ور گروہ ہیں جن کی وجہ سے ان کی زندگی کے ایام گذر رہے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ باپ کی زندگی میں جب کہ ان دونوں کی کوئی حقیقت نہیں کہ ان کو ہم سے زیادہ چاہا جائے۔
۳)۔ان دو باتوں سے انہوں نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اپنے اس عمل میں وہ غلطی کر رہے ہیں، لہٰذا دونوں بیٹوں کی محبت ان کے دل میں بغیر کسی وجہ کے ہے۔
پہلا جملہ یعنی ''اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا (یوسف۔8)'' مطلب اول کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یوسفؑ اور ان کے بھائی سے باپ کی محبت ضرورت سے زیادہ ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ یہ دونوں بھائی ایک ہی ماں ''راحیل'' سے تھے جبکہ دوسرے تمام بھائی دوسری ماں سے تھے۔
یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں بیٹوں کی محبت جناب یعقوبؑ کے دل میں کیوں زیادہ تھی؟ اس کے جواب میں دو باتوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔
۱)۔فطری اور طبعی بات ہے کہ ہر انسان اپنے چھوٹے بچہ کو، جو کمزور و ناتواں ہوتا ہے، بڑے بچوں کی نسبت زیادہ چاہتا ہے (یہ بات صرف لڑکے کے لیے ہی مخصوص نہیں ہوتی)۔
۲)۔حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ کی صورت میں ان کی خصوصی عظمت کو احساس کرتے تھے اور جانتے تھے کہ ان کا علم زیادہ اور روشن ہے۔
آپ کے دوسرے مفہوم کہ جناب یعقوبؑ کی معیشت میں ان لوگوں کا کافی دخل تھا، جملہ ''و نحن عصبه'' سے ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ کہ دس بھائی آپس میں بہت ہی متحد و متفق تھے جیسا کہ تیسری بات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ باپ کے عمل کو غلط شمار کرتے اور اپنی اجتماعی زندگی میں انہیں غلط سمجھتے تھے۔ جملہ ''اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ (یوسف۔8)'' اس طرف اشارہ کرتا ہے۔
آیت میں غور کرنے سے ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے انہیں دینی لحاظ سے غلط نہیں کہا تھا بلکہ وہ ان کے اس فعل کو غلط قرار دیتے اور کہتے تھے کہ یہ بات اجتماعی زندگی کے خلاف ہے۔ ان کا خیال تھا کہ باپ کی شفقت و محبت ہم لوگوں کے لیے زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ ہم لوگوں کے بغیر ان کی زندگی گذارنا ممکن نہیں۔ جب کہ ان دو بچوں کی ان کی زندگی میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں۔ ان کی یہ منطق اگر صحیح سمجھ لی جائے تو معاشرتی غلطی ہی ثابت کرتی ہے، نہ کہ دینی گمراہی۔ لہٰذا دوسرے مفسرین نے اس آیت کی دوسری طرح جو تفسیر کی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعد کی آیات اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ وہ اپنے باپ کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر، شافع، مستجاب الدعوۃ (یوسف۔97) جانتے تھے اور صرف یہ چاہتے تھے کہ باپ کی توجہ یوسفؑ سے ہٹا کر اپنی طرف کر لیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان کی جا چکی ہے۔
دوسری دلیل یہ ہے کہ یہاں ''ضلل مبین'' سے گمراہی دینی مراد نہیں ہے، یعقوبؑ کے بیٹوں کی دوسری جگہ پر گفتگو سے اس طرح واضح ہو جاتی ہے:
جس دن یوسفؑ نے اپنی قمیص قاصد کو دی کہ اسے یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچا دے تو اسی وقت جناب یعقوبؑ نے کہا: اِنِّيْ لَاَجِدُ

رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَآ أَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف۔94)، یعنی ''اگر تم اشتباہ سے کام نہ لو تو مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے''۔ بھائیوں نے فوراً کہا: تَاللّٰهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيمِ (یوسف۔95) یعنی ''خدا کی قسم! آپ اپنی پرانی غلط فہمی میں مبتلا ہیں''۔ اس آیت میں لفظ ''ضلالت'' وہی معنی رکھتی ہے جو آیت مورد بحث میں ہے اور دونوں میں باپ کو غلطی پر جانتے ہیں کہ کیوں بے وجہ ان دو بیٹوں کو ہم لوگوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ حضرت یوسفؑ سے جناب یعقوب علیہ السلام کی محبت ان کے کمالات کی بناء پر تھی اور اس طرح کی محبت قابل ملامت نہیں ہوتی۔ زیادہ محبت اس وقت قابل ملامت ہوتی ہے جب بغیر کسی سبب کے ہو۔

سازش کی منصوبہ بندی

بھائیوں کا مشورہ آخر ختم ہوا اور آخر میں انہوں نے نتیجہ نکالا کہ باپ کی توجہ کو ہٹانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ یوسفؑ کو ان سے دور کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ان دو کاموں میں سے ایک انجام دینا ضروری ہے:

۱)۔ اس کو قتل کر دیں۔

۲)۔ یا اسے کسی ایسی سرزمین پر چھوڑ آئیں جہاں سے وہ وطن واپس نہ آ سکے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: اقْتُلُوْا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوْهُ أَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ (یوسف۔9)

اس سے بھائیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر اس مانع کو اپنی راہ سے ہٹا دیں تو جو مہر و محبت باپ کی یوسفؑ سے ہے وہی ہمارے حصہ میں آجائے گی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ (یوسف۔9)

لیکن پہلا نظریہ ظاہر آیت کے خلاف ہے، کیونکہ جملہ ''وتکونوا'' جملہ ''یخل'' پر عطف ہے اور دونوں شرطیہ جملہ کی جزا شمار ہوتے ہیں جو آیت کے سیاق سے ظاہر ہوتی ہے۔ پس حقیقت میں وہ کہتے ہیں: ''یوسف کو قتل کر دو یا بہت دور چھوڑ آؤ'' اگر یہ کام کرو گے تو نتیجے حاصل ہوں گے:

''اپنے لیے باپ کی مہر و محبت کے باعث کو دور کر دو گے اور پھر نیک بن جاؤ گے''۔

قطعی طور سے جو صلاح قتل یا شہر بدر کرنے سے حاصل ہوگی وہ ان کی نظر میں اصلاح دنیوی میں ہوگی۔

گذشتہ آیت صرف دو باتوں کو ظاہر کرتی ہے یعنی دو نظریہ یوسفؑ کے بارے میں تھے:

ایک قتل، دوسرا شہر بدری، لیکن ان میں ایک اس پر راضی نہ ہوا، بعد کی آیت یہ بتلاتی ہے کہ ان میں سے ایک نے اکثریت کی توجہ کو ایک تیسرے نظریہ کی طرف پھیر دیا، اگرچہ یہ سازش بھی حضرت یوسفؑ کے شہر بدری کے بارے ہی میں تھی۔ وہ سازش یہ تھی کہ اس نے کہا: یوسفؑ کو قتل نہ کرو، بلکہ مخفی طور پر اسے کسی کنوئیں میں ڈال دو تا کہ تجارتی قافلے اس طرف سے گذرتے وقت اسے نکال لیں اور اپنے ساتھ لے کر چلے جائیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوسُفَ وَأَلْقُوْهُ فِي غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (یوسف۔10)

یہ آیت یعنی ''اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ'' اس بات کی شاہد ہے کہ ان لوگوں کے درمیان وہ بھائی ان دونوں نظریوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ جب اس بات کو طے کیا جا رہا ہے کہ اسے باپ سے دور کر دیا جائے تو کم از کم ہم ایسا کام کریں کہ اس کی موت کا سبب نہ بنیں۔

عربی زبان میں کنوئیں کے لیے مختلف الفاظ ہیں جیسے ''بئر''، ''جب''، ''طوی''، اور ''قلیب''۔ جب کسی کنوئیں کو پتھر سے ڈھک دیتے ہیں تو اسے ''طوی'' کہتے ہیں، اس کے بغیر ''بئر'' یا ''جب'' کہتے ہیں۔

''غیابت'' لغت عرب میں کنویں کے اندر کے ایسے حصہ کو کہتے ہیں جسے دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے ''غیابت'' کنوئیں کی ایسی جگہ کو کہتے ہیں جس کے اطراف میں دیوار بنا دی جاتی ہے کہ آدمی وہاں آسانی سے بیٹھ جائے اور ڈول میں پانی بھر بھر کر دیتا ہے، خود پانی میں نہ اترے، بلکہ ڈول بھر کر اوپر بھیجتا رہے تا کہ وہ دوسرا ڈول اندر بھیج دیں۔

منصوبہ پر عمل

تمام بھائیوں نے اس رائے پر اتفاق کیا اور اسی پر عمل کرنے پر تیار ہو گئے۔ اس لیے انہوں نے اپنے والد بزرگوار کے پاس بیٹھ کر بڑی محبت و دلسوزی سے عرض کیا:

۱)۔ آپ کیوں یوسفؑ کو ہم لوگوں کے ساتھ نہیں بھیجتے؟ کیا آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے؟

۲)۔ یوسفؑ کو بھی دوسرے جوانوں کی طرح سیر و تفریح کی ضرورت ہے۔ انہیں گھر سے باہر لے جانا ضروری ہے تا کہ وہ بھی نعمات خدا سے مستفید ہوں۔

۳)۔ اگر آپ کو اس بات کا ڈر ہے کہ راستے میں کچھ ان کے لیے خطرہ لاحق ہو گا تو ہم اس کے محافظ و نگہبان ہیں۔ قرآن اس مفہوم کی طرف اس طرح اشارہ فرماتا ہے: قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ۔ (پہلے مطلب کی طرف اشارہ)

اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ (دوسرے مطلب کی طرف اشارہ)

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (تیسرے مطلب کی طرف اشارہ)

''رتع'' عربی زبان میں حیوانوں کے چرانے کو کہتے ہیں لیکن انسان کے لیے اس سے سیر و تفریح مراد ہے۔

بیٹوں نے ان تین سوالات کو باپ کے سامنے رکھ کر انہیں عجیب طرح مجبور کر دیا۔ اگر یہی کہیں کہ ان کے بیٹے سیر و تفریح کی ضرورت نہیں ہے تو یہ خلاف واقع ہوتا کیونکہ لڑکپن کھیل کود کا دور ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر بھائیوں کی محافظت سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم پر اعتماد نہیں، تو مشکل مزید بڑھ جاتی ہے یعنی برادران یوسف کے دلوں میں یوسفؑ کی دشمنی زیادہ ہو جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے جس سے عداوت کا پردہ چاک ہوتا ہے جو ہرگز صحیح نہیں۔

لہٰذا آپ نے ان لوگوں کی بات کے جواب میں نور الٰہی سے مشورہ کیا کہ کوئی راستہ نکل آئے اور کوئی اور سبب سیر و تفریح سے روکنے کے لیے بیان کریں۔ اس وجہ سے انہوں نے دو باتیں پیش کیں:

۱)۔ان کا لے جانا میرے لیے رنج وغم کا سبب ہوگا کیونکہ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:اِنِّىۡ لَيَحۡزُنُنِىۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا (یوسف۔13)

۲)۔بکریوں کی چارہ گاہ بھیڑیوں سے خالی نہیں ہوتی۔ممکن ہے تم لوگ غافل ہوجاؤ اور بھیڑیا اسے کھالے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:وَاَخَافُ اَنۡ يَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَاَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ (یوسف۔13) اس وقت تمام بھائی باپ کو جواب دینے کے بارے میں سوچنے لگے،لیکن موضوع کے مطابق بات نہ کہی کیونکہ یہ مسئلہ قابل حل نہیں تھا۔حضرت یوسفؑ کا باہر لے جانا یقیناً جناب یعقوبؑ کے غمگین ہونے کا سبب تھا۔

لیکن دوسری بات کے بارے میں یہ جواب دیا:(یوسف۔14) یعنی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہماری اس طاقت ور جماعت کے ہوتے ہوئے جب کہ یوسفؑ ہماری حفاظت میں ہوگا،اسے بھیڑیا کھا جائے اور ہم اس کی حفاظت نہ کرسکیں،کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ اگر اس طرح کا حادثہ پیش آجائے تو ہم لوگ کس طرح اتنے بے بس ہوجائیں گے کہ اپنے بھائی کی حفاظت بھی نہ کرسکیں۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ انہوں نے یوسفؑ کو ساتھ لے جانے کے وقت کہا تھا:وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (یوسف۔12) یعنی ''ہم لوگ یوسفؑ سے دور نہیں جائیں گے''۔

لیکن جب وہ انہیں لے گئے اور رات کو گھر واپس پلٹے تو یوسفؑ کے بھیڑیا اٹھالے جانے کی خبر دی اور کہا:اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَتَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا (یوسف۔17) یعنی ''ہم آپس میں کھیل کود میں مصروف ہوگئے اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا ،اس طرح بھیڑیا اس کو کھا گیا''۔

سبق آموز نکات

اس باب میں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

۱)۔جناب یعقوبؑ کو ان لوگوں کی دشمنی اور پہلے سے طے شدہ فریب کا علم تھا۔لہٰذا وہ جانتے تھے کہ یوسفؑ کو ان کے بھائی و باپ سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔ان لوگوں کو تو بالکل کچھ نہ کہا بلکہ یہ کہا کہ یوسفؑ کی جدائی ہمارے لیے قابل برداشت نہیں۔۔یہ بات ہمارے لیے ایک بہت بڑا درس ہے کہ ہمیں دشمن کو بغیر کسی دلیل یا واقعہ رونما ہونے سے پہلے متہم کردیں۔

۲)۔جناب یعقوبؑ نے اپنی دوسری ایسی بات کہی جسے خود ان کے بیٹے نے اپنے لیے ترکیب قرار دیا۔انہوں نے کہا:''میں ڈرتا ہوں کہ کہیں بھیڑیا اسے کھا نہ لے،یہی بات اس کا سبب بنی جس سے ان کے بیٹے اپنا عذر بنا کر نجات پانا چاہتے تھے جب کہ باپ نے یہ جملہ صاف و پاک دل سے کہا تھا،لیکن انہوں نے اس سے سوئے استفادہ کیا۔

جدائی کا آغاز

موضوع سے متعلق آیات

وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿١٦﴾
قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ
الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾
وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ
فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾
وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ
وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾
وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ ﴿٢٠﴾
(یوسف۔۱۶ تا ۲۰)

آیات کا ترجمہ:

۱۶)۔ یہ لوگ (برادران یوسفؑ) رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔

۱۷) کہنے لگے: ''ابا جان! ہم لوگ تو جا کر دوڑ نے بھاگنے لگے اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا۔ ہماری غیر حاضری میں بھیڑیا آ کر اسے کھا گیا۔ اب ہم لوگ اگر سچے بھی ہوں تب بھی آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا''۔

۱۸)۔ (خدا کی شان دیکھو) ایک قافلہ (وہاں) آ کر اترا۔ ان لوگوں نے اپنے سقہ کو (پانی بھرنے) بھیجا۔ اس نے اپنا ڈول پانی نکالنے کے لیے ڈالا۔ (پھر جب اس نے ڈول کھینچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان رسن بستہ اس کے ساتھ باہر آیا، اس نے خوش ہو کر کہا: یہ تو لڑکا ہے''۔ قافلہ نے (یوسفؑ کو) قیمتی سرمایہ سمجھ کر چھپا لیا حالانکہ جو کچھ یہ

لوگ کر رہے تھے، اللہ اس سے خوب واقف تھا۔

۲۰)۔(جن لوگوں نے یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا تھا انہوں نے) یوسفؑ کو گنتی کے کھوٹے چند درہم (بہت تھوڑے دام) پر بیچ ڈالا۔ اور وہ لوگ تو (یوسفؑ) سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے مختلف حیلہ و بہانہ سے اپنے خاص مقصد کے لیے ان کو اپنے والد بزرگوار سے الگ کیا۔ انہیں جنگل میں لے آئے اور نہایت سنگدلی سے انہیں اس امید سے کنوئیں میں پھینک دیا کہ شاید اس طرف سے کوئی قافلہ گذرے اور یوسفؑ کو کنوئیں سے باہر نکال لے۔۔ آخر کار حضرت یوسفؑ نے اپنے آپ کو کنوئیں میں پایا اور سکون سے وہیں بیٹھ گئے۔

حضرت یوسفؑ کے بھائی یہاں کھیل کود میں مصروف رہے اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ لیکن کام یہیں پر ختم نہیں ہوتا کیونکہ یوسفؑ کے بارے میں انہیں جواب دہ ہونا تھا کہ کیا وجہ ہوئی کہ صبح صبح تو یوسفؑ کو ساتھ لے کر گئے تھے لیکن شام کو بغیر یوسفؑ کے کیوں واپس ہوئے۔

جھوٹی رپورٹ

لہٰذا ان لوگوں نے طے کیا کہ یہ کہا جائے کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا، لیکن یہ جواب باپ کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ سوال ہو سکتا تھا کہ تم دس طاقت ور بھائیوں کے ہوتے ہوئے کیسے بھیڑیا انہیں لے گیا اور تم لوگوں نے کوئی مدافعت نہ کی۔ اس وجہ سے رائے یہ ہوئی کہ کہا جائے کہ ہم لوگوں نے آپس میں مقابلہ کا ایک کھیل شروع کیا جس میں ہم یوسفؑ کو نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس لیے یوسفؑ کو وہیں پر چھوڑ دیا جہاں ہم نے اپنا سامان رکھا تھا۔ جب کھیل سے واپس ہوئے اچانک دیکھا کہ یوسفؑ کی خون آلود قمیص تو ہے لیکن یوسفؑ وہاں نہیں، ان سب نے مل کر اپنے والد بزرگوار کے لیے یہ بات بنائی اور ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: وَجَآءُوٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ۔ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ

لفظ 'عشا' سے آغاز شب یا نماز مغرب و عشاء کے درمیان کا وقت یا آدھی رات مقصود ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح آیت میں ''نستبق'' استباق سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں دو آدمیوں میں ہر ایک کا کسی خاص ہدف کے لیے آگے بڑھنا۔ لفظ ''مؤمن'' جو ''لام سے متعدی ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے'' بمومن لنا'' غالباً با سے متعدی ہوتا ہے، لیکن دونوں میں فرق شاید یہ ہے کہ اگر ایمان واقعی ہوتا ہے تو باء کے ذریعے متعدی ہوتا ہے۔ اور اگر ایمان صوری ہوتا ہے تو لام کے ذریعہ متعدی ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: (توبہ۔61) یعنی'' خدا پر ایمان رکھتا ہے اور مومنین کی باتوں پر بھی''۔ البتہ یہ فرق اس وقت ہوتا ہے جب دونوں صورتیں ایک ہی جملے

میں ہی پائی جاتی ہیں۔ان لوگوں نے اپنے والد بزرگوار کو یقین دلانے کے لیے یوسفؑ کے قمیص کو دنبہ کے خون سے رنگ لیا۔قرآن نے اسے جھوٹا خون کہا ہے کیونکہ یہ خون یوسفؑ کا نہیں تھا بلکہ دنبہ کا خون تھا جسے ذبح کرنے کے بعد اس کے خون سے یوسفؑ کی قمیص کو رنگ دیا گیا تھا جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ (یوسف۔18) خون کے جھوٹا ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ وہ یوسفؑ کی قمیص بالکل صحیح وسلامت لے کر آئے تھے۔یقیناً اگر یوسفؑ بھیڑیے کا شکار ہوئے ہوتے تو قمیص کے ٹکڑوں کے علاوہ کچھ نہ بچا ہوتا۔

یہاں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ جھوٹ باطل کی ایک شاخ ہے جو پائیدار نہیں ہوتی۔آخر کار جھوٹا رسوا ہو کر رہتا ہے کیونکہ سچ دنیا میں ہمیشہ اپنے ساتھ شواہد قائم رکھتا ہے۔جھوٹے لوگ جھوٹ سے حقیقت کو چھپا تو لیتے ہیں لیکن ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اس کے جملہ لوازمات کو بھی چھپا سکیں۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ غالباً وہ لوگ ان لوازمات کے سلسلہ میں غفلت کرتے ہیں یا اس کے لوازمات کو سمجھ نہیں پاتے۔اس کی مثال یہی ہے کہ یوسفؑ کی قمیص صحیح سالم رہتی ہے اور وہ بھیڑیے کے شکار سے ان کی موت ظاہر کرتے ہیں۔ان لوگوں نے قتل یوسفؑ کو چھپانے کے لیے انہیں بھیڑیے کا شکار تو بتایا لیکن یہ نہ سمجھ پائے کہ ان کی حیات کو ان کے پیراہن کی سلامتی ظاہر کر دے گی۔اس لیے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (زمر۔3) یعنی اللہ تعالیٰ حق کو چھپانے والے جھوٹوں کی ہدایت نہیں فرماتا۔

حضرت یعقوبؑ کا ردعمل

حضرت یعقوبؑ جو دل وجان سے اپنے لخت جگر کو چاہتے تھے،اس خبر کو سن کر جو ہر باپ کے دل کو ہلا کر رکھ دیتی ہے،قریب تھا کہ اپنے کپڑوں کو چاک کر ڈالتے اور اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگتے یا کوئی ایسا کام کرتے جو ہر انسان مصیبت کے وقت کرتا ہے،لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے یوسفؑ کے بھائیوں سے صرف دو جملے کہہ کر اس مسئلہ کو ختم کر دیا اور ایسا ردعمل ظاہر کیا کہ اس فکر کو وہ لوگ ترک کر کے معمولی زندگی پر آ جائیں۔وہ دو جملے اس طرح ہیں:

۱۔قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا

۲۔فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ

جناب یعقوبؑ نے پہلے جملہ سے ان کے جھوٹ کو ظاہر کیا اور فرمایا: ''یہ بات تمہارے نفس امارہ کی پیداوار ہے۔''سوّل'' زبان عرب میں ''تسویل'' سے مشتق ہے جس کے معنی بناوٹ اور حقیقت سے خالی کلام کے ہیں۔

دوسرے جملہ میں آپ نے یہ کہنا چاہا کہ اس کلام میں ہمارا ردعمل صرف یہ ہے کہ میں مستقل صبر واستقلال کو ظاہر کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے،اللہ تعالیٰ ہی سے اس مصیبت میں مدد طلب کروں جو تم نے میرے لیے پیدا کی ہے۔

حضرت یعقوبؑ نے ان دو اہم جملوں سے بات ختم کر دی گویا ان کی کسی بات کا اثر نہ لیا۔[1]

اس طرح جناب یعقوبؑ نے اپنے خاندان کی عزت بچالی اور بیٹوں کی زندگی کو نا اتفاقی سے بچا لیا تا کہ وہ اپنے کاروبارِ زندگی کو جاری رکھیں۔ حضرت یعقوبؑ کو اس کام کے لیے دو باتوں نے آمادہ کیا:

۱۔ وہ اپنی دروغ گوئی سے آگاہ ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ یوسفؑ زندہ ہیں۔

۲۔ مصیبت کے وقت دشمن کے مقابلہ میں اتنا مضبوط قلعہ بن جائے کہ وہ قلب و دماغ میں نفوذ ہی نہ کر سکے۔ اسی لیے انہوں نے صبر کو ایک طاقت ور قلعہ سمجھ کر انتخاب کیا تا کہ خاندان کے داخلی معاملات خراب نہ ہونے پائیں، اور دوسری طرف بظاہر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی کہ ان کے جھوٹ کو ظاہر کر کے حقیقت کو روشن فرمائے۔

انبیاء کے مناسب ترین بات یہی ہے جو آیات بتلا رہی ہیں، وہ نہیں توریت میں جس کی تفصیل بیان ہوئی ہے جو اس طرح ہے:

''اس وقت ان لوگوں نے یوسفؑ کی قمیص کو لیا اور بکری کے بچہ کو ذبح کر کے اس کے خون میں رنگین کر دیا۔ پھر اس رنگین قمیص کو باپ کے پاس لے کر آئے اور کہا کہ ہمیں یہ قمیص ملی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ یہ قمیص آپ کے بیٹے کی ہی ہے یا نہیں؟

انہوں نے اس قمیص کو پہچان کر کہا: ''یہ میرے بیٹے کی ہی قمیص ہے۔ کسی درندہ نے اسے پھاڑ کھایا ہے۔ یقیناً یوسفؑ چیر پھاڑ ڈالے گئے ہیں''۔ پھر حضرت یعقوبؑ نے اپنے لباس کو چاک کر ڈالا اور کمر میں پٹکہ باندھ کر بہت دنوں تک گریہ کرتے رہے، یہاں تک کہ تمام لڑکے اور لڑکیاں انہیں تسلی دینے لگے۔ لیکن اس کے بعد وہ رونے سے باز نہ آئے اور کہا میں اپنے بیٹے کی قبر پر اسی طرح روتا ہوا جاؤں گا۔ اس طرح ان کے باپ ان کے غم میں بہت روئے۔

یہ جملے قرآن سے بہت مختلف ہیں:

۱)۔ قرآن میں قمیص کا ذکر آیا ہے جب کہ توریت میں لفظ قبا آیا ہے۔

۲)۔ قرآن کہتا ہے انہوں نے اپنے بیٹے کی اس خبر کو شیطانی فعل قرار دیا اور اسے جھٹلا دیا جب کہ توریت میں آیا ہے کہ اس پر یقین کیا۔

۳)۔ توریت کے مطابق یہ خبر سن کر جناب یعقوبؑ بہت غمگین ہو گئے اور صف عزا بچھائی جبکہ قرآن میں یہ خبر سننے کے بعد صرف انہی دو جملوں کا تذکرہ ہے۔

کنوئیں سے حضرت یوسفؑ کی نجات

حضرت یوسفؑ کنوئیں میں اللہ پر بھروسہ کر کے آرام و اطمینان سے بیٹھ گئے۔ بعض روایتیں کچھ دعاؤں کا تذکرہ کرتی ہیں جو اس وقت جناب یوسفؑ نے پڑھیں: یعنی ''اللّٰھم انی اسئلك بأن لك الحمد لا الہ الا انت المنان بدیع السمٰوٰت والارض

---

[1] اگر حضرت یعقوبؑ بعد میں کسی بے تابی کا مظاہرہ کرتے تو اس کا ان کی اپنی کیفیت سے کوئی ربط نہ ہوتا۔ احساس غم کا اصل موقعہ ہی تھا جسے انہوں نے نہایت عقلمندی سے باتیں کر کے ختم کر دیا۔

ذوالجلال والاکرام ان تصلی علی محمد وآل محمد وان تجعل لی مما انا فیه فرجًا ومخرجًا''[1]

جیسا کہ یوسف کے بھائیوں نے سوچ رکھا تھا اور اندازہ لگایا تھا کہ ایک تجارتی قافلہ جو مدین سے مصر کو جا رہا تھا، اس سرزمین سے گذرا اور وہاں آ کر رکا تاکہ پانی لے سکیں۔ بہشتی نے جس کو عربی زبان میں ''وارد'' کہتے ہیں، پانی نکالنے کے لیے اپنا ڈول کنوئیں میں ڈالا۔ یوسفؑ تو نجات پانے کے انتظار میں تھے ہی، جونہی انہوں نے رسی کو دیکھا، جو ڈول کے ساتھ کنوئیں میں ڈالی گئی تھی، موقع ہی نہ دیا کہ ڈول پانی سے بھرے۔ فوراً اس کو پکڑ لیا، ادھر بہشتی نے سمجھا کہ ڈول پانی سے بھر گیا ہے۔ اس لیے اسے اوپر کی طرف کھینچا۔ اچانک اس کی نظر ایک خوبصورت نوجوان پر پڑی۔ اس نے یہ دیکھ کر کہا: ''واہ واہ کیا کہنا کہ پانی کی جگہ اتنا خوبصورت جوان کنوئیں سے باہر آیا ہے''۔

قرآن مجید فرماتا ہے: وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ (یوسف۔19) جملہ ''فادلیٰ دلوہ'' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بہشتی اکیلا ہی تھا۔ بعد کے جملوں میں ضمیر جمع غائب ''واسرو''، ''وشروہ'' اس لیے آئی ہے کہ جب بہشتی کی نظر جوان پر پڑی تو پکارا اٹھا جس کی وجہ سے کاروان کے تمام لوگ اس جوان کے گرد جمع ہو گئے اور اپنے آپ سے کہنے لگے: ''ایک بڑی دولت ہاتھ آئی ہے۔ اسے اس وقت تک محفوظ رکھیں مبادا کہ اس کے مالک کو پتہ چل جائے اور آ کر اسے لے جائے''۔

قرآن مجید نے اس مفہوم کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا ہے: وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (یوسف۔19) یعنی کاروان کے کچھ لوگوں نے، یا وہ سب جو اس کے پاس جمع ہو گئے تھے، یہ سوچا کہ ایک بڑی دولت ہاتھ آئی ہے۔ لہٰذا اسے تجارتی سامان سمجھ کر چھپا لیا۔ بہرحال ان لوگوں نے جو کچھ بھی کیا اللہ اس سے آگاہ تھے۔

اب قرآن اس جوان کے بیچنے کے بارے میں فرماتا ہے۔ ظاہری آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں نے یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا تھا انہیں لوگوں نے انہیں بیچ ڈالا، اور عجیب بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے یوسفؑ کو سستا مال سمجھ کر چند کوڑیوں میں بیچ ڈالا کیونکہ وہ لوگ ان کی حقیقت سے ناواقف تھے یا ان کی قیمت نہیں جانتے تھے، یا اس چیز کا خوف رہا ہو کہ کہیں اس کے باپ کو پتہ نہ چل جائے، راز فاش ہو جائے اور یہ سودا ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ (یوسف۔20)

جملہ ''وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ'' پہلے والے جملے کی وضاحت کرتا ہے: ''وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ'' یعنی ان لوگوں نے بالکل دلچسپی نہ لی اور کم قیمت میں انہیں بیچ ڈالا کیونکہ شاید وہ لوگ جانتے تھے کہ یقینی طور پر یہ جوان غلام نہیں ہے کیونکہ غلاموں کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے تھے جس کی وجہ سے ان لوگوں نے چند درہم میں ان کو بیچنا غنیمت جانا۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۲ ص ۱۶۔ اسی کتاب میں حضرت یوسفؑ کی کچھ اور دعائیں بھی نقل ہوئی ہیں۔ یعنی خداوندا! تجھ سے ہی درخواست کرتا ہوں کیونکہ تمام تعریف تیرے لیے سزاوار ہے۔ کوئی معبود تیرے سوا نہیں، تو ہی بہت زیادہ نعمات کا عطا کرنے والا، آسمانوں اور زمین کا خالق، صاحب جلال و کرم ہے۔ میں تجھ سے ہی التماس کرتا ہوں کہ محمد و آل محمد پر درود نازل فرما اور مجھے موجود حالت سے نجات عطا فرما۔

آیت کے ظواہر سے یہی پتہ چلتا ہے جس طرح ہم نے تفسیر کی ہے۔ کسی جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب یوسفؑ کے بھائیوں نے بعد میں ان کی خبر لی تو تمام واقعہ سے مطلع ہوئے اور یوسفؑ کو اپنا بھائی ہونے سے چھپایا اور کہا کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ پس ان لوگوں نے اس کو بطور غلام چند درہم میں بیچ دیا۔ لیکن یہ تفسیر آیت کے جملوں ''ارسلوا''، ''واسروا''، ''وشروہ'' سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ظاہر آیت یہ ہے کہ تمام ضمیریں ایک نقطہ کی طرف ہی پلٹتی ہیں نہ کہ پہلی اور دوسری قافلہ کی طرف اور تیسری یوسفؑ کے بھائیوں کی طرف۔

لیکن توریت سے دوسرے معنی ہی کا پتہ چلتا ہے یعنی توریت کہتی ہے:

''یہودا'' (سب سے بڑے بھائی) نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اپنے بھائی کو قتل کرنے اور اس کے خون کو چھپانے کا ہمیں کیا فائدہ؟ آؤ اسے اسمٰعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیں اور اس کے قتل میں ہم لوگوں کا ہاتھ نہ آئے۔ کیونکہ آخر وہ ہمارا بھائی اور ہمارا گوشت پوست ہی تو ہے۔ بھائیوں نے یہ تجویز قبول کر لی۔ کچھ تجارت پیشہ لوگ ادھر سے گذر رہے تھے، جنہوں نے یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا اور لا کر اسمٰعیلیوں کے ہاتھ بیس چاندی کے سکوں کے عوض بیچ ڈالا جو حضرت یوسفؑ کو لے کر مصر چلے گئے۔[1]

یہاں تک حضرت یوسفؑ کی زندگی کا وہ ابتدائی حصہ ہے جو شفقت پدری کا مظہر تھا یعنی کنوئیں سے نکلنے تک تمام ہوا۔ اب وقت آ پہنچا ہے کہ یوسفؑ کی زندگی کا دوسرا حصہ شروع کیا جائے۔

---

[1] تورات سفر تکوین فصل ۳۷ آیات ۲۶ تا ۲۸

زندگانی یوسف علیہ السلام کا دوسرا حصہ

یوسفِ کنعانی

عزیز مصر کے گھر میں نئی زندگی کا آغاز

موضوع سے متعلق آیات

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ یَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ؗ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۲﴾ (یوسف۔۲۱،۲۲)

آیات کا ترجمہ:

۲۱)۔(یوسفؑ کو لے کر مصر پہنچے اور وہاں اسے بڑے نفع پر بیچ ڈالا) جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا اپنی بیوی (زلیخا) سے کہنے لگا کہ اسے عزت و آبرو سے رکھ کہ یہ شاید ہمیں کچھ نفع پہنچائے یا اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں اور یوں یوسفؑ کو (ملک مصر) میں متمکن کر کے مرتبہ دوام عطا فرمایا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ ہم اسے خوابوں کی تعبیر بھی سکھائیں اور اللہ تو اپنے کام پر (ہر طرح) غالب و قادر ہے۔ مگر بہتیرے لوگ اس کو نہیں جانتے۔

۲۲)۔ جب یوسفؑ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا اور نیکوکاروں کو ہم یونہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

کنعانی نوجوان کی نئی زندگی کا آغاز شہر مصر میں داخل ہونے کے بعد ہوا۔ اسے پھٹے پرانے لباس میں مصر کے بازار میں لایا گیا اور

ایک مصری نے اسے خرید لیا۔ آیت میں خریدنے والے کو لاولد بتایا گیا ہے جیسے جیسے یہ واقعہ آگے بڑھتا ہے یوسفؑ کا خریدار واضح ہوتا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید صرف ضروری باتوں پر اکتفاء کرتا ہے۔ اس مصری شخص نے جب اس معصوم نوجوان کو دیکھا، جس کی عمر ابھی صرف سات یا نو سال کی تھی،[1] تو اس کے چہرہ پر عظمت و بزرگی کا مشاہدہ کیا اور اس کو خرید کر غلاموں کے زمرے میں رکھنے کی بجائے اپنی زوجہ کے حوالے کر کے کہا کہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو، ممکن ہے یہ بچہ مستقبل میں ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنا لیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (یوسف۔21)

مشیت الٰہی نے چاہا کہ حضرت یوسفؑ کو سرزمین مصر میں عزت بخشے اور اسے عزت کے لیے کئی چیزیں دی جائیں جن میں سے ایک خواب کا علم ہو جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ٘ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ

سوال یہ کہ "ولنعلمه" کا کس جملہ پر عطف ہوتا ہے؟ جواب واضح ہے کہ اس کا معطوف علیہ "مقدر" ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ٘ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ لنفعل فی حقه كذا وَمَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ یعنی اس کی خاطر کچھ کام کریں اور اسے تعبیر خواب کا علم عطا کریں۔

اس آیت میں "تمکن" سے مراد مصر کے ایک متمکن گھر میں ورود ہے اور یہ تمکن یوسفؑ کی زندگی کے نشیب و فراز میں باقی رہا۔ دوسری جگہ پر ارشاد ہوتا ہے: وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ (یوسف۔56) یعنی اسی طرح ہم نے یوسفؑ کو اس سرزمین پر متمکن فرمایا کہ وہ جہاں چاہے زندگی بسر کرے۔

اگر حضرت یوسفؑ کے بھائی چاہتے تو ان کو کسی ایسی سرزمین میں پھینک آتے جہاں ان کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ اسی لیے اپنی تجویز میں کہا "اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا" خداوند متعال ان کے جواب میں فرماتا ہے: "ابھی ان لوگوں کی فریب کاری کے چند روز بھی نہیں گذرے تھے کہ ہم نے یوسفؑ کو مصر میں تمکن و عزت بخشی اور ان کی زندگی میں اس طرح کی ناز و نعمت فراہم کی کہ کسی طرح کی کمی نہ رہی"۔

اس کے بعد خیانت کار بھائیوں کے جواب میں فرماتا ہے: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ (یوسف۔21)۔ دنیا کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کاموں میں خود مختار ہے۔ وہ ہر انسان کے معیار زندگی کو بلند بھی کر سکتا ہے اور پست بھی۔ دوسری جگہ فرماتا ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (اعراف۔54) یعنی "خلقت و نظم و نسق اس کے ہاتھ میں ہیں، بزرگ ہے پروردگار عالمین"۔

جملہ "كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ" میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

ا)۔ یہ جملہ خود جناب یوسفؑ سے ہی مخصوص ہو، یعنی جس طرح حضرت یوسفؑ کو ہم نے کنوئیں سے نجات دی ہے اور اپنے لطف و کرم

---

[1] نور الثقلین، ج ۲ ص ۴۰۶ ممکن ہے "سبع"، "تسع" سے متحرف ہو گیا ہو کیونکہ پہلے نقطے لگانے کا رواج نہ تھا۔ اسی لیے "تسع" و "سبع" میں شبہ ہو سکتا ہے۔

کو ان کے شامل حال کیا، اسی طرح اسی مرحلہ میں بھی ہم نے اس کو ہر طرح سے لطف و آرام میں رکھا اور شہر مصر کے ایک گھر میں رکھا جہاں دنیا کی ہر نعمت انہیں ملتی رہے۔

ا)۔ممکن ہے کہ یہ جملہ ایک قانون کلی ہو۔یعنی ہمارا یہ طریق ہے کہ ہم نیک بندوں کو، جو ہم سے لو لگائے ہوئے ہیں، اچھی جزا دیتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ اس مصری شخص کے گھر میں داخل ہوئے اور اپنی زندگی کا آغاز کیا، یہاں تک کہ وہ مرحلہ کمال خلقت اور جسم و روح کے لحاظ سے کامل ہو گئے۔ یہ مرحلہ زندگی بلوغ سے شروع ہوتا ہے اور مدت تک قائم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کے اس مرحلے کو''بلوغ اشد'' کے نام سے یاد فرمایا ہے''اشد'' بالمفرد ہے جمع کے وزن پر، یا جمع ہے جس کا مفرد نہیں۔لغت میں اس کے معنی دو رسیوں کو گرہ لگانا۔اور آہستہ آہستہ جسمانی اور روحانی طاقتوں کے بڑھنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے۔

اب یہ تکامل عمر انسانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس حالت میں بازو قوی، سینہ چوڑا، آنکھیں کھلی ہوئی اور آواز بھاری ہو جاتی ہے ، یہ حالت انسان میں تدریجی طور سے شروع ہوتی ہے۔آخری مرحلے تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر سن بلوغ کی آخری عمر ۲۵ سال بتاتے ہیں۔اس سے حضرت یوسفؑ کی جوانی کی عمر کی وضاحت نہیں ہوتی لیکن آئندہ حالات کے واقعات جو ملکہ مصر کے عشق کو بیان کرتے ہیں، ان سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بلوغ کی عمر ۱۸ سے ۲۰ سال کی ہوگی۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے عمر کے اس حصہ میں انہیں دو چیزیں عنایت فرمائیں یعنی حکم و علم، لیکن اس بات کو یاد رکھیں کہ اس طرح کی عنایتیں صرف حضرت یوسفؑ سے مخصوص نہیں بلکہ تمام متقی و پرہیز گار لوگ ان دو نعمتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (یوسف۔22) (نیک کام کرنے والوں)یعنی''محسنین'' کی تعبیر صرف انبیاء کے لیے مخصوص نہیں کیونکہ ایک طرح آیت یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ تمام نیک کام کرنے والوں کو حکم و علم عطا کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ حکم کا مطلب حکمت اور حکیمانہ باتیں ہیں اور علم سے مراد کلی علوم جن کے سائے میں ریاست کی مشکلات کو حل کیا جا سکتا ہے۔

توریت میں حضرت یوسفؑ کے خریدار کی زندگی کے حالات اس طرح بیان کئے گئے ہیں:''یوسفؑ کو مصر میں لا یا گیا'' ''پوطیفر'' خواجہ سرائے فرعون کے خاص لشکر کے سردار مصری نے اسمٰعیلیوں سے جو وہاں انہیں لائے تھے، کے ہاتھ سے خریدا، خداوند عالم حضرت یوسفؑ کے ساتھ تھا اسی نے انہیں کامیاب کیا۔جب اس نے دیکھا کہ اللہ حضرت یوسفؑ کے ساتھ ہے اور جو بھی وہ کرتے ہیں اللہ ان کی مدد کرتا ہے تو اس نے حضرت یوسفؑ پر نظر التفات رکھی اور انہیں اپنے گھر کا نگران بنا دیا اور تمام نظام ان کے حوالے کر دیا۔خداوند عالم نے یوسفؑ کا پاس و لحاظ رکھنے کے لیے اس کے گھر میں برکت دی اور اس برکت نے اس کے گھر باہر کی چیزوں کا احاطہ کر لیا جس کی وجہ سے اپنا سب کچھ حضرت یوسفؑ کے حوالے کر دیا، حتیٰ کہ اپنے کھانے پینے کے سوا کسی چیز پر اپنی نظر نہ رکھی۔[ا]

[ا] تورات۔سفر تکوین، فصل ۳۹، آیات ا تا ٦

(۲)۔ایمان وخواہشات کی جنگ

اب یوسفؑ اپنے تمام جمال وکمال اور دلربا حسن کے ساتھ بیس سال کے سن میں داخل ہوئے۔ظاہری حسن متانت، سنجیدگی سے بات کرنے کے علاوہ ان کی اور بہت سی دوسری عادات اس بات کا سبب بنیں کہ عزیز مصر کی زوجہ ان پر عاشق ہوگئی (ان صفات کی موجودگی میں نہ صرف عزیز مصر کی بیوی بلکہ کوئی بھی اس کی جگہ ہوتا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ رکھتا آپ کے ساتھ عشق کرنے لگتا) قرآن حکیم نے حضرت یوسفؑ کی زندگی کے اس مرحلہ کو (جب کہ عشق وایمان کے درمیان عزیز مصر کے گھر میں جنگ ہونے لگی جس میں ایمان کو آخر غلبہ ہوا، بلکہ ایک لحاظ سے اس کی رہبری ہوئی) آیات کے ضمن میں اس طرح ذکر فرمایا ہے:

موضوع سے متعلق آیات

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ
قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ
السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ
قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾
قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ
مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾
وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾
فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾
يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ
الْخٰطِئِيْنَ ﴿۲۹﴾ (یوسف۔۲۳ تا ۲۹)

آیات کا ترجمہ:

۲۳)۔اور وہ (خاتون خانہ) بہانہ سے حضرت یوسفؑ کی طرف آئی تا کہ انہیں اپنی طرف متوجہ کرے (اور اپنی ہوس پوری کرے) اس نے دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی لو آؤ! یوسفؑ نے کہا میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے سرپرست سے خیانت کروں)، وہ میرا مالک ہے اس نے مجھے اپنے گھر میں اچھی طرح رکھا ہے اور ظلم کرنے والے یقیناً کامیاب نہیں ہوتے۔

۲۴)۔اس عورت نے ان سے برائی کا ارادہ کیا، وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے۔ ہم نے اس طرح یوسفؑ سے برائی و بدکاری کو دور رکھا کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔

۲۵)۔وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے۔ اس عورت نے (یوسفؑ کو باہر نکلنے سے روکنے کے لیے ان کا کرتا پکڑ کر کھینچا جس کے نتیجہ میں) کرتا پھٹ گیا۔ دروازہ پر اس عورت کے شوہر کو موجود پایا۔ اس عورت نے گھبرا کر فریاد کی کہ جو تمہاری عورت کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے علاوہ اور کیا ہوگی کہ اسے قید کر لیا جائے، یا اس پر دردناک عذاب کیا جائے۔

۱۶)۔یوسفؑ نے (اس حالت میں حقیقت سے پردہ اٹھانے کے علاوہ کوئی صورت نہ پا کر) کہا کہ یہ مجھ سے بدکاری کی خواہش رکھتی تھی، پس اس خاتون کے نزدیکیوں میں سے ایک نے گواہی دی: ''یوسفؑ کی قمیص سامنے سے پھٹی ہے تو تیری زوجہ تجھ سے ٹھیک کہتی ہے اور یوسفؑ جھوٹوں میں سے ہے''۔

۲۷)۔''اور اگر یوسفؑ کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو تیری زوجہ جھوٹی ہے اور یہ سچوں میں سے ہے''۔

۲۸)۔پھر جو دیکھا تو ان کا کرتا پیچھے سے پھٹا پایا۔ پس اس نے کہا کہ یہ تم عورتوں کی مکاری ہے۔ تمہارا مکر بے شک بہت بڑا ہوتا ہے۔

۲۹)۔یوسفؑ اب تم اس سے اعراض کرو اور تو اپنے گناہ کے لیے استغفار کر کہ تو خطاکاروں میں سے ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

یوسفؑ نے عزیز مصر کے گھر میں کئی سال زندگی گذاری۔ اس دوران لازمی طور پر بہت سے کاموں میں سے کسی نہ کسی کام میں

مشغول رہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی جوان کئی سال تک کسی کے گھر میں زندگی گذارے اور اس کے ذمہ کوئی کام نہ لگایا جائے۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا ان کا اکثر کام گھر کے اندر کا تھا۔ ان کی دلربائی بھی ان کی عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔۔ لازمی طور پر زوجہ عزیز مصر کے پاس ایک طرف تو تمام عیش نوش کے ذرائع ہوتے تھے اور دوسری طرف صاحب اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس جوان کے حسن کی دیوانی ہوگئی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کی دیوانگی بڑھتی گئی۔ دوسری طرف کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو یوسفؑ کی جگہ لے سکتی اور وہ اپنے آپ کو اس میں مشغول کرتی۔

واقعہ کے طبیعی حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایماء اور اشارہ سے اپنے عشق کا آغاز کیا۔ وہ برابر حضرت یوسفؑ کے سامنے سج دھج کر اور طرح طرح کے آرائشی لباس پہن کر آنے لگی تا کہ حضرت یوسفؑ کو اپنے حسن پر فریفتہ کرے اور اس طرح دونوں میں کسی طرح کی کشش پیدا ہو۔ لیکن اس کے برعکس وہ جتنا بھی بن سنور کر سامنے آتی رہتی اسی قدر حضرت یوسفؑ کا انکار بڑھتا جاتا۔

دام شیطانی

آخرکار اس نے طے کر ہی لیا کہ حضرت یوسفؑ سے اپنے عمل کا بدلہ لے اور ایسی جگہ ان سے اظہار عشق کرے جہاں سے فرار کا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ اس نے گھر کو خالی دیکھ کر موقع غنیمت سمجھا۔ پھر شاید نوکروں اور خادماؤں کو دوسری جگہ بھیج دیا اور یوسفؑ کو ایک خالی کمرہ میں بلا کر کسی کے اندر نہ آپانے کی خاطر دروازہ کو خوب اچھی طرح مضبوطی سے بند کرلیا۔ اس طرح چاہا کہ حضرت یوسفؑ کے پاک دامن کو اپنے دامن تزدیر سے آلودہ کر کے ان کے ظاہری استقلال کردار پاک سے انہیں نیچے گرادے۔

قرآن مجید اس حقیقت کو اس طرح بیان فرماتا ہے: وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ اس چھوٹے سے جملہ میں کئی واضح نکات ہیں:

۱)۔ اس عورت کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

۲)۔ یہ نہیں کہا کہ عزیز مصر کی زوجہ خود عزیز کی اہانت کا باعث ہو، بلکہ یہ کہا ہے کہ ایک عورت جس کے گھر میں جناب یوسفؑ رہتے تھے اس نے ایسا ارادہ کیا۔

۳)۔ قرآن اس کے ارادہ کو جملہ ''راودته'' سے بیان کیا گیا ہے۔ لغت عرب میں اس کے معنی اپنی چاہت پر اصرار کرنا ہوتا ہے، وہ بھی حیلہ وفریب کے ساتھ۔

۴)۔ کلمہ ''عن نفسه'' جو متصلات فصل سے ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یوسفؑ اس موقع پر اپنے انکار میں مستقل اور مضبوط تھے جب کہ وہ عورت چاہتی تھی کہ وہ حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف متوجہ کرے۔

۵)۔ عورت کی عصمت اور عفت اس بات کا سبب ہوتی ہے کہ برے کام کے لیے بلانا، اشارہ اور کنایہ سے استفادہ کرے۔ اس وجہ سے اس نے موقع پر کہا: ''هيت لك''۔ ''هيت'' عربی لغت میں ''آؤ'' کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی آؤ، آگے آؤ، اور لفظ ''لك'' مخاطب کے لیے تاکید ہوتا ہے یعنی ''تم سے کہتی ہوں آؤ''۔

یہاں عشق و ایمان کی جنگ شروع ہوتی ہے ۔بیس سالہ حضرت یوسفؑ جو اپنی بھرپور جوانی میں ہیں ، ایک نہایت ہی خوبصورت عورت جس کے حسن کا چرچا پورے مصر میں ہے،اس سے برائی کی درخواست کر رہی ہے، جو اس کے دسترخوان پر بیٹھ چکا ہے اور اس کے گھر میں عزت و شرف کی زندگی گذار رہا ہے۔لازمی ہے کہ ایسے وقت میں عورت اور ساتھ ساتھ خالی کمرہ میں کسی جوان کو اپنی طرف کشش کے طرح کے وسائل فراہم کر چکی ہو یعنی کسی جوان کو اپنا دیوانہ بنانے کے لیے باریک اور چست لباس پہنے ہوئے ہوگی۔

اس طرح کے دلفریب ماحول میں فقط عصمت ہی انسان کو بچا سکتی ہے،ایسی عصمت جو گناہ کے انجام کو اسی جگہ دیکھ رہی ہو اور جلتی ہوئی آگ کا مشاہدہ کر رہی ہو۔ایسی صورت میں حضرت یوسفؑ نے الٹا ہاتھ اس نامحرم کے سینے پر مارا اور اس کی خواہش کے جواب میں دو جملے کہے:

ا)۔''مَعَاذَ اللهِ''!خدا سے پناہ چاہتا ہوں (خدا ضرور مجھے اس مقامِ لغزش سے نجات دے گا اور اگر وہ نجات نہ دلائے تو میرا دامن داغدار ہو جائے گا)

۲)۔''اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ''حضرت یوسفؑ نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑا کہ ہم تمہاری خواہش کو کس طرح پورا کریں، جب کہ تیرے شوہر کے حق میں یہ خیانت ہوگی اور اس نے میرے ساتھ بہت نیکی کی ہے۔کیا یہ مناسب ہوگا کہ میں نیکی کا بدلہ بدی سے دوں؟

اگر پہلی آیت میں یہ جملہ نہ ہوتا کہ اس عورت کے شوہر نے اس سے کہا: اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ ضمیر''انہ ربی '' کو لفظ''اللہ'' جو ''معاذ اللہ'' میں ہے، اس کی طرف پلٹاتے ہیں اور یوسفؑ دو چیزیں کہتے ہیں:

ا)۔خدا سے پناہ چاہتا ہوں۔

۲)۔ایسا خدا جس نے ہمیں قدر و منزلت اور نیک منصب عنایت کیا ہے۔یہی آیت اس بات میں مانع ہے کیونکہ ''انہ'' میں جو ضمیر ہے وہ لفظ جلال کی طرف پلٹے، بلکہ یہ اس عورت کے شوہر کی طرف پلٹتی ہے اور اگر اس کو ''رب'' کہتے ہیں تو یہاں ''رب'' کے معنی صاحب کے ہیں۔عربی زبان میں رب کے معنی صاحب کے زیادہ تر آتے ہیں جیسے کہتے ہیں: ''رب البیت ''اور''رب الضیعۃ '' یہاں تک کہ خود حضرت یوسفؑ نے کلمہ رب کو بادشاہ مصر کے لیے استعمال کیا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں: اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ (یوسف۔62) دوسری آیت میں ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ (یوسف۔50)

اس فریب سے حضرت یوسفؑ کو نجات

قرآن نے حضرت یوسفؑ کے اس بڑے فریب سے نجات کے واقعہ کو صرف دو آیات میں بیان فرمایا ہے۔ پہلی آیت میں دونوں حریفوں کے مرحلہ فکری اور دوسری آیت میں مرحلہ عملی بیان ہوا ہے۔

پہلے مرحلہ کی عبارت اس طرح ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ

اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ (یوسف۔24)

’’ھم ‘‘ کے عربی زبان میں عزم وارادہ کے معنی ہیں۔اب دیکھنا یہ ہوگا کہ متعلق ارادہ کیا تھا؟

یہاں پر دواحتمال پائے جاتے ہیں:

ا۔متعلق ارادہ دونوں طرف جنسی عمل ہوگا،اس فرق کے ساتھ کہ زوجہ عزیز مصر نے اس چیز کا ارادہ کیا اور اپنے اس ارادہ پر باقی رہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔لیکن حضرت یوسفؑ کی طرف سے یہ ارادہ وقتی اور تعلیقی تھا اور وہ یہ کہ اگر انہوں نے خدا کی برہان کو خود سے نہ دیکھا ہوتا تو شاید اس کام کے لیے ارادہ کر لیتے چونکہ خدا کی برہان کو دیکھ لیا تھا اس لیے کوئی ارادہ نہ کیا۔اس طرح آیت کا محذوف حصہ اس طرح ہوگا:

الف۔وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ’’زوجہ عزیز مصر نے برے کام کا ارادہ کیا۔

ب۔وَلَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ لَهَمَّ بِهَا’حضرت یوسفؑ بھی اگر خدا کی برہان کو نہ دیکھتے تو شاید اس طرح کا ارادہ کرتے۔

درحقیقت آیت کی عبارت اس طرح ہے:’’وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ‘‘اور ہم جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اصل آیت اس طرح ہے تو اس وجہ سے کہ’’لولا ‘‘اپنے لیے جواب چاہتا ہے۔اور صدر جملہ کا قرینہ ہے کہ اس کا جواب محذوف ہے اور جملہ’’وھم بھا‘‘ کلمہ’’لولا‘‘لانے سے پہلے،جواب کی ضرورت نہیں رہی۔

لیکن اس کا جملہ صرف’’لھم بھا‘‘ کے علاوہ کچھ نہیں،لیکن جملہ کی وجہ سے جواب محذوف ہوگیا ہے جس کے نتیجہ میں آیت کے معنی یہ ہیں کہ زلیخا کا پورا ارادہ تھا،جب کہ حضرت یوسفؑ کا ارادہ مشروط تھا اور شرط کے محقق نہ ہونے پر بھی منتفی ہوجاتا ہے۔اب اس طرح دامن یوسفؑ ہرطرح کے برے ارادہ اور اس کے مرحلہ سے بھی پاک و پاکیزہ باقی رہا۔اس طرح کی روایت امام رضاؑ سے بھی ملتی ہے.حضرت نے مامون کے جواب میں اس طرح فرمایا:’’وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ لھم بھا کما ھمت بہ لکنہ کان معصوما والمعصوم لا یھم بذنب ولا یاتیہ‘‘[1]

زوجہ عزیز مصر نے ارادہ کیا تھا لیکن اگر حضرت یوسفؑ خدا کی برہان کو نہ دیکھے ہوتے تو وہ بھی ارادہ کر لیتے،لیکن وہ معصوم تھے معصوم نہ صرف گناہ نہیں کرتا ہے بلکہ گناہ کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔

جملہ کی دوسری طرح تفسیر

کبھی جملہ’’وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ‘‘ کی دوسری طرح بھی تفسیر ہوتی ہے،وہ یہ کہ’’ھم ‘‘سے مراد دونوں طرف کا ارادہ کرنا ہے کیونکہ تمام عاشقوں کے درمیان یہ سنت رہی ہے کہ عاشق اپنے عشق میں شکست کھا گیا،یہاں تک ایک قسم کی برائی ہوتی ہے کہ معشوق سے مار پیٹ کا بدلہ لیتا ہے۔اور زوجہ عزیز مصر نے بھی اپنے نافرمان معشوق سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا تھا۔

---

[1] نورالثقلین۔ج ۲،ص ۴۱۹

اس وقت حضرت یوسفؑ بھی اپنا دفاع کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے ہاتھاپائی کریں لیکن یکا یک متوجہ ہو گئے کہ یہ کام ہوسکتا ہے کہ ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو کیونکہ ہاتھاپائی بغیر مار پیٹ اور زخم کے نہیں ہوتی۔ اور اس صورت میں ہاری ہوئی عشق اپنا انتقام لینے کے لیے اپنے آپ کو زخمی بتاتی ہے اور اپنے معشوق کو برے کام سے متہم کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس نے چاہا کہ میرے ساتھ برا کام کرے لیکن میں نے دفاع کیا۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے مارا پیٹا اور زخمی کر دیا۔ اسی وجہ سے حضرت یوسفؑ اپنے ارادہ سے باز رہے۔

کبھی اس نظریہ کے تائید میں کہا جاتا ہے: ''همت به'' اور ''هم بها'' ان جملوں کو کام کرنے کے معنی میں تفسیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس جملہ سے پہلے تمام ان مراحل کو جو ممکن تھے زوجہ مصر کو یوسفؑ کی توجہ کے لیے طے کرنا چاہیے تھا۔ یہ ذکر بھی ہوا ہے یہاں تک کہ صریحاً اس نے کہا: ''هيت لك'' اس تصریح کے بعد اب ضرورت نہیں ہے کہ انجام عمل کے لیے ارادہ کی تکرار ہو۔

ہم دوسرے نظریے کو رد نہیں کرتے لیکن آخری تائید بھی کرتے کیونکہ مذکورہ تائید اس صورت میں سبب ہو سکتی ہے کہ جب تکرار موضوع بے فائدہ ہو۔ لیکن اگر پہلی تکرار دوسرے مطلب کے بیان کے لیے مقدمہ ہو تو اس صورت میں تکرار بے فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ اچھا و بہتر ہوگا۔

توضیح وضاحت یہ ہوگی کہ پہلی آیت ''وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ'' دونوں کی کشمکش کو بیان کر رہی ہے اور یہ کہ ایک طرف تو رغبت و خواہش اور دوسری طرف سے انکار میں سختی تھی۔ لیکن دو اہم مطلب کہ جس کو دوسری آیت اور تیسری آیت بیان کر رہی ہے اس میں بیان نہیں ہوئی ہے اور یہ دو مطلب اس طرح ہیں:

۱)۔ اس امتناع کیا کیا علت تھی؟

۲)۔ حضرت یوسفؑ نے اس مخمصہ سے کس طرح نجات پائی؟

قرآن دو مطالب کی وضاحت کے لیے دوبارہ پلٹتا ہے اور اصل مسئلہ کو پھر سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ دونوں کو بیان کر سکے۔ اسی وجہ سے جملہ ''هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا'' کے بعد دونوں کو یاد دلاتا ہے۔ پہلے مطلب (ان کو نجات) کے بارے میں فرماتا ہے: لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف۔24)

دوسرے مطلب کے بارے میں فرماتا ہے: وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ (یوسف۔25)

جیسا کہ آپ نے غور کیا مسئلہ کی تکرار اور یہ ارادہ زوجہ عزیز مصر کی طرف سے کیا گیا، دو اہم مطلب بیان کرنے کی وجہ سے ہے جس کو پڑھنے کے لیے لوگ جستجو میں رہتے ہیں اور موضوع کی طرف پلٹنے کے لیے نتائج کے بیان کے لیے ایک کام رائج ہے۔

مصنف نے نظریۃ ''عهدہ'' کی تائید کے لیے دوسری وجہ کا اضافہ کیا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم کہیں گے ''هم'' کا مقصد مار پیٹ ہی ہے تو اسی صورت میں دو لفظ ''سوء'' و ''فحشاء'' کے آیت میں جدا جدا معنی ہو جائیں گے۔ پہلے سے مقصد (ضرب) اور دوسرے عمل خلاف عفت ہوگا لیکن اگر کہیں کہ اس سے مراد عمل خلاف عفت ہے تو اس صورت میں دونوں کے ایک ہی معنی ہوں گے جو قرآن کی فصاحت کے لیے سازگار نہیں ہے۔

یہ توجیہ بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ سابق میں یہ ہے کہ تکرار تاکید کے لیے، یا عبارت میں فن پیدا کرنے کے لیے اور بعض موقع پر وضاحت کا سبب ہوتی ہے۔

پہلے نظریہ کے لحاظ سے بھی ہوسکتا ہے کہ ان دونوں الفاظ کے دو مختلف معنی ہوں، کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ ''سوء'' سے مراد مالک کے حق میں خیانت اور ''فحشا'' سے عمل خلاف عفت مراد ہو اور خداوند عالم نے ''برھان ربہ'' کے پرتو میں انہیں دونوں کو گناہ سے باز رکھا۔ قرآن کی تعبیر میں ان سے دونوں گناہوں کو برطرف کر دیا کیونکہ جماع شوہر دار عورت کے ساتھ دو طرح سے منطبق ہوگا ایک تو یہ کہ غلط کام سے دوسرے مرد کے حق میں خیانت ہے۔ لیکن بغیر شوہر والی عورت کے ساتھ بغیر جبر کے زنا کرنا فقط ایک گناہ ہی ہوگا۔

برہانِ رب سے کیا مراد ہے؟

''برھان'' لغت عرب میں حجت قاطع، واضح گواہ اور حقیقت ظاہری کے بیان کو کہتے ہیں۔

ابن منظور ''لسان العرب'' میں کہتا ہے: ''برہان اختلاف کے بارے میں فیصلہ کن دلیل واضح کو کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں کہ فلاں نے دلیل قائم کر دی یعنی ایسی دلیل لایا جس سے اختلاف ختم ہو گیا''۔ ہر وہ شے جو شک وتردید کو ختم کر کے حقیقت کو روشن کر دے اور اصلاح میں مفید علم ویقین ہو اس کو برہان کہتے ہیں۔

اگر قرآن معجزہ کو برہان کہتا ہے اور فرماتا ہے: فَذٰنِكَ بُرۡهَانٰنِ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ (قصص۔32) تمہاری رسالت پر تمہارے پروردگار کی طرف سے عصا اور ید بیضا فرعون اور فرعونیوں پر دو گواہ ہیں۔

اگر قرآن مشرکوں سے کہتا ہے: ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (نمل۔64) ''کیا خدا اللہ کے علاوہ ہے تو بتاؤ، اگر سچ کہتے ہو تو اس پر کوئی دلیل لے آؤ''۔

اگر قرآن اپنے آپ کو برہان کہتا ہے اور قرآن فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ (نساء۔174) یعنی ''اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے گواہی آئی ہے۔

اگر قرآن کہتا ہے: یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ معجزہ پیش کرنے والے کے لیے حجت اور دلیل قاطع ہوتا ہے جیسا کہ وجودِ پیغمبر کا اپنے زمانہ میں کتاب کا لانا وغیرہ، جس کے سامنے عرب کے تمام فصیح وبلیغ انسان عاجز وناتواں ہو گئے بذاتِ خود دلیل قاطع اور حقیقت کو لوگوں پر روشن کرنے والے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کسی مختلف مقام سے تعلق رکھتی ہے اور آپ مکہ کے ماحول جہانِ مادی سے بلند و بالاتر مقام کے تربیت یافتہ ہیں۔ برہان کے معنی ومفاہیم کو سمجھنے کے لیے دیکھنا چاہیے کہ اس کا مفہوم کلی کیا ہے؟ یہاں مفسرین نے چند وجہیں بیان کی ہیں جن میں اکثر درست نہیں ہیں، جیسے:

۱)۔ یوسفؑ کی زنا کی حرمت اور اس کے عذاب سے آگاہی۔

۲)۔ واضح برجستہ صفات جو پیغمبروں میں پائی جاتی ہیں جن کے باعث وہ اپنے نفس کی پاکیزگی کو عفت وصیانت کے ذریعہ پلیدی

سے دور رکھتے ہیں۔

مسلم بات ہے کہ حرمتِ زنا اور اس کے لیے آخرت کے عذاب کے بارے میں عمومی علم انسان کو پلیدی سے روک کر نہیں رکھ سکتا، جب تک صفات واضح و مضبوط مانع نہ ہوں کیونکہ شہوانی طوفان کے امواج، وہ بھی مناسب مواقع پر ٹوٹ پھوٹ کا باعث بن جاتی ہیں۔ بعض لوگوں نے برہان کو نبوت، بعض نے عصمت اور بعض نے اسے امدادِ غیبی سے تعبیر کیا ہے اور شاید یہ تمام کے تمام معنی ایک ہی حقیقت کی طرف پلٹتے ہوں۔

لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے مراد دنیا اور آخرت میں فحش باتوں کے وحشت ناک نتائج کی تجسیم ہے اور یہ ایک ایسی ہی نوعیت پر تو نبوت و عصمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی لطف کی صورت میں آتا ہے۔ ایسے واقعہ کو قرآن اس طرح فرماتا ہے: ''رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ'' کا افق ان کی نظر میں اس طرح روشن ہوا کہ چھوٹی شک و تردید کا سبب بھی ان کی نظر میں باقی نہیں رہتا۔

دوسری بات جس طرح حجت عقلی انسان کی نظر میں واضح ہوتی ہے اور اسے قاطعیت عطا کرتی ہے اسی طرح کی حقیقت کو دیکھنا لوازم نبوت میں سے ہے اور الطاف الٰہی ہے جو اسے روشنی عطا کرے اور قاطعیت بخشے۔ اسی وجہ سے حضرت یوسفؑ کو اس کام کے انجام دینے سے ان کا دماغ جلنے لگتا تھا۔

''برھان ربہ'' کی تفسیر میں بے معنی نظریات

یہاں بعض مفسرین نے ''برہان ربہ'' کے دوسرے ایسے معنی مراد لیے ہیں جو ہرگز مقام نبوت و عصمت کے لیے سازگار نہیں ہیں اور بعض وقت قلم ان کو لکھتے ہوئے شرماتے ہیں۔

غالباً احادیث اسرائیلی اس طرح کی توجیہات اور تفاسیر کرنے کا سبب بنی ہیں (معاذ اللہ، معاذ اللہ) نمونہ کے طور پر ہم چند نظریات کو نقل کرتے ہیں:

۱)۔ ایک پرندہ حضرت یوسفؑ کے کاندھے پر آ بیٹھا اور ان کے کان میں کہنے لگا کہ ایسا کام نہ کرو کیونکہ اگر یہ کام کروگے تو نبوت کے درجہ سے گر جاؤ گے۔

۲)۔ یوسفؑ نے یعقوبؑ کو دانتوں تلے انگلی دبائے ہوئے اور انہیں کہتے ہوئے دیکھا اور کہا کیا تم مجھے نہیں دیکھ رہے ہو؟

۳)۔ یوسفؑ نے ندائے غیبی سنی کہ تمہارا نام پیغمبروں کی فہرست میں ہے اور تم گندے لوگوں جیسا کام کرنا چاہتے ہو۔

۴)۔ ایک ہاتھ دیکھا جو دیوار سے باہر آیا اس پر لکھا تھا: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا (اسراء۔32)

۵)۔ چھت پھٹ گئی اور ایک حسین صورت نظر آئی اور وہ کہہ رہی تھی (اے معصوم پیغمبر یہ کام نہ کرو!)

۶)۔ سر نیچے کیا تو زمین پر لکھا دیکھا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ (نساء۔123)

۷)۔ ایک فرشتہ آیا، اس نے اپنے پر کو یوسفؑ کی پیٹھ پر ملا جس سے ان کی شہوت پیر کی انگلیوں سے باہر نکل گئی۔

۸)۔انہوں نے بادشارہ کو کہتے دیکھا:"تم ہمارے گھر میں رہ کر غلط کام کر رہے ہو"۔
۹)۔یوسفؑ اور زلیخا کے درمیان ایک پردہ حائل ہو گیا جس کی وجہ سے کسی نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔
۱۰)۔بہشت کے ایک خوبصورت فرشتہ کو دیکھ کر اس کے حسن میں منہمک ہو گئے اور پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا:"میں وہ ہوں جو زنا نہیں کرتا"۔
۱۱)۔ایک پرندہ اڑا، اور اس نے آواز لگائی:"یوسفؑ! جلدی نہ کرو، عنقریب وہ تمہارے لیے حلال ہو جائے گی، یہ تمہارے لیے ہی خلق کی گئی ہے۔
۱۲)۔یوسفؑ نے اس کنوئیں کو (جس میں قید کئے گئے تھے) دیکھا کہ وہاں ایک فرشتہ کھڑا ہے جو کہہ رہا ہے:"یوسفؑ کیا تم اس کنوئیں کو بھول گئے ہو؟"
۱۳)۔انہوں نے زلیخا کو بدترین حالت میں دیکھا اور اس سے دور بھاگ گئے۔
۱۴)۔انہوں نے ایک آدمی کو دیکھا جو ان سے کہہ رہا تھا:"اپنے داہنی طرف دیکھو"، ناگہاں انہوں نے بہت بڑا اژدہا دیکھا جو کہہ رہا تھا:"زنا کار قیامت میں میری خوراک ہوگا" اس وجہ سے وہ بھاگ نکلے۔

ہم ان نظریات کے بارے میں ایک بات کہتے ہیں، وہ یہ کہ ماں سے زیادہ دائی مہربان کیوں ہے اور یوسفؑ کا بدی کے لیے آمادہ ہونا بتا کر متہم کر رہی ہے؟ پھر لوگ جو کہتے ہیں کہ ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا، جس نے انہیں اس عمل سے روک لیا یہ تو ایک قسم کی جبری ممانعت ہوئی، اس کی کیا اہمیت ہے کیونکہ ہماری نظر میں وہ تو بہادر ہے جس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے اور انہوں نے گواہی دی کہ اس جوان نے بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا۔

۱)۔اللہ تعالی نے اس واقعہ کو فوراً بعد ان کے بارے میں فرمایا ہے: اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ (یوسف۔24)
۲)۔خاندان زلیخا سے ایک گواہ نے مجرم کی شناخت کے لیے راہنمائی کی کہ اگر یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ سچا ہے اور زلیخا جھوٹی ہے۔اتفاق سے ایسا ہی تھا۔(اس کی شرح بعد میں آئے گی)۔
۳)۔عزیز مصر نے زلیخا سے کہا: اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ۝ يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا (یوسف۔28،29) یعنی "یہ تم عورتوں کی مکاری ہے۔تمہارا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔یوسفؑ اب تم اس کی پرواہ نہ کرو۔
۴)۔مصر کی عورتوں نے جو زلیخا سے رابطہ رکھتی تھیں، کہا: حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمۡنَا عَلَيۡهِ مِنۡ سُوۡٓءٍ ؕ (یوسف۔51) یعنی "حاش للہ! ہم نے ہرگز ان (یوسفؑ) میں کوئی برائی نہیں دیکھی"۔
۵)۔خود زلیخا نے کہا: الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَـقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنۡ نَّـفۡسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيۡنَ (یوسف۔51) یعنی "اب حق بالکل واضح ہو گیا کہ میں نے خود انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ صادقین میں سے ہیں"۔

ایک اور جگہ وہ صاف طور سے کہتی ہے: ''وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ''[1] (یوسف۔32)
یعنی''میں نے خود اسے اپنی طرف بلانا چاہا تھا لیکن اس نے پرہیز کی''۔

ان گواہیوں اور شہادتوں کے بعد کس طرح ایسے کمزور نظریوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان نظریوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ آخر تک پہنچ چکے تھے اور معاملات تمام ہو چکے تھے لیکن ایک غیبی مانع نے ان کو اس برے عمل سے باز رکھا، اگر کوئی بھی معاملہ انجام پا چکا ہوتا تو زلیخا ہرگز یہ نہ کہتی: وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ (یوسف۔32)

نیز اگر کوئی ایسی بات ہوئی ہوتی تو اللہ تعالی حضرت یوسفؑ کی توبہ کا ضرور ذکر فرماتا، جیسا کہ حضرت آدمؑ و ایوبؑ کے ترکِ اولیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کے شکوک نقل کرنے والے انبیاء سے گناہ کی نسبت دیتے ہوئے کتنے جری ولا پرواہ ہیں حالانکہ اگر کوئی مسلمان ایسے گناہ کے دسویں حصہ کی بھی کسی صحابی رسولؐ سے نسبت دیتا ہے تو اسے ملحد و کافر کہہ دیتے ہیں گو یا صحابہ رسول عصمت وتقویٰ کے اعتبار سے انبیاء سے بھی افضل و برتر ہیں۔

جو بے معنی بات ان مفسرین کو ایسی خرافات کے طرف لے گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے جملہ''وھم بھا'' کو پہلے جملہ ''وھمت بہ'' کی طرح مستقل جانا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زلیخا اور یوسفؑ دونوں گناہ کی حد تک ہم آہنگ آمادہ تھے۔ حضرت یوسفؑ نے برہان پرورد گار کو دیکھ لیا جس کی وجہ سے وہ بچ گئے لیکن زلیخا کو ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔

اس گروہ کی نظر میں اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ''وَهَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ نفعل '' سے وہ لوگ اس تفسیر کو قبول کرنے پر مجبور ہوئے کیونکہ وہ ان وجوہات کو جو عیسائی راہبوں اور یہودیوں کی کتاب میں مسلمانوں کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کو قبول کریں جب کہ گذشتہ بحث میں ہم کہہ چکے ہیں: ''لو لا ان رای برھان ربہ'' دوسرے جملہ''ھم بھا'' کے لیے لازم ہے، نیز زجاج کہتا ہے کہ: جواب''لولا'' مقدم نہیں ہوتا''۔ اگر اس بات کو صحیح بھی مان لیا جائے تو کوئی مشکل وجود میں نہیں آتی، کیونکہ جواب''لولا'' مقدم نہیں ہوا اور ہرگز''ھم بھا'''لولا'' کا جواب نہیں بلکہ''لولا'' کا جواب پہلے والے جملے کے قرینہ سے محذوف ہے، جیسا کہ یاد دلایا گیا کہ یہ اس طرح ہے: ''اقسم ولقد ھمت بہ واقسم لولا ان رابرھان ربہ لھم بھا'' جیسے''واللہ لا ضربنہ ان یضربنی ''،قطعی طور سے''ان یضربنی'' کی جزائے محزوف ہے اور پہلا جملہ اس بات پر گواہ ہے گو یا یوں کہیں''واللہ و...ان یضربنی لا ضربنہ''

ظاہر آیہ کَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ بھی یہی ہے کہ یوسفؑ برے کام کے لیے آگے کو نہ بڑھے تھے بلکہ یہ سوء و فحشاء تھا جو خود یوسفؑ کی تلاش میں پیدا ہوا تھا، اور اللہ نے ان دونوں بلاؤں کو ان سے برطرف کر دیا جیسا کہ فرماتا ہے کہ ہم نے بدی و پلیدگی کو

[1] فخر رازی، تفسیر کبیر، ج۱۸ص۱۱۶

ان سے لوٹا دیا، یہ نہیں کہ ہم نے یوسفؑ کی توجہ کو ان دونوں چیزوں سے باز رکھا۔ دوسری آیت میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ حضرت یوسفؑ خود اپنی دعا میں خداوند متعال سے عرض کرتے ہیں: ''خداوندا! اس کے جال سے مجھ سے بچا لے''۔ جہاں فرماتا ہے: وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَاَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۳۳﴾ فَاسۡتَجَابَ لَہٗ رَبُّہٗ فَصَرَفَ عَنۡہُ کَیۡدَہُنَّ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (یوسف۔33،34)

جال سے فرار

ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے چاروں طرف بچھائے ہوئے جال سے چھٹکارا پانے کے لیے دو راستے اختیار کئے:

ایک زلیخا سے گفت وشنید کا راستہ جس کی تشریح گذر چکی ہے۔

دوسرا طریقہ عمل کے ذریعہ کہ وہ اس حالت کو بدل دیں اور دیگر شرائط پیش کریں تا کہ وہ اپنے منصوبہ پر عمل نہ کر سکے۔ ان کے دماغ میں یہ بات آئی کہ قبل اس کے کہ زلیخا ان کی طرف متوجہ ہو وہ دروازہ کھول کر بھاگ جائیں۔ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے: وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ وَقَدَّتۡ قَمِیۡصَہٗ مِنۡ دُبُرٍ یعنی ''دونوں دروازہ کی طرف دوڑے''۔

حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ دروازہ کھول کر بھاگ جائیں جب کہ زلیخا نے چاہا کہ دروازہ کھولنے سے انہیں روکے۔ اس لیے دوڑ کر اس نے حضرت یوسفؑ کی قمیض پکڑ لی اور اسے کھینچا کہ انہیں کمرہ کے اندر لے آئے۔ لیکن یوسفؑ کی قمیص پھٹ گئی۔ حضرت یوسفؑ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ زلیخا بھی پیچھے پیچھے بھاگی لیکن وہاں دونوں نے عزیز مصر کو اپنے سامنے پایا۔ زلیخا ہارے ہوئے عاشق کی طرح کام میں کامیاب نہ ہو پائی تھی اور ذلیل بھی ہوئی کیونکہ یہ عشق اللہ کی طرف سے نہ تھا بلکہ حیوانی جذبہ کے تحت تھا، اس لیے اس نے فوراً اپنی مرضی کو معشوق کی باتوں پر (یہاں تک کہ موت اور زندان) مقدم جانا اور بہانہ بنا کر حضرت یوسفؑ کو بری نیت سے متہم کیا، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَلۡفَیَا سَیِّدَہَا لَدَا الۡبَابِ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَہۡلِکَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ یُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ

جبکہ ایک طرف تو زلیخا رسوائی کے دہانے پر تھی اور دوسری طرف اس کی شہوانی آگ بھی بھڑک رہی تھی، ان دو چیزوں کی کشمکش میں اس نے اپنی مرضی کو مقدم رکھا، لیکن ایسے مواقع پر بھی بدزبانی نہیں کی، کیونکہ:

پہلے یہ کہ متہم کا واضح طور سے نام نہ لیا اور کہا: ''مَنۡ اَرَادَ بِاَہۡلِکَ''

دوسرے: برے کام کا بھی واضح طور سے نام نہ لیا، صرف یہ کہا: ''سُوۡٓءًا''

تیسرے: سزا کو بھی مبہم طور سے تجویز کیا: ''اِلَّاۤ اَنۡ یُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ''

ممکن ہے کہ عذاب الیم سے قتل مراد ہو، لیکن زلیخا یوسفؑ کے قتل پر راضی نہ تھی، لہٰذا دو سزاؤں میں تجویز کیا کہ کم سے کم قید ہی ہو، تا کہ کسی طرح اسے نجات ملے۔

ایک لفظ ''باھلك'' استعمال کر کے شوہر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہی۔

یہ تمام باتیں اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں کہ زلیخا کوئی معمولی عورت نہ تھی، بلکہ دربار کی محترم و مؤدب خواتین سے تھی۔

دونوں کی شکایت کا افشاء

حضرت یوسفؑ نے دروازہ کھولا اور دونوں بھاگے ہی تھے کہ سامنے اچانک زلیخا کے شوہر کو کھڑا ہوا پایا، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے: زلیخا نے فوراً اپنی صفائی پیش کی اور بہانہ بنا کر حضرت یوسفؑ کو متہم کیا، یہاں یہ ضروری تھا کہ حضرت یوسفؑ اپنا دفاع کرتے، لیکن مختصر طور پر اپنے بچاؤ کے لیے انہوں نے کہا: اس نے مجھ سے زبردستی کا اصرار کیا۔ اور اپنی طرف مجھے کھینچا۔ میں نے اس وقت اپنے فرار کا یہی راستہ دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور میرے پیچھے پیچھے وہ بھی بھاگی چلی آئی۔

یہ کوئی چھوٹا سا مسئلہ نہیں تھا، ناموس کی بات ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ اس سے سرسری نظر سے گذر جایا جائے۔ اب کس طرح معلوم ہو کہ دونوں میں سچا کون ہے؟

اس وقت ایک سمجھدار اور معقول شخص موجود تھا، فوراً اس کے دماغ میں ایک بات آئی کہ ان تمام شرائط کے ساتھ سچے اور جھوٹے کو پہچانا جائے، کیونکہ دونوں اس بات کا اقرار کر رہے تھے کہ کمرے کے اندر جنسی مسئلہ درپیش تھا، جس میں سے ایک چاہتا تھا اور دوسرا اس عمل سے بھاگ رہا تھا۔ جبکہ دونوں کہہ رہے تھے کہ کمرے سے اس لیے بھاگے کہ کہیں اس برائی میں مبتلا نہ ہو جائیں اور اسی تگ ودو میں یوسفؑ کی قمیص بھی پھٹ گئی، کیونکہ یہ بے معنی بات ہوگی کہ یوسفؑ گھر میں بھی عزیز مصر کی طرح پھٹی ہوئی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ اب یہ دیکھنا ہوگا کہ یوسفؑ کی قمیص کہاں سے پھٹی، آگے سے یا پیچھے سے؟ اگر یوسفؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہوتو زلیخا سچی ہوگی اور یوسفؑ جھوٹے اور اگر یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوتو زلیخا جھوٹی اور یوسفؑ سچے۔

اب یہ دیکھنا ہوگا کہ اس شخص نے اپنے دماغ سے اس منظر کو دیکھتے ہوئے کس طرح سچے کو جھوٹے سے الگ کرنا چاہا۔ شاید اس کی بات اس طرح ہو:

اگر حضرت یوسفؑ جنسی عمل انجام دینا چاہتے تھے اور زلیخا اپنے آپ کو بچا رہی تھی تو لازمی طور سے ان میں کشمکش ہوتی جس میں یوسفؑ حملہ آور ہوتے اور زلیخا مدافع، یوسفؑ مستقل طور پر زلیخا کے سامنے ہوتے، کسی صورت سے پیٹھ ان کی طرف نہ ہوتی، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ ان کی قمیص آگے سے پھٹی ہو نہ کہ پیچھے سے۔ دوسری صورت چہرے کا پلٹنا اس کے علاوہ تصور میں نہیں آ سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ زلیخا کے پاس ہوتے تھے۔

اگر معاملہ اس کے برعکس تھا یعنی زلیخا چاہتی تھی اور یوسفؑ بھاگ رہے تھے، وہ زلیخا کے حکم سے اس کے سامنے نہیں ہونا چاہتے تھے تو

لازمی طور سے فرار کی حالت میں تھے اور اس وقت یقیناً زلیخا یوسفؑ کو پکڑنے کے لیے بھاگی ہوگی، پیچھے سے قمیص کو پکڑا ہوگا اور کھینچا ہوگا جس کی وجہ سے وہ پھٹ گئی، ہرحال میں یہ شہادت جھوٹی ہو یا سچی، عزیز مصر اور سمجھدار گواہ نے اس بات کو قبول کرلیا اور قانع ہوگیا۔ یوسفؑ کی پھٹی ہوئی قمیص کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یوسفؑ بھاگے ہوں گے اور زلیخا نے انہیں پکڑ کر کمرہ میں لانا چاہا ہوگا۔ اس وجہ سے قمیص پھٹ گئی۔

ارشاد ہوتا ہے: فَلَمَّا رَاٰ قَمِيۡصَهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ‌ ؕ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ [۱]

یعنی جب عزیز مصر کی نظر یوسفؑ کی قمیص پر پڑی اور دیکھا کہ وہ پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے، لہٰذا فوراً یوسفؑ کو چھوڑ دیا اور گناہ کو اپنی زوجہ کی طرف جانا۔

یہاں آدمی اس بات کو سوچتا ہے کہ عزیز مصر کو اس سے زیادہ تنبیہ کرنا چاہیے تھا، جب کہ اس نے صرف ایک جملہ پر اکتفاء کیا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ کے درباریوں کو بھی آج کے درباریوں کی طرح اپنے ناموس کے بارے میں کوئی احساس شرم وحیا نہ تھا اور خود مرد بھی اپنی بیویوں کی طرح آلودہ رہتے تھے۔

اس کے بعد دو جملے کہے: ایک یوسفؑ سے اور ایک اپنی زوجہ سے۔

یوسفؑ سے کہا: يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا یعنی اس کو اہمیت نہ دو تاکہ ہمارے راز کھل نہ جائے اور اپنی بیوی سے کہا وَاسۡتَغۡفِرِىۡ لِذَنۡۢبِكِ‌ ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ یعنی ''اس کو اہمیت نہ دو تاکہ ہمارا راز کھل نہ جائے۔ اور اپنی بیوی سے کہا: (یوسف۔29) یعنی ''اپنے گناہوں پر توبہ کرکہ تو خطا کرنے والیوں میں سے ہے''۔

پس یہاں یہ واضح ہوگیا کہ یوسفؑ خوش وخرم اس حادثہ سے نکل آئے اور شرمندگی زلیخا کے حصہ میں آئی۔

آئیں دیکھیں اس واقعہ میں توریت کیا کہتی ہے۔ توریت میں اس طرح آتا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش ہوا تو اس عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ تیرے غلام نے ہمارے ساتھ اس اس طرح کیا تو اسے بہت غصہ آیا اور یوسفؑ کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جس میں بادشاہ کے تمام قیدی تھے۔ [۲]

توریت برخلاف قرآن حضرت یوسفؑ کو بادشاہ کے نزدیک محکوم جانتی ہے اور انہیں زندان کی سند دیتی ہے جب کہ قرآن کہتا ہے کہ عزیز نے حضرت یوسفؑ سے معذرت چاہی۔ یہ اختلاف اس بات پر گواہ ہے کہ قرآن کسی صورت میں توریت سے متاثر نہیں بلکہ توریت کا مصحح ہے۔

---

[۱] قدّ لغت عرب میں قطّ کی طرح پھٹنے کے معنی رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اگر شگاف لمبائی کی طرف ہو تو اسے قدّ کہتے ہیں اور اگر عرض میں ہو تو قطّ کہلاتی ہے۔

[۲] تورات سفر تکوین فصل ۳۹، آیات ۱۹، ۲۰

(۳)۔ مصر میں عزیز مصر کی بیوی کے عشق کا چرچا

کوئی بھی راز اس دنیا میں چھپا نہیں رہتا اور کوئی ایسا کام جسے چاہو کہ اس کی طرف کوئی متوجہ نہ ہو انجام نہ دو کیونکہ آخر میں راز ایک نہ ایک دن نکل ہی جاتا ہے۔ عزیز مصر نے سوچا تھا کہ نصیحت کرنے سے اس کے گھر کی عزت بچی رہے گی، جب کہ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ پورے مصر میں اس کی زوجہ کے حضرت یوسفؑ سے عشق کا چرچا ہو ہی گیا۔ قرآن مجید نے اس حصہ کو اس طرح بیان فرمایا:

موضوع سے متعلق آیات

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ
شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۰
فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ
وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ
اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝۳۱
قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ
وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۳۲
قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ
اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۳۳
فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۴

آیات کا ترجمہ:

۳۰)۔ خواتین کی ایک جماعت شہر میں چرچا کرنے لگی کہ عزیز مصر کی بیوی غلام سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کی کوشش میں ہے، اور اس پر فریفتہ ہوگئی۔ ہم تو اسے صریح غلطی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

۳۱)۔ عزیز کی زوجہ نے ان کے طعنے سنے تو ان عورتوں کی دعوت کی، ان کے لیے تکیہ لگوائے، ایک مجلس آراستہ کی

اوران میں ہرایک کے ہاتھ میں ایک چھری و نارنج دے کر یوسفؑ سے کہا کہ ان کی محفل میں داخل ہوں۔ جب ان عورتوں نے اسے دیکھا تو اس کو بڑا حسین پایا۔ پھر سب نے ترنج کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہنے لگیں : حاش للہ! یہ بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔

(۳۲)۔عزیز مصر کی بیوی نے (جب یوسفؑ کے حسن میں ان کو مبہوت پایا تو وقت کو غنیمت جان کر) ان سے بولی یہ وہی تو ہے جس کے عشق کی خاطر تم سب مجھے ملامت کرتی تھیں۔ میں اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی آرزومند تھی لیکن یہ بچا رہا۔ جس کام کا میں حکم دیتی ہوں، اگر یہ نہ کرے گا تو ضرور قید بھی کیا جائے گا اور ذلیل بھی ہوگا۔

(۳۳)۔یوسفؑ نے کہا: پالنے والے! جس بات کی یہ عورتیں مجھ سے خواہش رکھتی ہیں، اس کی نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اگر ان عورتوں کے فریب کو مجھ سے دفع نہ فرمائے گا (تو مبادا کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں) اور جاہلوں میں شمار ہوں گا۔

(۳۴)۔پس ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمالی اور ان سے ان عورتوں کے مکر کو دفع فرمادیا، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا سننے والا واقف کار ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

عزیز مصر کی بیوی کے ایک عبرانی سے عشق کا واقعہ گھر سے باہر مشہور ہوگیا اور کسی حد تک عورتوں کے درمیان موضوع بحث بننے لگا۔ ایک طرف تو وہ اشراف خواتین جن کے پاس کوئی کام نہیں رہتا، فطرۃً کسی نہ کسی ٹوہ میں لگی رہتی ہیں تا کہ ان کا وقت گذرے اور دوسری طرف حسد و خاندانی انتقام کا جذبہ سب ایک ساتھ مل گئے اور یہ عشق ہر روز عام وخاص کا موضوع بن گیا۔ وہ خیر خواہی کی صورت میں لیکن اندر اندر عزیز مصر کی زوجہ کو ذلیل کرنے کے لیے برابر اس کے عشق کی باتیں کرتیں اور بعد میں یہ بات بھی کہہ دیتیں کہ عزیز مصر کی زوجہ کے لیے مناسب نہیں تھا کہ ایک کنعانی غلام سے عشق کرتی، وہ بھی ایسا غلام جو بازار سے خرید کر گھر میں لایا گیا ہو، اصولی طور پر چاہیے کہ مرد عورت کی طرف کھینچے اور عورت کو چاہیے کہ اپنی بزرگی وعظمت محفوظ رکھے۔

یہ چکنی چپڑی باتیں عزیز مصر کی بیوی کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے چاہا کہ اپنے عشق کی مجبوری ان لوگوں پر واضح کرے اور ان لوگوں کو سمجھائے کہ اگر وہ لوگ بھی اس کی جگہ موجود ہوتیں تو اس جوان کی دیوانی ہو جاتیں، لیکن کیونکہ وہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں اس لیے مجھے ملامت کرتی ہیں۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ یہ سب بھی اس حسین اور دلفریب جوان کو دیکھیں اور بے اختیار ان کا عشق بھی اس جوان سے ظاہر ہو جائے۔

اس مقصد کی خاطر اس نے ایک جشن منعقد کیا جس میں خواتین شرفاء کو بلوایا، ہر ایک کے لیے ایک خاص جگہ معین کی، اس کے لیے

تکیوں [1] وغیرہ کا انتظام کیا تا کہ وہ قاعدہ سے بیٹھ جائیں،سب کے لیے پھلوں کا انتظام کیا اورانہیں کاٹنے کے لیے ہرایک کے ہاتھ میں چاقو دے دیا۔

وہ اشراف عورتیں جن کو اس جشن میں بلایا گیا تھا، لازمی طور پر بہت سج دھج کر آئی ہوں گی جب کہ خود یہ سب ایسے گھرانوں میں رہی ہوں گی جن میں سب کی سب خوبصورت اور حسین ہوں گی۔ وہ سب کی سب آ کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں اور آپس میں باتیں کرنے لگیں ۔کھانے کے لیے سب لیموں کاٹنے لگیں تھیں کہ اچانک عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسفؑ سے کہا جو ساتھ والے کمرے میں تھے، کمرہ سے باہر نکل آوَ،حضرت یوسفؑ غلام کی حیثیت میں تھے،اس لیے انکار نہ کر سکتے تھے۔لہٰذا فوراً ہی کمرے میں داخل ہو گئے،خواتین جو عزیز مصر کی بیوی کے عندیہ سے آگاہ نہ تھیں،اچانک ایک خوبصورت وزیبا جوان کے سامنے آئیں جس کے حسن کے سامنے چاند بھی شرمارہا تھا اور اس کی خوبصورتی جمال پروردگار کی غمازی کررہی تھی۔

قرآن فرماتا ہے:فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَكۡرِهِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَيۡهِنَّ وَاَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِكِّيۡنًا وَّقَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَيۡهِنَّ.........(یوسف۔31)

یہاں چند مطالب اس طرح بیان کئے جاتے ہیں:

۱)۔زلیخا نے ان کی نصیحت آمیز باتوں کو مکروحیلہ سے تعبیر کیا،جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:**فلما سمعت بمکرھن**۔اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اس مکروحیلہ سے اس کی عزت برباد کرنا چاہتی تھیں۔یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس بہانے سے حضرت یوسفؑ کا دیدار بھی کر لیں۔

۲)۔ہرایک کے لیے الگ الگ بیٹھنے کی جگہ اور تکیہ کا انتظام کیا گیا تھا۔اگر اس کا مقصود یہی ہوتا جو کہا گیا ہے تو یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ نشست کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس پر لیموں رکھا جائے اور لیموں کو اٹھانے میں آسانی ہو جس سے زلیخا کا مقصد بہتر طریقہ سے انجام پائے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:"وَاَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مَتَّكَاً"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ"مُتَّكَاً" ترنج (ایک قسم کے میوہ) کے معنی میں ہے۔بعض اوقات"مُتَّكَاً" بغیر ہمزہ کے قرأت کیا جاتا ہے۔اس کے معنی بھی ترنج ہی ہوتے ہیں۔

۳)۔پھلوں میں سے ایسے پھل کا انتخاب کیا گیا جس کے استعمال میں چاقو کی ضرورت پڑے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:وَاَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّكَاً

۴)۔یہ کیفیت بنا کر حضرت یوسفؑ کو حکم دیا کہ وہ جہاں بھی ہوں فوراً چلے آئیں اور اس محفل میں آنکلیں،جیسا کہ قرآن

---

[1] یہ قرآن مجید کے لفظ"متکئًا" کی تفسیر ہے لیکن بعید نہیں کہ اس سے ایسے تخت مراد ہوں جن کو ہماری اصطلاح میں"صندلی" یعنی کرسی کہتے ہیں جس پر تکیہ بھی لگایا جاتا ہو۔قرآن مجید ایسے موقعوں پر تختوں پر تکیہ لگانے ہی کی بات کرتا ہے،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:"علی الارائك متكئون"(یس۔۵۹) اپنی جگھوں پر تکیہ لگائے بیٹے ہوں گے۔

فرماتا ہے: وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا

جب حضرت یوسفؑ نے محفل میں قدم رکھا تو محفل کی حالت دگرگوں ہوگئی اور ایسی صورتیں پیدا ہوگئیں جن کو قرآن اس تفصیل کے ساتھ بیان فرماتا ہے:

۱)۔ ان کو دیکھتے ہی انہوں نے بہت خوبصورت اور اپنے تصور سے بڑھ کر جانا، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ

۲)۔ حضرت یوسفؑ کی معصومانہ رفتار اور بلند پائے کی عفت وتصور نے ان عورتوں کے سامنے جہاں صرف خاموشی کا منظر اور ان کی استقامت واستواری جو انسان کے ذہن کو جھنجھوڑ دیں اور پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے، اس بات کا سبب بنی کہ وہ کہہ اٹھیں: یہ جوان آلودہ نہیں ہے اور اس طرح اس کو روکا نہیں جا سکتا، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ''وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ'' اس تعبیر کو ایک انسان کی پاکیزگی اور طاہر ہونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اور اس جملہ سے حضرت یوسفؑ کو پاک وپاکیزہ جاننا ظاہر ہوتا ہے۔

۳)۔ حضرت یوسفؑ کا جمال ظاہری، ساتھ ساتھ حسن سیرت اور ان کی پاکدامنی اس بات کا سبب بنی کہ ان کو بشر نہیں بلکہ ملک تصور کیا گیا، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ (یوسف۔31)

عزیز مصر کی زوجہ کی طرف سے مہمانوں کی مذمت

عزیز مصر کی زوجہ کی تمام مہمان عورتیں حیرت زدہ رہ گئیں اور ان لوگوں نے جس چیز کے اظہار کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا وہ سب ان کی زبان پر آ گیا اور انہوں نے اس کنعانی جوان سے اپنی محبت اور دیوانگی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت عزیز مصر کی زوجہ نے غنیمت جان کر ان کے ذہنوں پر اپنی نسبت سے ایک بھرپور چوٹ لگائی اور کہا کہ میں وہ ہوں جس نے سالہا سال اس خوبصورت جوان کے ساتھ زندگی گذاری ہے اور آخر اس کی دیوانی ہوگئی ہوں۔ تم لوگوں نے ہمارے اسی عشق سوزاں کی مذمت کی تھی۔ اب کیا ہوا کہ تم لوگ صرف پہلی ہی نشست میں اس کو دل دے بیٹھیں اور لیموں کاٹنے کی بجائے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ کیا اب بھی بات درست ہوگی کہ اس کی محبت کے بارے میں تم لوگ مجھے ملامت کرو؟ قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے: قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ یعنی'' یہ وہی کنعانی جوان ہے جس کے عشق کی وجہ سے تم لوگوں نے میری ملامت کی اور کہا کہ ایک عورت کو زیبا نہیں دیتا کہ اپنے غلام پر فریفتہ ہو جائے'' بلکہ یہ تو وہ مرد ہے جس کو عورت کے پیچھے بھاگنا چاہیے، لیکن ابھی ابھی تم لوگوں نے بھری محفل میں اس قاعدہ کو توڑ دیا۔ پس جان لو کہ میں نے خود اس کو اپنی طرف بلایا اور اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اگر سرتابی کرے گا تو ذلیل ہو کر قید میں ڈال دیا جائے گا اور زندان میں بھی اس کی اہانت کی جائے گی جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ

حضرت یوسفؑ نے محفل میں ایک کنارے بیٹھ کر عزیز مصر کی زوجہ کی یہ بات سنی کہ اسے جیل سے ڈرایا جا رہا ہے۔ بعد کی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ ہر عورت نے عزیز مصر کی زوجہ کی بات کی تائید کی اور حضرت یوسفؑ سے اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے کہا۔ اس وجہ سے انہوں نے فوراً ایک مضبوط قلعہ میں پناہ چاہی اور عرض کیا: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ یعنی'' پروردگار! قید میرے لیے گناہ

میں آلودہ ہونے سے بہتر ہے''۔

اس جملہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان سب عورتوں نے حضرت یوسفؑ سے عشقیہ باتیں کی تھیں اور انہیں غلط کام کی دعوت دی تھی۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان سب نے اپنے ساتھ وصال کی درخواست کی تھی یا سب نے مل کر زلیخا کی خواہش کی سفارش کی تھی۔

اگر حضرت یوسفؑ پہلے حالات میں ایک خوبصورت عورت کے قبضہ میں تھے تو آج مصر کی بہت سی خوبصورت عورتوں کے سامنے ہیں اور ان میں ہر عورت ایک متقی انسان کے لیے بہت بڑا فریب ہے، حتیٰ کہ وہ سب کی سب ان کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں۔

حضرت یوسفؑ چونکہ عزیز مصر کے گھر میں بچپن سے پلے بڑھے تھے، اس وجہ سے زلیخا کو ہمیشہ ماں کی نظر سے دیکھتے تھے جب کہ آج کی محفل کی تمام عورتیں مصر کی خوبصورت ترین عورتیں تھیں اور حضرت یوسفؑ کے سامنے پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ یقیناً پہلی منزل کی نسبت یہ دوسری منزل سخت تر تھی۔ اس وجہ سے یوسفؑ نے اپنی دعا میں زنداں کو ان کی خواہش پر ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کے حیلہ کو اس سے دور کرے تاکہ وہ کبھی بھی ان کی طرف مائل نہ ہوں اور جاہلوں میں سے ہو جائیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ كَیۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡهِنَّ وَاَكُنۡ مِّنَ الۡجٰهِلِیۡنَ

قدرتِ ہوس

اسلامی روایات میں آیا ہے: ''اعدی عدو المرء غضبه وشهوة فمن ملكها علت درجته وبلغ عافيه''[1]

انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا غصہ اور ہوس ہوتے ہیں۔ جس شخص نے ان دونوں پر قابو پا لیا اس کا درجہ بلند ہو گیا اور ان کے کمال کو پا لیا، کیونکہ جب بھی انسان کا غصہ اور ہوس بھڑک اٹھتے ہیں تو انسان کی فکر اتنی تیرہ و تاریک ہو جاتی ہے کہ وہ گناہ کے عواقب کو روک نہیں پاتا اور نتیجہ میں ایسا کام کر گزرتا ہے کہ بدلہ میں بربادی ہی ہاتھ آتی ہے۔ اس وجہ سے ان دو مہلک طاقتوں کے مقابلہ کے لیے کھڑا ہونا (جب کہ ان میں اعتدال انسان کی بقا و سعادت کا ضامن ہوتا ہے) جہادِ اکبر ہے اور اس کے مقابلے میں شمشیر چلانا جہادِ اصغر شمار کیا گیا ہے۔[2]

یہاں یوسفؑ نے حق کے لیے جہادِ اکبر کیا، ایسا جہاد جس نے ان کو اس دنیا میں عفت و تقویٰ کا مجسم اور صبر و خودداری کا نمونہ بنا دیا۔ انہوں نے اللہ سے چاہا کہ ان دو طاقتوں کے شر سے انہیں محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی اور ان کی پاکدامنی کو زندان کی قیمت سے ادا فرما کر انہیں محفوظ رکھا، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: فَاسۡتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنۡهُ كَیۡدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

---

[1] ہدایۃ العلم فی تنظیم غرر الحکم ص ۴۶۳، باب العین

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۱ ص ۲۲۔ پیغمبر اکرمؐ نے ایک جماعت کو جہادِ راہ خدا پر مامور فرمایا، جب وہ جہاد سے لوٹے (جب کہ تھکان خوردہ اور مجروح تھے) آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: ''آفرین سب ان لوگوں پر جنہوں نے جہادِ اصغر انجام دیا۔ لیکن ان کا جہادِ اکبر ہنوز باقی ہے''، پوچھا گیا: ''جہادِ اکبر کیا ہوتا ہے؟'' ارشاد فرمایا: ''جہاد بالنفس''۔

سبق آموز نکات

اگرچہ سورۃ یوسفؑ سراپا نصیحت وعبرت ہے لیکن اس حصہ کی آیت سے حسب ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱)۔کبھی تمام حالات سے انسان اپنے آپ کو پاک سمجھتا ہے اور دوسرے پر اتہام لگاتا ہے جب کہ اس کو دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ خود ان حالات میں الجھا ہوتا تو کیا عزت وآبرو کے ساتھ اس امتحان میں کامیاب ہوسکتا تھا یا نہیں۔

مصر کی عورتوں نے عزیز مصر کی زوجہ کے عمل کو بہت برا کہا تھا، لیکن امتحان کے وقت وہ سب کی سب ناکام ہو گئیں اور ان کا آئینۂ عفت ہوس کے پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہو گیا اور سب کی سب نے مل کر اظہار عشق کر ہی دیا۔جیسا کہ جملہ ''يَدۡعُوۡنَنِيۡۤ اِلَيۡهِ'' سے معلوم ہوتا ہے۔

۲)۔طاغوتی مملکت کی عورتوں کی زندگی کے مطالعہ سے انسان ایک خصوصیت حاصل کرتا ہے، وہ یہ کہ مادی دنیا میں زندگی کے طرح طرح کے وسائل اور ہوس رانی فراہم ہے۔وہ ظاہری عفت کم سے کم دام میں ٹوٹ جاتی ہے جس سے اس طرح کی عورتوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

۳)۔شدید ترین پہلوؤں سے انسان شیطان کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔اس صورت میں بہترین راہ نجات اللہ کی پناہ حاصل کرنا ہے تاکہ اس مضبوط قلعہ میں شیطان کے ہر طرح کے فریب سے محفوظ رہے۔حضرت یوسفؑ نے بھی ایسے ہی قلعہ میں اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کی۔

۴)۔دنیا کے عظیم انسان اپنے تقویٰ وعفت کے گوہر کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو زنداں کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ ان کا دین محفوظ رہے۔حضرت یوسفؑ بھی اپنی عفت کی حفاظت کی خاطر قید خانہ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔بعد کی آیات اس بات کو واضح طور پر بتلا رہی ہیں۔

زندگانی حضرت یوسف علیہ السلام کا تیسرا حصہ

زندان کی تاریکی سے کرسی صدارت تک

موضوع سے متعلق آیات

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ﴿۳۵﴾

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ

الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ

اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۳۶﴾

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ

هُمْ كٰفِرُوْنَ﴿۳۷﴾

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ

مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا

يَشْكُرُوْنَ﴿۳۸﴾ (یوسف۔ ۳۵تا۳۸)

آیات کا ترجمہ:

۳۵)۔ پھر عزیز مصر (اور اس کے لوگوں نے) باوجودیکہ (حضرت یوسفؑ کی پاکدامنی کی) نشانیاں دیکھ لی تھیں، ارادہ کیا کہ کچھ عرصہ کے لیے ان کو قید رکھیں۔

۳۶)۔ حضرت یوسفؑ کے ساتھ دو جوان اور بھی قید خانہ میں داخل ہوئے۔ (جو بادشاہ کے ملازمین میں سے

تھے) ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ انگور کی شراب نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور اس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں ان کی تعبیر بتاؤ کیونکہ ہم تم کو نیکو کاروں سے سمجھتے ہیں۔

۳۷)۔ یوسفؑ نے کہا (زیادہ دیر نہ ہوگی) کہ جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ (تعبیر خواب بھی) منجملہ ان باتوں کے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے تعلیم فرمائی ہے۔ میں ان لوگوں کے مذہب پر نہیں ہوں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے منکر ہیں۔

۳۸)۔ میں تو اپنے باپ دادا ابراہیمؑ واسحاقؑ ویعقوبؑ کے مذہب پر ہوں۔ درست نہیں کہ ہم اللہ کا کسی کو شریک بنائیں۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے ہم پر اور تم لوگوں پر بھی، مگر بہتیرے لوگ اس کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی وطہارت کا چرچا ہونے لگا تھا اور گواہوں نے طرح طرح سے ان کی پاکدامنی کے لیے گواہی دی تھی ،عزیز مصر کی بیوی، وہ خود بھی، اس کے خاندان کے ایک شاہد اور مہمان عورتوں نے کہا: ''یہ جوان عصمت، شرم وحیا کے لحاظ سے اس سے بلندو بالا ہے کہ ہم اپنے قبضہ میں لا سکیں۔ وہ تقویٰ کا پہاڑ ہے جسے اس جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ بالآخر ایک نیا ارادہ کیا گیا کہ کچھ عرصہ کے لیے انہیں زندان میں ڈال دیا جائے۔ اس ارادے کا کیا مقصد تھا؟ اس جگہ چند مسائل کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

۱)۔ عزیز مصر کی زوجہ کا عشق اور مہمان عورتوں کی فریفتگی ایسا موضوع نہ تھا جو گھر کے احاطہ میں دفن ہو جاتا اور یہ راز کھل نہ پاتا۔ خاص طور سے اگر یہ چرچا ہو جاتا کہ یہ کنعانی غلام ان شریف عورتوں کے ناز ونخرے سے متاثر نہیں ہوا، نہ ہی اس نے انہیں اہمیت دی ہے تو اس صورت میں تمام خاندان کی ہتک وبے عزتی ہوتی کیونکہ یہ حضرات اس کام میں ملوث تھے۔ اس وجہ سے حضرت یوسفؑ کو زندان میں بھیج دیا گیا تا کہ ان کی غلطی بنا کر اپنے خاندانوں کی عزت بچالی جائے نیز اس شاہی خاندان کو ہتکِ عزت کو بھی بچایا جائے۔

۲)۔ اس لائحہ عمل میں عزیز مصر کی بیوی کا زیادہ ہاتھ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ حضرت یوسفؑ سمجھ جائیں کہ حکومت کی باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا شوہر بھی اس کے بنائے ہوئے لائحہ عمل کے مطابق کام کرتا ہے وہی شوہر جس نے انہیں گنہگار جانا تھا اور یوسفؑ کو نجات دی تھی وہ اپنی زوجہ کے نفوذ سے اپنی رائے بدل دے گا اور یوسفؑ کی زندان میں بھیجنے کی موافقت کرے گا۔ لہٰذا یوسفؑ کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ زندان میں جائے یا اس کی خواہش پوری کرے۔ اتفاق سے عزیز مصر کی زوجہ نے صریحی طور پر اپنی مہمان عورتوں سے یہی کہا، جیسا کہ قرآن مجید بیان فرماتا ہے: وَلَئِنۡ لَّمۡ يَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسۡجَنَنَّ وَلَيَكُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِيۡنَ

۳)۔حضرت یوسفؑ کے حسن کی بات اور یہ خبر کہ جشن میں آئی ہوئی عورتوں نے انہیں دیکھ کر لیموں کی جگہ اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں، تمام مصر کی عورتوں میں تہلکہ مچا دیتی اور سب لوگ یہ چاہتے کہ اس خوبصورت شخص کو نزدیک سے دیکھیں۔ظاہر ہے کہ اس طرح کی شہرت سے ان عورتوں میں کیسا اجتماعی فساد پیدا ہو سکتا تھا۔

اس ایک وجہ یا اور کئی وجوہات کی بناء پر سب لوگوں نے یہی طے کیا کہ یوسفؑ کو زندان میں ڈال دیا جائے۔لیکن ان کا اس طرح زندان جانا ان کے لیے ترقی کا ایک زینہ بن گیا، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہر نشیب فراز کا مقدمہ ہوتا ہے۔ ہر محنت مشقت کے بعد ایک قوت وجود میں آتی ہے۔اس بار بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عظیم شخص اندھیرے زندان سے تختِ شہنشاہی پر جا بیٹھتا ہے۔

بے گناہ قیدی

بے گناہ قید کر دیئے گئے۔ ان کے زندان میں آتے ہی اور جوانوں کو بھی ان کے ساتھ ہی وہاں بھیجا گیا۔ جیسا کہ قرآن فرما رہا ہے:''وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ'' توریت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں جوان افسر و غلام تھے۔[1]

حضرت یوسفؑ کے نیک برتاؤ نے ان دونوں جوانوں کے دلوں کو جیت لیا۔انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ایک پاک باز اور نیک انسان ہیں اور تعبیر خواب بتانے میں بہت ماہر ہیں۔اس لیے جس نے بھی جو خواب دیکھا حضرت یوسفؑ سے اس کی تعبیر معلوم کرنا چاہی۔

ان میں سے ایک نے خواب دیکھا تھا کہ انگور نچوڑ رہا ہے کہ شراب بنائے، دوسرے نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے سر پر روٹی رکھ کر لے جا رہا ہے اور پرندے روٹیاں کھا رہے ہیں۔ دونوں نے حضرت یوسفؑ سے اپنے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہی، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ

تعجب اس بات پر ہے کہ ان لوگوں نے حضرت یوسفؑ کی نیکوکاری پر اعتماد کیا اور ان سے تعبیر خواب معلوم کی۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے:نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی''ہمیں اس کی تعبیر بتاؤ کیونکہ ہم تمہیں نیک کام کرنے والوں میں جانتے ہیں''۔

یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ فراعنہ کے نزدیک تعبیرِ خواب صرف نیک بندوں سے ہی مخصوص تھی۔کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ ہم تعبیر خواب بتانے میں دسترس رکھتے ہیں،لیکن یہ تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ حضرت یوسفؑ کے دعویٰ پر ہی تکیہ کرتے،ان کی نیکیوں پر نہیں اور ان سے یہ کہتے کہ تم نے کہا کہ ہم تعبیر خواب کے علم سے واقف ہیں۔یہ نہ کہتے کہ ہمارے خوابوں کی تعبیر بتاؤ کیونکہ تم نیک بندوں میں سے ہو۔

---

[1] اس تمام کاروائی کے بعد معلوم ہوا کہ ساقی اور روٹی پکانے والا اپنے آقا حکمران مصر کے مجرم تھے اور اس دور کا فرعون اپنے دونوں سرداروں یعنی ساقیوں اور نان بائیوں کے سرداروں سے ناراض ہوا۔لہٰذا اس نے سرداران فوج کے مخصوص فوج کے مخصوص قید خانہ میں، جس میں حضرت یوسفؑ کو بند کیا گیا تھا، قید کر دیا۔حضرت یوسفؑ کو مقرر کیا گیا کہ ان کی خدمت کریں اور وہ عرصہ تک قید رہے۔(سفر تکوین فصل چہارم، آیات ۱ تا ۵)

حضرت یوسفؑ زندان سے اخلاقی و اعتقادی درسگاہ کے عنوان سے استفادہ کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن تھا اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ توحید کے عقیدہ کو دوسروں تک پہنچائیں۔ افسوس کہ فراعنہ میں یہ دونوں اصل باتیں ایک حد تک مسخ ہو چکی تھیں۔ توحید ان لوگوں کے درمیان متفرق خداؤں کی صورت میں مسخ ہو چکی تھی، یعنی وہ واجب الوجود خدائے قادر و قاہر کے علاوہ بہت سے خداؤں کے معتقد ہو گئے تھے جن میں ہر خدا اپنے لیے الگ ذمہ داری رکھتا تھا، جیسے علم کا خدا، قدرت کا خدا، آسمان کا خدا، زمین کا خدا، خوبصورتی کا خدا، امنیت کا خدا اور اس کو مقابلہ میں جنات کو مبادیٔ بشر جانتے تھے کہ وہ موت فقر، بدکاری، درد و غم کو لاتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی قوم کے بزرگوں کی پرستش کرتے اور سلاطین کو اپنا مالک و مختار سمجھتے تھے۔ اس طرح اصل توحید شرک سے تبدیل ہو چکی تھی اور اس میں فاسد اعتقادات داخل ہو گئے تھے۔ دراصل عقیدۂ معاد میں بھی انحراف پیدا ہو گیا تھا۔[1]

وہ لوگ آخرت میں دوسری دنیا میں جانے کی بجائے معاد کو ایسی دنیا میں واپسی جانتے تھے اور اس بات پر معتقد تھے کہ دوسری مرتبہ پھر اسی دنیا میں پلٹ کر آئیں گے، لہٰذا طاقت ور لوگ دوبارہ اسی تخت شاہی پر آ کر بیٹھیں گے۔ اس وجہ سے قیمتی جواہرات کو اپنے ساتھ دفن کرتے تھے اور اپنے جسموں کی حفاظت کے لیے اہرام بنواتے تھے۔[2]

لہٰذا حضرت یوسفؑ نے تبلیغ و ہدایت کے مقصد ان دونوں کو اپنا ساتھی بنایا، لیکن ایک واضح مقدمہ کے ساتھ، اور وہ یہ کہ قطعی طور پر ان لوگوں سے کہا: ''قبل اس کے تمہارا کھانا تم تک پہنچے میں تمہیں ان دونوں خوابوں کی حقیقت سے آگاہ کر دوں گا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا۔ اس بناء پر ''بتاویله'' کی ضمیر خواب کی طرف پلٹتی ہے اور آیت کے سیاق سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری بات: جملہ ''الا نباتکما بتاویله'' اس جملہ کا معادل ہے جو دونوں قیدیوں نے کہا تھا یعنی ''نبئنا بتاویله'' لیکن جب ضمیر ان دونوں کی باتوں میں رؤیا کی طرف پلٹی ہے تو ضروری ہے کہ ''بتاویله'' میں جو ضمیر ہے اور کلام یوسفؑ میں ہے، اس کی ضمیر بھی اس طرف پلٹے۔

کہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''بتاویله'' کی ضمیر طعام کی طرف پلٹتی ہے اور حضرت یوسفؑ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے علم غیب کا دعویٰ کیا اور کہا: کھانا تمہارے پاس نہیں لایا جائے گا مگر یہ کہ اس کے لانے سے پہلے ہم اس کی کیفیت تمہیں بتا دیں گے اور یہ علم غیب خدا نے ہمیں سکھایا ہے''۔ اس طرح کا دعویٰ حضرت مسیحؑ کے دعویٰ کی مانند ہے جو انہوں نے بنی اسرائیل سے کیا تھا یعنی وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران۔ 49)

اس نظریہ کی اگر کوئی چیز مؤید ہو سکتی ہے تو وہ جملہ ''قبل ان یاتیکما'' ہے گویا اسی کا سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''کھانا لانے

---

[1] المیزان ج ۱۱ ص ۱۹۲۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے زندان میں تبلیغ کے دوران ''توحید در عبادت'' ہی کا سہارا لیا ہے۔

[2] المنار، ج ۱۲، ص ۲۰۶

سے پہلے'' حقیقت حال سے باخبر کردیں گے۔ اگر مقصود پہلی تفسیر ہی ہو تو اس حکم کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن جو چیز اس نظریہ کو ذہن سے ہٹاتی ہے وہ یہ کہ کسی چیز کے لیے ایک گھنٹہ پہلے خبر دینا، جو بعد میں حاضر ہونے والی ہے، لفظ تاویل استعمال نہیں ہوتا۔ لفظ تاویل وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی چیز سامنے ہو لیکن جس کی واقعیت کا آئندہ پتہ چلے، ایسی چیز کے لیے نہیں جیسے زنداں کا کھانا جو ابھی قیدیوں کے ہاتھوں تک نہیں پہنچا، اگر واقعاً یہ مقصود تھا تو بہتر تھا کہ آسان جملہ کے ساتھ، جیسا کہ حضرت مسیحؑ کے معجزہ کے بارے میں کہا گیا ہے، بیان ہوتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اولاً: کیوں تعبیر خواب میں تاخیر کی گئی؟ دوسرے: تفسیر اول کی بنا پر کیوں کھانا لانے کو تعبیر و تاویل کا زمانہ ملا کر قرار دیا گیا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اس طرح یہ چاہا کہ تعبیر خواب بتانے سے پہلے ان کو توحید کی طرف دعوت دیں کیونکہ جب وہ لوگ اپنے خوابوں کی تعبیر کے منتظر ہوں گے تو حضرت یوسفؑ کی باتوں کو اچھی طرح سنیں گے تاکہ ان کی بات مقصد کی انتہا تک پہنچ جائے۔ اس کے برعکس اگر فوراً تعبیر خواب بتا دیتے تو دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے اور تبلیغ کا موقع نکل جاتا۔ انسان کو متاثر کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اسے کسی بات کو سنا کر تشنہ چھوڑ دیا جائے تاکہ اس کی پوری توجہ باقی رہے اور وہ غور سے بات سنے۔

دوسرے سوال کے بارے میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کہ ان کے پاس وقت کے تعین کے لیے کوئی چیز نہ تھی، اس لیے شاید قیدیوں کے کام کو کھانا کھانے کے حساب سے منظم کیا گیا ہو۔ بہر حال کسی بھی صورت میں حضرت یوسفؑ نے اس مسئلہ کو پیش کیا کہ کھانا لانے سے پہلے ہم تم لوگوں کو تمہارے خوابوں کی تعبیر سے آگاہ کر دیں گے۔ اس طرح وہ تبلیغ کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔

حضرت یوسفؑ خواب کی تعبیر کے علم کو خود اپنے مقام کے لیے نہیں جانتے تھے، بلکہ اسے ایک نعمت الٰہی شمار کرتے تھے، جو انہیں آئین توحید کی پیروی کرنے سے ملی تھی، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ؀ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ

اس آیت میں دونوں باتوں یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان کا سہارا لیا گیا اور دونوں پر اعتقاد رکھنے کو اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے کرامت جانتے ہیں اور فرماتے ہیں: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ حضرت یوسفؑ کہتے ہیں: تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ اگر اس سے مراد عزیز اور اس کی زوجہ کا آئین ہو تو حضرت یوسفؑ اسی پر کبھی بھی ایمان نہیں لائے تھے کہ بعد میں اس کو ترک کر دیتے۔ دوسرے لفظوں میں لفظ ''ترک'' عموماً ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں انسان کچھ مدت تک اس چھوڑی ہوئی چیز یعنی متروک سے سروکار رکھتا ہو، اس کے بعد اس کو ترک کرے، جب کہ حضرت یوسفؑ نے پہلے ہی روز ایسے آئین سے انکار کر دیا تھا۔ پس اب کس طرح کہہ سکتے تھے کہ میں نے آئین شرک کو ترک کر دیا ہے!

اس کا جواب یہ لفظ ہمیشہ اسی مفہوم میں نہیں ہوتا۔ قرآن نے اس کلمہ کو حضرت یوسفؑ کے مشابہ میں بھی استعمال کیا ہے جہاں فرماتا ہے: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (قیامت۔36) یعنی ''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ مرنے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیا جائے

گا'' جب کہ انسان مرنے سے پہلے بھی آزاد تھا۔ آخر میں ہم یاد دلا دیں کہ زندان میں یہ پہلا موقع تھا جب حضرت یوسفؑ نے اپنے بزرگوں کا نام یعنی ابراہیمؑ و اسحٰقؑ، خود لیا تھا۔

موضوع سے متعلق آیات

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾
مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٠﴾
يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿٤١﴾
وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿٤٢﴾ (یوسف۔ ۳۹ تا ۴۲)

آیات کا ترجمہ:

۳۹)۔ میرے قید خانے کے ساتھیو! یہ بتاؤ کہ کیا متفرق قسم کے خدا عبادت کے لیے بہتر ہوتے ہیں یا ہر کام کے لیے ایک خدائے واحد و قہار؟

۴۰)۔ تم اس خدا کو چھوڑ کر صرف ان ناموں کی پرستش کرتے ہو جنہیں تم نے خود رکھ لیا ہے۔ یا تمہارے آباؤ اجداد نے انہیں معبود کا نام دیا ہے۔ اللہ نے تو ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی جب کہ حکم کرنے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے اور اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ یہی مستحکم اور سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔

۴۱)۔ میرے قید خانے کے ساتھیو! (اب میں تمہارے خوابوں کی تعبیر تمہیں بتاتا ہوں) تم میں سے ایک دوبارہ اپنے مالک کا ساقی بنے گا، جب کہ دوسرے کو سولی پر لٹکا دیا جائے گا اور پرندے اس کے دماغ کو نوچ نوچ کر

کھائیں گے، اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے جس کے بارے میں تم سوال کر رہے ہو، (اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی)

۴۲)۔ اور پھر جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ نجات پانے والا ہے، اس سے کہا کہ اپنے مالک سے میرا بھی ذکر کر دینا لیکن شیطان نے اسے مالک سے ذکر کرنے کی بات بھلا دی اور حضرت یوسفؑ چند سال مزید قید خانے ہی میں رہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یوسفؑ کا محورِ گفتگو توحید درعبادت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ توحید کے دوسرے مراحل قابل بحث نہیں تھے یعنی ان کا اعتقاد اس کے بارے میں صحیح تھا یعنی وہ لوگ اس بات کے معتقد تھے کہ اللہ واجب الوجود ہے، پوری دنیا کا خالق ہے اور کائنات کا تمام نظام اسی کی ذمہ داری ہے، لیکن بعض وجوہات کی بناء پر بعض لوگ جن کے اسماء پہلی فصل میں آ چکے، ان کی پرستش بھی کرتے تھے۔

جب یوسفؑ پلے ان کے فطری رجحان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں: ''کیا معبودِ واحد وقہار (تم سب کے سب جس کا عقیدہ رکھتے ہو) عبادت کے لائق ہے یا وہ ناتوان یا کمزور مخلوق جو خود سب کے سب اپنی پائیداری میں بقاء کے لیے اس کی محتاج ہیں؟ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف۔39)۔ فطرتاً اس سوال کا جواب یہی ہوگا کہ خداوند واحد وقہار ہی عبادت کے لائق ہے۔

اب حضرت یوسفؑ توحید درعبادت کی تکمیل کی طرف پلٹتے ہیں اور ان کے معبودوں کی حقیقت کی تشریح کرتے ہیں کہ یہ تو صرف نام کے خدا ہیں، خدا نے ہرگز یہ نہیں کہا ہے کہ ایسی ناتواں مخلوق کی عبادت کرو، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (یوسف۔40)

حقیقت میں ہے کہ حکم اسی معبود کی طرف سے ہے جس کی عبادت کا اس نے حکم دیا ہے کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہ اصول تمام شرائع میں محفوظ ہیں لیکن اکثر لوگ اس سے نا آگاہ ہیں جیسا کہ فرماتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف۔۔40)

حضرت یوسفؑ نے اپنے اس بیان سے آئین توحید کی تشریح فرمائی لیکن معاد کے سلسلہ میں کچھ نہ کہا، گویا معاد کے لیے صرف پہلے جملہ پر ہی اکتفاء کیا یعنی اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ

اب دونوں قیدی بڑی شدت سے منتظر ہیں کہ حضرت یوسفؑ ان کے خواب کی تعبیر بیان کریں۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے دونوں کے خواب کی تعبیر بغیر بتائے کہ کون سی تعبیر کس کے خواب کی ہے بیان فرمائی لیکن دونوں نے اپنے اپنے قرینے سے اپنے خواب کی تعبیر سمجھ لی۔ انہوں

نے فرمایا: ''تم دونوں میں سے ایک اپنے سرپرست کا ساقی بنے گا جب کہ دوسرا دار پر چڑھا دیا جائے گا اور پرندے اس کا مغز کھائیں گے۔ لیکن پھر بھی اس کی تصریح سے پرہیز کیا کہ کون ساقی ہوگا اور کون دار پر چڑھا دیا جائے گا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ (یوسف-41)

صحیح ہے کہ حضرت یوسفؑ نے دونوں کے خوابوں کی تعبیر بتائی لیکن یہ تصریح نہیں کی کہ کون سی تعبیر کس کے خواب کی ہے۔ لیکن ان لوگوں نے قرینہ سے خود ہی یہ سمجھ لیا کہ جس نے خواب میں اپنے آپ کو انگور کو نچوڑتے دیکھا ہے وہ اپنے سرپرست کا ساقی ہوگا اور جس نے خواب میں دیکھا ہے کہ روٹی لے جا رہا ہے اور پرندے روٹیاں کھا رہے ہیں وہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ زندان کے باہر بادشاہ نے عدالت میں ان دونوں کے لیے یہی متضاد دو فیصلے کئے تھے اور حضرت یوسفؑ نے بھی یہی تعبیر بتلائی تھی۔ آخر کار حضرت یوسفؑ کے بتانے کے مطابق ہی صورت پیش آئی، یعنی یہ کوئی قضا و قدر کا مسئلہ نہ تھا کہ اس میں ''بداء'' واقع ہوتی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ۔ یہاں تک کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی اپنے خواب کی تکذیب بھی کرتا تو اس کا کوئی اثر نہ پڑتا حتیٰ کہ کوئی نیک کام بھی کرتا تو اس میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں تھی۔

اسباب طبعی کا دخل

یہاں حضرت یوسفؑ نے فرصت کو غنیمت جانا اور اپنی آزادی کے لیے اسباب طبیعی کے دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ یہ ایسے اسباب تھے جن سے تمسک کرنا عقل و شرع کے عین موافق تھا اور خود اسلام نے بھی اس کی دعوت دی ہے۔ یہ اسباب انسان کی نظر میں ایسے وسیلہ سے زیادہ نہیں ہیں کہ اگر مؤثر ہوں تو اذنِ خدا ہی سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اسباب طبیعی کو آئین توحید کے خلاف نہیں جاننا چاہیے۔ دنیا میں تمام زندگی اسباب و مسببات کی بنیاد پر ہی گزرتی ہے۔ اس کی مثال کسان کی سی ہے جو اسباب طبیعی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، زمین کو زرخیز بنا کر اس میں بیج ڈالتا ہے، موجود پانی سے استفادہ کرتا ہے اور زراعت کے اگنے پر اس کو کھاتے ہیں۔

اصولی طور پر اگر کوئی طبعی دروازوں کو کھٹکھٹانے کو توحید کی مخالفت سمجھتا ہے یا انہیں استقلال کے خلاف تصور کرتا ہے تو وہ افراط و تفریط کا شکار ہوتا ہے، پہلا شخص توحید کی صحیح تفسیر نہیں کرتا جب کہ دوسرا شرک اختیار کرتا ہے اسی وجہ سے حضرت یوسفؑ نے نجات پانے والے سے کہا: ''ہماری اصلی حالت اپنے سرپرست کو بتا دینا کہ یوسفؑ کو بغیر کسی جرم کے قید کیا گیا ہے اور یہ حکم اس پر ظالمانہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ

الفاظ عبارت ''انسا'' اور ''ذکر ربہ'' کی ضمیر ہائے متصل بادشاہ کے ساقی کی طرف کرتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی طرف نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید بادشاہ کے بھول جانے والے ساقی کی مراد لیتا ہے جس کو مدت کے بعد حضرت یوسفؑ کی درخواست یاد آئی، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: واذ کر بعد امۃ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دونوں ضمیریں حضرت یوسفؑ کی طرف پلٹتی ہیں: ''فانسہ الشیطن ذکر ربہ'' یعنی شیطان اس بات کا

باعث بنا کہ حضرت یوسفؑ نے خدائے ذوالجلال کو بھلا دیا اور بجائے اس کے کہ اللہ کے سامنے استغاثہ کرتے ایک انسان کی پناہ لی اور اس سے مدد طلب کی۔ اس طرح وہ ترکِ اولیٰ کے مرتکب ہوئے جس کی وجہ سے مدتوں قید میں پڑے رہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ

اگرچہ یہ تفسیر بھی فریقین کی کتب میں ملتی ہے۔ [1]

لیکن یہ روایت غالباً مرسل اور بغیر سند کے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت ابوہریرہ جیسے راویوں ہی کی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی بعید نہیں کہ یہ روایت عیسائیوں اور یہودیوں کے راہبوں اور احبار نے گھڑی ہو۔

پہلے حصہ میں ہم نے دیکھا کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کو مخلصین میں شمار فرماتا ہے یعنی اَنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ (یوسف۔42) اور قرآن مجید خود صراحتاً فرماتا ہے کہ شیطان "مخلصین" تک نہیں پہنچتا یعنی اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ (حجر۔40) ۔لہٰذا حضرت یوسفؑ کم از کم اس حکم کے ذریعہ "مخلصین" سے ہیں اور اس سے برتر ہیں کہ شیطان ان تک راہ پائے۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۲ ص ۴۲۶، ۴۲۷، دار المنثور ج ۴ ص ۵۴۱

بادشاہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی تعبیر

قرآن ابھی تک حالات مصر کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جن میں حضرت یوسفؑ خریدے گئے تھے، عزیز مصر کے گھر میں پلے بڑھے تھے اور اس کے بعد چند اسباب وعلل، جو بیان کئے گئے، کی وجہ سے زندان میں ڈال دیئے گئے تھے۔ قرآن اس کے بعد بادشاہ کی طرف مخاطب ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالک کی حیثیت رکھتا اور عصرِ حاضر کے مطابق بادشاہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ''عزیز'' کے علاوہ کوئی شخص تھا۔ بادشاہ کے کچھ کام اس کے ذمہ کر دیئے گئے تھے اور زندان کا اختیار بھی اسی کے سپرد تھا۔ وہ دو شخص جو بادشاہ کی ناراضی کا باعث ہوئے تھے۔ انہیں بھی اس جیل میں بھیجا گیا تھا جہاں حضرت یوسفؑ قید تھے۔ اس وجہ سے ہم بلا وجہ یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت یوسفؑ کو فوراً زندان میں بھیج دیا جاتا ہے، وہ بھی کسی طرح کا ان کے بارے میں حکم صادر ہوئے بغیر۔

بادشاہ نے ایک خواب دیکھا کہ جس کی تعبیر کے لیے مصر کے دانشمند حضرات کو جمع کیا گیا لیکن وہ تمام کے تمام اس کی تعبیر دینے سے عاجز رہے۔ ناگہاں بادشاہ کے ساقی کے ذہن میں اس پاکدامن انسان کی یاد آئی جو زندان میں زندگی گذار رہا تھا اور خواب کی تعبیر بتانے میں بہت ماہر تھا۔ ساقی نے اپنے دل میں سوچا کہ کتنا اچھا ہو کہ بادشاہ کا خواب اس سے بیان کرے اور اس کی تعبیر اسی سے معلوم کرے لہٰذا فوراً بادشاہ کی اجازت لے کر وہ زندان کی طرف روانہ ہو گیا اور حضرت یوسفؑ سے تعبیر سن کر دوڑا ہوا دربار میں لوٹا۔ اسی وقت بادشاہ کے دل میں دیدارِ یوسفؑ کا شوق پیدا ہوا۔ اب ہم بادشاہ کے خواب اور اس کی جناب یوسفؑ کی زبان سے تعبیر کے متعلق آیات کو نقل کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝۴۴

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝۴۵

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۴۶

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾
ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا
تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾
ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

(یوسف۔ ۴۳ تا ۴۹)

آیات کا ترجمہ:

۴۳)۔بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب میں سات موٹی گائیں دیکھی ہیں جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری تازی بالیاں اور سات خشک بالیاں دیکھی ہیں، اے بزرگانِ قوم! میرے خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تمہیں خواب کی تعبیر دینا آتا ہو۔

۴۴)۔ان لوگوں نے کہا کہ یہ تو ایک خواب پریشان ہے، اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

۴۵)۔پھر (حضرت یوسفؑ کے ساتھ) دونوں قیدیوں میں سے جو بچ گیا تھا اسے ایک مدت کے بعد حضرت یوسفؑ یاد آئے تو اس نے کہا کہ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر سے باخبر کرتا ہوں، ذرا مجھے بھیج تو دو۔

۴۶)۔(وہ زندان میں آیا، حضرت یوسفؑ سے ملا اور کہا) یوسفؑ! اے صدیق! ذرا ان سات موٹی گایوں کے بارے میں جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیوں اور سات خشک بالیوں کے بارے میں اپنی رائے تو بتاؤ، تا کہ میں لوگوں کے پاس جاؤں اور انہیں مطلع کروں۔

۴۷)۔حضرت یوسفؑ نے کہا: سات برس تک مسلسل زراعت کرتے رہو، جو غلہ اس طرح پیدا ہوا اسے بالیوں سمیت محفوظ رکھ دو سوائے تھوڑی مقدار کے جو تمہارے کھانے کے کام آئے۔

۴۸)۔اس کے بعد سات سال قحط اور خشک سالی کے سال آئیں گے جن میں تم اپنے ذخیرہ کو کھاؤ گے سوائے اس تھوڑے سے غلہ کے جو تم نے بچا رکھا ہوگا۔

(۴۹)۔اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں کو بہت بارش نصیب ہوگی اور لوگ اس سال میں (پھل اور روغن دار اجناس کو خوب) نچوڑیں گے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یوسفؑ چند سال تک زنداں میں رہے۔قرآن اس مدت میں ان کے کسی کام کے بارے میں کچھ نہیں فرماتا۔آپ عقل وضمیر کے مطابق اس تمام عرصہ میں مصروفِ عمل رہے یہاں تک کہ ایک دن اچانک زندان سے باہر آنے کی امید پیدا ہوئی۔

بادشاہ نے جو پورے ملک کا منتظم تھا،ایک عجیب خواب دیکھا۔قرآن نے اس کے خواب کو اس کی زبان سے لفظ''أریٰ'' کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس خواب کو دوبارہ دیکھا تھا اور اس خواب نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

خواب اس طرح تھا کہ سات کمزور گائیں سات موٹی گایوں کو کھا رہی ہیں جب کہ اس کے برعکس ہونا چاہیے کیونکہ طاقت ور ہمیشہ کمزوروں پر غالب آتے ہیں۔اسی طرح سات ہری بالیوں کو سات خشک بالیوں کے ساتھ دیکھا۔شاید یہ خواب دیکھ کر اس نے اپنی مملکت کے مستقبل کو تاریک تصور کیا اور سوچا کہ بہتر ہوگا کہ واقعہ ہونے سے پہلے اس کا علاج کر لیا جائے۔اس نے اپنے خواب کو ان بزرگوں سے بیان کیا جو اس کے دربار میں موجود تھے،قرآن ان کو لفظ''ملأ'' سے تعبیر کرتا ہے،ایسے موقع پر قرآن''فتویٰ''لغتِ عرب میں حادثہ کے حکم کے بیان کرنے کو کہتے ہیں۔[1]

گویا یعنی وہ چاہتا تھا کہ خواب کی حقیقت واضح ہونے سے پہلے اس کی اصلیت کو جان لے۔جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيٓ أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَٰتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنۢبُلَٰتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَٰتٍ ۖ يَٰٓأَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُءْيَٰيَ إِن كُنتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ

مندرجہ بالا آیت سبز بالیوں کی تعداد سات بتاتی ہے اور کہتی ہے:''سَبْعَ سُنۢبُلَٰتٍ خُضْرٍ ''لیکن خشک بالیوں کے تعداد کے بارے میں کچھ نہیں فرماتا،صرف اتنا ہی کہا گیا ہے،''وَأُخَرَ يَابِسَٰتٍ ''ممکن ہے کلمہ''اخر''اس بات کو ظاہر کرتا ہو کہ وہ بھی سات ہی تھیں۔دوسرا احتمال یہی ممکن ہے کہ جب موٹی اور کمزور گایوں اور سبز بالیوں کو سات تک شمار کیا ہے تو لازمی طور پر اس بات کا سبب بنتا ہے کہ اس کا معطوف بھی اس طرح کا ہو،لیکن اس حالت میں قرآن کی طرف اس مسئلہ کو یقینی طور سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ خواب کے پہلے حصہ میں واضح طور پر کہا جا رہا ہے کہ موٹی گائیں کمزور گایوں پر حملہ کر کے انہیں کھا رہی ہیں لیکن سبز اور خشک بالیوں کے بارے میں کچھ بیان نہیں کیا گیا،صرف ایک جملہ کہا گیا ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ان کو ان کے پاس دیکھا۔

---

[1] مجمع البیان،ج۳ص۲۳۸

اس وجہ سے مفسرین یہاں اس جملہ کے یہی معنی نکالتے ہیں کہ خشک بالیوں نے سبز بالیوں کو لپیٹ لیا ہے اور انہیں ڈھانپ رکھا ہے۔[1]

آیت میں کوئی چیز اس معنی کی شاہد نہیں سوائے اس کے کہ پہلے والے جملہ سے اس چیز کو مقدر جانا جائے یعنی جس طرح لاغر گائیں موٹی گایوں کو کھا رہی ہیں اسی طرح خشک بالیاں لاغر گایوں کی طرح سبز بالیوں پر غالب ہیں۔لیکن یاد رہے کہ ہر خشک خوشہ بغیر دانے کے نہیں ہوتا کہ اسے لاغر گائے کے درجہ میں رکھا جائے بلکہ ممکن ہے خشک بالیاں بھی سبز بالیوں کی طرح اناج سے بھری ہوئی ہوں۔بہرحال آیت اس نقطۂ نظر سے اجمال سے خالی نہیں ہے۔مگر یہ ہوسکتا ہے کہ اس اجمال کی تورات کے ذریعہ تشریح کریں اور کہیں کہ خشک بالیاں پہلے ہی سے مردہ تھیں اور شروع سے اس طرح پیدا ہی بغیر دانے کے ہوئی ہوں گی۔

دانشمندان دربار بادشاہ کے اس خواب کی تعبیر بتانے سے گریزاں رہے تھے۔ان لوگوں نے کہا" آپ نے جو خواب دیکھا ہے وہ پریشان خواب ہے، ہم اس طرح کے خواب کو کچھ نہیں سمجھتے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ ۚ وَمَا نَحۡنُ بِتَاۡوِیۡلِ الۡاَحۡلَامِ بِعٰلِمِیۡنَ

"اضغاث""ضغث" سے ہے جس کے معنی پھول یا سبزہ کا ایک گٹھا ہے۔کیونکہ بادشاہ کا خواب چند متفرق خوابوں کا مجموعہ تھا اس لیے اس کو سبزہ کی گانٹھ سے تشبیہ دی گئی۔"احلام""حلم" کی جمع ہے جس کے معنی ایسے خواب ہیں جو انسان کے تخیلات سے وجود میں آتے ہیں اور خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا، برخلاف ان خوابوں کے کہ جو واقعات کو بیان کرتے ہیں آج کل بھی زبان عرب میں "حلم" اور "احلام" کو اس طرح کے خوابوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا اور جنہیں امرِ محال سمجھا جاتا ہے جیسا کہ کہتے ہیں: "هٰذا صحيح لو صحت الاحلام"

یہ خیال بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے خواب سن کر کچھ سمجھ بھی لیا ہو لیکن مصلحت کے خلاف دیکھتے ہوئے کہ ملک کو آئندہ خطرہ سے دوچار ہونا پڑے گا، نہ بتایا ہو، کیونکہ بادشاہ کے حاشیہ نشین عام طور پر اپنی مصلحت کو بادشاہ اور مملکت کی مصلحت پر ترجیح دیتے ہیں۔

ان حالات میں دو قیدیوں میں سے ایک نے جو حضرت یوسفؑ کے ساتھ قید تھا اور آزاد ہوکر بادشاہ کا ساقی بنا تھا، بادشاہ کا خواب سنا تو یک بہ یک اس کے ذہن میں بات آئی کہ سب سے بڑا خواب کی تعبیر بتانے والا اس کا وہی زندان کا ساتھی یوسفؑ ہے، جس نے زندان میں اس کے اور دوسرے قیدی کے خواب کی تعبیر صحیح بتلائی تھی اور افسوس جس کو اب تک وہ بھولا ہوا تھا، نہ ہی اس کی آزادی کے لیے بادشاہ سے اس نے کوئی بات کی تھی۔لہٰذا اس وقت ساقی نے بادشاہ سے کہا: یہ کام آپ میرے سپرد کردیں، میں آپ کے اس خواب کی مشکل کو حل کئے دیتا ہوں"۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَقَالَ الَّذِیۡ نَجَا مِنۡهُمَا وَادَّکَرَ بَعۡدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُکُمۡ بِتَاۡوِیۡلِهٖ فَاَرۡسِلُوۡنِ

امت سے ایک جماعت مراد ہے لیکن یہاں اس سے مراد زمانہ ماضی ہے یعنی یوں کہہ لیں کہ جب چھوٹے چھوٹے عرصے جمع ہوتے

---

[1] مجمع البیان ج ۳ ص ۲۳۸، تورات میں اس طرح آیا ہے:"یہ سات سرسبز بالیاں ایک ہی شاخ سے نکلیں اور یہ سات مردہ بالیاں جنہیں مشرقی ہوا نے کمزور و مردہ کر دیا ان کے بعد اگیں۔ان سات مرجھائی ہوئی بالیوں نے سات تندرست بالیوں کو لپیٹ میں لے لیا۔(سفر تکوین، فصل ۴۰ آیات ۲۲ تا ۲۵)

ہیں تو زمانہ کی ایک جماعت تشکیل پا لیتی ہے۔

خزرازی کہتا ہے: ''امۃ'' زمانہ کے ایک عرصہ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ زمانہ زیادہ ایام کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے جیسے بہت سے افراد جمع ہوتے ہیں تو ایک امت وجود میں آتی ہے، یہ درحقیقت ایسی امت ہے جو ایام و ساعات سے بنی ہے۔[1]

بادشاہ کا ساقی زندان میں وارد ہوا۔ ملاقات کے بعد ساقی نے بادشاہ کے خواب کو حضرت یوسفؑ سے بیان کیا۔ یہاں حضرت یوسفؑ چاہتے تو اپنی عظمت کا لوہا منواتے اور اس آنے والے سے ملاقات نہ کرتے، یا ملاقات کرتے تو بادشاہ کے خواب کی تعبیر نہ بتاتے، یا بتاتے بھی تو اسے اپنی آزادی کے ساتھ مشروط کر دیتے۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے ان تمام چیزوں کو درگذر کرتے ہوئے ایک عالم متبحر کی طرح جو اپنے علم کو طلباء کے استفادہ کے لیے استعمال کرتا ہے، بغیر کسی شرط کے پیچیدہ خواب کی تعبیر بتا دی۔ عجیب بات یہ ہے کہ صرف خواب کی تعبیر ہی نہیں بتائی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ذمہ دار افراد کی ذمہ داری بھی معین کر دی تا کہ ملک کو قحط سے نجات دلائی جا سکے۔

یہاں پر دو مرحلے سامنے آتے ہیں:

۱)۔ بادشاہ کا خواب آئندہ کس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے؟

۲)۔ اس واقعہ سے نپٹنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

انہوں نے پہلے حصے کے بارے میں اس طرح فرمایا:

۱)۔ سات سال تک تمام برکات الٰہی کا روئے زمین پر نزول ہوگا۔ زمین سرسبز ہوگی اور ہر جگہ نعمتیں ہی نعمتیں ہوں گی۔

۲)۔ دوسرے سات سال میں شدید قحط پڑے گا اور پورے ملک میں کچھ نہیں اُگے گا۔

۳)۔ سات موٹی گایوں اور سات سبز بالیوں کی تعبیر سات سال نعمت کی فراوانی ہے۔

۴)۔ سات لاغر گایوں اور سات خشک بالیوں کی تعبیر دوسرے سات سال قحط کا ہے۔

یقیناً تعبیر کا کچھ حصہ بغیر ذمہ داری واضح کئے ملک کے ذمہ دار لوگوں میں عجیب پریشانی پیدا کرتا ہے۔ وہ لوگ اگرچہ کافر و مشرک تھے لیکن انسان تو تھے ہی۔ حضرت یوسفؑ کو اپنے فرائض انسانی پر عمل کرتے ہوئے لازم تھا کہ انہیں اللہ کے بتائے ہوئے خزانہ وحی سے مطلع فرمائیں۔ لہٰذا انہوں نے خواب کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اس طرح فرمایا:

پہلے سات سالوں میں تمام زمینوں میں زراعت کرو، کھیت کاٹنے کے بعد فصل کو اس کے خوشوں میں بند رہنے دو۔ غلہ میں سے صرف ضرورت کے مطابق کھاؤ اور باقی کو محفوظ کر لو تا کہ آئندہ کے ساتھ سال وہ کام آ رہا ہے، جب آسمان سے ایک قطرہ بھی بارش نہ ہوگی۔ پھر غلہ کو بالیوں سے نکال کر لوگوں کے درمیان متعین مقدار میں تقسیم کرتے رہو اور اس طرح اپنی قوم کو قحط سے نجات دو۔

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۱۸ ص ۱۴۷۔ تورات میں آتا ہے: ''دو سال ختم ہونے کے بعد ایسا ہوا تھا کہ فرعون نے خواب دیکھا (سفر تکوین، فصل ۴۱ آیت ۱) حالانکہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کی کئی سال کی قید کا ذکر فرما ہے، جس میں کم از کم تین ۳ اور اکثر نو ۹ سال بنتے ہیں۔

اس زمانہ میں کاشتکاری کے علم نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ لوگ گندم کو ذخیرہ کرنے کے لیے گودام تعمیر کرتے۔لیکن حضرت یوسفؑ نے علم غیب کے ذریعہ ایک بہت آسان راستہ سیکھا تھا اور وہ یہ کہ بالیوں کو توڑ کر اسی حالت میں محفوظ کرلیا جائے۔اس طرح گیہوں ایک گودام کی مانند صحیح سالم محفوظ رہ سکتی ہے یعنی نہ تو اس میں آگاؤ کی صورت پیدا ہوئی تھی نہ ہی خرابی واقع ہوتی تھی۔قرآن اس حصہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے: قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ۔ جملہ''الا قلیلاً''اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی نظر حالات کے تمام جوانب پر تھی،یعنی یہ ذخیرہ بعد میں رزق کے طور پر عوام کے کام آسکے،اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ۔ جملہ''ما قدمتم لهن''میں بہت بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔یعنی یہ سات سال ایک بھوکے انسان کی طرح منہ کھولے ہوں گے جو غذا کا منتظر ہو۔اس کے لیے گذشتہ سات سال میں جو کھیتی کر کے اکٹھا کیا ہوگا اس کو آنے والے سات سال میں تقسیم کرنا ہوگا تاکہ لوگ کھا سکیں۔لیکن یہاں بھی سب کا سب بانٹنے کے لیے نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ اس میں سے بھی تھوڑا محفوظ کرلو تاکہ بعد میں جب خوش حالی کا زمانہ آئے اور کھیتی باڑی ممکن ہوجائے تو بچا ہوا غلہ بیج کے کام میں لایا جاسکے۔

یہاں تک بادشاہ کے خواب کی تعبیر اور اس کے مشیروں کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔لیکن حضرت یوسفؑ نے یہاں ایک اور چیز کا بھی اضافہ فرمایا،وہ یہ کہ پندرھواں سال مدد و نصرت یا زیادہ بارش کا سال ہوگا جس میں تمام درختوں پر بہت پھل آئے گا جس سے وہ روغن وغیرہ حاصل کریں گے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ

لفظ''یغاث''اگر''یغث''سے لیا جائے تو اس کے معنی نصرت اور مدد کے ہوتے ہیں یعنی لوگ مشمول مدد خدا ہوں گے اور اگر ''غیث''سے مراد لیا جائے تو اس کے معنی بارش کے ہوتے ہیں یعنی کھیتوں میں بارش ہوگی۔لہٰذا بعد کا جملہ''فيه يعصرون''(لوگ نچوڑیں گے)اس بات پر شاہد ہے کہ''یغاث''''غیث''سے ہے نہ کہ''غوث''سے،یعنی زیادہ بارش ہونے سے درخت پھلوں سے بھر جائیں گے اور لوگ ان کے رس کو نچوڑ لیں گے۔

زندان سے آزادی

بادشاہ کے ساقی نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر حضرت یوسفؑ سے معلوم کر کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچا دی۔ وہ اور اس کے تمام درباری اس خواب کی تعبیر اور اس کے بعد کی ضروریات کو سن کر متعجب ہوئے اور بادشاہ نے بھی یہ چاہا کہ حضرت یوسفؑ کو دیکھے۔

اس مقصد کے لیے بادشاہ کا نمائندہ زندان میں آیا اور بادشاہ کا پیغام حضرت یوسفؑ کو پہنچا دیا لیکن انہوں نے زندان سے نکلنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا: ''زندان سے میں اس شرط پر نکلوں گا کہ میرے قید ہونے کی وجہ واضح ہو جائے۔ اس حصہ کی آیات اس طرح ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ
مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۰
قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا
عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ
نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱
ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝۵۲
وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝۵۳ (یوسف۔ ۵۰ تا ۵۳)

آیات کا ترجمہ:

۵۰)۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو میرے پاس لے آؤ، شاہی نمائندہ زندان میں آیا اور حضرت یوسفؑ کو پیغام پہنچایا۔ انہوں نے نہ مانا بلکہ کہا کہ اپنے بادشاہ کے پاس پلٹ جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا حال بھی معلوم کرے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ میرا پروردگار ان کے مکر سے واقف ہے۔

۵۱)۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر پوچھا: ”جس وقت تم لوگوں نے یوسفؑ کو اپنی طرف بلایا تو کیا ہوا تھا، وہ سب کی سب کہنے لگیں: حاش للہ ہم نے یوسفؑ میں کسی طرح کی برائی نہیں پائی“۔ تب عزیز (مصر) کی بیوی بول اٹھی کہ اب تو تمام صورت حال سب پر ظاہر ہو ہی گئی۔ اصل مطلب یہ ہے کہ میں نے خود اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی تمنا کی تھی، لیکن وہ سچوں میں سے ہے۔

۵۲)۔ یہ قصہ میں نے اس لیے بتایا ہے کہ بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے عزیز کی عدم موجودگی میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کی۔

۵۳)۔ یوں تو میں بھی نفس کو بے لوث نہیں کہتا کیونکہ (بظاہر بشر ہوں) اور بر انفس برائی کی طرف ابھارتا ہے۔ مگر جس پر پروردگار رحم فرمائے (گناہ سے بچائے)۔ اس میں شک نہیں کہ میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

بادشاہ مصر جب خواب کی تعبیر اور قحط سے نمٹنے کے لیے منظم لائحہ عمل سے آگاہ ہوا تو اس نے چاہا کہ حضرت کو دیکھے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ عجیب طرح کا عقلمند اور دانشور شخص زنداں میں پڑا ہوا ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ اسے بلا کر آزاد کر دوں۔

ملازم نے جب بادشاہ کا پیغام حضرت یوسفؑ تک پہنچایا تو وہ سمجھ گئے کہ بلانے کا مقصد آزاد کرنا ہے۔ حضرت یوسفؑ زندان کی طرف پلٹ گئے، رہائی سے انکار کیا اور کہا کہ جب تک ان عورتوں کا ماجرا جنہوں نے اپنی انگلیاں کاٹی تھیں، واضح نہیں ہوتا میں زنداں نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے ان لوگوں کے برعکس جو کئی سال زنداں میں رہتے ہیں اور آزادی کی خبر سن کر سب کچھ بھول جاتے ہیں، زندان سے رہائی سے انکار کر دیا اور یہی شرط رکھی کہ پہلے ان عورتوں کا ماجرا اچھی طرح واضح ہو جائے اور خائن وامین کی شناخت ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ

اس آیت میں قابل توجہ نکات اس طرح ہیں:

۱)۔ جملہ ”قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ“ حضرت یوسفؑ کو بادشاہ کے دیکھنے ہی سے تعلق نہیں رکھتا جس کے بعد وہ پھر واپس زنداں بھیج دیئے جاتے کیونکہ اس صورت میں حضرت یوسفؑ زندان سے بلائے جانے سے انکار نہ کرتے، بلکہ ایسی ملاقات کو ظاہر کرتا ہے جس کے نتیجہ میں انہیں مکمل آزادی ملنے والی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان عورتوں کے ماجرے کی تحقیق ہونے سے پہلے زندان سے رہائی حاصل کرنے سے انکار کیا۔

۲)۔انہوں نے اپنی آزادی کو ان خواتین کے ماجرے کی تحقیق سے مشروط قرار دیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آزادی پر اپنی کرامت و شرافت کے اظہار کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ زندان سے رہائی سے پہلے اپنی بے گناہی کو ثابت کریں، اس کے بعد قید سے آزاد ہوں۔ دوسرے لفظوں میں وہ بادشاہ کی طرف سے معافی نہیں چاہتے تھے کیونکہ معافی سے ان کا مجرم ہونا ثابت ہوتا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اور انہیں بے گناہ ہوتے ہوئے زندان میں ڈالا گیا تھا۔

۳)۔وہ اسی طریقہ سے بادشاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہتے تھے کہ تھوڑے عرصہ میں ہی مقام بلند پر پہنچ جائیں جو ایسا مقام ہو جس میں خدا اور خلق خدا دونوں راضی ہوں کیونکہ تحقیق اور بری الذمہ ہونے کے بعد وہ بادشاہ سے ان شرائط پر ملاقات کریں کہ ان کا علم و تقویٰ بادشاہ پر ثابت ہو چکا ہو۔ اس طرح کی مشروط ملاقات کا قبول کرنا دوسری جائز شرطوں کے لیے زمین ہموار کرتا ہے، بعد میں جن کی طرف ہم اشارہ کردیں گے۔ اگر یہ راہ ہموار کئے بغیر ملاقات کے لیے تیار ہو جائے تو وہ ایک دانشمند سے ملاقات کرتا مگر وہ دانشمند خائن بھی ہو سکتا تھا، لیکن تحقیق کے بعد ایک پارسا دانشمند سے ملاقات عمر بھر کے لیے قوت و توانائی کی حامل ہوتی۔

۴)۔حضرت یوسفؑ راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے عزیز مصر کی بیوی کا نام نہیں لیتے حالانکہ وہی ان کے زندان میں جانے کی وجہ بنی تھی۔ یہ اس لیے کہ عزیز اور اس کی زوجہ جانے پہچانے لوگوں میں سے تھے جو تمام ملک میں سرداران سلطنت شمار ہوتے تھے۔ لہٰذا صرف ان خواتین کے بارے میں کہتے ہیں جنہوں نے پھل کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِیۡ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَهُنَّ یعنی (ان عورتوں کا ماجرا کیا تھا جنہوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں؟)

اس وقت فرماتے ہیں اِنَّ رَبِّیۡ بِکَیۡدِهِنَّ عَلِیۡمٌ یعنی ہمارا پروردگار ان کے فریب سے آگاہ ہے۔ یہاں قطعی طور پر ''رب'' سے مراد خالق حقیقی ہے۔ اگر ایک روز عزیز کے لیے 'رب' کا استعمال کیا تھا تو ظاہری طور پر اس دن حضرت یوسفؑ اس کی غلامی میں تھے اس لیے کہا تھا: ''انه ربی احسن مثوٰه'' جس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

۵)۔بادشاہ کا ملازم اس کے پاس حضرت یوسفؑ کے بغیر ہی آیا اور اسے حضرت یوسفؑ کا پیغام سنایا کہ وہ زندان سے اپنی آزادی کو ان خاص عورتوں کے بارے میں تحقیق کے ساتھ مشروط قرار دے رہے ہیں اور بادشاہ کی طرف سے یہ مہربانی اس وقت قبول کریں گے جب ان عورتوں کے بارے میں تحقیق ہو چکے گی۔ یہی وہ موقعہ تھا جب بادشاہ حضرت یوسفؑ کی عقل و دانش کا پہلے سے زیادہ معتقد ہوا اور پہلے سے زیادہ ان سے ملاقات کا خواہش مند ہوا۔

آخر بادشاہ نے ان معزز خواتین کو بلایا اس نے حالات سے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ وہ سب کی سب حضرت یوسفؑ پر فریفتہ تھیں اور عزیز کی بیوی بھی ان میں شامل تھی۔ قرائن سے حضرت یوسفؑ سے ان کے عشق کا پتہ چل گیا۔ اسی لیے ان سے کہا: مَا خَطۡبُکُنَّ اِذۡ رَاوَدۡتُّنَّ یُوۡسُفَ عَنۡ نَّفۡسِهٖ یعنی ''کیا بات تھی کہ یوسفؑ کو تم لوگوں نے دعوت دی؟'' یہ جملہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بادشاہ نے قرائن سے پتہ لگا لیا تھا کہ یہ سب حضرت یوسفؑ پر عاشق تھیں۔ ان حالات میں ان خواتین کا ضمیر بیدار ہو گیا اور انہوں نے راز کھول دیا۔ پس انہی معزز خواتین نے بھی حضرت یوسفؑ کی پاکدامنی کا اعتراف کیا اور کہا: قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمۡنَا عَلَیۡهِ مِنۡ سُوۡٓءٍ۔ اس کے ساتھ ہی زوجہ عزیز مصر نے بھی

جو اس فتنہ کی بنیاد تھی، کہا کہ اب نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے، میں صاف اعلان کرتی ہوں کہ میں نے ہی اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا، اس نے نہیں ۔وہ اپنی بات میں صادق و صحیح ہے ،جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ

یہاں تک آیات قرآن کے اہداف واضح ہو گئے۔اب ہم آیات ۵۲، ۵۳ تک پہنچتے ہیں جو اسی واقعہ کا حصہ ہیں۔لیکن یہ بات واضح نہیں کہ یہ حضرت یوسفؑ کی باتوں کا حصہ ہے یا عزیز کی زوجہ کی باتوں کا؟ یہاں مفسرین کے دو گروہ سامنے آتے ہیں:

ا)۔ایک گروہ کہتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے پیغام کا حصہ ہے جو بادشاہ کے نام تھا کیونکہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کو یہ پیغام بھیجا تھا: مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ ان عورتوں کی سرگذشت کو کیوں چھیڑنا چاہتے تھے اور اس سے ان کا مقصد کیا تھا؟

حضرت یوسفؑ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''یہ مسئلہ آزادی سے زیادہ میرے لیے اہمیت رکھتا ہے تا کہ عزیز مصر جان لے کہ اس کی عدم موجودگی میں بھی میں نے اس سے خیانت نہیں کی کیونکہ فریب کاروں کا فریب نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَاۗىِٕنِيْنَ

لفظ ''ذلك'' فیصلہ کی درخواست کی طرف اشارہ ہے تا کہ واضح ہو جائے کہ خائن کون ہے؟ کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے کہ میں خائن نہیں تھا۔

یہاں حضرت یوسفؑ اپنی امانت وشرافت کو بیان کرتے ہیں کیونکہ انبیاء کی یہی شان ہے کہ وہ ہر جگہ مقام توحید کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر اپنے آپ کو قادر وتوانا کہیں بھی تو فوراً اس کو اللہ کی طرف سے جانیں نہ کہ خود اپنی طرف سے۔دوسرے لفظوں میں چونکہ پہلے جملہ سے خود ستائی کی بو آتی تھی۔حضرت یوسفؑ اس توہم کی تردید میں کہتے ہیں: اگرچہ میں نے خیانت نہیں کی لیکن ہرگز اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں سمجھتا۔ یعنی میں نہیں کہتا کہ میں ملک یا فرشتہ ہوں کیونکہ میں بھی نفس امارہ رکھتا ہوں جو انسان کو برے کاموں کی طرف دعوت دیتا ہے۔پس جو شخص نفس امارہ سے نجات پا جائے وہ رحمت خدا کے سائے میں ہوتا ہے اور میرا پروردگار بہت بخشنے والا مہربان ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

یہ صحیح ہے کہ ان دو آیات اور بادشاہ سے حضرت یوسفؑ کی باتوں کے درمیان اور ایسی آیات بھی موجود ہیں جن کا تعلق بادشاہ سے ہے لیکن چونکہ ان دو آیات کا مضمون ایک خاص بلندی کا حامل ہے۔اس لیے فطرتاً یہ بات حضرت یوسفؑ ہی سے منسوب ہو نہ کہ ایک مشرک عورت سے۔علاوہ ازیں یہ بات نہایت بعید از قیاس ہے کہ ایک بدکردار مشرک عورت نظریہ توحید کے بارے میں اس بلندی سے واقف ہو جو ان دونوں آیات میں پائی جاتی ہے اور کہے: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ

ان سب باتوں کے بعد زلیخا کس قدر حضرت یوسفؑ کی عدم موجودگی میں یہ ادعا کر سکتی تھی کہ انہوں نے خیانت نہیں کی ہے، حالانکہ اپنے شوہر کے سامنے اس نے حضرت یوسفؑ کو متہم کیا تھا کہ اس نے میرے ساتھ خیانت کی ہے اور کہا: مَا جَزَاۗءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا اِلَّآ

اَنۡ یُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ اسی اتہام کے تحت اس نے حضرت یوسفؑ کو قید کر ڈالا تھا۔

دوسرا امر جو تائید کرتا ہے کہ دوسری آیت حضرت یوسفؑ کی اپنی بات ہے، یہ ہے کہ انہوں نے یہی بات پہلے بھی کہی تھی۔ جب وہ عورتوں کے مکر سے آگاہ ہوئے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ یا تو شیطانی کام کے لیے تیار ہو جاؤ یا زندان کے لیے، اس وقت انہوں نے اپنی دعا میں کہا تھا: رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡهِ ۚ وَ اِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡهِنَّ وَ اَکُنۡ مِّنَ الۡجٰهِلِیۡنَ''

یہاں جملہ ''اَصۡبُ اِلَیۡهِنَّ''، ''لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ'' کی جگہ ہے۔

صرف ایک چیز ہے جو اس نظریہ کو سمجھنے میں مانع ہوتی ہے، وہ یہ کہ کس طرح حضرت یوسفؑ کے بادشاہ کو پیغام کا یہ حصہ پہلے حصہ سے الگ ہوا اور کیسے عورتوں کی بات بادشاہ کے ذریعہ درمیان میں آتی ہے۔

ممکن ہے اس کی علت یہ رہی ہو کہ قرآن نے اس کلام کے نقل کرنے میں اس محاکمہ کو درمیان میں قرار دیا تا کہ اس کی سچائی ثابت نہ ہو، کیونکہ اس طرح حضرت یوسفؑ کا پیغام برہان و دلیل کے ساتھ نہیں ہوگا۔ لیکن جب عزیز مصر کی زوجہ اور دوسری عورتوں نے کہا کہ وہ تو پاکیزہ جوان ہے اور ہم لوگ اس کو گمراہ کر رہی تھیں، حضرت یوسفؑ کے لیے مناسب تھا کہ کہیں: ''ذٰلِكَ لِیَعۡلَمَ اَنِّیۡ لَمۡ اَخُنۡهُ''

۲)۔ ان دو آیتوں میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ دونوں زلیخا کی بات کا حصہ ہیں۔ وہ حضرت یوسفؑ کی پاکدامنی کی گواہی دینے کے بعد کہتی ہے کہ اس کی پاکدامنی پر میری دلیل یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی خیانت نہیں کی۔

اس نظریہ کی تائید میں تین دلیلیں قائم ہوتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱)۔ آیت کے شروع میں لفظ ''ذٰلِكَ'' آیا ہے اور یہ اسم اشارہ ہے جو عزیز مصر کی بیوی کے علاوہ کسی طرف نہیں پلٹتا۔

جواب: یہ صحیح ہے کہ آیت کا سیاق اسی بات کا سبب بنتا ہے کہ اس کا مرجع عزیز مصر کی بیوی کا کلام ہو اور وہ یہ چاہتی ہو کہ اپنی حرکت کا سبب بیان کرے: انا رَاوَدۡتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ کیونکہ ''ذٰلِكَ لِیَعۡلَمَ اَنِّیۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَیۡبِ'' لیکن مضمون کی بلندی دیکھتے ہوئے اس سیاق کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت حضرت یوسفؑ کی امتناع آزادی کی علت بیان کر رہی ہو، ایسا امتناع جو جملہ ''اِرۡجِعۡ اِلٰی رَبِّكَ فَسۡـَٔلۡهُ'' سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کا مفاد یہ ہے کہ جاؤ اور پہلے جھوٹی عورتوں کے حالات معلوم کرو تا کہ میری طہارت و پاکیزگی ثابت ہو۔ میرا اصرار صرف اس وجہ سے ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں نے کسی عورت کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ اس کے بعد مجھے آزاد کرو۔

۳)۔ اگر یہ دونوں آیتیں حضرت یوسفؑ سے متعلق ہوں تو اول و بعد کے درمیان تناقض وجود آئے گا۔ پہلی آیت میں فرماتے ہیں: ''میں نے عزیز مصر کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی''۔ جب کہ دوسری طرف کہتے ہیں: ''میں اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں کرتا، کیونکہ نفس امارہ برائی ہی کی طرف رہنمائی کرتا ہے''۔

اس سوال کا جواب واضح ہے، وہ پہلی آیت میں اپنی طرف سے ہر طرح کی خیانت کی نفی کرتے ہیں لیکن دوسری آیت میں اسے لطف خدا سے متعلق جانتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''میں خود یوسفؑ ہی نہیں جو فریب میں گرفتار نہیں ہوا، اگر اس طرح ہوتا تو حضرت یوسفؑ نفس امارہ میں گرفتار ہو گئے ہوتے، یہ تو صرف اللہ کی ذات تھی جس نے لطف کیا اور مجھے نجات دی''۔ درحقیقت دوسری آیت میں اپنی خودداری کا سبب

واضح کیا اور اس طرح سے بات کرنا انبیاء و اولیاء ہی کا شیوہ ہے جو کہتے ہیں: قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (یونس۔49)

اس سے بڑھ کر تناقص اس صورت میں ہے جب کہتے ہیں: ''میں نے خیانت کی ہے جب کہ دوسری آیت میں ذرہ برابر بھی خیانت کی طرف اشارہ نہیں، خاص طور سے آخر میں آیت ان افراد کو مستثنٰی کرتی ہے جن کے شامل حال رحمتِ خدا ہوتی ہے اور قرآن فرماتا ہے: ''الا ما رحم ربی''

۳)۔اگر حضرت یوسفؑ کا مقصد اس جملہ ''ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ'' سے یہ ہے کہ عزیز جان لے، تو عزیز جانتا ہی تھا کہ اس کی زوجہ گنہگار ہے نہ کہ یوسفؑ، کیونکہ اس نے ان سے کہا تھا: اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۣوَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ، اگر مقصود یہی ہے کہ بادشاہ سے کوئی خیانت نہیں کی تو یہ مسئلہ بادشاہ سے کسی طرح متعلق نہیں تھا۔

جواب: ظاہری آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عزیز جان لے کہ حضرت یوسفؑ نے اس کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی لیکن مقصد واقعی یہ ہے کہ بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشین اس بات سے مطلع ہو جائیں کہ میں مرد خائن نہیں ہوں۔ یہ اصرار اس وجہ سے تھا کہ ان کی پاکیزگی و طہارت خیانت سے ثابت نہیں ہوئی۔ وہ بادشاہ کے دل میں جگہ نہیں بنا سکے کہ عظیم مقام و منزلت کو حاصل کر سکتے۔

یہاں بادشاہ کے دل کے حالات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی واقعہ تشکیل نہ پاتا اور حضرت یوسفؑ فوراً بادشاہ کے پاس پہنچ جاتے تو وہ مملکت مصر کے دوسرے ذمہ دار شخص نہیں ہو سکتے تھے۔

صدارت کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کا انتخاب

موضوع سے متعلق آیات

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ (یوسف۔ ۵۴ تا ۵۷)

آیات کا ترجمہ:

۵۴)۔بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسفؑ کو میرے پاس لاؤ تا کہ اسے مشاورت کے لیے مخصوص کروں۔پھر جب اس نے یوسفؑ سے باتیں کیں (جن سے حضرت یوسفؑ کی قابلیت اعلیٰ ثابت ہوئی) تو اس نے کہا کہ تم آج سے ہمارے نزدیک بلند مقام اور ہمارے امین ہو۔

۵۵)۔یوسفؑ نے کہا: مجھے ملکی خزانہ پر مقرر کیجئے کیونکہ میں امانتدار ہوں اور دانا بھی۔

۵۶)۔ہم نے اس طرح یوسفؑ کو زمین پر با اختیار کیا کہ جہاں چاہیں رہیں۔ہم جس پر چاہتے ہیں اپنا فضل کرتے ہیں اور نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

۵۷)۔ایماندار اور پرہیزگار لوگوں کے لیے آخرت میں دنیوی اقتدار سے بہتر اجر ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یوسفؑ کا پیغام بادشاہ کے غلام کے ذریعہ اس تک پہنچا اور وہ یوسفؑ کے وقار و عظمت اور ان کی عقل کو دیکھ کر متعجب ہوا۔اس

پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ کتنا بے بہا خزانہ زندان میں پڑا ہوا ہے جو عالم بھی ہے، دانا بھی ہے، منتظم بھی ہے اور مدبر بھی۔ نیز متقی و پرہیز گار بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کامل منتظم کی تمام شرطیں اس میں جمع ہیں۔ دربار کی خواتین نے ان کی طہارت نفس کی گواہی دی، خواب کی صحیح تعبیر اس کے علم و دانائی کی دلیل ہے۔ ملک پر سخت مصیبت کے وقت جو لائحہ عمل اس نے تجویز کیا ہے وہ اس کے اعلیٰ منتظم ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اگر بادشاہ پہلے مرحلے میں اس کی آزادی چاہتا تھا تو آپ کی آزادی کی خود بادشاہ کو ضرورت تھی تا کہ اسے وزیر مشاورت قرار دے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ حالانکہ پہلے پیغام میں اس نے کہا تھا ''ائتونی بہ'' ان دونوں جملوں میں فرق واضح ہے۔ پہلے جملہ میں ان کا علم اس بات کا سبب بن رہا تھا کہ بادشاہ ان سے ملے اور انہیں آزاد کرے، لیکن اس میں ان کی امانت داری ثابت نہیں ہوتی تھی کہ انہیں منتظمین کی صف میں شامل کیا جاتا۔ اس مرتبہ جب ان کی طہارت و پاکیزگی ثابت ہوئی تو ان کی شائستگی کے پیش نظر لازم ہو گیا کہ انہیں آزاد کر کے منتظمین مملکت میں شامل کیا جائے۔

حضرت یوسفؑ بادشاہ کے دربار میں آئے اور بڑے احترام کے ساتھ ان کو پیش کیا گیا۔ یقینی طور سے اس نشست میں کچھ باتیں ایسی ہوئی جن میں اس کی توجہ خاص یوسفؑ کی طرف ہی تھی یہ کیا گفتگو تھی، قرآن اس کا ذکر نہیں فرماتا بلکہ صرف یہ بتلاتا ہے کہ جب ان دونوں کی گفتگو ختم ہوئی تو بادشاہ نے ان سے کہا: ''تم کو اس ملک میں مقام و منزلت حاصل ہو گی اور ہمارے امین بھی ہو گے: فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ۔ ''مَكِيْنٌ'' کے معنی مقام رکھنا کے ہیں۔ لازمی طور پر اس کا مطلب یہی ہے کہ صدارت و وزارت کا عہدہ اور کم سے کم مشیر خاص کا عہدہ تو ضرور حاصل ہو گا۔

یہاں حضرت یوسفؑ نے جو ابتداء میں توقع رکھی تھی اس سے بڑے مقام کی درخواست کی اور کہا: ''مجھے زراعت مصر کی وزارت دی جائے کیونکہ اس وزارت میں دو اہم باتوں کی ضرورت ہے یعنی امانت اور علم جب کہ میرے پاس دونوں ہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ

یہاں میں چند نکات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جن کی تفصیل یہ ہے:

ا)۔ انبیاء جو دنیا کے نہایت ہی سادہ ترین انسان ہوتے ہیں، کس طرح ایک اہم مقام یعنی وزارتِ زراعت کی خواہش کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام و منزلت کی خواہش ہوا و ہوس یا غلبہ کے حصول کی خاطر نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ آئندہ کی تاریکی ان کو ڈرا رہی ہے۔ اس لیے اس بڑے ملک کے افراد کی نجات کے لیے نہایت دانا و امین شخص کی ضرورت ہے جو خود ان کی غرض سے اس مقام و منزلت کی درخواست کی تھی تا کہ وہ پہلے سات سال میں زراعت کے ذریعہ جتنا زیادہ غلہ پیدا ہوا سے گوداموں میں جمع کر دیں۔ پھر اپنا ایک منظم لائحہ عمل تشکیل دے کر خاص مقدار میں لوگوں کے لیے تقسیم کریں تا کہ دوسرے سات سالوں میں بچے ہوئے غلہ کو اس طرح تقسیم کریں کہ آئندہ بیج کے لیے بھی غلہ محفوظ ہو جائے۔

اس طرح کا طریق کار اور اس پر صحیح عمل، ایک ایسا فرض تھا جو صرف حضرت یوسفؑ ہی انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس بات کو اچھی طرح نبھایا اور صرف چودہ سال کے عرصہ میں منتظم و مدبر کے طور پر وہ ہی ان فرائض کو صحیح طریقے سے انجام دے سکتے تھے۔

۲)۔کسی ظالم بادشاہ سے عہدہ قبول کرنا انبیاء واولیاء کے لیے مناسب نہیں سوائے اس کے کہ یہ عمل اشد ضروری ہو۔
اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضرورت خود انہیں سے متعلق تھی۔لہٰذا انہوں نے اس عہدہ کو قبول کیا اور خود ہی اس کا تعین کیا۔یہاں ہم ایک حدیث امام رضا علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں جو حضرت یوسفؑ کے قبولیت منصب اور امام رضا علیہ السلام کے ولیعہدی کو قبول کرنے کی علت بیان کرتی ہے۔
اپنے زمانہ میں حکومت کو قبول کرنے کے بعد امام رضا علیہ السلام پر جاہلوں کے اعتراض کی بھرمار ہوگئی۔امامؑ مختلف بیانات سے ان لوگوں کو مطمئن کرتے تھے جن میں سے ایک بیان یہ تھا کہ کیا پیغمبر برتر ہوتا ہے یا اس کا وصی؟ جواب میں لوگوں نے کہا: ''پیغمبر، آپ نے پوچھا: مسلم برتر ہے یا مشرک؟'' لوگوں نے کہا: ''مسلم'' آپ نے پوچھا: ''عزیز مصر مشرک تھا اور حضرت یوسفؑ پیغمبر تھے۔انہوں نے اس کے عہدہ کو قبول کیا جب کہ وہ مجبور نہ تھے حالانکہ میں نے ولیعہدی کو ایک ظاہری مسلمان سے قبول کیا ہے جب کہ میں اس منصب کو قبول کرنے کے لیے مجبور تھا۔[۱]
۳)۔خودستائی اسلامی روایات میں مذموم ہوتی ہے۔جب انسان برتری پانے کا ہدف رکھتا ہو، یعنی علمی اصطلاح میں خود اس کی طرف بھاگے تاکہ دوسروں کی تحقیر کا ذریعہ واضح ہو اور اپنے ذریعہ جذبات سے اس کی طرف مائل ہو۔لیکن جب کبھی معاشرہ کی خدمت مقصود ہو تو وہاں اپنا تعارف کروانا چاہیے۔یہاں خاموش رہنا جرم ہوتا ہے۔
حضرت یوسفؑ نے متعدد منصوبوں میں سے وزارت زراعت کو قبول کیا۔صرف اس وجہ سے کہ قوم کو نجات دلا سکیں۔یہ صرف بادشاہ کی موافقت سے ہی ممکن تھا جس کے لیے انہیں اپنا تعارف کرنا ضروری تھا۔اسی وجہ سے انہوں نے اپنا تعارف ''حفیظ'' یعنی ملک کے محافظ اور ''امین'' کہہ کر بطور واقف امور اپنا تعارف کروایا۔
امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بعض چیزوں میں اپنا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ان علی منھا ...... علی القطب من الرحی ینحر وعن السیل ولا یرقی الی الطیر'' اس تعارف کی بھی یہی وجہ ہے۔[۲]
امام جعفر صادق علیہ السلام اس سوال کا اس طرح جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''یوسفؑ اپنی تعریف کے لیے مجبور تھے اور جب یہ بندہ صالح اپنا تعارف کرانے پر مجبور ہوگئے تو فرمایا: ''وانا لکم ناصح امین''[۳]
۴)۔آخر حضرت یوسفؑ اقتصادی حالات کو ایک مؤثر عامل کے طور پر دیکھ رہے تھے۔لہٰذا تمام منصوبوں کو چھوڑ کر اسی منصب کی اہمیت کی خاطر اس کی خواہش کی۔

---

[۱] وسائل الشیعہ ج ۱۲ ص ۱۴۶
[۲] نہج البلاغہ، خطبہ سوم
[۳] نور الثقلین، ج ۲ ص ۴۲۳

۵)۔حضرت یوسفؑ اس مقام ومنزلت تک صرف اپنے تقویٰ و پرہیزگاری کی وجہ سے پہنچے۔اگر پہلے دن ہی ان کا دامن آلودہ ہو جاتا تو ان کی جگہ منصب پر کوئی اور ہوتا۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ یعنی اب جہاں چاہتے حضرت یوسفؑ قیام فرماتے کیونکہ تمام ملک ان کے اختیار میں تھا۔صرف حضرت یوسفؑ ہی نہیں جو تقویٰ کی وجہ سے اس منزل تک پہنچے بلکہ تمام نیک بندے آخرت کے سوا دینا میں تقویٰ کی وجہ سے اپنا ایک خاص مقام حاصل کرتے ہیں، کیونکہ خداوند عالم نیک بندوں کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا، جیسا کہ فرماتا ہے:نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ

لیکن دنیا کی حکومت آخرت کی جزا کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں کیونکہ ارشاد ہوتا ہے:وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔

یہاں حضرت یوسفؑ کی زندگی کا تیسرا حصہ ختم ہوا اور اب بعض آیات جو ان کی زندگی کے اس کے بعد کے حصے کو بیان کرتی ہیں، نقل کرتے ہیں:

زندگانی یوسف علیہ السلام کا چوتھا حصہ

دورِ حکمرانی اور جدائیوں کا اختتام

زندگی کے اس حصہ میں حضرت یوسفؑ حکومت کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے کر خشک سالی سے مقابلہ کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے ہیں۔فراوانی کے سالوں میں حاصل کردہ نعمات کو جمع کر کے ذخیرہ کر لیتے ہیں اور پھر خشک سالی کے دور میں انہیں لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

سرزمین کنعان اگرچہ فراعنہ کی سرزمین سے الگ تھی لیکن خشک سالی سے نہیں بچ پائی تھی۔حضرت یعقوبؑ کے بیٹے غذائی اشیاء کے کم ہوجانے کی وجہ سے مجبور ہوئے کہ مصر جائیں اور وہاں سے خاندان یعقوبؑ کے لیے گندم مہیا کر کے لائیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی بھائیوں سے ملاقات

موضوع سے متعلق آیات

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾
وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ
اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾
فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾
قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾
وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا
انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾
فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا
نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ (یوسف۔۵۸ تا ۶۸)

آیات کا ترجمہ:

(۵۸)۔حضرت یوسفؑ کے بھائی ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا۔لیکن وہ (حضرت یوسفؑ) کو نہ پہچان سکے۔

۵۹)۔جب حضرت یوسفؑ نے ان کے لیے غلہ مہیا کر دیا تو ان سے کہا کہ آئندہ اپنے دوسرے بھائی کو بھی ساتھ لانا،جس کو اپنے والد کے پاس چھوڑ کر آئے ہو،کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں پورا ماپ دیتا ہوں اور تمہارے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آتا ہوں؟

۶۰)۔اگر تم اس کو ساتھ نہیں لاؤ گے تو تمہارے لیے نہ میرے پاس کوئی غلہ نہ ہوگا۔نہ ہی تم میرے پاس آنا۔

۶۱)۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم اس کے والد سے اس کے بارے میں جاتے ہی درخواست کریں گے اور ایسا ہی کریں گے۔

۶۲)۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ جو قیمت یہ گندم کی ادا کریں اسے ان کے سامان ہی میں رکھ دیں تا کہ جب یہ لوگ گھر لوٹ کر جائیں تو اپنی پونجی کو پہچان لیں (کہ یہ وہی پونجی ہے جو انہوں نے بطور قیمت غلہ ادا کی تھی) اور اس طرح پھر پلٹ کر آئیں۔

۶۳)۔ غرض جب یہ لوگ اپنے والد کے پاس واپس آئے تو عرض کی: ''بابا! ہمیں آئندہ غلہ کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ لہٰذا آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھی بھیج دیں تا کہ اس طرح شاید غلہ پھر مل جائے اور ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

۶۴)۔ حضرت یعقوبؑ نے کہا: ''میں اس کے بارے میں تمہارا اعتبار کیسے کروں، یہ ویسا ہی جیسا کہ اس کے پہلے اس کے بھائی یوسفؑ کے بارے میں مجھے اطمینان نہ تھا۔ خدا اس کا بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہی سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

۶۵)۔ جب ان لوگوں نے اپنا اسباب کھولا تو اپنی رقم کو پایا کہ بعینہٖ واپس کر دی گئی ہے، پس اپنے والد بزرگوار سے کہنے لگے: بابا جان! آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ دیکھئے یہ ہماری پونجی تک تو ہمیں واپس کر دی گئی ہے۔ لہٰذا ہم آئندہ سفر میں اپنے اہل وعیال کے واسطے غلہ لے آئیں اور اپنے بھائی کی پوری حفاظت کریں گے۔

۶۶)۔ حضرت یعقوبؑ نے کہا: جب تک تم لوگ میرے سامنے خدا سے عہد نہیں کر لو گے کہ تم اس کو ضرور صحیح وسالم میرے پاس لے آؤ گے میں اس کو تمہارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا سوائے اس کے کہ حالات تمہارے بس سے باہر ہو جائیں (اور تم اس کی واپسی کی سکت نہ رکھو)''۔ جب ان لوگوں نے حضرت یعقوبؑ کے سامنے عہد کر لیا تو انہوں نے کہا: ہم جو کہہ رہے ہیں خدا اس کا ضامن ہے۔

۶۷)۔ حضرت یعقوبؑ نے کہا: ''اے بیٹو! سب کے سب ایک ہی دروازہ سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اس (بلا) کو جو خدا کی طرف سے ٹال نہیں سکتا۔ حکم تو خدا ہی کی طرف سے ہے۔ میں نے اس پر بھروسہ کیا، اور سب بھروسہ کرنے والے اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔

۶۸)۔ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق مصر میں داخل ہوئے تو ان کے والد کی ہدایات ان کے کام نہ آئیں (اللہ نے ایسا مقدور ہی نہ کیا تھا) سوائے اس کے جو بات یعقوبؑ کے دل میں تھی وہ پوری ہوئی اور وہ اس علم وعقل کا ملک تھا جو ہم نے اسے سکھلائی تھی۔ جب کہ زیادہ تر لوگ یہ نہیں جانتے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

دوسرے سات سال میں خشک سالی صرف مصر تک محدود نہ تھی بلکہ مصر کے اطراف یعنی فلسطین و کنعان میں بھی اس کا اثر تھا، فرق صرف یہ تھا کہ مصر کا منتظم عقلمند تھا جس نے آنے والے سات سالوں کی خشک سالی کے لیے غلہ کو جمع کر رکھا تھا تا کہ اس کو ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ لیکن یہ طریق کار دوسرے ملکوں میں نہ تھا۔ لہٰذا خشک سالی کے دوسرے سات سالوں میں کوئی غلطہ پیدا نہ ہوا اور مصر کے اطراف کے لوگ مصر کی طرف بھاگے کہ وہاں سے وہ غلہ خرید کر کنعان لے آئیں۔

حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر میں داخل ہوئے، ان بھائیوں کے پہنچنے کی کوئی وجہ واضح نہیں ہے۔ مفسرین نے اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا ہے۔[1] ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مصر میں داخل ہونے والوں کی فہرست حضرت یوسفؑ کو دی جاتی تھی جس میں حضرت یوسفؑ نے ان لوگوں کے نام دیکھ کر حکم دیا کہ ان کو میرے سامنے حاضر کیا جائے۔ وہ لوگ حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش ہوئے۔ حضرت یوسفؑ نے تو ان لوگوں کو پہچان لیا، لیکن وہ لوگ حضرت یوسفؑ کو نہ پہچان سکے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ**

وہ لوگ حضرت یوسفؑ کو کیسے پہچانتے کیونکہ حضرت یوسفؑ جب ان لوگوں سے جدا ہوئے تھے تو سات یا نو سال کے تھے۔ پھر دس سال عزیز مصر کے گھر میں رہے، پھر اتہام لگنے کی وجہ سے سات سال تک زندان میں قید رہے۔ اس کے بعد زندان سے آزاد ہو کر مصر کے زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر جب ان کے بھائی ان کے پاس آئے تو شاید خشک سالی کا نصف حصہ گذر بھی چکا تھا۔ اس حساب سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت تقریباً ۳۲ سال تھی۔ علاوہ ازیں حضرت یوسفؑ کے پہچانے نہ جانے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے ان کے قرائن سے ان کو پہچان لیا اور حکم دیا کہ دوسروں کی طرح ہی ان لوگوں کے ساتھ سلوک کیا جائے اور ان کی ضرورت کو پورا کیا جائے۔

کفایت شعاری کے پیش نظر یہ قانون بنایا گیا تھا کہ کسی شخص کو ایک اونٹ کے بارے سے زیادہ غلہ فروخت نہ کیا جائے۔ اس لیے ان بھائیوں کو دس اونٹ بھر غلہ دیا گیا اور بیچنے والوں سے رقم وصول کی، لیکن حضرت یوسفؑ نے رازداری سے حکم دیا کہ ان کی رقم کو ان کے غلہ میں ہی رکھ دیا جائے۔

---

[1] مجمع البیان۔، ج ۲ ص ۲۴۵

قرآن یہاں اس بات کی یاد دہانی کرتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ان دس بھائیوں سے پوچھا کہ تمہارے باپ کی طرف سے کوئی اور بھائی بھی ہے؟ کیا بھائیوں نے نہ پوچھا کہ تم نے ایک مصری فرد ہوتے ہوئے کیسے سمجھا کہ ہم ایک اور سوتیلا بھائی رکھتے ہیں؟ یہاں بہت سے اقوال فرض کئے گئے ہیں اور تفاسیر میں بہت سی باتیں نقل ہوئی ہیں۔لیکن ممکن ہے کہ بھائیوں نے غلہ کی زیادہ مانگ کی ہو کہ ہم صرف دس آدمی نہیں۔ ہمارے علاوہ کنعان میں دو افراد اور ہیں، ایک ہمارا بوڑھا باپ جو سفر نہیں کر سکتا اور ایک چھوٹا بھائی جسے ہم اس کی خدمت کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم ان دونوں کا حصہ بھی ہمیں دے دو؟

اسی طرح کی باتوں نے حضرت یوسفؑ کو موقع دیا کہ دوسرے بھائی کے بارے میں خاص طور پر معلوم کریں۔اور کہیں کہ دوسری مرتبہ اس کو بھی ساتھ لے کر آئیں، ہم ایک اونٹ غلہ اس کے لیے بھی دے دیتے ہیں۔ بہر حال چاہے یہ مفروضہ درست تھا یا غلط، حضرت یوسفؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ اس مرتبہ اپنے بھائیوں کو بھی لے آنا، کیونکہ تم دیکھ رہے ہو کہ میں پورا حق دے رہا ہوں اور تمہیں با عزت سمجھتا ہوں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ [1] بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ

غلہ کو بار کرتے وقت یہ پیغام ان کو دیا گیا اور اس لیے یہ کام عمل میں آئے تین چیزوں کی تاکید کی اور ایک اور کام بھی انجام دیا:

ا۔ ''أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ ''(پورا وزن دیتا ہوں) کم نہیں دیتا۔

۲۔ ''وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ '' (اچھا میزبان ہوں)

۳۔ ''فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ '' اگر اس کو نہیں لاؤ گے تو تمہیں نہ غلہ ملے گا اور نہ تم ہمارے قریب آپاؤ گے، تصریح کے طور پر قرآن نے خود فرمایا: [2]

اگر اس کو لاؤ گے تو ایک اونٹ کا غلہ اور زیادہ دیں گے۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کو پہچانے بغیر وعدہ کر لیا کہ اس بھائی کو اپنے باپ سے مانگیں گے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ ۔نراود کا مطلب یہاں پر بار بار بہانہ اور پیار سے مانگنے کے ہیں۔یعنی ہر قیمت پر ہم یہ کام انجام دیں گے۔

۴)۔حضرت یوسفؑ نے یہ کام بھی کیا کہ بیچنے والوں کو حکم دیا کہ کنعانی جو رقم غلہ حاصل کرنے کے لیے لائے تھے اسے ان کے غلہ ہی میں ڈال دو تا کہ کنعان واپس آنے پر وہ لوگ اپنی رقم کو پہچان لیں اور جان لیں کہ یہ تو وہی رقم ہے جو ہم نے غلہ کے لیے ادا کی تھی۔اس طرح مصر کے حوصلہ کو یاد رکھ کر اپنے بھائی کو لے کر دوبارہ مصر آئیں گے، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

---

[1] عربی لغت میں جہاز کے معنی سامان وملکیت کے ہیں، جیسا کہ ''جہز ء'' کے معنی اونٹ پر لادنے کے ہیں۔

[2] 'ونزداد کیل بعیر'' آیت ۶۵

'فتیان' ''لفظ'فتی' ' کی جمع ہے جس کے معنی 'جوان' ہیں۔لیکن ایسے جوان جو مصریوں کا کام کرتے تھے۔انہیں اظہار محبت کے طور پر''فتی'' کہا جاتا تھا۔'بضاعت'' کے معنی تجارتی سامان کے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی گندم کی خریداری کے لیے تجارتی سامان لائے تھےلیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے غلہ کے عوض رقم دی تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ رقم ان کے بار میں واپس رکھ دی گئی تھی جن کی واپسی کی وجہ یہ تھی کہ شاید مزید غلہ کے لیے رقم حضرت یعقوبؑ اور برادران یوسفؑ کے پاس نہ ہو نیز اس میں بھائیوں کی محبت کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ وہ نہ آنے والے بھائی کو ساتھ لے آئیں، اور رقم کا نہ ہونا کنعان میں ان کے توقف کا باعث نہ بنے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بیت المال میں اس طرح کا تصرف کیوں کیا، کیونکہ گندم مصریوں کے لیے تھی پھر کس طرح بغیر حساب اپنے بھائیوں کو واپس بخش دی؟

جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اس ملک کی بہتری کے لیے جان فشانی کی تھی۔لہٰذا وہ اس کے عوض اپنے خاندان کے لیے اتنا حق تصرف رکھتے تھے،یعنی کم از کم ان کی حیثیت ہی کو استوار کریں خواہ ان کے لواحقین مصر میں ہوتے یا اس سے باہر کسی جگہ ہوتے۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ مصر میں ایک قانون یہ بھی ہو کہ غرباء و مستضعف لوگوں سے کچھ نہ لیا جائے۔اس صورت میں حضرت یوسفؑ کے لیے مصر کی جغرافیائی سرحد محدود نہ تھی بلکہ وہ دنیا کے تمام مستضعفین کے لیے یہ حکم دے سکتے تھے۔

قافلہ کا کنعان میں ورود

حضرت یوسفؑ کے بھائی کنعان میں داخل ہوئے تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔کیونکہ دس اونٹ وزن گندم لے کر آئے تھے جس سے مدت تک بھوک سے محفوظ رہ سکتے تھے۔وہ حضرت یعقوبؑ کے پاس آئے اور سفر کا قصہ سنانے لگے،ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ عزیز مصر نے ایک شُتر کا بار غلہ کا زیادہ دینے کا وعدہ کیا ہے، بشرطیکہ وہ اس کے لیے اپنے بھائی (بنیامین) کو ساتھ لائیں جس کے بغیر وہ غلہ نہیں دے گا۔لہٰذا بابا جان! آپ ہماری یہ بات مان لیں اور اس کو ہمارے ساتھ بھیج دیں ہم اس کے محافظ ہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔اس موقع پر بھی حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے بنیامین کو ساتھ لے جانے کے لیے وہی جملہ استعمال کیا جو یوسفؑ کو لے جاتے وقت کہا تھا۔ان لوگوں نے اس وقت کہا تھا:اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، یہاں کہا:فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔حضرت یوسفؑ کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ اسے ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ تفریح کرے اور کھیلے کودے، ہم اس کے محافظ ہیں۔یہاں کہا:اسے بھیج دیں تاکہ غلہ لے آئیں اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

جملہ'منع منا الکیل'' بمعنی'منع منا المکیل'' ہے اور''کیل'' یہاں 'مکیل'' کے معنی میں ہے جس سے مراد غلہ ہے۔اس طرح اس زمانہ کے ترازو کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت مصر میں غلہ کے لیے وزن پیمانہ کا رواج تھا۔

حضرت یوسفؑ کو جنگل لے جاتے وقت ان کے پدر بزرگوار نے کہا تھا کہ اس کو لے جانا میرے لیے باعث غم و اندوہ ہوگا۔لیکن اس

موقع پر سخت تربات کی یعنی : کہا میں اس کے بارے میں بھی اسی طرح اطمینان کرلوں جس طرح اس کے بھائی کے بارے میں اطمینان کیا تھا؟ ''یعنی تم لوگ قابل اعتماد نہیں ہو، کیونکہ اس وقت بھی تم لوگوں نے ''انا لہ لحفظون'' کا جملہ کہا تھا،لیکن جب شام کو لوٹے تو یوسفؑ کا رنگین پیراہن لے کر آئے تھے۔لہٰذا میں کیسے اس کو تم لوگوں کے حوالہ کروں جب کہ یوسفؑ کے بعد میرا مونس صرف بنیامین ہی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔لیکن حضرت یعقوبؑ نے اشارۃ ان لوگوں کو بتا دیا کہ یوسفؑ ابھی زندہ ہے کیونکہ فرمایا: تم کسی طرح بھی محافظ نہیں ہو سکتے کیونکہ حافظ تو خدا ہے، جہاں فرماتے ہیں فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کی بات باپ کے سامنے آدھی رہ گئی اور وہ لوگ اپنے والد محترم کو اطمینان نہ دلا سکے۔لیکن جب انہوں نے اپنے لائے ہوئے غلے کو کھولا تو دیکھا کہ غلہ کی قیمت جو انہوں نے ادا کی تھی اس کے اندر موجود ہے،انہوں نے اسے بادشاہ مصر کی خوش اخلاقی اور جوانمردی تصور کیا اور رقم لے کر اپنے باپ کے پاس پہنچے اور کہا: ہمیں اور کیا چاہیے کہ یہ وہ رقم ہے جسے ہم نے گیہوں کی قیمت کے طور پر عزیز مصر کے کارندوں کو دیا تھا۔انہوں نے بغیر ہماری اطلاع کے اسے ہمارے بار میں ڈال کر دیا ہے،اس رقم سے ہم اپنے خاندان کے لیے مزید غلہ خرید سکیں گے۔

لہٰذا بابا جان! بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں،ہم اس کی حفاظت کریں گے اور غلہ کا اونٹ ایک اور زیادہ لائیں گے درآنحالیکہ اس بارے میں ہم نے جو کچھ پوچھا تھا وہ ہماری بساط سے کم تھا،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی باتوں نے ایسی زمین ہموار کی کہ بنیامین ان کے ساتھ سفر کرے۔پس ان کے والد اس کو بھیجنے کو تیار ہو گئے لیکن فرمایا: ''تم لوگ خدا کی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ اسے واپس لے کر آؤ گے سوائے اس کے کہ تم محصور ہو جاؤ اور تمہاری طاقت سلب ہو جائے'' بھائیوں نے یہ وعدہ دے دیا اس طرح یوسفؑ کے بھائی کو ان لوگوں کے ساتھ بھیجنے کے لیے ان کے والد تیار ہو گئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ

اس آیت میں تین باتیں قابل توجہ ہیں:

الف)۔یوسفؑ کے بھائی کو بھیجنے میں اس وقت ان کے والد محترم رضامند ہوئے جب ان لوگوں نے پیمان الٰہی باندھا، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خائن افراد کی قسم کا کیا اعتبار، کیا ایسا نہیں کہا گیا: ''من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ''یعنی ''جو شخص آزمائے ہوئے کو آزمائے، وہ پشیمان ہوتا ہے''۔اسی سے وعدہ کرنے والے کی اہمیت ثابت ہوتی ہے جو اپنے وعدہ کا پکا ہو، جب کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں میں یہ چیز نہیں پائی جاتی تھی۔یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے پہلے بھی کہا تھا ''انا لہ لحفظون'' لیکن یوسفؑ کو ان لوگوں نے کنوئیں میں پھینک دیا۔تمام سورۃ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سب کے سب ان دونوں بھائیوں سے جلتے تھے۔لہٰذا بعید نہ تھا کہ بنیامین کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں جو یوسفؑ کے ساتھ کیا تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۚ۔اس سوال کا جواب ظاہر ہے، وہ یہ کہ بات واضح ہے وہ یہ کہ پہلے والی بات اب ان میں موجود نہ تھی۔اولاً یہ کہ یہ لوگ

اپنی جوانی کا دور ختم کر چکے تھے اور ان کا پیری کا دور شروع ہو چکا تھا۔ان کی عقل وخرد کامل ہو چکی تھی۔ثانیاً یہ کہ یہ لوگ تجربہ کر چکے تھے کہ یوسفؑ کو گم کرنے کے بعد بھی باپ کی محبت کا رخ اپنی طرف نہیں موڑ سکے تھے بلکہ ان کی محبت کا مرکز یوسفؑ کے بھائی بنیامین ہو گئے تھے۔اس طرح اپنے فعل سے انہوں نے گھر کی خوشحال زندگی کو ختم کر کے عزاخانہ بنا دیا تھا۔

ثالثاً۔اس وقت کی خشک سالی کی حالت ہر بات پر مجبور کر رہی تھی۔اس وقت یہ بعید تھا کہ دس عاقل اشخاص اپنے وعدہ کو صرف اپنی ہوس کی خاطر توڑ ڈالیں۔اس وجہ سے جناب یعقوبؑ نے ان لوگوں کی بات پر اعتماد ہی نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان سے قسم بھی لے لی تا کہ وہ اس سے سرتابی نہ کریں جیسا کہ فرماتے ہیں: قَالَ لَنۡ اُرۡسِلَهٗ مَعَكُمۡ حَتّٰى تُؤۡتُوۡنِ مَوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاۡتُنَّنِىۡ بِهٖۤ

ب)۔دوسری طرف یہ چیز بھی ممکن ہو جاتی کہ کوئی مانع ایسا سامنے آ جائے جو برادران یوسفؑ کو واپس لانے میں بھائیوں کے اختیار سے باہر ہو، یقیناً اس طرح کا کوئی عہد و پیمان حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی طرف نہ ہوا۔اس وجہ سے حضرت یعقوبؑ نے اس صورت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا: قسم کھاؤ کہ اس کو واپس لے آؤ گے"اِلَّاۤ اَنۡ يُّحَاطَ بِكُمۡ ان لوگوں کا پیمان الٰہی یہاں ختم ہو گیا، لیکن حضرت یعقوبؑ نے ان کے اس پیمان پر اکتفاء نہ کی اور خدا کو محافظ و ناصر و مؤثر جانا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَلَمَّاۤ اٰتَوۡهُ مَوۡثِقَهُمۡ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ

یہاں پر توحید یعقوبؑ اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے، ایسی توحید جو ہر طرح کے اسباب طبیعی سے کاملاً ہم آہنگ ہے۔اولاً انہوں نے اسباب طبیعی کو پیش نظر رکھا، ان لوگوں سے قسم لی اور قطعی طور پر یہ اسباب طبیعی حضرت یعقوبؑ کے اطمینان کے لیے ناکافی نہ تھے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام اسباب طبیعی کو خدا کے حکم سے وابستہ جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب باتیں خدا کی اجازت سے ہیں اور وہی (خدا) ہے جو اسباب میں اثر پیدا کرتا ہے۔وہی ہے جو ہر چیز سے اثر کو چھین بھی لیتا ہے، وہی اسباب میں اثر بھی پیدا کرتا ہے، اور اس اثر کو ختم بھی کر دیتا ہے، اس طرح وہ جانتے تھے کہ ان کا پیمان الٰہی اسی وقت مؤثر ہو گا جب اللہ ان لوگوں کی پشت پناہی کرے گا۔حقیقت میں حقیقی مؤثر تو (اللہ) ہی ہے۔ اس وجہ سے فرماتے ہیں: اللہ ما نقول و کیل لہٰذا چاہیے کہ اپنے کاموں کو اس کے ہی حوالے کر دیں۔اس طرح کلمہ "وکیل" اس آیت میں موکول الیہ واقع ہوتا ہے۔

مصر کا دوسرا سفر

وقت گذرتا گیا۔دوسری مرتبہ پھر حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کو آزوقہ فراہم کرنے کی فکر ہوئی جس کے لیے مصر ہی ان کے لیے امید افزا مقام ہو سکتا تھا جہاں اس عزیز کی حکومت تھی، لہٰذا گیارہ کے گیارہ بھائی مل کر اپنے جمال و کمال سمیت جوان کے نصیب ہی میں تھا، مصر کی طرف روانہ ہوئے۔

بھائیوں نے اپنے والد بزرگوار کو خدا حافظ کہا اور شاید وقت وداع باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔خصوصاً اس وقت جب بنیامین کو الوداع کہا۔آخر میں ان لوگوں کو سمجھایا کہ سب گیارہ بھائی اپنے ظاہری جمال و کمال اور نور خاندان نبوت کے ساتھ ایک دروازہ سے نہ داخل ہوں

، بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں۔ اس زمانہ میں شہر مصر میں دیگر شہر کی مانند بہت سے دروازے تھے ۔ رات کو شہر کی حفاظت کے لیے بند کر دیئے جاتے تھے اور صبح کو خاص وقت پر کھول دیئے جاتے تھے۔

ممکن ہے کہ سوال کیا جائے کہ جناب یعقوبؑ نے اس طرح کا حکم کیوں دیا تھا؟ آیت سے اس سلسلہ میں کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ممکن ہے یہ اس وجہ سے کہا ہو کہ اگر ایک ہی دروازہ سے سب کے سب داخل ہوئے تو شاید کچھ لوگ ان سے سوءظن میں مبتلا ہو جائیں اور خیال کریں کہ یہ لوگ کہیں کسی غلط مقصد کے تحت شہر میں داخل ہوئے ہیں کہ واپسی تک اپنی بے گناہی کو ثابت کریں، زیادہ وقت لگ جائے اور ممکن ہے کہ جو قافلہ فلسطین پلٹ رہا ہو وہ نہ پہنچ سکے۔

یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اکٹھے داخلہ سے انہیں نظر بد نہ لگ جائے۔علم اصول بھی کسی حد تک اس بات کی تائید کرتا ہے اور روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے، بسا اوقات خودنمائی میں بعض لوگوں کی نظریں لگ جاتی ہیں جو تکلیف کا سبب بنتی ہے۔ یہ دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔لیکن اصلی سبب کیا تھا، اس کا قطعی طور سے فیصلہ نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ

یہاں تیسرا احتمال بھی ہے جسے عرفانی ذوق سے سمجھا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ حضرت یعقوبؑ کا عندیہ یہ تھا کہ مقصد تک پہنچنے کے لیے مختلف راستوں سے وارد ہوں تا کہ اگر ایک راستے سے نتیجہ تک نہ پہنچ پائیں تو دوسرا اور تیسرا راستہ اختیار کر لیں۔

آخر کار حضرت یعقوبؑ نے ان سب باتوں کے بعد اپنے بیٹوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو یاد دلایا اور فرمایا: میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے وہ صرف خطرہ سے بچنے کے لیے ہے۔لیکن اگر اللہ کی طرف سے جو کچھ مقدر ہو چکا ہے اسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔تقدیر الٰہی دو طرح کی ہوتی ہے: تقدیر قطعی، تقدیر معلق۔ میری یہ باتیں دوسری قسم کی تقدیر میں مؤثر ہوسکتی ہیں، پہلی میں ہرگز نہیں۔لہٰذا تمہیں چاہیے کہ میری باتوں کو یاد رکھو، لیکن اپنے تمام امور اللہ کے سپرد کر دو کیونکہ دنیا کی تقدیر اور جملہ امور اسی کے ہاتھ میں ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ گویا ایک آدمی کہتا ہے، کیوں، جواب دیتا ہے:اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

یادرہے کہ ''ان الحکم الا اللہ'' کا جملہ کلام یوسفؑ میں بھی آیا ہے (آیہ۔20) اور کلام یعقوبؑ میں بھی، لیکن بیٹوں کے کلام میں حکم سے مراد، حکم تشریعی ہے، یعنی قوانین وضوابط جب کہ باپ کے کلام میں اس کا مطلب حکم تکوینی ہے۔جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (اعراف۔54) یعنی ''خلقت جہان اور حکم اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہ عظیم اور عالمین کا رب ہے۔

بعد کی آیت حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کا مصر میں وارد ہونا بیان کر رہی ہے۔اس آیت میں چار جملے آئے ہیں جن کی توضیح کسی قدر ضروری ہے:

ا)۔بیٹے باپ کے حکم کے مطابق مصر کے پایہ تخت میں وارد ہوئے: ولما دخلو من حیث امر ھم ابوھم

۲)۔ باپ کی نصیحت واقع ہونے والی کیفیت میں مانع نہ ہوئی: ما کان یغني عنهم من الله من شئی
۳)۔ جو قطعی انجام حضرت یعقوبؑ دیکھنا چاہتے تھے اور دل میں رکھے ہوئے تھے اس کے ذریعہ پورا ہوگیا۔ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ
۴)۔ حضرت یعقوبؑ کو عطا شدہ علم و دانش کے بارے میں قرآن خود اپنی توصیف کرتے ہوئے زیادہ تر لوگوں کو جاہل جانتا ہے، اور فرماتا ہے: وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

صحیح بات یہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں محنت سے کام نہیں لیا۔

اب ہم ہر چار حصہ کی توضیح پیش کرتے ہیں۔ پہلی آیت کا مطلب واضح ہے، لیکن جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے اس کی توضیح پہلی آیت میں گذر چکی اور وہ یہ کہ حضرت یعقوبؑ کہتے ہیں کہ اسباب طبیعی کی پیروی کا مطلب یہ نہیں کہ تمام مقدرات کو آدمی ٹال سکتا ہے بلکہ یہ ہے کہ مقدرات معلق کو اسباب طبیعی کے ذریعہ ٹالا جا سکتا ہے لیکن جو چیز اللہ کی طرف سے مقدر ہو چکی ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا اور ہماری نصیحت بھی ان حوادث سے نہیں بچا سکتی۔

آیت کا تیسرا حصہ اسی آیت میں ہے جو ایک مطلب کو مستثنیٰ کر کے کہتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے دل میں جو کچھ تھا وہ اس طرح پورا ہو گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی کیا حاجت تھی جو اس طریقہ پر پوری ہوئی۔ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ ان باتوں سے حضرت یعقوبؑ کو تسکین حاصل ہوئی اور یقین ہو گیا کہ اگر وہ سب کے سب الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں گے تو خطرہ سے محفوظ رہیں گے۔ درحقیقت ان کی نصیحت کا اثر باطنی تھا نہ کہ ظاہری، لیکن یہ تفسیر بالکل صحیح نہیں۔ کیونکہ چوتھے حصے میں انہیں علم و دانش سے متصف کیا جا رہا ہے۔ اگر ان کی نصیحت ان کے علم و دانش کی وجہ سے تھی تو بغیر کسی شک وشبہ کے یہ اثر تکوینی تھا اور اس میں صرف روحانی اقدار پائی جاتی ہیں ورنہ یہ علت اپنے معلول سے مناسبت نہیں رکھتی۔ بہر حال اس طرح کی باتیں عظیم علم نبوت سے وجود میں آئی تھیں تا کہ حضرت یعقوبؑ کی حاجت کو پورا کریں۔ سوال یہی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی عظیم حاجت کیا تھی؟ یہ صرف فکر وصال یوسفؑ تھی، کیونکہ وہ لوگ اپنے باپ کی نصیحت کے مطابق مختلف دروازوں سے داخل ہوئے۔ لیکن اس سے کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔

آخر کار یہ لوگ چوری کے الزام میں پکڑے گئے اور عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ حضرت یعقوبؑ کے چھوٹے بیٹے نے چوری کی ہے۔ لہٰذا اسے کنعانی حکم کے مطابق غلام بنا لیا گیا۔ بڑے بھائی نے کیونکہ وعدہ کیا تھا کہ بنیامین کو سفر سے واپس لائیں گے، جب کہ یہ ایک اتفاق پیش آ گیا جس کی وجہ سے وہ وہیں رک گیا۔۔

صحیح ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی نصیحت اس تلخ حادثہ کو نہ روک سکی۔ لیکن یہ تلخ حادثہ حضرت یعقوبؑ کی قبولیت حاجت پر تمام ہوا۔ یہی تلخ درخت تھا، جس نے آخر کار میٹھا پھل دیا اور ہجر و فراق وصال میں بدل گیا۔

حضرت یوسفؑ کی عاقلانہ تدبیر

کنعان سے مصر تک کی مسافت بہت طویل ہے۔ یہ دور دراز بے آب وگیاہ صحراء کا سفر خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لیے خاندان یعقوبؑ کا چھوٹا سا قافلہ کسی بڑے قافلہ میں ملے بغیر اس مسافت کو طے نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ وہ کسی بڑے قافلہ کا جو فلسطین سے مصر کی طرف جا رہا ہو انتظار کریں اور اس قافلہ کے ساتھ جائیں۔ آخر کار وہ لوگ شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہوئے اور اس کے بعد بادشاہِ مصر سے ملاقات کی۔ جس کا نتیجہ ظاہری طور پر تلخ نکلا، قرآنی آیات واقعات کے اس حصہ کو اس طرح بیان فرماتی ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيٓ اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿٧٠﴾

قَالُوا وَاَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿٧١﴾

قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾

قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾

قَالُوا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٧٤﴾

قَالُوا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٥﴾

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٦﴾ (یوسف۔ ۶۹ تا ۷۶)

آیات کا ترجمہ:

۶۹)۔ جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ نے اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پہلو میں جگہ دی اور (چپکے سے) اس (بنیامین) سے کہہ دیا۔ کہ میں تمہارا بھائی (یوسفؑ) ہوں۔۔ لہٰذا جو (بدسلوکیاں) یہ لوگ تمہارے ساتھ کر رہے ہیں اس کا رنج نہ کرو۔

۷۰)۔ جب بادشاہ نے ان کا سازوسامان سفر (غلہ وغیرہ) درست کروایا تو ملازمین سے اپنے بھائی کے اسباب میں بادشاہ کا ایک قیمتی برتن رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے آواز دی کہ اے قافلہ والو! تم لوگ چور ہو۔

۷۱)۔ (یہ سن کر) وہ لوگ آواز دینے والے کی طرف پلٹے اور پوچھا کہ تمہاری کیا چیز گمی ہے؟

۷۲)۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کا ایک برتن گم ہو گیا ہے اور میں ضامن ہوں کہ جو شخص اس کو حاضر کرے گا اس کو ایک بار شتر غلہ انعام ملے گا۔

۷۳)۔ ان لوگوں نے کہا: خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ ہم (تمہارے) ملک میں فساد کرنے کی غرض سے نہیں آئے اور نہ ہی ہم لوگ چور ہیں۔

۷۴)۔ وہ ملازمین بولے کہ اگر تم جھوٹے نکلے (یعنی تمہارے سامان سے بادشاہ کا برتن برآمد ہو گیا) تو پھر اس کی کیا سزا ہوگی؟

۷۵)۔ انہوں نے کہا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان سے وہ برتن برآمد ہو وہ خود اس کے عوض غلام بنا لیا جائے گا۔ ہم لوگ اپنے یہاں چوروں کو یہی سزا دیتے ہیں۔

۷۶)۔ غرض ملازمین نے (حضرت یوسفؑ کے بھائی کا) بار کھولنے سے پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان سے تلاشی شروع کی۔ اس کے بعد (یوسفؑ کے) ماں جائے بھائی کے سامان سے برتن برآمد کر لیا۔ یوسفؑ کو بھائی کو روکنے کی ہم نے یہ تدبیر بنائی ورنہ بادشاہِ (مصر) کے قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے۔ اس طرح ہم جسے چاہتے ہیں بلند درجہ دیتے ہیں اور دنیا میں ہر صاحب علم سے بڑھ کر ایک اور عالم ہے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر میں داخل ہوئے اور تکان دور کرنے کے بعد مناسب لباس پہن کر دربارِ حضرت یوسفؑ کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ ان لوگوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس مرتبہ اپنے بھائی کو ساتھ لائیں گے اس لیے درباری کارندوں نے نئے مہمانوں کو ان کے چھوٹے بھائی کے ساتھ داخلہ کی خبر دی۔ ملاقات کے لیے وقت معین کیا گیا۔ جب ملاقات کا وقت بھی آیا، لیکن حضرت یوسفؑ کا اپنے بھائی کے بلانے کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ اپنے بھائی کو ان لوگوں سے الگ کر کے اپنے آپ کو اس سے پہنچوائیں اور اس طرح دوسرا طریق کار ان سے پوشیدہ رکھیں۔ اگر یہ طریقہ بظاہر ان کو برا لگے تاہم وہ اظہار ناراضگی نہ کریں اور صبر کریں تاکہ ان کا مقصد اپنے نتیجہ تک پہنچ جائے۔

قرآن اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ دربار میں داخل ہوتے وقت ایسی ترتیب دی گئی تھی کہ حضرت یوسفؑ کا بھائی ان سے خصوصی ملاقات کر سکے اور یہ ایسی ملاقات ہو کہ دوسرے اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ یہاں مفسرین نے معمول کے مطابق ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو بنیامین کے سن و سال سے مناسبت نہیں رکھتے۔ اس طرح انہوں نے تفسیر کی کتابوں کو شکوک سے بھر دیا ہے۔ کبھی یہ کہا گیا ہے کہ کارکنوں نے دو دو بھائیوں کو دسترخوان کے ایک ایک طرف بٹھایا اور بنیامین تنہا بچ گئے اور رو رو کر کہنے لگے، اگر میرا بھائی زندہ ہوتا تو میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا، حالانکہ بنیامین بچپن اور نوجوانی سے گذر چکے تھے اور مرد کامل بن چکے تھے۔ ان کا سن تقریباً تیس اور چالیس سے درمیان تھا۔ اس لیے یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ پختہ عمر کا کوئی شخص بچوں کی طرح رونے لگے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ دو دو بھائیوں کے سونے کے لیے الگ الگ کمرے دیئے گئے اور بنیامین تنہا رہ گئے تو حضرت یوسفؑ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا حالانکہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ بنیامین اس سفر میں بھائیوں کے لیے کافی موردِ احترام تھے۔ پس بڑا بھائی ایسی شرط کو قبول ہی نہیں کر سکتا تھا۔

یہاں صرف یہی کہنا چاہیے کہ حضرت یوسفؑ نے ایسا طریقہ ترتیب دیا کہ جس سے وہ اپنے بھائی سے الگ ملاقات کر سکیں۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے کیا طریقہ اختیار کیا، ہم پر واضح نہیں ہوتا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے دو باتوں کو ظاہر کیا۔ پہلی بشارت یہ دی کہ میں تمہارا بھائی ہوں، دوسرے ان کو ماضی میں بھائیوں کے سلوک کو معاف کرنے کے لیے کہا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

خاطر و مدارات کے دن تمام ہوئے اور قافلہ غلہ کے تقسیم ہونے کی جگہ پہنچا، یہاں حضرت یوسفؑ نے اپنے صرف ایک کارندے کو حکم دیا کہ بغیر کسی کو اطلاع کئے وہ بادشاہ کا قیمتی برتن اس چھوٹے بھائی کے سامان میں رکھ دے۔ جہاں غلہ تقسیم ہو رہا تھا وہاں سب کے سب اپنی باربرداری ساتھ لائے تھے اور غلہ لے کر چلے جاتے تھے، اسی طرح بنیامین نے بھی اپنا سامان گودام والے کو دے دیا کہ اس میں غلہ بھر دے۔ حضرت یوسفؑ کے کارندے نے غلہ بھر کر اس میں بادشاہ کا قیمتی کاسہ رکھا اور اس کا منہ بند کر کے بنیامین کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے غلہ اونٹ پر لادا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ان کی روانگی کے وقت حضرت یوسفؑ کے تمام

کارندے یکبارگی متوجہ ہوئے کہ بادشاہ کا برتن نہیں ہے۔ شاید حضرت یوسفؑ کے خاص کارندے نے ہی دوسرے کو خبر کی کہ بادشاہ کا برتن نہیں ہے، اس کے بغیر کہ وہ ملازم حضرت یوسفؑ کی اس ترکیب کا ذکر کرتا۔ پس ایک ملازم نے چلا کر کہا: قافلہ والو! تم چور ہو، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ

ایسا اعلان، وہ بھی بادشاہ مصر کے دربار میں، اتنی خاطر ومدارات کے باوجود! اس نے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ لہٰذا وہ فوراً واپس ہوئے اور پوچھا: ''تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟'' (تا کہ ہم فوراً تلاش کریں اور آپ کے حوالہ کریں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ۔ ان لوگوں نے فوراً جواب دیا کہ ہمارے بادشاہ کا قیمتی برتن گم ہوگیا ہے جس سے ہم غلہ تقسیم کرتے تھے۔ شاید ان لوگوں نے جو کہا کہ ہم نے گم کیا ہے اپنے عقیدہ کے اعتبار سے درست ہی کیا تھا کیونکہ اس واقعہ سے حضرت یوسفؑ کے خاص آدمی کے علاوہ کوئی بھی واقف نہیں تھا اور قوی امکان ہے کہ بنیامین بھی جانتے تھے۔ دوسرے کارندے یہاں تک کہ جنہوں نے یہ سب کیا تھا، اس کے اصلی مقصد سے ناواقف تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ پہلی آیت میں کلمہ (سقایہ) پانی پینے کے برتن کے معنی میں آیا ہے جب کہ اس آیت میں لفظ ''صواع'' پیمانہ کے معنی میں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بادشاہ جس برتن میں پانی پیتا تھا اسی کو غلہ تقسیم کرنے کا پیمانہ بنا لیا گیا تھا اور اسی سے ماپ کر دیا جاتا تھا۔ شاید حضرت یوسفؑ کا جو جاسوس تھا اسی نے آواز لگائی تھی (تم چور ہو)۔ یہاں اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ جو بھی وہ برتن لائے گا اسے انعام دیا جائے گا جو یہ ہوگا کہ ایک اونٹ کا غلہ اسے زیادہ دیا جائے گا، تم لوگ یہ تصور نہ کرو کہ یہ حکومت کا وعدہ ہے اور حکومت سے کچھ لینا بہت مشکل ہے۔ اس کے بارے میں، میں خود ضامن ہوں۔ جیسا کہ فرماتا ہے: وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ جیسے نبی نے اتنے لوگوں پر چوری کا کس طرح الزام لگایا؟

جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اتہام نہیں لگایا تھا بلکہ فقط اس بات کا حکم دیا تھا کہ برتن کو چھوٹے بھائی کے غلہ میں ڈال دیا جائے۔ بقیہ مسئلہ دربار کے کارندوں کی کارستانی تھی۔ ان لوگوں نے جب یہ سمجھا کہ بادشاہ کا برتن نہیں ہے، وہ بھی ایک قیمتی برتن، مجبور تھے کہ چلاتے اور کہتے کہ تم لوگ چور ہو تا کہ وہ برتن مل جائے۔ یہاں ممکن ہے کہ کہا جائے کہ آخر کار حضرت یوسفؑ کی وجہ سے یہ مقدمہ وجود میں آیا تھا۔ اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ بے شک یہ بات حضرت یوسفؑ جیسے نبی سے بعید ہے لیکن وہ اس طریق کار کے لیے مجبور تھے تا کہ یعقوبؑ جیسے نبی کو اذیت و پریشانی سے نجات دی جائے اور کنعان سے آئے ہوئے بھائی مصر کی طرف آجائیں۔ اس کے علاوہ چوری کا الزام بنیامین پر لگا تھا جو اس الزام پر راضی تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنیامین اس ترکیب کو جانتے تھے۔

کارندے کا چلانا کہ بادشاہ کا قیمتی برتن ہم سے گم ہوگیا ہے اور جو بھی اس کو لا کر دے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ اس بات کا سبب بنا کہ سب کے سب بھائی جوش میں آ کر قسم کھانے لگے اور کہنے لگے کہ خدا گواہ ہے! تم جانتے ہو کہ ہم یہاں فساد کے لیے نہیں آئے اور ہم چور بھی نہیں ہیں، ہم تو خود بادشاہ کی دعوت پر یہاں آئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ

آخر کار سرکاری کارندے جو اپنا یہ فرض جانتے تھے کہ بادشاہ کا برتن ڈھونڈا جائے، حضرت یوسفؑ کے اشارہ کے مطابق کہنے لگے کہ

اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے اور برتن تمہارے غلہ میں سے نکل آیا تو اس کی کیا سزا ہوگی؟ یقینی طور سے یہ سوال حضرت یوسفؑ کی طرف سے تھا۔ بعد کی آیات بھی اس بات پر گواہ ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کنعان کا قانون یاد دلایا اور کہا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ اگر چور پکڑا جائے تو اسے غلام بنا لیتے ہیں، یا کم سے کم اس سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا ہم میں سے جس کے پاس بھی بادشاہ کا برتن ملے وہ ہی ذمہ دار ہوگا اور اسے پکڑ لیا جائے۔ ہم ظالموں کو اسی طرح کی سزا دیتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے اس طرح کے پیغام نے کارندوں کا کام اور آسان کر دیا کیونکہ بات آہستہ آہستہ اپنے نتیجہ کو پہنچ رہی تھی۔ حضرت یوسفؑ کے سمجھائے ہوئے کارندے نے، اس لیے کہ کسی کی خاص توجہ نہ ہو، پہلے بنیامین کے بھائیوں کے غلہ کی تلاشی لی لیکن اس کے اندر مسروقہ برتن نہ ملا۔ آخر میں اس نے ان کے چھوٹے بھائی کے غلہ کی تلاشی لی جس کے غلہ سے وہ برتن مل گیا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ

اس کیفیت نے ان لوگوں کو اتنی پریشانی میں مبتلا کر دیا جسے تحریر نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایک طرف تو خاندانِ یعقوبؑ کی بے عزتی ہوئی، دوسری طرف ان کا غلہ روک لیا گیا۔ کیونکہ ان کے قافلہ پر چوری کا الزام ثابت ہو چکا تھا۔ نیز یہ کہ اب انہیں مصر آنے کے لیے ممانعت ہوگئی۔ ان سب کے علاوہ بنیامین پکڑ لئے گئے اور جیل بھیج دیئے گئے جب کہ ان لوگوں نے اپنے والد بزرگوار سے یہ وعدہ کیا تھا کہ بنیامین کو واپس لے کر آئیں گے۔ لہٰذا رونے دھونے اور غصہ کرنے کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ اگر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا تو بنیامین روکے نہ جا سکتے تھے جب کہ حضرت یوسفؑ کا ہدف ان کے روکنے پر موقوف تھا، کیونکہ اگر یہ طے پاتا کہ مصر کے قانون کے مطابق عمل کیا جائے، تو پھر چور کو کوڑے مارے جاتے یا اسے قتل کر دیا جاتا اور یہ بات بادشاہ مصر کے مقصد کے خلاف تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ

یہ عاقلانہ ترکیب جو بنیامین کی نجات کا سبب بنی اور جس کی وجہ سے انہوں نے اتنی مدت حضرت یوسفؑ کے پاس گذاری کہ یہ خبر حضرت یعقوبؑ تک پہنچ جائے، حضرت یوسفؑ کے عاقلانہ حکم کا نتیجہ بنی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ

جملہ ”نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ“ حضرت یوسفؑ کو بلند مقام تک لے جانے کی طرف اشارہ ہے جس نے بھائیوں کی قید سے انہیں مصر کی صدارت تک پہنچا دیا تھا۔

جملہ ”وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ“ حضرت یوسفؑ کے وسیع علم کی طرف اشارہ ہے کہ ایک ماہرانہ ترکیب سے انہوں نے اپنے بھائی کو روک لیا۔ کیونکہ مصر کا قانون یہ نہیں تھا کہ چور کو قید کر لیا جائے لیکن ایک خصوصی عدالت میں فیصلہ ہوا کہ قافلہ والے خود اپنے مجرم کی سزا تعین کریں۔ حضرت یوسفؑ بھی اس بات پر راضی ہوئے۔ فطرتاً یہی طے پایا کہ بنیامین کو روک لیا گیا۔ آیت میں ’علیم‘ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ کوئی کتنا ہی عالم کیوں نہ ہو، اللہ سب سے بالاتر ہے۔

موضوع سے متعلق آیات

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ
يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿٧٧﴾
قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٧٨﴾
قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿٧٩﴾
فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ
قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ
اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٠﴾
اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا
وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾
وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ
بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾
وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ
فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ
الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾
قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾

(یوسف۔۷۷ تا ۸۶)

آیات کا ترجمہ:

۷۷)۔ان لوگوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔اس کا بھائی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے۔یوسفؑ نے اس بات کو اپنے دل میں رکھا اوران پر اظہار نہ کیا بلکہ تم بڑے برے لوگ ہو اوراللہ تعالیٰ تمہارے بیانات کے بارے میں بہتر جاننے والا ہے۔

۷۸)۔ان لوگوں نے کہا: اے عزیز! اس کے والد بہت ضعیف العمر ہیں۔لہٰذا ہم میں سے کسی ایک کو اس کی جگہ پرروک لیجئے اوراسے چھوڑ دیجئے کہ ہم آپ کو احسان کرنے والا سمجھتے ہیں۔

۷۹)۔یوسف نے کہا: خدا کی پناہ! ہم جس کے پاس اپنا سامان پائیں اس کے علاوہ کسی دوسرے کو کیوں روکیں، اس طرح ہم تو ظالم ہو جائیں گے۔

۸۰)۔جب وہ لوگ یوسفؑ کی طرف سے مایوس ہو گئے تو الگ جا کر مشورہ کرنے لگے۔سب سے بڑے بھائی نے کہا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے تم سے عہد لیا تھا اوراس سے پہلے بھی تم یوسفؑ کے بارے میں کوتاہی کر چکے ہو؟ میں تو اس سرزمین کو نہیں چھوڑوں گا، جب تک والد محترم اجازت نہ دیں، یا خدا میرے حق میں کوئی فیصلہ کر دے کہ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

۸۱)۔''تم لوگ باپ کی خدمت میں جاؤ اورعرض کرو کہ آپ کے فرزند نے چوری کی اور ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں جس کا ہمیں علم ہے اورہم غیب کا حال جاننے والے نہیں ہیں۔

۸۲)۔''آپ اس بستی کے لوگوں سے دریافت کرلیں جس میں ہم تھے یا اس قافلہ سے پوچھ لیں جن کے ساتھ ہم آئے تھے،اورہم بالکل سچے ہیں''۔

۸۳)۔یعقوبؑ نے کہا: ''تمہارے دل نے ایک نئی بات گھڑ لی ہے۔میں پھر بھی صبر جمیل اختیار کروں گا۔امید ہے اللہ ان کو واپس لے آئے گا کہ وہ ہر شے کا جاننے والا، صاحب حکمت ہے۔

۸۴)۔یہ کہہ کر انہوں نے سب سے منہ پھیر لیا اورکہا: ہائے افسوس یوسف! اوراتنا روئے کہ ان کی آنکھیں سفید

ہو گئیں اور غم کے گھونٹ پیتے رہے لیکن اپنے غم کو ظاہر نہ کیا۔

۸۵)۔ان لوگوں نے کہا کہ آپ اسی طرح کئی سال سے یوسفؑ کو یاد کر رہے ہیں، آپ بیمار یا ہلاک ہو جائیں گے۔

۸۶)۔یعقوبؑ نے کہا کہ میں اپنے حزن وملال اور اپنی بے قراری کی فریاد اللہ کی بارگاہ میں کر رہا ہوں اور اس کی طرف سے جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

بنیامین پر چوری کا الزام لگنے سے تمام بھائی غم واندوہ میں پڑ گئے اور بغض میں ان کا گلا سوکھنے لگا ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آخر کار وہ لوگ ہاتھ پیر مارنے لگے کہ اپنے آپ کو بری کرائیں کیونکہ تلاشی سے پہلے کوئی مرتبہ فریاد کر چکے تھے۔یعنی''وما کنا سارقین''لیکن جب چوری پکڑی گئی اور حقیقت کھل گئی تو انہوں نے چاہا کہ اپنے آپ کو بنیامین سے الگ کر لیں تا کہ اپنا حال ٹھیک رہے۔لہٰذا ان لوگوں نے کہا کہ بنیامین کا ہم لوگوں سے زیادہ تعلق نہیں ہے کیونکہ وہ باپ کی طرف سے ہمارا بھائی ہے، اس کی ماں ہم سے الگ ہے۔پس اگر اس نے چوری کی ہے تو تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، اور بھائی سے مراد یہاں یوسفؑ تھے۔حضرت یوسفؑ نے ان کی یہ بات سن تو لی لیکن جوانمردی کی بناء پر ان کی طرف رخ نہ کیا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تہمت کی وجہ کیا تھی؟ یہاں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ بھائیوں نے اس وجہ سے دوسرے بھائی پر الزام لگایا ہو کہ اپنے آپ کو اس سے بالکل الگ کر لیں۔وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ بری عادت اس نے اپنی ماں سے ورثہ میں پائی ہے، باپ کی طرف سے نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس اتہام کا کوئی سبب تو پایا نہیں جاتا تھا۔

مفسرین یہاں دوسرے احتمالات کا ذکر بھی کرتے ہیں جن کے لیے کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔کبھی کہتے ہیں کہ یوسفؑ نے کسی کے گھر سے بت اتار کر توڑ ڈالا تھا۔کبھی کہتے ہیں کہ یوسف نے دسترخوان سے تھوڑا سا کھانا اٹھا کر کسی غریب کو دے دیا تھا۔ان باتوں کو ان کے بھائیوں نے چوری قرار دیا۔

کبھی یہ کہتے ہیں کہ یوسفؑ ماں کے مرنے کے بعد اپنی پھوپھی کی طرف رہے تھے۔جب حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو ان کی پھوپھی کے پاس واپس بلایا کہ اپنے پاس رکھیں تو ان کی پھوپھی نے حضرت اسحاقؑ کا کمر بند یوسفؑ کی کمر میں باندھ دیا اور انہیں حضرت یعقوبؑ کے گھر بھیج دیا اور ادعا کیا کہ یوسفؑ کا خیال یہ تھا کہ اس کمر بند کو غائب کر دیں اور پھوپھی قانون کنعان کے مطابق حضرت یوسفؑ کو اپنے پاس رکھے۔ [1]

---

[1] مجمع البیان۔ج ۳ ص ۲۵۵

ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی درست نہیں۔ اگر فرض کر لیں صحیح ہے تو اس میں کوئی کمزور نقطہ بھی نہیں پایا جاتا۔ سب سے معقول یہ ہے کہ ہم کہیں کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان سے لا پرواہی برتی اور اپنے آپ کو نجات دلانے کے لیے یہ تہمت گھڑ لی، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ۔ لیکن حضرت یوسفؑ کی دلیری دیکھئے کہ یہ بات سن کر انہوں نے اپنے چہرہ سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا، گویا بالکل درگذر کر لیا جیسا کہ قرآن فرماتا ہے ''فَاَسَرَّہَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِہٖ وَلَمۡ یُبۡدِہَا لَہُمۡ ''[1]

صرف یہ کہا کہ اگر تمہاری بات صحیح ہے کہ بنیامین کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، تو تم اس سے بھی بدتر ہو، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا۔ میں ھا بہ تانیث دو افعال سے متعلق ہے: ''اسرھا۔ لم یبدھا''۔ یعنی جو کچھ دل میں چھپایا تھا اور ظاہر نہیں کیا تھا وہ یہی تھا کہ اگر وہ برا ہے تو تم اس سے بدتر ہو۔

لیکن یہ احتمال ہر آیت کے خلاف ہے۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے حضرت یوسفؑ کو پہچانے بغیر ان پر چوری کا الزام لگایا تو حضرت یوسفؑ نے اس کو اہمیت نہ دی۔ صرف ان لوگوں کو سنانے کے لیے کہ تم اس سے بدتر ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ یوسفؑ سے بدتر کیوں ہیں؟ اس کا باطن بھی ہے اور ظاہر بھی۔ لیکن بہ نظر باطن یہ کہ ان لوگوں نے بہت بڑا جرم حضرت یوسفؑ کے ساتھ کیا تھا جب کہ ظاہری نظر میں یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسی گھر میں چوری کا ارتکاب کیا جہاں ان کے لیے تمام اہتمام کیا گیا تھا۔

لیکن جملہ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا کا اشارہ ایک طرح ان کی حرکتوں کی تصدیق ہے (اس کا ایک بھائی تھا اس نے بھی چوری کی تھی) وہ فوراً اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ خدا اس چیز سے آگاہ ہے جو تم الزام لگا رہے ہو جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ

عزیز مصر سے دوسری درخواست

اپنے آپ کو چوری سے بری کرنے اور بنیامین اور ان کے بھائی کو متہم کرنے کا اچھا اثر نہ ہوا بلکہ حالات بدتر ہو گئے اور بادشاہِ مصر نے ان سے کہا: اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا لہٰذا انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور کہا کہ ہم لوگوں میں سے کسی ایک کو بنیامین کی جگہ رکھ لو، لیکن عزیز مصر کی مہربانیوں کے پیش نظر اس سے کہا: ''اے عزیز مصر! اس متہم کا بہت بوڑھا باپ ہے جو اس کے فراق کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ نیز ہم نے اپنے والد سے وعدہ بھی کیا تھا کہ اسے ضرور واپس لائیں گے۔ لیکن ہم اس وقت ایسی مصیبت سے دوچار ہوئے ہیں اس لیے آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہم لوگوں میں سے کسی ایک کو روک لیجئے اور کام آگے بڑھائیے، جیسا کہ ان لوگوں نے کہا: قَالُوۡا یٰۤاَیُّہَا الۡعَزِیۡزُ اِنَّ لَہٗۤ اَبًا شَیۡخًا کَبِیۡرًا فَخُذۡ اَحَدَنَا مَکَانَہٗ ۚ اِنَّا نَرٰىکَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ

لیکن حضرت یوسف نے اس شرط کو قبول نہ کیا کیونکہ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ کسی بے گناہ کو ملزم کی جگہ پکڑ لیا جائے۔ یہ چیز نہ عقل

---

[1] شاید ''اسرھا'' اور ''لم یبدھا'' میں مونث کی ضمیر لانے کی وجہ یہ ہو کہ ان ضمیروں کا یہی مرجع ہے اور یہی خیال بھی ہے کہ یہ لفظ ''سرقت'' کی وجہ سے ہو جیسا کہ گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

قبول کرتی ہے اور نہ ہی شرع، نیز قاضی کے حکم کے خلاف عمل سے عدالت کی آبرو بھی جاتی ہے۔پس ان کی درخواست کو سختی سے رد کر دیا گیا اور برے کام سے تعبیر کرتے ہوئے کہا: (یوسف۔79) یعنی میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسا غلط کام کروں جس کے پاس سے میرا مال نکلا ہے اس کے علاوہ کسی کو نہیں پکڑتا۔اگر میں اس کے علاوہ کوئی طریقہ اختیار کروں گا تو ظالم قرار پاؤں گا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ

یہاں ان لوگوں کے حضرت یوسفؑ کے سامنے دلائل ختم ہو گئے اور وہ لوگ اپنی مشکل حل نہ کر پائے۔اب وہ دوراہے پر کھڑے تھے۔سوال یہ تھا کہ کیا وہ سب کے سب مصر میں رک جائیں تاکہ مسئلہ حل ہو اور ان کا بھائی آزاد ہو جائے؟ اس صورت میں ان کے خاندان کا کیا حال ہوگا۔خاندان والے ان کے منتظر ہوں گے کہ غلہ لے کر آ رہے ہیں۔کیا بعید کہ نہ جانے یہ وہ لوگ بھوک سے مرنے لگیں! یا سب کے سب واپس چلے جائیں؟ اس صورت میں وہ حضرت یعقوبؑ کو کیا جواب دیں گے کیونکہ انہوں نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ یوسفؑ کے بھائی کو ضرور واپس لائیں گے۔جب وہ حضرت یوسفؑ سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف جا کر مشورہ اور سرگوشی کرنے لگے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ

بڑے بھائی نے جس کی ذمہ داری زیادہ تھی، مشورہ میں دو حساس باتیں کہیں:

۱)۔تم جانتے ہو کہ بابا جان نے بڑی سختی سے تم سے پیمان الٰہی لیا تھا۔اس صورت میں تم ان کے پاس خالی ہاتھ کیسے جاؤ گے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا

۲)۔یہ پہلی دفعہ نہیں ہے کہ ہم باپ کے لیے اذیت کا سبب ہوئے ہیں کیونکہ یوسفؑ کے سلسلہ میں بھی ہم لوگوں نے کوتاہی کی تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ

ان دو باتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ میں تنہا مصر میں اس وقت تک رکا رہوں گا، جب تک دو میں سے ایک کام ہو جائے۔

الف)۔بابا جان واپس آنے کا حکم دیں۔فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ

ب)۔خدا ہمارے فائدہ میں فیصلہ فرمائے اور ہمارا بری الذمہ ہونا باپ کے سامنے ثابت ہو جائے، یا بنیامین آزاد ہو اور میں اس کے ساتھ واپس جاؤں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ

پس یہ طے پایا کہ کنعان کا قافلہ فلسطینی قافلے کے ساتھ واپس چلا جائے اور بڑا بھائی مصر میں رکا رہے جب کہ باقی بھائی والد بزرگوار کے پاس واپس جا کر جو واقعہ پیش آیا ہے انہیں بتائیں نیز یہ کہیں کہ صحیح ہے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ بنیامین کو واپس اپنے ہمراہ لائیں گے لیکن ہم غیب تو نہیں جانتے تھے۔ہمیں کیا معلوم تھا کہ چوری کرے گا اور ہم لوگوں کو بھی پھنسا دے گا۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ (آپ کے بیٹے نے چوری کی، یہ نہیں کہہ رہے کہ ہمارے بھائی نے چوری کی ہے)۔اگر ہم اس کی شہادت دیں تو یہ چشم دید گواہی ہوگی کیونکہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بادشاہ کا برتن اسی کے سامان سے نکلا ہے۔جیسا کہ قرآن

فرماتا ہے: وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا [1]

ہم لوگوں نے آپ سے وعدہ کیا تھا لیکن ہمیں غیب کا علم تو نہیں تھا۔ وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ

اس کے بعد بڑا بھائی اپنی اور اپنے بھائیوں کی بے گناہی کے سلسلہ میں انہیں سکھلاتا ہے کہ والد بزرگوار سے کہنا کہ ہمارے پاس بنیامین کے جرم پر دو گواہ ہیں:

ا)۔ جس شہر سے ہم لوگوں نے غلہ لیا ہے وہاں سے پوچھیں ۔ یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی ہے اور شہر کے درودیوار تک اسے جانتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا

۲)۔ فلسطینی قافلہ جس کے ساتھ ہم لوگ کنعان واپس آئے ہیں وہ لوگ بھی بنیامین کے جرم کی گواہی دیں گے اور آپ یہ جان لیں کہ ہم لوگ بے گناہ ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے: وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ

کنعان میں ورود

کنعانی قافلہ واردِ شہر ہوا، بوڑھا اپنے بیٹوں کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا تھا خاص طور پر اپنے چھوٹے بیٹے (بنیامین) کے لیے۔ لیکن افسوس کہ وہ لوگ آئے تو نہ صرف یہ کہ یوسفؑ کی کوئی خبر نہ لائے بلکہ اس کے چھوٹے بھائی بنیامین کو بھی گنوا کر آئے۔ یہ وقت تھا جب بوڑھا باپ جس کی زندگی کے چالیس سال فراق یوسفؑ میں جلتے ہوئے گذرے تھے اس کی زندگی میں بالکل اندھیرا چھا گیا۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے واقعہ سنایا اور بڑے بھائی کا مصر میں رک جانا بھی باپ کو بتایا اور کہا: ”ہمارے پاس اپنی سچائی پر دو گواہ موجود ہیں، ایک شہر کے لوگ اور اس کے درودیوار، دوسرے وہ قافلہ جو ہم لوگوں کے ساتھ آیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ باپ نے ان سے پھر وہی جملہ کہا جو یوسفؑ کے بارے میں اس وقت کہا تھا۔ جب ان لوگوں نے آ کر بتایا تھا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے دونوں مرتبہ یہی کہا تھا: قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ لیکن پہلے واقعہ میں اس جملہ کے ساتھ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ کا اضافہ کی تھا۔ جب کہ اس مرتبہ ایک اور جملہ سے اس کی تکمیل کی اور کہا: عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا

یہاں دو باتوں کا ذکر ہے:

ا)۔ ممکن ہے سوال کیا جائے کہ باپ نے دونوں کو کیسے ایک ہی زمرہ میں رکھا؟ صحیح ہے کہ پہلے مسئلہ میں ان لوگوں نے غلط کام کیا تھا اور اسے اچھا کہا تھا کیونکہ اس وقت ان لوگوں نے جھوٹ بولا تھا اور سوچا تھا کہ انہوں نے نیک کام کیا ہے۔ لیکن دوسرے مرحلے میں انہوں نے اپنے علم کے اعتبار سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یعنی بنیامین کے چوری کرنے کی بات دل سے نہیں گھڑی تھی بلکہ واقعہ وہی تھا جیسا انہوں نے دیکھا تھا

---

[1] کبھی کبھی جملہ کی اس طرح تفسیر بھی ہوتی ہے کہ اگر ہم یوسفؑ سے کہتے کہ چور کو پکڑ لو تو یہ بات ہمارے علم کو ظاہر کرتی جبکہ ہم نہیں جانتے تھے کہ بنیامین نے چوری کی ہے۔

اور گواہی بھی دلائی تھی اس صورت میں بھی کس طرح حضرت یعقوبؑ یہ کہتے: بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ

جواب: حضرت یعقوبؑ دونوں واقعات میں ایک حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ وہ یہ کہ تم لوگوں کی باتیں دونوں میں جھوٹ بے بنیاد ہیں۔ پہلے معاملہ میں تمہارا حسد تھا جس نے تم لوگوں کو جھوٹ بولنے پر مائل کیا، جبکہ دوسرے میں اپنی جہل و نادانی کے باعث تم نے تصور کیا ہے کہ میرے بیٹے نے چوری کی ہے۔ تم لوگوں نے سوچا نہیں کہ صرف ایک برتن برآمد ہوجانے سے ایک آدمی کی گواہی اس کے چور ہونے پر صحیح نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کام کسی اور نے اس کو بدنام کرنے کے لیے کیا ہو۔ تمہیں کیسے معلوم ہے کہ یہ کام تم لوگوں کے علاوہ کسی اور نے نہیں کیا؟ کچھ بھی ہو دونوں باتیں شیطان کا بہکاوا تمہاری نفسانی خواہش اور حقیقت سے خالی ہیں۔

پہلے معاملہ میں یعنی جب حضرت یوسفؑ کے مارے جانے کی خبر لائے تھے تو جانتے تھے کہ جدائی کی مدت بہت طولانی ہوگی اور وہ اتنی جلدی سے ملاقات نہیں کرسکیں گے۔ اس وقت وہ مجبور تھے کہ فراقِ یوسفؑ میں جو مصیبت آئے اس میں خدا سے صبر اور مدد طلب کریں۔ لہٰذا فرمایا: وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ لیکن دوسرے معاملہ میں جانتے تھے کہ ملاقات کا وقت قریب ہے اور جلد ہی یوسفؑ گم گشتہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ہمراہ واپس آئیں گے۔ اس لیے فرماتے ہیں: عَسَی اللّٰهُ اَنۡ یَّاۡتِیَنِیۡ بِهِمۡ جَمِیۡعًا

مشکل یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ دو موقعوں میں خدا کو 'علیم و حکیم' کہہ کر پکارتے ہیں، یعنی ایک وہ موقعہ جب حضرت یوسفؑ اپنا خواب اپنے والد بزرگوار سے بیان کرتے ہیں (یوسف۔6) دوسرے یہاں جب تینوں بیٹوں کے واپس آنے کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ یعنی خدا کا کام حکمت کے ساتھ ہے اور وہ حقائق سے واقف ہے۔

نتیجتاً باپ نے بیٹوں کی مذمت کی اور گواہوں کی گواہی کو اہمیت نہ دی لیکن غم و اندوہ نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے جھوٹے بھائیوں سے منہ موڑ لیا اور غم کی شدت سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَقَالَ یٰۤاَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ وَابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰهُ مِنَ الۡحُزۡنِ فَهُوَ کَظِیۡمٌ۔ جملہ 'من الحزن'' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ غم کی شدت نے آنکھوں پر اثر نہیں ڈالا تھا۔ نہ ہی صرف رونے نے، بلکہ شاید ان دونوں کا اثر تھا کیونکہ حزن وملال گریہ کا سبب ہوتا ہے۔

جملہ 'وھو کظیم'' اس بات کا اظہار ہے کہ وہ روئے تو ضرور لیکن اپنے غم کو چھپائے رکھا اپنے غصہ کو بھی اندر ہی اندر دبائے رکھا اور بیٹوں سے کوئی باز پرس نہ کی۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے چاہا کہ باپ کا دل بہلائیں اس لیے ان سے کہا: ''یہ غم و اندوہ و گریہ تمہیں دو میں سے ایک نتیجہ تک پہنچا دے گا، یا تو تمہیں بیمار کردے گا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالُوۡا تَاللّٰهِ تَفۡتَؤُا تَذۡکُرُ یُوۡسُفَ حَتّٰی تَکُوۡنَ حَرَضًا یا آپ کو مار ڈالے گا۔ اَوۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡهٰلِکِیۡنَ

حضرت یعقوبؑ نے ان کو جواب دیا: میں اپنا شکوہ شکایت خدا کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں، تم سے کوئی مطلب نہیں رکھتا، کیونکہ میں خدا سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میرے اس فراق کے اندھیرے کو میری زندگی سے برطرف کردے گا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ اِنَّمَاۤ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَحُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ

مصر کا تیسرا سفر

موضوع سے متعلق آیات

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ
لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾
فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ
مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾
قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾
قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ
عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾
قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾
اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ (یوسف۔ ۸۷ تا ۹۳)

آیات کا ترجمہ:

۸۷)۔ میرے بیٹو! جاؤ، یوسفؑ اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور رحمت خدا سے مایوس نہ ہو کہ اس کی رحمت سے کافروں کے علاوہ کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

۸۸)۔ جب وہ لوگ دوبارہ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو کہنے لگے: اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو بڑی تکلیف پہنچی ہے اس لیے ہم تھوڑی پونجی لے کر آئے ہیں، آپ ہمیں پورا پورا غلہ عنایت کریں، اور ہم پر احسان

کریں کہ خدا کارِ خیر کرنے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

۸۹)۔عزیز نے کہا: کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور ان کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جب کہ تم بالکل جاہل تھے؟

۹۰)۔ان لوگوں نے پوچھا: کیا آپ ہیں یوسفؑ ہی؟ انہوں نے کہا: بے شک میں یوسفؑ ہی ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے اور جو کوئی بھی تقویٰ وصبر اختیار کرتا ہے، اللہ ایسے نیک عمل کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

۹۱)۔ان لوگوں نے کہا: خدا کی قسم! خدا نے آپ کو ہم پر فضیلت وامتیاز عطا فرمایا ہے اور ہم سب خطا کار تھے۔

۹۲)۔یوسفؑ نے کہا: آج تم پر کوئی الزام یا ملامت نہیں۔خدا تمہیں معاف کر دے گا اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

۹۳)۔میری قمیص لے جاؤ اور اسے باپ کے چہرے پر ڈال دو کہ ان کی بصارت پلٹ آئے گی اور اس مرتبہ اپنے تمام گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

یوسفؑ کے بھائیوں کی عذر و معذرت نے انہیں اپنے والد بزرگوار کے پاس کوئی فائدہ نہ پہنچایا، اور وہ برابر حضرت یوسفؑ کے فراق میں جلتے رہے۔بنیامین کے فراق نے ان کے غم واندوہ میں اور اضافہ کیا۔خشک سالی ایک طرف اور غم واندوہ کی زیادتی نے دوسری طرف مل کر حضرت یعقوبؑ کے خاندان کی زندگی کو تیرہ وتار بنا دیا۔پھر جو غلہ مصر سے لائے تھے چھ مہینے سے زیادہ کے لیے کافی نہ تھا، ہر جگہ سے طبیعت عاجز آ چکی تھی اور صرف ایک جگہ ہی یعنی مصر کی طرف سے کرن نظر آتی تھی۔لہٰذا حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ان کے حکم سے آمادہ سفر ہوئے تاکہ گھر والوں کے لیے غلہ کا انتظام کریں اور حضرت یوسفؑ اور اس کے بھائی کی بھی کچھ خبر لائیں۔اگر گذشتہ دو مرحلوں میں گیہوں کے دام ادا کئے ہوتے تو اس وقت ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہ جاتی۔

حضرت یعقوبؑ نے اپنے نو بیٹوں کو سفر پر جاتے وقت آذوقہ زندگی کے بارے میں تو کچھ نہ کہا بلکہ انہیں حکم دیا کہ یوسفؑ اور اس کے بھائی بنیامین کے بارے میں ضرور جستجو کریں اور رحمت خدا سے مایوس نہ ہوں، کیونکہ خدا سے ناامیدی کفر کی علامت ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو الہام ہو گیا تھا کہ فراق کا زمانہ اب ختم ہونے والا ہے۔اور ملاقات فرزند بہت جلد ہو گی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ۔حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ کے بارے میں حکم دیتے ہیں

کہ ان کے لیے ضرور جستجو کریں جیسا کہ قرآن نے یعقوبؑ کی بات کو مادہ 'تحس' سے تعبیر کیا ہے، جو نیک کام کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ 'تجسس' سے کیونکہ یہ لفظ شر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں :التحس فی الخیر والتجس فی الشر'' اور سورۂ حجرات میں خدا فرماتا ہے:''وَلا تجسسوا ''(حجرات۔۱۲)

'روح 'لغت عرب میں رحمت کی ہوا کو کہتے ہیں جو عذاب کی ہوا کے ضد میں ہے۔آیت میں اس سے مراد شدت و پریشانی کے بعد راحت و آسانی ہے اصولی طور پر ایمان کا لازمہ یہ ہے کہ انسان خدائے دانا، توانا، قاہر اور غالب کی رحمت وکرم سے مایوس نہ ہو لیکن کافر لوگ جو ان صفات سے خدا کو نہیں مانتے۔ اپنے دل میں اس طرح کی رجا و امید پیدا ہی نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں سے کہتے ہیں :اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ ۔قرآن ایک اور آیت میں زبان ابراہیم سے نقل فرماتا ہے:وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ

اس نصیحت اور سفارش نے ان کے دلوں میں امید کا بیج بویا اور انہیں امید دلائی کہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں تحقیق کریں۔لیکن جلد ہی ان لوگوں نے باپ کی اس نصیحت کو بھلا دیا اور حصول آذوقہ کے علاوہ کوئی بات ان کے ذہن میں نہ رہی۔اصولی طور پر یعقوبؑ جیسے باپ امید کا بیج انہی کے دلوں میں ڈالتے ہیں جو اس کے قابل ہوتا ہے نہ کہ جس میں اس کی صلاحیت ہی نہ ہو۔لہٰذا ان لوگوں کو کسی طرح بھی یہ فکر نہ ہوئی کہ یوسفؑ زندہ ہوں گے اسی وجہ سے ان لوگوں نے مصر میں داخل ہو کر یا دربار میں شرف یابی کے وقت صرف آذوقہ زندگی ہی کے بارے میں بات کی یا زیادہ سے زیادہ بنیامین کی آزادی کے لیے درخواست کی۔

نو کے نو بھائی مصر میں داخل ہو کر قطعی طور پر بڑے بھائی کی تلاش میں ہی گئے ہوں گے۔لہٰذا اس کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لیا اور سب دست بستہ بادشاہ مصر کے سامنے کھڑے ہو گئے اور نہایت ذلت و رسوائی کے انداز میں بات کی۔

وہ طاقت ور جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو رسی کے ذریعہ کنوئیں میں ڈالا تھا، آج سب کے سب ذلت آمیز انداز میں ان کے سامنے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ غلہ کی خریداری کے لیے ان کے پاس کافی رقم نہیں ہے کہ اس کی قیمت ادا کر سکیں۔وہ کم رقم لے کر آئے ہیں ،پس ان پر رحم کیا جائے اور ان کے اونٹوں کے بار غلہ سے بھر دیئے جائیں، انہیں صدقہ دیا جائے کیونکہ خدا صدقہ دینے والوں سے محبت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں تین جملوں سے خطاب کیا:

۱)۔''مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ ''اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا خاندان بڑی عزت میں زندگی گذار رہا تھا اور بڑی مشکل سے ان کا کاروان زندگی آگے بڑھ رہا تھا۔''ضر ''لغت عرب میں غربت و بدحالی کو کہتے ہیں۔

۲)۔''وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ ''اگر حضرت یعقوبؑ کے بیٹے پہلے کے لائے ہوئے غلہ کی قیمت ادا کئے ہوتے تو اس دفعہ کے

غلہ کی قیمت بالکل ادا نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ اس دفعہ کم رقم لائے تھے اور اس کا اعتراف بھی کر رہے تھے یعنی ''بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ'' ''مزجاة'' عربی زبان میں دور ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کم سرمائے کو بھی ''مزجاة'' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا لینے والا اس کو کم اہمیت دیتا ہے اور اس کو اپنے سے دور کرتا ہے۔

۳)۔ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ط اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ان لوگوں کی تصدق کی خواہش سے کیا مراد تھی، یقینی طور پر اس کا علم نہیں ہوتا۔ لیکن احتمال یہی ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب پہلے جملہ کی تاکید ہو، یعنی اے عزیز! ہمارے ساتھ نیکی کرو اور غلہ کی پوری قیمت ہم سے نہ لو۔ اسی طرح یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے بنیامین کی آزادی مقصود ہو۔

بھائیوں کی باتیں ختم ہوئیں۔ قبل اس کے کہ بعد کی آیت کی تفسیر کریں، ہم اس سوال پر بحث کرتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے اس مدت میں اپنے والد بزرگوار کو اپنے حالات کی اطلاع کیوں نہ دی۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے کچھ دن تک عزیز کے گھر میں غلام کی حیثیت سے بھی زندگی گذاری، اس کے بعد زندان میں بھیج دیئے گئے۔ ان دو مرحلوں میں اطلاع دینے پر قادر بھی نہیں تھے اور نہ بتانا ہی بہتر تھا کیونکہ اس وقت مصلحت یہ نہ تھی کہ اپنی بدحالی اور غربت کو باپ پر ظاہر کرتے، لیکن اس کے بعد جب زندان سے آزاد ہو گئے اور وزیر زراعت بن گئے، اس وقت تو لازم تھا کہ اپنی اس سات سالہ زندگی کی خبر باپ تک پہنچاتے تاکہ ان کا غم کچھ کم ہوتا، یا ان کو مصر بلاتے یا خود کسی طرح ان کے پاس جاتے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام امکانات کے ہوتے ہوئے حضرت یوسفؑ کی خاموشی کا کیا سبب تھا؟

جواب: حضرت یوسفؑ کا واقعہ ایک الٰہی امتحان تھا جس کے ساتھ بہت سی عبرتیں، نکتے اور نتائج منسلک تھے اور آخر میں جس بات کا نتیجہ کے طور پر میٹھا پھل دیا، اسے آخر تک پہنچنا چاہیے تھا۔ اگر حضرت یوسفؑ اس الٰہی امتحان کو بیچ سے منقطع کر دیتے اور اپنے حالات سے حضرت یعقوبؑ کو باخبر کر دیتے تو اس کا اہم حصہ باقی رہ جاتا۔ اس میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ دنیا والے اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھیں کہ ایک متقی و پرہیزگار بردبار انسان کس طرح اندھیرے کنوئیں سے نکل کر صدارت کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ لمبی گردن والوں نے ایک دن اسی متقی شخص کو اندھیرے کنوئیں میں دھکیل دیا تھا اور آج اسی کے سامنے گردن جھکائے ہوئے کھڑے تھے اور اسے غلہ کی بھیک مانگ رہے تھے۔ کیا یہ نتیجہ اور اس کے علاوہ دسوں نتائج جو اس سے حاصل ہوئے بغیر امتحان پورا کئے ہمیں مل سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر ایک پڑھا لکھا آدمی نکات سورۂ یوسفؑ کو یکے بعد دیگرے جمع کرے تو اسے دسیوں عبرت و نصیحت کے درس حاصل ہوں گے جو تمام کے تمام اس سرگذشت کا ثمر ہیں، جسے ہم الٰہی امتحان کہتے ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے

خدا کی اجازت سے چاہیے تھا کہ حضرت یوسفؑ پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ اپنا تعارف کراتے اور بھائیوں کے مستقبل کے اضطراب کو کم کرتے۔ لیکن انہوں نے گذشتہ تیس سال کی طرف نظر کی جو سب عرصہ رنج و غم سے بھرا ہوا تھا جس کے عامل اور باعث یہی لوگ تھے جو آج ان کے سامنے کھڑے تھے۔ لیکن عطوفت پیغمبری ان پر غالب آئی اور بڑے نرم لہجہ میں کہا: کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے

ساتھ کیا کیا تھا جب تم جاہل تھے۔قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ

حضرت یوسفؑ نے ان کو بڑے اچھے انداز میں جتلایا لیکن ان کی بزرگوای ملاحظہ کریں کہ مذمت کے آخر میں ان کے عذر کو یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں: تم نے یہ کام اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے کیا تھا۔ بہرحال یہ بات حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کا اہم راز تھا اس لیے وہ لوگ متعجب ہوئے اور سب کے سب دل میں کہنے لگے: تعجب ہے! اس مصری شخص کو کیسے معلوم ہے کہ ہم نے چند سال پہلے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ بے مروتی کی تھی اور اس کو اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا، یہ تو ایسا راز ہے جسے صرف حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ہی جانتے تھے۔ کیا وہ کوئی پیغمبر ہے جو اپنے علم غیب سے ہمارے راز فاش کر رہا ہے یا وہ خود یوسفؑ ہی ہے جو اس مقام بلند پر پہنچ گیا ہے؟

دوسرا احتمال ان لوگوں کے ذہن کو بہتر معلوم ہوا اور انہوں نے ایک دم کہا: ''کیا تم یوسفؑ تو نہیں ہو؟'' حضرت یوسفؑ نے کہا: 'ہاں! میں یوسفؑ ہی ہوں اور یہ میرا بھائی ہے'۔ اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے اور ہمیں فضیلت بخشی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ۖ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا

اس وقت حضرت یوسفؑ نے پیغمبروں کی طرح تمام چیزوں کو اللہ کی عطا کردہ جانتے ہوئے اس برتری کے اسباب کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''دو چیزیں اس برتری کا سبب بنی ہیں'':

۱)۔تقویٰ و پرہیز گاری' وانه من يتق''

۲)۔صبر و بردباری' ويصبر''

لیکن اے یعقوبؑ کے بیٹو! جان لو! یہ سنت الٰہی ہے کہ پرہیزگار صابر کو بلند و بالا کرتی ہے اور یہ مجھ اور میرے بھائی بنیامین سے ہی مخصوص نہیں ہے: فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے یوسفؑ کو باپ کے دامن سے جدا کیا تھا و را سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر انہیں اندھے کنوئیں میں ڈال دیا تھا، لیکن وہی آج ان لوگوں کی خاطر و مدارات کر رہا تھا ابھی تک دو مرتبہ خاطر داری کی لیکن پیشانی پر ذرا سا بل نہ آنے دیا، نہ ہی کسی طرح ان کے ساتھ کوتاہی برتی'' دیکھو دونوں باتوں میں کتنا فرق ہوا''

حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی صورت نہ تھی کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے اور کہتے لَقَدْ آثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِن كُنَّا لَخَاطِئِينَ جو عمداً غلطی کرتا ہے اسے خاطی اور جو بھول کر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اسے مخطی کہتے ہیں [1]

اس آیت میں لفظ' اثر'' آیا ہے عرب کہتے ہیں: 'اثرك ايثارًا فضلك الله'

موجودہ موقع بہت ہی حساس اور تاریخ ساز تھا کیونکہ انہیں معلوم نہ تھا کہ حضرت یوسفؑ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ کیا

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۱۸ ص ۲۵۔الخاطی هو الذی اتی بالخطیئة وفرق بين الخاطی والمخطی وهذا الفرق . يقال لمن يجهتد فی الاحكام فلا يصيب انه مخطی۔

ان لوگوں کو سزا دیں گے یا انہیں معاف کر دیں گے؟ ان حالات میں ان کے دل عجیب طرح دھڑک رہے تھے۔ حضرت یوسفؑ نے ان کی پریشانی کا مشاہدہ کیا، عمومی معافی کا اعلان کر دیا اور فرمایا: ہم آج تمہاری مذمت نہیں کرتے۔ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے گا اور وہ ارحم الرحمین ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ [1]

اگر آج ان پر کوئی ملامت نہیں تو آئندہ بھی نہ ہوگی۔

کرم فرمائی دیکھو، کرم و عطوفت ملاحظہ کرو! تمام مجرموں کو ایک دم بخش دینا شیوۂ انبیاء ہے۔ بالخصوص جب وہ احساس ندامت کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے جب فتح مکہ کیا تو قریش کے سب لوگ مجرمین کے طور پر قید ہو کر سب کے سب مسجد الحرام میں موجود تھے اور اپنے آئندہ کے بارے میں متفکر تھے۔ اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا: ما ترونی دوسرے لفظوں میں "ما ذا تظنون" یعنی کیا سوچ رہے ہو؟ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی رحمت و کرم میں پناہ مانگی اور کہا: نظن خیرًا اخ کریم وابن اخ کریم وقدورات" یعنی ہم آپ سے نیکی کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتے۔ آپ کریم بھائی، کریم بھائی کے بیٹے اور اپنی سبقت کے لحاظ سے بات کر رہے ہیں"۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میں وہی کہوں گا جو میرے بھائی یوسفؑ نے کہا تھا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔

مجلس میں ٹھہراؤ آ گیا اور بھاری سکوت طاری تھی۔ کئی طرح کی مشکلوں کو حل کرنا تھا جو بھائیوں کی بے مہری کی وجہ سے رونما ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ دو مشکلات تھیں:

ا)۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے پدر بزرگوار کے حالات پوچھے تو بھائیوں نے ان کی زندگی کی تفصیل بتائی کہ غم و اندوہ کی وجہ سے ان کی بصارت ختم ہو گئی ہے اور وہ تمہارے فراق میں مستقل روتے رہتے ہیں۔

اس مشکل کے بارے میں حضرت یوسفؑ کو معنوی اور نفسِ قدسیہ سے استفادہ کرنا چاہیے تھا کہ اچھے انداز سے بطور بہبودی ان سے کہہ دیتے کہ ان کی اولاد میں ایک مسیحا بن کر اس کام کو انجام دے گا۔ اگر وہ مادر زاد اندھے کو بینائی عطا کرے گا جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: "اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ" یعنی مادر زاد اندھوں کو بینائی اور بیماروں کو شفا دے گا تو حضرت یوسفؑ بھی حضرت یعقوبؑ کو جو کچھ دن پہلے بینائی کھو چکے تھے، پلٹا دیں گے۔ یہ کام خارق العادت اور ادعائے نبوت کے سلسلہ میں بھی نہیں تھا اس لیے اسے معجزہ نہیں بلکہ کرامت کہا جائے گا۔

یہاں حضرت یوسفؑ کی چاہت اور نفس موثر ہے، جیسا کہ تمام انبیاء کی کرامت میں ان کی چاہت موثر ہوتی ہے، گویا خداوند عالم نے اسباب جہان کو ان کے اختیار میں رکھا ہے جو بعض شرائط کے ساتھ اللہ کی اجازت سے نہ دیکھنے والے اسباب کو بھی کام میں لاتے ہیں اور نئی اور واضح چیز وجود میں لاتے ہیں۔

اس وجہ سے حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا: میری قمیص کنعان لے جاؤ اور ان کے چہرہ پر ڈال دو فوراً ان کی بینائی لوٹ کر واپس آ جائے گی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۲ مطبوعہ مصر

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے وسائل طبیعی میں قمیص ہی کا کیوں سہارا لیا جب کہ اشارہ ہے، یا ایک لقمہ روٹی بھیج کر یا کسی دوسرے وسیلہ سے بصارت واپس لا سکتے تھے؟ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ ان کی خون بھری قمیص حضرت یعقوبؑ کی بینائی زائل ہونے کا سبب بنی تھی، اس لیے یہی قمیص ان کی بینائی کو پلٹا بھی دے گی۔ نیز جس کسی نے خون بھری قمیص لے جا کر انہیں غمگین کیا تھا، یہاں بھی اس کو چاہیے تھا کہ دوسری قمیص لے جا کر انہیں شاد و خوشحال کرے۔

قمیص یوسف عصائے موسیٰ کی مانند ہے۔ سوتی کپڑے اور لکڑے کے عصا میں یہ قدرت نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف انبیاء کی خواہش و ارادہ پر ہوتا ہے۔ یہاں تنگ نظر وہابیوں کو اپنی فکروں کو اس کے ذریعہ درست کرنا چاہیے کہ حضرت یوسفؑ اپنی قمیص کو بھیجتے ہیں جو تھوڑے سے سوت کے وزن سے زیادہ نہ تھی، تاکہ باپ تبرک کے طور پر اس قمیص سے بینا ہو جائیں۔ اس میں کیا مانع ہے کہ پیغمبر ﷺ کی پر اقدس اور منسوب چیزیں اس طرح کی چیزوں کی مظہر ہوں، وہ بھی اللہ کی مرضی اور پیغمبر اکرم ﷺ کے لطف و کرم سے؟

اگر تنگ نظر وہابی اس زمانے میں ہوتے تو حضرت یوسفؑ کو مشرک بنا دیتے، لیکن ایسے لوگوں سے کہنا چاہیے: ''اپنے کو توڑنے والے آئینہ کا توڑنا غلط ہے''۔

۲)۔ دوسری مشکل، جو حضرت یوسفؑ کو جلد سے جلد حل کرنا تھی حضرت یعقوبؑ کے خاندان کی مشکل تھی، جو کنعان میں دیہاتی زندگی گذار رہے تھے جب کہ خشک سالی اور مہنگائی بھی چھائی ہوئی تھی، یہ مشکل اسی طرح حل ہو سکتی تھی کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں سے کہیں کہ سب کے سب کنعان سے مصر منتقل ہو جائیں، جیسا کہ فرماتے ہیں: (یوسف۔93)

اس ملاقات کے مجموعی نتائج یہ ہوئے کہ:

۱)۔ بھائیوں کو معاف کر دیا گیا۔

۲)۔ باپ کی بینائی واپس آنے کے بارے میں طریق کار اختیار کیا گیا۔

۳)۔ بھائیوں کو حکم ہوا کہ حضرت یعقوبؑ کے خاندان کو مصر منتقل کریں۔

اس طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کو کوچ کا حکم صادر ہوا۔ انہوں نے اپنے اونٹوں پر غلہ لادا اور کنعان کی طرف روانہ ہوئے۔

یعقوب علیہ السّلام کے غم کا اختتام

جب قافلہ مصر سے حرکت کرتا ہے تو مصیبت زدہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ کے وصال کی پیشن گوئی کرتے ہیں۔اس سلسلہ کی آیات یہ ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ

إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ (یوسف۔۹۴ تا ۹۶)

آیات کا ترجمہ:

۹۴)۔جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو ان کے پدر بزرگوار نے کہا کہ میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں اگر تم لوگ مجھے سٹھیایا ہوا نہ کہو۔

۹۵)۔ان لوگوں نے کہا (جو حضرت یعقوبؑ کے پاس تھے) خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنی پرانی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔(آپ کو خیال ہے کہ یوسفؑ ابھی زندہ ہے حالانکہ یوسف کہاں اور زندگی کہاں)

۹۶)۔اس کے بعد جب بشیر نے آ کر قمیص کو یعقوبؑ کے چہرہ پر ڈالا تو وہ دوبارہ صاحب بصیرت ہو گئے۔پھر انہوں نے کہا: کیا میں تم سے نہ کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو؟

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یعقوبؑ کے تمام بیٹوں کے مصر چلے جانے کی وجہ سے ان کے خاندان میں ایک خلا واقع ہو گیا تھا۔جس کی وجہ سے ان کی بیٹیاں اور ان کی اولادیں ان کو گھیرے رہتے تھے۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹے اور ان کے ساتھ دوسرے قافلے جب مصر سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئے تو یعقوبؑ نے اپنے پاس بیٹھنے

والوں سے کہا: ''مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے''۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ

اس جملہ سے ان کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ جملہ اشارہ ہے؟ یعنی میں یوسفؑ سے ملنے کی توقع کرتا ہوں، یا واقعاً یوسفؑ کی خاص خوشبو تھی جسے وہ سونگھ رہے تھے؟ اس مورد میں یہ دیکھنا ہوگا کہ عرب اس جملے کو کہاں استعمال کرتے ہیں، کیا حقیقی معنی یا مجازی میں؟ لیکن بعید نہیں ہے کہ یہ وصال یوسفؑ کے متعلق اشارہ ہو، اور وہ علم الٰہی کے ذریعہ سمجھ گئے ہوں کہ راستہ کے درمیان یوسفؑ کا کوئی اثر ہے اور اس کے بعد وہ یوسفؑ سے ملیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت یوسفؑ کوئی خاص بو رکھتے تھے جس کی وجہ سے قمیص بھیج دینے سے حضرت یعقوبؑ ان کی بو سونگھ رہے تھے۔

اگر تفسیر میں اس طرح کے جملے دوسری زبان کے لیے علامات قرار دیں تو فارسی زبان میں اس طرح کی تعبیریں علم وہدایت کے موارد میں بہت پائی جاتی ہے اور آج بھی مسائل سیاسی میں کہتے ہیں: فلاں شخص کی سیاسی سوجھ بوجھ اچھی ہے، یا کہتے ہیں کہ ہم اس معاملہ میں خون کی بو محسوس کرتے ہیں یا کہتے ہیں فلاں کے گھر میں جب داخل ہوا تو مجھے عشق کی خوشبو آئی۔

تعجب یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ (قرآن کی زبان میں) فرماتے ہیں: ''مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے''۔ لیکن مفسرین اس کی تفسیر حضرت یوسفؑ کی قمیص کی خوشبو قرار دیتے ہیں اور ان کی قمیص کے بارے میں بہت سی تفصیلات بیان کرتے ہیں، جو روایات میں آئی ہیں۔ [1]

لیکن روایات کی صحت کی کس حد تک پائیداری پائی جاتی ہے وہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ حافظ ان روایات سے متاثر ہو کر کہتا ہے:

زمصرش بوئے پیراہن شکیدی
چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی [2]

جب مصر سے قمیص کی بو سونگھ رہے تھے تو کنعان کے کنوئیں کو کیوں نہ دیکھا؟

اگر تفسیر قرآن اور تفسیر بیان کو پیش نظر رکھیں تو آیت کو آیت سے اور لغات اور ان کے جملوں کی تفسیر عرب کے استعمالات کے لحاظ سے تفسیر کرنا ہوگی۔ اس طرح شاید یہ واقع سے قریب تر ہو، لیکن حقیقت میں یہ روایات صحیح اور قابل اعتماد راستوں سے ہم تک پہنچی ہوں تو ہم ان کو تسلیم کریں گے اور ہمیں ان کی تردید کا حق نہیں ہوگا۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۱۲ ص ۴۶۲

[2] اردو شعراء بھی اس کیفیت کو اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً مرزا غالبؔ کا شعر ہے:

نسیم مصر کو کیا پیر کنعان کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے (مترجم)

جس وقت حضرت یعقوبؑ نے یہ جملہ کہا اور حقیقت غیبی سے پردہ اٹھایا، یعنی ایسی حقیقت جسے وہ نورِ نبوت سے دیکھ رہے تھے تو ان کے گرد ایسے جاہل افراد تھے جو عالموں کو غلط سمجھتے ہیں۔لہٰذا انہوں نے فوراً ان کو غلط سمجھا اور کہا: خدا کی قسم! آپ اس وقت بھی تیس سال پہلے کی خبر دے رہے ہیں''۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ

یقیناً ضلالت سے مراد ان کی حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائی بنیامین سے دیرینہ محبت ہے جس کی وجہ سے وہ ان دونوں کو زندہ تصور کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ایک باطل و بے بنیاد بات تھی۔

فلسطین کا قافلہ دروازۂ کنعان پر پہنچ گیا، کنعانیوں نے اپنے اونٹ وہیں روک لیئے اور وہیں اتر گئے۔ان کے استقبال کے لیے کچھ لوگ گئے۔تمام گیارہ بھائی خوشی کی دنیا ساتھ لے کر حضرت یعقوبؑ کے گھر اکٹھے پہنچے اور عرض ادب کے بعد حضرت یوسفؑ کے زندہ ہونے کی خوشخبری سنا کر ان کی قمیص کو حضرت یعقوبؑ کے چہرہ پر ڈال دیا۔فوراً بیان باپ بینا ہو گیا اور بھائیوں نے بھی یوسفؑ کی عظمت وقار و صفا کو قبول کیا۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا

اس وقت نہ صرف حضرت یعقوبؑ کی زندگی روشن ہوگئی بلکہ خاندان کے تمام لوگ خوشی و مسرت محسوس کرنے لگے۔حضرت یعقوبؑ جو پیغمبر خدا تھے الطاف خداوندی کا ذکر کرنے لگے، بیٹوں کو وعظ و نصیحت کی، ان سے جو باپ کو غلط فہمی میں سمجھتے تھے، خطاب فرمایا اور کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے؟ یعنی قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ حضرت یعقوبؑ نے پہلے بھی یہ بات اپنے بیٹوں سے کہی تھی جہاں اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں: قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (یوسف۔86)

شاید حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں نے پوری زندگی میں آج سے بہتر اور خوشحال دن نہیں دیکھا تھا۔لیکن یہ واقعہ ابھی آدھا ہی ہے، آخری منزل تک نہیں پہنچا۔اس میں ابھی دو موضوع باقی ہیں۔

۱)۔یعقوبؑ کی طرف سے مجرموں کی معافی۔

۲)۔مصر کو روانگی اور وہاں پر سکونت

جدائی کا اختتام

موضوع سے متعلق آیات

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ۝۹۷

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۝۹۸

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ۝۹۹

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۝۱۰۰

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝۱۰۱

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ۝۱۰۲ (یوسف۔۹۷ تا ۱۰۲)

آیات کا ترجمہ:

۹۷)۔ان لوگوں نے کہا: ابا جان! آپ ہمارے گناہوں کے لیے استغفار فرمائیں، ہم یقیناً خطا کار رہیں۔

۹۸)۔انہوں نے فرمایا: میں عنقریب تمہارے حق میں اپنے پروردگار سے استغفار کروں گا وہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

۹۹)۔اس کے بعد جب سب لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے والدین کو پہلو میں جگہ دی اور کہا کہ آپ لوگ مصر میں انشاء اللہ بڑے اطمینان وسکون سے رہیں۔

۱۰۰)۔انہوں نے (والدین کو) بلند مقام تخت پر جگہ دی اور سب لوگ یوسفؑ کے سامنے سجدہ میں گر پڑے۔ اس وقت یوسفؑ نے کہا: ''باباجان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جسے میرے پروردگار نے سچ کر دکھایا ہے۔اس نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے قید خانہ سے نکال کر آپ کو صحراء سے مصر میں لایا جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد پیدا کر چکا تھا، بے شک میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی بہترین تدبیر کرنے والا اور صاحب علم وحکمت ہے۔

۱۰۱)۔میرے پروردگار تو نے مجھے ملک بھی عطا فرمایا اور خوابوں کی تعبیر کا علم بھی دیا۔تو ہی زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا اور دنیا وآخرت میں میرا ولی وسرپرست ہے۔مجھے دنیا سے باایمان اٹھانا اور صالحین سے ملحق فرمانا۔

۱۰۲)۔(اے پیغمبر!) یہ سب غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم وحی کے ذریعہ آپ تک پہنچا رہے ہیں،ورنہ آپ اس وقت برادران یوسفؑ کے پاس نہ تھے جب وہ اپنی سازش پر اتفاق کر رہے تھے اور یوسفؑ کے بارے میں بری تدبیریں بنا رہے تھے۔

آیات کی موضوعاتی تفسیر

حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر سے خوشخبری لے کر کنعان پہنچے۔یوسفؑ کے حکم پر عمل کیا اور ان کے باپ کی بینائی پلٹ آئی۔پورے گھر میں خوشحالی پھیل گئی اور آہستہ آہستہ مصر کے سفر کے مقدمات فراہم ہو گئے۔لیکن ایک بات حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کو رنج میں مبتلا کر رہی تھی۔وہ یہ کہ ان کے والد بزرگوار کی یہ تمام پریشانی وسختی ان ہی کی وجہ سے وجود میں آئی تھی کیونکہ حضرت یوسفؑ کی دربدری اور زندان کا باعث یہی لوگ تھے۔وہ جلد سے جلد اپنے گناہ کا بوجھ کم کرنا چاہتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ حضرت یعقوبؑ اپنے حق سے درگذر فرمائیں اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادے۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹے پیشہ ور مجرم نہیں تھے کہ گناہ سے انہیں مسرت حاصل ہوتی اور کبھی اصلاح کی فکر نہ کرتے۔وہ پیغمبر کے بیٹے تھے،نبوت ورسالت کے سائے میں زندگی گذار رہے تھے،صرف ایک مرتبہ گناہ سے دوچار ہوئے تھے اور شیطان نے ان کے درمیان فتنہ پیدا کیا تھا۔لہٰذا دیر یا سویر خواب غفلت سے بیدار ہو گئے اور خدا کی طرف لوٹے۔انسان مومن تنہا صرف وہی ہی ہے جو ہمیشہ پاک و پاکیزہ رہے،کیونکہ ایسے پاک لوگوں کا نمونہ بہت کم ہے،ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔اچھا انسان وہ ہی ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور احکام

الٰہی سے باہر نہ جائے۔ اگر کبھی شیطان اسے بہکا دے تو فوراً بیدار ہوجائے اور خدا کی طرف پلٹ آئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ (اعراف۔201)

پرہیزگار افراد جب وسوسۂ شیطانی میں گرفتار ہوتے ہیں (تو اللہ تعالٰی کی طرف سے سزا کو یاد کرتے ہیں) واپس پلٹ آتے ہیں اور بینا ہوجاتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ہر چند دیر سے بیدار ہوئے لیکن انہوں نے پھر پوری زندگی اسی بیداری میں گذاری۔ اسی وجہ سے جب وہ حضرت یوسفؑ کو پہچان گئے تو ان سے معافی مانگی اور کہا: اِنۡ کُنَّا لَخٰطِئِیۡنَ حضرت یوسفؑ نے بھی انہیں معاف کر دیا اور فرمایا یَغۡفِرُ اللّٰهُ لَکُمۡ اب وہ وقت آن پہنچا تھا جب حضرت یعقوبؑ کے بیٹے نئی زندگی اختیار کریں اور مغفرتِ پروردگار کو شامل حال کریں۔ یہ نیا سبب ان کے پدر بزرگوار کی دعا سے ہوا کہ خدا ان کو اپنے مخلص وصالح بندوں میں شامل فرمائے۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے دو حق پائمال کئے تھے۔ ایک حق اللہ اور دوسرا حق الناس۔

ان لوگوں نے اللہ کے حکم کی مخالفت کی اور حق اللہ کو نظر انداز کیا انہوں نے ماں باپ کو تکلیف پہنچائی تھی اور یوسفؑ کو در بدر کیا تھا۔ اس طرح انہوں نے حق الناس کو پائمال کیا تھا۔ لہٰذا گناہ سے مکمل پاکیزگی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب دونوں حقوق کا ازالہ ہوجائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی بندہ صالح سے متوسل ہوں کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں مغفرت کے لیے دعا کرے۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہوں۔ اس راستے سے خدا کی رضا بھی حاصل کریں اور خدا ان کے گناہوں سے درگذر بھی فرمائے۔ لہٰذا انہوں نے باپ سے عرض کیا: قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا کُنَّا خٰطِئِیۡنَ۔ باپ کی مہربانی و بزرگی ملاحظہ فرمائیں کہ وہ فوراً جواب دیتے ہیں: قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَکُمۡ رَبِّیۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ

یہاں حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ایک انسان صالح سے متوسل ہوتے ہیں کہ وہ ان کے حق میں دعا کرے اور یہ ایک اچھا طریقہ ہے کہ بزرگوں سے توسل کیا جائے۔ صحیح ہے کہ یہاں توسل زندہ آدمی سے ہے اور وہ بھی اس کی دعا کا توسل لیکن توجہ کرنا چاہیے کہ دعا سے توسل کرنا درحقیقت ان شخصیتوں ہی سے توسل ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنے اندر طہارت کا احساس نہیں کرتا اس وقت تک ہرگز دعا قبول نہیں ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمام موقعوں پر جب بھی انسان دعا کے لیے کسی صالح شخص سے متوسل ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ پہلے اس کی شخصیت سے توسل کرے۔ اس راستے سے دعا چاہنے والے اس سے فیض پاتے ہیں۔

تنگ نظر لوگ جو ہر قسم کے توسل کو ممنوع قرار دیتے ہیں، اس آیت کے مقابلہ میں یا اور دیگر آیتیں جیسے سورۃ منافقین (آیت 5) میں آیا ہے جو صریحی طور سے حکم دیتی ہے کہ پیغمبر کے پاس جاؤ اور ان سے دعائے مغفرت طلب کرو، وہ لوگ اس مغالطہ کا شکار ہوتے ہیں کہ صرف زندہ آدمی ہی، وہ بھی برادرِ مومن سے توسل جائز ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کرنا جائز نہیں بلکہ یہ شرک ہے۔ یہ کوتاہ نظر لوگ سوچتے ہیں کہ توسل میں دعا مؤثر ہے، نہ کہ داعی کی طہارت و پاکیزگی جب کہ انسان اپنے سامنے والے شخص میں قرب معنوی وطہارت نفسانی کا احساس نہیں کرے گا تو اس سے دعا کی درخواست کے ذریعہ ہی اس کی ذات اور اس کی دعا سے بھی متوسل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر زندہ آدمی سے دعا کے لیے توسل کرنا شرک نہیں ہے تو دعا کے اولیاء الٰہی جو دنیا سے جا چکے ہیں، ان سے بھی توسل

شرک نہیں ہوگا کیونکہ اولاً وہ قرآن کی رو سے حیات برزخی رکھتے ہیں اور ہمارے اوران کے درمیان رابطہ برقرار ہے۔ ثانیاً اگر فرض کرلیں کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ حیات برزخی بھی نہیں رکھتے تو اس طرح کا توسل لغو ہوگا نہ کہ شرک، کیونکہ دعا پر قادر رہونا یا عاجز ہونا دعا پر اثر یا عام اثر کا باعث ہوسکتا ہے نہ کہ توحید وشرک کی حد پر اثر انداز ہوگا۔ ہم نے اپنی کتاب [۱] میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

مصر کی طرف سفر

حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کے لیے دعا کی اوران کے لیے خدا سے طلب مغفرت کی۔ اس طرح ان کے دکھی دل کو آرام پہنچا۔ لیکن اب یہ چاہیے تھا کہ سب گھر والے اس جنگلی زندگی کو چھوڑ کر مصر کے لیے کوچ کریں۔ ایک بزرگ خاندان کا گھر چھوڑنا جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہوں اور تقریباً دوسو سال سے وہاں رہ رہے ہوں، آسان کام نہیں تھا۔

تاریخ کہتی ہے کہ جس دن خاندان یعقوبؑ کنعان سے مصر کے لیے روانہ ہوا تو وہ سب 73 افراد تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غلطی ہوئی ہے کیونکہ اتنے بڑے خاندان کے اس مدت میں اس سے زیادہ لوگ ہوسکتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ صرف حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ امکان غالب یہ ہے کہ یہ سب 73 افراد حضرت یعقوبؑ ہی کی نسل سے تھے جو سب کے سب مصر کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ جاننا بھی غلط نہ ہوگا کہ جس دن حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے اور اپنے وطن کی طرف واپس ہوئے تو ان کے ہمراہ چھ ہزار پانچ سو سے اوپر افراد تھے۔ [۲]

لازمی طور پر یہ خاندان پڑوسیوں کی اطلاع کے بغیر آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس حرکت سے وہاں پر بہت جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ آخر کار یہ قافلہ مصر کے راستے میں پہنچ ہی گیا اور کسی شخص کو پہلے ہی مصر بھیج دیا گیا کہ والدین کے آنے کی اطلاع حضرت یوسفؑ کو پہنچا دے تا کہ وہ ملک میں ان کے داخل ہونے کا دن مقرر کر دیں۔

حضرت یوسفؑ ایسے عظیم شخص جو جمال وکمال کے مظہر اور مہر ومحبت سے بھرپور باپ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے اور ایسی جگہ پہنچے جہاں سے اپنے والدین کا استقبال کریں۔ وہ تیس سال کے قریب ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم رہے تھے۔ لہٰذا ان کے گلے سے لپٹ گئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ۔ صحیح یہ ہے کہ "اوی الیه" کے معنی اپنے پاس جگہ دینا ہے، لیکن قرینہ بتاتا ہے کہ "ادخلوا مصرًا" یہ ملاقات شہر کے باہر ہوئی اور اٹھنے بیٹھنے کی بات استقبال میں کہیں بیان نہیں کی گئی۔ اس لیے اس جملہ سے یہی گلے لگنے، اور ایک دوسرے سے پلٹ جانے کا پتہ چلتا ہے، یعنی پدر بزرگوار کے چہرہ پر اپنا چہرہ رکھ کر خوب روئے اور بعد میں اطمینان دلانے کے لیے کہا کہ آپ کو یہاں زندگی نہیں گذارنی ہے، بلکہ مصر کی طرف ہی لوٹنا ہے اور خدا کے فضل سے آپ وہاں ہر قسم کے فکر سے آزاد رہیں گے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وقال ادخلوا مصرًا (یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلی ملاقات شہر سے باہر ہوئی تھی اور

[۱] التوحید والشرک فی القرآن الکریم

[۲] مجمع البیان۔ ج ۳ ص ۲۶۴

حضرت یوسفؑ والدین کے استقبال کے لیے وہاں آئے تھے)۔اس کے بعد کہا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے چاہا تو آپ امن وامان میں رہیں گے۔

حضرت یوسفؑ قوت وطاقت کی بلندیوں پر ہیں لیکن کسی وقت بھی اس اقتدار نے انہیں یادِ خدا سے غافل نہ رکھا، یہاں بھی اپنے والدین کو مصر میں مطمئن زندگی گذارنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔تو اللہ کی مرضی کو سامنے رکھتے ہیں۔یہ شیوۂ انبیاء ہے کہ تاثیر سبب کو مشیت الٰہی کی طرف سے جانتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ اپنے والدین اور کنعانی قافلہ، وزراء وملازمین کے ساتھ جو آپ کے رکاب میں تھے، بتدریج شہر میں داخل ہوئے ، پھر دربار کی طرف روانہ ہوئے، یعنی ایک لمحہ کے لیے اپنے والدین سے جدا ہوگئے یا کسی دوسرے دروازے سے اپنے دربار میں پہنچ کر تختِ حکومت پر بیٹھ گئے۔اس وقت کارندوں نے پردہ ہٹایا۔والدین باقی بھائیوں کے ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔حضرت یوسفؑ نے والدین کے ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے تخت پر اپنے پاس بٹھالیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:(یوسف۔100)اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے والدین کو ساتھ لے کر تخت پر بیٹھے، ان کے ہاتھوں کو سہارا دے کر اوپر لے گئے اور انہیں تخت پر بیٹھنے میں مدد کی۔

اس سے بڑھ کر احترام کی کوئی صورت نہیں کہ والدین اور بھائیوں کے استقبال کے لیے ملک کا والی خود شہر سے باہر آئے، انہیں گلے لگائے، پھر ان کے ساتھ شہر میں وارد ہو، ایک ساتھ سب دربار میں داخل ہوں اور والدین کو اپنے تختِ حکومت پر بٹھائے۔حضرت یوسفؑ کے بارے میں سردمہری کی روایات کہ حضرت یوسفؑ اپنے ماں باپ سے تکبر سے پیش آئے، گھوڑے سے نہ اترے جس کی وجہ سے نورِ نبوت ان کی انگلیوں کے درمیان سے نکل گیا۔اس آیت سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی۔[1]

یہ باتیں بھی ملتی ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے آخر وقت تک فرائض الٰہی کو انجام دیا، اسی لیے ان کے والدین اور تمام بھائی بے اختیار عظمت یوسفؑ کے سامنے سجدہ میں گر پڑے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:(یوسف۔100) یہ سجدہ جیسا کہ لفظ''لہ'' سے ظاہر ہوتا ہے خود حضرت یوسفؑ کے لیے تھا نہ کہ خدا کے لیے اور حضرت یوسفؑ ہی ''مسجودلہٗ'' تھے نہ کہ قبلہ۔جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا سجدہ خدا کے لیے تھا اور یہ سجدۂ شکر تھا۔ان لوگوں نے لفظ''لہ'' کو نہیں سمجھا۔بعض لوگ جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو یہاں قبلہ فرض کیا ہے۔[2]

شاید یہ تصور کیا ہے کہ اگر سجدہ یوسفؑ کے لیے ہوگا تو شرک ہوجائے گا، جب کہ سجدۂ عبدیت خضوع کے علاوہ کچھ نہیں اور ہر خضوع عبادت و پرستش''مخضوع لہ'' کے لیے شمار نہیں ہوتا۔عبادت کی اساس نیت پر ہوتی ہے جو خاضع کے دل میں ہوتی ہے۔اگر کوئی شخص کسی

---

[1] مجمع البیان۔ج ۳ ص ۲۶۴۔جس سردمہری کی نسبت حضرت یوسفؑ سے دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد بزرگوار سے ملاقات کے وقت گھوڑے سے نہ اترے تو جبرئیل نے آکر ان سے کہا: اس فریضہ کو ترک کرنے کی وجہ سے آپ کے بیٹوں میں کوئی مبعوث بہ نبوت نہ ہوگا۔اور نورِ نبوت ان کی انگلیوں سے نکل گیا، حالانکہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ

[2] المیزان۔ج ۱۱ ص ۲۵۲

کے سامنے اس نیت سے سجدہ کرے کہ الوہیت یا ربوبیت یا اس کا کچھ حصہ اس کی قدرت میں ہے تو یہ خضوع شرک ہوگا لیکن کہیں بھی اس نیت سے ہٹ کر اگر خضوع پایا جائے تو وہ شرک نہیں ہوگا، بلکہ اس کے عظمت وجلالت کا احترام اسی حالت میں ظاہر ہوسکتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی صورت احترام نہیں۔حضرت یوسفؑ کے ماں باپ کا سجدہ اسی قسم کا تھا جس وقت والدین نے اپنے بیٹے (یوسفؑ) کو تخت حکومت پر جلوہ افروز دیکھا تو اس کی عظمت وجلالت (جو الٰہی عظمت کا پرتو ہے) نے ان کو تعظیم وتکریم کے لیے مجبور کیا۔

حقیقت میں ان گیارہ افراد کا سجدہ حضرت یوسفؑ کے خواب کی تعبیر تھا۔حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا تھا کہ چاند، سورج اور گیارہ ستارے ان کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں تو چاند سورج سے والدین اور گیارہ ستاروں سی مثال بھائیوں سے دی گئی ہے۔اسی وجہ سے اس منظر کو دیکھنے کے بعد حضرت یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار سے کہا: يَٰٓأَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُءْيَٰىَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا یعنی یہ خواب اس وقت اپنی تعبیر کو پہنچا ہے۔

اب وہ وقت آن پہنچا جب حضرت یوسفؑ اس نشست یا بعد میں کسی وقت اپنے ساتھ گذرے ہوئے واقعہ کو بیان کریں۔پہلی چیز جو زبان پر آئی وہ خدا کی بیکراں نعمات کا ذکر ہے کہ کہتے ہیں: قد احسن بی۔یعنی (خدا نے ہمارے حق میں بہتری فرمائی)۔

ان بھلائیوں (نیکیوں) میں سے حضرت یوسفؑ دو چیزیں یاد دلاتے ہیں، جو ابھی تک انہوں نے بھائیوں سے بھی نہ کہی تھیں:

۱۔'إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ' یعنی مجھے زندان سے نکالا۔شاید یہ پہلی بار ہے جب حضرت یوسفؑ نے اپنا واقعہ بیان کیا، یہاں تک کہ پہلے سفر میں اپنے بھائی سے بھی اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا تھا۔

۲۔''وَجَآءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ'' یعنی تم لوگوں کو جنگل سے یہاں لے آیا۔تم لوگوں کی دیہاتی زندگی سے نجات دلا کر ایسی عیش و عشرت کی جگہ لے آیا۔یہ تمام باتیں اسی 'قَدْ أَحْسَنَ بِي'' کا حصہ ہیں۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ تمام جدائی و دوری کے سبب ہمارے بھائی تھے جو شیطان کے قبضہ میں آگئے تھے اور شیطان نے ہم لوگوں میں فتنہ وفساد برپا کیا جیسا کہ فرماتے ہیں: مِنۢ بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَٰنُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِيٓ

آخر میں اللہ کو یاد کرتے اور کہتے ہیں کہ شیطان کا فتنہ آخر کار ہمارے فائدہ پر تمام ہوا، یہ خدا کا لطف وکرم ہے کہ ہماری پریشانیوں کے بدلہ میں ہمیں آرام بخشا۔حقیقت میں (عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد) اگر خدا چاہے تو دشمن بھلائی کا سبب بن جاتا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں: إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَآءُ

اس وقت صفات الٰہی یعنی 'عَلِيمُ الْحَكِيمُ'' کو یاد دلاتے ہیں: إِنَّهُۥ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ اتفاق سے خود حضرت یعقوبؑ نے بھی اپنے واقعہ میں اس لفظ کا دو مرتبہ سہارا لیا تھا۔ایک حضرت یوسفؑ کے واقعہ کی ابتداء میں جب حضرت یوسفؑ نے اپنا خواب حضرت یعقوبؑ سے بیان کیا تھا۔(یوسف۔6)۔اور دوسرے جب حضرت یوسفؑ کے تمام بھائی بغیر بنیامین کے کنعان واپس پہنچے تھے (یوسف۔83)۔

یہاں حضرت یوسفؑ کا اسرار آمیز اور سبق آموز واقعہ اختتام کو پہنچتا ہے۔غم کے ایام گذر گئے۔خاندان یعقوبؑ نے اپنی پرانی زندگی

کے نشیب وفراز چھوڑ کرنئی زندگی کا آغاز کیا، ان حالات میں یہاں حضرت یوسفؑ شکر خدا ادا فرماتے ہیں اور اللہ کی دو نعمتوں کو یاد دلاتے ہیں:

قدرت اور حکومت: رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ

تعبیر خواب کا ملکہ: وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

اس وقت توحید پروردگار کی طرف توجہ کرتے اور عرض کرتے ہیں: تو زمین وآسمان کا خالق دنیا وآخرت میں تو ہی میرے اختیار کا مالک ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی اگر مجھے اندھیرے کنوئیں میں ڈالا گیا، پھر مصر میں مجھے پہنچایا گیا، جب نیکی کے جرم میں مجھے زنداں میں ڈالا گیا تو میں تیری قضا وقدر پر راضی تھا اور اب بھی ہوں۔ لہٰذا آج بھی جو تخت حکومت پر بیٹھا ہوں وہ خدمت خلق کے لیے ہوں۔ پھر بھی تیرا ہی لطف ہے۔

خداوندا! تجھ سے دو چیزیں چاہتا ہوں:

حسن عاقبت، یعنی ایمان کے ساتھ موت۔

نیک وصالح افراد کے ساتھ زندگی جو ہمیشہ ہمیشہ سعادت کے ساتھ ہمکنار ہوں۔ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ

یہاں پر ابتداء سے انتہاء تک قرآن کی زبان میں واقعہ یوسفؑ اختتام کو پہنچا۔

لیکن قرآن مجید پیغمبر اکرم ﷺ کو یہاں ایک بات یاد دلاتا ہے، وہ یہ کہ اے رسول گرامیؐ جو کچھ بھی اس سورۃ میں آپ کو وحی کی گئی ہے، وہ غیبی خبریں ہیں، آپ ان باتوں سے واقف نہ تھے۔ آپؐ نے انہیں صرف مکتب وحی سے سیکھا ہے کیونکہ آپ اس وقت ان کے ہمراہ نہ تھے کہ واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ

جملہ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ اس بات پر گواہ ہے کہ آپ نے اسے مکتب وحی سے سیکھا ہے کیونکہ آپؐ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے ساتھ تو نہیں تھے کہ ان کے مکر وفریب سے آگاہ ہوتے۔ انہوں نے اس واقعہ کو توریت سے نہیں لیا ہے، اس کی دو دلیلیں ہیں:

ا)۔ آپ ایک فرد امی تھے اور آپؐ نے کسی سے درس نہیں لیا تھا۔

۲)۔ دونوں کے نقل میں بہت فرق، جو اس بات پر سب سے بڑا گواہ ہے۔

توریت میں جو نکاتِ ضعیف نقل ہوئے ہیں وہ اس بات کی علامت ہیں کہ تورات میں تحریف ہوئی ہے اور قرآن کا بیان صحیح اور مستقل ہے۔

تفسیر موضوعی

جلد بارہ

قرآن کا دائمی منشور

نگارش

آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

ترجمہ

مولانا قیصر عباس

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ

انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے وہ برگزیدہ بندے ہیں جو پیغام الٰہی کو بندوں تک پہنچانے کے لیے خلق ہوئے۔ یہ حضرات ہدایتِ انسانی کی خاطر دو راستے اختیار کرتے ہیں۔

ا۔ انسانی فطرت کے تمایلات کی رہنمائی

فطرت کی رہنمائی کے ذریعہ انسان کچھ اصولوں سے اپنے آپ کو روشناس کرتا ہے لیکن مختلف عوامل کی وجہ سے یا تو وہ اصول طاقِ نسیان کے سپرد ہوجاتے ہیں یا پھر بے توجہی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس وقت انبیاء وہ کامل رہبر ہوتے ہیں جو اپنے دلکش و دلنشین ارشادات کے ذریعہ ان اصولوں سے فراموشی کے حجاب ہٹا کر فطرت کے چہرہ کو ہر قسم کے گرد و غبار سے صاف کردیتے ہیں۔

حضرت امیر المؤمنین تبلیغ انبیاء کے اس پہلو پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

و واتر الیهم انبیاءه لیستادوهم میثاق فطرته و یذکر و هم فنسی نعمته و یحتجوا علیهم بالتبلیغ و یثیرو الهم دفائن العقول (نهج البلاغه خطبه ۱)

’’افرادِ بشر کی طرف اللہ تعالیٰ نے متواتر انبیاء بھیجے تاکہ وہ لوگوں سے اس فطری میثاق کی ادائیگی طلب کریں جو خلقت کے وقت ان سے لیا گیا تھا، انہیں اللہ تعالیٰ کی بھولی ہوئی نعمت یاد دلائیں، تبلیغ کے ذریعہ اُن پر حجت تمام کریں اور عقل کے خزانے جو ان کے اندر پوشیدہ ہیں، انہیں ظاہر کریں۔

۲۔ احکام و معارف کے اصولوں کی تعلیم

عالمِ غیب کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے افرادِ بشر کے اختیار میں احکام وعقائد کی صورت میں کچھ اصول ہیں کہ انسانوں کو انبیاء اپنی تعلیمات کے ذریعہ ان اصولوں سے روشناس کرواتے ہیں۔ اگر یہ معلمین الٰہی (انبیاء) نہ ہوتے تو بشر کے لیے اتنی جلدی ان اصولوں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کو کبھی مذکر (یاددلانے والے) اور کبھی معلم کہا گیا ہے۔

امت مسلمہ وہ پہلی امت نہیں ہے جس کی خاطر خداوند تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر آئے یا ان کے لیے کتاب نازل ہوئی ہو، بلکہ اس

کے برعکس امت مسلمہ وہ آخری امت ہے جس کی طرف پیغمبر بھیج کر یہ سلسلہ (نبوت) ختم کر دیا گیا اور اس کے بعد کسی اور شریعت کی گنجائش بالکل ختم کر دی گئی ہے۔

ان مندرجہ بالا دو اصولوں کے استحکام کے لیے انتہائی مناسب ہے کہ امتِ مسلمہ سابقہ انبیاء کے حالاتِ زندگی اور انبیاء کے مقابلے میں اُن کی امتوں کے ردِعمل سے صحیح طور پر آ گاہی حاصل کر لے، خصوصاً اس صورت میں کہ عہدِ عتیق وجدید (تورات وانجیل) کی کتابیں تحریف سے محفوظ نہ رہ سکیں اور ان میں حق کے ساتھ باطل شامل کر دیا گیا ہے۔

مسلمان اس تاریخی تسلسل میں آئے بغیر اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید سے سابقہ انبیاء کے سچے واقعات اور ان کی تلخ وشیریں حکایات لے کر انہیں اپنے لیے درسِ عبرت بنا سکتے ہیں۔ اصولی طور پر صحیح وحقیقی داستان کی خاصیت یہ ہے کہ انسان اس کے تلخ وشیریں حوادث کو جانے بغیر اس کے اندرونی نتائج سے بہرہ مند ہوسکتا ہے۔ یہی وہ اخلاقی نکتہ ہے اخلاقی معلمین اور دنیا کے معلمین جس کی طرف ہمیشہ اشارہ کرتے رہے ہیں۔

خوش تر آن باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگراں

بہتر تو یہ ہے کہ دلبروں کے رموز دوسروں کے ذکر میں کہے جائیں۔

گیارہویں جلد میں جن انبیاء علیہم السلام کے حالاتِ زندگی بیان ہو چکے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) حضرت آدمؑ (۲) حضرت ادریسؑ (۳) حضرت نوحؑ (۴) حضرت ہودؑ (۵) حضرت صالحؑ (۶) حضرت ابراہیمؑ (۷) حضرت اسمٰعیلؑ (۸) حضرت اسحٰقؑ (۹) حضرت لوطؑ (۱۰) حضرت یعقوبؑ (۱۱) حضرت یوسفؑ

اب ایسے ہی دوسرے بزرگ انبیاء الٰہی کا تزکرہ کیا جائے گا جن کی طرف قرآن مجید میں کچھ اشارات ہوئے ہیں۔ اور وہ بزرگان یہ ہیں۔

(۱) حضرت شعیبؑ (۲) حضرت موسٰیؑ (۳) حضرت داؤدؑ (۴) حضرت سلیمانؑ (۵) حضرت ایوبؑ (۶) حضرت یونسؑ (۷) حضرت زکریاؑ (۸) حضرت یحیٰیؑ (۹) حضرت عیسٰی مسیحؑ

سابقہ جلد کی طرح ان انبیاء علیہم السلام کے حالاتِ زندگی کے سلسلہ میں بھی خود قرآن، نیز بعض موارد میں روایات اور مفسرین کے اقوال پر اعتماد کیا گیا ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہماری تفسیر کا یہ حصہ حق وحقیقت کے طلب گار اور کلامِ الٰہی کی تفسیر کے آرزومند حضرات کے لیے چراغِ راہ بنے گا، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے قرآن مجید کے بقیہ موضوعات پر قلم فرسائی کی توفیق کی دعا بھی کرتے ہیں۔

مؤلف

بارہویں پیغمبر

حضرت شعیب علیہ السلام

بمقامِ مدین

انبیاء الٰہی میں سے ایک نبی جنھوں نے ظالموں سے مقابلہ و مبارزہ کیا، حضرت شعیبؑ ہیں۔ قرآنی آیات کے تناسب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قومِ لوطؑ کی تباہی و بربادی کے بعد مبعوث ہوئے اور زمانہ کے لحاظ سے انہیں حضرت لوطؑ کے بعد کا پیغمبر سمجھنا چاہیے۔ اس دلیل کی وجہ سے کہ قرآن حکیم میں متعدد موارد میں آلِ لوطؑ کی سرگذشت کے بعد حضرت شعیبؑ اور اُن کی قوم کا تذکرہ کیا گیا ہے، پتہ چلتا ہے کہ حضرت شعیبؑ قومِ لوطؑ کی تباہی کے بعد مبعوث ہوئے اور اس علاقہ میں ان دو انبیاء کے درمیان کوئی اور نبی مبعوث نہیں ہوا۔ [۱]

حضرت شعیبؑ کی بعثت کا زمانہ اور علاقہ

مدین [۲] اس علاقہ کا نام ہے جہاں حضرت شعیبؑ رہتے تھے، اگرچہ بعض کے نزدیک مدین حضرت شعیبؑ کے قبیلہ کا نام ہے اور اس بات سے کہ وہ اپنی قوم کو ہدایت کرنے کے لیے قومِ لوطؑ کی تباہی کا تذکرہ کرتے تھے پتہ چلتا ہے کہ قومِ لوط اور اُن کا زمانہ ایک دوسرے کے نزدیک ہی تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی آتا ہے:

وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ﴿٨٩﴾ (ھود: ۸۹)

یعنی ''قومِ لوط تم سے دور نہیں تھی''۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ عراق سے شام کی طرف ہجرت کی اور شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں شام جانے کا حکم ہوا ہو، لہٰذا طبیعی طور پر حضرت شعیبؑ کا وطن وہی علاقہ قرار پائے گا۔

---

[۱] سورہ اعراف ۸۵، سورہ ہود ۸۴، سورہ عنکبوت ۳۷، سورہ حجرہ ۸۷

[۲] یاقوت نے مراصد الاطلاع میں کہا ہے کہ مدین تبوک کے مقابل دریائی میڈیٹرین کے ساحل پر واقع تھا۔ ان دونوں کے درمیان چھ منزل کا فاصلہ تھا اور ان دونوں سے مصر ۸ دن کی مسافت پر واقع تھا۔ درحقیقت یہ شہر حجاز کے شمال اور شام کے جنوب میں واقع تھا۔ بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ مدین ان لوگوں کو کہتے ہیں جو خلیج عقبہ سے کوہِ سینا تک کے علاقہ میں رہتے تھے اور تورات میں اس علاقہ کو مدیان کہا گیا ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ حضرت شعیبؑ پانچ عرب انبیاء میں سے ایک ہیں جب کہ باقی چار حضرت صالحؑ، حضرت ہود، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت پیغمبر ختمی مرتبت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں حضرت شعیبؑ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ خوفِ خدا رکھتے تھے۔ (بحار، ج ۱۲، ص ۳۸۵)

قومِ شعیب کے بارے میں جو آیات وارد ہوئی ہیں اُن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں دو قسم کی برائیاں پائی جاتی تھیں، ایک خدا پرستی کی بجائے بت پرستی اور دوسری ناپ تول میں کمی۔

قرآن اس قوم کو کبھی اصحاب الایکہ کے نام سے بھی ذکر فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ۝ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝ (حجر: ۷۸،۷۹)

''اگر چہ اصحاب الایکہ ظالم تھے، ہم نے اُن سے انتقام لے لیا اور یہ لوگ قومِ لوطؑ کے ساتھ آپ کی طرف شام کے راستے پر ہیں''

اس آیت میں کسی حد تک قومِ شعیب کے علاقہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اور وہ یہ کہ جب عرب شام کی طرف سفر کرتے ہیں تو اُن کے راستے میں قومِ شعیب کا علاقہ پڑتا ہے۔

''اَیکہ'' پتوں اور ٹہنیوں سے لدے ہوئے درختوں کو کہتے ہیں جن کی شاخیں ایک دوسرے میں پیوستہ ہوتی ہیں۔ یہ لوگ جس سر زمین پر رہتے تھے وہاں اس قسم کے درختوں کی بہتات تھی اور جس دن یہ قوم ہلاک ہوئی۔ قرآن نے اس دن کو ''یوم الظلۃ'' فرمایا ہے جس کی تفسیر بعد میں ذکر ہوگی۔

یہاں تک ہمیں قومِ شعیب کی سرزمین، اُن کے ماحول اور اُن کی روحانی مشکلات سے شناسائی ہوگئی۔ اب ہم اس عظیم پیغمبرؑ کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

حضرت شعیبؑ کی خصوصیات

حضرت شعیبؑ نے اپنے آپ کو "رسول امین" انی لکم رسول امین (شعراء/ ۱۸۷) ''مصلح'' ان ارید الاالاصلاح ما استطعت (ہود: ۸۸) اور صالح کہا ہے: ستجدنی ان شاء اللہ من الصلحین (قصص: ۲۷) قرآن مجید نے بھی ان کے ان اوصاف کو بیان کرنے کے بعد ان کی تصدیق فرمائی ہے (کیونکہ بعید نہیں ہے کہ شعیبؑ حضرت موسیٰؑ کے سسر ہوں جو ان حضرت شعیبؑ کے علاوی ہوں جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں۔ ہم حضرت موسیٰؑ کے حالات کے ضمن میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔ لہٰذا یہ وہ حضرت شعیبؑ ہو سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ جن کے ہاں تقریباً دس سال تک کام کرتے رہے اور پھران کے داماد

ٹھہرے۔ سورہ قصص: ۲۷)

آئندہ صفحات میں اس پیغمبر خدا کی زندگی کے درج ذیل پہلوؤں کا تذکرہ ہوگا۔

۱۔ وہ مطالب جن کی دعوت دی۔

۲۔ تبلیغ کا طریقہ کار

۳۔ قوم کا ردِعمل اور حضرت شعیبؑ کے جوابات

۴۔ عذابِ الٰہی کا نزول

(۱) دعوتِ شعیبؑ کے مختلف پہلو

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا
النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸۵﴾ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ
عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ (الاعراف: ۸۵، ۸۶)

۲۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَیْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْۤ اَخَافُ
عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ﴿۸۴﴾ وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ
بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ
مُفْسِدِیْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ۬ وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ
بِحَفِیْظٍ ﴿۸۶﴾ (هود: ۸۴، ۸۵، ۸۶)

۳۔ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾
اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ
اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَیْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ
الْمُخْسِرِیْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ﴿۱۸۲﴾
وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا

الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الۡجِبِلَّۃَ الۡاَوَّلِیۡنَ﴿۱۸۴﴾ (شعراء: ۱۷۶ تا ۱۸۴)

۴۔ وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ ارۡجُوا الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۳۶﴾ (العنکبوت: ۳۶)

آیات کا ترجمہ ا۔ مدین کی طرف اُن کے بھائی [۱] شعیبؑ کو بھیجا۔ شعیبؑ نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے رب کی طرف سے تم پر دلیل و برہان آ چکی ہے۔ پیمانہ و ترازو متوازن رکھو۔ لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو۔ زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔ اگر تم مومن ہو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ راستوں پر مت بیٹھو کہ اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ڈراؤ یا ان کا راستہ بند کردو (یعنی انہیں اللہ کے راستے پر نہ چلنے دو) یا انہیں اس سے منحرف کرو۔

۲۔ اہل مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ میں تمہیں رفاہ و بہتری میں دیکھ رہا ہوں اور تمہارے لیے اس دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں جو گھیر لے گا۔ اے میری قوم! ناپ تول پورا رکھو، لوگوں کو چیزیں دیتے ہوئے کمی نہ کرو اور زمین پر فساد برپا نہ کرو۔ جو کچھ تمہارے پاس اللہ کا عطا کردہ بچ جائے (لوگوں کا مال دینے کے بعد) وہی تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو، اور میں تمہارا محافظ نہیں ہوں۔

۳۔ سرزمین ایکہ [۲] کے رہنے والوں نے انبیاء کو جھٹلایا۔ تب شعیبؑ نے ان سے کہا: کیوں تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ میں تمہارے لیے ایک امین رسول ہوں۔ اللہ کی مخالفت سے پرہیز

---

[۱] حضرت شعیبؑ اس قوم سے تعلق نہ رکھتے تھے اور اُن کے بھائی نہ تھے۔ چونکہ ایک غم خوار و ہمدرد بھائی کی طرح تبلیغ کرتے تھے لہٰذا انہیں بھائی کہا گیا ہے۔

[۲] سابقہ صفحات میں ہم بتلا چکے ہیں کہ "ایکہ" کے معنی گھنی شاخوں اور پتوں والے درخت کے ہیں جو آپس میں گندھے ہوئے ہوں۔ اُن کی سرزمین میں ایسے درختوں کی بہتات تھی۔

کرو اور میری پیروی کرو۔ میں اپنی رسالت پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ میرے پروردگار کی طرف سے ہے ناپ تول پورا کرو، اس میں کمی نہ کرو، ٹھیک ترازو سے وزن کرو، لوگوں کی چیزیں انہیں کم نہ دو، زمین میں فساد برپا نہ کرو اور اس معبود سے ڈرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو خلق فرمایا۔

۴۔ اہل مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، آنے والے ایک دن (قیامت) کی اُمید رکھو اور زمین پر فساد برپا نہ کرو۔

آیات کی موضوعی تفسیر

سب انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ میں کچھ اصول مشترک تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کی خصوصیات کے پیش نظر بعض امور پر زیادہ زور دیتے تھے۔ سابقہ آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شعیبؑ چار چیزوں پر زیادہ زور دیتے تھے:

۱۔ توحید (یگانہ پرستی)

۲۔ معاملات میں عدل وانصاف کی دعوت

۳۔ زمین میں فساد برپا نہ کریں۔

۴۔ مومنین کے لیے راستہ بند نہ کریں۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اس قوم میں کچھ برائیاں دوسری قوموں کے ساتھ مشترک تھیں اور کچھ اُن کی مخصوص برائیاں تھیں۔ مشترک برائی تو بت پرستی ہی تھی۔ ان کی مخصوص برائیاں ناپ تول میں کمی، دوسروں کے اموال پر ہاتھ صاف کرنا اور جو لوگ حضرت شعیبؑ پر ایمان لے آئے انہیں ڈرانا دھمکانا تھا۔ اس کے علاوہ زمین پر فساد برپا کرنا بھی ان کا شیوہ تھا کہ جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

اب ہم ہر ایک برائی سے مربوط آیات کو جدا جدا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ توحید میں انحراف

يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ (اعراف: ۸۵، ھود: ۸۴)

۲۔ معاملات میں انحراف (بے ایمانی)

فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ (اعراف: ۸۵)[1]

---

[1] اس موضوع کی دیگر آیات: ہود ۸۴، ۸۵۔ شعراء: ۱۸۱ تا ۱۸۳

۳۔ روئے زمین پر فساد برپا کرنا

وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ؕ (اعراف: ۸[۱]۵)

''ہر گناہ ایک قسم کا فساد برپا کرنا ہے''

۴۔ مومنین کا راستہ روکنا

وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَتَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ۚ (اعراف: ۸[۲]۶)

''گویا وہ راستہ پر بیٹھ جاتے تھے اور جو کوئی حضرت شعیبؑ کے گھر جانا چاہتا اُسے قتل کی دھمکیاں دیتے تھے''

---

[۱] اس موضوع کی دیگر آیات: ہود ۸۵، شعراء: ۸۳

[۲] تبغونہا میں دھاء ضمیر مونث ہے جو کہ سبیل کی طرف لوٹ رہی ہے اور سبیل مونث مجاری ہے، یعنی آپ اس راستے کو کج کرنا چاہتے ہوں اور من آمن مفعول بہ ہے تصدون کے لیے، معنی ''تصدون من امن عن سبیل اللہ۔

(۲) تبلیغ کا طریقِ کار

یہاں تک ہمیں مطالبِ تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس قوم کے انحرافات سے بھی اطلاع حاصل ہوگئی۔ انبیاء کی امتوں کے حالاتِ زندگی دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شیطان کس طرح لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف راہوں سے وارد ہوتا ہے، یعنی بعض برائیوں کے عمومی ہونے کے ساتھ ساتھ شیطان ہر قوم کو اُن کے ماحول کے مطابق مخصوص برائیوں میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ حضرت شعیبؑ کی قوم بھی بت پرستی جیسی عمومی برائی کے ساتھ ساتھ فسادِ مالی اور دوسروں کے اموال پر تجاوز ولوٹ کھسوٹ جیسی قباحتوں میں مبتلا ہو چکی تھی۔

اب دیکھنا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے ان کی اصلاح کے لیے کون سی روش تبلیغ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

آیاتِ قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ کا تبلیغی انداز درج ذیل طریقوں پر مشتمل تھا:

۱۔ برہان واستدلال کے ذریعہ

۲۔ خداوند عالم کی نعمتوں کی یاددہانی

۳۔ سابقہ امتوں کی المناک سرگذشت کا تذکرہ

۴۔ عذابِ الٰہی سے ڈرانا

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ

۲۔ وَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ﴿۸۶﴾ (الاعراف: ۸۵، ۸۶)

۳۔ وَاِنۡ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنۡكُمۡ اٰمَنُوۡا بِالَّذِيۡۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا فَاصۡبِرُوۡا حَتّٰى يَحۡكُمَ اللّٰهُ بَيۡنَنَا ۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ﴿۸۷﴾ (الاعراف: ۸۷)

۴۔ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ بِخَيۡرٍ وَّاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ مُّحِيۡطٍ○ (هود: ۸۴)

۵۔ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِحَفِيۡظٍ﴿۸۶﴾ (هود: ۸۶)

۶۔ وَيٰقَوۡمِ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِىۡۤ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ

قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ (هود: ۸۹)

۷۔ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ (هود: ۹۰)

۸۔ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

(الشعراء: ۱۸۰)

آیات کا ترجمہ

۱۔ بے شک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے واضح دلیل آ چکی ہے۔

۲۔ اس وقت کو یاد رکھو جب تم تھوڑے تھے، تو اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا اور دیکھو فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟

۳۔ کیا تم میں سے ایک گروہ میری رسالت پر ایمان لے آیا اور بعض دوسرے ایمان نہ لائے (تو اس کا مجھے کوئی نقصان نہیں)۔ صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔

۴۔ میں تمہیں نعمت و ثروت میں دیکھ رہا ہوں اور بہ تحقیق میں تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (جس کی ہولناکیوں سے کوئی بچنے نہ پائے گا)

۵۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے باقی چھوڑ دے وہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم صاحبِ ایمان ہو۔ اور میں (عذاب سے) تمہارا محافظ نہیں ہوں۔

۶۔ اے میری قوم! میرے ساتھ تمہاری دشمنی موجب نہ بن جائے کہ تم اسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ جس میں قومِ نوح، قومِ ہود اور قومِ صالح (تم سے پہلے) مبتلا ہو چکی ہیں، اور قومِ لوط (کا انجام بھی) تم سے دور نہیں ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو، اس کی طرف لوٹ جاؤ (توبہ کرو) میرا پروردگار بندوں پر بڑا مہربان اور ان سے محبت کرنے والا ہے۔

۸۔ میں اس تبلیغ کے لیے تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر صرف میرا پروردگار ہی دے گا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت شعیبؑ اپنی تبلیغ میں درج ذیل مطالب سے استفادہ فرماتے تھے جن میں ہر ایک مطلب گمراہوں کی ہدایت کو کافی ہے۔

۱۔ اپنی بات کی حقانیت وسچائی پر دلیل وبرہان لانا

یہ بات سب پر روشن ہے کہ ہر نبی صاحب معجزہ ہوتا تھا۔ بعض ابتدا سے ہی معجزہ لے کر آتے تھے اور بعض لوگوں کے طلب کرنے پر معجزہ دکھاتے تھے۔ کوئی بھی ایسا پیغمبر یا نبی اللہ کی طرف سے بندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث نہیں ہوا جس کے پاس معجزہ نہ ہو۔ حضرت شعیبؑ پہلی قسم سے تھے یعنی ابتدا سے ہی معجزہ لے کر آئے تھے، لہٰذا فرمایا: قد جآء تکم بینة من ربکم فاوفوا الکیل۔ دوسرے جملے فاوفوا کو فاء کے ذریعہ پہلے جملے "قد جآء تکم بینة" پر مترتب کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شعیبؑ اس معجزہ وبرہان کے باعث لوگوں کو پابند کررہے ہیں کہ ان کے احکام کی پیروی کریں۔ یہ سوال کہ ان کا معجزہ کس نوعیت کا تھا، قرآن نے اس بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا۔ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن میں حضرت شعیبؑ کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں ہے لہٰذا حضرت شعیبؑ معجزہ نہیں رکھتے تھے، انتہائی بے سروپا بات ہے کیونکہ خود پیغمبر اسلام کے بہت سے معجزات ایسے تھے جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہوا۔[1]

ایک اور آیت میں بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ (ھود: ۸۸)

یعنی "اس (شعیبؑ) نے کہا کہ اے میری قوم! کیا تم دیکھتے نہیں (یا مجھے خبر دو) کہ میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں؟"

۲۔ نعماتِ الٰہی کی یاددہانی

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی طرف متوجہ کیا کیونکہ عقلی طور پر منعم (نعمات دینے والے) کی اطاعت وتشکر لازم ہے۔ ازاں جملہ ان انعامات کے یہ فرمایا کہ تم تعداد میں کم تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہاری آبادی بڑھا دی جس کے نتیجہ میں تم ایک قوی ومقتدر قوم بن گئے "واذکروآ اذ کنتم قلیلاً فکثر کم" کبھی نعمت کے دائرہ کو اس سے بلندتر کردیا اور یوں یاددہانی کرائی: "واتقوا

[1] مجمع البیان، ج ۲ ص ۴۴۷

الذی خلقکم و الجبلة الاولین"۔ (شعراء: ۱۸۴) یعنی اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے پرہیز کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو خلق فرمایا"

۳۔ ظالموں کے انجام کا تذکرہ

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہیں ظالموں کے انجام سے درسِ عبرت لینا چاہیے مبادا تم بھی نوحؑ و ہودؑ و صالحؑ کی قوم جیسے انجام سے دوچار ہوجاؤ، نزدیک ترین درسِ عبرت خود قوم لوطؑ کی سرگذشت ہے جو تمہارے ہمسایہ تھے اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت و عصیان کی وجہ سے ہلاک ہوگئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝۸۹ (ھود: ۸۹)

پھر دوسری جگہ فرمایا:

وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۶ (اعراف: ۸۶)

۴۔ عذاب الٰہی سے ڈرانا

اگر مندرجہ بالا طریقے ہدایت کے لیے موثر نہ ہوسکیں تو پھر طبیعی بات تہدید و دھمکانے کا طریقہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا حضرت شعیبؑ نے یہی کیا اور مومنین و کفار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "فالصبر وا حتی یحکم اللہ بیننا و ھو خیرا الحکمین (اعراف: ۸۷)

پھر دوسری آیت میں پہلی کی نسبت بڑی صراحت کے ساتھ دھمکی دی، فرمایا:

اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝۸۴ (ھود: ۸۴)

مندرجہ بالا مطالب حضرت شعیبؑ کے انداز تبلیغ کو بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی دوسرے انبیاء کی طرح وہی بات کہی کہ میں تم سے اجرِ رسالت طلب نہیں کرتا، میری توفیق صرف اللہ کی طرف سے ہے اور توکل بھی صرف خدا پر ہی کرتا ہوں، جیسا کہ ان دو آیات میں فرماتا ہے:

وَمَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۸۰

(شعراء: ۱۸۰)

اور

وَمَآ اُرِيۡدُ اَنۡ اُخَالِفَكُمۡ اِلٰى مَاۤ اَنۡهٰكُمۡ عَنۡهُ‌ؕ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ‌ؕ وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ‏ ﴿۸۸﴾ (هود: ۸۸)

یعنی ”میں ہرگز نہیں چاہتا کہ جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں اس کا خود ارتکاب کروں۔ میں سوائے اصلاح کے، جتنی کہ مجھ میں استطاعت ہے، اور کچھ نہیں چاہتا، اور میں صرف اللہ سے توفیق طلب کرتا ہوں۔ میں نے اُسی پر توکل کیا ہے اور اُسی کی طرف میری بازگشت ہے“۔

اس آیت میں جملہ ”ان ارید الا الاصلاح“ پہلے والے جملے ہی کی تشریح کر رہا ہے جس میں پہلی نظر میں اجمال سا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت نے کہا کہ میں تمہاری مخالفت نہیں کرنا چاہتا، اس بات میں کہ میں جس سے روکتا ہوں، تو، میں مقدور بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور اصلاح کی بنیادی شرط مدعی اصلاح کے کردار و گفتار میں مطابقت ہونا ہے۔

بالآخر حضرت شعیبؑ اپنی قوم کو گمراہی کے راستہ سے پلٹانے اور راہِ اصلی کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے:

وَاسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ‌ؕ اِنَّ رَبِّىۡ رَحِيۡمٌ وَّدُوۡدٌ[1] ﴿۹۰﴾ (هود: ۹۰)

[1] اگرچہ مندرجہ بالا آیات حضرت شعیبؑ کے طریقِ تبلیغ کی وضاحت کرتی ہیں تاہم ممکن ہے کہ یہی کسی قدر ان کی قوم کے اعتراضات کا جواب بھی بن جائے۔ یہ اعتراضات آگے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی آیات حضرت شعیبؑ کی قوم کے جواب میں شامل نہیں بلکہ ان سے الگ آتی ہیں جو کسی حد تک اُن کے واضح جوابات قرار پاتے ہیں۔

(۳) قوم کا ردِ عمل

دوسری اقوام کی طرح حضرت شعیبؑ کی قوم نے بھی اُن کی دعوت کی سختی سے مخالفت کی اور سوائے چند لوگوں کے کوئی بھی حضرت شعیبؑ پر ایمان نہ لایا۔ مخالفین اُن کے ساتھ مجادلہ و کج بحثی کرنے لگے، اُن کے بحث و مجادلہ کے چند دلائل تھے:

۱۔ آپ کی رسالت کے مطالب سمجھ میں آنے والے نہیں ہیں۔

۲۔ آپ کو ساحر و مجنون ہونے پر متہم کیا۔

۳۔ حضرت شعیبؑ کے بشر ہونے پر اعتراض کیا۔

۴۔ معاشرہ میں مقتدر نہ ہونے پر اعتراض

۵۔ آپ کی پیروی ہمارے لیے نقصان دہ ہے۔

۶۔ شہر بدر کرنے اور سنگساری کی دھمکیاں دیں۔

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ (الاعراف: ۸۸)

۲۔ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ (الاعراف: ۹۰)

۳۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ (ھود: ۸۷)

۴۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ (ھود: ۹۱)

۵۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ (الشعراء: ۱۸۵)

٦۔ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ (الشعرآ: ۱۸۶)

آیات کا ترجمہ

۱۔ قوم شعیبؑ کے مستکبرین کے گروہ نے کہا: ”اے شعیبؑ ہم تمہیں اور جو تم پر ایمان لائے ہیں انہیں شہر سے باہر نکال دیں گے یا تم ہماری طرف لوٹ آ ؤ۔ حضرت شعیبؑ نے جواب میں کہا: اگر چہ ہم تمہارے آئین کو ناپسند ہی کرتے ہوں۔

۲۔ قوم شعیبؑ میں جو سردار کافر تھے انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم شعیبؑ کی پیروی کرو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔

۳۔ انہوں نے کہا: اے شعیبؑ! کیا تیری عبادت (دعا و نماز) تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اس کو چھوڑ دیں جس کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے، یا ہم اپنے احوال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟ تم ہی تو بڑے بردبار و دانا ہو۔

۴۔ انہوں نے کہا اے شعیبؑ! آپ کی اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہم آپ کو اپنے میں ضعیف و ناتوان پاتے ہیں۔ اگر آپ کا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم آپ کو سنگسار کر دیتے اور آپ ہمارے اوپر کوئی قوت نہیں رکھتے۔

۵۔ آپ پر تو جادو کر دیا گیا ہے۔

٦۔ آپ ہماری طرح ہی کے بشر ہیں اور ہم آپ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

آیات کی موضوعی تفسیر

۱۔ قوم شعیب، اُن کی (شعیبؑ کی) دعوت کے مطالب کو بے معنی و مبہم خیال کرتے تھے اور کہتے تھے: يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (ہود: ۹۱) جب کہ یہ مسلم ہے کہ حضرت شعیبؑ کی دعوت انتہائی واضح و روشن تھی۔ اس سے زیادہ واضح مطالب اور کون سے ہو سکتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں: ”اس خدا کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو خلق فرمایا: وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ (شعراء ۱۸۴) یعنی ”اور اس (اللہ) سے ڈرو جس نے تمہیں خلق فرمایا اور تمہارے پہلوں کو بھی“۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ خداوندِ قادر و عالم کی عبادت کی دعوت تو مبہم ہو لیکن بے جان و حرکت اور بے حس بتوں کی عبادت کی

دعوت واضح و روشن ہو۔

۲۔ وہ سابقہ اُمتوں کی طرح بشر ہونے کو رسالتِ الٰہی کے مانع خیال کرتے تھے لہٰذا اسی لیے حضرت شعیبؑ کو جھوٹا جانتے اور کہتے تھے: وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴿۱۸۶﴾ (شعراء: ۱۸۶)

۳۔ وہ سابقہ امتوں کی طرح حضرت شعیبؑ کو جنون اور جادو زدگی سے متہم کرتے اور کہتے تھے۔ "قالوا انما انت من المسحرين" (شعراء: ۱۸۵) اور کبھی طنزاًیوں کہتے: انك لانت الحليم الرشيد (هود: ۸۷)

معاشرے میں خیال کیا جاتا ہے کہ جو انسان افکارِ عمومی کے خلاف آواز اٹھائے وہ مجنون و دیوانہ ہوتا ہے لیکن یہ لوگ خود ایسے مجنون ہیں جن کی دیوانگی کا مطلب لوگوں کی حق وحقیقت کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ اس ہدف کے تحقق کے لیے انتھک محنت کرتے ہیں اور اس راہ میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ اگر بشر ہونا رسالتِ الٰہی میں مانع ہے تو پھر بنی نوعِ انسان کو کون ہدایت کرے گا؟ کیا فرشتے جوان سے کسی طرح کی مشابہت نہیں رکھتے، ان کی ہدایت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں؟

۴۔ ان کی نظر میں کسی کا معاشرہ میں صاحبِ اقتدار ہونا اس کے حق پر ہونے اور معاشرہ میں کمزور ہونا تو ان ہونا اس کی دعوت کے ناحق ہونے کی دلیل ہے جیسا کہ وہ کہتے تھے: وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ﴿۹۱﴾ (هود: ۹۱)

یہ نرالی منطق قومِ شعیبؑ سے ہی مخصوص نہیں بلکہ فرعون بھی جب اپنے آپ کو مبارزہ میں حضرت موسیٰؑ سے مغلوب ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو یہی کہتا ہے: يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ (زخرف: ۵۱۔ ۵۲) یعنی "اے میری قوم! کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں اور یہ چشمے کیا میرے محل کے نیچے سے نہیں بہہ رہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو بلکہ میں بہتر ہوں اس شخص سے جو حقیر وضعیف ہے؟"

۵۔ چونکہ وہ معاملات میں حرام وحلال کی پروا نہیں کرتے تھے، ماپ تول میں کمی اور دوسروں کے اموال پر ہاتھ صاف کرنا ان کا شیوہ تھا، لہٰذا شعیبؑ کی پیروی کو (جو ان حرکتوں سے روکتے تھے) وہ نقصان کا موجب سمجھتے تھے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴿۹۰﴾ (اعراف: ۹۰)

۶۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کے ان ہتھکنڈوں سے شعیبؑ باز آنے والے نہیں تو انہوں نے حضرت شعیبؑ کو شہر بدر اور سنگسار کرنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور کہا: لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ (اعراف: ۸۸) نیز کہتے: وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ﴿۹۱﴾ (هود: ۹۱)

یہاں تک تو ذکر تھا قومِ شعیبؑ کے بچگانہ اعتراضات کا جن سے ہم آشنا ہوئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے مقابلہ میں حضرت شعیبؑ نے کیسے معقول جوابات دیے۔ ان دونوں دلائل کا مقابلہ کرنے سے ہم منطقِ الٰہی کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔

قوم کے اعتراضات پر حضرت شعیبؑ کے جوابات[1] کی تفصیل درج ذیل ہے:

حضرت شعیبؑ نے ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں، جنہیں قرآن نے تشریح کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، مثلاً:

قوم نے شعیبؑ کو کہا کہ بت پرستی کی طرف لوٹ آؤ، تو انہوں نے جواب دیا:

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ (اعراف: ۸۹)

''اگر ہم آپ کے آئین کی طرف لوٹ آئیں اور اُسے اللہ کا آئین قرار دیں تو یہ اللہ پر جھوٹ و افتراء ہوگا بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے نجات دی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اس آئین کی طرف لوٹ جائیں، مگر یہ کہ اللہ ایسا چاہے جو ہمارا رب ہے اور ہمارے رب کا علم وسیع ہے، ہر چیز کو شامل ہے، ہم نے اللہ پر توکل کیا ہے۔ خدایا! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما کہ تو بہترین ہے سب فیصلہ کرنے والوں سے!''

انہوں نے شعیبؑ سے کہا: ''اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے''۔ شعیبؑ نے جواب میں فرمایا:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ (هود: ۹۲)

''اے قوم! کیا میرا قبیلہ تمہیں اللہ سے زیادہ عزیز ہے، حالانکہ تم نے اللہ کے فرامین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ تحقیق میرا پروردگار تمہارے اعمال پر مکمل احاطہ رکھتا ہے''

حضرت شعیبؑ ان کے بچگانہ اعتراضات کے مقابل میں درجہ ذیل مطالب ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ تمہارے آئین کے بے اساس ہونے پر دلیل رکھنے کے باوجود اس کی پیروی کرنا بدعت اور اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے، جیسا کہ فرمایا:

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ

---

[1] چونکہ اس ضمن میں آیات زیادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم آیات وترجمہ وتفسیر اکٹھا ذکر کردیں گے جداگانہ فصل نہیں بنائیں گے۔

(اعراف: ۸۹)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اُن کے آئین کی طرف جانے کی اپنے اور اپنے پیروکاروں سے نفی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ کے مدبر تنہا ہونے پر بھی اشارہ کرتے ہیں، یعنی ہماری باگ ڈور اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ ہے، جیسا حکم اس کی طرف سے ہوگا ہم اس پر سر تسلیم خم کریں گے، چنانچہ فرمایا: يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ﴿۸۹﴾ (اعراف: ۸۹) ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ اُن کے آئین کی طرف لوٹ جائیں مگر یہ کہ ہمارا پروردگار ایسا چاہے۔ اس الا ان یشاء اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کا مکمل اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہی مقلب القلوب ہے۔ (دلوں کو پھیرنے والا ہے)۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی کسی مومن کے شرک کی طرف لوٹنے پر تب ہی ہوتی ہے جب خود وہ شخص اپنے اختیار سے ایسے عوامل پیدا کرلے جو موجب شرک ہوں۔

۲۔ بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو میرے قبیلہ کی وجہ سے سنگسار نہیں کرتے، کیا میرا قبیلہ اللہ کی نسبت تمہیں زیادہ عزیز ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے فرامین پر عمل نہیں کرتے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ (هود: ۹۲)

ان کے بعض اعتراضات کے جوابات یا تو حضرت شعیبؑ نے ان کی نامعقولیت کی وجہ سے دیئے ہی نہیں یا اگر دیئے بھی ہیں تو قرآن نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ سب جنون وجھوٹ سے متہم کرنا، دعوت کے مطالب کو مبہم کہنا اور بشر ہونے کو دعویٰ رسالت کے منافی خیال کرنا جیسے اعتراضات ہیں جن میں بعض کی طرف ہم سابقاً اشارہ کر چکے ہیں۔

(۴) عذابِ الٰہی کا نزول

حضرت شعیبؑ قوم کو عذابِ الٰہی کے نزول سے ڈراتے رہتے تھے اور لوگ بھی بعض اوقات طنز و مزاح کے طور پر عذاب کی خواہش کرتے تھے۔ جب ان کے ایمان لانے سے مکمل مایوسی ہوگئی تو عذابِ الٰہی نے سب کو فنا کر دیا سوائے اس کے کہ صرف حضرت شعیبؑ اور ان پر ایمان لانے والوں نے نجات پائی۔ اس موضوع پر آیات درج ذیل ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝۹۳ (ھود: ۹۳)

۲۔ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۸۷ (الشعرآء: ۱۸۷)

۳۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۸۹ (الشعرآء: ۱۸۹)

۴۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۱ (اعراف: ۹۱) [1]

۵۔ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۴ (ھود: ۹۴)

۶۔ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝۹۵ (ھود: ۹۵)

۷۔ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۲ (اعراف: ۹۲)

۸۔ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ

---

[1] سورۂ عنکبوت، آیہ ۳۷ بھی ایسی ہی ہے۔

فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ﴿۹۳﴾ اعراف: ۹۳)

آیات کا ترجمہ

۱۔اے قوم تم جو چاہو کرلو، میں بھی کر رہا ہوں۔عنقریب جان لو گے کہ خوار کر دینے والا عذاب کس پر نازل ہوتا ہے اور جھوٹا کون ہے! تم ہوشیار ہو جاؤ، میں بھی ہوشیار و متوجہ ہوں۔

۲۔اگر تم سچے ہو تو آسمان سے ایک ٹکڑا ہمارے اوپر گرادو۔

۳۔انہوں نے اس کو جھٹلایا۔پس انہیں (بادل کے) سائے والے دن کے عذاب نے آلیا۔اس دن کا عذاب بڑا عظیم عذاب تھا۔

۴۔انہیں زلزلہ نے آلیا۔وہ اپنے گھروں میں ہی ہلاک ہو گئے۔

۵۔جب ہمارا امر (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے شعیبؑ اور اس پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دی اور جنہوں نے ظلم کیا تھا انہیں ہولناک آواز نے آلیا۔پس وہ اپنے گھروں میں خاموشی کے ساتھ ہلاک ہو گئے۔

۶۔وہ ہلاک ہو گئے گویا وہ وہاں تھے ہی نہیں۔جان لو کہ اہل مدین رحمتِ خدا سے ایسے ہی دور ہو گئے جیسے قومِ ثمود دور ہو گئی تھی۔

۷۔جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا تھا گویا وہ اس علاقے میں تھے ہی نہیں اور جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا وہی گھاٹے میں رہے۔

۸۔اس نے اُن سے منہ پھیر لیا اور کہا: اے میری قوم! میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچا دیا اور تمہیں نصیحت کر دی۔اب میں کیسے کافروں پر افسوس کروں۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ایک شفیق ناصح جب کسی کو نصیحت کرتے کرتے تھک جائے اور اصلاحِ افراد سے مایوس ہو جائے تو وہ کہتا ہے کہ تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں، یہی حالت حضرت شعیبؑ کے بارے میں اس آیت سے سامنے آتی ہے۔جب حضرت شعیبؑ نے انہیں کہا:

وَيٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ‌ ؕ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ (ھود: ۹۳)

قوم والے اُن پر اعتراض کرتے ہوئے انہیں جھوٹا کہتے تھے۔ حضرت شعیبؑ نے اُن کے جواب میں کہا: ''آئندہ معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا کون ہے''۔

عَامِلٌ‌ ؕ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَمَنۡ هُوَ كَاذِبٌ ؕ

(ھود: ۹۳)

ایسے حالات میں قوم جری ہو جایا کرتی ہے، وہ عذاب کا تقاضا کرنے لگتی اور کہتی ہے:

فَاَسۡقِطۡ عَلَيۡنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَؕ‏ ﴿۱۸۷﴾

(شعراء: ۱۸۷)

اسی طرح اُن سے ناامیدی یقینی ہو جاتی ہے اور وہ حتمی عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تین طرح کے عذاب سے یہ قوم نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

۱۔ انتہائی ہولناک پریشان کن گرج! ''و اخذت الذین ظلموا الصیحة (ھود: ۹۴)

۲۔ شدید زلزلہ جو ظاہر ہے کہ اس ہولناک گرج کے نتیجہ میں پیدا ہوا: ''فاخذتھم الرجفة'' (اعراف: ۹۱)

۳۔ ''ظلة'' جس کے معنی سایہ دار بادل کے ہیں۔ اس بادل میں کس قسم کا عذاب تھا، آیت ہمیں اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتاتی، البتہ مفسرین کے ایک طبقہ نے اس ضمن میں کہا ہے کہ وہ بادل آگ برسا رہا تھا جس نے انہیں جلا دیا لیکن یہ احتمال بھی دیا جا سکتا ہے کہ سایہ والے دن کا مطلب وہ دن ہے جب بادل زمین پر اُتر آئے، جیسے کہر والے دن ہوتا ہے کہ کہر سطح زمین پر چھا جاتی ہے، یہ تاریکی اُن کے حواس باختہ کرنے کا موجب بنی اور اس کے بعد گرج و زلزلہ جیسے تباہ کن عذاب نازل ہوئے۔ لیکن چونکہ سابقہ اُمتوں کے عذاب کے سلسلہ میں بجلی گرنے کا تذکرہ بھی وارد ہوا ہے لہٰذا اس موقعہ کے لیے بھی جو کچھ مفسرین نے کہا ہے وہ صحت کے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ پس عذاب اس طرح آیا ہو گا کہ اس بادل کے ذریعہ بجلی چمکی جس سے مہیب گرج پیدا ہوئی اور شدید قسم کی آگ ان پر برسنے لگی۔ نیز اس گرج کے نتیجہ میں زمین میں شدید زلزلہ پیدا ہو گیا۔

ایماندار افراد اور کفار کے گروہ سے ایک جیسا سلوک نہ ہونے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے شعیبؑ اور اس پر ایمان لانے والوں کی نجات کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا شُعَيۡبًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا (ھود: ۹۴)

بالآخر حضرت شعیبؑ نے ان بے جان لاشوں کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا اور یوں خطاب فرمایا:

لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۝۹۳ (اعراف: ۹۳)

بہر کیف اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بزرگ شخصیات اسی عالم میں کسی پاک یا بد روح سے ارتباط پیدا کر سکتی ہیں اور ان سے باتیں بھی کر سکتی ہیں جیسا کہ حضرت صالحؑ کے بارے میں بھی کہا جا چکا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد ان سے باتیں کیں (اعراف: ۷۹)

نکات وعبرت

حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سرگذشت سے ہم درج ذیل نکات کا پتہ لگاتے ہیں:

۱۔ قوم شعیبؑ اگرچہ بت پرست بھی تھی لیکن حضرت شعیبؑ کی تبلیغ کا زور ان کی مالی برائیوں پر تھا کہ وہ حرام وحلال میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کے اہدافِ عالیہ میں سے ایک ہدف مالی انحراف سے مبارزہ کرنا تھا جو قیامِ عدل کا موجب ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۝۲۵ (حدید: ۲۵) یعنی ''ہم نے اپنے رسولوں کو دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب ومیزان کو بھی نازل کیا تا کہ لوگ عدل وانصاف کی بنیادوں پر زندگی گزار سکیں۔

۲۔ بعض لوگ اپنی قومی اور اجتماعی رشتہ داریوں کو الٰہی اقتدار پر اہمیت دیتے ہیں بلکہ یوں کہہ لیں کہ ان چیزوں کو اقدار شمار کرتے ہیں جو اقدار نہیں ہیں جیسا کہ حضرت شعیبؑ کی قوم نے ان سے کہا: "ولو لا رهطك لرجمنك"، تو حضرت شعیبؑ نے جواب میں کہا: "ارهطی اعز علیکم من الله"

۳۔ مصلحین الٰہی کے گفتار و کردار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور حضرت شعیبؑ نے بھی اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے: "ما ارید ان اخالفکم الی ما انهکم عنه"

تیرھویں پیغمبر

حضرت موسیٰؑ ابن عمران

(کلیم اللہ)

حضرت موسیٰؑ ان بزرگ و عظیم انبیاء خدا میں سے ہے جن کا نام نامی حضرت ابراہیمؑ کے بعد تاریخِ نبوت میں سلسلۂ انبیاء کی بنیادی کڑی کے طور پر جگمگا تا نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی ولادت سے وفات تک مسلسل مشکلات و حوادث اور تلخیوں سے معمور رہی۔ مردانِ حق کی تاریخ مبارزہ و جہاد میں ظلم و ستم اور قوم پرستی کے خلاف جہاد و مبارزہ اور توحید و یگانہ پرستی کی تجلی کے مظہر کے طور پر حضرت موسیٰ کو تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کرسکتی۔ قرآن مجید میں جس کثرت سے حضرت موسیٰ کی زحمات و مبارزات کا تزکرہ ہوا ہے۔ شاید ہی کسی نبی کا ہوا ہو۔ لہٰذا اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت موسیٰ کا نام قرآن مجید میں ۱۳٦ بار اور ان کی سرگذشت بطورِ اجمال یا تفصیلاً ۳۴ بار آئی ہے۔

حضرت موسیٰ انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل قرآن کی اصطلاح میں بارہ اسباط کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ جو یہ ہیں:

(۱) بنی روبین (۲) بنی شمعون (۳) بنی جار (۴) بنی یہودا (۵) بنی یسا کار (٦) بنی زبولون (۷) بنی یوسفؑ (۸) بنی بنیامین (۹) بنی عشیر (۱۰) بنی دان (۱۱) بنی تفتالی اور (۱۲) بنی لاویان۔ ان میں ہر قبیلہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کے نام پر ہے۔

حضرت یوسفؑ کی حکومت کے دور میں حضرت یعقوبؑ اپنے گیارہ بیٹوں کے ہمراہ مصر منتقل ہو گئے۔ حضرت یوسفؑ کی مصر میں حیثیت کی مدد سے ان لوگوں کو قحط کی مشکلات سے نجات نصیب ہوئی اور حضرت یوسفؑ نے انہیں جوشن یا شہراون میں آباد کردیا (۱۷۲۹ قبل مسیح) اس وقت اسرائیل کے افراد خاندان کی تعداد، تورات کے مطابق، ستر افراد پر مشتمل تھی۔ مصر میں بنی اسرائیل کی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی اور اتنی زیادہ ہوئی کہ فراعنۂ مصر گھبرا گئے۔ مصری حکومت کا بنی اسرائیل کے ساتھ برتاؤ انتہائی ناروا تھا۔ وہ ان کے بیٹوں کو قتل کر دیتے اور ان کی بیٹیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔[1] قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے ساتھ (جو سب حضرت یعقوبؑ کی اولاد تھے) فرعون کے وحشیانہ سلوک کو اس طرح نقل فرمایا ہے:

نَتۡلُوۡا عَلَيۡكَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰى وَفِرۡعَوۡنَ بِالۡحَـقِّ لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝۳ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَـعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ

---

[1] اعلام قرآن، ص ۱۰۴، ٦٦٩

اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۴﴾ وَنُرِيۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَنَجۡعَلَهُمۡ اَئِمَّةً وَّنَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِيۡنَ ﴿۵﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَنُرِىَ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَحۡذَرُوۡنَ ﴿۶﴾ (قصص: ۳ تا ۶)

''ہم تجھے موسیٰ وفرعون کی سچی خبر بتاتے ہیں تاکہ مومن اس سے استفادہ کریں۔ فرعون نے زمین میں اقتدار پیدا کرلیا۔ اس نے اہل زمین کو (مختلف) گروہوں میں بانٹ دیا اور ایک گروہ کو ذلیل وخوار بنا دیا۔ وہ اُن کے بیٹوں کو قتل کر دیتا اور ان کی بیٹیوں کو چھوڑ دیتا۔ یقیناً فرعون فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے۔

ہم زمین میں ضعیف وکمزور بنا دیئے جانے والے افراد پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انہیں کو لوگوں کا رہبر وپیشوا اور اس زمین کا وارث بنانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں زمین پر قوت عطا کریں اور فرعون، ہامان اور ان کے لشکر کو اس چیز میں مبتلا کر دیں (وہ چیز دکھلا دیں) جس سے وہ ڈرتے ہیں''

تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ فرعون وہامان موسیٰ ؑ کی ولادت سے خائف تھے (کیونکہ نجومیوں نے انہیں بتا رکھا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ متولد ہونے والا ہے جو ان کی مملکت کو تباہ کر دے گا)۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل میں جو لڑکا بھی متولد ہوتا اُسے قتل کروا دیتے تاکہ وہ بچہ زندہ نہ بچ سکے جس سے انہیں خطرہ تھا۔ اس آیت میں ''ما کانوا یحذرون'' میں ان کے اس خوف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کرلیا ہے کہ جس کا ان میں خوف تھا (یعنی ولادتِ حضرت موسیٰؑ) وہ چیز انہیں دکھلا دے۔ اس بات پر ''ما کانوا یحذرون'' میں لفظ ''ما'' سے تولدِ موسیٰؑ ہی مراد ہے، شاہد بعد والی آیت ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: ''واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ''۔ یعنی ہم نے مادرِ موسیٰ کو الہام کیا کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے، یعنی اللہ کی مشیت یہ تھی کہ یہ شخص متولد ہو اور فرعون کے تخت وتاج کو برباد کردے۔

آیات قرآن کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت موسیٰ کی زندگی کو چھ مرحلوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے اور پھر ہر مرحلہ ایک مختلف محور پر منحصر ہے جس کے بارے میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں۔ وہ چھ مرحلے کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ مصر میں پیدائش سے لے کر مدین کی طرف ہجرت تک۔

۲۔ مدین میں حضرت شعیبؑ کے پاس دس سال تک کی زندگی۔

۳۔ مدین سے مصر کی طرف ہجرت اور راستے کے واقعات

۴۔ مصر میں دوبارہ ورود اور فرعون کی ہلاکت تک اس کے ساتھ مبارزہ و جہاد۔

۵۔ آلِ فرعون کی ہلاکت و بربادی۔

٦۔ مصر سے خروج اور صحرائے سینا میں ورود۔

۷۔ صحرائے سینا میں چالیس سال کی سرگردانی

ان مراحل کی تفصیل آیندہ صفحات میں بیان کی گئی ہے۔

(۱)

ولادت سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔مدین کی ہجرت تک

حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا یہ پہلو دو بنیادی محوروں پر مشتمل ہے:

۱۔ ولادت سے فرعون کے دربار تک آنا۔

۲۔ فرعون کے گھر میں زندگی سے ہجرت تک کے واقعات

اب ہم پہلے محور سے مربوط آیات ذکر کرتے ہیں:

(الف) ولادت سے دربارِ فرعون میں پہنچنے تک

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ وَلَا تَخَافِىۡ وَلَا تَحۡزَنِىۡ‌ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ‏ ﴿۷﴾
(القصص:۷)

۲۔ فَالۡتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرۡعَوۡنَ لِيَكُوۡنَ لَهُمۡ عَدُوًّا وَّحَزَنًا‌ ؕ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا كَانُوۡا خٰطِـئِيۡنَ‏ ﴿۸﴾ (القصص:۸)

۳۔ وَقَالَتِ امۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ قُرَّتُ عَيۡنٍ لِّىۡ وَلَكَ‌ ؕ لَا تَقۡتُلُوۡهُ ‌ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَـتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ‏ ﴿۹﴾ (القصص:۹)

۴۔ وَاَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰى فٰرِغًا‌ ؕ اِنۡ كَادَتۡ لَـتُبۡدِىۡ بِهٖ لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰى قَلۡبِهَا لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ‏ ﴿۱۰﴾ (القصص:۱۰)

۵۔ وَقَالَتۡ لِاُخۡتِهٖ قُصِّيۡهِ‌ فَبَصُرَتۡ بِهٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَۙ‏ ﴿۱۱﴾

(القصص:١١)

٦۔ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿١٢﴾ (القصص:١٢)

٧۔ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ (القصص:١٣)

٨۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ ﴿٣٩﴾ (طٰه:٣٧ تا ٣٩)

٩۔ اِذْ تَمْشِىْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۬ؕ (طٰه:٤٠)

آیات کا ترجمہ

١۔ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ اپنے بچہ کو دودھ پلا۔ جب اس کی جان کا خوف محسوس کرے تو اُسے (صندوق میں رکھ کر) دریا میں ڈال دے اور کوئی خوف وغم دل میں نہ لا۔ ہم اُسے تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اُسے مرسلین سے قرار دیں گے۔

٢۔(جب مادرِ موسیٰ نے موسیٰ کو خاص طریقہ سے دریا میں ڈال دیا تو) آلِ فرعون نے موسیٰ کو اٹھالیا کہ وہ (آخر کار نہ چاہتے ہوئے بھی) ان کا دشمن اور ان کے غم کا موجب بنے۔ بہ تحقیق فرعون وہامان اور ان کا لشکر خطا کار تھے۔

٣۔فرعون کی زوجہ نے کہا: "یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، شاید آئندہ یہ ہمیں فائدہ دے یا اسے ہم بیٹا بنالیں"، لیکن وہ ناواقف تھے (انجام کار سے)

۴۔ مادرِ موسیٰ کا دل (بیٹے کی یاد کے علاوہ) ہر چیز سے خالی ہو چکا تھا۔ اگر ہم اس کے دل کو تقویت نہ دیتے تو قریب تھا کہ وہ اپنے راز کو ظاہر کر بیٹھتی (ہم نے یہ کام کیا) تا کہ وہ مومنین سے ہو۔

۵۔ مادرِ موسیٰ نے موسیٰ کی بہن سے کہا: ''اس (صندوق) کے پیچھے چلتی جا''۔ (یعنی دیکھتی رہ کہ دریا میں ڈالنے کے بعد میرے بچہ پر کیا گزرتی ہے)۔ وہ دور سے بھائی کو دیکھ رہی تھی حالانکہ آلِ فرعون اس کی طرف متوجہ نہیں تھے (یعنی اس نے دیکھا کہ موسیٰ کو صندوق سے نکال کر فرعون کے گھر لے گئے ہیں)۔

۶۔ ہم نے پہلے سے ہی تمام دودھ پلانے والی عورتوں کو اس پر حرام کر دیا تھا۔ (موسیٰ نے کسی عورت کا دودھ نہ پیا)۔ موسیٰؑ کی بہن نے (جو ایک ناواقف کی طرح اُسے دیکھ رہی تھی) آلِ فرعون سے کہا: ''کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ بتاؤں جو تمہارے لیے اس بچہ کی کفالت کریں اور وہ اس کے خیر خواہ ہوں گے؟''

۷۔ ہم نے موسیٰؑ کو (اس طرح) اس کی ماں کے پاس لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اُسے غم نہ رہے اور وہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ حق ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۸۔ ہم نے دوبارہ تم پر احسان کیا جب تمہاری ماں پر وحی کی کہ بچہ کو صندوق میں ڈال کر دریا میں ڈال دو، بچے کو ایک میرا اور تمہارا دشمن اٹھا لے گا۔ جب موجیں صندوق کو ساحل پر لا ڈالیں گی۔ ہم نے تم پر اپنی محبت القا کی تا کہ ہمارے سامنے تمہاری پرورش ہو۔

۹۔ جب تمہاری بہن جا رہی تھی اور کہتی تھی: ''کیا میں تمہیں ایسے خاندان کا پتہ بتاؤں جو اس بچہ کی پرورش کریں گے؟'' پس ہم نے تجھے تیری ماں کے پاس لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت اور فرعون کی قساوتِ قلبی

حضرت یوسفؑ کے زمانہ سے حضرت موسیٰؑ کے دور تک مصر پر فراعنہ حاکم تھے۔ نجومیوں نے انہیں بتا رکھا تھا کہ اُن کی یہ سلطنت و اقتدار بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ایک بچہ کے ہاتھوں میں اس کی جوانی کے وقت برباد ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فراعنہ بنی اسرائیل

میں پیدا ہونے والے ہر بیٹے کو قتل کروا دیتے تھے تا کہ موسیٰ متولد نہ ہو پائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت قرار پا چکی تھی کہ موسیٰ بنی اسرائیل ہی کے ایک گھر میں پیدا ہوں، فرعونی کارندے اس طرف متوجہ نہ ہو سکیں اور پھر اسی فرعون کے گھر میں ہی پل کر بڑے ہوں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ فرعون کی قساوتِ قلبی کے باوجود خداوند تعالیٰ نے موسیٰ کی محبت اس کے دل میں ڈال دی اور فرعون موسیٰ سے محبت کرنے لگا۔ حضرت موسیٰ کی ماں نے حکم خدا کے مطابق موسیٰ کو صندوق میں ڈالا، اس کے اوپر لاکھ لگا دی تا کہ پانی اس کے اندر نہ جا سکے اور صندوق کو موجوں کے حوالے کر دیا۔ دریائے نیل کی موجوں نے صندوق کو قصرِ فرعون کے پاس ساحل پر لا ڈالا، فرعون اور اس کی بیوی متوجہ ہو گئے، انہوں نے صندوق کو کھولا تو اس میں ایک خوبصورت بچہ کو دیکھا جو آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہا تھا گویا کہہ رہا ہو مجھے یہاں سے نکال کر گود لے لو اور اپنے زیر سایہ میری پرورش کرو۔ موسیٰ کو انہوں نے صندوق سے نکالا (گویا فرعون بچے کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن) اس کی بیوی نے اسے بچہ کو قتل نہ کرنے دیا اور کہا: ''شاید ہمیں یہ بعد میں نفع پہنچائے یا اسے ہم اپنا بیٹا ہی بنا لیں''۔ وہ یہ تو کہہ رہے تھے لیکن انجام سے مطلع نہیں تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''عسی ان ينفعنا اونتخذه ولداً وهم لا يشعرون''

پھر بچے کو دودھ پلانے کے لیے وہ کسی دایہ کو تلاش کرنے لگے، لیکن دودھ پلانے والی جو عورت بھی لائی جاتی، بچہ اس کے دودھ کو قبول نہیں کرتا تھا اور بھوک سے مسلسل روئے جا رہا تھا۔ اس وقت موسیٰ کی بہن عام لوگوں میں سے ناواقف شخص کی طرح داخل ہوئی اور انہیں مشورہ دیا کہ میں ایک گھر ایسا جانتی ہوں جو اس بچہ کی پرورش کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔ وہ تو اس مشکل میں تھے ہی، یہ سنتے ہی مسئلہ کے حل پر خوش ہو گئے، اس گھر والوں کو بلا بھیجا اور وہ موسیٰ کی ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جب ماں نے آ کر بچہ کو دودھ پلانا شروع کیا تو بچہ راضی خوش دودھ پینے لگا۔ اس طرح فرعون اور اس کی بیوی خوش ہو گئے اور بچہ کی پرورش کی ذمہ داری موسیٰ کی ماں کو سونپ دی گئی۔ اس طرح وعدۂ خدا ''انا رآدوه اليك'' متحقق ہو گیا۔

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مشیتِ الٰہی کے سامنے بشر کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، ''وما تشاؤن الا ان يشاء الله (انسان: ۳۰) اور خدا ہی سب چیزوں پر حاکم ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاصر شاعرہ پروین اعتصامی (مرحومہ) کے اُن لطیف و بدیع اشعار کو ذکر کریں جن میں اس نے حضرت موسیٰ کی ولادت، اُن کی والدہ کی بے چینی اور اُن کی واپسی کے وعدۂ الٰہی کو متحقق کیا ہے۔ [1]

مادرِ موسیٰ، چو موسیٰ را بہ نیل
در فکند، از گفتۂ رب جلیل

خود ز ساحل کرد با حسرت نگاہ
گفت کای فرزند خردبی گناہ

گر فراموشت کند لطفِ خدای
چون رہی زین کشتیِ بی نا خدای

گر نیارد ایزدِ پاکت بہ یاد
آب، خاکت را دہد ناگہ بہ باد

[1] دیوانِ پروین اعتصامی، طبع چہارم، ص ۲۳۶

وحی آمد کاین چه فکرِ باطل است
رهبرِ ما اینک اندر منزل است
پردۂ شک را براند از میان
تابَبِینی سود کر دی یا زیان
ما گر فتیم آنچه را اندا ختی
دستِ حق را دیدی و نشنا ختی
در تو، تنہا عشق و مہر مادری است
شیوۂ ما عدل و بندہ پروری است
نیست بازی کارِ حق، خود را مباز
آنچه بردیم از تو باز آریم باز
سطحِ آب از گاہو ارش خوشتراست
دایہ اش سیلاب و موجش مادر است

ترجمہ:

موسیٰؑ کی ماں نے جب موسیٰ کو نیل میں
حکم ربِ جلیل سے ڈال دیا
تو خود ساحل پر نگاہِ حسرت ڈال کے
کہنے لگی کہ اے میرے چھوٹے سے بے گناہ بیٹے!
اگر لطفِ خدا تجھے بھلا دے تو
اس بغیر نا خدا کی کشتی سے کیسے نجات پاؤ گے؟
اگر خداوندِ پاک تجھ پر لطف نہ فرمائے
تو پانی کی موجیں تجھے بہا لے جائیں گی
وحی آئی کہ تو کیسی غلط فکر کر رہی ہے
ہمارا رہبر و اب منزل پر پہنچ چکا ہے
لہٰذا شک کے پردے درمیان سے ہٹا کے
دیکھ کہ تجھے نقصان ہوا ہے یا فائدہ
جو تو نے ڈالا ہم نے اسے لے لیا ہے
اور تو نے دستِ خدا کو دیکھ کر نہیں پہچانا
تجھ میں صرف ایک ماں کی مہر و محبت ہے
جب کہ ہمارا شیوہ عدل اور بندہ پروری ہے
حق کے کام کھیل نہیں ہوتے لہٰذا تو بھی ہمت نہ ہار کہ
جو کچھ تجھ سے لے گئے وہ تجھے لوٹا دیں گے
موسیٰ کے لیے پانی کی سطح گہوارہ سے زیادہ آرام دہ ہے
سیلاب اس کے لیے دایہ اور موجیں اس کے لیے ماں ہیں

سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قصص کی آیات کا موازنہ

سورہ طٰہ اور سورہ قصص دونوں میں موسیٰ کی پیدائش اور فرعون کے اہل کاروں سے ان کی نجات کا تذکرہ ہوا ہے لیکن کیفیت دونوں سوروں میں مختلف ہے۔ہم دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ا۔ سورۂ طہ میں موسیٰ کو دریا میں ڈالنے کی کیفیت پر زیادہ توجہ کی گئی ہے، ارشاد ہے:

ان اقذفیه فی التابوت فاقذفیه فی الیم فلیلقه الیم بالساحل

”یعنی اُسے صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریا میں ڈال دو اور موجیں اُسے ساحل پر ڈال دیں گی“

سورہ قصص میں اس کی اتنی تفصیل ذکر نہیں ہوئی، صرف ایک جملہ آتا ہے: "فالقیه فی الیم" یعنی اُسے دریا میں ڈال دے۔ اب کس طرح دریا میں ڈالے اور پھر نجات کیسے ہوگی، اس سورہ میں اس کی طرف اشارہ نہیں ہوا۔

۲۔ سورہ طہٰ میں ارشاد ہوتا ہے کہ میرا اور تیرا مشترکہ دشمن اُسے اٹھا لے گا، لیکن سورۂ قصص میں ہے کہ آلِ فرعون نے اُسے لے لیا تا کہ وہ (نادانستہ) اُن کا دشمن اور موجبِ غم و حزن بنے، جیسا کہ ارشاد ہے: فالتقطه ال فرعون لیکون لهم عدواً و حزناً۔ یہ دونوں بیان درست ہیں لیکن کیفیت بیان میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔

۳۔ سورہ طٰہٰ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کیسے فرعون اور اس کی بیوی کے دل میں موسیٰ کی محبت جاگزین ہوئی اور فرعون، جس نے اتنا قتل عام کیا تھا، اس نے اس بچے کو کیوں قتل نہ کیا بلکہ اپنے گھر میں اس کی پرورش کی۔ اس کو اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے ان دونوں کے دلوں میں، یا سب کے دلوں میں موسیٰ کی محبت ڈال دی تھی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: والقیت علیك محبة منی یعنی ہم نے تم پر اپنی طرف سے محبت القاء کی۔ یہ نکتہ سورۂ قصص میں نہ آیا۔

۴۔ سورہ طٰہٰ میں اس جملہ "والقیت علیك محبة منی" کے ساتھ ایک دوسرا جملہ ذکر کیا گیا ہے (عطف ہوا ہے)، اور وہ "ولتصنع علی عینی" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے فرعون کے دل میں موسیٰ کی محبت اس لیے ڈال دی گئی تا کہ خداوندِ عالم کی خاص عنایت کے زیر سایہ موسیٰؑ کی زیر پرورش ہو۔ اگر ان کے دلوں میں یہ محبت پیدا نہ ہوتی تو موسیٰؑ بھی دوسرے بچوں کے انجام ہی سے دوچار ہوجاتے اور جوانی کی منزلوں پر نہ پہنچ پاتے۔ یہ القا محبت ہی موسیٰ کے دوام و بقا کا موجب بنی جس کے نتیجہ میں خداوند تعالیٰ کی خاص عنایت کے زیر سایہ موسیٰؑ بڑے ہوئے۔ یہ نکتہ سورۂ قصص میں نہیں آیا۔

۵۔ سورۂ طٰہٰ میں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے (موسیٰؑ کو) اپنے کام (وحی و رسالت) کے لیے پیدا کیا ہے: "والطنعتك لنفسی" [1] یہ نکتہ بھی سورۂ قصص میں نہیں ہے۔

۶۔ سورۂ قصص میں مادرِ موسیٰ کو تسلی دینے کا ذکر بڑا واضح و صریح آیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "ولا تخافی ولا تحزنی انا رآدوه الیك" یعنی ہم نے اس کی ماں سے کہا: "خوف نہ کر غم نہ کھا۔ ہم اسے تیری طرف واپس لوٹا ئیں گے"۔ سورۂ طٰہٰ میں صرف "لا تحزن" کہنے پر اکتفا ہوا ہے۔

۷۔ سورۂ قصص میں نہ صرف مادرِ موسیٰ کو تسلی دینے پر اکتفا ہوا ہے بلکہ یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ موسیٰ شرِ فرعون سے نجات پائے گا اور آئندہ ہم اسے انبیاء سے قرار دیں گے، جیسا کہ ارشاد ہے "وجعلوه من المرسلین"۔ یہ نکتہ سورۂ طٰہٰ میں نہیں آیا۔

۸۔ سورۂ قصص میں مادرِ موسیٰ کی پریشانی کا زیادہ تذکرہ ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم اس کے دل کو مستحکم نہ کرتے تو وہ بنی اسرائیل کے ایک گھر میں موسیٰ کی ولادت کا راز آشکار کر بیٹھتیں، جس سے موسیٰ کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی۔ ارشاد ہوتا ہے: واصبح فواد اُم موسیٰ

---

[1] راغب نے مفردات میں کہا ہے: "الاصطناع المبالغة فی اصلاح الشی" یعنی صنع کے معنی کسی شے کی اصلاح کے لیے بہت توجہ کرنا ہے۔

فرغاً ان کادت لتبدی بہ لو لا ان ربطنا علی قلبھا"۔ یعنی مادرِ موسیٰ کا دل یادِ پسر کے علاوہ ہر فکر سے خالی ہو گیا۔ اگر ہم اس کے دل کو مستحکم نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اپنا راز ظاہر کر بیٹھتیں۔ (لیکن ہم نے اس کے دل کو مضبوط کیا کہ وہ مطمئن رہے) یہ نکتہ سورۂ طٰہ میں ذکر نہیں ہوا۔

۹۔ سورۂ قصص میں آتا ہے کہ موسیٰ کی ماں نے موسیٰ کی بہن کو صندوق کے پیچھے بھیجا تا کہ موسیٰ کی حالت کا پتہ چلتا رہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "و قالت لا ختہ قصیہ فبصرت بہ عن جنبٍ و ھم لا یشعرون جب کہ سورہ طٰہ میں صرف بہن کے پیچھے جانے کا تذکرہ ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ موسیٰ کی ماں نے اُسے کہا تھا کہ صندوق کا پیچھا کرے۔

۱۰۔ سورۂ قصص میں موسیٰ کو ماں کے پاس لوٹانے کی وجہ بیان کی گئی ہے، وہ یہ کہ چونکہ موسیٰ کسی عورت کے دودھ کو قبول نہیں کر رہے تھے، لہٰذا مجبوراً موسیٰ کی ماں کو بطور دایہ بلایا گیا جیسا کہ تفصیل گذر چکی ہے کہ کیسے موسیٰ کی بہن نے انہیں مشورہ دیا: "وحرمنا علیہ المراضع من قبل فقالت ھل ادلکم علی اھل بیتٍ یکفلو نہ لکم و ھم لہ ناصحون جب کہ سورۂ طٰہ میں صرف خواہرِ موسیٰ کے دریا کے کنارے چلنے اور پھر مشورہ دینے کا تذکرہ ہے، لیکن یہ کہ کیوں اس نے یہ مشورہ دیا اور کیوں دربارِ فرعون نے یہ مشورہ قبول کر لیا، اس کا جواب سورۂ طٰہ میں مذکور نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "اذتمشی اختك فتقول ھل ادلکم علی من یکفلہ" یعنی جب تمہاری بہن جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس کی پرورش کرنے والوں کا پتہ بتاؤں؟"

اس موازنہ سے یہ معلوم ہوا کہ ایک داستان کا تکرار کرنا بے فائدہ کام نہیں ہے بلکہ ہر دفعہ ایک نکتہ کی طرف ایسا اشارہ کیا گیا ہے جو دوسری جگہ پر ذکر نہیں ہوا۔ اب یہ سوال کہ کیوں ساری داستان ایک ہی جگہ پر بیان نہ کر دی گئی، اس کا جواب تب معلوم ہو سکتا ہے کہ آیات کے شانِ نزول کو دیکھیں کہ فلاں آیت کیوں نازل ہوئی، کون سے اسباب موجبِ نزول بنے، اب آیات میں اتنے ہی مسائل بیان ہوں گے جن کا تقاضا وہ مقام و مورد کرے گا جو سبب بنا نزولِ آیات کا۔ لہٰذا بقیہ نکات ان آیات میں ذکر نہیں کیے جائیں گے۔

(ب) فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰؑ کی زندگی

موسیٰؑ کے دودھ پینے کا زمانہ اختتام کو پہنچا۔ فرعون (بادشاہِ مصر) نے موسیٰ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور یوں موسیٰؑ نے فرعون کے محل میں ناز و نعم میں پرورش پا کر جوانی کی منزل میں قدم رکھا۔ اب جس زندگی کو موسیٰؑ نے دیکھا، محسوس کیا اور جیسی زندگی بسر کی اس کا لازمہ تو یہ تھا کہ موسیٰ بھی ظالم و مستکبر کے حامی اور کمزور ناتوان افراد کے مخالف ہوتے۔ لیکن چونکہ وہ کسی اور درخت کا ثمر تھے، دربارِ فرعون میں ان کا جان مصلحت کی بنیادوں پر تھا، لہٰذا انہوں نے اپنی اصلی فطرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ہمیشہ راہِ انبیاء پر گامزن رہے (اگرچہ ابھی تک مقامِ نبوت پر فائز نہیں ہوئے تھے)۔ قرآن نے موسیٰ کی زندگی کے اس مرحلہ کو یوں بیان کیا ہے:

۱۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

۲۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

۳۔ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾

۴۔ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

۵۔ فَاَصْبَحَ فِى الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِى اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِىٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

۶۔ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِىْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِىْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

۷۔ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡعٰى قَالَ يٰمُوۡسٰٓى اِنَّ الۡمَلَاَ يَاۡتَمِرُوۡنَ
بِكَ لِيَقۡتُلُوۡكَ فَاخۡرُجۡ اِنِّىۡ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيۡنَ ﴿۲۰﴾
۸۔ فَخَرَجَ مِنۡهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۱﴾
۹۔ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلۡقَآءَ مَدۡيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىۡۤ اَنۡ يَّهۡدِيَنِىۡ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۲۲﴾
(القصص ۱۴ تا ۲۲)

آیات کا ترجمہ

''جب موسیٰؑ جوا[1]ن اور کامل ہو گئے تو ہم نے انہیں حکمت و دانش (علم) عطا فرمائی۔ ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں۔

۲۔ جب شہر والے غفلت کی حالت میں تھے تو وہ شہر میں داخل ہوا (یعنی موسیٰؑ)۔ اچانک اس نے دو اشخاص کو لڑتے دیکھا۔ ان میں ایک اُس کا پیرو اور دوسرا دشمن تھا۔ پیرو نے موسیٰ سے مدد مانگی۔ موسیٰ نے دشمن کے سینہ پر ایک مکا مارا جس سے وہ مر گیا۔ موسیٰ نے کہا کہ یہ شیطانی کام تھا اور شیطان کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔

۳۔ موسیٰ نے کہا: ''خدایا میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ میرے اس عمل کو چھپا لے''۔ اللہ نے اس عمل کو چھپالیا کیونکہ اللہ عیوب کو چھپانے والا، مہربان ہے۔

۴۔ موسیٰ نے کہا: ''خداوندا! اس نعمت کی قسم جو تو نے مجھے دی، میں مجرمین کا پشت پناہ نہیں بنوں گا''

[1] اس آیت میں ''بلغ اشدہ''، ''استویٰ''، ''حکما''، ''عاما'' کی لفظیں استعمال ہوئی ہیں۔ ''شدت'' کے معنی لغتِ عرب میں توانائی و قوت کے ہیں ''وبلغ اشدہ'' یعنی قوت کی منزل تک پہنچ گئے کہ جو بلوغ یا اس سے اوپر کی حد سے کنایہ ہے، ''استویٰ'' یعنی کامل ہو گیا۔ جب کھیتی کھڑی ہو جائے تو کہتے ہیں ''استوی الزرع''۔ قرآن میں یہ لفظ کمالِ خلقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''حخم'' کا کلمہ بصیرت و بینائی کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ حق و باطل میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ فارسی میں فرزانگی اس کلمہ کے مترادف ہے۔ ''علم'' در مقابل جہل دانش کے معنی میں ہے۔ پس حکم و نبوت کے معنی میں استعمال نہیں ہوا چونکہ موسیٰؑ ابھی تک مقامِ نبوت کو نہیں پہنچے تھے۔

۵۔ موسیٰ خوف کی حالت میں شہر میں اس واقعہ پر ردِ عمل جاننے کی کوشش کرتے رہے۔

اچانک اسی کل والے شخص نے دوبارہ موسیٰ سے مدد مانگی۔ موسیٰ نے اس سے کہا: ط ''تو یقیناً ایک جاہل آدمی ہے''

٦۔ جب موسیٰؑ نے اپنے اور اس اپنے پیرو کے دشمن پر حملہ کرنا چاہا تو اُس [1] نے کہا: ''اے موسیٰ مجھے بھی ایسے ہی قتل کرنا چاہتے ہو جیسے کل ایک شخص کو تم نے قتل کر دیا تھا؟ تم زمین میں برتری حاصل کرنا چاہتے ہو اور زمین میں اصلاح نہیں کرنا چاہتے''۔

۷۔ شہر کی دوسری طرف سے ایک آدمی موسیٰؑ کے پاس آیا اور کہا: ''زعمائے قوم تمہارے قتل کی سازش کر رہے ہیں لہٰذا شہر چھوڑ دو۔ میں آپ کا خیر خواہ ہوں''

۸۔ موسیٰ نے اس شخص کی بات مان لی، خوف و پریشانی کے عالم میں شہر سے نکلے اور کہا: ''خدایا مجھے ظالم قوم سے نجات عطا فرما''۔

۹۔ پھر جب مدین کی طرف رخ کیا تو کہا: ''امید ہے اللہ تعالیٰ مجھے صحیح راستے کی ہدایت فرمائے گا''۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ا۔ آیت ۲ تا آیت ٦ میں دو واقعات کا تزکرہ ہے موسیٰؑ کو زندگی کے پہلے مرحلہ کے دوسرے موقعہ پر پیش آئے۔ ان دونوں واقعات کے بارے میں آیات میں زیادہ وضاحت نہیں ہے بلکہ واقعات میں ابہام باقی ہے جس کا دور کرنا ضروری ہے۔

''و دخل المدینة علی حین غفلة من اھلھا''۔ یعنی موسیٰؑ شہر میں اس وقت داخل ہوا جو لوگوں کی غفلت کا وقت تھا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ موسیٰؑ کہاں رہتے تھے جہاں سے اس وقت شہر میں آئے جب لوگ بے خبر تھے۔ دوسرے لوگوں کی غفلت سے کیا مراد ہے؟

جواب: سابقاً یہ بتایا جا چکا ہے کہ فرعون اور اس کی بیوی نے موسیٰ کو بیٹا بنا لیا تھا، لہٰذا موسیٰ ان کے محل پر رہ رہے تھے جو شہر سے باہر تھا۔ موسیٰ وہاں سے جو بھی انہیں کام تھا، اس کے لیے شہر آئے تھے، جہاں انہیں وہ حادثہ پیش آیا۔ (اسرائیلی و قبطی کی لڑائی اور پھر قبطی کو مکا مارنا) لوگوں کی غفلت کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام سے چھٹی کا وقت تھا اور لوگ گھروں کو جا چکے تھے۔ لہٰذا یہاں دو احتمال ہو سکتے ہیں یعنی یا موسیٰ دوپہر کو شہر آئے

---

[1] یہ ترجمہ اس بنا پر ہے کہ قال کا فاعل عدو ہو، یعنی اس دشمن نے یہ کہا ہو نہ کہ پیرو موسیٰؑ نے۔ اس پر آئندہ مزید بحث ہوگی۔

تھے (دوپہر کو دوکانیں بند ہوجاتی ہیں اور لوگ گھروں کو چلے جاتے ہیں، پھر چار بجے کھلتی ہیں۔مترجم) یا یہ احتمال ہے کہ موسیٰ رات کو جب کاروبار بند ہوجاتے ہیں، شہر آئے تھے، ان دونوں اوقات میں عموماً سڑکیں سنسان ہوتی ہیں اور لوگ گھروں میں آرام کررہے ہوتے ہیں۔

پہلے احتمال کو اس لحاظ سے تقویت ملتی ہے کہ دوسرے دن دوبارہ وہ اسرائیلی ایک اور قبطی کے ساتھ لڑائی میں موسیٰؑ سے مدد مانگتا ہے اور موسیٰؑ نے جب دشمن کے خلاف اس کی مدد کرنا چاہی تو قبطی نے کہا: ''کیا مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہو جیسے کل تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا؟'' یہاں ''امس'' جس کے معنی کل گذشتہ کے ہیں، استعمال ہوا ہے۔ اگر واقعہ رات کا ہوتا تو عربی میں اس کے لیے 'بارحہ' کی لفظ استعمال ہوتی جس کے معنی کل رات (گذشتہ) کے ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ موسیٰ کے شہر میں داخل ہوتے ہی پیش آیا تھا لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰ دن کے وقت آئے تھے نہ کہ رات کے وقت اور دن کا وقت جس میں شہر میں اتنی رفت و آمد نہیں رہتی، دوپہر کا وقت ہے۔ (پتہ نہیں مصنف نے صبح تڑکے کا احتمال کیوں نہیں دیا جب کہ یہ زیادہ قرین قیاس ہے اور صبح کی لفظ اس کی موید بھی ہے)۔

۲۔ قرآن نے اسرائیلی کو موسیٰ کا شیعہ (پیرو) کہا ہے (فاستغاثه الذی من شیعته علی الذی من عدوه) سوال یہ ہے کہ موسیٰ کے پیرو کہاں سے آگئے تھے جب کہ موسیٰ فرعون کے محل میں رہتے تھے اور بنی اسرائیل کے ساتھ ان کے روابط ہی نہ تھے؟

جواب: یہ صحیح ہے کہ موسیٰ نے فرعون کے محل میں پرورش پائی لیکن موسیٰ کے روابط اپنی ماں اور بنی اسرائیل کے ساتھ بالکل ہی منقطع نہیں تھے اور اسرائیلیوں پر بھی یہ حقیقت روشن تھی کہ ان کا ایک آدمی فرعون کے محل میں رہ رہا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰ نے بحث و جدال کی وجہ سے فرعون کا محل چھوڑ دیا ہوا اور اپنی قوم کے ساتھ ان کے روابط برقرار رہے ہوں۔[1] اسی وجہ سے بنی اسرائیل کی نظر میں موسیٰ کی ایک شخصیت بن چکی تھی اور ان میں موسیٰؑ کے پیروکار بھی پیدا ہوچکے تھے۔

۳۔ موسیٰ جب شہر میں آئے تو انہوں نے ایک اسرائیلی کو قبطی کے ساتھ دست و گریباں دیکھا اور اسرائیلی کے مدد کے لیے پکارنے پر موسیٰؑ نے دشمن قبطی کو مکا مار کر ختم کر دیا۔ ''فو کزه موسیٰ فقضی علیه''۔

یہاں چند سوال سامنے آتے ہیں: موسیٰؑ نے اصل مسئلہ جانے بغیر کیسے اسرائیلی کا دفاع کیا؟ کیا موسیٰؑ اس کو پیٹنا یا مارڈالنا واقعی چاہتے تھے؟ پھر قبطی جب مر گیا تو موسیٰ نے کہا: ''هذا من عمل الشیطان انه عدو مبین'' موسیٰ نے کس کام کو عملِ شیطان کہا ہے؟

پہلے سوال کا جواب تو ظاہر ہے۔ بنی اسرائیل ہمیشہ قبطیوں کے ہاتھوں میں ذلیل و خوار ہوتے رہتے تھے۔ لہٰذا کسی اسرائیلی کے ذہن میں یہ تصور ہی نہیں آسکتا تھا کہ وہ زبردستی کسی قبطی کے گلے پڑے۔ ان حالات میں یقیناً لڑائی کی بنیاد طاقت ور فریق کی طرف سے پڑتی ہے۔ اس وجہ سے موسیٰؑ نے اسرائیلی کا دفاع کیا۔

آیت میں بھی استغاثہ کی لفظ استعمال ہوئی ہے۔ یہ لفظ وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں ایک کمزور و ناتواں شخص کسی طاقت ور شخص

---

[1] سید قطب تفسیر ''فی ظلال القرآن'' ج ۲۰، ص ۴۸ پر لکھتے ہیں: ''فانه بعید الاحتمال، ان تطیق نفسه ابتغاء فی مستنقع الشر و الفساد''

کے ہاتھوں میں گرفتار و بے بس ہو اور مدد کے لیے پکارے۔ لہٰذا موسیٰ پر موقعہ کی نزاکت واضح ہوگئی اور وہ جلدی سے اپنے پیرو کی مدد کو جھپٹے۔

دوسرے سوال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے مکا مارا تھا اور مکا آلہ قتل نہیں بلکہ آلہ ضرب ہے۔ اگر مکا مارنے سے کوئی مر جائے تو یہ قتل خطائی ہو گا یعنی وہ اتفاقاً مر گیا، موسیٰ نے اس کے قتل کا قصد نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا قصد ہوتا تو مکے کے بجائے کوئی ایسا ہتھیار استعمال کرتے جو قتل کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ موسیٰ تو صرف مظلوم کے دفاع کے لیے آگے بڑھے تھے نہ کہ ظالم کے قتل کے لیے۔ یہ سوال کہ وہ کون سا عمل ہے جسے موسیٰ شیطانی عمل قرار دیتے ہیں تو اس کی ضمیر کا مرجع دیکھا جائے گا کہ کیا ہے۔ ایک احتمال یہ دیا جاتا ہے کہ مراد ان دونوں کی لڑائی ہے جو قبطی کے قتل کا موجب بن گئی اور اس معنی پر ایک روایت بھی وارد ہوئی ہے۔[۱]

لیکن اس احتمال کا قبول کرنا مشکل ہے کیونکہ بعد والی آیت میں موسیٰ نے کہا: "قال رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی"، اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرجع ضمیر عملِ موسیٰ ہے۔ اگر عمل موسیٰ مراد نہ ہوتا تو طلبِ مغفرت کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر کوئی غلط کام نہیں کیا تو یہ کیوں کہا کہ خدایا میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، مجھے بخش دے۔

لہٰذا حق یہ ہے کہ مراد خود موسیٰ کا کام ہے، لیکن ہر عمل شیطان گناہ نہیں ہے بلکہ جو کام بھی بے موقع ہو وہ ایک قسم کا عمل شیطان ہوتا ہے اور موسیٰ کا کام بے موقع تھا کیونکہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے لڑائی جھگڑے نہ صرف اُن کے لیے مفید نہیں تھے بلکہ مسائل، پریشانی اور مخالف شخصیات کے دباؤ کے بھی موجب تھے۔ لہٰذا اگر موسیٰ صبر کرتے کہ یہ قبطی بھی دوسرے قبطیوں کی مانند دریائے نیل میں غرق ہو کر مر جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ موسیٰ کی یہ بے احتیاطی ان کی دربدری کا موجب بنی۔ اس وجہ سے اسے عمل شیطان کہا گیا کیونکہ یہ عمل الٰہی و عقلی نہیں تھا۔ لہٰذا بعد میں فرعون نے موسیٰ کے اس کام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "وفعلت فعلتك التی فعلت و انت من الكفرين (شعراء:۱۹) جو کچھ تم نے کیا وہ تو کیا لیکن تم نے کفرانِ نعمت بھی کیا۔ موسیٰ نے جواب میں کہا: "فعلتها اذا و انا من الضالين"، (شعراء:۲۰) یعنی میں نے وہ کام جو کیا تھا اس میں میری غلطی تھی۔ غلطی اس اعتبار سے کہ جو کام میں نے اس وقت کیا مصلحت کے خلاف تھا۔ اس وجہ سے موسیٰ نے اس کام کو نفس پر ظلم سے تعبیر کیا اور کہا: "قال رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی فغفر له"۔

موسیٰ ظلم کی نسبت اپنی طرف دیتے ہیں۔ یعنی اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو زحمتوں اور مشقتوں میں ڈال[۲] ا۔ لفظ

---

[۱] عیون اخبار الرضا ج ۱، ص ۱۹۹۔ تحقیق لاجوردی لیکن چونکہ راوی حدیث علی ابن محمد ابن الجہم ہے جو زبردست دشمنِ اہل بیت تھا، لہٰذا کسی صورت میں اس کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ (تنقیح المقال، ج ۲، ص ۳۰۳)

[۲] اس کی تفسیر کی مثال حضرت آدمؑ سے متعلق آیت میں بھی سامنے آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا لنكونن من الخسرين" (اعراف:۲۳)

''غفران'' آج کل بخش دینے کے استعمال ہوتا ہے، جبکہ لغت عرب میں پوشیدہ کرنے کے معنی میں آتا ہے [1]۔ موسیٰؑ خدا سے چاہتے ہیں کہ اُن کے کام کو چھپا دے اور اس ورطۂ حیرت سے انہیں نجات دے۔ چونکہ دوسری آیت میں آیا ہے: "فنجینك من الغمـ" (طٰہٰ: ۴۰) کہ ہم نے تجھے غم سے نجات دی۔

چوتھی آیت میں موسیٰ اس نعمت کی قسم کھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اُن پر ارزانی فرمائی تھی اور جس کے زیر سایہ بچپن ولڑکپن کی منزلیں طے کر کے وہ جوانی کی حدود کو پہنچے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قال رب بما [2] انعمت علی فلن اکون ظهیراً للمجرمین

''مجھے قسم ان نعمتوں کی جو تو نے مجھ پر انعام کیں، میں کبھی مجرمین کا پشت پناہ نہیں بنوں گا''

سوال یہ ہے کہ مجرمین سے یہاں کون مراد ہیں؟ کیا وہ اسرائیلی [3] جس کی مدد کرتے ہوئے حضرت موسیٰ قبطی کو قتل کر بیٹھے تھے، یا مراد وہ قبطی ہے، یا تمام فراعنہ جو گناہ و جرم کی زندگی میں غرق تھے؟

پہلا احتمال بہت ضعیف ہے۔ ایک موحد کے استغاثہ کو جرم نہیں کہہ سکتے جب کہ اس سے کوئی جرم بھی سرزد نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں اگر وہ مجرم تھا تو دوسرے دن دوبارہ کیوں موسیٰؑ نے اس کی مدد کی۔ دوسرا یا تیسرا احتمال ہی مراد ہوسکتا ہے، بلکہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ اسرائیلی کا دفاع کرنے پر پشیمان بھی نہیں تھے، فقط یہ کہ بہتر یہ تھا وہ شخص قتل نہ ہوتا۔

موسیٰ شہر میں پھر رہے تھے کہ اچانک بالکل گذشتہ واقعہ کی طرح صورت حال دوبارہ پیش آ گئی۔ وہی اسرائیلی ایک اور قبطی کے ساتھ دست بگریباں تھا اور اس نے پھر موسیٰؑ سے مدد مانگی۔ اس دفعہ موسیٰ نے اس اسرائیلی کو "غوی مبین" کہا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "فاصبح فی المدینة خآئفاً یترقب فاذا الذی استنصره بالامس یستصرخه قال له موسیٰ انك لغوی مبین o

اب سوال یہ ہے کہ کیوں موسیٰؑ نے مدد طلب کرنے والے کو ''غوی مبین'' کہا اور اس سے اُن کی مراد کیا تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ''غی'' غوایہ سے مشتق ہے، عربی میں نادرست کام کے لیے استعمال ہوتا ہے، رشد کے برعکس، بے موقع کام کو غوایہ اور اس کے کرنے والے کو غوی کہا جاتا ہے جس میں جہل و نادانی کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ (مفردات راغب، ص ۳۲۹)۔ ظاہر ہے کہ اس اسرائیلی کا یہ کام مسلماً غلط تھا کہ قدرتِ دفاع نہ رکھنے کے باوجود روزانہ کسی نہ کسی قبطی سے دست بدست جھگڑے کی کوشش کرتا تھا۔ نیز یہ بھی امر مسلم ہے کہ اگر موسیٰ اس کی مدد کو نہ جاتے تو قبطی یا تو اُسے بہت مارتا (کہ اس کا کچومر نکل جاتا) یا پھر اسے جان سے مار دیتا۔ اس وجہ سے

---

[1] راغب مفردات میں کہتے ہیں: "اغفروا هذا لا مر بغفرته" یعنی "استروه بما یجب ان یشر به" اور خود کو مغفر اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ سر کو ڈھانپ لیتا ہے اور جس پٹی کو عورت سر پر باندھتی ہے تاکہ تیل منہ پر نہ لگے اسے غفارہ کہتے ہیں۔

[2] بما میں با قسم کے لیے ہے۔ یہاں فعل قسم اقسم اور جواب قسم لاتومن فی وجہ المجرمین محذوف ہیں۔

[3] زمخشری: کشاف، ج ۲، ص ۴۶۹، مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ھ

موسیٰ کے پاس اس کی مدد کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔لیکن اب مدد اس طرح نہ کی جیسے پہلی کی تھی، بلکہ صرف اس حد تک کہ قبطی اس کی پٹائی نہ کر سکے۔ارشاد ہوتا ہے:"فلما ان اراد ان یبطش بالذی ھو عدو لھما"

یہاں موسیٰؑ کو اس قبطی نے یا اسرائیلی نے کہا:"قال یموسیٰ اترید ان تقتلنی کما قتلت نفساً بالامس ان ترید الا ان تکون جباراً فی الارض و ما ترید ان تکون من المصلحین o اس نے کہا:''اے موسیٰؑ! کیا مجھے بھی ایسے ہی قتل کر دینا چاہتے ہو جیسے تم نے کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا''۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ یہ کلام کس کا تھا،اسرائیلی کا یا قبطی کا؟ دوسرا یہ کہ جبار سے کیا مراد ہے؟

پہلے سوال کے سلسلہ میں دو احتمال دیئے گئے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ اسرائیلی نے یہ جملہ کہا تھا کیونکہ جب موسیٰ ان دونوں کی طرف بڑھے تو اس نے سمجھا کہ موسیٰ اُسے مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔چونکہ موسیٰ پہلے ہی اس اسرائیلی کو''غوی مبین'' کہہ چکے تھے،لہٰذا اس نے اس جملہ کے ذریعہ موسیٰ کے راز کو آشکار کر دیا۔[۱]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ قبطی کے قتل کی خبر شہر میں پھیل چکی تھی جس سے موسیٰؑ کی ان دنوں بنی اسرائیل کے پشت پناہ کے طور پر پہچان ہو چکی تھی،لہٰذا اس وجہ سے لوگوں کو پتہ چل چکا تھا کہ یہ کام موسیٰ ہی کا ہے۔اس لیے قبطی نے موسیٰؑ سے بچنے کے لیے اس عمل کا تذکرہ کیا اور کہا: "اترید ان تقتلنی..."

دوسرا سوال کہ جبار کے کیا معنی ہیں،تو اس کا جواب یہ ہے کہ جبار لغت میں برتری طلب شخص کو کہتے ہیں۔[۲] گویا کہنے والے نے خیال کیا کہ موسیٰ جو یہ کام کر رہا ہے صرف وہاں کی حکومت حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔

بالآخر موسیٰ کی مداخلت سے جھگڑا تو ختم ہو گیا لیکن اب موسیٰ جان گئے کہ اُن کا راز آشکار ہو چکا ہے۔لہٰذا اُن کو حکومتی کارندوں سے گرفتاری کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ان حالات میں اس قاصد نے آ کر دربارِ فرعون کی سازش سے موسیٰ کو آگاہ کیا جس کے نتیجہ میں انہوں نے مصر چھوڑ دینے کا عزم کر لیا۔

حفاظتِ الٰہیہ

آیاتِ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰؑ فرعون کے ہاں بلوغ تک ٹھہرے،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّلَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ ﴿۱۸﴾ (سورہ شعراء: ۱۸)

---

[۱] المیزان علامہ طباطبائی ج ۱۶ ص ۱۹

[۲] راغب نے آیۃ "علی کل قلب متکبر جبار کی تفسیر میں کہا ہے: "متعال عن قبول الحق و الایمان لھا"۔

''فرعون نے کہا کیا بچپن میں ہم نے تمہاری پرورش نہیں کی اور کیا تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں نہیں گزار چکے؟''

''ولید'' عربی زبان میں اس بچہ کو کہتے ہیں جو ابھی تک بالغ نہ ہوا ہو اور جب حدِ بلوغ کو پہنچ جائے تو اُسے ''وصیف'' کہا جاتا ہے۔ بنا بریں موسیٰؑ اس عمر تک فرعون کے ہاں تھے اور اس کے بعد بھی کئی سال وہاں رہے کہ "ولبثت فينا من عمرك سنين" اس کی وضاحت کر رہا ہے۔ بعض مفسرین، جیسے بیضاوی، نے کہا ہے کہ تیس سال کی عمر تک وہاں رہے۔[1] ہم اگر چہ اس حد بندی پر اعتماد نہیں کر سکتے لیکن اتنا کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰؑ نے عمر کا ایک حصہ اس بت پرستی کے ماحول میں یقیناً گزارا تھا، لیکن تعجب یہ کہ بت پرستی نے بال برابر بھی موسیٰ میں تاثیر پیدا نہ کی تھی۔ فرعون چاہتا تھا کہ موسیٰ کی پرورش کاہن کریں اور اسے آئین فراعنہ کی تعلیم دیں لیکن غیبی ہاتھ نے موسیٰ کو ایسا پاک وصاف رکھا کہ وہ دربارِ فرعون سے نکلنے کے بعد نمائندہ توحید کے طور پر سامنے آئے اور فراعنہ کے دعویٰ خدائی کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یہاں سے انسان ان جملوں "ولتصنع على عيني" اور "وصطنعتك لنفسي" کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ کیسے اللہ تعالیٰ شرک کے گڑھ میں توحید کے تناور درخت کی پرورش کرتا ہے۔

---

[1] بیضاوی، انوار التنزیل ج ۲، ص ۱۵۲

(۲) مدین میں زندگی کے دس سال

حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا پہلا مرحلہ دربارِ فرعون میں جبری اقامت تھی۔ قبطی کے قتل کے بعد مجبوراً انہیں مصر کو کسی دوسرے ملک کی نیت سے چھوڑنا پڑا جہاں فرعون کا اختیار نہ ہو۔ اس موضوع سے مربوط آیات اس طرح ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَوَجَدَ مِنْ
دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ
الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾

۲۔ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ
فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

۳۔ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ
اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫
نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

۴۔ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ
الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾

۵۔ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ
فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ
شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾

۶۔ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ
عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ (القصص: ۲۳ تا ۲۸)

۷۔ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ○ (طٰهٰ:۴۰)

آیات کا ترجمہ

۱۔ جب موسیٰؑ مدین کے پانی (کنویں) پر پہنچے تو وہاں کچھ لوگوں کو اپنے ریوڑوں کو وہاں سے پانی پلاتے دیکھا۔ ان کے دوسری طرف دو خواتین کو دیکھا جو اپنے ریوڑ کو روکے کھڑی تھیں۔ موسیٰ نے پوچھا کہ اُن کا کیا مسئلہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے گوسفندوں کو پانی تب پلا سکیں گی جب یہ چرواہے اپنے اپنے ریوڑ لے کر یہاں سے چلے جائیں گے، اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔

۲۔ موسیٰ نے اُن کے ریوڑ کو سیراب کر دیا۔ اس کے بعد ایک سایہ کے نیچے جا کر بیٹھ گئے اور عرض کیا کہ خداوندا! جو نعمت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے میں اس کا محتاج ہوں۔

۳۔ (دونوں لڑکیاں ریوڑ لے کر گھر چلی گئیں اور انہوں نے سارا واقعہ اپنے باپ کو بتایا کہ کیسے ایک جوان نے ان کی گوسفندوں کو سیراب کیا تھا۔ اس پر اُن کے باپ نے اُن میں سے ایک کو کہا کہ جاؤ اور اس جوان کو گھر لے آؤ تا کہ اسے اس کے کام کی مزدوری ادا کریں)۔ ایک اُن میں سے بڑی حیا و شرم کے ساتھ چلتی ہوئی آئی اور کہا کہ میرا باپ آپ کو بلا رہا ہے تا کہ وہ آپ کو ریوڑ کو پانی پلانے کی اجرت ادا کرے۔ جب موسیٰ ان (شعیبؑ) کے گھر آئے اور سارا ماجرا انہیں بتایا تو انہوں نے موسیٰؑ سے کہا کہ اب ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ ظالموں سے نجات پا چکے ہیں۔

۴۔ ایک بیٹی نے باپ سے کہا کہ اس جوان کو ملازمت پر رکھ لیں، کیونکہ ملازمت کے لیے ایسا شخص بہترین رہے گا جو طاقت ور ہو اور امین بھی ہو۔

۵۔ شعیبؑ نے موسیٰؑ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں اپنی دو میں سے ایک بیٹی کی شادی تم سے کر دوں، بشرطیکہ تم آٹھ سال میرے لیے کام کرو اور اگر دس سال کر دو تو تمہاری مرضی ہوگی۔ میں تم پر کسی طرح سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم ان شاء اللہ مجھے نیک پاؤ گے۔

۶۔ موسیٰ نے جواب دیا کہ یہ معاہدہ میرے اور آپ کے درمیان ٹھہرا۔ میں ان دو مدتوں میں سے جو بھی پوری کر دوں مجھ پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر شاہد و گواہ ہے۔

۷۔ تم نے ایک انسان کو قتل کیا۔ ہم نے تمھیں آزمائش سے نجات دی، بار بار تمہیں آزمایا اور تم کئی سال مدین میں ٹھہرے رہے، پھر تم، اے موسیٰؑ، اس معین وقت تک پہنچ گئے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

قرآن مجید میں ہوسکتا ہے مدین سے مراد شعیبؑ کا شہر ہو اور ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد شعیبؑ کی قوم بھی ہو۔ مدین (شہر شعیبؑ) خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع تھا، وہاں کے باشندے حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے تھے اور اُن کی تجارت مصر، لبنان، فلسطین کے ساتھ تھی۔ آج کل مدین کا نام معان پڑ گیا ہے۔ بعض جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ مدین اس قوم کا نام ہے جو خلیج عقبہ سے کوہِ سینا کے علاقوں تک رہتی تھی (اعلام قرآن: ۵۰۰) بعض لوگوں نے اُن کے مسکن کو دریائے فرات کے کنارے تک بتایا ہے۔

موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے خاص الطاف کے زیر سایہ دن رات سفر کر کے مصر سے مدین تک کا فاصلہ طے کیا اور انتہائی خستہ و رنجور جسم کے ساتھ سرزمین مدین پر پہنچے، اپنے سامنے ایک کنواں دیکھا جسے چرواہے اپنے ریوڑوں کے ساتھ گھیرے کھڑے تھے اور مسلسل کنویں سے پانی نکال نکال کر اپنی گوسفندوں کو پلا رہے تھے۔ اچانک موسیٰؑ کی نظر دو لڑکیوں پر پڑی جو وہاں سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر اپنا ریوڑ روکے کھڑی تھیں تا کہ ان کی بکریاں کنویں کی طرف نہ جائیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''و وجد من دونهم امراتين تذودن'' (ذود کے معنی روکنے کے ہیں۔ حضرت شعیبؑ کی بیٹیاں اپنی بکریوں کو اس لیے روکے ہوئے تھیں کہ وہ متفرق نہ ہو جائیں یا کنوئیں کی طرف نہ چلی جائیں)۔ یہ صورت حال دیکھ کر کہ جن کا زور چلتا ہے وہ پانی پلاتے جا رہے ہیں اور دو لڑکیاں منتظر کھڑی ہیں، موسیٰؑ ان لڑکیوں کی طرف گئے اور پوچھا کہ آپ کیوں کھڑی ہیں، جا کر اپنے ریوڑ کو سیراب کیوں نہیں کرتیں لڑکیوں نے حیا و غیرت کے جذبات موسیٰؑ کے چہرہ پر دیکھ لیے تھے، لہٰذا انہوں نے حقیقتِ حال اُن کو بتا دی کہ حیا مانع ہے کہ مردوں کے سامنے پانی کھینچیں۔ لہٰذا منتظر ہیں کہ جب سب پانی پلا کے جا چکیں تو ہم پلائیں۔ واضح ہے جب دو جوان لڑکیاں اتنے چرواہوں کے سامنے پانی کھینچیں گی تو یہ منظر عفت و حیا کے منافی ہوگا، آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''لا نسقی حتی یصدر الرعا''۔[1]

اس آیت کے آخر میں ہے لڑکیوں نے کہا: ''وابونا شیخ کبیر'' غرض یہ بتانا مقصود تھا کہ ہم جو گھر سے باہر آ کر کام کر رہی ہیں، اس وجہ

[1] رُعاء راعی کی جمع ہے چرواہے کے معنی میں اور صدر کے معنی دور ہونے کے ہیں یعنی جب چرواہے کنوئیں سے دور چلے جائیں گے۔

سے ہے کہ ہمارے باپ میں بڑھاپے کی وجہ سے یہ کام کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس طرح کے طاقت فرسا سنگین کام مردوں کے شایانِ شان ہیں، عورتوں کے لائق نہیں۔

جب موسیٰؑ نے سنا کہ اُن کے والد بہت زیادہ بوڑھے وضعیف ہیں جس کی وجہ سے مجبور ہوکر یہ کام ان کے ذمہ لگایا گیا ہے تو انہوں نے طے کیا کہ آج تو یہ کام ان کی خاطر کردیں، لہٰذا وہ ریوڑ کنوئیں پر لے گئے اور تھوڑی دیر میں تمام ریوڑ کو سیراب کر کے لڑکیوں کے حوالے کر دیا اور بغیر کچھ کہے واپس جا کر سائے کے نیچے بیٹھ گئے اور اپنے پروردگار سے مناجات کرنے لگے: "رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر"۔ یعنی "خدایا جونعمتیں تو نے مجھے دی ہیں میں ان کے لیے شکرگزار ہوں۔ اس سے ان کا مطلب جسمانی توانائی وقوت تھی جس کے ذریعے انہوں نے مظلوم کی فریادرسی کی، پھر اپنی حفاظت کی خاطر یہ سفر طے کیا، پھر ان لڑکیوں کی مدد اور بالآخر اس توانائی ہی کے ذریعے اپنے لیے روزی کمائیں گے۔ لہٰذا وہ اس نعمت کے لیے شکرگزار ہیں۔ شاید موسیٰ کا یہ جملہ اللہ تعالیٰ سے رزق طلب کرنے کی درخواست کے مترادف ہو۔ اگر یہ معنی لے جائیں تو موسیٰ جب مصر سے نکلے اور مدین میں وارد ہوئے تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزیں مانگیں تھیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ انہیں ظالموں سے نجات دلائے: رب نجنی من القوم الظلمین (قصص: ۲۱)

۲۔ اللہ تعالیٰ اس سفر میں ان کی رہنمائی فرمائے: "عسیٰ ربی ان یھدینی سوآءَ السبیل (قصص: ۲۲)

۳۔ اللہ تعالیٰ سے کھانا طلب کیا: "رب انی لما انزلت الی من خیرٍ فقیر

موسیٰؑ کی تینوں دعائیں جلد ہی مستجاب ہوگئیں، چنانچہ جب لڑکیاں گھر پہنچیں تو شاید اُن کے معمول سے جلدی آ جانے سے والد کو حیرت ہوئی اور اس بارے میں ان سے پوچھا تو انہوں نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ ان کا نیک باپ چونکہ کام کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا، اگرچہ کام کرنے والے نے اللہ ہی کی خوشنودی کے لیے کام کیا تھا، کسی سے کچھ اجرت لینے کی خاطر نہیں، لہٰذا انہوں نے اپنی ایک بیٹی سے کہا کہ جا کر اس جوان کو گھر بلا لائے تا کہ اُسے اس کام کی اجرت ادا کی جائے۔

قرآن نے یہاں اس لڑکی کے چلنے کی کیفیت کا بھی تذکرہ فرمایا ہے: "فجآءَته احدھما تمشی علی استحیاءٍ"۔ لڑکی کے لیے حیا وعفت ایک فطری امر ہے اور جو کام بھی حیا وعفت کے منافی ہو وہ خلافِ فطرت ہے۔ جب لڑکی نے موسیٰؑ کو یہ پیغام دیا تو موسیٰؑ نے قبول کرلیا اور اس کے باپ کے پاس چلے آئے۔ موسیٰؑ نے وہاں ایک ایسے بوڑھے مرد کو دیکھا زمانہ نے جس سے طاقت سلب کر لی تھی۔ دونوں میں گفتگو کا آغاز ہوا تو موسیٰؑ نے اپنا ماجرا بیان کیا۔ اس مردِ ضعیف نے جواب میں کہا: "اب مت ڈرو۔ ظالموں سے آپ نجات پا چکے ہیں یعنی مدین ان کے قلمرو سے باہر ہے"۔

یہاں موسیٰ کی تینوں دعائیں مستجاب ہوتی نظر آتی ہیں کیونکہ انہوں نے ظالموں سے نجات پالی، راستہ بھی گم نہ کیا اور شعیب کے گھر ان کی پذیرائی بھی ہوگئی۔

ان باتوں کے بعد ان ہی سے ایک لڑکی نے باپ کو مشورہ دیا کہ موسیٰؑ کو چرواہے کے طور پر ملازم رکھ لیں۔ اس نے کہا: "میں نے اتنے وقت میں اس جوان میں دو چیزیں مشاہدہ کی ہیں۔ ایک تو یہ جسمانی طور پر طاقت ور ہے اور چرواہے کو ایسا ہونا ہی چاہیے اور دوسرے

غیرت مند و امین ہے۔ لہٰذا ہمارے ساتھ رہنے کے قابل ہے''۔ ''ان خیر من استأجرت القوی الامین''

باپ نے بیٹی کا مشورہ مان لیا لیکن ایک مختلف صورت میں، وہ یوں کہ انہوں نے موسیٰؑ کو پیش کش کی کہ ان کی دو بیٹیوں میں سے ایک سے شادی کر لیں، اس شرط پر کہ آٹھ سال یا اگر ہو سکے تو دس سال اُن کے لیے کام کریں۔ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ کام ریوڑ کی دیکھ بھال ہی ہوگا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موسیٰؑ کا کام صرف یہی تھا کیونکہ جب وہاں شادی کر لی تو اب وہی اس گھر کے توانا مرد ٹھہرے۔ لہٰذا جو کام بھی گھر کے مرد کے شایانِ شان ہوں موسیٰؑ کو انجام دینا تھے۔ اگرچہ اہم ترین کام ریوڑ کی دیکھ بھال ہی تھی۔ موسیٰؑ نے پیش کش قبول کر لی اور دونوں میں سے کوئی ایک مدت پوری کرنے کا وعدہ کر لیا۔

موسیٰؑ بہرحال وہی قوی جوان ہیں جنہوں نے فرعون کے محل میں ناز و نعم سے تربیت پائی تھی اور اب ریوڑ کی دیکھ بھال جیسا مشکل کام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً ناز و نعم کے ماحول سے کم ہی ایسے افراد نکلتے ہیں جو قوی، پختہ ارادہ والے اور کام کر گزرنے والے ہوں بلکہ غالباً یہ لوگ مشکلات کے سامنے ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ موسیٰؑ جیسے جوان کو (جسے زندگی میں ہزاروں مصائب و مشقتیں درپیش ہوئیں اور جسے فرعون جیسے ظالم مستکبر سے واسطہ پڑنا ہو) حالات و حوادث کی بھٹی میں پک کر کندن بن جانا چاہیے تاکہ زمانہ کی سختیاں اور لوگوں کے ظلم و ستم اس کی آہنی شخصیت کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ کر سکیں اور ان حالات کے مقابلہ میں پہاڑ کی سی استقامت کے ساتھ ہمیشہ سیدھا کھڑا رہ سکے۔

بکریاں چرانا اور انہیں سنبھالنا ایسا کام ہے جس سے انسان میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور انسانوں کی رہبری کے لیے وہ بہتر طور پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر ظاہر قرآن (آیت کی لفظوں کو دیکھ کر پہلی نظر میں جو معانی سمجھ میں آئیں) ہمارے لیے حجت ہو تو ان آیات سے درج ذیل نکات کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ ہر انسان کا کام قدر و قیمت رکھتا ہے، یہ چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ لڑکی میں سب سے اہم صفت حیا و عفت ہے۔ اس کی رفتار و گفتار میں حیاء کو نظر آنا چاہیے۔

۳۔ کسی کام کے لیے جس شخص کو ملازم رکھنا ہو اس میں دو شرطیں موجود ہونا لازم ہے: ایک قوتِ جسمانی اور دوسرا امین ہونا۔ اگر امین نہ ہوگا تو ممکن ہے وہ کسی خراب مسئلے سے دوچار کر دے۔

۴۔ اگر باپ کسی صالح و پاک نوجوان کو دیکھے کہ اس کی بیٹی کے لیے اچھا شوہر ثابت ہو سکتا ہے تو کوئی معیوب بات نہیں کہ اُسے اپنی بیٹی کے رشتہ کی پیش کش کر دے۔ یہ کام خلافِ اخلاق نہیں سمجھنا چاہیے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ جوان سمجھدار و عالی ظرف ہو۔

۵۔ جس لڑکی سے نکاح ہو رہا ہے فقہی اعتبار سے اس کا ایجاب میں معین ہونا ضروری نہیں، بلکہ قبول کے وقت معین کر لینا کافی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایجاب و قبول دونوں میں ضروری ہے ہی نہیں کہ لڑکی معین ہو، عقد کے بعد معین کر سکتے ہیں۔ یہ مطلب اس آیت سے ثابت ہے: لیکن اس مورد میں علماء کے فتاویٰ کو دیکھتے ہوئے مفسرین نے کہا ہے کہ موسیٰؑ و شعیبؑ کے درمیان صرف پیش کش و جواب کی صورت حال تھی، اسے عقدِ نکاح نہیں سمجھا سکتا۔ لہٰذا خود ایجاب و قبول میں لڑکی کا معین ہونا ضروری ہے۔

۶۔ حق مہر کا ہر طرح معین ہونا ضروری نہیں، بلکہ بعض جہات سے مبہم و مجمل بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ اس واقعہ میں ہے۔ کیونکہ مہر کام کی مدت قرار پائی تھی اور وہ مدت آٹھ یا دس سالوں میں مردد تھی، کسی ایک کو چن لینا شوہر کے اختیار میں تھا۔

۷۔ شوہر کا کام کرنا بھی بطورِ حق مہر کے معین کیا جا سکتا ہے۔ فقہا نے اس کے جواز کا فتویٰ بھی دیا ہے بلکہ ایک روایۃ بھی وارد ہوئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایک شخص کی شادی کسی عورت سے کرتے ہوئے حق مہر یہ رکھا کہ شوہر بیوی کو قرآن پڑھائے گا۔[1]

۸۔ لڑکی کا حق مہر اس کی رضا سے اس طرح معین کیا جا سکتا ہے جس سے لڑکی کے والدین اور دوسرے افراد کی زندگی کی گزر اوقات ہو سکے۔ خاندان کا مطلب بھی یہی ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گزاریں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔

۹۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت شعیبؑ کی بیٹی کا مہر زیادہ تھا کیونکہ آٹھ یا دس سال تک کام کرتے رہنا کوئی کم مدت نہیں ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں موسیٰ کو اس گھر میں تمام سہولیات میسر تھیں۔ انہیں الگ گھر بنانے کی ضرورت نہ تھی۔

۱۰۔ گویا یہ سب زحمتیں اور مشقتیں اس لیے تھیں کہ موسیٰؑ اس مردِ بزرگ کی نورانی نیت کے زیر سایہ رہ کر بصیرت و نور روحانی کمال حاصل کریں، تا کہ دس سال کی مدت گزار کر فرعون جیسے مستکبر کے مقابلہ پر آ سکیں۔

یہ ضعیف باپ (شعیبؑ کون تھا)؟

یہ ضعیف العمر شخص جسے موسیٰؑ جیسا داماد نصیب ہوا، کون تھا۔ ابو جعفر طبری نے اپنی تفسیر میں اس بارے میں مختلف نظریات ذکر کیے ہیں جن کی تعداد پانچ تک ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شعیبؑ نبی تھے اور اکثر مفسرین کا یہی نظریہ ہے۔ ابو العلاء معری نے اس شخص کے متعلق جس نے خود نکاح کے لیے اپنی بیٹی پیش کی کہا ہے:

كنت موسىٰ عَلَيْهِ السَّلَام و افته بنت شعيب عَلَيْهِ السَّلَام
غيران ليس فيكما من فقير

یعنی "میں موسیٰؑ کی طرح ہوں۔ مجھے بیوی شعیبؑ کی بیٹی جیسی ملی، سوائے اس کے کہ میں تمہارے درمیان کوئی فقیر نہیں ہوں"۔

بعض نے کہا کہ وہ شعیبؑ نبی کے بھتیجے تھے۔ بعض نے کہا کہ وہ مدین کے فرمانروا تھے اور ان کا نام یثری تھا لیکن یہ تیسرا نظریہ قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر وہ فرمانروا تھا تو پھر بیٹیوں کو کیوں بھیجا کہ بکریوں کو پانی پلا کر لائیں۔

بزنطی نے ایک روایۃ میں (جس کی سند صحیح ہے) امام رضا علیہ السلام سے سوال کیا کہ شعیبؑ کے دس سال یا آٹھ سال کی پیش کش میں سے حضرت موسیٰؑ نے کس پر عمل کیا، تو حضرت نے فرمایا: "دس سال پر"۔ اس سوال و جواب سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰؑ کے سسر کا شعیبؑ ہونا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۵، باب ۲، از ابواب مہر حدیث ۱۱، زحر عاملی

مسلم ہے (بحار الانوار، ج ۱۳، ص ۳۰۷، کافی کلینی سے ماخوذ)

عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب قصص قرآن میں کہا ہے کہ یہ نظریہ صحیح نہیں ہوسکتا کہ وہ شعیبؑ نبی ہوں کیونکہ لوطؑ پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر تھے اور حضرت شعیبؑ نبی قوم لوطؑ کی بربادی کا تذکرہ اپنی قوم سے ان لفظوں میں کرتے تھے: "وما قوم لوط منکم ببعید" (هود:۸۹) یعنی قوم لوطؑ کی سرگذشت تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔

اگر حضرت موسیٰؑ کے سسر یہی شعیبؑ نبی تھے تو یقیناً وہ بڑے معمر آدمی ہوں گے کیونکہ ابراہیم خلیلؑ اور موسیٰؑ کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ ہے۔[1]

ہم عرض کرتے ہیں کہ عبدالوہاب نجار کی یہ بات کوئی دلیل نہیں رکھتی، ان کا ذہن اُسے بعید سمجھتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے کہہ دیا کہ ایسا نہیں ہوسکتا جب کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوم لوطؑ قوم شعیبؑ کے ہمسایہ تھے۔ شعیبؑ نے اس آیت میں جو کہا ہے وہ تم سے دور نہیں تھے، ان کی مراد مکانی فاصلہ ہے نہ زمانی فاصلہ۔

نیز موسیٰؑ کے سسر نے اپنے آپ کو صالحین سے شمار کیا، جب کہا: "ستجدنی ان شآء الله من الصلحین" (قصص:۲۷) اور صالحین کی صفت قرآن میں اگرچہ انبیاء کے مقابلے میں ذکر ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾ (نساء:۶۹)

لیکن یہاں مراد صرف صالح کے لغوی معنیٰ ہیں وہ تقسیم مراد نہیں جو قرآن میں افراد کے لیے کی گئی ہے۔

---

[1] عبدالوہاب نجار، قصص القرآن، ص ۱۷

(۳) مدین سے مصر کو واپسی

حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے دو مرحلے بیان ہوئے۔ اُن کی زندگی کا پہلا مرحلہ مصر سے مدین کو ہجرت کا ہے جب کہ دوسرے مرحلہ سے اُن کا مدین میں دس سالہ قیام مراد ہے۔ اب تیسرے مرحلے کا ذکر ہوتا ہے جو مدین سے مصر کی طرف ہجرت واپسی سے تشکیل پاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ دس سال مدین میں رہنے اور دخترِ شعیبؑ سے شادی کے بعد اب پھر مدین کو مصر کے لیے چھوڑنے کا سوچ رہے ہیں تا کہ وہاں جا کر اپنی قوم و ملت کے ساتھ رہ سکیں جہاں وہ متولد ہوئے تھے اور اُن کی تمام امیدیں انہی سے وابستہ تھیں۔ حضرت کی زندگی کے اس مرحلہ میں تین پہلو ہیں:

۱۔ مدین سے مصر تک کے سفر کے واقعات

۲۔ موسیٰ اور فرعون کے مابین مناظرہ

۳۔ فرعون پر عذاب کا نزول سب سے پہلے ہم تیسرے مرحلہ کی آیات کا ذکر کرتے ہیں۔

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

۲۔ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ [۱] الْوَادِ [۲] الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾

۳۔ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ

---

[۱] شاطئ۔ کنارہ، ۲۔ الواد۔ درہ (سیلاب کے بہاؤ کی جگہ، ۳۔ الایمن۔ دائیں، ۴۔ بقعہ۔ سرزمین، حصہ، ۵۔ الجان۔ سانپ

[۲] جیب کے معنی گریبان یا بغل کے ہیں۔ اور دوسری جگہ آیت میں اس کی جگہ جناح استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا دوسرے معنی بہتر ہیں۔

يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

۴۔ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ
جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ۭ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

۵۔ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۡ اِنِّىْٓ اَخَافُ
اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾

۶۔ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ
بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

۷۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا
سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾ (القصص ۲۹ تا ۳۵)

۸۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ
الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ۙ (القصص: ۴۴)

۹۔ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۹﴾ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ
نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿۱۰﴾

۱۰۔ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾ۭ

۱۱۔ اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾ۭ

۱۲۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾

۱۵۔ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾ (طٰهٰ: ۹ تا ۱۶)

١٦۔ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ
بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿١٨﴾
١٧۔ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿١٩﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا
تَخَفْ ٚ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿٢١﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ
بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿٢٢﴾
لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ (طٰهٰ: ١٧ تا ٢٤)
١٨۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ
لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ
بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾
اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ (طٰهٰ: ٢٥ تا ٣٦)
١٩۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ
طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ
اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾
فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ
قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ
اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾ (طٰهٰ: ٤٢ تا ٤٨)
٢٠۔ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا
يَتَّقُوْنَ ﴿١١﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿١٢﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ
لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿١٣﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿١٤﴾ قَالَ
كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿١٥﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا

رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶﴾ (الشعرآء: ۱۰ تا ۱۶)

۲۱۔ هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ﴿۱۵﴾ اِذۡ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾
اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى
رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ﴿۱۹﴾ (النزعت: ۱۵ تا ۱۹)

آیات کا ترجمہ

۱۔ جب موسیٰ نے مدتِ (موعودہ) پوری کر لی اور اپنے گھر والوں کے ساتھ مصر کی طرف چل پڑے تو انہوں نے طور کی جانب آگ دیکھ کر اپنے اہل وعیال سے کہا: آپ ٹھہریں۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید وہاں سے کوئی خبر یا تھوڑی سی آگ لے آؤں تا کہ آپ اسے تاپ سکیں۔

۲۔ جب آگ کے قریب پہنچے تو انہیں اس مبارک سرزمین کی وادی کے دائیں جانب سے آواز آئی: ''اے موسیٰ! میں ہی عالمین کا رب ہوں''۔

۳۔ آپ اپنا عصا (لاٹھی) پھینک دیں۔ (جب عصا پھینک دیا) دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے۔ اب موسیٰؑ پیٹھ پھیر کے بھاگ نکلے اور پلٹ کے بھی نہ دیکھا۔ آواز آئی کہ اے موسیٰؑ پلٹ آیئے، آپ امان میں ہیں، ڈریں نہیں۔

۴۔ اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈالیے تو دیکھا کہ وہ روشن و درخشندہ نکلے گا، بغیر کسی تکلیف کے، نیز اپنا ہاتھ خوف وڈر سے سینے پر رکھ لیں (تا کہ غیبی تسلی ہو) [1]۔ یہ (عصا، ید بیضا) دو روشن دلیلیں ہیں آپ کے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے حاشیہ نشینوں کے لیے کہ وہ یقیناً فاسق گروہ ہیں۔

۵۔ موسیٰؑ نے کہا: خدایا! میں نے ان کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا، ڈرتا ہوں کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔

۶۔ میرے بھائی ہارونؑ کی زبان مجھ سے فصیح تر ہے۔ اسے میری مدد کے لیے میرے ساتھ بھیج

[1] ایک دوسری تفسیر کے مطابق معنی یہ ہیں کہ اپنے ہاتھ سیدھے نیچے کر لیں اور بدن کے ساتھ ملا کر رکھیں، ادب کے طور پر۔

دے تا کہ وہ میری تصدیق کرے، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔

۷۔ اللہ نے فرمایا: ہم آپ کے بازو آپ کے بھائی کے ساتھ مضبوط کرتے ہیں، آپ دونوں کو برتری عطا کریں گے، اُن کے ہاتھ آپ تک ہماری نشانیوں کی وجہ سے نہیں پہنچیں گے اور آپ کے پیرو غالب رہیں گے۔

۸۔ آپ (اے پیغمبرؐ وادیٔ طور) کے دائیں جانب حاضر نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو نبوت عطا فرمائی اور آپ اس کے شاہد بھی نہ تھے۔

۹۔ کیا موسیٰؑ کا قصہ آپ تک پہنچا ہے؟ جب اس نے آگ دیکھی اور اپنے خاندان سے کہا کہ ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے، میں وہاں سے آگ لے آؤں یا اس کی روشنی میں راستہ پا سکوں؟

۱۰۔ جب وہ آگ کے پاس آئے تو ندا آئی: اے موسیٰؑ!

۱۱۔ میں تیرا پروردگار ہوں، جوتے اتار دے، اس وقت تو مقدس وادی طویٰ کی سرزمین پر ہے۔

۱۲۔ میں نے تجھے چن لیا ہے۔ جو وحی تجھ پر کر رہا ہوں غور سے سن۔

۱۳۔ میں اللہ ہوں۔ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ میری عبادت کرو اور میری خاطر نماز قائم کرو۔

۱۴۔ قیامت آنے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے مخفی رکھوں تا کہ ہر انسان کو اس کے اعمال کی جزا دوں۔

۱۵۔ جو قیامت پر ایمان نہ لائے اور اپنی خواہشات کی پیروی کرے وہ تجھے اس پر ایمان سے کہیں روک نہ دے، مبادا تو ہلاک ہو جائے۔

۱۶۔ اے موسیٰ! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰؑ نے کہا یہ میرا عصا ہے، اس کا سہارا لیتا ہوں، اس کے ذریعے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی اس سے دوسرے کام انجام دیتا ہوں۔

۱۷۔ اللہ نے فرمایا: اے موسیٰؑ! اس عصا کو پھینک دو۔ اچانک وہ سانپ بن گیا جو ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ اللہ نے فرمایا: اس سانپ کو پکڑ لو اور مت ڈرو۔ ہم اُسے اس کی پہلی صورت پر لوٹا دیں

گے۔ اپنے ہاتھ کو بغل کی طرف لے جاؤ، بغیر کسی تکلیف کے یہ روشن ومنور نکلے گا۔ یہ تمہارے لیے ایک اور نشانی ہے تا کہ ہم تجھے اپنی اس سے بڑی نشانیاں دکھائیں۔

۸۔ فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ موسیؑ نے عرض کیا: ''خدایا! میرے سینے کو کھول دے (وسیع کر دے) میرے کام کو آسان کر دے، میری زبان کی گرہ کھول دے تا کہ وہ میرے کلام کو سمجھ سکیں اور میرا مددگار میرے خاندان سے بنا دے، میرے بھائی ہارون کو، میری پشت کو اس کے ذریعے مضبوط بنا دے، اسے میرے کام میں شریک کر دے تا کہ ہم تیری زیادہ تسبیح کریں اور تیرا زیادہ ذکر کریں، تو ہماری حالت کو خوب جانتا ہے''۔ خطاب آیا: اے موسیؑ! جو تم نے مانگا، وہ تمہیں ہم نے دے دیا۔

۲۱۔ تم اور تمہارا بھائی میری آیات کو لے جاؤ، میرے ذکر میں سستی نہ کرو۔ فرعون کی طرف جاؤ کہ اس نے بڑی سرکشی کی ہے۔ اس کے ساتھ (نرمی کے ساتھ پیش آؤ شاید سدھر جائے یا ڈر جائے) نرم گفتگو کرو، شاید وہ متذکر ہو جائے یا ڈر جائے۔

ان دونوں نے کہا: خدایا ہمیں خطرہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا طغیان کرے گا۔ اللہ نے فرمایا: مت ڈرو! میں تمہارے ساتھ ہوں، سن بھی رہا ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں۔ اس کی طرف جاؤ اور اُسے کہو کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں مت ستا، ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لائے ہیں اور سلامتی ہو اس پر جو حق کی پیروی کرے۔ ہم پر وحی ہوئی ہے کہ اس پر اللہ کا عذاب ہو گا جو انبیائے خدا کو جھٹلائے گا اور ان سے روگردانی کرے گا۔

۲۰۔ جب تمہارے رب نے موسیؑ کو پکارا کہ ظالم قوم کے پاس جاؤ جو قومِ فرعون سے کیا وہ پرہیز گاری نہیں ہونا چاہتے؟ موسیؑ نے عرض کیا: خدایا! میں ڈرتا ہوں کہیں وہ میری تکذیب نہ کریں، پھر میرا دل تنگ ہو جائے اور زبان کھل نہ پائے۔ ہارون کو بھی بھیج دے (اسے بھی رسالت دے)، ان کا میری گردن پر گناہ ہے، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اللہ نے فرمایا: وہ

ایسا نہیں کر سکتے۔ تم دونوں میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور سن رہا ہوں۔
پس فرعون کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ ہم خداوند عالم کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔
۲۱۔ کیا تجھے موسیٰؑ کی داستان پہنچی ہے جب اس کو اس کے رب نے وادیٔ مقدس طویٰ میں ندا دی اور فرمایا: فرعون کی طرف جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تو چاہتا ہے کہ پاکیزہ ہو جائے اور میں تجھے تیرے پروردگار کی طرف ہدایت کروں تا کہ تو اس سے ڈرے؟

آیات کی موضوعی تفسیر

مدین کی سرزمین پر محض بکریاں چرانے کے لیے موسیٰؑ بن عمران کی خلقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو صرف ایک تعلیمی و تجرباتی دور تھا تا کہ موسیٰ کو اس سے بڑی ذمہ داریاں نبھانے اور بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجۂ ستم سے نجات دلانے جیسے اہم معاملات نمٹانے کا بہتر تجربہ ہو سکے۔ جب وہ تعلیمی و تجرباتی دور ختم ہوا تو موسیٰ نے اپنی ذمہ داری یہ سمجھی کہ اب مصر لوٹ جانا چاہیے تا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل سے مل سکیں، اگرچہ اس میں بہت زیادہ خطرات تھے۔ لہٰذا موسیٰؑ نے مدین کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ راہی مصر ہوئے۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ مدین سے مصر کا فاصلہ آٹھ منزل کا تھا اور ہر منزل ایک دن رات میں طے کی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سفر کے واقعات اس طرح بیان فرمائے ہیں:

رات کو جب سردی زیادہ تھی موسیٰ راستہ بھول گئے۔ انہوں نے دور سے آگ جلتی ہوئی دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا: آپ یہیں ٹھہریں۔ میں جاتا ہوں کہ کچھ آگ لے آؤں تا کہ آپ اُسے تاپ سکیں یا میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں (تا کہ راستہ مل سکے)۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَۃٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾ (قصص: ۲۹)

لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ہُدًی ﴿۱۰﴾ (طٰہٰ: ۱۰)

اس آیت میں بخبر کی لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ راستہ کھو چکے تھے اور "جذوۃ" و "قبس" کی لفظوں سے پتہ چلتا ہے کہ موسم سردی کا تھا۔ لہٰذا انہیں آگ کی ضرورت تھی۔

۲۔ موسیٰؑ فطری کشش کی بنا پر آگ کی طرف چل پڑے۔ یہ آگ کیسی تھی، کیا حقیقتاً وہاں یہ طبیعی آگ موجود تھی، یا معنوی نور تھا جو دور سے آگ کی طرح نظر آیا تھا، قرآن نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ موسیٰؑ وہاں پہنچے۔ اچانک اس وادی کی دائیں طرف سے ایک مبارک مقام سے جہاں ایک درخت تھا، موسیٰؑ نے کچھ آوازیں سنیں۔ قرآن نے سورہ قصص و سورہ طٰہٰ میں ان کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾ (قصص: ۳۰)

"سورہ قصص میں اسی ایک ندا کا تذکرہ ہے کہ اے موسیٰ میں ہی تمہارا پروردگار ہوں جو عالمین کا بھی رب ہے۔ لیکن سورۂ طٰہ میں متعدد آوازوں کا ذکر ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

الف۔ انی انا ربك یہ جملہ اور "انی انا اللہ رب العلمین" جو کہ سورۂ قصص میں ہے ہم معنی ہیں۔

(ب) فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾ [1]

(ج) وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾

(د) اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾

(ہ) اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾

(و) فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾ (طٰہ: ۱۲ تا ۱۶)

ان نداؤں میں حضرت موسیٰؑ کے لیے مقام نبوت پر فائز ہونے اور اصولِ دین میں سے دو اصول توحید و معاد کا پیغام تھا۔ توحید کے لیے جملہ "اننی انا اللہ لا الہ الا انا" اور "انی انا ربك" اور معاد کے لیے "ان الساعة اتیة" اور ہدف معاد کے بیان کے لیے "لتجزی کل نفسٍ بما تسعی" فرمایا:

تاہم یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ آج سے تم نبی ہو بلکہ اس قسم کے خطاب ہوتے ہی اس سے ہیں کہ جسے نبوت دے دی گئی ہو۔ اصولِ دین کے علاوہ فروعِ دین میں سے مسئلہ عبادت، جس کا روشن ترین مظہر نماز ہے، کا تذکرہ ہوا ہے۔ فرمایا: فاعبدنی واقم الصلوٰة لذکری۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کو نبوت مل گئی، اصول و فروع کے چند مسائل بتا دیئے گئے اور وحیِ الٰہی کی فرح بخش آواز ان کے کانوں میں پڑی

[1] قرآن میں اس جگہ کو جہاں موسیٰؑ نے تجلیِ الٰہی کا مشاہدہ کیا ہے، مختلف لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے:

۱۔ شاطئ الواد الایمن فی البقعة المبارکة (قصص: ۳۰)

۲۔ فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس طوی (طٰہ: ۱۲)

۳۔ و نادینه من جانب الطور الایمن و قربنه نجیا (مریم: ۵۲)

۴۔ قد انجینکم من عدو کم وواعدنکم جانب الطور الایمن۔ (طٰہ: ۸۰)

جب کہ یہاں آواز درخت سے آ رہی تھی۔ بالآخر وحی کی آواز کسی سمت سے تو موسیٰؑ کے کانوں پر پڑ نا تھی۔ اس مرتبہ حکمتِ الٰہی نے درخت کو منتخب کرلیا کہ یہ تجلی وحی کا محل قرار پائے۔ [1]

۳۔ حضرت موسیٰؑ کو منصبِ نبوت تو مل گیا لیکن غالباً نبوت کے ساتھ رسالت بھی مل جاتی ہے، ایسا کم ہوتا ہے کہ پہلے نبوت ملے اور بعد میں رسالت۔ بعض روایات میں اگر چہ آیا ہے کہ بعض انبیاء صرف اپنی ذات کے ذمہ دار تھے لیکن ننانوے فیصد انبیاء کے فرائض کا تعلق دوسروں سے تھا، یعنی اپنی ذات کے علاوہ۔

حضرت موسیٰؑ کے معجزات

حضرت موسیٰؑ کی رسالت فرعون کے پاس جا کر اُسے عذابِ الٰہی سے ڈرانا تھا تا کہ وہ جھوٹی خدائی سے توبہ کر لے اور بنی اسرائیل کو آزاد کردے۔ ظاہر ہے کہ عام لوگوں میں نبوت ورسالت کا دعویٰ، چہ جائیکہ فراعنہ کے سامنے اس ترقی یافتہ تہذیب میں نبوت ورسالت کا دعویٰ بہت بڑا دعویٰ تھا جس کے لیے دلیل و برہان کا ساتھ ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا اگر خدا نے موسیٰ کو ایسا عہدہ دیا تھا تو ضروری تھا کہ معجزہ بھی دیتا تا کہ اس غیبی قوت کے ساتھ موسیٰؑ جوش وجذبہ سے آگے بڑھتے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک بقعہ میں موسیٰؑ کو دو معجزے عطا فرمائے، ایک یہ کہ عصا پھینکیں تو وہ سانپ بن جائے اور جب اٹھالیں تو پہلی صورت پر لوٹ آئے۔ دوسرا یہ کہ اگر ہاتھ کو اپنے گریبان یا بغل میں داخل کریں تو بغیر کسی عیب ونقص کے سیف ومنور ہو جائے گا۔ گویا پہلا معجزہ ہیبت ناک اور دوسرا معجزہ امید دہندہ تھا کہ اگر دونوں کو ملائیں تو انداز و بشارت کے مظہر ہو جائیں۔ ہم یہاں وہ آیات بیان کرتے ہیں جن میں یہ دو معجزے دینے کا ذکر ہوا ہے:

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ
يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ
تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ

---

[1] جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں درخت وحیِ الٰہی کا محلِ ظہور تھا یعنی موسیٰؑ نے وحی اس طرف سے سنی تھی جب کہ "انی انا اللہ رب العلمین" سے مراد خود خدا ہے، نہ کہ درخت۔ لہٰذا اس درخت کی آواز کو اس کلمہ کے ساتھ جو منصور حلاج نے کہا تھا قیاس کرنا درست نہیں۔ اس نے کہا تھا "فانی جبتی الا اللہ"۔ (میرے جبہ میں خدا کے علاوہ کچھ نہیں) لہٰذا شیخ شبستری نے گلشنِ راز میں جو کچھ ہے وہ ایک مغالطہ ہے۔ اس نے کہا:

روا باشد انا الحق از درختی چرا نبود روا از نیک بختی

جب درخت انا الحق کہہ سکتا ہے تو ایک بندۂ نیک کیوں نہیں کہہ سکتا

بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۝۳۲

(قصص: ۳۱۔ ۳۲)

سورہ طٰہٰ میں عصا کو پھینکنے کے حکم سے پہلے اللہ نے پوچھا: ''موسیٰؑ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰؑ نے عصا کے متعلق تین چیزوں کا ذکر کیا:

۱۔ اس پر ٹیک لگاتا ہوں۔

۲۔ اس کے ذریعہ بکریوں کے لیے پتے گراتا ہوں۔

۳۔ اور دوسرے کام بھی اس سے کرتا ہوں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى۝۱۷ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى۝۱۸ (طٰهٰ: ۱۷، ۱۸)

سوال یہ ہے کہ اللہ نے یہ سوال کیوں کیا اور موسیٰؑ نے مختصر جواب دینے کی بجائے اتنا مفصل جواب کیوں دیا؟ سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ موسیٰؑ متوجہ رہیں اور خود اقرار بھی کریں کہ ان کے ہاتھ میں صرف ایک خشک لکڑی ہے تا کہ جب اسے پھینکنے کا حکم ہوا اور موسیٰؑ اسے سانپ کی صورت میں دیکھ لیں تو مطمئن رہیں کہ اُن کے پاس ایک انتہائی فوق العادہ قوت ہے تا کہ وہ اطمینان خاطر کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دے سکیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اتنا مفصل جواب اس لیے دیا کہ انہیں رب الارباب کے ساتھ گفتگو میں عجیب لذت و فرحت کا احساس ہو رہا تھا اور وہ طویل سے طویل تر بات کرنا چاہ رہے تھے۔ لہٰذا اس کی مکمل تفاصیل بتادیں تا کہ جو بھی مطلب کی بات ذکر ہو جائے، بار بار سوال کی زحمت نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى۝۱۹ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى۝۲۰ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى۝۲۱ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى۝۲۲ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى۝۲۳ (طٰهٰ: ۱۹ تا ۲۳)

انہی آیات میں کہا گیا ہے کہ عصا سانپ بن گیا۔ خطاب آیا اسے پکڑ لو تو یہ اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئے گا۔ اسی سے موسیٰؑ کی قوتِ قلب میں اضافہ ہوا تا کہ جب فرعون کے سامنے اُسے ڈالنے لگیں تو خود بھی نہ ڈر جائیں اور اُسے ہاتھ لگانے سے نہ ڈریں۔

دونوں سوروں میں دوسرے معجزہ (ید بیضا) کے ساتھ ''من غیر سوءٍ'' ذکر ہوا ہے۔ یہ جملہ بتلاتا ہے کہ ہاتھ کا چمکنے لگنا برص وغیرہ

کی طرح کسی بیماری کی وجہ سے نہیں ہ[ا] ے۔

ان آیات میں آتا ہے کہ جب موسیٰؑ نے اس سانپ کو متحرک دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے اور اپنے پیچھے بھی نہیں دیکھتے تھے۔ خطاب آیا: موسیٰؑ آگے آجاؤ اور مت ڈرو۔ آپ امان میں ہیں۔قصص (۳۱)

اسی طرح (سورہ طٰہٰ: ۲۰،۲۱) میں ارشاد ہوتا ہے: ''جب موسیٰؑ نے اس سانپ کو بھاگتے دیکھا تو ہم نے اُسے کہا کہ اسے پکڑ لو اور ڈرو نہیں''، اس ڈر سے کیا مراد ہے؟ جواب یہ ہے کہ لغتِ عرب میں خوف کے معنی خشیۃ سے مختلف ہیں۔ خوف یہ ہوتا ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے شر سے محفوظ رہ سکے۔ انسان میں یہ کیفیت فطری ہے اور مستحسن شمار کی جاتی ہے جب کہ خشیۃ روح کے اضطراب و تاثر قلبی کو کہتے ہیں۔ یہ شجاعت کی ضد ہے اور ایک قسم کی رذیلت شمار ہوتی ہے۔ اور خشیۃ انبیاء کے لیے ممکن نہیں ہے جب کہ خوف ان کے لیے ممکن ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ (احزاب: ۳۹)

''اللہ تعالیٰ کے پیامبر اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے''

لہٰذا ''واضمم الیك جناحك من الرھب'' کی تفسیر ڈر کے معنی میں نہیں کرنا چاہیے بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ بعنوان عاجزی و فروتنی ہاتھ بدن کے ساتھ لگا لو اور ہاتھوں کو اس طرح نہ پھیلائے رکھو جیسے متکبر لوگ کرتے ہیں۔

دوسرے معجزے کے بارے میں دو بیان ہیں: (۱) اُسلك یدك فی جیبك (قصص: ۳۲) (۲) واضمم الیك جناحك (طٰہٰ: ۲۱) مفسرین جب جیب کو گریبان کے معنی میں بیان کیا جب کہ دوسری آیت میں جناح کی لفظ استعمال ہوئی ہے جو بغل سے زیادہ مناسب ہے جس سے پہلو مراد ہوگا۔

یہاں تک حضرت موسیٰؑ کی نبوت و رسالت کے اعطاء کا بیان تھا۔ اب یہاں سے ان مطالب کا بیان ہوگا جن پر موسیٰؑ کی رسالت مشتمل تھی۔

رسالت موسیٰؑ کے مطالب

آیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰؑ کا اہم ترین کام دو مطلب کی تبلیغ تھا:

[ا] موجودہ تورات میں اس معجزہ کے بارے میں عبارت یوں ہے: ''جب خدا نے فرمان دیا کہ اپنے ہاتھ کو آستین کے اندر کرلو اور پھر نکالو تو اچانک ان کا ہاتھ برص والے کے ہاتھ کی طرح سفید ہوگیا''۔ توراۃ سفر خروج اصحاح ۴، آیہ ۶، قرآن یہاں تورات کے اس بیان کی تردید کرتا ہے۔

۱۔ قبطیوں کو بت پرستی چھوڑ کر خدا پرستی کی دعوت اور فرعون کی خدا فروشی کے ساتھ مبارزہ کرنا۔ آئندہ صفحات میں اس بات کا ذکر کریں گے کہ فرعون خدائی دعویٰ کے ساتھ ساتھ خداوندِ عالم کے علاوہ کسی اور خدا کی پرستش بھی کرتا ہے۔[۱]

۲۔ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے نجات دلانا تا کہ انہیں ارض موعود (فلسطین) میں لے جائیں۔ ان دو مطالب کے علاوہ اس زمانہ میں کوئی اور مسئلہ ایسا نہ تھا جس کا ذکر کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ابھی تک موسیٰؑ صاحبِ شریعت نہیں ہوئے تھے کہ اپنی شریعت کی طرف دعوت دیتے۔[۲] بہر حال یہ تو سب کو معلوم ہے کہ تورات موسیٰؑ پر فراعنہ کی تباہی اور مصر سے نکلنے کے بعد نازل ہوئی تھی۔ الہٰذا فی الحال موسیٰؑ کی تبلیغ کے لیے اہم ترین دو ہی مطالب تھے۔ ہم ان سے متعلق آیات کو بیان کرتے ہیں:

(الف) قرآن فرعون کی سرکشی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی سرکشی اس کی جھوٹی خدائی اور بت پرستی کو رواج دینا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ (طٰہ: ۲۴)

نیز

اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَاَخُوۡكَ بِاٰيٰتِىۡ وَلَا تَنِيَا فِىۡ ذِكۡرِىۡ ﴿۴۲﴾ اِذۡهَبَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ (طٰہ: ۴۲،۴۳)

علیٰ ہذا القیاس

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰۤى اَنۡ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ﴿۱۹﴾ (نازعات: ۱۷ تا ۱۹)

(ب) اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ فرعون کو نرم گوئی سے تبلیغ کریں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوۡ يَخۡشٰى ﴿۴۴﴾ (طٰہ: ۴۴)

(ج) بنی اسرائیل کو ظلم و ستم سے نجات دلانا۔ جو آیات کوہِ طور پر نازل ہوئیں اگرچہ ان میں اس کا ذکر نہیں لیکن جب دربار میں موسیٰؑ

---

[۱] ویذرك الهتك (اعراف: ۱۲۷)

[۲] مصر میں آنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ نماز اپنے گھروں میں ہی ادا کریں۔ (سورۂ یونس: ۸۷) "واوحينا الى موسىٰ واخيه ان تبوا بقو مكما مصرا بيوتاً واجعلوا بيوتكم قبلة واقيمو الصلوٰة و بشر المومنين"، اور خود موسیٰؑ کو طور پر نماز کی صورت میں عبادت کا حکم ہوا تھا۔ (طٰہ: ۱۴)

فرعون کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، تو اس مسئلہ کو بھی اٹھاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ (اعراف: ۱۰۵)

میرے لیے لازم ہے کہ اللہ کی طرف سچی بات کے علاوہ کسی بات کی نسبت نہ دوں۔ میں تیرے رب کی طرف سے دلیل لے کر آیا ہوں۔ پس بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر کے میرے ساتھ (ارضِ مقدس) بھیج دے۔

تاریخ کہتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل مہاجرین کے طور پر مصر میں زندگی بسر کرنے لگے۔ قبطی ہمیشہ ان کی تحقیر کرتے اور ان سے بیگار لیتے یعنی مشکل وحقیر کام جیسے گھر (عمارتیں) بنانا، پانی کھینچنا اور مٹی اٹھا کے لے جانا، ان سے لیے جاتے۔ حضرت موسیٰؑ فرعون سے چاہتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے اس طرح کی پابندیاں ہٹا دی جائیں اور انہیں موسیٰؑ کے ساتھ ارض مقدس کی جانب جانے دیا جائے۔ ایک اور سورہ میں ارشاد ہوتا ہے: اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ (شعرا: ۱۷) پھر فرماتا ہے: فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ (طٰہٰ: ۴۷) ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ (شعراء: ۲۲) کیا نعمت یہی ہے (کہ تم نے اپنے گھر میں مجھے بڑا کیا) جس کا مجھ پر احسان جتا رہے ہو، جب کہ بنی اسرائیل کو تم نے اپنا غلام بنا رکھا ہے؟

ہم اس آیت کی وضاحت کے لیے عرض کرتے ہیں کہ موسیٰؑ کو فرعون ہمیشہ یہ کہہ کر احسان جتلاتا تھا کہ تم وہی تو ہو جس نے بچپن ہمارے گھر گزارا اور اب آ کر ہمارے ساتھ مبارزہ کرتے ہو؟ موسیٰؑ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ کون سا احسان ہے کہ تو نے اپنے گھر میں میری پرورش کی حالانکہ اس کے مقابلہ میں تو میری قوم کو اپنا غلام بنا لیا اور اگر میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی تو اس لیے کہ تو نے انہیں اپنا غلام بنا رکھا تھا، ان کے بیٹوں کو قتل کر دیتا تھا۔ لہٰذا مجبوراً میری ماں نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ میں تمہارے گھر ہی پرورش پا کر بڑا ہوا ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کی اللہ تعالیٰ سے درخواستیں

حضرت موسیٰؑ کو اس کام کی عظمت کا اندازہ ہو گیا تھا جو ان کے کاندھوں پر ڈالا گیا تھا۔ لہٰذا اُسے پورا کرنے کے لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کچھ چیزوں کی درخواست کی:

۱۔ اُن کا سینہ فراخ کر دے۔ "رب اشرح لی صدری" (طٰہٰ: ۲۴) یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں راہ میں انہیں صبر و استقامت عطا فرما۔ [1]

---

[1] حضرت امیر المومنین کا ارشاد ہے: الة الرئاسة سعة الصدر۔ حکومت کرنے کے لیے وسیع الصدر یعنی بردبار و حلیم ہونا ضروری ہے۔ (نہج البلاغہ، حکمت ۱۷۶)

۲۔ فرائض کو ان پر آسان فرما۔ "ویسر لی امری (طہ: ۲۶) قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ موسیٰؑ نے اپنے فرض یعنی تبلیغ میں آسانی طلب نہیں کی، بلکہ اس تبلیغ کو قبول کرتے ہوئے اس کے انجام دینے کی آسانی طلب کی ہے۔

۳۔ اُن کی زبان کی گرہ کھول دے۔ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِيۡ ﴿۲۷﴾ يَفۡقَهُوۡا قَوۡلِيۡ ﴿۲۸﴾ (طٰہٰ: ۲۷، ۲۸) اس گرہ سے کیا مراد ہے؟ کیا واقعاً موسیٰؑ کی زبان میں لکنت تھی یا کچھ اور مراد ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ انہیں تبلیغ کے بیان پر قادر کردے، یعنی اُن کی زبان و بیان اس حد تک قوی ہوں کہ لوگ اُن کی بات سمجھ جائیں "یفقھوا قولی" ظاہراً یہی دوسرے معنی صحیح ہیں۔ اس پر شاہد وہ دوسری آیت ہے جس میں موسیٰؑ نے ہارون کی شراکت کی دعا کی اور فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہارون کی زبان مجھ سے افصح ہے (افصح اسم تفضیل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خود موسیٰؑ بھی فصیح اللسان تھے گویا زبان میں کسی قسم کی لکنت نہیں تھی، مترجم) ارشاد ہوتا ہے: وَاَخِيۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّيۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِيَ رِدۡاً ﴿۳۴﴾ (قصص: ۳۴) میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ اسے میرے ساتھ بھیج دے تاکہ یہ میرا مددگار و ناصر رہے۔

جن آیات میں حضرت موسیٰؑ کی یہ درخواست کہ ہارون کو کارِ تبلیغ میں میرا شریک بنا دے ذکر ہوئی ہے ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو موسیٰؑ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا حامی و مددگار کوئی شخص اُن کے اپنے خاندان سے ہو جو انہیں بہتر پہچانتا ہو، دوسرے زبان و بیان کے ذریعہ ان کی مدد کرے اور تیسرے اُن کی (موسیٰؑ کی) تصدیق کرے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھائی کے لیے بھائی کی تصدیق کیا اہمیت رکھتی ہے اور وہ بھی فرعون کے سامنے؟

جواب یہ ہے کہ ہارون کوئی عام آدمی نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ کی غیبت کے دوران اپنا ایک مقام پیدا کر چکے تھے۔ لہٰذا اگر حضرت ہارونؑ کی تصدیق فرعون کے سامنے موثر نہ بھی ہوتی تو حضرت موسیٰؑ کے مستقبل کے لیے جب کہ انہیں اپنی قوم کی رہبری کرنا تھی یقیناً موثر ہوتی۔ اب اس سے مربوط آیات پیش کی جاتی ہے:

وَاجۡعَلۡ لِّيۡ وَزِيۡرًا مِّنۡ اَهۡلِيۡ ﴿۲۹﴾ هٰرُوۡنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِيۡ ﴿۳۱﴾ وَاَشۡرِكۡهُ فِيۡۤ اَمۡرِيۡ ﴿۳۲﴾ كَيۡ نُسَبِّحَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذۡكُرَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِيۡرًا ﴿۳۵﴾ (طٰہٰ: ۲۹ تا ۳۵)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاَخِيۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّيۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِيَ رِدۡاً يُّصَدِّقُنِيۡۤ ۫ اِنِّيۡۤ اَخَافُ اَنۡ يُّكَذِّبُوۡنِ ﴿۳۴﴾ (قصص: ۳۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّيۡۤ اَخَافُ اَنۡ يُّكَذِّبُوۡنِ ﴿۱۲﴾ وَيَضِيۡقُ صَدۡرِيۡ وَلَا يَنۡطَلِقُ لِسَانِيۡ

فَاَرۡسِلۡ اِلٰی هٰرُوۡنَ ﴿۱۳﴾ (شعراء: ۱۲، ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کی تمام درخواستیں قبول فرمالیں جس کے لیے کبھی تو یوں فرمایا:

قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَكَ یٰمُوۡسٰی ﴿۳۶﴾ (طٰہٰ ۳۶)

کبھی فرمایا:

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیۡكَ وَنَجۡعَلُ لَكُمَا سُلۡطٰنًا فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡكُمَا ۚ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚ اَنۡتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۳۵﴾ (قصص: ۳۵)

یعنی ''ہم تمہارے بازو تمہارے بھائی کے ذریعہ محکم کردیں گے اور آپ دونوں کو ایسی قدرت مہیا کریں گے کہ وہ تم دونوں تک ہماری آیات کے زیر سایہ نہیں پہنچ پائیں گے اور اس تک بھی جو تمہاری پیروی کرے گا کیونکہ تم اور تمہارے پیروکار غالب رہیں گے''

یہاں تک یہ معلوم ہوگیا کہ دونوں (موسیٰؑ و ہارون) اللہ تعالیٰ کے رسول تھے جن میں ایک دوسرے کی مدد کے لیے تھا اور مشکل کام کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

ایک سوال کا جواب

اللہ تعالیٰ اور موسیٰؑ کے درمیان یہ تمام گفتگو حضرت ہارونؑ کی عدم موجودگی میں ہوئی تھی، لیکن بعض روایات میں دونوں بھائی مخاطب نظر آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب طور کے مقام پر موسیٰؑ کے علاوہ کوئی اور نہ تھا تو پھر آیت میں دونوں کو خطاب کیسے ہوا؟''

اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت اگرچہ وہاں ہارونؑ نہ تھے لیکن جب موسیٰؑ مصر پہنچے اور تمام صورت حال ہارونؑ کے گوش گزار کی تو خطاب دونوں کو شامل سمجھا جائے گا۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تبلیغ میں ہر قسم کی شکست کی نفی کردی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾ۚ فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی ﴿۴۴﴾ قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنۡ یَّفۡرُطَ عَلَیۡنَاۤ اَوۡ اَنۡ یَّطۡغٰی ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیۡ مَعَكُمَاۤ اَسۡمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾ (طٰہٰ: ۴۳ تا ۴۶)

یعنی ''تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ (تاہم) اس کے ساتھ نرمی

---

[1] مجمع البیان، ج ۴، ص ۱۲، تفسیر آیت ۴۴ سورہ طہٰ

سے گفتگو کرو، شاید وہ سمجھ جائے یا ڈر جائے۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے عرض کیا: ”خدایا! ہم ڈرتے ہیں کہیں وہ پہل نہ کر ڈالے۔ ہمارے بولنے سے پہلے ہی ہمیں قتل نہ کر دے) یا اس کی سرکشی میں اضافہ ہو جائے (بنی اسرائیل پر زیادہ ظلم کرنے لگے)“۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”مت ڈرو۔ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں“۔

پھر اس طرح خطاب الٰہی کے دو مرحلے بنتے ہیں، پہلا مرحلہ طور پر خطاب کا تھا جہاں تنہا موسیٰؑ سے خطاب تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَاَخُوۡكَ بِاٰيٰتِىۡ وَلَا تَنِيَا فِىۡ ذِكۡرِىۡ ۚ﴿۴۲﴾ (طٰہٰ: ۴۲) دوسرا مرحلہ مصر کا تھا جب موسیٰؑ وہاں پہنچے۔

بعض نے کہا ہے کہ دونوں کو اکٹھا خطاب کرنے میں کچھ مانع نہیں جب ایک موجود نہ ہو، مثلاً کسی کو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کے ساتھ دونوں جاؤ اور اس طرح کہو۔ لیکن یہ جواب صرف ایک جملہ ”اذهبا“ (تم دونوں جاؤ) کے لحاظ سے تو درست ہے کیونکہ اللہ نے قرآن میں دونوں بھائیوں کا کلام بھی نقل کیا ہے جیسا کہ فرمات ہے ”قالا ربنا“۔ اس صورت میں جواب صرف وہی بن سکتا ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں کہ خطاب الٰہی کے دو مرحلے تھے، ایک مرحلہ طور پر خطاب کا تھا جو صرف موسیٰؑ سے تھا۔ ”اذهب انت و اخوك“ دوسرا مرحلہ جب مصر پہنچے اور قبیلہ میں آن کر ہارون کو تمام صورت حال بتائی تو یہاں دوسرا خطاب آیا، یعنی اگرچہ خطاب پہلے تثنیہ کے لیے آ چکے تھے اب دونوں کو شامل ہو جائیں گے، جیسے ”قالا“، ”اذهبا“ وغیرہ۔

قرآن یہ بھی فرماتا ہے کہ تم فرعون کو دعوت دینے میں مایوس نہ ہونا۔ تمہاری دعوت دو میں سے کوئی ایک اثر ضرور ظاہر کرے گی یعنی یا تو وہ فطرت پر پلٹ آئے گا اور خداوند عالم کی ہستی کا اعتراف کر لے گا یا عذاب الٰہی سے ڈر جائے گا اور کم از کم تمہاری بعض باتوں کو قبول کر لے گا، مثلاً اگر اپنے دعوائے خدائی سے باز نہ بھی آیا تو بنی اسرائیل کو کچھ سہولیات دینے کے مطالبے کو ضرور مان لے گا۔ انہی دو نکات کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

”لعله يتذ كرا و يخشى (طہ: ۴۴) تذکر کا مطلب موحدوں کے اجتماع میں شامل ہونا ہے اور خشیت سے مراد اندرونی طور پر خشوع و خضوع ہے جو انسان کے اعمال پر موثر ہوتا ہے، مثلاً اس کی تاثیر ظالموں کے اعمال پر یہ ہوتی ہے کہ ان کے ظلم میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

(۴) فرعون کے ساتھ مبارزہ سے اس کی ہلاکت تک

حضرت موسیٰ وادی طویٰ میں وحی الٰہی کے حصول کے بعد مصر پہنچے۔ وہاں بنی اسرائیل اور اپنے بھائی ہارون سے مل کر اپنے فرائض کے بارے میں انہیں مطلع کیا۔ فطری بات ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری کا سن کر انہیں بھی کسی حد تک پریشانی ہوئی لیکن رسالت کی مشکلات انبیاء کو انجام رسالت سے نہیں روکا کرتیں۔ لہٰذا دونوں بھائی قصرِ فرعون کی طرف چل پڑے، مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر فرعون کے روبرو پہنچ کر درجِ ذیل پیغاماتِ الٰہی اُسے پہنچائے۔ یہ حصہ متعدد مراحل رکھتا ہے۔

پہلا مرحلہ

پیغاماتِ الٰہی کا ابلاغ

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

۲۔ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ (الاعراف: ۱۰۴، ۱۰۵)

۳۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾

۴۔ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَىَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾

۵۔ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ (الدخان ۱۷ تا ۱۹)

۶۔ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾

۷۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِىْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

۸۔ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

۹۔ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِىْ رَبِّىْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِىْ مِنَ

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾

۱۰۔ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾

۱۱۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾

۱۲۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾

۱۳۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

۱۴۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾

۱۵۔ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

۱۶۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

(الشعرآء ۱۸ تا ۲۸)

۱۷۔ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾

۱۸۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾

۱۹۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾

۲۰۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

۲۱۔ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ

السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾

۲۲۔ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾

۲۳۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

۲۴۔ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾ (طٰہٰ: ۴۹ تا ۵۶)

آیات کا ترجمہ

۱۔موسیٰؑ نے فرعون سے کہا: ''میں پروردگارِ عالم کی طرف سے رسول ہوں۔

۲۔میرے لیے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچی بات کے علاوہ کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے معجزہ لے کر آیا ہوں۔ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔

۳۔اس سے پہلے بھی ہم نے قومِ فرعون کو آزمایا اور ایک بزرگ وار رسول اُن کی طرف آیا تھا۔

۴۔اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو۔ میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

۵۔اللہ پر برتری کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہارے پاس واضح و روشن دلیل لایا ہوں۔

۶۔فرعون نے کہا: کیا بچپن میں تم نے ہمارے پاس پرورش نہیں پائی اور کئی سال زندگی ہمارے ساتھ نہیں گزار چکے ہو؟

۷۔جو کچھ تم نے کیا سو کیا اور تم نے ہمارے احسان کی قدر نہ کی۔

۸۔موسیٰؑ نے کہا کہ وہ کام جو میں نے کیا تھا وہ میری غلطی تھی۔

۹۔جب میں ڈرا تو تمہارے درمیان سے بھاگ نکلا۔ پس اللہ نے مجھے نبوت و رسالت عطا فرمائی اور مجھے انبیاء سے قرار دیا۔

۱۰۔کیسا احسان مجھ پر جتلاتے ہو (کہ تم نے بچپن میں میری پرورش کی) جب کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔

۱۱۔فرعون نے کہا کہ پروردگارِ عالم کون ہے؟

۱۲۔موسیٰ نے کہا وہی جو زمینوں، آسمانوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کا رب ہے اگر تم یقین رکھتے ہو۔

۱۳۔فرعون نے اپنے مصاحبوں سے کہا: کیا سن رہے ہو کہ یہ کیا کہتا ہے؟

۱۴۔موسیٰؑ نے (ان سے سبقت کرتے ہوئے) کہا: وہ تمہارا رب اور تمہارے آباؤ اجداد

کا رب ہے۔ [۱]

۱۵۔فرعون نے کہا: ''تمہاری طرف ایسا رسول بھیجا گیا ہے جو دیوانہ ہے''۔

۱۶۔موسیٰؑ نے (اپنے مدعا کو دوسری طرح بیان کرتے ہوئے) کہا: مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کا رب! اگر تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔

۱۷۔فرعون نے کہا: تم دونوں (موسیٰ وہارونؑ) کا پروردگار کون ہے؟

۱۸۔موسیٰؑ نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو خلق فرمایا اور پھر اُسے زندگی میں ہدایت عطا فرمائی۔

۱۹۔فرعون نے کہا: ''جو قومیں پہلے گزر چکی ہیں اُن کی کیا کیفیت ہے؟''

۲۰۔موسیٰؑ نے کہا: ہر قوم کے اعمال میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہیں۔ میرا پروردگار نہ خطا کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔

۲۱۔ وہ میرا پروردگار جس نے زمین کو تمہارے لیے گہوارہ قرار دیا، اس میں تمہارے لیے رستے بنائے اور آسمان سے پانی بھیجا جس کے ذریعے مختلف قسم کے پودے اُگائے۔

۲۲۔خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ تحقیق اس میں صاحبان خرد کے لیے نشانیاں ہیں۔

۲۳۔ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اس میں تمہیں لوٹائیں گے اور ایک دفعہ پھر اسی سے تمہیں نکالیں گے۔ [۲]

۲۴۔ہم نے اسے اپنی تمام نشانیاں دکھلا دیں۔ اس نے انہیں جھٹلایا اور ماننے سے انکار کیا۔

---

[۱] یہ بھی احتمال دیا جاسکتا ہے کہ قال کا فاعل فرعون ہو، یعنی یہ کلمہ اسنے کہا ہوتا کہ اس طرح سے موسیٰؑ کا تمسخر اڑائے۔

[۲] احتمال یہ ہے کہ "الذی جعل لکم" کے جملہ سے ''تارۃ اخری'' کی رسالت موسیٰؑ کے افراد سے اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے۔موسیٰؑ یا فرعون سے نہیں۔ اس ادغامِ گفتگو کی وجہ ظاہر ہے کہ کیونکہ اس گفتگو کے لیے قرآن نے اسی مقام کو موزوں جانا ہے۔اللہ تعالیٰ موسیٰؑ و فرعون کے درمیان مناظرہ میں دلائلِ توحید کا ذکر فرماتا ہے۔اگرچہ یہاں پر یہ موسیٰؑ کی گفتگو کا حصہ نہ بھی قرار پاتا ہو۔اس احتمال کی آخر میں آنے والے جملہ "منہا خلقنکم'' سے تائید ہوتی ہے کیونکہ یہ جملہ لازماً حضرت موسیٰؑ کی گفتگو کا حصہ نہیں ہے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ان آیات میں حضرت موسیٰؑ کے فرعون کے ساتھ مذاکرات کا بیان ہے جو نرمی سے شروع ہوتے ہیں اور آخر میں باتوں میں تندی آ جاتی ہے۔حضرت موسیٰؑ نے گفتگو کی ابتدا اپنی پہچان کے ذریعہ کی کہ میں پروردگارِ عالم کی طرف سے رسول ہوں۔(اعراف:۱۰۴) پھر اپنے اُن دو تبلیغی مطالب کو مختلف عبارتوں میں ذکر کیا۔ایک یہ کہ فرعون سرکشی ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرے۔اس پیغام کو جملہ "ان لا تعلوا علی اللہ" (دخان:۱۹) کے ساتھ ادا کیا۔

دوسرا یہ کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے تاکہ وہ حضرت موسیٰ کے ہمراہ مصر سے چلے جائیں۔ فَاَرۡسِلۡ مَعِیَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۰۵﴾ (اعراف:۱۰۵)-اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۸﴾ (دخان:۱۸)

فرعون نے بھی یہ کلام سن کر ابتدا میں نرم اور محبت آمیز گفتگو کی اور کہا کہ تم کیوں ایسی باتیں کرتے ہو؟ کیا میرے حقوق کو بھول گئے ہو؟ بچپن میں میں نے تمہاری پرورش کی تھی۔قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّکَ فِیۡنَا وَلِیۡدًا وَّ لَبِثۡتَ فِیۡنَا مِنۡ عُمُرِکَ سِنِیۡنَ ﴿۱۸﴾ (شعراء:۱۸) اس کے بعد لہجہ کسی قدر سخت کر کے کہا: ''کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے ہمارا ایک آدمی قتل کر دیا تھا اور ہم نے جو تمہیں سہولت دے رکھی تھی تم نے اس کی قدر نہ کی''۔

وَ فَعَلۡتَ فَعۡلَتَکَ الَّتِیۡ فَعَلۡتَ وَ اَنۡتَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹﴾ (شعراء:۱۹)

حضرت موسیٰؑ نے اس کی دونوں باتوں کا جواب دیا۔ پہلے اس آدمی کے قتل کی بات کی اور کہا کہ وہ قتل عمداً نہیں تھا بلکہ خطائی تھا۔اس وجہ سے میں نے مدین کا قصد کر کے مصر کو چھوڑ دیا تھا۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ فَعَلۡتُہَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیۡنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرۡتُ مِنۡکُمۡ لَمَّا خِفۡتُکُمۡ فَوَہَبَ لِیۡ رَبِّیۡ حُکۡمًا وَّ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۱﴾ (شعراء:۲۰،۲۱)

اس آیت میں جو حکماً کا کلمہ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ کیا اس سے وہ حکمت وفرزانگی مراد ہے جو رسالت سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو عطا کی گئی تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ اسۡتَوٰۤی اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ (قصص:۱۴) لیکن خیال یہ ہے کہ اس سے مراد نبوت ہوگی کیونکہ جب یہ منصب دیا گیا اس وقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:''جب میں تمہارے ہاں سے چلا گیا تو اللہ نے مجھے عہدہ عطا فرمایا اور مجھے مرسلین سے قرار دیا''۔پس ایک حکم مدین کی طرف ہجرت سے پہلے دیا تھا، اور ایک حکم ہجرت کے بعد۔لہٰذا یہ حکم یقیناً اس کے علاوہ ہوگا۔لہٰذا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پہلے حکم کے معنی حکمۃ وفرزانگی اور دوسرے حکم کے معنی نبوت ہیں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اس کی پہلی بات کا جواب دیتے ہیں: ''صحیح ہے کہ میں نے تمہارے ہاں پرورش پائی، لیکن اس کے سبب تم خود تھے۔مجھے تمہارے گھر پرورش پانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا، تمہارا خوف سب پر غالب تھا۔

تمہارے خوف کی وجہ سے مجھے دریا میں ڈال دیا گیا جس کے نتیجہ میں میں تمہارے محل میں پہنچ گیا اور وہاں پرورش پانے لگا۔ یہ کیسا احسان مجھ پر جتلاتے ہو جب کہ اس کا سبب وہ غلامی کا طوق ہے جو تم نے بنی اسرائیل کے گلے میں ڈال رکھا تھا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿۲۲﴾ (شعراء:۲۲)

حضرت موسیٰؑ کی فرعون کے خلاف دلیل

یہاں تک ہم حضرت موسیٰؑ و فرعون کے مابین ابتدائی گفتگو سے مطلع ہوئے جس میں موسیٰؑ کی دعوت کے جواب میں فرعون گلے شکوے کھول بیٹھا۔ لیکن بعد والا مرحلہ استدلالی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے دو تبلیغی مطالب میں سے پروردگارِ عالم کی ربوبیت والی بات پر فرعون زیادہ چیں بہ جبیں ہوا مگر بنی اسرائیل کی آزادی کے بارے میں کچھ نہ بولا۔ اس مرحلہ میں ان کی گفتگو کا آغاز اس طرح ہوا:

حضرت موسیٰؑ مدعی ہیں کہ کائنات کا صرف ایک رب ہے جس کے حکم کے تحت اس کا نظام چل رہا ہے اور اسی طرح اس کائنات کا خالق بھی بس ایک ہی ہے۔ لہٰذا تیری ربوبیت کا کوئی محل نہیں۔ یہ بات سن کے فرعون نے موسیٰؑ سے پوچھا: ''اس کائنات کا پروردگار کون ہے؟'' یعنی ''وما رب العلمین o

موسیٰؑ نے کہا: ''زمین، آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کا رب، اگر تم یقین کرنے والے بنو؟'' ''رب السموات والارض وما بینهما ان کنتم موقنین o

فرعون اپنے درباریوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے: ''کیا تم سن نہیں رہے کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ یعنی ''الا تستمعون''۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا: ''پروردگارِ عالم! وہی تمہارا رب ہے اور تمہارے آباؤ اجداد کا رب بھی وہی ہے، یعنی ''ربکم و رب ابائکم الاولین o

فرعون نے کہا: ''یہ رسالت کا دعویٰ دار جو ہماری طرف بھیجا گیا ہے دیوانہ ہے: یعنی ''قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون o

حضرت موسیٰؑ نے موقع غنیمت جانا اور دیوانگی کے اتہام کا جواب دیئے بغیر اللہ تعالیٰ کی پہچان دوسرے طریقے سے کروائی اور کہا: ''وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا رب ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو؟ یعنی ''قال رب المشرق و المغرب و ما بینهما ان کنتم تعقلون o

سورہ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان مناظرہ ایک اور طریقہ سے بھی ہوا، وہ یوں کہ فرعون نے کہا: ''اے موسیٰؑ! تم دونوں کا پروردگار کون ہے؟ یعنی ''فمن ربکما یموسیٰ۔

موسیٰؑ نے جواب دیا: ''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے تمام موجودات کو خلق فرمایا، اس کے بعد انہیں اس ہدف کی طرف راہنمائی کی جس کے لیے وہ خلق ہوئے تھے یعنی ''قال ربنا الذی اعطیٰ کل شیءٍ خلقه ثم هدیٰ''۔ شاید کسی انسان نے اس دن تک اس طرح کا مضبوط و استوار کلام نہیں سنا تھا کہ جواب وحی کے نتیجہ میں بیان ہوا۔ کیسے ایک مختصر سے جملہ میں انتہائی محکم و استوار انداز میں رب العالمین کی

پہچان کروائی ہے اور بتایا گیا ہے کہ پروردگارِ عالم وہی ہے جو اس کائنات کا خالق ہے۔ اس نے اس کائنات کو خلق کیا اور انہیں زندگی کے آداب اور راہ و رسم سکھائے۔ ہر قسم کے پودے، جاندار اور انسان فطری رہنمائی کے ساتھ ابتدائے خلقت سے شاہراہِ حیات پر گامزن ہوتے ہیں۔

فرعون نے مغالطہ کی خاطر سابقہ اقوام کی صورتِ حال پیش کی۔ مانندِ قوم نوح، عاد و ثمود جو بت پرست تھے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اس نے کہا: ''پہلی اقوام کا کیا ہوگا۔ یعنی ''قال فما بال القرون الاولی۔ [1]

حضرت موسیٰؑ نے کہا: اُن کے اعمال میرے رب کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہیں، وہ پروردگار جو نہ خطا کرتا ہے اور نہ فراموش کرتا ہے یعنی ''قال علمها عند ربی فی کتابٍ لا یضل ربی ولا ینسی (طٰهٰ: ۵۲)

ان آیات کے بعد اللہ تعالیٰ کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ خیال تو یہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے اور مناسبت سے یہاں ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا سابقاً ہم نے صرف ان آیات کے ضمن میں ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔

یہاں تک ہم حضرت موسیٰؑ کے منطقی کلام اور فرعون کے احمقانہ جوابات سے مطلع ہوئے۔ جب فرعون نے دیکھا کہ موسیٰؑ پیچھے ہٹنے والے نہیں تو دوسرے طریقہ سے بحث کرنے لگا جس کی مثال سابقہ امم میں بھی ذکر ہو چکی ہے۔ اب اس کے بعد حضرت موسیٰ کی رسالت کا یہ حصہ موردِ بحث قرار پائے گا۔

---

[1] قرون قرن کی جمع ہے جس کے معنی وہ اقوام ہیں جو ایک زمانہ میں زندگی بسر کرتی رہی ہوں، یعنی ''ولقد اھلکنا القرون من قبلکم'' (یونس: ۱۳) بال کے معنی حال و حالت کے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''ویصلح بالھم'' (محمد: ۵)

دوسرا مرحلہ

اتہامات، دھمکیاں اور معجزہ کی درخواست

اس دوسری نشست یا پہلی نشست کہ جو ابھی تک جاری تھی، میں ہی فرعون سابقہ اقوام کی طرح موسیٰؑ کو دبانے کے لیے تین طریقے اختیار کرتا ہے:

۱۔ اتہام
۲۔ دھمکی
۳۔ معجزہ کی درخواست

ہم پہلے آیات کو بیان کرتے ہیں۔

موضوع سے متعلق آیات [۱]

۱۔ قَالَ اِنَّ رَسُوۡلَكُمُ الَّذِىۡۤ اُرۡسِلَ اِلَيۡكُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ ﴿۲۷﴾ (الشعرا: ۲۷)

۲۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذۡتَ اِلٰهًا غَيۡرِىۡ لَاَجۡعَلَنَّكَ مِنَ الۡمَسۡجُوۡنِيۡنَ ﴿۲۹﴾

(الشعرا: ۲۹)

۳۔ قَالَ اَوَلَوۡ جِئۡتُكَ بِشَىۡءٍ مُّبِيۡنٍ‌ ﴿۳۰﴾

۴۔ قَالَ فَاۡتِ بِهٖۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾

---

[۱] بعینہ یہی آیات (شعرائ: ۳۰ تا ۳۵) معمولی سے اختلاف کے ساتھ سورۂ اعراف میں دو جگہ وارد ہوئی ہیں (آیت ۱۰۶ تا ۱۱۰) وہ اختلاف ایک تو 'اولو جئتك بشيءٍ مبين' میں ہے کہ سورہ اعراف میں "قال ان کنت جئت بآية" آیا ہے۔ دوسرا اختلاف حضرت موسیٰؑ پر سحر کی تہمت لگانے کے سلسلہ میں ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے کہ خود فرعون نے اتہام لگایا اور سورۂ اعراف میں ہے کہ ایسا کرنے والے فرعون کے درباری تھے: "قال الملاء من قوم فرعون ان هذا ساحر علیه" لیکن ان دونوں نسبتوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

۵۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴿۳۲﴾

۶۔ وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۳۳﴾

۷۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۴﴾

۸۔ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

(الشعر ۳۰ تا ۳۵)

۹۔ وَفِیْ مُوْسٰۤى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾

۱۰۔ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ (الذریت: ۳۸،۳۹)

۱۱۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ
فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

۱۲۔ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ
وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ (اسرآء ۱۰۲:۱۰۱)

۱۳۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۳﴾

۱۴۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾

۱۵۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْۤا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ
وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ (مومن: ۲۳ تا ۲۵)

۱۶۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾ (الزخرف: ۴۷)

۱۷۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا
سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۶﴾ (القصص: ۳۶)

۱۸۔ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ
عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ (القصص: ۳۷)

۱۹۔ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶

۲۰۔ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ
السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷

۲۱۔ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاۗءُ فِي
الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۸ (یونس: ۷۶ تا ۷۸)

۲۲۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۳

۲۳۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۴ (النمل: ۱۳، ۱۴)

آیات کا ترجمہ:

۱۔ فرعون نے کہا: جو رسول تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، دیوانہ ہے۔

۲۔ اگر تو نے میرے علاوہ کسی کو خدا جانا تو تجھے زندان میں ڈال دوں گا۔

۳۔ موسیٰؑ نے کہا: اگرچہ تیرے پاس روشن وواضح دلیل ہی کیوں نہ لاؤں۔

۴۔ فرعون نے کہا: اگر سچ کہتا ہے تو اپنی دلیل پیش کر۔

۵۔ موسیٰؑ نے اپنا عصا ڈالا جو اچانک اژدہا بن کر ظاہر ہوا۔

۶۔ (پھر موسیٰؑ نے) اپنا ہاتھ بغل سے نکالا تو وہ اچانک دیکھنے والوں کے لیے درخشاں ومنور ہو گیا۔

۷۔ فرعون نے اپنے حلقہ نشینوں سے کہا کہ یہ بڑا دانا جادوگر ہے۔

۸۔ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے ذریعہ تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال دے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

۹۔ موسیٰؑ کو یاد کرو جب ہم نے اُسے فرعون کے پاس دلیل (معجزہ) کے ساتھ بھیجا۔

۱۰۔ اس نے بوجہ اپنی قوت کے پشت پھیر لی اور کہا کہ موسیٰؑ جادوگر ہے یا دیوانہ۔

۱۱۔ ہم نے موسیٰؑ کو نو معجزے عطا فرمائے۔ بنی اسرائیل سے پوچھو کہ جب وہ اُن کے پاس آیا تو

فرعون نے کہا کہ اے موسیٰؑ میں گمان کرتا ہوں تجھ پر جادو کر دیا گیا ہے۔

۱۲۔ موسیٰ نے فرعون سے کہا: تم جانتے ہو کہ یہ دلائل و معجزات پروردگارِ آسمان و زمین کے علاوہ کسی اور نے نہیں بھیجے اور اے فرعون میں تو تجھے ہلاک شدہ دیکھ رہا ہوں۔

۱۳۔ ہم نے موسیٰؑ کو نشانیوں اور روشن دلائل کے ساتھ بھیجا۔

۱۴۔ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف! انہوں نے کہا یہ جھوٹا جادوگر ہے۔

۱۵۔ جب موسیٰؑ ہماری طرف سے ان کے لیے آئینِ حق لائے تو انہوں نے کہا کہ جو موسیٰؑ پر ایمان لائیں ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دو، کفار کا حیلہ گمراہی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

۱۶۔ جب وہ (موسیٰؑ) ہماری نشانیوں کے ساتھ ان کی طرف آیا تو وہ اچانک اس پر ہنسنے لگے۔

۱۷۔ موسیٰؑ جب دلائل و معجزات لے کر ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ جھوٹے جادو کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے ایسی کوئی چیز نہیں سنی۔

۱۸۔ موسیٰؑ نے کہا: میرا خدا اسے جو اس کی طرف سے ہدایت لایا ہے اور اس کو جس کا آخرت میں اچھا انجام ہوگا، خوب جانتا ہے اور بتحقیق ظالم فلاح و کامیابی نہیں پا سکتے۔

۱۹۔ جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو انہوں نے کہا بتحقیق یہ تو کھلا جادو ہے۔

۲۰۔ موسیٰؑ نے اُن سے کہا کہ کیا تم اس حقیقت کو جو تمہارے پاس اللہ کی جانب سے آئی ہے، سحر و جادو کہتے ہو، حالانکہ جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۲۱۔ انہوں نے کہا: اے موسیٰؑ! یہاں اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اس آئین سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے آباو اجداد کو پایا تھا اور تم دونوں یہاں کے بڑے بن جاؤ۔ ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے۔

۲۲۔ جب ہماری واضح نشانیاں اُن کے پاس آئیں تو انہوں نے کہا: یہ تو کھلا جادو ہے۔

۲۳۔ وہ دل میں تو ان آیات کا یقین رکھتے تھے لیکن زبان سے انکار کر رہے تھے، ظلم و تکبر کی وجہ سے۔ دیکھئے فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے!

آیات کی موضوعی تفسیر

مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ فرعون اور اس کے حاشیہ نشینوں نے حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں مختلف قسم کے ردِعمل کا اظہار کیا جو درج ذیل صورت پر تھا:

(الف) تہمت

سابقہ اقوام کا دستور بھی انبیاء پر تہمتیں لگانا ہی تھا کیونکہ یہ آسان ترین حربہ ہے کہ تہمت لگا کر لوگوں کو اس کی طرف مائل ہونے سے روکا جائے۔ وہ تہمتیں کچھ اس طرح سے تھیں:

ا۔ ساحر

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ (شعراء ۳۴)

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ (یونس: ۷۶)

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ (نمل: ۱۳)

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ (اعراف: ۱۰۹)[1]

۲۔ کذاب (جھوٹا)

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ (مومن: ۲۴)

قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى (قصص: ۳۶)

۳۔ جنون (دیوانگی)

فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ (اسراء: ۱۰۱)

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ (شعراء: ۲۷)

---

[1] چونکہ اس آیت کا مضمون سورہ شعراء کی آیت ۳۴ جیسا ہی ہے اس لیے اسے آیات میں سابقاً ذکر نہیں کیا گیا۔

وَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ (ذاریات: ۳۹)

۴۔الف۔ برتری طلب کرنا

وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ (یونس: ۷۸)

(ب) آباؤاجداد کے طریق سے ہٹانا

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (یونس: ۷۸)

(ج) تمسخر

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝ (زخرف: ۴۷)

(د) دھمکیاں

قتل کر دینا

لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ (شعراء: ۲۹)

قتل کر دینا

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ (مومن: ۲۵)

(ھ) لجاجت

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ (نمل: ۱۴)

(۵) زمینوں پر قبضہ

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ (شعراء: ۳۵)

یہاں تک ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ردِ عمل کا بیان پیش کیا۔ اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی مرحلہ پر بھی حضرت موسیٰؑ نے

کوئی کمزری نہیں دکھائی۔ انہوں نے صرف چند روحانی مسائل کو موضوعِ اعتراض بنایا جن کا اثبات ونفی مشکل کام ہے، البتہ دوسروں کے لیے حیرانی و پریشانی کا کسی حد تک موجب بن سکتا ہے۔ موسیٰؑ میں کوئی نقطۂ ضعف نہ تھا، ورنہ وہ اعتراض کے طور پر اس کا ذکر کرتے۔ اس سے یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ اس قسم کے اعتراض مخالفین کی طرف سے درحقیقت انبیاء کی پاکدامنی پر دلیل ہوتے ہیں کیونکہ اُن کی ذات میں اگر کوئی عیب یا نقص ہوتا تو یقینا مخالفین اُسے سامنے لاتے۔

اب دیکھنا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان تہمتوں کے جواب میں کیا فرمایا:

جیسا کہ بیان ہو چکا اس قسم کی تہمتیں جواب کی محتاج نہیں ہوتیں۔ لہٰذا حضرت موسیٰؑ بھی جواب میں صرف اپنی حقانیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اولو جئتك بشيءٍ مبين" (شعراء: ۳۰) پھر سورہ قصص ۳۷ میں ارشاد ہوتا ہے: رَبِّيٓ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰى مِنۡ عِنۡدِهٖ اس کے بعد انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم معجزہ اور جادو کے درمیان کیوں فرق نہیں کر سکتے؟

قَالَ مُوۡسٰٓى اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمۡ ؕ اَسِحۡرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ۝ (یونس: ۷۷)

یہاں تک ان کے زبانی اعتراضات کے مقابلہ میں موسیٰؑ نے بڑے منطقی انداز میں مقابلہ کیا جس سے ہم آشنا ہوئے۔ اب انہوں نے عملی طور پر موسیٰؑ کے دعویٰ کو جھٹلانے کے منصوبے بنانا شروع کیے۔ بعد والی بحث اس مرحلہ کے بیان میں ہے۔

تیسرا مرحلہ

جادوگروں کی طلبی

باوجود اس کے کہ انہوں نے بصیرت کی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کا عمل جادو نہیں ہے، تاہم لوگوں کو گمراہ کرنے اور شورش سے خوف کی بنا پر انہوں نے طے کیا کہ مصر کے اطراف سے قاصد بھیج کر بڑے بڑے جادوگر منگوا لیے جائیں اور ایک مقررہ دن دونوں فریق اپنے اپنے کام کا مظاہرہ کریں تا کہ اس طرح سے موسیٰ و ہارونؑ کو شکست دی جائے۔

چنانچہ بڑے بڑے جادوگروں کو بلوایا گیا۔ فرعون نے جادوگروں سے کہا: اگر تم لوگ کامیاب ہو گئے تو میرے مقرب قرار پاؤ گے۔ لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ اللہ کے کاموں اور جادوگروں کے شعبدوں میں کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ موسیٰؑ کا عصا تھا جو امرِ خدا سے حقیقی اژدھا بن گیا جب کہ جادوگروں کے محدود علم کی صرف یہ صلاحیت ہے کہ ایک ظاہری تماشا دکھا سکتے ہیں جس کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ جانور کے چمڑے سے سانپ کی شکل تو بنا سکتے ہیں، اسے پارے سے بھرتے ہیں تا کہ سورج کے سامنے حرکت کرنے لگے، لیکن جو عصائے موسیٰؑ کا سانپ ہے وہ حقیقی ہے۔ لہٰذا سب کو کھانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ پہلے اس موضوع سے مربوط آیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

۲۔ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

۳۔ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

۴۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾

۵۔ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾

۶۔ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا

وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ ﴿٦٣﴾

۷۔ فَأَجْمِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوا صَفًّا ۚ وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَىٰ ﴿٦٤﴾

۸۔ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِمَّا أَن تُلْقِيَ وَإِمَّا أَن نَّكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَلْقَىٰ ﴿٦٥﴾

۹۔ قَالَ بَلْ أَلْقُوا ۖ فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا
تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾

۱۰۔ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ﴿٦٧﴾

۱۱۔ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ﴿٦٨﴾

۱۲۔ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا ۖ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ ۖ وَلَا
يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴿٦٩﴾

۱۳۔ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ ﴿٧٠﴾

۱۴۔ قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ
السِّحْرَ ۖ فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي
جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ ﴿٧١﴾

۱۵۔ قَالُوا لَن نُّؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا ۖ فَاقْضِ مَا
أَنتَ قَاضٍ ۖ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٧٢﴾

۱۶۔ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۗ وَاللَّهُ
خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿٧٣﴾

۱۷۔ إِنَّهُ مَن يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴿٧٤﴾

۱۸۔ وَمَن يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ ﴿٧٥﴾

۱۹۔ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَن

تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ (طٰهٰ: ۵۸ تا ۷۶)

۲۰۔ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

۲۱۔ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

۲۲۔ وَجَاۗءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

۲۳۔ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

۲۴۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

۲۵۔ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَاۗءُوْ

بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

۲۶۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

۲۷۔ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

۲۸۔ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

۲۹۔ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

۳۰۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾

۳۱۔ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

۳۲۔ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي

الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

۳۳۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

۳۴۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

۳۵۔ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاۗءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

۳۶۔ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ
وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا
فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴿۱۲۷﴾ (الاعراف ۱۱۱ تا ۱۲۷)
۳۷۔ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾
۳۸۔ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾
۳۹۔ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾
۴۰۔ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾
۴۱۔ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾
۴۲۔ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ
الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾
۴۳۔ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾
۴۴۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾
۴۵۔ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾
۴۶۔ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾
۴۷۔ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾
۴۸۔ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾
۴۹۔ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾
۵۰۔ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ
السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ
وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

۵۱۔ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۚ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝۵۰
۵۲۔ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۱

(الشعرآ ۳۶ تا ۵۱)

۵۳۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝۷۹
۵۴۔ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝۸۰
۵۵۔ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۱
۵۶۔ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲ (یونس ۷۹ تا ۸۲)

۱۔ ہم بھی تیرے جادو کے مقابلہ میں جادو لائیں گے۔ تو ہمارے ساتھ وعدہ گاہ کے طور پر ایک معین جگہ قرار دے، نہ تم اس کے خلاف کرو گے نہ ہم ایسا کریں گے (حسبِ وعدہ پہنچ جائیں گے)۔

۲۔ موسیٰؑ نے کہا: تمہارے وعدہ کا دن زینت والا دن ہوگا۔ جب لوگ چاشت کے وقت اکٹھے ہوتے ہیں۔

۳۔ فرعون نے منہ پھیر لیا، اپنے حیلہ گروں (جادوگروں) کو اکٹھا کیا اور میدانِ مقابلہ میں پہنچ گیا۔

۴۔ موسیٰؑ نے انہیں (جادوگروں سے) کہا: ہلاکت ہو تم پر۔ اللہ پر جھوٹ نہ باندھو، مبادا وہ تم سب کو ہلاک کر دے اور خسارے میں ہے وہ شخص جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

۵۔ جادوگر ایک دوسرے سے جھگڑنے اور سرگوشیاں کرنے لگے۔

۶۔ فرعون اور اس کے حاشیہ نشینوں نے جادوگروں سے کہا: یہ دونوں (موسیٰؑ و ہارونؑ) جادوگر ہیں جو اپنے جادو کے ذریعہ تمہیں تمہاری سرزمین سے نکالنا چاہتے ہیں اور تمہارے مثالی آئین کو راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں]

۷۔ اپنی تدبیریں کرلو اور ایک صف میں آ جاؤ۔ جو آج جیت گیا در حقیقت کامیاب وہی ہے۔

۸۔انہوں نے کہا: اے موسیٰؑ! یا تم پہلے ڈالو گے یا ہم پہلے ڈالیں۔

۹۔موسیٰؑ نے کہا: تم ہی پہلے ڈالو۔انہوں نے رسیاں اور چھڑیاں پھینکیں تو اُن کے جادو نے انہیں یوں بنادیا گویا وہ لپکتے ہوئے سانپ ہیں۔

۱۰۔موسیٰؑ دل میں ڈر رہے تھے۔

۱۱۔ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ مت ڈرو، کامیابی تمہاری ہی ہوگی۔

۱۲۔جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اسے ڈال دو تا کہ وہ نگل لے اس کو جو کچھ انہوں نے بنایا ہے وہ جادو ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی جائے۔

۱۳۔(موسیٰؑ نے عصا ڈال دیا اور اس نے سب کو نگل لیا) جادوگر سجدہ میں گر گئے اور کہنے لگے کہ ہم موسیٰؑ و ہارونؑ کے رب پر ایمان لائے۔

۱۴۔فرعون نے اُن سے کہا: میری اجازت کے بغیر تم اس پر ایمان لے آئے ہو۔وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں الٹی طرف سے کاٹ دوں گا اور کھجور کے تنوں پر تمہیں پھانسی دے دوں گا تا کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت اور طاقت ور ہے۔

۱۵۔جادوگروں نے کہا: خدا کی قسم! ہم تجھے ہرگز ترجیح نہیں دیں گے ان روشن دلیلوں پر جو ہمارے پاس آ چکی ہیں قسم ہے اس کی جس نے ہمیں خلق کیا۔جو کرنا ہے کرلو۔تو صرف یہ دنیاوی زندگی ہی ختم کر سکتا ہے۔

۱۶۔ہم اپنے رب پر ایمان لائے ہیں تا کہ ہماری لغزشیں (خطائیں) اور جو تم نے ہمیں جادو پر مجبور کیا بخش دے۔اللہ ہی بہتر اور توانا ہے۔

۱۷۔بتحقیق جو اپنے رب کے پاس گنہگار جائے گا، اس کے لیے جہنم ہے، جس میں نہ موت ہوگی اور نہ وہ زندہ رہ سکے گا۔

۱۸۔جو شخص اللہ کی طرف باایمان جائے گا اور اس نے اعمال صالحہ کیے ہوں گے اس کے لیے بلند

درجات ہیں۔

۱۹۔جاوداں باغات میں جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ہے اس کی جزا جس نے اپنے آپ کو (آلودگیوں سے) پاک کرلیا ہو۔

۲۰۔فرعون کے حاشیہ نشینوں نے کہا: موسیٰ اور اس کے بھائی کو روک لو اور کچھ افراد کو دوسرے شہروں میں بھیجو۔

۲۱۔تا کہ وہ سب دانا جادوگروں کو لے آئیں۔

۲۲۔جادوگر فرعون کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے پوچھا: ''اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمارے لیے کوئی اجر ہوگا؟

۲۳۔فرعون نے کہا: ہاں! اس صورت میں تم ہمارے مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔

۲۴۔جادوگروں نے موسیٰؑ سے کہا: تم ڈالو گے یا ہم ڈالیں۔

۲۵۔موسیٰؑ نے کہا: پہلے تم ڈالو۔ جب انہوں نے پھینکا تو لوگوں کی نظر بندی کردی، انہیں ڈرا دیا اور وہ عظیم جادو لائے۔

۲۶۔ہم نے موسیٰ کو وحی کی: تم اپنا عصا پھینکو۔ انہوں نے عصا پھینکا تو یکا یک وہ اُن کے اس جھوٹے مظاہرے کو کھانے لگا۔

۲۷۔حق ظاہر ہو گیا اور جو عمل انہوں نے کیا تھا وہ باطل ہو گیا۔

۲۸۔جادوگر مغلوب و خوار ہو گئے۔

۲۹۔جادوگر سجدے میں گر گئے۔

۳۰۔انہوں نے کہا: ہم پروردگارِ عالم پر ایمان لے آئے۔

۳۱۔جو موسیٰؑ و ہارونؑ کا رب ہے۔

۳۲۔فرعون نے کہا: تم نے ایمان قبول کر لیا اس سے پہلے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا۔ یہ وہی حیلہ ہے جو تم نے اس شہر کے بارے میں سوچ رکھا تھا تا کہ اس کے رہنے والوں کو اس سے نکال

باہر کرو۔ عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا۔

۳۳۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کاٹ ڈالوں گا۔ پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔

۳۴۔ جادوگروں نے کہا: ہم اپنے رب کی طرف لوٹ جائیں گے۔

۳۵۔ تو ہم سے انتقام نہیں لے رہا مگر چونکہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لے آئے ہیں جب وہ ہمارے سامنے آئیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں صبر عطا فرما اور ہمیں مسلمان ہوتے ہوئے موت دے۔

۳۶۔ فرعون کے حاشیہ نشینوں نے کہا: کیا تم موسیٰؑ و ہارونؑ کو آزاد چھوڑ دو گے کہ وہ زمین میں فساد برپا کرتے پھریں اور تیرے خداؤں کو ترک کر دیں؟ فرعون نے کہا: ”ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے، ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیں گے اور ہم ان پر غلبہ رکھتے ہیں۔

۳۷۔ انہوں نے کہا: موسیٰؑ اور اس کے بھائی کو روک لو اور کسی کو شہر بھیج دو،

۳۸۔ کہ وہ تیرے پاس دانا جادوگروں کو لے آئیں۔

۳۹۔ جادوگر اس دن مقررہ وقت پر حاضر ہو گئے۔

۴۰۔ لوگوں سے کہا گیا: کیا تم بھی اس اجتماع میں شرکت کرو گے

۴۱۔ تاکہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے تو ان کی پیروی کرو؟

۴۲۔ جب جادوگر آئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا: اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمیں کوئی اجر ملے گا؟

۴۳۔ فرعون نے کہا: ہاں! کامیابی کی صورت میں تم میرے مقربین سے ہو جاؤ گے۔

۴۴۔ موسیٰؑ نے جادوگروں سے کہا: جو کچھ پھینکنا چاہتے ہو پھینکو!

۴۵۔ جادوگروں نے اپنی رسیاں اور چھڑیاں پھینکیں اور کہا: عزت فرعون کی قسم ہم کامیاب ہوں گے۔

۴۶۔موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا۔اچانک اس نے جو کچھ انہوں نے جھوٹا مظاہرہ کیا تھا، اُسے نگل لیا۔

۴۷۔پس جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔

۴۸۔کہنے لگے کہ ہم پروردگارِ عالم پر ایمان لائے۔

۴۹۔جو موسیٰؑ و ہارون کا رب ہے۔

۵۰۔فرعون نے جادوگروں سے کہا: میری اجازت سے پہلے تم موسیٰؑ پر ایمان لے آئے ہو۔وہی تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔تم عنقریب جان لو گے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں دائیں بائیں سے کاٹ دوں گا اور تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔

۵۱۔انہوں نے کہا: اس کا ہمیں کوئی خوف نہیں۔ہم اپنے رب کی طرف جا رہے ہیں۔

۵۲۔انہوں نے کہا: ہمیں اُمید ہے اللہ ہماری غلطیوں کو معاف کر دے گا کیونکہ ہم موسیٰؑ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

۵۳۔فرعون نے کہا: ہر سمجھدار جادوگر کو میرے پاس لے کر آؤ۔

۵۴۔جب جادوگر آ چکے تو موسیٰؑ نے ان سے کہا: ڈالو جو کچھ ڈالتے ہو۔

۵۵۔جب جادوگروں نے ڈال دیا (جادو کا مظاہرہ کر دیا) موسیٰؑ نے کہا: جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے۔اللہ تعالیٰ اسے باطل کر دے گا اور اللہ مفسدوں کے عمل کی اصلاح نہیں فرماتا۔

۵۶۔اللہ تعالیٰ حق کو اپنی قاطع مشیت کے ساتھ پائیدار کرتا ہے اگرچہ مجرم اسے ناپسند کریں۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ان آیات میں متعدد مسائل ہیں لیکن سب پر ایک عنوانِ مجموعی صادق آتا ہے اور وہ فرعون کا موسیٰؑ کی مخالفت کرنا ہے۔اب ان مسائل پر بحث کرتے ہیں۔

(الف) ماہر جادوگروں کا اکٹھا کرنا

جب فرعون کے ظالمانہ نظام نے معجزۂ موسیٰؑ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے دست و پا دیکھا تو اس نے مقابلے کی ٹھانی اور

چونکہ ہر طرح کے مالی وسائل اس کو حاصل تھے اس کے شاہی کارندوں نے مصر کے تمام بڑے بڑے جادوگر اکٹھے کر لیے، جیسا کہ ان آیات میں آتا ہے:

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿١١١﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿١١٢﴾ (اعراف: ۱۱۱۔ ۱۱۲)

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿٣٧﴾ (شعراء: ۳۷)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿٧٩﴾ (یونس: ۷۹)

فرعون نے موسیٰؑ سے کہا کہ مقابلہ کے لیے دن معین کر لیں۔ حضرت موسیٰؑ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان کے عید کے دن کا انتخاب کیا تاکہ لوگوں کا عظیم اجتماع ہو جائے۔ انہوں نے مقابلہ کا وقت بھی ایسا رکھا جب چھوٹے بڑے سب بیدار ہو چکے ہوں اور ناشتہ وغیرہ کر کے سیدھے میدانِ مقابلہ میں پہنچ جائیں، جیسا کہ آیت میں ارشاد ہوتا ہے: فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ (طٰہٰ: ۵۸۔ ۵۹)

جادوگر مختلف اطراف سے فرعون کے پاس حاضر ہونے لگے۔ ان کے لیے حق و باطل کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی نظریں مالِ دنیا اور عہدوں کے حصول پر لگی ہوئی تھیں۔ انہیں توقع تھی کہ کامیابی کی صورت میں فرعون انہیں مالا مال کر دے گا، جیسا کہ ارشاد ہے: وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٣﴾ (الاعراف: ۱۱۳) اس جیسی آیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ شعراء ۴۲ میں بھی آئی ہے۔

فرعون نے بھی ان سے مستقل وعدہ کیا اور کہا کہ کامیابی کی صورت میں انہیں مقربین سے قرار دیا جائے گا یعنی قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٢﴾ (شعراء: ۴۲)

جادوگر جو اپنی کامیابی کو یقینی جانتے تھے، انہیں ناکامی کا گمان بھی نہ تھا۔ لہٰذا فرعون کے کہتے ہی وہ قطار میں میدانِ مقابلہ میں آن پہنچے۔ اُن کا اس طرح سے میدان میں آنا دلوں کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾ (طٰہٰ: ۶۴)

جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ چاہیں تو آپ پہل کریں اور اگر کہیں تو ہم پہل کریں۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ تم لوگ ہی پہل کرو۔ انہوں نے اپنے جادو کو ظاہر کیا، وہ اس طرح کہ ان کی رسیاں اور چھڑیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کو مرعوب کر دیا۔ ان کا یہ جادو اتنا عجیب تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لفظ عظیم استعمال فرمایا ہے: قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ (طٰہٰ: ۶۵، ۶۶) قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿١١٦﴾ (اعراف: ۱۱۶)

جملہ "یخیل الیہ من سحرھم" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے بھی انہیں چلتا ہوا گمان کیا۔اسی وجہ سے انہوں نے خوف بھی محسوس کیا، اگر چہ یہ خوف اس کے نتیجہ کے لحاظ سے تھا کہ مبادا اُن کی تبلیغ کو ضرر پہنچے اس لحاظ سے نہیں کہ ہارنے کی صورت میں ان کی شخصیت پر اثر پڑے گا۔قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

فاو جس فی نفسه خیفة موسی خطاب آیا کہ موسیٰؑ مت ڈریئے۔کامیابی آپ ہی کو ہوگی۔ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى﴿۶۸﴾ (طه: ۶۷،۶۸)

(ب) فرعون کی شکست اور جادوگروں کا ایمان

جب بھی حق و باطل کا ٹکراؤ ہوتا ہے یقینا کامیابی حق ہی کی ہوتی ہے۔موسیٰؑ کے معجزہ کو خداوندِعظیم کی لا یزال قوت کی پشت پناہی حاصل تھی جب کہ باطل کا اعتماد صرف محدود قدرتِ بشری پر تھا۔لہٰذا طبعی بات ہے کہ باطل کو قدرتِ الٰہی کے مقابلہ میں مغلوب ہونا تھا۔پس حضرت موسیٰؑ کو خطاب ہوا کہ اپنا عصا ڈال دو تا کہ ایک ہی لحظہ میں اس حق نما باطل کو نگل لے اور تم کامیاب ہو جاؤ۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى﴿۶۹﴾ (طه: ۶۹) نیز وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ﴿۱۱۷﴾ (اعراف: ۱۱۷) ۔ پھر فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ﴿۴۵﴾ (شعراء: ۴۵)

اس مقابلہ میں حق واضح ہوگیا۔عجیب بات یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والے جادوگر ہی تھے اور عجیب تر یہ کہ انہیں فرعون کی قوت کا مطلق ڈر نہ ہوا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جادوگر اپنے فن میں استاد تھے۔انہیں جادو کی حدود کا علم تھا۔چنانچہ جب انہوں نے حضرت موسیٰؑ کا کام دیکھا تو جادو کے سلسلہ میں اپنی معلومات کے پیشِ نظر انہیں یقین ہوگیا کہ یہ جادو سے ماوراء معجزۂ الٰہی ہے جو موسیٰؑ کو لوگوں کی ہدایت کی خاطر دیا گیا ہے۔لہٰذا وہ فوراً سجدہ میں گر گئے اور رب موسیٰؑ وہارونؑ پر ایمان کا اظہار کر دیا،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴿۷۰﴾ (طه:۷۰)

نیز

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ﴿۱۲۲﴾ (اعراف:۱۲۰ تا ۱۲۲)

ایک تو فرعون کی شرمناک شکست اور دوسرے جادوگروں کا موسیٰؑ کے ساتھ مل جانا،ان دونوں چیزوں نے فرعون کو انتہائی غضب ناک کر دیا۔اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیسے اس شکست کا بدلہ لے۔لہٰذا جب کوئی راہ نظر نہ آئی تو جادوگروں سے کہنے لگا: "میری اجازت کے بغیر موسیٰؑ پر ایمان کیوں لائے ہو؟ گویا لوگوں کے قلوب بھی فرعون کے فرمان کے تابع تھے اور انہیں دل سے اس کا احترام

کرنا لازم تھا۔

پھر کہنے لگا تم سب نے موسیٰؑ سے جادو سیکھا ہے اور منصوبہ بنایا کہ قبطیوں کو سرزمین مصر سے نکال باہر کرو۔ یہ تہمت صرف افکارِ عمومی کو ان سے منحرف کرنے کی خاطر لگائی، اور آخر میں انہیں (جادوگروں) قتل کی دھمکی دے کر کہا کہ میں تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ اس بارے میں آیات درج ذیل ہیں:

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ (طٰہٰ:۷۱)

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ (اعراف: ۱۲۳، ۱۲۴)

فرعون کی پھانسی چڑھانے کی دھمکیاں نہ صرف ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکیں، بلکہ اس کے استحکام کا موجب بنیں۔ انہوں نے فرعون کو انتہائی محکم و مستقل لہجہ میں عقلی جواب دیا کہ ہمارے پاس جو دلیلیں آ چکیں ہم ہرگز تیری دنیا کو اس پر ترجیح نہیں دیں گے۔ تو زیادہ سے زیادہ ہماری رگ گردن کاٹ کر ہماری دنیوی زندگی کا چراغ گل کر سکتا ہے جس سے یہ عارضی زندگی ختم ہو جائے گی لیکن آخرت کے دن پر تیرا کوئی اختیار نہیں جب کہ ہم اب اخروی زندگی کے خواہشمند ہیں، خداوندِ عالم سے درخواست گزار ہیں کہ ہمارے گناہ بخش دے اور اس جادو والے گناہ سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا درگزر فرمائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا [1] وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾ (طٰہٰ ۷۲۔ ۷۳)

پھر فرماتا ہے:

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا

[1] سورہ شعراء ۵۱ بھی اسی موضوع کی حامل ہے، فرق صرف یہ ہے کہ جادوگروں نے بڑے فخر سے کہا کہ ہم حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لائے ہیں۔

جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ [1] عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ (اعراف: ۱۲۵ تا ۱۲۶)

فرعون سخت غضب ناک ہو گیا۔ اس کے درباریوں نے اسے مشورہ دیا کہ سابقہ طریق کار دوبارہ شروع کر دیا جائے۔ یعنی بنی اسرائیل کے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح اپنی برتری کو باقی رکھا جا سکتا ہے ورنہ تو روئے زمین پر فتنہ و فساد پھیل جائے گا جس سے لوگ فرعون اور اس کے خداؤں کو بھول جائیں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ باطل کا یہ شیوہ ہے کہ جب بھی اس کے احمقانہ اعتراضات موثر ثابت نہ ہوں تو وہ طاقت استعمال کرنے پر اتر آتا ہے۔ آج بھی سامراجی طاقتیں اس طریقہ کار پر عمل پیرا ہیں۔ پہلے تشہیر و غوغا کے ذریعہ مخالفین کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر اس طرح کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر کسی نہ کسی طرح اُسے جنگ کی آگ میں دھکیل دیتے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ [2] قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ (اعراف: ۱۲۷)

(ج) سب سے پہلے جادوگر ہی کیوں ایمان لائے؟

سابقہ آیات سے پتہ چلتا ہے کہ مصری جادوگر معجزۂ موسیٰؑ کے مشاہدہ کے فوراً بعد پروردگار موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لے آئے اور بغیر کسی شک و تردید کے کہنے لگے: قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (شعراء: ۴۸، ۴۹) ہم عالمین کے رب پر ایمان لاتے ہیں جو موسیٰ و ہارونؑ کا رب ہے۔

جب فرعون نے انہیں ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھانسی پر چڑھا دینے کی دھمکی دی تو انہوں نے نہ صرف اس دھمکی کی پرواہ نہ کی بلکہ اپنے عقیدۂ توحید کو زیادہ استحکام کے ساتھ بیان کیا۔ انہوں نے کہا: قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (شعراء: ۵۰ ۔ ۵۱) انہوں نے کہا کوئی ڈر نہیں ہم اپنے پروردگار کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ ہماری خطاؤں کو بخش دے گا کیونکہ ہم موسیٰؑ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

---

[1] افرغ بمعنی برسا۔

[2] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون خود معبود ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنے سے بڑے معبودوں پر بھی ایمان رکھتا تھا جن کی فرعون خود بھی پرستش کرتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ جادوگر سب سے پہلے کیوں ایمان لے آئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ جادو کے ماہر تھے اور جادو کے حدود و قیود کا بخوبی علم رکھتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا کہ ایک خشک لکڑی اچانک اژدھا میں بدل جاتی ہے، ان کے جادوئی کھلونوں کو نگل لیتی ہے اور پھر دوبارہ اپنی اصلی شکل پر لوٹ آتی ہے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ موسیٰؑ کا کام جادو کی حدود سے بلند تر ہے، بلکہ عالمِ بشر کے علاوہ کوئی لامتناہی قوت موسیٰؑ کی پشت پناہ ہے جس کو جادو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وجہ تھی کہ وہ سب سے پہلے ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گئے۔

(د) شرمناک شکست کے بعد

میدان سے نکلتے ہوئے جہاں فرعون نے شرمناک شکست کھائی تھی، وہاں موسیٰؑ کا چہرہ فتح کے احساس سے سرشار چمک رہا تھا۔ اب حضرت موسیٰؑ نے سوچا کہ اپنے پیروان کو اکٹھا کر کے آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا جائے تاکہ ساتھیوں کو تفریق سے بچایا جا سکے۔

قرآن نے فتح کے بعد کے حالات (جیسے قومِ موسیٰؑ) کا ان پر ایمان لانا اور بقیہ کا شرک پر باقی رہنا) کو یوں بیان فرمایا ہے:

۱۔ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ؀۸۳

۲۔ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ؀۸۴

۳۔ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ؀۸۵

۴۔ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ؀۸۶

۵۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؀۸۷ (یونس: ۸۳ تا ۸۷)

۶۔ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ڐ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ؀۱۲۸

۷۔ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ؀۱۲۹

(الاعراف ۱۲۸، ۱۲۹)

آیات کا ترجمہ

۱۔موسیٰؑ پر سوائے ان ک[1] ی قوم کے چند افراد کے کوئی ایمان نہ لایا اس حال میں کہ وہ فرعون سے اور خود اپنے زعما قوم سے ڈرتے تھے کہ وہ انہیں موسیٰؑ کی پیروی سے روک دیں گے۔بتحقیق فرعون نے زمین پر تکبر کیا اور وہ اسراف (زیادہ روی) کرنے والا تھا۔

۲۔موسیٰؑ نے کہا: اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر حقیقتاً مسلمان ہو۔

۳۔انہوں نے جواب دیا: ہم نے خدا پر توکل کیا، پروردگارا ہمیں قومِ ظالمین کے لیے موجبِ امتحان نہ بنا۔

۴۔اور اپنی رحمت کے صدقہ ہمیں کافر قوم سے نجات دے۔

۵۔ہم نے موسیٰؑ اور ان کے بھائی پر وحی کی کہ تم دونوں اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر تیار کرو اور اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے مقابل بناؤ، نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دے دو۔

۶۔موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ زمین اللہ کی ملکیت ہے، وہ جسے چاہے اپنے بندوں میں سے زمین کا وارث بنا دے اور اچھا انجام متقین ہی کے لیے ہے۔

۷۔انہوں نے موسیٰؑ سے کہا: تمہارے مصر آنے سے پہلے، بلکہ اس کے بعد بھی ہمیں اذیتیں دی جاتی تھیں۔موسیٰؑ نے کہا: امید ہے اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا، تمہیں زمین میں اس کا جانشین بنا دے گا اور دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو!

---

[1] یہ کس کی قوم مراد ہے، فرعون کی یا موسیٰؑ کی مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ہم نے ترجیح دی ہے کہ مراد قومِ موسیٰؑ سے ہے گویا خود بنی اسرائیل دو گروہ تھے، ایک مستضعفین کا جو موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور دوسرا متکبرین کا جو فرعون کے ساتھ روابط کی وجہ سے اس کی حمایت کرتے تھے۔لہٰذا موسیٰؑ و فرعون پر ایمان لانے والے دونوں گروہ ڈرتے تھے، ایک گروہ فرعون سے اور دوسرا خود اپنی قوم کے مستکبرین سے۔بعض نے احتمال دیا ہے کہ شاید قوم فرعون کے وہ افراد مراد ہوں جو موسیٰؑ پر ایمان لے آئے تھے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

موسیٰؑ کی کامیابی کے پیشِ نظر اُن کی پوری قوم، بلکہ قومِ فرعون کے سمجھدار لوگوں کو بھی موسیٰؑ پر ایمان لے آنا چاہیے تھا لیکن خلافِ توقع خود موسیٰؑ کی اپنی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بعض ایمان لے آئے اور بعض نے عمومی طریقہ پر باقی رہنے میں عافیت جانی۔ شاید سورۂ یونس ۸۲ میں "ملاھم" کی لفظ سے مراد یہی دوسرا گروہ ہو۔ لیکن قومِ فرعون سے صرف دو افراد ایمان لائے۔ ایک فرعون کی بیوی اور دوسرا مومن آلِ فرعون جن دونوں کی مفصل داستان آئندہ بیان ہوگی۔ ہدف کو پانے کے لیے اصولی شرط اس کے بارے میں مستقل مزاجی ہے۔ جو لوگ فرعون سے استقلال و آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے انہیں اپنے ہدف میں مستقل مزاج ہونا چاہیے تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا پر توکل کرتے ہوئے اس کی لایزال قوت سے مدد طلب کرے اور جو قوتیں اسے خدا نے دے رکھی ہیں ان کو کام میں لاتے ہوئے آگے بڑھے۔ آیات میں ان نکات کے بارے میں اشارہ ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ (یونس:۸۴)

اس آیت میں دو جملے "ان کنتم اٰمنتم باللہ، ان کنتم مسلمین" اس مطلب کو بیان کر رہے ہیں کہ آپ یعنی ملت بنی اسرائیل کے سامنے بڑے بڑے اہداف ہیں جب کہ جملہ "فعلیہ توکلوا" انہیں متوجہ کر رہا ہے کہ ان اہداف کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کیے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ چونکہ بشر ہر لحاظ سے محدود ہے لہٰذا اُسے ایک نا محدود قدرت سے مدد مانگنا چاہیے۔ لہٰذا حضرت موسیٰؑ کی راہنمائی کے نتیجہ میں وہ درگاہِ پروردگار میں توجہ کرتے ہیں اور غیب سے مدد طلب کرتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ (یونس: ۸۵، ۸۶)

ان پر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام اقدامات بھی لازم کر دیئے گئے جو ان اہداف کو آگے بڑھانے میں موثر واقع ہو سکتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کو پیغام دیا کہ بنی اسرائیل اپنے گھر ایک دوسرے کے مقابل بنائیں تاکہ نماز کے لیے پرشکوہ جماعت کھڑی ہو سکے، اس طرح کامیابی کے مقدمات فراہم ہو جائیں گے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾ (یونس: ۸۷)

اس آیت کے آخری حصہ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو نجات کی خوشخبری سنا دیں۔ سورۂ اعراف میں یہ خوشخبری اس

سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ آئی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ (اعراف: ۱۲۸)

حضرت موسیٰؑ نے اس آیت میں چار نکات کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ قوتِ لایزال سے مدد مانگنا، "استعینوا باللہ"

۲۔ مصائب اور سختیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا "واصبروا"

۳۔ زمین پر حاکمیت مطلق اللہ کی ہے، وہ جسے اس پر مسلط کر دے۔ ان الارض للہ یورثھا من یشاءُ من عبادہٖ

۴۔ اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہے، "والعاقبۃ للمتقین" اس لیے کہ متقین فطرتی راستے پر چلتے ہیں اور طبیعی انسانی خواہشات کو دباتے نہیں ہیں، جب کہ گنہگار فطرت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ اُن کی طرح ہیں جو پانی کے بہاؤں کی مخالف سمت تیرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس طرح یہ راستے ہی میں تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہدف تک کبھی نہیں پہنچ پاتے۔

اس حصہ کی آخری آیت میں موسیٰؑ اور ان کی قوم اپنی اپنی بات کی طرف الگ اشارہ کرتے ہیں: قوم نے موسیٰؑ کو صاف لفظوں میں کہا کہ تم تو ہمیں نجات کے وعدے دیتے رہتے ہو جبکہ فرعونیوں کی سختیاں جیسی پہلے تھیں، اب بھی ویسی ہی ہیں۔ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟

حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا: میں دو چیزوں کی اُمید رکھتا ہوں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک و نابود کر دے گا "ان یہلك عدو کم" دوسرے تمہیں اُن کا جانشین بنا دے گا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ اس نعمت کے بدلہ میں تمہارے کاندھوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائے گا اور دیکھے گا کہ تم کیسے اس کے فرامین پر عمل کرتے ہو، "فینظر کیف تعملون"۔

یہ آیت ہمارے (ملت ایران کے) لیے بھی ہے۔ جنہوں نے مدتوں مصیبتیں کاٹیں اور تکلیفیں برداشت کیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں انقلاب اسلامی جیسی عظیم نعمت سے نوازا جو ایک بہت بڑا درس ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے مسلمانوں کے دشمن (سابقہ طاغوت) کو ہلاک کر دیا اور باایمان افراد کو ان کی جگہ دی۔ لیکن کیا یہیں پر بات ختم ہو جاتی ہے؟ ایسا نہیں۔ خداوند عالم نے ہمیں یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔ اب وہ ہماری کارکردگی دیکھ رہا ہے کہ ہم بھی اس کے فرامین پر عمل کرتے ہیں یا نہیں اور اپنے نصب العین کو اسلامی معیار کے مطابق استوار کرتے ہیں اور کیا ہم زبان سے عمل، گفتار سے کردار تک پہنچتے ہیں یا نہیں؟ لہٰذا اب بھی وقت ہے کہ ہم توجہ کریں اور فینظر کیف تعملون کی آواز کو جو آج بھی ہمارے معاشرے میں گونج رہی ہے، سننے کی کوشش کریں۔

(ھ) فرعون کے محل میں نفوذ!

یہ تو سابقاً بیان ہو چکا ہے کہ صرف قومِ موسیٰؑ کے چند افراد ہی ایمان لائے تھے اور قبطیوں سے کسی نے ایمان قبول نہ کیا۔ لیکن قرآن

نے اُن میں سے دو افراد کے ایمان لانے کا ذکر فرمایا ہے، ایک فرعون کی زوجہ اور دوسرا آلِ فرعون کا ایک شخص، دونوں میں فرق یہ تھا کہ زوجۂ فرعون اپنے ایمان کا برملا اظہار کرتی تھیں جب کہ دوسرا فرد تقیہ کرتا تھا۔ اس طرح وہ بظاہر فرعون کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا اور اس طرح وہ فرعون سے موسیٰؑ کا بہتر دفاع کرسکتا تھا۔ زوجۂ فرعون کے ایمان کے بارے میں آیت اس طرح ہے:

زوجۂ فرعون کا ایمان

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۱ (تحریم: ۱۱)

یعنی ''اللہ تعالیٰ مومنین کے لیے زوجۂ فرعون کی مثال دیتا ہے کہ جب اس نے کہا: خداوندا! میرے لیے جنت میں ایک گھر بنا دے۔ مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے نجات عطا فرما اور مجھے ظالم قوم سے نجات دے''۔

کسی حکومت و نظام کے لیے اس سے بڑا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ دشمن اس کے اندرونِ خانہ نفوذ کر جائے۔ فرعون کے لیے قریب ترین شخص اس کی زوجہ تھی جس نے حضرت موسیٰؑ کی روشن دلیلوں کو دیکھ کر ایمان قبول کر لیا تھا اور اپنے شوہر کی مخالفت کا اظہار کرنے لگی تھی۔ اگر یہی صورتِ حال باقی رہتی تو یقیناً محل کی دوسری خواتین میں بھی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ لہٰذا فرعون نے اپنی زوجہ کے بارے میں سخت ترین اقدام کا فیصلہ کر لیا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ فرعون کی زوجہ آسیہ بنتِ مزاحم نے جب حضرت موسیٰؑ کو جادوگروں پر کامیاب ہوتے دیکھا تو اُن پر ایمان لے آئی۔ لہٰذا فرعون کی زوجہ کے ساتھ محبت بھی اُسے سزا سے باز نہ رکھ سکی اور اس نے اپنی زوجہ کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں گاڑ کر اُسے دھوپ میں لٹا دیا اور حکم دیا کہ ایک بہت بڑا پتھر اس کے سر پر گرایا جائے۔ یہ وقت تھا جب اس مومنہ نے اللہ تعالیٰ سے مناجات شروع کی: خدایا! میرے لیے جنت میں ایک گھر بنادے اور مجھے اس ظالم گروہ سے نجات عطا فرما''۔

اس داستان کے ذکر سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ مثال و نمونہ ذکر کرنے کے لیے بھی (چاہے اچھا نمونہ ہو یا برا) واضح کرداروں کو ذکر فرماتا ہے۔ آسیہ کے ساتھ ہی مریم بنتِ عمران کا تذکرہ فرماتا ہے اور دونوں کا بزرگ ہستیوں کے طور پر ذکر کرتا ہے، جیسا کہ ان کے مقابلہ میں دو بُری عورتوں کا تذکرہ کرتا ہے جو خدا کے دو نیک بندوں کے گھر میں رہتی تھیں۔ وہ نوحؑ و لوطؑ کی بیویاں تھیں جنہیں برائی کے نمونہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

ان دو نیک خواتین کے ذکر سے عورت کی شخصیت کا احترام و اکرام بھی مقصود تھا اور باوجود صدیاں گزرنے کے قرآن نے ان دونوں کا

تذکرہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ماہ و سال کا گزر جانا کسی شخصیت کی اقدار کو ماند نہیں کر سکتا ہے۔قرآن جہاں انبیاء کو طبقہ مذکر سے بطور نمونہ ذکر فرماتا ہے وہاں خواتین کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید جو پیغمبر اسلامؐ کی اپنی بعض بیویوں کے ساتھ گفتگو کا تذکرہ جابجا قرآن میں کرتا ہے کسی شخصی غرض کی خاطر نہیں کرتا بلکہ مقصد نمونۂ عمل کا ذکر کرنا تھا۔تعجب ہے کہ ان دو بزرگ خواتین کا تزکرہ سورۂ تحریم میں ہوا ہے جس سورہ سے ابتدا میں پیغمبرؐ اسلام کی بعض ازواجِ مطہرات کی زیادتیوں کا تذکرہ ہوا ہے۔چونکہ یہ تذکرہ ہمارے موضوعِ بحث سے باہر ہے اس لیے ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہتے۔

(و) توحید کے فروغ سے فرعون کا خوف

اصولِ توحید کے قصرِ فرعون میں داخلے نے فرعون کو انتہائی وحشت میں ڈال دیا۔ دوسروں کے لیے نمونہ عبرت بنانے کی خاطر اس نے اپنی محبوب ترین ہستی اور مصر کی خوبصورت ترین عورت کو پھانسی پر چڑھا دیا اور اسے بڑی سخت سزائیں دیں۔ اس پر اکتفانہ کیا بلکہ توحید سے مقابلہ کے لیے دو اور منصوبے بھی بنائے:

۱۔ اپنے مقربین کے ساتھ اس نے موسیٰؑ کے قتل کے مشورے شروع کر دیئے۔

۲۔ سادہ لوح عوام کو دھوکہ دینے کے لیے اس نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ ایک بلند و بالا عمارت تعمیر کروائے تا کہ موسیٰؑ کے خدا کے بارے میں خبر حاصل کی جائے۔ ہم پہلے ان دونوں مطالب کے بارے میں آیات بیان کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَلۡیَدۡعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَكُمۡ اَوۡ اَنۡ یُّظۡهِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ﴿۲۶﴾

۲۔ وَقَالَ مُوۡسٰۤی اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَرَبِّكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ﴿۲۷﴾ (مومن: ۲۶، ۲۷)

۳۔ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ یٰهَامٰنُ ابۡنِ لِیۡ صَرۡحًا لَّعَلِّیۡۤ اَبۡلُغُ الۡاَسۡبَابَ﴿۳۶﴾ اَسۡبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوۡسٰی وَاِنِّیۡ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُیِّنَ لِفِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِیۡلِ ؕ وَمَا كَیۡدُ فِرۡعَوۡنَ اِلَّا فِیۡ تَبَابٍ﴿۳۷﴾

(مومن: ۳۶، ۳۷)

۴۔ وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَقَوۡمَهٗ لِیُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ﴿۱۲۷﴾ (الاعراف: ۱۲۷)

آیات کا ترجمہ

۱۔فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا: آپ مجھے موسیٰؑ کو قتل کرنے دیں اور وہ اپنے رب کو بلا لے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا یا زمین پر فساد برپا کرے گا۔

۲۔موسیٰؑ نے جواب میں کہا: میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں ہر اس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

۳۔فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا: میرے لیے ایک بلند و بالا عمارت بناؤ تا کہ وسائل حاصل کروں اور اس کے ذریعے موسیٰؑ کے رب کے بارے میں اطلاع بہم پہنچاؤں۔ بتحقیق میں موسیٰؑ کو جھوٹا سمجھتا ہوں گویا فرعون کے برُے اعمال اس طرح اس کی نظر میں اچھے کر دیئے گئے، اس کے لیے حق کی راہ بند ہوگئی اور فرعون کے حیلوں نے سوائے ہلاکت کے اُسے کچھ نہ دیا۔

۴۔(جب جادوگر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے تو) ملتِ فرعون کے زعماء نے اسے مشورہ دیا کہ تم نے کیوں موسیٰؑ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیا ہے کہ وہ روئے زمین پر فساد برپا کرتے پھریں اور تجھے اور تیرے خداؤں کو چھوڑ دیں؟ فرعون نے کہا: ہم ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور اُن کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیں گے۔ ہمیں ان پر برتری حاصل ہے۔

(ز) موسیٰ کے قتل کی سازش!

فرعون موسیٰؑ کے قتل کے سلسلہ میں اپنے عہدہ داروں سے مشورہ کرنے لگا جیسے ارشاد ہوتا ہے: "و قال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ ولیدع ربہ..." فرعون کے کہنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے تمام درباری موسیٰؑ کے قتل پر اتفاق نظر نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اس نے کہا: مجھے موسیٰؑ کو قتل کرنے دیں، اگرچہ مخالفین قتل کی وجہ بالکل واضح نہیں۔ شاید وہ سوچتے تھے کہ اگر موسیٰؑ بددعا کریں گے تو فرعون اور اس کا تمام نظام نابود ہو جائے گا۔ چونکہ فرعون نے کہا تھا "ولیدع ربہ" وہ (موسیٰؑ) اپنے رب کو پکار لے یا شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ کسی تحریک کے رہبر کو قتل کرنے سے اس کی تحریک کو زیادہ تقویت ملتی ہے اور وہ زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔

سورہ اعراف ۱۲۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود درباری بھی فرعون کو قتل موسیٰؑ کے مشورے دیتے تھے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "و قال الملامن قوم فرعون اتذر موسیٰ و قومہ..." ان دو آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قتلِ موسیٰؑ پر سب درباریوں کا اتفاق نہ تھا، کچھ موافق

تھے اور کچھ مخالف۔

اب دیکھنا ہے کہ وہ قتلِ موسیٰؑ کی کیا توجیہ کرتے تھے؟ فرعون نے یہ توجیہ کی کہ اگر اسے قتل نہ کروں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارا دین تبدیل کردے گا یا زمین پر فساد برپا کرے گا۔

فرعون کی یہ توجیہ سوائے دھوکہ کے اور کچھ نہیں تھی کیونکہ فرعون ظاہر تو یہ کر رہا تھا کہ وہ موسیٰؑ کے قتل پر صرف لوگوں کے فائدہ کی وجہ سے مجبور تھا۔ کیونکہ وہ لوگوں کے دین کو تبدیل کردے گا یا زمین پر فساد برپا کرے گا یعنی کچھ لوگ موسیٰؑ پر ایمان لے آئیں گے اور فرعون کو مجبوراً ان سے جنگ کرنا پڑے گی۔ لہٰذا خواہ نخواہ خونریزی تو ہوگی ہی اور تباہی بھی آئے گی۔

یہ تو اس واقعہ کی ظاہری صورتِ حال تھی جب کہ حقیقت حال یہ تھی کہ فرعون کی جھوٹی خدائی خطرہ میں تھی کیونکہ جس دین کی بات فرعون کر رہا تھا وہ اس کی الوہیت کے عقیدہ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اگر فرعون اپنی اس خود پرستی کو چھوڑ دیتا اور لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے دیتا تو یقیناً وہ مسائل، حالات اور مشکلات پیش نہ آتے اور یوں جنگیں معرضِ وجود میں نہ آتیں۔ بُرے نتائج جتنے بھی پیش آئے وہ فرعون کی خود پسندی کا نتیجہ تھے۔

آیت کے متن سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے ظالم و جابر نہ صرف عوام کی تحقیر کرتے ہیں بلکہ اپنے حواریوں کو بھی نہیں بخشتے اور انہیں بھی حقیقت حال نہیں بتاتے۔

مجھے یاد ہے کہ انقلاب اسلامی کے آنے سے ایک سال پہلے (۱۳۵۷ شمسی) شاہِ مردود نے ہمدردی کے عنوان سے کہا تھا: مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ شورشیں اور مظاہرے دین کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس وقت جسے لوگ دین سمجھتے تھے وہ شہنشاہی اصول و آئین ہی تھا۔ جسے خدا و مملکت کے مقابلہ میں اہمیت دی جاتی تھی اور شاہ اپنے آپ کو خدا کے بالمقابل جانتا تھا۔ اس کی باتوں کا بھی یہی مطلب تھا کہ مجھے ڈر ہے کہیں میری سلطنت خطرے میں نہ پڑ جائے۔

فرعون کے درباریوں کی باتیں بھی کافی واضح تھیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ موسیٰؑ کی بقا و آزادی تیری خدائی کے زوال کا موجب بنے گی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "ويذرك و الهتك"، یعنی وہ تجھے اور تیرے خداؤں کو چھوڑ دیں گے۔ اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ فرعون کی پرستش کرتے تھے اور فرعون کے اپنے بھی معبود تھے جن کی وہ عبادت کرتا تھا۔

جب حضرت موسیٰؑ کو اپنے قتل کی سازش کا پتہ چلا تو انہوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی پائیداری و مستقل مزاجی کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی عنایات والطاف کی بدولت مجھے کچھ نہیں ہوگا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

انی عذت بربی و ربکم من کل متکبرٍ لا یومن بیوم الحساب

اس آیت میں اہم نکتہ یہ ہے کہ موسیٰؑ نے اس متکبر سے اللہ کی پناہ مانگی ہے جو یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا تھا چونکہ ایسے شخص کو جسے حساب وکتاب کا کوئی خوف نہ ہو ہر قسم کا کام انجام دینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی، لہٰذا ایسے شخص سے خدا کی پناہ مانگنا چاہیے۔

(ح) سادہ لوح عوام کو دھوکہ دہی

فرعون یہ سمجھتا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے قتل سے تو کسی حد تک فائدہ حاصل ہوگا لیکن موسیٰؑ کی فکر ونظریات کو لوگوں کے ذہنوں سے نہیں نکالا جا سکتا۔لہٰذا ایسا کام کرنا چاہیے کہ یہ فکر ذہنوں سے نکل جائے وہ ثابت کر دے کہ خدا صرف وہی ہے اور جس خدا کی طرف موسیٰؑ بلاتا ہے وہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔لہٰذا اس نے اپنے وزیر کو ایک بلند وبالا عمارت تعمیر کرنے کا حکم دیا جو بلندی میں آسمانوں کے نزدیک جا پہنچے تا کہ فرعون اس پر چڑھ کر موسیٰؑ کے خدا کے بارے میں تحقیق کرے اور جب آسمانوں میں اُسے ڈھونڈ نہ سکے تو لوگوں کو بتائے کہ موسیٰؑ جھوٹ کہتا ہے۔

فرعون کو بھی اپنے مقام پر علم تھا کہ یہ محض دھوکہ وفریب ہے۔جس خدا کی طرف موسیٰؑ بلاتا ہے وہ آسمانوں میں نہیں رہتا۔موسیٰؑ تو اس خدا کی طرف بلاتا ہے جو زمین وآسمان کا رب ہے اور اس کا بھی رب ہے جو زمین وآسمان کے درمیان ہے، جیسا کہ فرعون نے جب موسیٰؑ سے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے، تو انہوں نے جواب میں فرمایا تھا: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِیۡنَ﴿۲۴﴾ (شعراء: ۲۴) وہ جو زمین، آسمانوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اُن کا رب ہے اگر تم یقین کرلو (اور تمہیں اس بات سے فائدہ تب ہوگا کہ تم صراط پر یقین کرو)

بناء بریں اگر دسیوں ایسی بڑی بلند عمارتیں بنالی جائیں اور ان کے اوپر خدا کو نہ پائیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہ ہوگا کہ خدا نہیں ہے اور موسیٰؑ نے جھوٹ بولا ہے۔

تعجب تو اہل سنت کے فرقہ اہل حدیث پر ہے جو خدا کے لیے آسمانوں میں ٹھکانا سمجھتے ہیں کہ خدا ایک تخت پر بیٹھتا ہے جو اس کے بوجھ سے اونٹ کے پالان کی طرح آواز نکالتا ہے۔اپنے اس عقیدہ پر دلیل یہی فرعون وہامان کی گفتگو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے موسیٰؑ نے انہیں خدا کا ٹھکانا آسمانوں میں بتا رکھا تھا، تب ہی تو فرعون موسیٰؑ کی تکذیب کی خاطر ہامان کو ایک بڑی عمارت بنانے کا حکم دیتا ہے تا کہ پتہ تو چلے موسیٰؑ سچ کہتا ہے یا جھوٹا ہے۔اگر آپ کو بتایا جائے کہ یہ دلیل ایک معروف شخصیت ''ابن تیمیہ'' نے دی ہے، تو شاید آپ کو یقین نہ آئے۔

آج سلفیوں نے ابنِ تیمیہ کو اتنی بڑی مجددِ دین، عقیدۂ توحید کا احیاء کرنے والی اور شرک کے خلاف جہاد کرنے والی شخصیت بنا دیا ہے کہ ہر کوئی اُسے حقیقت سمجھنے لگ گیا ہے جب کہ خود بے چارہ ابن تیمیہ بڑا زور لگا رہا ہے کہ خدا کے لیے جہت ثابت کر سکے اور بہ عنوانِ دلیل فرعون کی باتیں ذکر کرتا ہے۔

اگر یہ شخص قرآن کی دوسری آیات کا مطالعہ کر لیتا تو یقینا متوجہ ہو جاتا کہ موسیٰؑ نے فرعون سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے ثابت ہوتا کہ خدا آسمانوں پر رہتا ہے، بلکہ موسیٰؑ نے تو اس خدا کے بارے میں انہیں دعوت دی تھی جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سبھی کا رب ہے۔لہٰذا یہ بات بالکل بے دلیل ہے کہ خدا آسمانوں پر ہو، زمینوں پر نہ ہو، یا ان کے درمیان نہ ہو۔

مشہور ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی نہیں۔لیکن ہم اس بات کو نہیں مانتے۔تاریخ تو ایک تجربہ گاہ ہے جو بار بار دہرائی جاتی رہتی

ہے۔ زمانہ کے ستمگر سب شیطانی مدرسہ کے شاگرد ہیں اور مسلسل اسی سے درس لیتے رہتے ہیں۔

اگر کئی ہزار سال پہلے فرعون نے اس طرح کی بلند و بالا عمارت بنوا کر عوام فریبی کی کوشش کی تھی تو آج ترقی یافتہ دور میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ جب گریگورین، پہلا روسی خلا باز، دنیا کے گرد چکر لگا کر زمین پر اترا تو کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر خروشخیف نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے ان بلندیوں پر خدا کو بھی دیکھا تھا؟ تو اس نے کہا کہ نہیں! آسمانوں پر خدا کا کوئی وجود نہیں۔ وہ دراصل ابن تیمیہ کی طرح جسمانی خدا کو ڈھونڈ رہا تھا جو فضا میں کہیں رہتا ہے لیکن وہ خدا جو ہر جگہ موجود ہے، نہ اشیاء سے جدا ہے اور نہ اشیا کے ساتھ متصل، اس کو عقل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے وہ کبھی غائب نہیں ہوا کہ اس کو کہیں جا کر ڈھونڈیں۔ واقعیت کو دیکھنے والے عرفا اور اچھوتے آثار کے بارے میں تحقیق کرنے والے حکماء اس خدا کو پا چکے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جو انگلی کے نشان سے نقاش کی انگلیوں کو جان لیتے ہیں۔

ابوقرہ محدث نے امام رضا علیہ السلام سے خدا کے مکان کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت نے فرمایا: ''یہ سوال وہ کرتا ہے جو خود حاضر ہو، جس کے بارے میں سوال کر رہا ہے وہ غائب ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ سے غائب نہیں کہ اس کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو۔ [1]

---

[1] احتجاج طبرسی، ج ۲، ص ۳۷۷

(ط) مومن آلِ فرعون کا واقعہ

قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے کہ قصرِ فرعون میں دو انسان ایمان لائے تھے، ایک فرعون کی زوجہ جن کا واقعہ بیان ہو چکا اور دوسرا وہ سلجھا ہوا انسان جو بعض مصلحتوں کی وجہ سے اپنے ایمان کو چھپاتا تھا تاکہ اس طرح موسیٰؑ کی مدد کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی سرگزشت یوں بیان فرمائی ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ
يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ
كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ
مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾
۲۔ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ
اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ
الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾
۳۔ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ۙ
۴۔ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ
ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾
۵۔ وَيٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ۙ
۶۔ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا
لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾
۷۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ

بِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ
اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۚۖ ﴿۳۴﴾
۸۔ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ
وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾۔
(مومن: ۲۸ تا ۳۵)
۹۔ وَقَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۚ ﴿۳۸﴾
۱۰۔ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ؗ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾
۱۱۔ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ
اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾
۱۲۔ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَى النَّارِ ؕ ﴿۴۱﴾
۱۳۔ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؗ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى
الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾
۱۴۔ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ
مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾
۱۵۔ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ ۢ
بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾
۱۶۔ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ ﴿۴۵﴾
(مومن: ۳۸ تا ۴۵)

آیات کا ترجمہ

۱۔آلِ فرعون سے ایک مومن (بہ موسیٰؑ)، اس حال میں کہ اپنے ایمان کو چھپاتا تھا، اس نے (مجلسِ مشاورت) میں کہا: کیا ایک شخص کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار عالمین کا رب ہے، حالانکہ وہ روشن دلیلیں پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس لایا ہے۔ وہ اگر جھوٹا ہے تو اس جھوٹ کا وبال اسی پر ہوگا، اور اگر وہ سچا ہے تو جن چیزوں سے ڈراتا ہے اُن کا ضرر تمہیں پہنچے گا کیونکہ جو زیادہ متجاوز و جھوٹا ہے اللہ اس کی ہدایت نہیں فرماتا۔

۲۔اے میری قوم! آج ظاہری حکومت زمین میں تمہارے ہاتھ ہے۔ لیکن کون کل ہمیں عذابِ خدا سے بچائے گا جب عذاب خدا ہم پر آئے گا۔

۳۔فرعون نے کہا: (میں جو کچھ دیکھتا ہوں تمہیں بتا رہا ہوں) میں تمہیں بتا رہا ہوں اور تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جو تمہارے لیے مصلحتہً درست سمجھتا ہوں اور تمہیں صرف راہِ راست کی ہدایت کرتا ہوں۔

۴۔مومن (آل فرعون) نے کہا: میں تم پر یوم احزاب کی مانند دن سے ڈرتا ہوں۔ قوم نوح، عاد و ثمود اور ان سے بعد والی قوموں کی طرح۔ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

۵۔اے میری قوم! میں تم پر فریاد والے (یومِ قیامت) دن سے ڈرتا ہوں۔

۶۔جس دن تم عذاب سے ڈر کر پشت پھیر کر بھاگو گے لیکن عذاب خدا سے تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی اور جسے خدا گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدایت نہیں کرسکتا۔

۷۔اس سے پہلے یوسفؑ روشن دلیلوں کے ساتھ تم پر مبعوث ہوئے تو تم ہمیشہ اس میں شک کرتے رہے جو وہ لائے تھے، یہاں تک کہ اُن کی وفات ہوگئی تو تم نے کہا کہ اب خدا کسی رسول کو مبعوث نہیں کرے گا اور جو افراد حد سے تجاوز کر جائیں، شک و تردید میں پڑ جائیں انہیں اللہ تعالیٰ گمراہ کر دیتا ہے۔

۸۔ وہ لوگ جو دلیل کے بغیر اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں یہ کام اللہ اور ان کے لیے جو ایمان لائے، بڑا غضب کا موجب ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

۹۔ اس مومن نے کہا: ''اے میری قوم! میری پیروی کرو۔ میں تمہیں سیدھے راستے کی ہدایت کروں گا۔

۱۰۔ اے میری قوم! یہ دنیا چند روز کی متاع و سامان ہے اور آخرت ہی پائیداری و ہمیشگی والی ہے۔

۱۱۔ جو برا کام کرتا ہے اُسے صرف اسی کی سزا ملے گی اور جس نے عورتوں یا مردوں میں سے اچھا کام کیا وہ جنت میں جائے گا اور اُسے بے حساب رزق ملے گا۔

۱۲۔ اے میری قوم! کیا بات ہے کہ میں تو تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف بلاتے ہو۔

۱۳۔ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کفر کروں، اس کا شریک قرار دوں، اس چیز کو کہ جس کا مجھے علم نہیں اور میں تمہیں عزیز و غفار کی طرف بلاتا ہوں (قدرت مند، بخشنے والا)

۱۴۔ تم مجھے یقیناً اس کی طرف بلاتے ہو جو دنیا میں دعوت اور آخرت میں حاکمیت نہیں رکھتا جب کہ ہماری بازگشت صرف اللہ کی طرف ہے اور اسراف کرنے والے جہنم میں جائیں گے۔

۱۵۔ عنقریب جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اس سے مطلع ہو جاؤ گے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں کہ وہی اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ ہے۔

۱۶۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اُن کے حیلوں اور سازشوں کے عواقبِ بد سے بچایا اور شدید عذاب نے آلِ فرعون کو آ لیا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

قرآن نے مختلف سوروں میں ایسے انسانوں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے غیر جانبدار رہ کر انبیائے الٰہی کی مدد کی۔ ہم یہاں کچھ آیات کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ حبیب نجار کی سرگذشت جو حضرت مسیحؑ کے قاصدوں کی مدد کرتا تھا، سورہ یٰسین (۲۰، ۲۷) میں بیان ہوئی ہے۔ آغاز یوں ہوتا

ہے: یقوم اتبعوا المرسلین یعنی ''شہر کے دوسرے کنارے سے ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے قوم انبیائے الٰہی کی پیروی کرو''۔

۲۔ آل فرعون کا ایک آدمی جو شہر کے دور کے علاقہ سے مرکز کی طرف آیا اور موسیٰؑ کو خبر دی کہ فرعون والے آپ کے قتل کے در پے ہیں۔ لہٰذا جتنا جلدی ہو سکے شہر سے چلے جاؤ۔ پس موسیٰ مصر سے مدین کی طرف چلے گئے۔ (قصص: ۲۰)

۳۔ مومنِ آلِ فرعون نے فرعون کی مجلس مشاورت کے سامنے بڑے معقول طریقے سے موسیٰؑ کا دفاع کیا۔ اب کیا یہ وہی پہلے والا آدمی ہے یا کوئی اور ہے، اس میں وضاحت سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ وہ اور آسیہؑ جو موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے، اس آیت کا یقینی مصداق تھے جس میں ارشاد ہوتا ہے: ''یخرج الحی من المیت'' (روم: ۱۹)

اسی سے اس اصول کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وراثت و ماحول کے عوامل اگرچہ موثر ہوتے ہیں، تاہم انسان اُن کے سامنے بے بس و مجبور نہیں ہو جاتا۔ یہ جو بعض انسانی نفسیات کے ماہرین انسانی شخصیت کے تین عوامل کا ذکر کرتے ہیں یعنی وراثت، ثقافت اور ماحول، تو انہیں صرف مقتضی شمار کرنا چاہیے کہ ان میں تاثیر کی صلاحیت ہے، اختیار خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ عوامل علت تامہ نہیں ہو سکتے۔ اس پر شاہد یہی واقعہ لے لیں کہ یہ دونوں فرعون کے آدمیوں میں شامل تھے لیکن ان عوامل کے سامنے مغلوب نہیں ہوئے، بلکہ ان کا مقابلہ کیا، انہیں بے اثر کر دیا اور ایمان لے آئے۔

(ی) مومن آلِ فرعون کی گفتگو میں تعمیری و تعلیمی نکات

مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل نکات کا استفادہ ہوتا ہے:

۱۔ عقل و خرد کے مطابق انسان اپنی جان و مال کی حفاظت کی خاطر کفر کا اظہار کر سکتا ہے اور ایمان کو پوشیدہ رکھ سکتا ہے۔ یہی تقیہ ہے جس پر دوسری آیات شاہد ہیں۔ مومن آلِ فرعون نے اسی طریقہ پر عمل کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کی مدد کی اور شاید اس کے مشورے نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ فرعون اپنے منصوبوں پر عمل کر چکا ہوتا۔ باوجود یکہ جیسا کہ سابقاً ذکر ہو چکا قتلِ موسیٰؑ پر فرعون کے سارے مشیر متفق نہیں تھے جس پر دلیل مومن آلِ فرعون ہی کی گفتگو ہے جو اس نے فرعون کی مشاورتی مجلس میں کی۔

۲۔ مومن آلِ فرعون نے فرعون کے ساتھ اظہارِ مخالفت کیے بغیر بلکہ اس کی خیر خواہی کے طور پر گفتگو کا آغاز کیا اور موسیٰؑ کی دعوت کو بڑے معقول طریقہ سے اُن کے سامنے رکھا۔ اس نے کہا: ''وان یك كاذباً فعلیه كذبه وان یك صادقاً یصبكم بعض الذی یعدكم'' جیسا کہ آپ نے دیکھا اس نے موسیٰؑ کے جھوٹا ہونے کے احتمال کو پہلے اور سچائی کے احتمال کو بعد میں ذکر کیا کہ فرعون کے جذبات سے اپنے حق میں استفادہ کر سکے۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جیسے: وَاِنَّآ اَوۡ اِيَّاكُمۡ لَعَلٰى هُدًى اَوۡ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۴﴾ (سبا: ۲۴) اس قسم کی گفتگو کے اپنے شرائط و حالات ہوتے ہیں لیکن اگر فریقِ مخالف انسانی بات مانتا ہے تو پھر تردید کے بجائے قطعی بات کرنا زیادہ صحیح ہوتا ہے۔

۳۔ مومن آلِ فرعون نے اپنی مصلحانہ و خیر خواہانہ گفتگو میں کہا: ''اگر موسیٰؑ جھوٹا ہے تو اس کا نقصان خود اُسے ہی پہنچے گا اور اگر وہ سچا ہے تو

پھر وہ بعض مضر امور تم تک پہنچیں گے جن سے وہ تمہیں ڈراتا ہے''۔ یہاں اُسے تمام امور کہنا چاہیے تھا، بعض کیوں کہا! شاید یہ بھی صرف پہلو بچانے کی خاطر ہو کہ جو ہدف اس کے سامنے ہے مبادا کہ اس کے سلسلہ میں کسی قسم کی گفتگو مشکلات پیدا کردے۔ لہٰذا اس نے اکثر کے بجائے کم از کم کہا اور اسی طرح کہا کہ اگر موسیٰؑ سچا ہو تو کم از کم کچھ چیزیں، جن سے تمہیں موسیٰؑ ڈراتا ہے، یقیناً تمہارے نقصان میں ہوں گی۔

۴۔ اس نے کہا: جس ظاہری قوت پر تم اترا رہے ہو ممکن ہے ہاتھ سے دے بیٹھو اور موسیٰؑ کی بددعا تمہیں لگ جائے۔ ایسی حالت میں ہماری مدد کون کرے گا۔ یقوم لکم الملك الیوم ظاهرین فی الارض فمن ینصرنا من باس الله ان جآءَنا۔

۵۔ پھر اس نے اپنی بات پر کچھ تاریخی شواہد پیش کیے کہ اقوام نوح، ثمود، عاد اوران کے بعد آنے والی اقوام اسی قسم کی ظاہری توانائی رکھتی تھیں لیکن انبیائے الٰہی کی مخالفت کرنے پر اس توانائی کو کھو بیٹھیں۔ یقوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب۔

۶۔ دوسرے مرحلہ میں طرزِ تکلم تبدیل کرتے ہوئے اُنہیں دنیا سے آخرت کی طرف سے یہ کہہ کر متوجہ کرتا ہے کہ قیامت کا دن آہ و فریاد کا دن ہے۔ گناہگار عذاب کی سختی کی وجہ سے فریاد کریں گے اور جب عذاب الٰہی ان کی طرف آئے گا تو وہ اُس سے فرار چاہیں گے جب کہ ایک ایسا دن آپ کا منتظر ہے: ویقوم انی اخاف علیکم یوم التناد یوم تولون مدبرین ما لکم من الله من عاصمٍ و من یضلل الله فما له من هادٍ۔

۷۔ بعد کی گفتگو میں مومن آلِ فرعون نے کہا کہ انبیاء کی مخالفت تم فراعین کا ہمیشہ دستور رہا ہے۔ موسیٰؑ سے پہلے حضرت یوسفؑ بھی دلائل و براہین کے ساتھ تمہاری طرف آئے تو تم نے اُن کی دعوت میں شک کیا اور پھر اس کے بعد تم نے کہا کہ اب کوئی اور رسول نہیں آئے گا اس طرح تم لوگ مشرکین و شک کرنے والوں کے گروہ سے ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں تم وہ لوگ ہو جو کسی دلیل کے بغیر آیاتِ الٰہی کے خلاف مجادلہ کرتے ہو: ولقد جآءَ کم یوسف من قبل بالبینات فما زلتم فی شك مما جآءَ کم به حتی اذا هلك قلتم لن یبعث من بعدهٖ رسولاً کذالك یضل الله من هو مسرف مرتاب٥

۸۔ اس تمام گفتگو اور تبلیغ سے پتہ چلتا ہے کہ مومنِ آل فرعون بڑا فہمیدہ اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ اس نے جتنی باتیں کیں بعینہٖ مطابق وحی تھی جو انبیاء پر نازل ہوئی۔ ہم چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ گناہگار کو اس کے جرم کے مطابق سزا دیتا ہے اور نیک افراد کو بے حساب اجر عطا فرماتا ہے: من عمل سیئَةً فلا یجزی الا مثلها و من عمل صالحاً من ذکر او انثی و هو مومن فاولئبك یدخلون الجنة یرزقون فیها بغیر حسابٍ٥ قرآن مجید میں دیگر موارد میں بھی بعینہٖ یہی مضمون وارد ہوتا ہے: من جآءَ بالسیئَة فلا یجزی الا مثلها و هم لا یظلمون''۔ یا دوسری جگہ فرماتا ہے: من جآءَ بالحسنة فله عشر امثالها (انعام: ۱۶۱)

(ب) اس زمانہ کے افکارِ عمومی کے برخلاف عورت مرد دونوں کو اللہ کے حضور انسان کامل کے طور پر پہچان کرواتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: من عمل صالحاً من ذکرٍ او انثی۔ قرآن حکیم اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَمُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ (نحل: ۹۷)

(ج) اس نے فراعنہ کے شرک کے بارے میں مشورہ کو رد کرتے ہوئے کہا کہ میں کیسے اس چیز کو مان لوں اور اس کا اعتقاد کر لوں جس کا مجھے علم نہیں۔قرآن نے اسی طرح بعینہٖ اپنی تعلیمات میں فرمایا: (☆)(عنکبوت:۸)

۹۔ آخر میں کہتا ہے کہ تمہارے یہ جھوٹے خدا نہ اس دنیا میں کوئی دعوت رکھتے ہیں اور نہ آخرت میں کوئی قدرت رکھتے ہیں۔اگر یہ مقام ربوبیت رکھتے ہوتے تو چاہیے تھا کہ یہ بھی اپنے نبی بھیجتے جو لوگوں کو اُن کی طرف دعوت دیتے۔لہٰذا اس نے کہا: لاجرم ان ماتدعونني اليه ليس له دعوة في الدنيا ولا في الاخرة

۱۰۔ اس کے معقول تبلیغی طریقِ کار نے فرعون کو غضب ناک کر دیا۔ممکن تھا فرعون اس کو پھانسی کا حکم دے دیتا اور شاید کسی حد تک اس کے مقدمات بھی فراہم ہو چکے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اسے ان کے منصوبوں کے عواقبِ بد سے بچایا: "فوقه الله سيات مامكروا"۔

۱۱۔ فرعون نے اس کی بعض باتیں سن کر اپنا وہی متکبرانہ انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ صحیح بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔"ما اريكم الاما ارىٰ"۔ یہی استبداد و تکبر کہلاتا ہے۔

(ک) آخری اتمامِ حجت

خالق کائنات کی سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ نرمی و مہربانی کے ساتھ پیش آتا ہے، یہاں تک کہ فرعون جیسے ستمگر و جابر شخص کو بھی سالہا سال تک مہلت دی کہ ہوسکتا ہے راہِ راست پر آ جائے۔کئی طریقوں سے اس کی ہدایت کی کوشش کی جاتی ہے،لیکن وہ متکبر و مغرور انسان اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹا رہتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرعون پر اتمامِ حجت کر دیا۔حضرت موسیٰؑ کو روشن دلیلوں کے ساتھ اس کی ہدایت کے لیے بھیجا۔مناظرہ کی منزل میں اس پر تمام راہیں بند کر دیں۔اب اُسے راہِ راست پر لانے کے لیے آخری ہتھیار یہی بچ گیا تھا تاکہ اس پر مصائب و حوادث نازل ہوں۔ان حالات سے مربوط آیات کا بیان اس طرح ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۡ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾

۲۔ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

۳۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾ (الزخرف:۴۸ تا ۵۰)

۴۔ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ﴿۱۳۰﴾
۵۔ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا
بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴿۱۳۱﴾
۶۔ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴿۱۳۲﴾
۷۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ
مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ﴿۱۳۳﴾
۸۔ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ
لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴿۱۳۴﴾
۹۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ﴿۱۳۵﴾۔
(الاعراف: ۱۳۰ تا ۱۳۵)
۱۰۔ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا
يُرْجَعُوْنَ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ﴿۴۰﴾ (القصص ۳۹، ۴۰)

آیات کا ترجمہ

۱۔ہم نے انہیں کوئی نشانی نہیں دکھائی مگر یہ کہ وہ اپنے سے پہلے والی نشانی سے بڑی تھی اور انہیں عذاب و بلا میں مبتلا کر دیا کہ شاید (وہ اللہ کی طرف) لوٹ آئیں۔

۲۔آلِ فرعون نے موسیٰؑ سے کہا: اے بڑے جادوگر [1] اپنے رب کو ہماری مدد کے لیے بلاتا کہ اس

[1] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ساحر سے ان کی مراد دانش مند عالم تھا کیونکہ اس زمانہ میں علمِ سحر کو بڑا عظیم مقام حاصل تھا۔

نے تیرے ساتھ جو عہد کر رکھا ہے اس کے ذریعہ (وہ ہم سے عذاب برطرف کرے کہ) ہم بھی ہدایت پا جائیں۔

۳۔ جب ہم نے موسیٰؑ کی دعا سے) عذاب ان سے برطرف کر دیا تو انہوں نے پھر عہد شکنی کی اور ایمان نہ لائے۔

۴۔ ہم نے آلِ فرعون کو شدید قحط میں مبتلا کر دیا اور انہیں فصلوں (کھیتی باڑی) کی بیماریوں کے ذریعہ امتحان میں مبتلا کیا کہ شاید وہ سمجھ جائیں۔

۵۔ جب انہیں اچھائی پہنچتی تو اُسے اپنی طرف منسوب کرتے اور جب کسی ناگوار صورتِ حال کا سامنا ہوتا تو اُسے موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں فالِ بد شمار کرتے۔ انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کی فالِ بد اللہ کے پاس ہے (یعنی یہ آزمائشیں وہی بھیجتا ہے) لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے۔

۶۔ آلِ فرعون نے کہا کہ جو نشانی یا معجزہ بھی لاؤ گے کہ اس کے ذریعہ ہم پر جادو کرو تو جان لو کہ ہم پھر بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

۷۔ پس اس کے نتیجہ میں ہم نے اُن پر طوفان، ٹڈیاں، قُمّل (مچھر نما کیڑے)، مینڈک اور خون جیسی مفصل نشانیاں اتاریں لیکن انہوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم قوم تھے۔

۸۔ ان پر جب عذاب نازل ہوا تو انہوں نے کہا کہ اے موسیٰؑ اللہ کو اس عہد کے ذریعہ پکارو جو اس نے آپ کے ساتھ کر رکھا ہے۔ اگر وہ ہم سے عذاب دور کر دے گا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیج دیں گے۔

۹۔ انہوں نے جتنی مدت میں ایمان لانے کی مہلت مانگی تھی اتنی مدت عذاب ان سے برطرف کر دیا لیکن پھر بھی انہوں نے عہد توڑ دیا۔

۱۰۔ اس (فرعون) نے اور اس کے لشکر نے ناحق تکبر کیا اور گمان کیا کہ وہ ہماری طرف لوٹ کے نہیں آئیں گے۔ پس ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو پکڑ لیا اور دریا میں غرق کر دیا۔ آپ دیکھیں کہ

ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آلِ فرعون کو شرک وسرکشی سے روکنے کے لیے مختلف مصیبتوں میں گرفتار کیا، ایک کے بعد دوسرا عذاب ان پر نازل ہوا۔ جب بھی کوئی عذاب اُن پر آ تا تو موسیٰؑ سے کہتے کہ دعا کریں اللہ ہم سے عذاب برطرف کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ موسیٰؑ دعا کرتے، عذاب برطرف ہو جاتا، لیکن وہ اپنے کفر وشرک پر باقی رہتے۔

ان پر جو عذاب نازل ہوئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ قحط اور پھلوں کی کمی

"ولقد اخذنا ال فرعون بالسنين و نقص من الثموت لعلهم يذ كرون"۔ "سنين" "سنة" کی جمع ہے جس کے معنی سال کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد قحط کے سال ہیں۔ قحط کے لیے جو "سنة" و "سنين" کی لفظیں عربی میں استعمال کی جاتی ہیں اس لیے ہیں کہ لوگ خشک سالی کے لیے "سنة" قحط جیسے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا استعمال میں سہولت کی خاطر دوسرا حصہ یعنی قحط گرا دیا گیا اور اس کی جگہ "سنة" کی لفظ استعمال کی جانے لگی۔ یہاں جمع ''سنین'' کی لفظ کا استعمال بتاتا ہے کہ قحط کی مدت دو سال سے زیادہ تھی، پھر بھی اس حد تک قحط شدید نہیں تھے کہ بھوک سے مر جاتے بلکہ شاید بعض طریقوں سے غذا حاصل کرنے کے قابل ضرور تھے۔

۲۔ طوفان

اس طوفان سے مراد شاید ایسا سیلاب ہے جو گھروں اور کھیتوں کو بہا لے جاتا ہے۔ پھر سیلاب کے عواقب بھی شدید ہوتے ہیں جیسے طاعون اور آبلوں کی بیماریوں کا پھیل جانا۔

۳۔ ٹڈی دل

یہ زراعت کی بیماری ہے۔

۴۔ قمل

''قمل، قملہ کی جمع ہے۔ یہ ایک پروں والا چھوٹا سا کیڑا ہوتا ہے، سرخ مٹیالے پر رکھتا ہے اور کھیتی کے لیے آفت شمار ہوتا ہے۔ کبھی اسے چھوٹا مچھر (صفار الذباب) کہا جاتا ہے اور یہ حیوانات کی تباہی کا سبب بھی بنتا ہے۔

۵۔ضفادع

یہ ضفدع کی جمع ہے جس کے معنی مینڈک کے ہیں۔

۶۔خون

یہ کبھی کبھی اُن کے مشروبات میں ظاہر ہوجاتا تھا۔

قرآن نے ان تمام مصائب کی ''آیاتِ مفصلات'' کے عنوان سے تعبیر کی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب یکے بعد دیگرے ظاہر ہورہے تھے۔تعجب کی بات یہ ہے کہ جب عذاب نازل ہوتا تو وہ موسیٰؑ کے دامن میں پناہ لیتے اور کہتے کہ اگر عذاب برطرف ہوجائے تو ایمان لے آئیں گے۔لیکن ایمان پھر بھی نہ لاتے۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پانچ مرتبہ حضرت موسیٰؑ سے عہد کیا اور ہر مرتبہ عہد شکنی کے مرتکب ہوئے۔شاید درج ذیل آیات اُن کے متعدد بار عہد کرنے، پھر انہیں توڑنے اور ان پر متعدد مصائب کے نزول کے بارے میں ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلٰٓى أَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿۱۳۵﴾

سوال یہ ہے کہ اس آیت میں جملہ ''بماعھد عندک'' میں جو عہد کی لفظ استعمال ہوئی ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

شاید اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے موسیٰؑ سے عہد کیا تھا کہ جب بھی دعا کرو گے میں قبول کروں گا، یا عہد سے مراد آلِ فرعون کا ایمان ہو کہ اگر عذاب برطرف ہوجائے تو وہ ایمان لے آئیں گے۔لیکن پہلا احتمال زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے جب کہ دوسرا احتمال ان کی درخواست سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ عہد الٰہی میں تو یہ شرط تھی کہ وہ عذاب کے اٹھنے سے پہلے ایمان لے آئیں، جب کہ وہ اس کے برعکس کہتے تھے کہ پہلے عذاب دور ہوجائے پھر وہ ایمان لے آئیں گے۔

(۵) آلِ فرعون کی تباہی وہلاکت

یہاں تک ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت موسیٰؑ کے ہدایت آلِ فرعون کی خاطر مختلف طریقہ ہائے کار کی تفصیل سے آشنا اور انتہائی ڈھیٹ وہٹ دھرم انسانوں کے حالات سے آگاہ ہوئے جو اس شعر کے مصداق ہیں:

لطف حق باتو مدارا ھا کند　　چونکہ از حل بگذرد رسوا کند

خدا کے الطاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ تیرے موافق رہے۔لیکن جب کوئی حل نظر نہ آئے تو پھر تجھے رسوا کرتا ہے۔

بال آخر یہ بات مسلم ہوگئی کہ وہ (آل فرعون) کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے۔لہٰذا اب ضروری ہوگیا کہ زمین کو اس ناسور سے پاک کر دیا جائے۔پس رحمت کا پیغمبر اب مظہر غیض بن گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کے اموال تباہ کر دے، ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور عذابِ قیامت سے اس حالت میں دوچار ہوں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓي اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٨٨﴾ (یونس:۸۸)

موسیٰؑ نے کہا پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرکردہ درباریوں کو دنیاوی زندگی میں بہت سامال وزیب وزینت کے وسائل عطا فرمائے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انہوں نے تیرے بندوں کو گمراہ کیا۔ پروردگارا! ان کے اموال کو برباد کردے، ان کے دلوں پر مہر لگا دے تا کہ وہ ایمان نہ لاسکیں یہاں تک کہ عذاب الیم (دردناک عذاب) دیکھ لیں۔

حضرت موسیٰؑ کی دعا مستجاب ہوگئی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾ (یونس: ۸۹) اللہ تعالیٰ کا جواب آیا: بے شک آپ دونوں (موسیٰؑ وہارونؑ) کی دعا قبول ہوگئی۔ استقامت اختیار کرو اور جاہلوں کی پیروی نہ کرو۔

دوسری آیت میں فرمایا: فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٥﴾ (زخرف: ۵۵) یعنی جب انہوں نے ہمارے غضب کو ابھارا تو ہم نے اُن سے انتقام لے لیا اور سب کو غرق کردیا۔

اب دیکھنا ہے کہ کیسے آلِ فرعون دریا میں غرق ہوئے اور حضرت موسیٰؑ و بنی اسرائیل نے نجات پائی۔ آیات موضوع یہ ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَجٰوَزْنَا بِبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ
حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا
اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾

۲۔ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾

۳۔ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ
النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ (یونس: ۹۰ تا ۹۲)

۴۔ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾

۵۔ وَلَقَدْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی ۬ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی
الْبَحْرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰی ﴿۷۷﴾

۶۔ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ ﴿۷۸﴾

۷۔ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰی ﴿۷۹﴾ (طٰہٰ: ۷۷ تا ۷۹)

۸۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ (الشعرآء: ۵۲)

۹۔ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ﴿۶۰﴾

۱۰۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

۱۱۔ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۶۲﴾

۱۲۔ فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ
كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴿۶۳﴾

۱۳۔ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۴﴾

۱۴۔ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾

۱۵۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ (الشعرآء ۶۰ یا ۶۶)

۱۶۔ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

۱۷۔ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

۱۸۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ (الدخان ۲۲ تا ۲۴)

آیات کا ترجمہ

۱۔ بنی اسرائیل کو ہم نے دریا عبور کروا دیا۔ فرعون اور اس کے لشکر نے ظلم و سرکشی کی خاطر ان کا تعاقب کیا۔ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں تسلیم کرنے والوں سے ہوں۔

۲۔ (خطاب ہوا) اب (تو ایمان لاتا ہے) جب کہ پہلے نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں سے تھا۔

۳۔ آج ہم تیرے جسم کو پانی سے باہر نکال دیں گے تاکہ تیرے بعد آنے والوں کے لیے نشانی اور عبرت کا موقع بنے جب کہ بہت لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں۔

۴۔ فرعون نے ارادہ کیا کہ بنی اسرائیل کو سرزمین مصر سے باہر نکال دے یا قتل کر دے۔[1] ہم نے اُسے اور اُن کو جو اس کے ساتھ تھے، سب کو دریا میں غرق کر دیا۔

۵۔ ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ ہمارے بندوں کو رات کے وقت (دریا کی طرف) لے جائے، اُن کے لیے عصا مار کے دریا میں خشک راستہ بنائے اور فرعونیوں کے ہاتھ لگنے یا غرق ہونے سے خوف نہ کھائے۔

[1] چونکہ کلمہ "یستفز" نکالنے اور بدر کرنے کے معنی رکھتا ہے اور قلع قمع کرنے کے بھی، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کوئی ایک معنی یہاں مراد ہوں لیکن ہماری نظر میں قتل کرنے کے معنی مناسب تر ہیں۔

۶۔فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ موسیٰ اور ان کے ہمراہیوں کا تعاقب کیا (وہ اچانک دریا پر پہنچ گئے) تو انہیں دریا کی امواج نے ڈھانپ لیا (یعنی وہ دریا کی کوہ پیکر موجوں میں غرق ہو گئے)

۷۔فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور انہیں ہدایت نہ کی۔

۸۔ ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ راتکی تاریکی میں میرے بندوں کو لے چلے کہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

۹۔پس انہوں نے طلوعِ آفتاب کے وقت ان کا تعاقب کیا۔

۱۰۔ جب دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تو موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا اب ہمیں پکڑ لے جائیں گے۔

۱۱۔موسیٰؑ نے کہا ایسا نہیں ہوگا۔میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔وہ میری ہدایت فرمائے گا۔

۱۲۔ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو۔پس وہ شق ہو گیا اور اس کا ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی مانند نظر آنے لگا۔

۱۳۔اور ہم نے دوسروں کو بھی دریا کے نزدیک کر دیا۔

۱۴۔موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو ہم نے نجات دی۔

۱۵۔ان کے علاوہ لوگوں کو غرق کر دیا۔

۱۶۔موسیٰؑ نے اپنے رب سے مناجات کی اور عرض کیا: خدایا! آلِ فرعون مجرم قوم ہیں۔

۱۷۔خطاب آیا کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے چل اور تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

۱۸۔دریا سے گزرنے کے بعد اُسے پرسکون چھوڑ دے۔فرعون کی فوجیں غرق ہو جائیں گی۔

آیات کی موضوعی تفسیر

۱۔ مشیتِ الٰہی اب یہ ٹھہری کہ فساد کی جڑ کاٹ دے کیونکہ فرعون کے ارادے یہ تھے کہ بنی اسرائیل کے مردوں کو قتل کر دے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دے۔ چنانچہ اس نے کہا: "سنقتل ابناءھم و نستحی نساءھم وانا فوقھم قھرون"۔ یعنی ہم اُن کے مردوں کو قتل کر دیں گے اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے۔ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴿۱۲۷﴾ (اعراف: ۱۲۷) لٰہذا ایسے

خونی شخص کو کسی قسم کی مہلت دینا درست نہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ راتوں رات بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر دریا کی طرف جاؤ تاکہ تم دریا پار کر کے فرعون کی پہنچ سے دور ہو جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دریا کون سا ہے، اس سے دریا نیل مراد ہے جس دریا کا نام دیا جا سکتا ہے یا اس سے بحر احمر مراد ہے جس کو پار کر کے فلسطین کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے نہر سویز عبور کی تھی کیونکہ اس وقت اس میں پانی چلتا تھا جو بعد میں خشک ہو گئی اور پھر دوبارہ اسے کھودا گیا تاکہ اس کے ذریعے بحیرہ روم کو بحرِ احمر سے ملا دیا جائے۔ بہرحال مغرب سے مشرق کی طرف دریا عبور کیا گیا چاہے وہ رودِ نیل ہو یا بحیرۂ احمر۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ نے رات کی تاریکی سے استفادہ کرتے ہوئے پہلے سے طے شدہ ارادہ کے تحت تمام بنی اسرائیل کو سفر پر تیار کر لیا۔ اتنی بڑی تعداد کو جو بعض لوگوں کے نزدیک چھ لاکھ تھی، اتنی خاموشی سے نکال لے جانا کہ فرعونی کارندے متوجہ ہی نہ ہو سکیں، ایک بہت مشکل کام تھا۔ بنی اسرائیل نے یقیناً وہاں اپنی رہائش کے دوران گھر بنا لیے تھے، اُن کے سامان تھے اور وہ سارا سامان چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتے تھے، طبعی طور پر آدھی رات کو اتنے سامان کے ساتھ نکلنا کہ کسی کو احساس تک نہ ہو سکے، بڑا محیر العقول کارنامہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ فرعونیوں نے طلوعِ آفتاب کے وقت ان کا تعاقب شروع کیا، یعنی اس سے پہلے انہیں ان کے فرار کی خبر ہی نہ تھی۔ "**فاتبعوھم مشرقین**" (شعراء: ۶۰) حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر رات کی تاریکی میں چل پڑے اور ادیطلوعِ آفتاب کے وقت یہ لوگ لبِ دریا پہنچ چکے تھے، جب فرعون کو ان کے کوچ کی خبر ہوئی۔ لہٰذا وہ اپنے تمام لاؤلشکر سمیت اُن کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا "**فاتبعھم فرعون بجنودہٖ**" (طٰہٰ: ۷۸)

فرعون اور اس کے لشکر نے یہ فاصلہ بڑی تیزی سے طے کیا کیونکہ اُن کے پاس تیز رفتار سواریاں تھیں۔ جب بنی اسرائیل نے فرعون کے سپاہیوں کو دیکھا کہ وہ تیزی سے اُن کی طرف بڑھ رہے ہیں تو کہنے لگے: وہ ابھی ہمیں گرفتار کر لیں گے اور وہ خوف و دہشت سے کانپنے لگے کیونکہ اُن کے پیچھے فرعونی لشکر تھا اور آگے دریا تھا۔ پس اُن کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ فرعون کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔

حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا: ''ہم نہ فرعون کے ہاتھ لگیں گے اور نہ ہی دریا میں غرق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے نجات کا وعدہ فرمایا ہے اور وہی ہدایت دینے والا ہے۔ "**قال کلا ان معنی ربی سیھدین**" (شعراء: ۶۱)

ہر لحظہ لشکرِ فرعون اور ان کے درمیان فاصلہ گھٹ رہا تھا جب کہ موسیٰؑ اللہ کے فرمان کے منتظر تھے۔ حکم آیا کہ اپنا عصا دریا پر مارو، تم دیکھو گے کہ دریا میں ایک بڑا وسیع و خشک راستہ بن جائے گا۔ اس راستے سے بنی اسرائیل کو نکال لے جاؤ اور دریا کو اسی سکون کی حالت میں چھوڑ جاؤ تاکہ فرعونی جب بنا ہوا راستہ دیکھیں تو اسی راستے سے تمہارا تعاقب کرنے کی کوشش کریں۔ بالآخر تم نجات پاؤ گے اور وہ دریا میں داخل ہوتے ہی غرق ہو جائیں گے۔

قرآن فرماتا ہے: **وَلَقَدۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى ۙ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡ فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِيۡقًا فِى الۡبَحۡرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخۡشٰى ۝۷۷**(طٰہٰ : ۷۷) یا دوسری آیت میں فرماتا ہے: **وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡۤ اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ۝۵۲**(شعراء: ۵۲) اسر کے معنی رات کو چلانے کے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ انہوں نے رات کو کوچ کیا۔ دوسرا یہ کہ راستہ دریا میں ایک

سے زیادہ نہ تھا جو بہت بڑا تھا، جیسا کہ طریق کا کلمہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کے لیے ایک الگ راستہ تھا، اولاً تو یہ خود آیت کے ظاہر کے خلاف ہے، دوسرے بڑا بعید نظر آتا ہے کہ بنی اسرائیل تاریک رات میں اتنے منظم چل رہے ہوں کہ ہر قبیلہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر سفر کر رہا ہو۔

غرق ہوتے وقت ایمان لانا

ظالمین زمانہ کا دستور ہے کہ وہ اپنی بداعمالیوں میں اس وقت تک گم رہتے ہیں جب تک موت اپنے سیاہ پنجے اُن کے گلے پر نہ گاڑ دے۔ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوتے ہی ان کی آنکھوں کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور وہ اپنی بداعمالیوں کے نتائج کو مجسم دیکھنے لگتے ہیں۔ پھر وہ اپنے کیے پر پچھتاتے اور ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسا ایمان نہ کوئی قیمت رکھتا ہے نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ ایمان اس وقت مفید ہوتا ہے جب انسان عمل وترک عمل پر قادر ہو اور جہاں وہ خیر وشر کا مصدر بن سکے۔ لیکن جو شخص دریا کی عظیم موجوں میں تنکے کی طرح تھپیڑے کھا رہا ہو، اس کے ایمان کا اظہار کسی قسم کی اہمیت و قیمت نہیں رکھتا۔ فرعون نے یہی سمجھا کہ اب اگر وہ ایمان کا اظہار کر دے تو اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾ (یونس: ۹۰) اس موقع پر دریا کے اندر روحانی خطاب کی گونج سنائی دی جسے فرعون نے بھی سنا۔ آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾ (یونس: ۹۱)

فرعون کے اس بے اہمیت ایمان (ایمانی بے ایمانی) کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے خطاب کیا: تیرے بے جان جسم کو ہم دریا سے باہر لا پھینکیں گے، تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے نمونہ عبرت رہے اور سب کو پتہ چلتا رہے کہ سنگدل متکبر انسانوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ شاید فرعون کی حنوط شدہ لاش جو آج بھی مصر کے عجائب گھر میں موجود ہے، اس مشیتِ الٰہی کو پورا کرنے کے لیے ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ ﴿۹۲﴾ (یونس: ۹۲)

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جب پانی پھٹ گیا اور خشک راستہ ظاہر ہو گیا تو قرآن نے پانی کے ہر حصے کو ایک بڑے پہاڑ سے تشبیہ دی ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کیونکہ پانی چل رہا تھا اور آگے جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ لہٰذا طبعی بات ہے کہ پانی جمع ہوتا جائے گا جس سے اس کی بلندی پہاڑ کے مشابہ نظر آئے گا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَانۡفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرۡقٍ کَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ ﴿ۚ۶۳﴾ (شعراء: ۶۳)

آخری قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ انجام پاتا ہے وہ مشیتِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے اور اس کی قدرت سے سرچشمہ پاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی لا یزال قدرت اور عظیم مشیت نہ ہو تو کوئی طبیعی سبب موثر نہیں ہو سکتا۔ اس بات کے پیش نظر ہم عرض کریں گے کہ دریا کے پانی کا ہٹ کر خشک رستے کا بن جانا، اس میں ارادۂ موسیٰؑ اور عصا مارنا ہی موثر تھے، ورنہ کیا ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ راستے کے لیے دریا میں عصا مارنے کا حکم دیتا، شاید "ان اضرب بعصاك البحر" (عصا مارنے کا حکم دیا) کے "فانفلق" پر فاء کا آنا اسی بات کی طرف اشارہ ہو کہ پانی میں راستہ دینا اسی عصا مارنے کے نتیجہ میں تھا۔

بنی اسرائیل کی مصر سے ہجرت

فرعون کے ظالمانہ طویل دور کا خاتمہ اس کے غرق ہوتے ہی ہو گیا اور بنی اسرائیل نے ایک پُر مشقت طولانی سفر کے بعد دریا عبور کر کے استقلال و آزادی کو حاصل کر لیا۔ یہ ہے اس واقعہ سے متعلق آیات کا بیان:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾

۲۔ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾

۳۔ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾

۴۔ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾

۵۔ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾

۶۔ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾

۷۔ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ (الدخان: ۲۵ تا ۳۱)

۸۔ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا
الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا
صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾
(الاعراف: ۱۳۷)

۹۔ وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا
اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا
كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾ (یونس: ۹۳)

۱۰۔ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ

جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِيۡفًا﴿۱۰۴﴾ (اسرآئیل: ۱۰۴)

آیات کا ترجمہ

ا۔انہوں نے کتنے ہی باغات وچشمے،

۲۔کھتیاں وبلند وبالا عمارتیں

۳۔اور وہ ناز ونعمات چھوڑیں جن میں وہ غرق تھے۔

۴۔ان کا وارث ہم نے دوسروں کو بنا دیا۔

۵۔ان کی موت پر آسمان روئے، نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔

۶۔اور ہم نے بنی اسرائیل کو اس خوار کر دینے والے عذاب سے نجات دی۔

۷۔فرعون کے ہاتھ سے جو بڑا متکبر اور اسراف کرنے والا تھا۔

۸۔ہم نے زمین کے بابرکت مشرق ومغرب کا وارث ان لوگوں کو ٹھہرایا جنہیں زمین میں ضعیف بنا دیا گیا تھا۔اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت بنی اسرائیل پر اُن کے صبر کی وجہ سے تمام کر دی، نیز جو کچھ فرعون، اس کی قوم نے بنایا اور اس پر بلند کیا، اسے ہم نے برباد کر دیا۔

۹۔ہم نے بنی اسرائیل کو صحیح جگہ پر ٹھہرایا اور انہیں پاک و پاکیزہ نعمات سے نوازا۔انہوں نے پیغمبر ختمی مرتبت کی رسالت میں اختلاف نہ کیا، یہاں تک کہ انہیں یقین ہو گیا (تو پھر انہوں نے ہٹ دھرمی کی اور منکر ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کر دے گا جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔

۱۰۔ہم نے بنی اسرائیل سے اس کے بعد کہا: سرزمین معہود میں سکونت کرو اور جب ہمارا آخرت کا وعدہ آ گیا تو ہم تم سب کو لے آئیں گے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

جس قوم نے مدتوں مصر پر اس تابناک تمدن کے ساتھ حکومت کی تھی وہ دریا کی موجوں کا شکار ہو کر دریا میں غرق ہو گئے۔ان کے بلند

وبالا و دلکش محلات اور خوبصورت کھتیاں مکینوں سے خالی ہوگئیں۔ یہ افسوس ناک صورتِ حال ان مکینوں کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں واقع ہوئی۔ قرآن کریم ان خوبصورت مناظر کی تصویر کشی اور مکانوں کے بے آباد ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: **فما بکت علیھم السمآءُ والارض وما کانوا منظرین**o ان کے نیست و نابود ہونے سے بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجۂ ستم سے نجات مل گئی۔ارشاد ہوتا ہے: **ولقد نجینا بنی اسرائیل من العذاب المھین من فرعون انه کان عالیاً من المسرفین**o

یہاں جملہ "**فما بکت علیھم السمآءُ والارض**" ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ کہ زمین و آسمان ان کی حالت دیکھ رہے تھے۔اگر یہ سمجھ بوجھ رکھتے ہوئے تب بھی اُن کی حالت پر گریہ نہ کرتے کیونکہ انہیں یہ معلوم ہوتا کہ آلِ فرعون اس عذاب کی مستحق تھی، البتہ سمجھا جاسکتا ہے کہ آیت میں خود آسمان و زمین مراد نہیں ہیں بلکہ اہل آسمان و زمین مراد ہیں۔

دوسری بات یہ کہ سورہ دخان میں فرماتا ہے: **کذالك و اورثنھا قوماً اخرین**o اس آیت میں "**اورثنھا**" کی مونث ضمیر "**ھا**" نعمت اور اس کے مصادیق کی طرف لوٹ رہی ہے جب کہ نعمت کے مصادیق کھیتیاں، باغات اور چشمے ہیں۔بس اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ بربادی صرف قومِ فرعون پر آئی تھی، ان کے اموال و باغات وکھتیاں سب صحیح و سالم تھے جو دوسروں کے حصے میں آئے۔لیکن سورۂ اعراف کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قومِ فرعون کی یہ سب چیزیں بھی برباد ہوگئیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **ودمرنا ما کان یصنع فرعون و قومه و ما کانوا یعرشون**o سوال یہ ہے کہ اس ظاہری اختلاف کا کیا جواب ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ دخان کی آیات کا مطلب مناظرِ طبیعی، باغات اور کھیتیاں ہیں، بلکہ مقام کریم (خوبصورت مقام) سے مراد بھی وہی دلکش مناظر ہیں، یعنی جس چیز کا تعلق فطرت وطبیعت سے تھا وہ سالم رہی اور دوسرے اس کے وارث ہوگئے۔دوسری آیت میں جس بربادی کا تذکرہ ہے اس سے وہ چیزیں مراد ہیں جنہیں فرعون اور اس کی قوم نے بنایا تھا اور اس پر جو چھتیں بلند کی تھیں۔پس اس آیت میں فرعونی تہذیب وتمدن اور ان کی مصنوعات مراد ہوں گی کیونکہ اس آیت میں "**یصنع فرعون**" اور "**یعرشون**" کی لفظیں استعمال ہوئی ہیں۔بہر حال صناعی قدرت بچ گئی اور صناعیِ بشر برباد ہوگئی جو فرعون کے متکبرانہ تمدن کے مظاہر سے تھی۔

کیا بنی اسرائیل دوبارہ مصر میں واپس آئے؟

سورۂ دخان ۲۸ میں ذکر آتا ہے کہ آلِ فرعون کی سرسبز زمینوں کے دوسرے لوگ وارث ہوگئے۔ " **کذالك اورثنھا قوماً اخرین**o

سوال یہ ہے کہ یہ دوسری قوم سے کون مراد ہیں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بنی اسرائیل ہی تھے جو فرعون کی ہلاکت کے بعد مصر لوٹ آئے تھے اور ان نعمات سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔

لیکن یہ نظریہ صحیح معلوم نہیں ہوتا بلکہ ''قوم آخرین'' سے مراد قومِ فرعون ہی کے باقی ماندہ عورتیں اور بچے تھے جو غرق ہونے سے بچ گئے تھے کیونکہ وہ اپنی کمزوری کے باعث لشکر کے ساتھ نہیں گئے تھے اور شاید ان کے ہاتھ بنی اسرائیل کے خون سے رنگین نہیں ہوئے تھے اس

لیے وہ بچ گئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی اور قوم ہو جو بعد میں سرزمین مصر پر آ کر آباد ہوگئی ہو، اور وہاں کی وسیع سرزمین پر متصرف ہوئی ہو۔ بہر کیف "قوماً اخرین" سے بنی اسرائیل کا مراد لینا بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس کے ایک آیت بعد ارشاد ہے: ولقد نجینا بنی اسرائیل من العذاب المھین٥ اگر "قوما اخرین" سے مراد بنی اسرائیل ہی تھے تو پھر بلاغت کا تقاضا یہ تھا کہ "قوما آخرین" کی بجائے "بنی اسرائیل" کہنا چاہیے تھا کیونکہ اس سے بعد والی آیت میں "ولقد نجینا بنی اسرائیل من العذاب المھین" فرمایا گیا ہے۔

پس اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سورۂ اعراف ۷ ۱۳ میں جو مشارق الارض ومغاربھا کہا گیا ہے اس سے مراد سرزمین مقدس موعود فلسطین کے مشرق ومغرب ہیں نہ کہ مصر کے دراصل اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ مظلوم قوم ظالموں کے پنجۂ ظلم سے نجات پا کر سرزمین موعود پر آ کر آباد ہوگئی اور اس پوری سرزمین پر قابض ہوگئی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ

اس آیت میں اس بات کے دو شاہد ہیں کہ مشرق ومغرب سے مراد سرزمین فلسطین کے مشرق ومغرب ہی ہیں۔ ایک تو برکنا کی لفظ سے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں فلسطین وشام کی سرزمین کے لیے استعمال فرمایا ہے جہاں ارشاد ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (اسرائیل:۱) پاک ہے وہ ذات جس نے آدھی رات کو سیر کرائی، اپنے عبد کو، مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ تک، جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنادیا ہے"۔

دوسری شاہد جملہ "وتمت کلمۃ ربک الحسنی" ہے۔ یعنی ہم نے اپنا وعدہ پورا کردیا کیونکہ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں سرزمین موعود پر لے جائیں گے جیسا کہ درج ذیل آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے: يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (مائدہ:۲۱) "اے قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ جو تمہارے لیے مقدر کی گئی ہے"۔

اس آیت سے واضح ہوجاتا ہے کہ مقام صدق (مبوء صدق) سے، جو آیت میں آیا ہے، مراد بھی سرزمین فلسطین ہی ہے اور اُسے مقام صدق اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سرزمین پر لے آنے کا وعدہ سچا تھا، لہٰذا یہ جگہ صدق کی جگہ کہلائی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ولقد بوانا بنی اسرائیل مبوء صدقٍ ورزقنھم من الطیبت"۔

ممکن ہے اس سرزمین فلسطین کو مقام صدق اس وجہ سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ بھی ایک آباد سرزمین میں ہونا چاہیے اس زمین موجود تھا کیونکہ صدق کی طرف کوئی چیز مضاف ہو، جیسے وعدۂ صدق، کلام صدق وغیرہ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس مضاف میں جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ پایا جاتا ہے۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ آیت: "وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض" میں "ارض" سے مراد بھی سرزمین فلسطین ہی ہے۔ پھر آخر میں فرمایا: "وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض فاذا جآء وعد الاخرۃ جئنا بکم

لفیفاً"۔ یعنی ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ زمین موعود میں سکونت اختیار کرو۔ جب وعدۂ آخرت آیا تو ہم تم کو لے آئیں گے۔

لغت میں لفیف کے معنی نچوڑنے کے ہیں۔ اب دیکھنا ہوگا کہ یہاں اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ سب اکٹھے ہو جاؤ یا سب بغیر کسی امتیاز کے خدا کے حضور حاضر ہو جاؤ یا ممکن ہے وعدۂ آخرت سے مراد یوم قیامت کا وعدہ ہو، بلکہ وہ دوسرا وعدہ ہو جس کا تذکرہ سورۂ اسرا کے ابتدا میں ہوا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ ۟ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُوۡٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ۝ (اسرائیل: ۷) یعنی اگر تم نے نیکی کی تو اپنے لیے کی ہے اور اگر تم نے برا کیا تو بھی اپنے ہی حق میں برا کیا۔ پس جب آخری وعدہ آ گیا تو (بڑے قوی مرد) تمہارے چہروں پر خوف و غم کے آثار ظاہر کر دیں گے۔ وہ بیت المقدس میں پہلی بار کی طرح داخل ہوں گے، اور جس پر تمہارا تسلط ہے اسے ویران کر دیں گے۔

خلاصہ یہ کہ اب اگر جمہ "وجئنا بکم لفیفاً" کے معنی قیامت میں اٹھائے جانے کے ہوں تب بھی اس آیت کے منافی ہرگز نہیں جس میں جداگانہ اٹھانے کی بات ہوئی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا ۝ (مریم: ۹۵) یعنی سب کو قیامت کے دن تنہا محشور کیا جائے گا۔ اس علیحدگی سے مراد یہ ہے کہ اس دن کسی کو کسی دوسرے کی فکر نہیں ہوگی بلکہ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: لِكُلِّ امۡرِیٴٍ مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ ۝ (عبس: ۳۷) یعنی "قیامت کے دن ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی، اُسے دوسروں سے کوئی سروکار نہیں ہوگا"۔

(۶) مصر سے خروج اور صحرائے سینا میں ورود

بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے الطاف وعنایات سے اس ذلت کی زندگی سے نجات پا کے فرعون کے دستبرد سے نکل گئے۔اب انہیں نئی زندگی دریا کے اس پار شروع کرنا تھی اور فطری سی بات ہے کہ ایک ایسی سرزمین پر اتنی بڑی تعداد کا وارد ہونا جہاں وسائل زندگی بھی زیادہ میسر تھے، مادی و معنوی مشکلات سے خالی نہیں ہو سکتا تھا خصوصاً ایسی صورت میں کہ مصریوں کے نظریات (یعنی بت پرستی بھی) اس سرزمین پر رائج تھے اور قومِ موسیٰؑ کے اذہان میں بھی بت پرستی کے رجحانات ابھی تک باقی تھے۔دوسری مشکل یہ تھی کہ اس قوم کے لیے اس سرزمین میں گھر بار، کام کاج اور زراعت وکھیتی باڑی کی سہولیات ووسائل میسر نہ تھے۔لہٰذا سورج کی گرمی، پانی کی قلت اور کافی غذا کا نہ ہونا، ایسے مسائل تھے جوان کے لیے تکلیف کا باعث بنے۔یہی وجہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے اور ان سے اس مسئلہ کے حل کے لیے درخواست کی۔قرآن نے اُن کی زندگی کے اس مرحلہ کے بارے میں اس طرح وضاحت کی ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

۲۔ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

۳۔ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ (الاعراف: ۱۳۸ تا ۱۴۰)

۴۔ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰي مُوْسٰٓي اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ (الاعراف: ۱۶۰)

۵۔ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ

رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝۶۰ (البقرہ: ۶۰)

۶۔ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۵۷

(البقرہ: ۵۷)

۷۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى۝۸۰

۸۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى۝۸۱

۹۔ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى۝۸۲ (طٰہٰ: ۸۰ تا ۸۲)

آیات کا ترجمہ

۱۔ ہم نے بنی اسرائیل کو دریا عبور کروایا تو وہ ایسی قوم کے پاس پہنچے جو بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے: ہمارے لیے بھی ان کے معبودوں جیسا ایک خدا بناؤ۔ موسیٰؑ نے کہا: تم بڑے جاہل لوگ ہو۔

۲۔ یہ قوم اور اُن کا آئین تباہ ہو جائیں گے اور ان کے اعمال بے کار و باطل ہیں۔

۳۔ موسیٰؑ نے کہا: کیا میں تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی معبود قرار دوں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی ہے؟

۴۔ جب موسیٰؑ سے اُن کی قوم نے پانی طلب کیا تو ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ اچانک اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ ہر گروہ کو اپنے اپنے پانی پینے کے مقام کا پتہ چل گیا۔ ہم نے بادل کے ذریعے ان پر سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ نازل کیا (من کسی درخت کا شیرہ یا شہد، یا کوئی میٹھا شربت ہے اور سلویٰ بھونے ہوئے بٹیر) یہ پاک و پاکیزہ ہمارا عطا کردہ رزق کھاؤ۔ ہم

نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔

۵۔ یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو! اچانک اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور لوگوں نے اپنے اپنے پانی پینے کے مقام کو جان لیا۔ اللہ کے عطا کردہ رزق سے کھاؤ پیو، اور زمین پر فساد برپا نہ کرو۔

۶۔ بادل سے ہم نے تم پر سایہ کیا، من و سلویٰ تم پر اتارا۔ یہ پاک و پاکیزہ رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔ ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

۷۔ اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں تمہارے دشمنوں سے نجات دی، وادیٔ طور کے دائیں[1] جانب تم سے وعدہ کیا اور من و سلویٰ تمہارے لیے اتارا۔

۸۔ وہ پاک رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا ہے اور سرکشی مت کرو، مبادا تم پر میرا قہر و غضب نازل ہو جائے کیونکہ جس پر میرا قہر و غضب نازل ہو جائے وہ برباد ہو جاتا ہے۔

۹۔ جو بھی توبہ کرے، ایمان لے آئے، اعمال صالحہ انجام دے اور پھر ہدایت پا جائے (یعنی اپنی سابقہ ہدایت پر باقی رہے) تو میں اسے بخش دوں گا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ایسی قوم جس نے اتنی ذلتوں میں زندگی گزاری اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دے کر اتنی آسائشیں مہیا کیں، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ قوم ہمیشہ اللہ کا شکرادا کرتی رہتی اور اس کے علاوہ کسی کو پکارنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتی، بلکہ انہیں تو اس سے بڑھ کر دوسروں کو تبلیغ کرنا چاہیے تھی کہ وہ بت پرستی سے باز آ جائیں کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کو، جو اس نے انہیں فرعون سے نجات اور دریا عبور کرا کے کیا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ پیچھے سے دشمن سر پر ہو، سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا کا پانی اور یہ دریا سے بغیر کسی خوف و خطر کے گزر جائیں اور دشمن تباہ ہو جائے۔

انہیں چاہیے تو یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے شکر گزار اور ہمیشہ ان کے مطیع رہتے لیکن افسوس کہ بت پرستوں میں طویل مدت گزارنے کی

---

[1] "جانب طور الایمن"، وہی جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰؑ کو مدین سے مصر کو لوٹتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نور آگ کی صورت میں ایک درخت پر نظر آیا تھا۔

وجہ سے اُن کی طبیعتوں میں بت پرستی گہری ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وقتاً فوقتاً یہ جذبہ سر اٹھاتا رہتا تھا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت موسیؑ پر ساری قوم بنی اسرائیل ایمان نہیں لائی تھی بلکہ زعمائے قوم نے تو ایمان قبول ہی نہیں کیا تھا۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ لوگ اُن کے ساتھ اظہارِ موافقت کرتے تھے لیکن باطن میں انہیں حضرت موسیؑ کے ساتھ کوئی عقیدت نہیں تھی۔ اس حقیقت کو درج ذیل آیت واضح کرتی ہے:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ (یونس: ۸۳)

یعنی ”موسیؑ پر اُن کی قوم سے سوائے چند لوگوں کے اور کوئی ایمان نہ لایا جب کہ وہ بھی فرعون اور اپنی قوم کے زعما کے فتنہ سے خوفزدہ تھے۔

وہ لوگ ایسی سرزمین پر اُترے اور انہیں ایسی قوم نظر آئی جو بت پرست تھی۔ پس بنی اسرائیل حضرت موسیؑ سے کہنے لگے کہ جیسے ان کے پاس نظر آنے والے معبود ہیں ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی معبود بنا دو جس کی ہم عبادت کریں۔ ان بیوقوفوں نے یہ نہ سوچا کہ اس عذاب سے جس نے انہیں نجات دی اصلی معبود وہی تھا۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تو فرعون اور اس کے سپاہیوں کو بھی نجات پا جانا چاہیے تھا۔ اسی لیے حضرت موسیؑ نے انہیں جاہل و احمق قرار دیا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اس کے بعد انہیں بتایا گیا کہ یہ بت پرست قوم بھی دوسرے بت پرستوں کی طرح برباد ہو جائے گی اور ان کے کردار و اعمال بے فائدہ ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ مجھ سے یہ تقاضا کرتے ہو کہ تمہارے لیے معبودِ حقیقی کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نعمتیں عطا فرمائیں اور تمہیں ساری کائنات پر فضیلت دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

جنگِ صفین یا جمل کے دوران یا جنگ کے بعد، ایک یہودی نے حضرت علی علیہ السلام پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے نبی کی وفات کو ابھی صرف پچیس سال گزرے ہیں اور تم ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہو۔ امامؑ پاک نے جواب میں فرمایا: ”ٹھیک ہے لیکن تمہارے تو ابھی دریا کی مٹی سے پاؤں بھی خشک نہ ہوئے تھے کہ تم نے بت پرستی شروع کر دی اور موسیؑ سے کہنے لگے: ”اجعل لنا الھا کما لھم

الھۃ"[1]

بیابان میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمات کا نزول

سابقہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ساری کائنات پر فضیلت دی ہے:"وھو فضلکم علی العلمین" اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کے ایک ایک فرد کو برتری دی ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قومِ بنی اسرائیل میں کچھ خصوصیات ایسی تھیں جو دوسروں میں نہیں تھیں۔ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس تپتے صحرا میں جہاں وسائل زندگی کا تصور بھی نہیں تھا،اللہ تعالیٰ نے ان سب پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دیئے،انہیں پانی دیا،سائبان مہیا کیا اور بہترین کھانے بھی عطا فرمائے۔

ان رحمتوں کی تفصیل یہ ہے کہ پانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ عصا کا معجزہ دکھائیں اور اُسے پتھر پر ماریں جس سے چشمے پھوٹ پڑیں گے اور ہر قبیلہ ان سے پانی حاصل کرے گا کیونکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں بمصداق وَقَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَيۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ (اعراف:۱۶۰) "ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں میں تقسیم کر دیا،ان میں سے ہر قبیلہ اپنی خاص معاشرتی زندگی رکھتا تھا۔ لہٰذا پانی لیتے وقت ان میں ٹکراؤ کو روکنے کے لیے ہر قبیلہ کے لیے الگ چشمے کا بندوبست کیا۔اس طرح بارہ چشمے بنے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

واوحینا الی موسیٰ اذا ستسقه قومه ان اضرب بعصاك الحجر
فانجبست منه اثنتا عشرۃ عیناً قد علم کل اناسٍ مشربھم

سورج کی گرمی سے بچنے کے لیے سائبان کا اس طرح بندوبست فرمایا کہ اللہ کے حکم سے گھنے بادلوں نے ان کے سروں پر سایہ کر دیا۔اب وہ سورج کی براہِ راست تپش سے محفوظ ہو گئے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:"وظللنا علیھم الغمام وظللنا علیکم الغمام" اسی طرح غذا کی مشکل کا حل یہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ نے من وسلویٰ ان کے لیے آسمان سے نازل فرمایا جیسا کہ دو مقامات پر آیات میں اس کا تذکرہ ہوا ہے۔"وانزلنا علیھم المن والسلویٰ"۔"وانزلنا علیکم المن والسلوی"

اللہ تعالیٰ نے اس کھانے کو پاکیزہ غذا فرمایا ہے:"کلوا من طیبت مارزقنکم" سوال یہ ہے کہ من وسلویٰ سے کیا مراد ہے؟اس بارے میں مفسرین اختلاف نظر رکھتے ہیں،البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ من میٹھی غذا تھی،جیسے شہد یا درختوں کا شیرہ اور سلویٰ ایک ایسا پرندہ (بٹیر) تھا جو جسم کی حیاتیات کی ضروریات کو پورا کرتا تھا اور انہیں روزانہ تازہ ملتا تھا۔رہا یہ سوال کہ یہ کیسے نازل ہوتا تھا اس بارے میں تفسیر کی کتابوں میں مختلف اقوال کا تذکرہ ملتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائیں وہاں یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ نعمتوں کی یہ کثرت تمہیں گناہ وسرکشی کی طرف نہ لے جائے۔ارشاد ہوتا ہے:"ولا تطغوا فیه فیحل علیکم غضبی و من یحلل علیه غضبی فقد

---

[1] بحارالانوار ج ۱۳،ص ۱۷۶،نقل از تفسیر ثعلبی

ھو ئی"۔ فیہ کی ضمیر کھانے کی طرف مڑتی ہے اور کھانے میں سرکشی سے مراد کفرانِ نعمت ہے جس سے بعد میں وہ دوچار ہو بھی گئے اور کہنے لگے کہ اے موسیؑ ہم روزانہ ایک جیسے کھانے سے اکتا گئے ہیں۔ اللہ سے کہیں کہ اسے تبدیل کر دے۔ اس کی وضاحت آئندہ بیان ہوگی۔

سورہ طٰہٰ ۸۰ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری آئی ہے کہ بنی اسرائیل وادیٔ طور کے دائیں جانب ملاقات کریں گے۔ اس وادی سے مراد وہی جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے مدین سے واپسی پر نورِ خدا کو آگ کی صورت میں بلندی پر دیکھا تھا۔ اس مقام کے لیے قرآن میں مختلف لفظیں استعمال ہوئی ہیں۔

۱۔ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ

(قصص: ۳۰)

۲۔ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶ (نازعات: ۱۶)

۳۔ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ (مریم: ۵۲)

۴۔ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ (طٰہٰ: ۸۰)

طورِ ایمن وہی جگہ ہے جہاں نورِ پروردگار کی تجلی ہوئی تھی اور دوبارہ وہی جگہ بنی اسرائیل کے تورات کو حاصل کرنے کے لیے منتخب ہوئی۔ آیہ مبارکہ ووعدنکم جانب الطور الایمن اس کی خوشخبری سنا رہی ہے۔

تورات کے نزول کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اجمالی طور پر ہم ان حالات وحوادث کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس مرحلہ پر حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آئے۔ یہاں تین اہم ترین حادثے قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ حضرت موسیٰؑ پر تورات کا نزول

۲۔ بنی اسرائیل کے زعما کی جانب سے اللہ کو دیکھنے کی درخواست۔

۳۔ اور حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کا بت پرستی کی طرف لوٹ جانا۔

ان تین واقعات کا تذکرہ قرآن میں الگ الگ ہوا ہے۔ لہٰذا چونکہ ہم موضوعی تفسیر کر رہے ہیں ہم آیات کو جدا جدا ذکر کریں گے۔ ان تین واقعات کا ذکر ختم کر کے موسیٰؑ کے بنی اسرائیل کے ساتھ بقیہ حالاتِ زندگی بھی بیان کریں گے۔ پہلے نزولِ تورات سے متعلق آیات کا بیان کرتے ہیں:

میقات میں موسیٰؑ پر تورات کا نزول

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

۲۔ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

۳۔ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

(الاعراف: ۱۴۲، ۱۴۴، ۱۴۵)

۴۔ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ (البقرہ: ۵۳)

۵۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ (المائدہ: ۴۴)

۶۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ (القصص: ۴۳)

آیات کا ترجمہ

۱۔ ہم نے موسیٰؑ سے تیس رات کا وعدہ کیا۔ جب وعدہ کی مدت پوری ہوگئی تو دس راتیں اور بڑھا

دیں پس حتیٰ کہ موسیٰؑ سے اس کے رب کے وعدے کا وقت چالیس رات مکمل ہوا۔ موسیٰؑ نے (میقات کی طرف روانگی سے پہلے) اپنے بھائی ہارون سے کہا: میری قوم میں تم میرے جانشین ہو، ان میں اصلاح کرو اور فسادیوں کی پیروی نہ کرو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰؑ میں نے تمہیں اپنی رسالتوں (دینی احکام) اور اپنے ساتھ ہم کلام ہونے کے لیے اختیار کیا۔ پس جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے اسے لے لو اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔

۳۔ موسیٰؑ کے لیے ہم نے الواح (تختیوں) میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیلات لکھ دیں۔ پس اے موسیٰؑ اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور اپنی قوم سے کہہ دو کہ ان پر اچھے طریقے سے عمل کریں اور عنقریب میں تمہیں فاسقوں کا مقام دکھاؤں گا۔

۴۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو کتاب و فرقان عطا فرمائے، شاید کہ وہ (قوم موسیٰؑ) ہدایت پا جائیں۔

۵۔ ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت و نور ہے تا کہ اس کے ذریعے اللہ کے وہ انبیاء جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں یہودیوں کے لیے فیصلے کریں، نیز ان کے دانشمند و برگزیدہ افراد اس کے مطابق فیصلے کریں اور جو کچھ انہوں نے اس کتاب سے حفظ کیا ہے اس پر گواہ رہیں۔

۶۔ جب ہم نے پہلی اقوام کو ہلاک کر دیا تو موسیٰؑ کو وہ کتاب دی جس میں لوگوں کے لیے بصیرت و ہدایت و رحمت ہے تا کہ وہ متوجہ ہو جائیں۔

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ تیس دن کے لیے اپنی قوم سے دور رہ کر کوہِ طور پر ٹھہریں۔ اکثر مفسرین کے مطابق یہ تیس دن ذیقعدہ کا پورا مہینہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے قوم کو ان تیس دنوں کے لیے بھی رہبر کے بغیر نہ چھوڑا، بلکہ اپنے بھائی ہارون کو اپنا جانشین مقرر کیا اور کہا: قوم کی اصلاح کی کوشش کرنا اور فساد کرنے والوں کی پیروی نہ کرنا۔ مفسدین سے مراد وہ لوگ ہیں جو توحید کی راہ سے ہٹ جائیں اور بت پرستی شروع کر دیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو معلوم تھا کہ اُن کے بعد کیا صورت پیدا ہو گی۔ جب تیس راتیں مکمل ہو گئیں تو حکم ہوا کہ مزید

دس راتیں یہاں ٹھہریں۔ بالآخر چالیس راتیں مکمل ہوگئیں تو الواحِ تورات (تورات کی تختیاں) پا لینے کے بعد حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف واپس آئے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو ایسا حکم کیوں ہوا کہ کچھ عرصہ میقات میں جا کر ٹھہریں تب تورات ملے گی؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے خاص ارتباط، ایک کامل کتاب لینے اور اللہ کے ساتھ ہم کلام ہونے کے لیے ایک روحانی آمادگی کی ضرورت تھی جو لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی کے مسائل سے دو چار ہو کر حاصل نہیں ہو پاتی۔ اس قسم کی حالت کے لیے تنہائی و عزلت گزینی ضروری ہے جب انسان لوگوں سے دور رہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰؑ نے چالیس دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور اس طرح باطنی طور پر آمادہ ہوگئے کہ وحی خدا کو سنیں اور عظیم کتاب تورات کی تختیاں حاصل کرسکیں۔

اس بیان سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ قرآن دن کے بجائے رات کا ذکر کیوں کرتا ہے۔ یعنی "ثلاثین لیلة"۔ کیونکہ لوگوں میں رہتے ہوئے بھی رات کو انسان زیادہ اللہ کے قریب ہوسکتا ہے اور صفائے باطن حاصل کرسکتا ہے کیونکہ کوئی ایسا کام درپیش نہیں ہوتا جو انسان کی توجہ ہٹانے کا موجب بنے، جیسا کہ خود پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں ہے کہ جب انہیں بھاری ذمہ داریوں کے لیے اللہ تعالیٰ مکلف فرماتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں اٹھ کر نماز پڑھا کریں تا کہ آپ کو بھاری ذمہ داریاں سونپی جائیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ﴿۶﴾ (مزمل: ۱ تا ۶)

"اے چادر (کملی) اوڑھنے والے اٹھیے مگر اس کے تھوڑے سے حصے میں ...... ہم بہت بھاری ذمہ داری تم پر ڈالنے والے ہیں۔ رات کی تاریکی میں عبادت کرنا، ثبات قدم اور استحکام گفتار کا موجب بنتا ہے"۔

اس آیت میں (جو اوپر حضرت موسیٰؑ کے بارے میں نقل ہوئی) ایک اور نکتہ بھی ہے اور وہ یہ کہ کبھی ہوسکتا ہے نبی کسی واقعہ کی خبر دے لیکن وہ واقعہ اس طرح نہ ہو جیسے خبر دی گئی تھی، بلکہ دوسری طرح ہو۔ موسیٰؑ نے قوم کو تیس دن کی غیبت کی خبر دی تھی، جب کہ چالیس دن لگ گئے۔ یہ ہی مسئلہ بدا ہے جسے شیعہ متکلمین نے اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حضرت ہارونؑ کے بارے میں آیات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح نہیں تھے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ ۳۲ میں فرمایا ہے: "واشرکه فی امری"، یعنی ہارون کو اس رسالت میں میرا شریک کردے"۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قد اوتیت سولك یموسیٰ"

''اے موسیٰؑ تیری درخواست قبول ہوگئی''۔

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ہارونؑ خود نبی تھے تو حضرت موسیٰؑ کے جانشین کیسے ہو گئے؟

جواب: حضرت موسیٰؑ نبوت و رسالت کے علاوہ لوگوں کی امامت پر بھی فائز تھے، یعنی بنی اسرائیل کی رہبری و حکمرانی بھی انہیں حاصل تھی جب کہ ہارونؑ کے پاس صرف نبوت و رسالت تھی۔ اللہ تعالیٰ سے پیغام لے کر لوگوں تک پہنچانا ان کا فرض تھا لیکن امامت کا عہدہ جس کا مطلب لوگوں کی ہر طرح کی سرپرستی اور تمام معاشرتی مسائل میں اُن کی رہنمائی ہے وہ یہ عہدہ نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اس لحاظ سے حضرت موسیٰؑ نے انہیں اپنا جانشین بنایا۔ بنابریں قرآن میں لفظ امام اور حدیث میں لفظ خلیفہ کے معنی لوگوں کی تمام مسائل میں سرپرستی ہوں گے۔

قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے کہ موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فرامین کو لیں اور شاکرین سے ہو جائیں۔ اس پر دلیل یہ ذکر کی کہ ہم نے تمہیں دو چیزوں کے ذریعے دوسروں پر فضیلت بخشی ہے:

۱۔ میں نے تمہیں اپنی رسالتوں (پیغامات) کے پہنچانے کے لیے چن لیا جو بذاتِ خود بہت بڑا افتخار ہے جو تمہیں نصیب ہوا۔

۲۔ ہم نے تجھے اپنے ساتھ ہم کلام ہونے کا شرف بخشا، ان دو خصوصیتوں کی بنا پر ہمارے پیغامات لو اور انہیں لوگوں تک پہنچاؤ۔

حضرت موسیٰؑ کے پاس یہ دو امتیاز عام لوگوں کے لحاظ سے تھے نہ کہ دوسرے انبیاء کے مقابلے میں کیونکہ تمام انبیائے خدا ان دو خصوصیات میں برابر ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے پیغامات حاصل کرتے ہیں، وحی جو کہ کلامِ خدا ہے اسے سنتے ہیں اور یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے صرف موسیٰؑ سے ہی کلام کیا صحیح نہیں ہے [1] کیونکہ کلام خدا کی کچھ صورتیں ہیں جو سورہ شوریٰ کے آخر میں ذکر ہوئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ (شوریٰ: ۵۱)

اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ بشر سے ہم کلام ہو، مگر صرف تین طریقوں سے:

۱۔ ''الاوحیا'' بغیر واسطہ کے القا ہو دل میں

۲۔ او من ورآئ حجابٍ۔ پس پردہ آواز سنے اور متکلم کو نہ دیکھے جیسے حضرت موسیٰؑ نے درخت سے کلام سنا، لیکن متکلم کو نہیں دیکھا تھا۔

۳۔ اویرسل رسولا قاصد بھیج کر جو اللہ کے پیغام کا حامل ہو، جیسے جبرئیل امین وحی۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کلامِ خدا کی یہ تین قسمیں ہیں، صرف دوسری قسم ہی کلامِ خدا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے ساتھ کلام کرنے کو ان کے لیے خصوصیت شمار کیا ہے تو یہ دوسرے عام لوگوں کے مقابلہ میں ہے جن میں اس مرتبہ کی قابلیت نہیں ہے نہ کہ یہ کوئی

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان ج ۶، ص ۴۷۲ میں اس کلامِ خدا کو بلا واسطہ کلام سے تعبیر کیا ہے اور اسے حضرت موسیٰؑ کے لیے خصوصیت قرار دیا ہے۔

خصوصیت انبیاء کے مقابلہ میں ہے۔

بعد والی آیت میں توراۃ کی خصوصیتوں کا ذکر ہوا ہے۔

۱۔ "من کل شیء موعظة" ہر چیز کی وعظ ونصیحت۔

۲۔ "وتفصیلاً لکل شیئٍ اور ہر چیز کا مفصل بیان۔

ظاہراً پہلے جملہ کا تعلق اخلاقی اقدار کا بیان ہے جس میں بنی اسرائیل کے لیے اخلاقی مسائل کے بیان کا کہا گیا ہے جب کہ دوسرے جملے کا تعلق احکامِ الٰہی (واجبات، محرمات، مستحبات ومکروہات) کے بیان سے ہے۔اس کے بعد حضرت موسیٰؑ سے فرماتا ہے: "خذھا بقوةٍ اسے مضبوطی سے تھام لو۔قوم کو موسیٰؑ کے ذریعے فرماتا ہے: "وامر قومك یاخذوا باحسنھا" کہ اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اس پر اچھے طریقے سے عمل کریں۔ پہلے جملے "خذھا بقوةٍ" کا کیا مطلب ہے۔حضرت یحییٰؑ کے بارے میں بھی یہی خطاب آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: یا یحیی خذ الکتب بقوةٍ (مریم: ۱۲) نیز بنی اسرائیل سے بھی یہی خطاب ہوا ہے: خذوا ما اتینکم بقوةٍ (بقرہ: ۶۳، ۹۳) یعنی موسیٰؑ اور ان کی قوم دونوں کو کتاب کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہوا ہے۔اس سے مراد کیا ہے؟

یہاں دو احتمال ذکر ہوئے ہیں:

۱۔ تورات کو دونوں پہلوؤں علمی وعملی عقیدہ واحکام کے لحاظ سے اخذ کریں یعنی ایک پہلو پر اکتفا نہ کریں اور جان لیں کہ عقیدۂ تنہا عمل کے بغیر کافی نہیں ہوتا کیونکہ بلا عمل عقیدہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوجاتا ہے۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو تسلیم کریں، اُن پر عمل کے سلسلہ میں فرق نہ کریں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جنھوں نے بعض احکام کو لے لیا، بعض کو چھوڑ دیا، جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

إِخْرَاجُهُمْ ۭ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ (بقرہ: ۸۵)

یعنی "کیا تم کتاب کے کسی حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کسی کا انکار کرتے ہو؟ تم (بنی اسرائیل) میں سے جو بھی یہ کام کرے گا اس کی سزا سوائے ذلت وخواری کے کچھ نہ ہوگی"

حضرت موسیٰؑ کی قوم نے بہترین احکام کو اختیار کر لیا، اس سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "وامر قومک یامروا باحسنھا" گویا آیت میں "باحسنھا" کے مطابق بنی اسرائیل اس میں سے اچھے کو اخذ کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیات کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تورات کے تمام احکام اچھے ہیں لیکن ان میں جو احسن ہیں انہیں اختیار کریں مثلاً دشمن سے انتقام لینا اچھا ہے لیکن معاف کر دینا اس سے زیادہ اچھا ہے۔

احتمال ہے کہ آیت میں 'احسن' تفصیل کے معنی سے خالی ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ تورات کے خوبصورت احکام پر عمل کرو یعنی واجبات

پرعمل کریں اور محرمات کو چھوڑیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ (زمر: ۱۷، ۱۸)

یعنی ”بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو ہر قسم کی بات سنتے ہیں اور ان میں بہترین کلام کی پیروی کرتے ہیں“

بہرکیف ان دو جملوں ”من کل شیئٍ“ اور ”و تفصیلاً لکل شیئٍ“ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہدایت وتکامل کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کی تمام ضروریات کو تورات میں بیان کردیا گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تورات میں مکمل ضابطہ حیات حتیٰ کہ بنی اسرائیل سے بعد میں آنے والی قوموں کے لیے بھی بیان کردیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ اس آیت میں ”کل شیئٍ“ اور دوسری آیت میں جو قرآن کی توصیف بیان کررہی ہے، وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل: ۸۹) کل شیئٍ سے مراد لوگوں کو ہدایت وتکامل ہے کہ آسمانی کتاب کا کام ہی اُسے بیان کرنا ہے اور جو مسائل اس ہدف کے علاوہ ہیں اور آسمانی کتاب کے مقصد سے خارج ہیں انہیں ”شیئ“ کی لفظ شامل نہیں ہوگی۔

قرآن میں تورات کی صفات

قرآن میں ارشاد ہے کہ موسیٰؑ کو ہم نے کتاب وفرقان عطا فرمائے۔ کتاب سے مراد تورات اور فرقان سے وہ معجزات مراد ہیں جو انہیں اپنی حقانیت کے اثبات کے لیے دیئے گئے تھے۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ فرقان سے مراد تورات ہی ہو جیسا کہ قرآن کو فرقان کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ (فرقان: ۱) یعنی ”مبارک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندۂ خاص پر فرقان کو نازل فرمایا تاکہ وہ بندگان عالم کو ڈرائے“۔

بعد والی آیت میں تورات کی تین خصوصیات ذکر ہوئی ہیں:

۱۔ ”ھدی“ جو ہادی سے ہے۔

۲۔ ”نور جو اس پر ایمان لائے یہ اس کے لیے روشن چراغ ہے۔

۳۔ ”یحکم بها النبیون الذین اسلموا اللذین ھادوا والربا نیون والاحبار“ تورات کے ذریعہ تین قسم کے لوگ فیصلے کریں گے۔

۱۔ وہ انبیاء جو حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت مسیحؑ یا پیغمبر اکرمؐ کی بعثت کے درمیان لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوں گے۔

۲۔ علماء الٰہی

۳۔ یہود کے برگزیدہ علماء

بنابریں توریت بنی اسرائیل کی شریعت کی کتاب تھی اور انبیاء بنی اسرائیل ہمیشہ اس کے مطابق حکم کرتے تھے۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ برگزیدہ علماء تورات کے حافظ اس کے مضامین پر شاہد ہیں اور انہیں اختلافی مسائل میں اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے: "بما استحفظوا من کتاب اللہ و کانوا علیہ شھدآء"

۴۔ "بصائر للناس وھدی ورحمۃ" لوگوں کے لیے بصیرت وہدایت ورحمت کا موجب ہے۔

۲۔ بنی اسرائیل کے سرکردہ افراد کی اللہ کو دیکھنے کی درخواست

قرآن حکیم کے واضح ترین مسائل میں رویت الٰہی کا ناممکن ہونا ہے۔ اس آسمانی کتاب نے مسئلہ رویت پر اچھی خاصی سختی و شدت دکھائی ہے اور جہاں بھی رویت کی بات آئی ہے سختی سے اس کا انکار کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم کچھ آیات کا یہاں ذکر کرتے ہیں:

يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰٓى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰ لِكَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ ۚ (نساء: ۱۵۳)

یعنی ''اہل کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کتاب نازل کرائیں، (غم نہ کرو) یہی لوگ موسیٰؑ سے اس سے بڑی درخواست کر چکے ہیں یعنی ان سے کہا کہ ہم اللہ کو ظاہر بظاہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے اس بے محل سوال کی وجہ سے ان پر بجلی گری''

قرآن مجید نے ان کی اس درخواست کو احمقانہ حرکت قرار دیا ہے اور حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ان کی درخواست رویت اور پھر ہلاکت کے بعد ان پر بجلی گرنے اور ان کے مارے جانے کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے: اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ (اعراف: ۱۵۵) ''کیا ہمیں ان پاگلوں کے کام کی وجہ سے ہلاک کردے گا؟''

رویت کے بارے میں اس قسم کی گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ رویت کے مسئلہ کو قرآن ناممکن بتاتا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد عرض کرتے ہیں کہ موسیٰؑ نے کس جذبہ کے تحت رویت کی درخواست کی تھی؟ کیا حضرت موسیٰؑ کو اس کا محال ہونا معلوم نہیں تھا یا کسی اور وجہ سے انہوں نے ایسی درخواست کی؟ پہلے اس موضوع سے متعلق آیات کو بیان کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِىۡ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰٮنِىۡ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴۳﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

۲۔ وَاخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ سَبۡعِيۡنَ رَجُلًا لِّمِيۡقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِيَّاىَ ؕ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنۡ هِىَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِىۡ مَنۡ تَشَآءُ ؕ اَنۡتَ وَلِيُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الۡغٰفِرِيۡنَ ﴿۱۵۵﴾ (الاعراف: ۱۵۵)

۳۔ وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

۴۔ ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ (البقرة: ۵۵، ۵۶)

آیات کا ترجمہ:

۱۔ جب موسیٰؑ میقات اور وعدہ گاہ مخصوص پر آئے تو پروردگار نے ان سے کلام کیا۔ موسیٰؑ نے عرض کیا کہ پروردگار! اپنے آپ کو مجھے دکھا دے تا کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ خطاب ہوا تو ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتا لیکن (آزمائش کے طور پر) پہاڑ کو دیکھو۔ اگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہ گیا تو عنقریب مجھے دیکھ لو گے۔ جب موسیٰؑ کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو کہا: خداوندا! پاک و منزہ ہے تیری ذات اس سے کہ تجھے دیکھا جا سکے۔ میں توبہ کرتا ہوں اور میں پہلا شخص ہوں جو اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ تجھے دیکھا نہیں جا سکتا۔

۲۔ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہماری اس وعدہ گاہ پر لانے کے لیے چنے۔ انہیں۔ اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھنے کی درخواست کے جرم میں) بجلی نے آ لیا۔ موسیٰؑ نے اس بارے میں عرض کیا: خداوند! اگر انہیں مارنا تھا تو یہاں آنے سے پہلے موت دے دی ہوتی۔ کیا ہمیں بے وقوفوں کے کام کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے؟ یہ کام صرف تیری طرف سے امتحان کے سوا نہیں ہے۔ اس امتحان میں جسے تو چاہے گمراہ کر دے، جسے چاہے ہدایت کر دے۔ تو ہی ہمارا سرپرست و آقا ہے۔ ہمیں

بخش دے، ہم پر رحم کر کہ تو ہی بہترین بخشنے والا ہے۔

۳۔ جب تم نے موسیٰؑ سے کہا: اے موسیٰؑ ہم تمہاری رسالت پر ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ خدا کو واضح طور پر دیکھ لیں۔ پس تمہیں صاعقہ نے آ لیا، اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔

۴۔ اس کے بعد تمہیں ہم نے مرنے کے بعد زندہ کر دیا کہ شاید شکر کرنے والوں سے ہو جاؤ۔

آیات کی موضوعی تفسیر

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کا تذکرہ ہوا، موسیٰؑ کی طرف سے ہوا یا ان کی قوم کی طرف سے۔ ابتدائے اسلام سے آج تک ان آیات کے بارے میں علمی کاوشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ جو لوگ رویت پروردگار کے قائل ہیں۔ انہوں نے اور جو رویۃ الٰہی کو ناممکن جانتے ہیں، انہوں نے بھی اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ جس میں حضرت موسیٰؑ نے درخواست دیدار کی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک ہی آیت سے دونوں فریق استدلال کرتے ہیں اور دو متضاد نظریئے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام آیات میں مکمل تحقیق و تدقیق نہیں کی گئی نہ ہی تفسیر موضوعی کے طریقہ کار سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اب ہم خود آیات میں موجود شواہد کی بنا پر ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں۔

بنی اسرائیل اور رویت الٰہی کی درخواست

حضرت موسیٰؑ کا دعویٰ تھا کہ وہ کلامِ خدا کو سنتے ہیں اور اب کی بار جب میقات پر جائیں گے تو ایک کتاب (اللہ کی جانب سے) لے کر آئیں گے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کی ہٹ دھرمیاں اور ضدی طبیعت سے آگاہ تھے لہٰذا انہوں نے اپنی قوم سے ستر آدمی ساتھ لے جانے کے لیے چنے تاکہ وہ صورت حال پر شاہد رہیں۔ یعنی یہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اللہ کے کلام کو سنیں اور نزولِ تورات کا مشاہدہ بھی کریں۔ یقیناً یہ ستر آدمی بنی اسرائیل کے سرکردہ افراد سے ہوں گے جب کہ اس قوم کی تعداد سات لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔[1] جب یہ سب لوگ میقات پر پہنچ گئے اور انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اللہ کے کلام کو سنا تو ان کی طبیعت میں سویا ہوا ہٹ دھرمی کا جذبہ جاگ اٹھا اور کہنے لگے کہ ہم صرف اسی پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے اس معاملہ میں ہٹ دھرمی اختیار کی اس لیے آسمانی بجلی نے انہیں ہلاک کر دیا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾ (بقرہ: ۵۵) نیز: فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡہُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلۡمِہِمۡ ۚ (نساء: ۱۵۳)

ان دو آیات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اس اصرار کے بعد کہ ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں، آسمانی بجلی نے انہیں

---

[1] توحید الصدوق ص ۱۲۱، ص ۱۲۲

ہلاک کر دیا۔ اس تفسیر کے ذریعہ ایک اور آیت کے اجمال کو دور کیا جا سکتا ہے جس میں قومِ موسیٰ پر ''رجفہ'' پڑنے کا تذکرہ ہے۔ ''رجفہ'' کے معنی اگر چہ سخت زلزلہ کے ہیں تاہم یہ زلزلہ بجلی گرنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ ان کی دیکھنے کی درخواست کے بعد بجلی گری، اس کے بعد زلزلہ پیدا ہوا اگر چہ خود اس آیت میں صاعقہ کے نزول کا ذکر نہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (اعراف: ۱۵۵)

ان کی یہ ہٹ دھرمی غضبِ الٰہی کا موجب ہوئی جس کے نتیجہ میں اُن کے بے جان لاشے موسیٰؑ کے سامنے زمین پر پڑے نظر آئے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے چار درخواستیں کیں اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح مخاطب ہوئے۔

۱۔ اگر اللہ کی مشیت ان کی ہلاکت ہی سے متعلق تھی تو کاش میقات پر آنے سے پہلے ان کی قوم کے سامنے ہی ایسا ہو جاتا کیونکہ اب میں کیسے لوٹ کر قوم کے پاس جاؤں، انہیں ستر آدمیوں کی موت کی خبر دوں اور انہیں بتاؤں کہ وہ کیسے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے غضبِ الٰہی کا شکار بنے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قال رب لو شئت اهلكتهم من قبل و ایای" کاش تو انہیں اور مجھے اس سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاعقہ کا عذاب صرف ان ستر افراد پر نازل ہوا تھا پھر حضرت موسیٰ نے اس درخواست میں اپنے آپ کو کیوں شامل کیا۔ ''وایای'' کی لفظ اشارہ ہے کہ مجھے اور انہیں اس سے پہلے ہی ہلاک کر دیا ہوتا!

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ بجلی (صاعقہ) کے گرنے میں موسیٰؑ شامل نہیں تھے تاہم اگر اسی حالت میں اپنی قوم کی طرف واپس جاتے تو بچ خود بھی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا عرض کیا کہ اب جب کہ صورت حال یہ ہے کہ انہیں بھی مرنا تھا اور مجھے بھی (اگر چہ سب جدا جدا ہیں) تو کیا بہتر ہوتا کہ اس سے پہلے ایسا ہو چکا ہوتا!

۲۔ پروردگار! ہمیں چند بے عقلوں کے کام کی وجہ سے ہلاک نہ فرما۔ آیت میں ہے: "اتهلكنا بما فعل السفهاءُ منا"۔ یہاں اس نا کی ضمیر سے کیا مراد ہے؟ ظاہراً صرف حضرت موسیٰؑ ہی مراد ہیں یعنی مقامِ ربوبیت کے لیے مناسب نہیں کہ قوم کے چند بے وقوف لوگوں کی حرکات سے موسیٰؑ کو بھی ہلاکت کے قریب پہنچائے۔

یہاں ایک دوسرا احتمال بھی ہے کہ "اتهلكنا" کی ضمیر سے مراد وہ سب لوگ ہوں جو میقات میں حاضر تھے۔ حضرت موسیٰؑ انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ یہ تو بے وقوفوں اور نادانوں کی جماعت تھی، رحمت پروردگار کے شایان نہیں کہ نادانوں کو ان کے ناشائستہ کاموں کی وجہ سے ہلاک کر دے اور ان کی ہلاکت کو اپنی طرف اپنے اور قومی رہبری کے ارتباط کی خاطر نسبت دے۔

۳۔ بالآخر حضرت موسیٰؑ نے اس واقعہ کو امتحان کہا جس میں کچھ گمراہ ہو جاتے ہیں اور کچھ ہدایت پا جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میقات میں جو لوگ موجود تھے اپنی زندگی کے اس مرحلہ میں اس امتحان میں سرخرو نہ ہو سکے اور ناکام ہو گئے جب کہ موسیٰؑ اپنی سابقہ ہدایت پر باقی رہے

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ان ھی الا فتنتك تضل بھا من تشاءُ و تھدی من تشاءُ

۴۔ انبیاء رحمت الٰہی کے مظہر کامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ قوم کی مشکلات پر غمگین ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت موسیٰؑ نے ان ستر آدمیوں کے لیے طلبِ رحمت کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی مغفرت کی درخواست کی: انت ولینا فاغفرلنا وارحمنا وانت خیر الغافرین٥

موسیٰؑ اور رویت کی درخواست

یہاں تک ہمیں رویت باری تعالیٰ کے بارے میں آیات کے نکات ومطالب سے واقفیت حاصل ہوئی اور معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھنے کے امکان کو قرآن نے پوری شدت کے ساتھ رد کیا ہے۔ لیکن یہاں ایک دوسری اہم تر آیت ہے جس میں حضرت موسیٰؑ نے خود اپنی طرف سے خواہش دیدار کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ رویت الٰہی کو ممکن سمجھتے ہیں ان کی دلیل بھی یہی ہے کہ رویت ممکن تھی تب ہی موسیٰؑ نے اس کی درخواست کی اگر محال ہوتی تو موسیٰؑ کبھی للہ سے اس کی درخواست نہ کرتے۔

اس برعکس رویت باری تعالیٰ کو محال جاننے والے کہتے ہیں کہ آپ کی دلیل اس صورت میں صحیح ہوسکتی تھی کہ اگر موسیٰؑ نے حقیقی طور پر کسی بیرونی دباؤ کے بغیر رویت کا سوال کیا ہوتا، لیکن اگر موسیٰؑ نے قوم کے دباؤ کی وجہ سے ایسا سوال کیا ہو تو اس درخواست سے یہ سمجھنا جائز نہیں ہے کہ رویت ممکن تھی۔ یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰؑ نے خود اپنی خواہش سے ایسا سوال کیا ہوگا، جب کہ صرف دو آیت قبل وہ اس کام کو احمقانہ کہہ چکے ہیں، جب انہوں نے کہا: اتھلکنا بما فعل السفھاء اس کے علاوہ کیسے رویت الٰہی کو ممکن کہا جاسکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے جواب میں فرمایا: "لن ترانی" ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ حرف "لن" عربی میں نفی ابد (ہمیشہ کی نفی) کے لیے آتا ہے یعنی نہ دنیا میں رویت ممکن ہے اور نہ آخرت میں۔ یہ دونوں فریقوں کی گفتگو تھی اور جو عدمِ امکان کے قائل ہیں ان کی بات منطقی اعتبار سے قوی تر ہے۔ اب خود آیت کو دیکھیں کہ موسیٰؑ نے کن حالات میں اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی تھی۔ ان سب آیات میں غور کرنے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ بنی اسرائیل کے سرکردہ افراد نے اپنے ایمان کو رویت خدا سے مشروط کردیا تھا۔ لہٰذا ان کا یہ حشر ہوا کہ غضب خدا کے نتیجہ میں ہلاک ہوگئے اور پھر حضرت موسیٰؑ کی دعا سے انہیں دوبارہ زندہ کردیا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے اور کہنے لگے کہ ہم تو نہ سہی اب آپ خود رویت پروردگار کی درخواست کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسی درخواست پر ہمیں تو عذاب ہوا لیکن موسیٰؑ کو یقیناً نہیں ہوگا یا ان میں خدا کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں تھی جب کہ موسیٰ میں تھی۔

اب یہ سوال کہ موسیٰؑ خدا کو دیکھ بھی لیتے تو اس سے انہیں کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا، اس کے جواب میں دو احتمال سامنے آتے ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ موسیٰؑ اللہ کو دیکھ کر انہیں بتادیں تو وہ اس کو قبول کرلیں۔

۲۔ دوسرا یہ کہ چونکہ وہ بھی وہیں پر کھڑے تھے لہٰذا جب موسیٰؑ خدا کو دیکھیں گے تو وہ بھی دیکھ لیں گے جیسے انہوں نے خدا کا موسیٰؑ کے ساتھ کلام سن لیا تھا۔ یہاں انہوں نے تکلم کو رویت پر قیاس کیا (جو کہ کسی طرح درست نہیں ہوسکتا)۔ بہر کیف یہ جذبہ ان کے اس سوال کا موجب بنا۔ اس بات پر کہ یہ درخواست موسیٰؑ کی اپنی خواہش پر نہیں تھی بلکہ قوم کے دباؤ کی وجہ سے تھی، دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو نرمی سے سمجھایا "لن ترانی" اور کسی قسم کا عذاب نازل نہ ہوا۔ موسیٰؑ کا رویت کے عدم امکان پر ایمان انتہائی پختہ ہوجائے اس لیے اللہ

نے موسیٰؑ کو ایک منظر دکھلایا اور وہ یہ کہ نورِ خدا کی پہاڑ پر تجلی ہوئی جس سے پہاڑ اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا، وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اب موسیٰؑ کے لیے علم الیقین سے اگلی منزل عین الیقین حاصل ہو گئی کہ انسانی آنکھ میں اللہ کی رویت کی طاقت نہیں ہے۔ جب اس نور کے سامنے پہاڑ کی اپنی تمام مضبوطی کے باوجود یہ حالت ہوئی ہے تو انسان تو انتہائی کمزور مخلوق ہے، اس کا کیا حال ہوگا۔ اب یہ سوال کہ موسیٰؑ کے پاس ہی تو بنی اسرائیل کے افراد کھڑے تھے، اس نور کے مشاہدہ پر ان کی کیا حالت ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے یہ تجلی صرف موسیٰؑ ہی کو ہوئی ہو دوسروں کو نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ تجلی کا دائرہ دیکھنے والوں کے لحاظ سے محدود کر دے۔ لہٰذا جنہوں نے تجلی کا مشاہدہ نہیں کیا ان پر اس کے اثرات بھی ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اہل عرفان نے ایک اور تفسیر اس آیت کے ضمن میں کی ہے جسے بطنِ قرآن سے سمجھنا چاہیے اور وہ یہ کہ یہ تجلی پہاڑ پر عالم مادہ میں نہیں تھی بلکہ ایک دوسرے عالم میں تھی جب کہ موسیٰؑ نے اس کا مشاہدہ عالم غیر مادی میں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بے ہوش ہو گئے نیز یہ کہ اپنے مقام پر زندہ رہے۔ [۱]

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ کی درخواست رویت بنی اسرائیل کی درخواست رویت کے بعد تھی تو پھر آیات کے لحاظ سے اس کا تذکرہ پہلے کیوں ہوا ہے۔ یعنی یہ سورہ اعراف ۱۴۳ ہے جب کہ بنی اسرائیل کی درخواست کا تذکرہ سورۂ اعراف ۱۵۵ میں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی سرگذشت سورۂ اعراف میں آیت ۱۰۳ سے آیت ۱۵۶ تک بیان فرمائی ہے یعنی یہ داستان آیت ثم بعثنا من بعدھم موسیٰ بایاتنا سے شروع ہوئی اور "وا کتب لنا فی ھذہ الدنیا" حضرت موسیٰؑ کی بات پر ختم ہوئی۔ پس ان آیات میں محورِ کلام موسیٰؑ، ان کی زندگی اور ان کی کاوشیں ہیں۔ اس ترتیب کا لازمہ یہ ہے کہ جب میقات کی بات ہو تو جہاں فرمایا: "ووعدنا موسیٰ ثلاثین لیلۃ" تو وہاں موسیٰؑ کی درخواست کا تذکرہ ہونا چاہیے، درخواست جس نیت سے بھی کی گئی ہو، موسیٰؑ کی بات کو ذکر کرنا چاہیے نہ کہ بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی کا تذکرہ۔ لہٰذا اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرف واپسی اور حضرت ہارونؑ کے مسائل و مشکلات بیان کی گئی ہیں۔ جب یہ سرگذشت ختم ہو جاتی ہے جس میں مرکزی حیثیت موسیٰؑ کی تھی تو اب داستان کے آخر میں قوم کی ہٹ دھرمی کا تذکرہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے ان کو رویت سے مشروط کر دیا تھا۔ لہٰذا جو کچھ موسیٰؑ سے متعلق تھا اسے داستان کے درمیان میں ذکر کیا اور جو کچھ اُن کی قوم کے ستر افراد سے تعلق رکھتا تھا اسے داستان کے آخر میں بیان فرمایا یعنی عجل (گئوسالہ) کے واقعہ کے بھی بعد۔ یہیں سے یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا کے ساتھ صرف ایک ملاقات کی، ایک ہی میقات تھا اور تمام سوالات، درخواستیں، ہٹ دھرمیاں اور ضدیں اسی جگہ پر انجام پائیں، اس طرح نہیں کہ ایک دفعہ اپنے لیے درخواست رویت کی۔ ایک دفعہ ملاقات کی اور ایک دفعہ قوم کے افراد کے لیے رویت کی درخواست کی۔ ہم نے اس آیت کے ضمن میں جو معروضات پیش کی ہیں یہ ہم نے امام رضا علیہ السلام کی ایک حدیث، جو حضرت نے مامون سے بیان کی اور زمخشری کی تفسیر کشاف سے استفادہ کی ہیں۔ [۲]

---

[۱] امام خمینیؒ کے بیانات سے ہے

[۲] صدوق در توحید ص ۱۲۱، ص ۱۲۲ و زمخشر در کشاف ج ۱، ص ۵۷۳، ص ۵۷۴

بت پرستی کی طرف لوٹنا!

۱۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ
فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾ (البقرہ: ۵۴)

۲۔ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ (البقرہ: ۵۱)

۳۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ (البقرہ: ۹۲)

۴۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ
وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ
قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾ (البقرہ: ۹۳)

۵۔ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ یَرَوْا
اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۸﴾

۶۔ وَلَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا
وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱۴۹﴾

۷۔ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤی اِلٰی قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ
بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَی الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ
اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۫ۖ فَلَا تُشْمِتْ
بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۰﴾

۸۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿۱۵۱﴾

۹۔ إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿۱۵۲﴾

۱۰۔ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن
بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾ (الاعراف: ۱۴۸ تا ۱۵۳)

۱۱۔ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِن بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾

۱۲۔ فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ
وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدتُّمْ أَن يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ
مِّن رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم مَّوْعِدِي ﴿۸۶﴾

۱۳۔ قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ
فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

۱۴۔ فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَٰذَا إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ
فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

۱۵۔ أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

۱۶۔ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ
الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ﴿۹۰﴾

۱۷۔ قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ﴿۹۱﴾

۱۸۔ قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ﴿۹۲﴾

۱۹۔ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ﴿۹۳﴾

۲۰۔ قَالَ يَا ابْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ

بَيۡنَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَلَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِىۡ ﴿۹۴﴾

۲۱۔ قَالَ فَمَا خَطۡبُكَ يٰسَامِرِىُّ ﴿۹۵﴾

۲۲۔ قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ يَبۡصُرُوۡا بِهٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ
فَنَبَذۡتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِىۡ نَفۡسِىۡ ﴿۹۶﴾

۲۳۔ قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ فِى الۡحَيٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ‌ وَاِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا
لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ‌ وَانْظُرۡ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِىۡ ظَلۡتَ عَلَيۡهِ عَاكِفًا‌ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ
لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِى الۡيَمِّ نَسۡفًا ﴿۹۷﴾

۲۴۔ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ؕ وَسِعَ كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا ﴿۹۸﴾ (طٰہٰ: ۸۵، ۹۸)

آیات کا ترجمہ

۱۔ یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! بتحقیق تم نے گئو سالہ (بچھڑے) کو اپنا معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اپنے رب کی بارگاہ کی طرف لوٹ جاؤ اور اپنے آپ کو قتل کر دو۔ یہی تمہارے لیے خالق کی نظر میں بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کر لے گا۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

۲۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ پھر تم نے اس کے بعد (یعنی موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں) بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ جس میں تم بڑے ظالم تھے۔

۳۔ موسیٰؑ دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آئے، لیکن اُن کی عدم موجودگی میں تم بچھڑا پوجنے لگے جس میں تم بڑے ظالم تھے۔

۴۔ یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے عہد لیا اور ہم نے تم پر کوہِ طور کو بلند کیا جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور اللہ کے پیغام کو سنو۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور اس کی مخالفت کی۔ اُن کے باطنی کفر کی وجہ سے گئو سالہ کی محبت اُن کے اندر رچ بس چکی ہے ان سے کہہ دو

کہ کتنی بُری ہے وہ چیز (پیغمبروں کی تکذیب) جس کا حکم تمہیں تمہارا دین دیتا ہے، اگر تم مومن ہو۔

۵۔قومِ موسیٰؑ نے اُن کی عدم موجودگی میں اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنالیا جو گائے کی آواز نکالتا تھا اور اسے اپنا معبود بنالیا۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ وہ نہ اُن کے ساتھ بات کرسکتا ہے نہ کسی راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ انہوں نے اسے معبود بنایا اور وہ ظالمین سے تھے۔

۶۔جب وہ سخت نادم ہوگئے اور دیکھا کہ گمراہ ہوگئے ہیں تو کہنے لگے: اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمیں بخش نہ دے گا تو ہم خسارا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

۷۔جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف غصہ اور غم کی حالت میں لوٹے تو کہا: تم میرے بعد میرے کیسے بُرے جانشین نکلے (میری ہدایت کی کوئی پرواہ نہ کی)۔ کیا تم نے اپنے رب کے معاملے میں جلدی کی؟ موسیٰؑ نے تختیاں زمین پر پھینک دیں اور غصے سے اپنے بھائی ہارون کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔ ہارونؑ نے کہا: میرے ماں جائے آپ کے بعد قوم نے مجھے کمزور جانا۔ (قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے) مجھ پر اپنے غصے سے دشمنوں کو خوش نہ کرو اور مجھے ظالم قوم میں شمار نہ کرو۔

۸۔موسیٰؑ نے کہا: خدایا! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

۹۔(موسیٰؑ نے ان سے کہا) بتحقیق جنھوں نے گئو سالہ کو معبود بنایا ہے عنقریب انہیں اللہ تعالیٰ کا غضب اور دنیا میں ذلت نصیب ہوگی اور جھوٹوں کو ہم اسی طرح اجر دیتے ہیں۔

۱۰۔پس جنہوں نے بُرے اعمال کیے، اس کے بعد انہوں نے توبہ کرلی اور ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ کے بعد ضرور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

۱۱۔خطاب ہوا ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو آزمایا اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

۱۲۔موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف غصے اور غم کی حالت میں لوٹے اور کہا: اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا اس وعدے کی مدت بہت لمبی ہوگئی تھی یا اس عمل کے ذریعہ چاہتے تھے کہ تمہارے رب کا قہر وغضب تم پر نازل ہو؟ تم نے میرے ساتھ کیے ہوئے

عہد پر عمل نہیں کیا۔

۱۳۔ بنی اسرائیل نے کہا: ہم نے وعدے کی مخالفت اپنی مرضی سے نہیں کی تھی بلکہ ہمارے پاس قومِ فرعون کے کچھ زیورات تھے وہ ہم نے پھینک دیئے اور سامری نے انہیں اس طرح سے ڈھال لیا۔

۱۴۔اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا بنالیا جو گائے کی آواز نکالتا تھا، اورکہا کہ یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰؑ کا معبود بھی ہے۔سامری موسیٰؑ کے ساتھ کیے ہوئے اپنے وعدہ کو بھول گیا۔

۱۵۔کیا وہ نہیں دیکھتے تھے کہ یہ بچھڑا ان کی بات نہیں سنتا اورانہیں نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا؟

۱۶۔ پہلے سے ہی انہیں ہارونؑ نے کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم تم امتحان میں ڈالے گئے ہو اور تمہار اپروردگار وہی بخش دینے والا ہے۔لہٰذا میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو۔

۱۷۔ بنی اسرائیل نے جواب دیا، ہم گئو سالہ کی عبادت نہیں چھوڑیں گے جب تک موسیٰؑ ہماری طرف لوٹ نہ آئیں۔

۱۸۔ جب موسیٰؑ لوٹ کر آئے تو ہارون سے کہا کہ جب تم نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو کون سی چیز مانع ہوئی اس سے

۱۹۔کہ میری پیروی کرو۔کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟

۲۰۔ہارونؑ نے کہا کہ ماں جائے میری داڑھی اور سر نہ پکڑیں! مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میرے کہنے پر عمل نہ کیا۔

۲۱۔موسیٰؑ نے سامری کی طرف رخ کر کے کہا اس کام سے تمہارا کیا مقصد تھا؟

۲۲۔سامری نے کہا کہ میں نے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جسے یہ نہ دیکھ سکے۔ میں نے رسول (قاصد) کے پاؤں کے نیچے سے ایک مشت مٹی اٹھالی اور اُسے اس کے اندر ڈال دیا۔میرے نفس نے اسے میرے لیے اچھا بنا کر پیش کیا۔

۲۳۔موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ یہاں سے دور ہو جا۔تو ایک بیماری میں مبتلا ہو جائے گا، جو بھی

تیرے نزدیک آئے گا تو اُسے کہے گا کہ میرے نزدیک نہ آ۔ تیرے لیے وقت وعدہ مقرر ہے کہ جو پورا ہو کر رہے گا۔

اب تو اپنے اس پروردگار کو دیکھ جس کی تو عبادت کرتا تھا۔ اسے ہم آگ میں جلائیں گے اور پھر اس کی راکھ دریا میں بہا دیں گے۔

۲۴۔ تمہارا معبود صرف اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ ہر چیز کا عالم ہے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

موسیٰؑ تورات حاصل کرنے کے لیے ستر آدمیوں کے ہمراہ میقات پر چلے گئے لیکن ابھی چالیس دن بھی نہ گزرے تھے کہ بنی اسرائیل کسی نظر آنے والے معبود کی فکر کرنے لگے۔ وہ اس سے پہلے جب صحرائے سینا میں داخل ہوئے تھے تو موسیٰؑ کو ایسا مشورہ دے چکے تھے۔ اب انہوں نے اس گئوسالہ کی عبادت شروع کر دی جسے ان میں سے ایک فرد سامری نے بنایا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنے پیغمبر کی تمام محنت برباد کر دی۔

دراصل ان میں بت پرستی کے جراثیم موجود تھے کیونکہ سالہا سال سے مصر میں وہ مصریوں کو بتوں کی عبادت کرتے دیکھتے آئے تھے گویا بت پرستی کے جراثیم مصر میں رہتے ہوئے ان کے گوشت پوست میں رچ گئے تھے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق واشر بوا فی قلوبھم العجل یعنی گئوسالہ پرستی کی محبت ان کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی''۔ ادھر سے تیس راتیں مکمل ہو گئیں لیکن موسیٰ نہ لوٹے۔ پس موسیٰؑ کی موت کی افواہ نے بھی اُن کی بت پرستی میں مدد کی۔ تیسرے یہ کہ مصر میں خفت و ذلت کی زندگی گزارنے کی وجہ سے ان میں فہم و شعور اور تعلیم کی بہت کمی تھی، لہٰذا معمولی سی تبلیغ ہی سے وہ اِدھر سے اُدھر ہو جاتے تھے۔

سورہ بقرہ کی آیات میں گئوسالہ پرستی کے بارے میں صرف اشارہ ہوا ہے، یہاں بطورِ داستان اس کا ذکر نہیں ہوا۔ درحقیقت قرآن کریم پیغمبر اسلامؐ کے عہد سے یہودیوں کی حالت بیان فرماتا ہے اور اُن کی سابقہ بداعمالیوں کو برملا بُرا بتاتا ہے کہ تم نے کیا کچھ نہ کیا۔ ایک جگہ فرمایا: باتخاذ کم العجل دوسری جگہ فرمایا: ثم اتخذ تم العجل من بعدہ تیسری جگہ ان کے اندر بت پرستی کے رجحان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''واشر بوا فی قلوبھم العجل'' پھر سورہ بقرہ کی آخری آیت میں کہا: ''بئسما یامرکم بہ ایمانکم ان کنتم مومنین اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر واقعاً تم اپنے آپ کو تورات پر ایمان لانے والا سمجھتے ہو تو تمہیں تمہارا ایمان حکم دیتا ہے کہ یہ بے دینی کرو، انبیائے خدا کو قتل کرو، حرام خدا (ربا) کو حلال قرار دو اور پیغمبر اسلامؐ کی تصدیق نہ کرو، تو پھر تمہارا ایمان تمہیں بہت برا حکم دیتا ہے، جب کہ ایمان برا حکم نہیں دے سکتا۔ پس تم ایمان رکھتے ہی نہیں۔ سورہ بقرہ میں تو بس اتنا ہی تذکرہ ہے لیکن سورہ اعراف وطہ میں یہ افسوس ناک واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے:

سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں گئوسالہ پرستی کا تذکرہ

سورہ اعراف نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں اُن کی قوم نے اپنے زیورات سے بچھڑے کا ایک مجسمہ بنالیا اور آواز بھی نکالتا تھا اور اس کی بطور معبود پرستش کرنے لگے۔ ارشاد ہوتا ہے:

واتخذ قوم موسیٰ من بعدہٖ من حلیھم عجلاً جسداً لہ خ[1] **و**

قرآن نے اُن کی بدطینتی اوران کے بے شعور ہونے کو یوں بیان کیا ہے کہ وہ دیکھ بھی رہے تھے کہ یہ بچھڑا نہ تو ان کے ساتھ بات کر سکتا ہے اور نہ انہیں ہدایت ورہنمائی کرسکتا ہے، اس کے باوجود اس کی پرستش کرتے رہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **الم یروا انہ لا یکلمھم ولا یھدیھم سبیلاً اتخذوہ وکانوا ظلمین o**

جب یہ واقعہ وقوع پذیر ہوا اس وقت حضرت موسیٰؑ میقات پر تھے۔ وہاں سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: **قال فانا قد فتنا قومك من بعدك واضلھم السامری o** ''ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو سامری کے ذریعہ آزمایا اور سامری نے انہیں گمراہ کردیا''۔

حضرت موسیٰؑ کے لیے میقات میں قیام بڑا کیف آور اور شیریں تھا۔ لیکن یہ غمناک خبر سننے کے بعد ان کا قیام تکلیف دہ ہو گیا۔ جب میقات کی مدت پوری ہوگئی تو موسیٰؑ غصے اور غم کی حالت میں قوم کی طرف لوٹ آئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا** ۙ (اعراف: ۱۴۹) نیز **فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا** ۚ (طٰهٰ: ۸۶)

اس واقعہ میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں تین فریق تھے:

۱۔ سامری جس نے بت بنایا اور بت پرستی کی دعوت دی۔

۲۔ موسیٰؑ کی قوم والے جو سامری کے دھوکہ میں آکر گمراہ ہو گئے۔

۳۔ ہارونؑ جو موسیٰؑ کے جانشین تھے اور قوم کی سرپرستی ان کے ذمہ لگائی گئی تھی۔

قوم کے بارے میں حضرت موسیٰؑ کا ابتدائی ردِعمل لعن طعن کی صورت میں تھا جس کو ہم دونوں سوروں سے نقل کرتے ہیں:

سورہ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ''**من حلیھم**'' کے جملہ میں کلمہ ''من'' اس مادہ کی طرف اشار کرتا ہے جس سے گئوسالہ بنایا گیا تھا جیسا کہ کہا جاتا ہے: **الخاتم من فضه**'' فخار مصری نے عجیب بات کہی ہے کہ 'من' کو بدلہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی اس نے زیور لے لیے اوران کے بدلہ میں انہیں گئوسالہ دے دیا۔ درآنحالیکہ لغتِ عرب میں کلمہ 'من' ایسی تراکیب کا حصہ قرار دیا گیا ہے بدل کا نہیں جیسا کہ کہا گیا ہے: ''**الباب من خشبه**'' (قصص الانبیائؑ، ص ۲۲۲)

۱۔ بئسما خلفتمونی من بعدی

’’تم کتنے بُرے جانشین تھے میرے لیے‘‘

۲۔ اعجلتم امر ربکم

’’تم نے اپنے رب کے حکم میں جلدی کی‘‘

۳۔ ان الذین اتخذوا العجل سینا لھم غضب من ربھم و ذلة فی الحیوة الدنیا و کذلك نجزی المفترین

’’جنھوں نے گئوسالہ کو معبود بنا لیا عنقریب انہیں اسی دنیا میں اسی عجلت سے غضبِ خدا اور ذلت و خواری کا سامنا کرنا ہوگا‘‘۔

سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

۴۔ الم یعد کم ربکم وعداً حسناً

’’کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا‘‘۔

۵۔ ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی

’’یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو اسلیے تم نے میرے وعدے کی مخالفت کی‘‘

اب اس لعن طعن کی تفصیل بیان کرنا ہوگی۔

پہلے کلام میں انہیں بُرا جانشین بتایا گیا ہے ’’بئسما خلفتمو نی جس کی وجہ واضح ہے کہ انہوں نے موسیٰؑ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا۔ حضرت موسیٰؑ توحید کا پیغام لائے تھے جب کہ وہ شرک کرنے لگے۔

دوسرے کلام میں ان سے کہا گیا کہ تم نے اپنے پروردگار کے حکم کے سلسلہ میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا: ’’اعجلتم امر ربکم‘‘ یہ جملہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب پیروکار اپنے رہبر کی عدم موجدگی میں کوئی ایسا کام کرے جو رہبر کی منشا کے خلاف ہو۔ ایسے موقعہ پر کہتے ہیں ’’تم نے جلدی کیوں کی؟‘‘ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اگر شرک کا ارتکاب کرنا بھی تھا تو میرا انتظار کر لیا ہوتا، بلکہ انہیں اس کلام کے ذریعے ملامت کرنا مقصد تھا کہ کس جذبہ کے تحت تم نے عجلت میں یہ نامعقول کام کیا!

تیسرے کلام میں انہیں اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کے نزول اور دنیا میں ذلت و خواری کی دھمکی دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان الذین اتخذوا العجل سینا لھم غضب من ربھم و ذلة فی الحیوة الدنیا و کذلك نجزی المفترین‘‘ وہ کون سا غضبِ

خدا تھا، اس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت ۵۱ کے ضمن میں بعد میں بیان کریں گے۔

چوتھے کلام میں موسیٰؑ انہیں اللہ تعالیٰ کے اچھے وعدوں کو یاد دلاتے ہیں، وہ وعدے جو فرعون کے پنجۂ ستم سے آزادی سے شروع ہوئے اور سرزمین مقدس پر ورود کے ساتھ ختم ہوتے ہیں۔ کیا ان کے شکریہ کا تقاضا یہی تھا کہ غیر خدا کی پرستش شروع کر دیں؟ "الم یعد کم ربکم وعداً حسناً"

پانچویں کلام میں ان سے یہ کہا گیا ہے کہ کیا مجھے تمہارے یہاں سے گئے ہوئے بہت لمبی مدت گزر گئی تھی۔ تم نے تو میری چند دن کی غیر حاضری میں میری تعلیمات کو بھلا دیا: "افطال علیکم العهد"

آخری کلام میں ان سے کہا گیا ہے کہ تم نے گئو سالہ کی پرستش کر کے غضب خدا کو دعوت دے لی ہے اور جو وعدہ تم نے میرے ساتھ کیا تھا اسے توڑ ڈالا ہے: "ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی"۔

بنی اسرائیل کے پاس حضرت موسیٰؑ کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ بچگانہ عذر تراشیاں کرنے لگے کہ ہم بے اختیار تھے۔ ہمارے پاس فرعون کی قوم کے کچھ زیورات تھے جو ہم نے پھینک دیئے تھے اور سامری نے بھی انہیں پھینک دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

قالوا ما اخلفنا موعدك بملكنا و لكنا حملنا اوزاراً من زينة القوم فقذفنها فكذلك القى السامری

پہلے جملے میں ان کے بچگانہ جواب کا ذکر ہے جس میں انہوں نے کہا کہ راہِ توحید سے گمراہی ہمارے اختیار میں نہیں تھی۔

دوسرے جملے میں کہتے ہیں کہ جو زیورات ہم آلِ فرعون سے چھین کر اپنے ساتھ لائے تھے انہیں ہم نے پھینک دیا۔ شاید ان کی مراد یہ ہو کہ ہم نے سمجھا اب یہ ہمارے کسی کام کے نہیں، لیکن دوسری آیات کے لحاظ سے یہ احتمال بعید ہے کیونکہ عموماً زیورات وغیرہ عورتوں کے قبضہ میں ہوتے ہیں اور عورت کا زیورات سے لگاؤ ایک فطری امر ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اَوَمَنۡ یُّنَشَّؤُا فِی الۡحِلۡیَةِ وَهُوَ فِی الۡخِصَامِ غَیۡرُ مُبِیۡنٍ ۝۱۸ (زخرف: ۱۸) یعنی "کیا وہ جس کی تربیت (نشوونما) زیورات میں ہوئی اور واضح دلیل بھی نہ رکھتی ہو کیا وہ دوسروں کے برابر ہوگی؟

معلوم ہوتا ہے کہ سامری ایک ماہر زرگر تھا۔ کوئی خاص قسم کا وعدہ لے کر اس نے اپنا مقصد بتائے بغیر بنی اسرائیل کو فریب دے کر ان سے زیورات لے لیے۔ لہٰذا بنی اسرائیل اور سامری دونوں نے زیورات آگ میں ڈال دیے۔ بنی اسرائیل اس سازش کا شکار ہو گئے اور سامری نے ان زیورات سے گئو سالہ کا مجسمہ بنالیا جس سے گائے جیسی آواز نکلتی تھی۔ پھر وہ کہنے لگا کہ یہ ہے تمہارا معبود اور موسیٰؑ کا معبود بھی۔

یہ جو کہا گیا کہ بنی اسرائیل ایک سوچے سمجھے منصوبے کا شکار ہو گئے، اس پر دلیل فاخرج میں کلمہ "فا" کا دخول ہے۔ اگر سامری نے پہلے سے انہیں اس منصوبہ سے آگاہ کیا ہوتا اور وہ بھی اپنے زیورات اس مقصد کے لیے اسے دیتے تو پھر انہیں اس طرح سے معذرت طلب نہیں کرنا چاہیے تھی۔ بنی اسرائیل اس دوسرے جملہ میں معذرت طلب کر رہے ہیں جو اس وقت معذرت کی صورت پیدا کر سکتا ہے جب وہ زیورات دیتے وقت سامری کے منصوبے سے آگاہ نہ ہوں، اب یہ مسئلہ کہ سامری نے انہیں دھوکہ کیسے دیا، آیات اس بارے میں خاموش ہیں۔

بہر کیف جو بھی ہوان کا یہ بچگانہ بہانہ قابل قبول نہ تھا۔ یقیناً یہ بدبخت اپنی جان چھڑانے کے لیے بہانے تو بنا رہے تھے اگرچہ وہ نامعقول ہی ہوں، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ گئو سالہ کی پرستش اس عہد کے برخلاف تھی جو انہوں نے موسیٰؑ سے باندھا تھا، باوجودیکہ حضرت ہارونؑ نے انہیں متنبہ بھی کر دیا تھا کہ اس عمل کے ذریعہ ان کا امتحان لیا جا رہا ہے کیونکہ معبود گئو سالہ نہیں بلکہ پروردگار رحمان ہی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُونُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝۹۰ (طٰهٰ:۹۰)

انہوں نے حضرت ہارونؑ کو یہ جواب دیا کہ جب تک موسیٰ لوٹ نہ آئیں ہم گئو سالہ کی عبادت نہ چھوڑیں گے۔ قرآن ان کے اس جملہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے: قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝۹۱ (طٰهٰ:۹۱)

ان باتوں سے یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ گئو سالہ کی پرستش کے لیے وہ لوگ کوئی مناسب عذر نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا انہیں اپنے کیے کی سزا ملنا چاہیے تھی۔

حضرت موسیٰ کی اپنے بھائی سے جواب طلبی!

یہاں تک حضرت موسیٰؑ کی بنی اسرائیل کے فریب خوردہ لوگوں سے گفتگو کا پتہ چل گیا۔ اب دیکھنا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے بھائی سے کیا برتاؤ کیا کیونکہ موسیٰ نے میقات پر جاتے وقت ہارونؑ سے کہا تھا: وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۴۲ (اعراف: ۱۴۲)

گویا موسیٰؑ جانتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں فتنہ وفساد برپا ہو جائے گا، لہٰذا پہلے سے ہی بھائی کو اس کے بارے میں متنبہ کر دیا۔ ممکن ہے یہ حضرت موسیٰؑ کی پیش گوئی وحی کے ذریعہ سے نہ ہو بلکہ انہوں نے اپنی تیز نظروں سے اپنی قوم کے تیور دیکھ لیے ہوں جب صحرائے سینا میں داخل ہوتے ہی انہوں نے ایک دیکھے جانے والے معبود کا مطالبہ کر دیا تھا۔ لہٰذا ان آثار کے پیش نظر ایسی پیش گوئی کرنا آسان تھا۔ موسیٰؑ میقات ہی پر بنی اسرائیل کے بارے میں وحی کے ذریعے مطلع ہو چکے تھے۔ لہٰذا واپسی پر وہ بڑے غم وغصہ کی حالت میں تھے۔ اس شدید غم وغصہ کا ردِعمل دو طرح سے ظاہر ہوا۔ یہ شدید ردِعمل بھی اس وجہ سے تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنے گناہ کی بڑائی کا احساس ہو جائے۔ اگر موسیٰؑ اتنی شدت سے یہ ردِعمل نہ دکھاتے تو ممکن تھا کہ بنی اسرائیل اسی بت پرستی پر باقی رہتے لیکن انہوں نے جب موسیٰؑ کو اپنی دو انتہائی محبوب ومقدس چیزوں کے ساتھ اس طرح سلوک کرتے دیکھا تو انہیں اپنے گناہ کی شدت کا احساس ہو گیا۔ لہٰذا فوراً توبہ کرنے لگے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۱۴۹ (اعراف:۱۴۹)

حضرت موسیٰؑ کے دو ردِعمل یہ تھے:

۱۔ الواحِ تورات کو پھینک دینا۔

۲۔ بھائی کے سر اور ریش کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا۔

تورات تو وحی الٰہی تھی جب موسیٰؑ کے نزدیک ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل تھا اور ان کے بھائی ہارونؑ معصوم نبی تھے جو کبھی گناہ کے مرتکب ہو نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود غیظ و غضب کی شدت سے بنی اسرائیل کو متنبہ کرنے کے لیے انہوں نے تورات کو زمین پر پھینک دیا اور بھائی کا سر کھینچتے ہوئے بڑے غصہ سے کہا: قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ (طٰہٰ: ۹۲۔ ۹۳) یعنی ''اے ہارونؑ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو تجھے میری پیروی سے کون سی چیز مانع ہوئی؟ کیا تو نے میرے حکم کی مخالفت کی''؟

جب بنی اسرائیل نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انہیں اپنے کیے کا اندازہ ہو گیا اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ اب انہیں بھی سخت سزا ملے گی۔ ہارونؑ نے موسیٰؑ کی بات کا انتہائی نرمی سے جواب دیا کہ اے میرے ماں جائے! میرا سر اور داڑھی نہ کھینچیں۔ میں نے تو ان پر اس لیے سختی نہ کی کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا اور میری باتوں پر توجہ نہ کی۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ (طٰہٰ: ۹۴)

سورۂ اعراف میں حضرت ہارونؑ کے جواب کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تیرے بعد بنی اسرائیل نے مجھے کمزور جانا اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔ یہ کام کر کے میرے دشمنوں کو خوش نہ کرو اور نہ مجھے ظالمین میں قرار دے۔ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ (اعراف: ۱۵۰)

حضرت ہارونؑ کی اس محبت آمیز گفتگو نے حضرت موسیٰؑ کا غضب کم کر دیا، لہٰذا انہوں نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے مغفرت و رحمت طلب کرتے ہوئے عرض کیا: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ (اعراف: ۱۵۱)

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے کھلے دل کے ساتھ اپنے بھائی سے بات کی اور تورات زمین سے اٹھا لی۔ اسی تورات کی الواح میں رحمت و ہدایت کی فراوان ہدایات تھیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ښ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ (اعراف: ۱۵۴)

حضرت موسیٰؑ کی سامری سے گفتگو

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس واقعے میں تین فریق شامل تھے، گویا اس مثلث کے دو اضلاع بنی اسرائیل اور ہارونؑ تھے جب کہ تیسرا ضلع بدبخت سامری تھا جس نے گئو سالہ بنا کر انہیں جادۂ توحید سے منحرف کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ پہلے دو فریقوں سے نمٹ کر سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ یعنی قال فما خطبك يا سامري''۔ اس نے جواب دیا ''قال بصرت بما لم

یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذ تہا و کذلك سولت لی نفسی "یعنی" میں نے وہ کچھ دیکھ لیا ہے جسے بنی اسرائیل نہ دیکھ سکے۔

میں نے قاصد کے قدموں سے ایک مشت مٹی اٹھالی اور اسے اس گوسالہ میں ڈال دیا۔ میرے نفس نے یہ کام مجھے اچھا دکھایا۔ اس کلام کی تفسیر میں مفسرین نے دو احتمال ذکر کیے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ دونوں غلط ہیں۔ اللہ ہی ان سے دراصل آ گاہ ہے۔

پہلا احتمال یہ بتاتے ہیں کہ سامری نے کہا کہ جب فرعون کا لشکر دریا کے کنارے آ پہنچا تھا تو میں نے جبرائیل کو مرکب پر سوار دیکھا جو فرعون کے گھوڑے کو دریا کی طرف متوجہ کرنے کے لیے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ میں نے جبرائیل کے مرکب کے قدموں کی تھوڑی سی مٹی اٹھا لی اور وہ مٹی گوسالہ کے مجسمے میں ڈالی جس کی وجہ سے یہ آواز نکل رہی ہے۔

اکثر مفسرین نے یہ احتمال قبول کیا ہے۔ لیکن کیا ایک عام شخص کے لیے فرشتہ کو مجسم طور پر دیکھنا ممکن ہے؟ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ دیکھ سکتا تھا تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا سامری بنی اسرائیل سے نہیں تھا جب کہ سابقہ آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ جب بنی اسرائیل دریا سے گزر گئے اور آلِ فرعون دریا کے کنارے پہنچے تو راستہ ابھی باقی تھا جسے خشک راستہ سمجھتے ہوئے وہ اسی پر چل پڑے اور غرق ہو گئے۔ ایسی صورت میں سامری کو کب موقع ملا کہ وہ فرعون سے آگے چل کر جبرائیل کی سواری کے قدموں کی خاک اٹھا لیتا؟

اس کے علاوہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ جبرائیل کی سواری کے قدموں میں اس طرح کی کوئی خاصیت پائی جاتی ہے کہ اگر اسے کسی جماد پر ڈالا جائے تو اس میں آواز پیدا ہو جائے گی۔

اصل بات تو یہ ہے کہ یہ خیال زیادہ مناسب ہے کہ گئو سالہ کی بناوٹ میں کوئی ایسی چیز رکھ دی گئی تھی کہ جب بھی اس میں ہوا تیزی سے داخل ہو کر نکلتی تو گائے کی آواز نکلنے لگتی۔ آج کل بچوں کے کھلونوں میں یہ بات کافی حد تک ملتی ہے۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ سامری نے کہا تھا کہ میں رسول یعنی موسیٰؑ کے آثار (تعلیمات) پر ایمان رکھتا تھا۔ لیکن جب میرے دل میں گئو سالہ بنانے کا خیال پیدا ہوا تو میں نے اُن تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا اور مجھے یہ کام اچھا لگا۔ اس صورت میں رسول پیغمبر کے معنی میں ہوگا۔ جس سے اس کا مقصد تعلیم نبی کا اثر ہو۔ یہ اس لیے کہ "قبضت قبضۃ" سے مراد کسی حد تک رسولِ وقت کی تعلیم ہو اور "نبذ تھا" سے اس تعلیم کا ترک کرنا مراد ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے نہ آیت کا ظاہر اس کے موافق ہے اور نہ آیت کی تاویل۔ لہٰذا صبر کرنا ہو گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید بحث و تحقیق سے آیت کا مفہوم ممکن ہے بعد میں معلوم ہو جائے۔

سامری کی سزائیں

ہم جانتے ہیں کہ گناہ جتنا بڑا ہوگا سزا بھی اس کے مطابق ہوگی۔ جس شخص نے پوری قوم (بنی اسرائیل) کو راہِ راست سے منحرف کر کے کفر و شرک کی راہ پر لگا دیا ہو، اس کی سزا بھی یقیناً انتہائی سخت ہونا چاہیے۔ لہٰذا اسے اس دنیا میں بھی سزا ملنا لازم ہوگا اور آخرت میں بھی اسے شدید عذاب میں مبتلا ہونا ہوگا۔ قرآن نے سامری کے لیے دو شدید سزائیں اور ایک ردِّعمل بیان فرمایا ہے۔

۱۔ حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا: تو عنقریب ایک خاص قسم کی بیماری میں مبتلا ہوگا جس کی وجہ سے تجھے لوگوں سے وحشت ہوگی۔ جو بھی تیرے نزدیک آئے گا تو اس سے کہے گا کہ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ: قال فاذهب فان لك فی الحیوة ان تقول لا مساس۔

۲۔ قیامت کے دن تیرے لیے دردناک عذاب ہوگا، ایسا عذاب جو کسی طرح رفع نہ ہوگا: "وان لك موعدًا لن تخلفه" تیرے لیے قیامت کا عذاب ہے جس سے تو ہرگز نہیں بچے گا۔

تو نے جس معبود کی اتنا عرصہ مسلسل عبادت کی ہے ہم اسے جلا ڈالیں گے اور پھر اسے دریا میں بہا دیں گے۔ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ (طٰهٰ: ۹۷)

سامری کے معبود سے مراد وہ سونے کا مجسمہ تھا جو گائے کے بچھڑے کی شکل پر اس نے بنایا تھا۔ اس کے جلانے کا مطلب اسے پگھلا کر اس کی شکل کو ختم کر دینا ہے تاکہ دوبارہ کوئی اس کی پرستش کا سوچ نہ سکے۔ پھر ہم اسے دریا میں بہا دیں گے۔

اس طرح حضرت موسیٰؑ نے اس بدفطرت شخص کو لوگوں سے الگ کر کے رکھ دیا تاکہ کوئی شخص اس سے رابطہ نہ رکھے اور اسے دوبارہ کسی کو گمراہ کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

کیا بات یہیں پر ختم ہوگئی یا ان خبیث و بدطینت افراد کی عبرت کا سامان بھی کیا گیا تاکہ بت پرستی کا خیال دل میں نہ لاسکیں؟ لیکن حقیقت ہے کہ اگر مجرموں کی اچھی اچھی طرح گوشمالی نہ کی جاتی اور صرف زبانی ڈانٹ ڈپٹ پر اکتفا کی جاتی تو دوبارہ بت پرستی کے شروع ہونے کا خطرہ باقی رہتا۔ لہٰذا حضرت موسیٰؑ نے انہیں دیکھ کر پہلے ہی کہہ دیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ (اعراف: ۱۵۲)

یعنی "جنہوں نے گئو سالہ پرستی کی عنقریب اس دنیا میں اللہ کے قہر و غضب اور ذلت سے دو چار ہوں گے کہ جھوٹ بولنے والوں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں"۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ؗ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ (اعراف: ۱۵۳)

یعنی "جنہوں نے بُرے کام کیے اور اس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، بے شک توبہ کے بعد تیرا رب ان کے لیے غفور و رحیم ہے"

جس عذاب نے فوراً ہی انہیں آ لیا تھا آخر وہ کیا تھا؟ بطورِ اجمال اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۵۴ میں اس طرح خطاب ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوٓا إِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوٓا أَنْفُسَكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۚ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۴﴾ (بقرہ: ۵۴)

جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: ''اے میری قوم! تم نے گئو سالہ کو اپنا معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا، اب اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے آپ کو قتل کر ڈالو۔ یہی تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک بہتر ہے وہ تمہاری توبہ کو قبول فرمائے گا کہ وہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔

اس آیت کے جملہ ''فاقتلوا انفسکم'' کے بارے میں مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں:

۱۔ جن لوگوں نے گئو سالہ پرستی نہیں کی تھی وہ اُن کو قتل کر دیں جنہوں نے گئو سالہ پرستی کی اور یہی اُن کی توبہ ہوسکتی تھی کہ وہ قتل ہو جائیں۔

یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ اعراف ۱۵۳ میں توبہ کی قبولیت کی خوشخبری دے دی تھی، جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کی توبہ قبول فرمالیتا ہے لیکن توبہ کی قبولیت کے کچھ مراحل ہیں جن کا طے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض مراحل میں دنیاوی عذاب بھی سہنا پڑے۔

اس احتمال پر اعتراض یہ ہے کہ آیت کے الفاظ میں قتل کرنے کا خطاب خود گئو سالہ پرستوں کو ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قتل کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جنہوں نے بت پرستی نہیں کی تھی وہ انہیں قتل کر دیں جنہوں نے بت پرستی کی۔ لہٰذا خطابِ الٰہی کے پیش نظر اس احتمال کا قبول کرنا مشکل ہے۔

۲۔ مومنین ان لوگوں کو قتل کر دیں جنہوں نے ابھی تک گئو سالہ پرستی نہیں چھوڑی تھی۔ جو اشکال پہلے احتمال پر تھا وہی اعتراض اس احتمال پر بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ خطاب خود گئو سالہ پرستوں کو ہوا کہ ''انکم ظلمتم انفسکم باتخاذ کم العجل فتوبوا الی ابرئکم فاقتلوا انفسکم''۔ یہ خطاب انہی پرستش کرنے والوں کو ہے نہ کہ دوسروں کو جو مومن اور بت پرستی سے پاک تھے۔ اس کے علاوہ سورہ اعراف ۱۴۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ کی واپسی کے بعد سب گئو سالہ پرستوں نے گئو سالہ پرستی ترک کر دی تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا ۙ قَالُوا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿۱۴۹﴾ (اعراف: ۱۴۹)

یعنی ''جب وہ سخت پریشان ہو گئے اور انہوں نے جانا کہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں بخش نہ دے تو ہم خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے''۔

اس آیت کے پیش نظر یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ قتل وہی سب لوگ ہوئے جنہوں نے گئو سالہ پرستی کی؟ ہماری نظر میں ان دونوں تفسیروں میں سے کوئی بھی آیت کے ظاہر سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ یہاں ایک تیسرا احتمال آیت کے لفظوں کے زیادہ مطابق معلوم ہوتا ہے جس کا ہم اب ذکر کرتے ہیں۔

۳۔ بنی اسرائیل کے مرتدوں کو توبہ کی تکمیل کے لیے حکم ہوا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں، یعنی یا ہر شخص اپنے آپ کو قتل کر دے یا ایک دوسرے کو مار ڈالیں۔ اس احتمال کے پیش نظر خطاب انہی گئو سالہ پرستوں سے ہے کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔ تورات کے ظاہر کے بھی یہی امکان موافق ہے جہاں کہا گیا ہے کہ جنہوں نے رب کی طرف رجوع کیا انہیں اس نے بلایا تو بنو لاوی نے اس کی بات پر لبیک کیا۔ اس نے انہیں حکم دیا کہ تلواریں لے کر ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔

اس قسم کے حکم کو قبولیت توبہ کے اس وعدہ کے، جو سورۂ اعراف میں آیا ہے، منافی نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے قبولیت توبہ کے لیے یہ عمل ہی شرط کے طور پر ذکر ہوا ہو۔

(۷) صحرائے سینا میں چالیس سال کی سرگردانی

حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے بڑی مشکلات برداشت کیں۔ اس طرح وہ اپنے ہوش ولیاقت کی بنیادوں پر ایک انقلابی کی مانند قوم سے بت پرستی جیسے عظیم بحران سے گزر گئے، بروقت فیصلہ کرکے اس فتنۂ شرک کا سر مکمل طور پر کچل دیا اور مرتدوں کو سزائے موت دے کر دوسروں کی عبرت کا سامان کر دیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ انہیں سرزمین موعود "فلسطین" لے جائیں، وہ سرزمین جسے قرآن نے "الارض المقدسة" اور بارکنا حوله" جیسی لفظوں کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔

ایسی سرزمین پر وارد ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس زمین پر عمالقہ نامی قوم مسلط تھی جن کی قومیت سامی تھی اور وہ مدتوں سے جزیرۃ العرب کے شمالی علاقوں میں سکونت پذیر تھے۔

بنی اسرائیل کے کچھ افراد کو علاقہ کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے آگے بھیجا گیا۔ انہوں نے واپس آ کر وہاں کے باشندگان کی طاقت وتوانائی کے بارے میں بہت مبالغہ کیا۔ یہی چیز موجب بنی کہ بنی اسرائیل نے اس سرزمین کی طرف جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم میں ان کے ساتھ جنگ کی ہمت نہیں، بلکہ انتہائی بے شرمی کے ساتھ حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے: "تم اور تمہارا خدا جا کر ان سے جنگ کرو اور دشمن کو وہاں سے باہر نکالو، پھر ہم آپ کے بعد جائیں گے"۔

یقیناً اس علاقہ میں بسنے والی طاقت ور قوم کے بارے میں سننا ان کے ارادوں پر اثر انداز ہوا، لیکن یہ تاثیر بنی اسرائیل کے ذاتی جذبہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی کیونکہ فرعونی مظالم کے زیر سایہ سالہا سال ذلت وخواری کی زندگی گزارنے کی وجہ سے ابھی تک ان کی روحیں استقلال وآزادی جیسی نعمتوں کے ذائقہ سے روشناس نہیں تھیں۔ لہٰذا ذاتی طور پر ان میں جہاد اور شہادت کا جذبہ موجود ہی نہیں تھا۔

قرآن مجید نے موسیٰؑ کی بنی اسرائیل کے ساتھ زندگی کے اس مرحلہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِيۡكُمۡ اَنۡۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ‌ۖ وَّاٰتٰٮكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۔ يٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِىۡ كَتَبَ اللّٰهُ لَـكُمۡ وَلَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰٓى اَدۡبَارِكُمۡ فَتَـنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۲۱﴾

۳۔ قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِنَّ فِيۡهَا قَوۡمًا جَبَّارِيۡنَ ‌ۖ وَاِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَا حَتّٰى يَخۡرُجُوۡا

مِنۡهَا ۚ فَاِنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا فَاِنَّا دٰخِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾
۴۔ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمَا ادۡخُلُوۡا عَلَيۡهِمُ
الۡبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡهُ فَاِنَّكُمۡ غٰلِبُوۡنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۳﴾
۵۔ قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِيۡهَا فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ
فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ ﴿۲۴﴾
۶۔ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِىۡ وَاَخِىۡ فَافۡرُقۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَ الۡقَوۡمِ
الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۲۵﴾
۷۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ
عَلَى الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۲۶﴾ (المائدہ: ۲۰ تا ۲۶)

آیات کا ترجمہ

۱۔ یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کی نعمات کو یاد کرو۔ اس نے تم میں سے اپنے انبیاء بنائے، تمہیں بادشاہ بنایا اور اس نے تمہیں وہ کچھ دیا جو کائنات میں کسی اور کو نہ دیا تھا۔

۲۔ اے قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقرر فرمائی ہے اور پیچھے مت ہٹو مبادا خسارا اٹھانے والوں سے ہو جاؤ۔

۳۔ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰؑ! اس سرزمین میں تو بڑی طاقت ور قوم رہتی ہے۔ جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں ہم وہاں داخل نہیں ہوں گے۔ جب وہ نکلے تو ہم داخل ہو جائیں گے۔

۴۔ دو آدمی جنہیں اللہ تعالیٰ نے نعمت عطا فرمائی تھی ان سے کہنے لگے کہ تم شہر میں داخل ہو جاؤ (ڈرو مت)۔ جب تم وہاں داخل ہو گئے تو غالب تم ہی ہو گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو۔

۵۔ کہنے لگے کہ اے موسیٰؑ جب تک وہ لوگ اس سرزمین میں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل نہ ہوں گے۔تم اورتمہارارب جاؤاوران کے ساتھ جنگ کرو۔ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔

۶۔موسیٰؑ نے عرض کیا: خدایا! میں اپنے اوراپنے بھائی کے علاوہ کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔میرے اور اس فاسق قوم کے درمیان (جو تیری اطاعت سے باہر ہیں) جدائی ڈال دے۔

۷۔اللہ نے موسیٰؑ سے فرمایا: کہ یہ سرزمین مقدس (اس انکار کی وجہ سے) ان پر چالیس سال کے لیے حرام ہوگئی۔(اب یہ اس میں وارد نہ ہوسکیں گے) اس مدت میں یہ مسلسل سرگرداں رہیں گے۔تو اس فاسق قوم کے انجام پر افسوس نہ کر۔

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت موسیٰؑ نے حق کی متلاشی روح کو زندہ کرنے اور فلسطین پر قابض اقوام کے ساتھ جنگ پر آمادہ کرنے کی خاطر انہیں اللہ تعالیٰ کی اُن کے حق میں عظیم نعمتیں یاددلائیں جواس طرح ہیں:

(الف) حضرت یعقوبؑ کا خاندان جو خاندانِ نبوت تھا اور انبیاء اس خاندان سے مبعوث ہوئے تھے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اذجعل فیکم انبیاءً۔

(ب) تمہیں اللہ تعالیٰ نے بادشاہ وملوک بنایا: ''وجعلکم ملوکاً'' سب تو بادشاہ نہیں تھے مگر سب کو مبالغہ کی بنا پر ملوک کہا گیا ہے اور عام گفتگو میں یہ طریقہ مروج ہے کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی فرد بادشاہ بن جائے تو اس قبیلہ کے افراد کو بھی ملک کے بادشاہ کہا جاتا ہے۔چنانچہ بنی اسرائیل سے بڑے بڑے باشکوہ وباعظمت بادشاہ گزرے۔حضرت موسیٰؑ سے پہلے حضرت یوسفؑ تھے اوران کے بعد حضرت داؤدؑ وحضرت سلیمانؑ بھی بہت عرصہ تک حکمران رہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ملوکاً سے مراد بادشاہ نہ ہو بلکہ مراد بنی اسرائیل کی فرعون کے تسلط سے آزادی ہو چونکہ عربی میں ملک کے معنی مالک اورصاحبِ اختیار کے ہیں جیسا کہ سابقاً ذکر ہوا کہ بنی اسرائیل نے جب کہا کہ بت پرستی ہمارے اختیار میں نہ تھی، وہاں بھی ملک کی لفظ استعمال ہوئی ہے۔مَآ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا (طٰہٰ: ۸۷)

(ج) اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسی چیز عطا فرمائی جو کائنات میں کسی کو بھی نہ دی تھی: اتاکم مالم یؤت احداً من العلمین'' ممکن ہے اس سے مراد من وسلویٰ کا نزول ہو۔جس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔

وہ قوم جس کی تعداد سات لاکھ تھی، مدتوں بیابانوں میں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر غیب سے تازہ کھانا حاصل کرتے رہے۔یہ ایک ایسی نعمت ہے جو اس سے پہلے کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی جیسا کہ فرماتا ہے: واتاکم مالم یؤتِ احداً من العلمین''

اللہ تعالیٰ ان پر نعمتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد ان سے فرماتا ہے کہ اب یہاں سے کوچ کرو کہ تمہاری منزل بیت المقدس ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے معین فرمائی ہے۔ پس اللہ کے حکم کی مخالفت نہ کرو مبادا خسارہ اٹھانے والے بن جاؤ، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يقوم ادخلوا الارض المقدسة التي كتب الله لكم ولاترتدوا على ادبار كم فتنقلبوا خسرين٥

لیکن حضرت موسیٰؑ کی اس ساری تمہید نے ان کے مردہ دلوں پر کوئی اثر نہ کیا اور انہوں نے موسیٰؑ کو جواب دیا کہ اے موسیٰؑ تجھے معلوم ہے کہ وہاں تو ایک بڑی طاقت ور قوم آباد ہے۔ جب تک وہ وہاں سے نہیں نکلیں گے ہم وہاں داخل نہ ہوں گے: قالوا يموسى ان فيها قوماً جبارين و انالن ندخلها حتى يخرجوا منها فان يخرجوا منها فانا دخلون٥ " ان کے اس جواب سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک اُن کے اذہان سے غلامانہ زندگی کے اثرات نہیں نکلے تھے اور وہ غلامانہ زندگی کو آزاد و شریفانہ زندگی کے برابر ہی سمجھتے تھے۔

پھر بھی لوگوں کی اس جمعیت میں آزاد طبیعت انسان نکل ہی آتے ہیں۔ یہاں قرآن نے بھی دو ایسے افراد کا تذکرہ فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کے دو آدمیوں نے قوم کو لعن طعن کی اور کہا کہ خدا پر بھروسہ کر کے شہر کے دروازہ تک تو پہنچو۔ آگے اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمائے گا: قال رجلان من الذين يخافون انعم الله عليهما ادخلوا عليهم الباب فاذا دخلتموه فانكم غلبون٥

اللہ تعالیٰ نے ان دو افراد کی دو خصوصیتیں ذکر فرمائی ہیں:

ا۔ "يخافون" وہ ڈرتے ہیں۔

۲۔ "انعم الله عليهما" اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمت دے رکھی تھی۔

خوف سے مراد مخالفت کا خوف ہے اور نعمت سے مراد کامل ایمان کی نعمت ہے، انتہائی موقعیت شناسی کے ساتھ۔ ان دونوں افراد کی نظر میں کامیابی کا مشکل مرحلہ شہر کے دروازے تک پہنچنا تھا۔ اس کے بعد اور کوئی مشکل نہیں تھی۔ بغیر کسی روک ٹوک کے دروازۂ شہر تک پہنچ جانے کا مطلب دشمن کا غافل ہونا جب کہ جنگی حربوں میں دشمن کو اچانک جا لینے والی حکمت عملی جیسی کوئی حکمت نہیں ہوتی کیونکہ اچانک حملہ دشمن کو حواس باختہ کر دیتا ہے کہ دوڑ دھوپ میں وہ اپنے آدمیوں کے ہاتھوں خود مارے جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کی باتیں اور پھر ان دو افراد کی گفتگو بنی اسرائیل پر اثر انداز نہ ہو سکی بلکہ اس بار تو بڑی بے شرمی سے انہوں نے جواب دیا: کہنے لگے موسیٰؑ تم اور تمہارا خدا جا کر جنگ کرو۔ جب دشمن باقی نہ رہے گا تو ہم شہر میں داخل ہو جائیں گے، گویا وہ بہت بلند ہستی کے مالک تھے جب کہ باقی سب لوگ ان کی خدمت کے لیے تھے ؎

قانون خلقت است کہ باید شود ضعیف
ہر ملتی کہ بہ خورد خواب، خوکند

فطرت کا قانون ہے کہ وہ ملت ضعیف وناتواں ہوجاتی ہے جسے سونے اور کھانے سے فرصت نہ ہو۔

قرآن کریم نے ان کے جواب کو یوں بیان فرمایا ہے:"قالوا یموسیٰ انالن ندخلھا ابداً ما داموا فیھا فاذھب انت وربك فقاتلا انا ھھنا قاعدون"

ذرا تقابل کریں! کہاں وہ (ذلیل) قوم اور کہاں پیغمبر اسلامؐ کے عظیم صحابہ! جب آنحضرتؐ نے جنگِ بدر سے پہلے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کی طرف بڑھیں اور جنگ کریں یا واپس مدینہ چلے جائیں تو سعدؓ ابن معاذ نے کہا: اگر آپ اس دریا (بحرِ احمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں داخل ہوجائیں تو ہم آپ کے پیچھے داخل ہوجائیں گے۔ مقدادؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ہم بنی اسرائیل کی مانند نہیں ہیں کہ آپ سے کہیں کہ آپ اور آپ کا خدا جاکر جنگ کریں۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم تو کہیں گے آپ رب کا نام لے کر آگے چلیں، ہم آپؐ کے پیچھے آتے ہیں۔[1]

یہ وہ حالات تھے جس میں موسیٰؑ اپنی قوم کی ہدایت سے بالکل مایوس ہوگئے تو اپنے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا: ''خدایا! میرے اختیار میں تو میری اپنی ذات اور میرا بھائی ہے! ہمارے اس فاسق قوم کے درمیان جدائی ڈال دے''، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قال رب انی لا املك الا نفسی و اخی فا فرق بیننا و بین القوم الفسقین" اس آیت نے انہیں فاسق کہا ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے پیغمبر کی باتیں نہ مان کر کفر اختیار کیا۔

حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول ہوگئی اور خطاب آیا: ''یہ قوم اس سرزمین میں وج اللہ تعالیٰ کی مادی ومعنوی نعمتوں سے مالا مال ہے، ورود سے محروم ہوگئی۔ لہٰذا اب چالیس سال یہ لوگ بیابانوں میں سرگرداں رہیں گے تاکہ یہ ذلیل نسل ختم ہوجائے اور نئی نسل ان کی جگہ لے لے جو سرزمین مقدس کو فتح کرسکیں۔ بیابانوں کی چالیس سالہ زندگی نے انہیں سخت جان بنادیا۔ اب مشکلات کا مقابلہ کرنے کی تاب ان میں آ گئی۔ اب اُن کی نئی نسل سرزمین مقدس پر وارد ہوسکتی تھی، جیسا کہ فرماتا ہے:"قال انھا محرمة علیھم اربعین سنة یتیھون فی الارض فلا تاس علی القوم الفسقین"

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، ص ۲، ص ۶۱۵، طبع مصر

(۸) بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمیاں!

یہاں تک بنی اسرائیل کے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حالاتِ زندگی کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ اس قوم کی طبیعت میں نافرمانی، سرکشی، ہٹ دھرمی اور ضد جیسی بری خصلتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

اُن کی یہ بُری خصلتیں صرف اس پر ختم نہیں ہوجاتیں جو بیان ہوچکی ہیں بلکہ قرآن نے ان کے متعدد دیگر واقعات بھی نقل کیے ہیں جن کو دیکھ کر انسان کا اس قوم کی بدطینتی وسرکشی کے بارے میں اعتقاد اور بھی پختہ ہوجاتا ہے۔ ان میں ہم صرف تین واقعات کا بطور نمونہ تذکرہ کرتے ہیں:

۱۔ پہاڑ کا ان کے اوپر بلند ہونا۔

۲۔ شہر کے دروازہ میں سے ایک خاص حالت میں داخل ہونا۔

۳۔ اور ہفتہ کے دن کام سے روکنا اور ان کی نافرمانی وقانون شکنی۔

ان موضوعات سے متعلق آیات کا بیان اس طرح ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝۶۳

۲۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۝۶۴ (البقرہ: ۶۳، ۶۴)

۳۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ (البقرہ: ۹۳)

۴۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۝۱۵۴ (نسآء: ۱۵۴)

۵۔ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ

اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ (الاعراف: ۱۷۱)

۶۔ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

۷۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ (البقرہ: ۵۸، ۵۹)

۸۔ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

۹۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

۱۰۔ وَسْــَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

۱۱۔ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

۱۲۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

۱۳۔ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

(الاعراف: ۱۶۱ تا ۱۶۶)

آیات کا ترجمہ

۱۔ یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان باندھا اور کوہ طور کو تم پر بلند کیا، وہ جو کچھ (تورات) ہم نے تمہیں دیا اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو، شاید تم پرہیزگار بن جاؤ۔

۲۔ اس کے بعد تم نے ان ہدایات سے منہ پھیر لیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم خسارا اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے۔

۳۔ یاد کرو اس کو جو تمہارے ساتھ عہد و پیمان ہم نے باندھا اور کوہِ طور کو تم پر بلند کیا۔

۴۔ ہم نے کوہِ طور کو اُن کے پیمان کے مطابق ان پر بلند کیا، اور ہم نے کہا کہ دروازہ میں داخل ہو جاؤ سجدہ کرتے ہوئے، پھر ہم نے حکم دیا کہ ہفتہ کے دن تجاوز نہ کرو اور اس پر بڑا سخت پیمان لیا۔

۵۔ جب ہم نے پہاڑ کو ان پر بلند کیا، گویا وہ ایک سایہ ہے۔ انہوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر آن پڑے گا۔ پس جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو، شاید پرہیزگار بن جاؤ۔

۶۔ جب ہم نے کہا کہ اس شہر (بیت المقدس) میں داخل ہو جاؤ اور اس کی نعمتوں سے جو چاہو کھاؤ، سجدہ کرتے ہوئے دروازہ میں داخل ہو جاؤ اور ''حطہ'' کہو (خدایا! ہمارے گناہ معاف فرما دے) ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور احسان کرنے والوں کے اجر کو زیادہ کر دیں گے۔

۷۔ ان میں سے جو ظالم تھے انہوں نے اس کلام کو بدل دیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا اور ہم نے ظالمین پر آسمان سے عذاب نازل کیا، ان کی اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے۔

۸۔ یاد کرو جب ان سے کہا گیا کہ اس شہر (بیت المقدس) میں سکونت اختیار کرو، اس کی نعمتوں سے جو چاہو کھاؤ اور کہو ''حطہ'' اور سجدہ کرتے ہوئے دروازہ سے داخل ہو جاؤ۔ ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور اچھے کام کرنے والوں کا اجر زیادہ کر دیں گے۔

۹۔ ظالموں نے اس کلام کو بدل دیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ ان کے اس ظلم کے نتیجہ میں ہم نے اُن پر آسمان سے عذاب نازل فرمایا۔

۱۰۔ بنی اسرائیل سے اس ساحلِ سمندر (بحیرہ احمر) پر بنے ہوئے شہر کے بارے میں پوچھو جب اس کے رہنے والوں نے ہفتہ کے دن تجاوز کیا۔ اس دن دریا کی مچھلیاں بڑی تعداد میں ساحل پر آ جاتی تھیں، جب کہ دوسرے دنوں میں اس طرح نہیں آتی تھیں۔ انہیں ہم اسی طرح آزمائیں گے جس طرح وہ نافرمانی کرتے ہیں۔

۱۱۔ (شہر والے تین گروہوں میں بٹ گئے، نافرمان، غیر جانبدار اور خوف کھانے والے) دوسرے گروہ نے تیسرے گروہ والوں سے کہا: تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنا چاہتا ہے یا عذاب دینا چاہتا ہے؟ تیسرے گروہ نے جواب دیا: تا کہ ہم اللہ کے حضور عذر رکھ سکیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پرہیز گار بن جائیں۔

۱۲۔ جب انہوں نے ان نصیحتوں کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی تو جنہوں نے برائی سے روکا تھا ہم نے انہیں نجات دی اور جنہوں نے ظلم کیا تھا انہیں ہم نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے سخت عذاب کیا۔

۱۳۔ جب انہوں نے انکار کیا اس سے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے انہیں کہا دھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ۔

آیات کی موضوعی تفسیر

مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ بیابان میں وفات پا گئے [1] اور بیت المقدس کی فتح بعد میں حضرت یوشعؑ ابن نون کے ہاتھوں انجام پائی۔ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت قرار پائی تھی کہ بنی اسرائیل چالیس سال تک بیت المقدس میں داخلہ سے محروم رہیں۔ جب چالیس سال مکمل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یوشعؑ ابن نون کو وحی کی کہ بیت المقدس کی طرف کوچ کریں اور شہر کو فتح کریں۔ یہ اس وقت ہوا جب پرانی نسل ختم ہو چکی تھی اور نئی نسل ان کی جگہ لے چکی تھی۔ اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ کہنا ہو گا کہ اس کے بعد والی نسل نے بھی یوشعؑ کے زمانہ میں جن ہٹ دھرمیوں کا مظاہرہ کیا یہ انہیں اپنے آباء سے ورثے میں ملی تھیں اور بنی اسرائیل کے خمیر میں پائی جاتی تھیں۔

---

[1] تاریخ کامل ابن اثیر، ج۱، ص ۱۹۸، مطبوعہ دار صادر

اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ ان آیات میں جن واقعات کا ذکر ہوا ہے، یہ خود حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں وقوع پذیر ہوئے ہوں اور حضرت موسیٰؑ کی بیابان میں وفات والی بات درست نہ ہو۔ اصولی طور پر تاریخ کے اس حصہ کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم نے یہ مرحلہ بھی حضرت موسیٰؑ کے حالاتِ زندگی کے طور پر ذکر کیا ہے، بہرکیف جو بھی ہوا اہمیت ان آیات کی توضیح ہی کی ہے۔

جب بنی اسرائیل پر تورات نازل ہوئی تھی تو وہ اس پر عمل کرنے میں سستی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ انہیں ڈرا دھمکا کر تورات پر عمل کرنے پر مجبور کیا جائے۔ لہٰذا اللہ کے حکم سے پہاڑ زمین سے بلند ہو کر ان کے سروں کے اوپر آ گیا، اس طرح کہ وہ سمجھتے تھے کہ پہاڑ اُن پر آن گرے گا۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو "ورفعنا فوقھم الطور" کے جملہ میں بیان کیا ہے۔ اور دوسری جگہ "واذنتقنا الجبل" فرماتا ہے "نتق" کے معنی عربی میں اکھیڑنے اور کھینچنے کے ہیں۔ اگر اس کے ظاہری معنی مراد لیے جائیں تو گویا پہاڑ ان سے کچھ فاصلے پر واقع تھا، وہاں سے اکھڑ کر ان کی طرف اٹھتا گیا، اس طرح وہ سمجھنے لگے کہ ان پر آن گرے گا۔

اس سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے پر مجبور کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ انہیں تورات پر عمل کرنے پر مجبور کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا پہاڑ کے بلند کرنے کا ذکر کر کے فرمایا: "خذوا ما اتینکم بقوۃٍ" یعنی جو کچھ ہم نے تم پر اتارا ہے، اسے مضبوطی سے تھام لو۔

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل فکری و تربیتی لحاظ سے ابھی تک ابتدائی مراحل میں تھے (یعنی ان کا فکری بچپنا تھا)، عذاب و سزا کے بغیر ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے تھے اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اتنی نشانیاں دیکھنے کے باوجود تورات پر عمل سے انکاری ہی رہتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ۝۶۳ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۝۶۴ (بقرہ: ۶۳، ۶۴)

یہاں ہم اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آج کے ترقی یافتہ لوگ جو انبیاء و اولیاء کے معجزات، کرامات اور دوسرے غیبی کاموں کو سائنسی نظریات کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس طرح اہل دانش کے اذہان سے معجزہ کے بارے میں موجود شبہات کو دور کر سکیں، وہ اس آیت کی توجیہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل ایک پہاڑ کے دامن میں رہتے تھے۔ ایک شدید زلزلے میں پہاڑ کے کچھ ٹکڑے اڑتے ہوئے ان کی طرف آنے لگے تو انہوں نے سمجھا کہ ان پر آ گریں گے۔[۱]

لیکن یہ نظریہ آیت میں موجود الفاظ ''رفع'' اور ''نتق'' سے مناسبت نہیں رکھتا۔ پہاڑ کا بلند کرنا اور زلزلے سے اس کے ٹکڑے

---

[۱] شیخ محمد عبدہ، در تفسیر المنار ج ۸، ص ۳۸۵ طبع مصر سنہ ۱۳۶۷ شمسی اور عبدالوہاب نجار در قصص الانبیا، ص ۲۳۱

اڑانا مختلف باتیں ہیں۔ علاوہ اس کے خود قرآن نے پہاڑ کے اٹھانے کی کیفیت بیان فرما دی ہے۔ ''کانہ ظلة'' گویا وہ سائبان کی صورت میں اوپر آ گیا تھا۔

بیت المقدس میں داخلہ

بالآخر بنی اسرائیل حضرت یوشع (حضرت موسیٰؑ کے جانشین) کی سرکردگی میں ارض موعود میں داخل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں اطاعت و پیروی کے جذبہ کو پیدا کرنے کی خاطر انہیں حکم دیا کہ شہر کے دروازے سے خشوع و خضوع کی حالت میں یہ کہتے ہوئے گزریں: ''پروردگارا! ہمارے گناہوں کو بخش دے''۔

تاریخ میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل داخل ہوتے وقت نہ صرف یہ کہ خشوع و خضوع کی حالت میں نہ تھے بلکہ اپنے پیغمبر کے حکم کا تمسخر بھی اڑا رہے تھے اور ''حطہ'' (جس کلمہ کے کہنے کا انہیں حکم ہوا تھا) کہنے کی بجائے ''حنطہ'' کہتے تھے (جس کے معنی گندم کے ہیں) جو ان سے بعید نہیں۔ چونکہ عربی زبان اور عبری زبان بہت قریب قریب ہیں، لہٰذا ممکن ہے اس عربی لفظ کو انہوں نے ادا کیا، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ قِيۡلَ لَهُمُ اسۡكُنُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ وَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ وَقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ
وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا نَّغۡفِرۡ لَـكُمۡ خَطِيۡٓــٰٔتِكُمۡ‌ؕ سَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۶۱﴾
فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ
رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾ (اعراف: ۱۶۱۔ ۱۶۲)

اس آیت کے ظاہری لفظوں سے پتہ چلتا ہے کہ بیت المقدس میں داخلہ کے بعد یہ قوم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی کیونکہ انہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا تھا۔ ''بما کانوا یظلمون'' اور اطاعت پروردگار سے خارج ہو گئے تھے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے: ''بما کانوا یفسقون''۔ (بقرہ: ۵۸)

بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی کی ایک اور مثال!

بیت المقدس میں داخلہ کے بعد بنی اسرائیل مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ ان میں بعض تو ایلہ [1] نامی شہر میں جا کر آباد ہوئے جو ''بحر احمر'' کی ایک بندرگاہ شمار ہوتا تھا۔ تورات کے احکام میں سے ایک حکم یہ تھا کہ ہفتہ کا دن تعطیل کا ہے، اس میں کوئی کام نہ کیا جائے۔ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ دریا کے کنارے رہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہفتہ کے دن موٹی تازی مچھلیاں ساحل کے قریب آ جاتی ہیں جب کہ دوسرے دنوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ دوسرے دنوں میں یا تو موٹی اور بڑی مچھلیاں نظر ہی نہیں آتیں یا کچھ آتی بھی ہیں تو بہت کم تعداد میں ہوتی

---

[1] طبری در مجمع البیان۔ ج ۴، ص ۴۶۱

ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ کیا مچھلیاں کو ہفتے کے دن شکار نہ ہونے کی وجہ سے ساحل پر خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا لہٰذا ساحل کی طرف نکل آتی تھیں یا انہیں اللہ کا حکم ایسے ہی تھا تا کہ اس طرح کچھ لوگوں کا امتحان لیا جا سکے؟ لہٰذا بنی اسرائیل حیلے تلاش کرنے لگے کہ کیسے ان مچھلیوں کو بھی قابو کیا جائے اور شریعت کی مخالفت سے بھی بچ جائیں؟ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ دریا کے ساحل پر بڑے بڑے حوض بنا دیئے اور ان کو نالیوں کے ذریعے دریا سے ملا دیا کہ جب پانی اوپر آئے تو مچھلیوں سمیت حوضوں میں آنا شروع ہو جائے اور جب ''مد'' ختم ہو، جذر (پانی کے اتراؤ) کے وقت حوضوں کے راستے بند کر دیئے جائیں۔ یوں مچھلیاں حوضوں میں پھنس جاتیں اور اتوار کے دن وہ مچھلیاں پکڑ لیتے، یہ سمجھتے ہوئے کہ نہ شریعت کی مخالفت ہوئی ہے اور نہ مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے غافل تھے کہ یہ حرکت دین کو مسخ و تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اگر قانون بنانے والا، اس کا سدِ باب نہ کرے تو قانون نام کی کوئی چیز معاشرہ میں باقی نہیں رہے گی کیونکہ پھر ہر شخص اس کی تاویلیں کر کے حرام کام کو جائز بنا لے گا۔ قرآن نے اس واقعہ کو یوں نقل فرمایا ہے:

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٣﴾ (اعراف: ۱۶۳)

بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے باشندے تین حصوں میں بٹ گئے تھے: ایک تو وہ لوگ تھے جو علی الاعلان مچھلی کا شکار کرتے تھے، دوسرا گروہ اُن کی مخالفت کرتا اور انہیں نصیحت کرتا تھا لیکن تیسرے گروہ والے غیر جانبدار تھے، بلکہ ان نصیحت کرنے والوں کو سمجھاتے تھے کہ تمہیں ان گناہگاروں سے کیا تعلق! لیکن یہ غیر جانبدار لوگ گو یا معاشرے میں امر بمعروف اور نہی از منکر کی اہمیت سے ناواقف تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ معاشرہ میں ہر کوئی خود اپنا ذمہ دار ہے، اسے دوسرے سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیے، حالانکہ معاشرتی زندگی میں ایک معاشرہ کے افراد کی سرنوشت کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اگر کچھ لوگ علی الاعلان قانون توڑتے ہیں اور غلط کام کرتے ہیں تو یقیناً ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اسی گناہ کے مرتکب ہونے لگیں گے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''ان المعصية اذا عمل بها العبد سرا لن يضر بها الا عاملها و اذا عمل بها علانية و لم يغير عليه اضرت بالعامة۔ [1]

یعنی اگر کوئی شخص تنہائی میں برائی کرتا ہے تو اس کا نقصان صرف خود اس کو ہی ہے اور اگر برائی علی الاعلان کرے اور اسے اس کام سے روکا نہ جائے تو یہ عام لوگوں کے لیے نقصان دہ ہوگا، یعنی ایسی صورت میں قانون شکنی عمومی بیماری کی صورت پیدا کر لے گی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ سے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے تھے: ''و ذلك انه يذل بعمله دين الله و يقتدى به اهل عداوة الله''

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۱، باب از ابواب امر بمعروف حدیث ا

چونکہ اس شخص نے اپنے عمل کے ذریعہ دین خدا کو پست کیا اور دشمن خدا اس کی پیروی کریں گے۔ امر بالمعروف ونہی از منکر کی اس اہمیت کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں غیر جانبدار افراد کو نصیحت کرنے والے افراد نے اس طرح جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ ذمہ داری لگائی ہے جس کا انجام دینا ہم پر ضروری ہے تا کہ اللہ کے سامنے ہم عذر رکھتے ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ (اعراف: ۱۶۴)

آیت کے آخری جملے سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک ان کی اصلاح کی اُمید تھی اور اسی توقع کا اظہار نصیحت کرنے والوں نے کیا بھی ہے۔ لیکن ان خرد دماغوں نے اس نصیحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی روش برقرار رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے نصیحت کرنے والوں کو نجات دے دی اور ظلم کرنے والوں کو عذاب سے دوچار کیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف دو جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک وہ جسے نجات دی اور دوسری جسے عذاب کیا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ غیر جانبدار افراد (جو تیسری جماعت تھی وہ) بھی گناہگاروں کی مانند عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ (اعراف: ۱۶۵)

اس سے بعد والی آیت میں عذاب کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ جب انہوں نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ٹھہری کہ وہ دھتکارے ہوئے بندر بن جائیں۔ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾ (اعراف: ۱۶۶)

بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ نصیحت کرنے والی جماعت کا رہنا سہنا ان دوسری دو جماعتوں سے جدا تھا اور عذاب کے نزول کے بعد انہیں اس کی خبر ہوئی۔ بہرکیف آیت میں جو عذاب بیان ہوا ہے اس کے مطابق یہی کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ دونوں جماعتیں انسانوں کی شکلوں پر نہیں تھیں بلکہ بندر بن چکے تھے۔ جو لوگ معجزات وکرامات اور عذاب غیبی کی سائنسی بنیادوں پر توجیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس آیت کے سلسلہ میں بھی اپنا الگ نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شکلوں کے لحاظ سے تو وہ انسان ہی رہے لیکن ان کے قلوب واذہان بندروں والے ہو گئے تھے۔ [۱] یعنی عادتیں اُن میں بندروں والی ہو گئی تھیں نہ کہ صورتیں۔ یقیناً اس قسم کی تاویلیں آیات کے ظاہر سے مناسب نہیں رکھتیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آیت کے ظاہر پر ہی عمل کیا جائے۔

ان لوگوں کا بندر بن جانا ڈارون کے نظریہ سے بھی مربوط نہیں ہے۔ ڈارون تو انسان کی اصل کو بندر جیسا جانور سمجھتا ہے۔ جب کہ یہ حادثہ حضرت داؤد [۲] کے زمانہ سے متعلق ہے اور ڈارون کے نظریہ کا تعلق ماقبل تاریخ سے ہے، بلکہ اسے سے بھی پانچ سو سال پہلے کا ہے۔ لہٰذا اس حادثے کو نظریہ ڈارون کے لیے دلیل نہ سمجھا جائے۔

---

[۱] تفسیر المنار شیخ عبدہ، ج ۱، ص ۳۴۳، مجاہد سے یہ نظریہ نقل کیا گیا ہے۔

[۲] مجمع البیان طبرسی، ج ۲، ص ۴۹۳

قرآن اور بنی اسرائیل کی گائے کا قصہ!

مفسرین نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک آدمی نے اپنے کسی عزیز کو قتل کر دیا اور اس کی لاش کو بنی اسرائیل کے قبائل میں سے ایک اچھے قبیلہ کے راستہ پر ڈال دیا۔ پھر اس مقتول کے انتقام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قاتل کے تعین کی درخواست کی۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ ایک گائے ذبح کریں۔ وہ بڑے حیران ہوئے کہ ان کے سوال کا اس جواب سے کیا تعلق ہے۔ بالآخر سوالات کے ایک سلسلہ کے بعد انہوں نے بڑی مہنگی گائے خریدی، اسے ذبح کیا اور پھر حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ گائے کا کچھ گوشت (ٹکڑا) مقتول پر ماریں تو مقتول زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتلائے گا۔ انہوں نے یہی کیا۔ پس وہ مقتول زندہ ہوا اور کہا کہ میرا قاتل میرے چچا کا بیٹا ہے۔ اس نے وراثت کی خاطر مجھے قتل کیا یا میری بیٹی کے ساتھ شادی کی خاطر! اس طرح اللہ تعالیٰ نے قاتل کو معین فرمایا۔[1]

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَةً ؕ قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۶۷﴾

۲۔ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيۡنَ ذٰلِكَ ؕ فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۳۔ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾

۴۔ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ؕ وَاِنَّآ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۵۔ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِيۡرُ الۡاَرۡضَ وَلَا تَسۡقِى الۡحَرۡثَ ۚ

[1] مجمع البیان، ج ۱ ص ۱۳۴

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

٦۔ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾

٧۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾ (البقرہ: ٦٧ تا ٧٣)

آیات کا ترجمہ

١۔ وہ وقت یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک گائے کی ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا کیا ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ جاہلوں سے ہو جاؤں۔

٢۔ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے پوچھو کہ ہمیں بتائے وہ گائے کیسی ہو؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا کہ خدا فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو جو نہ بوڑھی ہو اور نہ جوان، بلکہ درمیان عمر کی ہو۔ پس وہ کام کرو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

٣۔ انہوں نے کہا خدا سے پوچھو کہ ہمیں بتائے اس گائے کا رنگ کیسا ہو؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس گائے کا رنگ زرد ہو، گہرا زرد (سنہری) جو دیکھنے والوں کو خوش کرے۔

٤۔ انہوں نے پھر کہا اللہ سے پوچھو کہ اس گائے کی وضاحت کرے گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے۔ انشاءاللہ ہم ہدایت پا جائیں گے۔

٥۔ موسیٰؑ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ سدھائی ہوئی ہے جو زمین میں کھیتی باڑی کرتی ہو (ہل چلائے) اور نہ پانی سے زمین سیراب کرے۔ (پانی کھینچنے میں کام آئے)۔ صحیح وسالم ہو، اس میں کوئی دوسرا رنگ نہ ہو۔ کہنے لگے اب آپ نے صحیح بات کہی ہے۔ پس انہوں نے گائے ذبح کی جب کہ قریب تھا (کہ بہانے کرتے اور پھر بھی گائے) ذبح نہ کرتے۔

۶۔ جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور تم اپنے آپ کو اس سے بری کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اُسے ظاہر کر دیا جسے تم چھپاتے ہو۔

۷۔ پس ہم نے کہا: مقتول کو گائے کے ایک ٹکڑے سے مارو، اور مقتول زندہ ہو گیا)۔ اللہ تعالیٰ اس طرح مردوں کو زندہ فرماتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، اگر تم غور کرو۔

آیات کی موضوعی تفسیر

یہ سورہ بقرہ ۶۷ سے آیت ۷۳ تک کی تمام آیات ایک ہی داستان کا ذکر کر رہی ہیں۔ اوپر ان کی شانِ نزول بیان ہو چکی ہے۔ کسی نے بنی اسرائیل کا ایک آدمی قتل کر کے اس کی لاش ایک دوسرے قبیلہ کے محلہ میں پھینک دی جس کی وجہ سے وہ قبیلہ اس قتل سے متہم ہو گیا جب کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے قتل نہیں کیا۔

اس اعتبار سے تو قتل کا ماجرا بھی قرآن میں ذکر ہونا چاہیے تھا اور آیت ۷۲ سے یوں بات شروع ہوتی: واذقتلتم نفسا فادرا تم فیها وسئلتم موسیٰ ان یعین القاتل فقال موسی ان اللہ یامرکم ان تذبحوا...

حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے قتل کے ماجرے کا بالکل تذکرہ ہی نہیں کیا، ابتدا ہی سے موسیٰ و بنی اسرائیل کے مذاکرات کا ذکر کیے ہیں، اس کے بعد قتل کا محرک ذکر کیا ہے (حالانکہ محرک پہلے ذکر ہونا چاہیے تھا)۔ اس کا موخر ہونا موجب بنا ہے کہ بعض مفسرین اس جملے "واذا قتلتم نفسا" کو ایک دوسری داستان سے متعلق خیال کرتے ہیں۔ گویا ان سابقہ آیات میں دو داستانیں بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب کیوں اختیار کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے اور بعد والی آیات میں بنی اسرائیل کی بری عادتوں کا تذکرہ ہے کہ وہاں اچھے اور درست کار لوگ نہیں تھے، بلکہ ہمیشہ انبیاء کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہنا ان کا شیوہ تھا۔ مثلاً ان آیات سے پہلے چند آیات میں خطاب اس طرح ہوتا ہے:

انکم ظلمتم انفسکم باتخاذ کم العجل

واذقلتم یموسیٰ لن نؤمن لك حتی نری اللہ جهرة

فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لهم

واذقلتم یموسیٰ لن نصبر علی طعامٍ واحدٍ

واذا خذنا میثاً قکم ورفعنا فوقکم الطور

ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت

ان آیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ محورِ سخن بنی اسرائیل کی افسوس ناک داستان کا بیان ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حضرت موسیٰؑ و بنی اسرائیل کے مذاکرات کا تذکرہ پہلے کیا تا کہ یہ ان کی نافرمان وسرکش طبیعت پر شاہد ہو کہ وہ کیسے حیلے بہانوں کے ذریعہ ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے تھے اگر چہ بالآخر مجبوراً اس کام کو انجام دینا پڑتا تھا۔

جب قرآن نے ان کی ہٹ دھرمی ظاہر کرنے کے لیے داستان کا یہ حصہ بیان کر دیا تو اب اصل سبب کو بیان فرمایا ہے کہ ''ذبح بقرہ'' کا حکم کیوں دیا گیا! ارشاد ہوتا ہے: واذقتلتم نفساً فادار اتم ثم فیھا واللہ مخرج ما کنتم تکتمون یعنی جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور سب اس قتل سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے رہے تھے، اور تم نے موسیٰؑ سے سارا واقعہ کہہ سنایا تو اس نے تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔تم نے مختلف سوالات کرنے کے بعد گائے ذبح کی۔ پس جان لو خدا ان تمام چیزوں کو ظاہر کرنے والا ہے جنہیں تم چھپا رہے تھے۔

اس کے بعد بیان ہوتا ہے کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے اس خفیہ معاملے کو ظاہر کر دیا: فقلنا اضربوہ ببعضھا کذلك یحی اللہ الموتی ویریکم ایتہ لعلکم تعقلون ہم نے کہا کہ مقتول کو گائے کے گوشت کا کوئی ٹکڑا مارو۔(انہوں نے ایسا کیا جس کے نتیجہ میں مردہ زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل کا پتہ بتلایا)

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ آیت میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ انہوں نے مقتول پر گوشت کا ٹکڑا مارا اور وہ زندہ ہو گیا، پھر یہ مطلب کہاں سے نکلتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خود آیت میں غور کرنے سے نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے کہ چونکہ جب بھی کسی مطلب کو کسی لفظی یا حالات کے شاہد و قرینہ کے ذریعے سمجھا جا سکے تو قرآن اس مطلب کو ذکر نہیں کرتا۔مثلاً قوم موسیٰؑ کے ''استسقا'' (پانی طلب کرنے) کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: واذا ستسقی موسی لقومہ فقلنا اضرب بعصاك الحجر فانبجست منہ اثنتا عشرۃ عینا'' یعنی جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔اچانک اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے''۔اس آیت میں یقیناً ایک کلام مقدر ہے کیونکہ درمیان میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ اس نے مارا یعنی (فضرب) فانبجست سے پہلے یہ جملہ ہونا چاہیے تھا۔لیکن چونکہ بیان مابعد سے خود معلوم ہو جاتا ہے لہٰذا اسے اس وجہ سے حذف کر دیا گیا۔

حضرت یوسفؑ کی داستان میں تو اس طرح کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ ہمارے مورد میں بھی جب ''فقلنا اضربوہ'' کہا تو بعد والے جملے ''فضربوہ ببعضھا فحی و عین قاتلہ'' حذف کر دیئے گئے کیونکہ سیاق وسباق سے اُن کا خود ہی پتہ چل جاتا ہے۔

قرآن مجید اس آیت کے آخر میں ایک اصولِ اعتقادی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کذلك یحی اللہ الموتی و یریکم ایتہ'' یعنی جب تم (بنی اسرائیل) نے اُس دنیا میں مقتول کو زندہ ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پھر جان لو کہ قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ مردوں کو اسی طرح زندہ فرمائے گا اور تمہیں مردوں کے زندہ ہونے میں شک نہیں ہونا چاہیے۔

یہ تھا ان آیات کے مطالب کا بیان۔ یہاں علامہ طباطبائیؒ ایک بڑے لطیف نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اس داستان سے

پہلے کی آیات میں خطاب خود بنی اسرائیل سے ہے یہاں تک کہ قتلِ نفس میں بھی انہیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "واذ قتلتم نفسًا" اسی طرح بعد کی آیات میں بھی خطاب انہی سے ہے۔لیکن جب گائے ذبح کرنے کی بات شروع کی تو قرآن مجید میں خود پیغمبر اسلامؐ مخاطب ٹھہرے۔"واذ قال موسیٰ لقومه" (یاد کرو) اس وقت کو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بنی اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کا یہ حصہ موجودہ تورات میں نہیں ہے اور شاید پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں بھی یہود کے پاس جو تورات تھی اس میں یہ حصہ موجود نہیں تھا۔لہٰذا خطاب خود پیغمبر اسلامؐ سے ہوا کہ وہ متوجہ ہوں، نہ کہ بنی اسرائیل سے کیونکہ ان کو اس کی اطلاع ہی نہ تھی کہ وہ اس پر توجہ کرتے۔[1]

یہاں ایک اور نکتہ سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مردہ کو زندہ کرنے کی خاطر بنی اسرائیل کو یہ حکم کیوں دیا کہ ایک گائے کو ذبح کریں۔شاید اس میں یہ نکتہ مضمر ہو کہ ان لوگوں کے نزدیک قربانی پیش کرنا انسان کی اللہ تعالیٰ کی قربت کے لیے بلند ترین کام سمجھا جاتا تھا یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو کہ قبل اس کے کہ وہ لوگ اللہ سے اپنے اس مشکل مسئلہ کا حل طلب کریں ایک گائے کی قربانی دیں تاکہ اس کے عوض ان کی دعا قبول ہو۔[2]

یہاں تک ہم نے آیات کی تفسیر آیات میں موجود قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے پیش کی۔لیکن وہ لوگ جو ہمیشہ معجزات، کرامات اور دوسرے ماوراء مادی امور کو سائنسی اصولوں پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے ان آیات کی تفسیر اور طرح سے کی ہے جس کے مطابق آیات سے کوئی بات عادت و معمول کے خلاف نہ سمجھی جا سکے۔اب ہم اس نظریہ کا یہاں جائزہ لیتے ہیں جس کو شیخ محمد عبدہ پیش کرتے ہیں۔

آیات کی تفسیر میں شیخ عبدہ کا نظریہ

علم کی پیاس اور اس کی تلاش بہت ہی اچھی صفت ہے بلکہ حدیث نبویؐ کے مطابق ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ گہوارہ سے قبر تک علم حاصل کرتا رہے۔لیکن علم زدگی اور علم کی طلب ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔جہاں علم کی طلب کمال ہے، وہاں علم زدگی بہت بڑی مصیبت ہے۔علم کی طلب موجب بنتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی جدید ترین نشانیوں کو اس کائنات میں پاتا چلا جاتا ہے لیکن جو لوگ علم زدہ ہیں، یعنی ان کی نظر میں ان کا اپنا معیارِ علم ہے وہ کائنات کے ماورأ مادی مسائل کو بھی اپنی ناقص و محدود معلومات کے سانچوں میں جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔لہٰذا وہ رفتہ رفتہ ایمان بہ غیب سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

اسلامی دنیا میں شیخ عبدہ کی علمی خدمات سے انکار بے شک نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی علمی لغزشوں کو یکسر

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱ ص ۲۰۲

[2] مجمع البیان، ج ۱ ص ۱۳۷

نظر انداز کر دیا جائے خصوصاً ایسی صورت میں کہ جب دوسرے انہی علمی لغزشوں کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانے کے درپے ہو جائیں۔ شیخ عبدہ بھی علم زدہ تھے، جس کی وجہ سے وہ اپنی تفسیر میں جگہ جگہ عالمِ غیب کے مسائل کو عام عادی معیاروں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ انہیں عجیب وغریب نہ سمجھ لیا جائے۔ ان آیات میں بھی موصوف تورات پر بھروسہ کرتے ہوئے کہتے کہ ممکن ہے جملہ "**اذقتلتم نفسًا**... **فقلنا اضربوہ ببعضها**" سے مراد وہی ہو جو تورات میں آیا ہے۔

تورات کے سفر تثنیہ فصل ۲۱ میں بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے کہ جب کسی قبیلہ میں کوئی مقتول پایا جائے اور قبیلہ والوں کو اس کے قتل سے متہم کیا جائے تو قبیلہ والے اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ کار پر عمل کریں۔

قبیلہ کے بزرگ ایسا بچھڑا تلاش کریں جس نے زمین میں ابھی تک ہل نہ چلایا ہو پھر اُسے ایسے درہ میں لے جائیں جہاں مسلسل پانی بہتا رہتا ہو اور اس زمین پر کبھی زراعت نہ ہوئی ہو۔ یہاں بچھڑے کی گردن توڑی جائے، قبیلہ کے بزرگ اپنے ہاتھ بچھڑے کی ٹوٹی ہوئی گردن پر دھوتے جائیں اور یہ جملہ کہتے جائیں: ”خدایا ہم نے یہ خون نہیں بہایا۔ اگر ہم نے بہایا ہے تو ہماری آنکھیں اندھی ہو جائیں۔

جو شخص یہ عمل کرے وہ قتل سے بری الذمہ ہو جائے گا اور جو اس کام سے ہچکچائے وہی قاتل ہوگا۔

شیخ عبدہ اس کے بعد کہتے ہیں کہ آیت "**و کذلك یحی الله الموتی**" کا مطلب یہی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ مزید خونریزی و قتل کو روک دیتا ہے، جیسا کہ آیت "**ولکم فی القصاص حیوة**" کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص سے قصاص لینا دوسروں کی عبرت کا موجب بن جاتا ہے تا کہ وہ دوبارہ کسی کو قتل کرنے کا خطرہ مول نہ لیں۔ [1]

یہ نظریہ اگر تورات کے موافق ہو پھر بھی قرآن مجید کی آیات کے سراسر منافی ہے کیونکہ آیات میں "**فقلنا اضربوہ ببعضها**" اور "**ویریکم ایته**" جیسے جملے ظاہری اعتبار سے اس سے مناسبت نہیں رکھتے۔

آیت میں حکم ہے کہ گائے کا کچھ گوشت مقتول کے بدن پر ماریں جب کہ عبدہ نے تفسیر میں اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ نیز قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اپنی نشانیاں دکھلاتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ہم مردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہیں جب کہ مندرجہ بالا تفسیر میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جسے خدا ظاہر فرمادے۔ تفسیر المنار کے مؤلف (سید قطب) جب آیت "**ویریکم ایته**" پر پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اُن کے استاد (شیخ عبدہ) کا نظریہ اس سے مناسبت نہیں رکھتا تو وہ لکھتے ہیں کہ اس جملے کے بارے میں استاد سے تفسیر کے مطالب مجھے معلوم نہیں، بلکہ اس جملہ کے علت ہونے کے بارے میں انہوں نے ایسے مطالب ذکر فرمائے ہیں جو مشہور تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر المنار، ج ۱ ص ۳۵۱

قارون۔۔۔ایک متکبر دنیا دار!

حضرت موسیٰؑ کی زندگی اس لحاظ سے بڑی عجیب تھی کہ اگر دوسرے انبیاء کو مال و دولت، طاقت اور دھوکہ وفریب کے کسی ایک مظہر سے مبارزہ کرنا پڑا تو موسیٰؑ کو تینوں سے سابقہ پڑا۔حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے وزیر ہامان کو جو شیطانی قدرت کے مظہر تھے، دریائے نیل میں غرق کر کے فرعونیت کی جڑیں کاٹ دیں، دھوکہ وفریب کے مظہر سامری سے یوں مبارزہ و جہاد کیا کہ سب پر اس کی بد دیانتی اور دھوکے کے راز کو واضح کر دیا کہ تم دھوکہ میں آ گئے ہو۔لہٰذا سب اپنے اعمال پر شرمندہ ہوئے۔

بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ کی تبلیغات پختہ ہونے لگیں۔کچھ لوگ ایمان لے آئے اور کچھ لوگ ایمان لانے کے متعلق سوچنے لگے کہ اچانک مال و دولت کے مظہر کے طور پر قارون میدان میں کود پڑا اور سادہ لوح افراد کے دل جیتنے میں کامیاب ہو گیا جو نادانستگی میں اس کے مقام و منزلت کی آرزو کرنے لگے۔اس بار بھی اللہ نے موسیٰؑ کی حمایت کے لیے غیب سے مدد کی اور زمین نے قارون کو اس کی دولت اور پیرو کاروں سمیت نگل لیا، حتیٰ کہ ان میں کچھ باقی نہ بچا۔

حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اس مرحلہ سے متعلق اب ہم آیات اور ان کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْۤاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۝۷۶

۲۔ وَابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۝۷۷

۳۔ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ۝۷۸

۴۔ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ
لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾
۵۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾
۶۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾
۷۔ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ
لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾
۸۔ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا
فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾
۹۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ
عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ (القصص:۷۶ تا ۸۴)

آیات کا ترجمہ

۱۔ قارون موسیٰؑ کی قوم سے تھا۔ اس نے اپنی بے انتہا ثروت کے باعث ان پر سرکشی کی۔ ہم نے اُسے خزانے اس مقدار میں دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور جماعت مشکل سے اٹھا پاتی تھی۔ جب اس کی قوم نے اس سے کہا مغرور ہو کر خوشی نہ دکھاؤ، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنی خوشی پر مغرور ہوں۔

۲۔ جو دولت تجھے اللہ نے دی ہے اس سے آخرت کا گھر طلب کر، دنیا سے اپنے حصے کو مت بھول، لوگوں سے اسی طرح اچھائی کر جیسے اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ اچھائی کی ہے، زمین میں فساد برپا نہ

کر۔ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

۳۔ اس نے (لوگوں کی خیر خواہی کے جواب میں) کہا کہ میں نے یہ دولت اپنے علم کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے وقتوں میں ایسے لوگوں کو ہلاک کر دیا جو قوت و مال دونوں لحاظ سے اس سے زیادہ تھے مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ وہ ایک دن اپنی زیب وزینت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے ظاہر ہوا تو دنیا خواہ افراد کہنے لگے کاش ہمارے پاس بھی قارون جیسی دولت ہوتی۔ اسے تو دولت کا بہت بڑا حصہ ملا ہے۔

۵۔ ان سے اہل علم نے کہا کہ افسوس ہے تم پر کیونکہ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے تو اُن کا ثواب اللہ بہتر دے گا اور وہ بھی صبر کرنے والوں کو ہی ملے گا۔

۶۔ ہم نے اس کو اس کی دولت اور اس کے گھر کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا، کوئی جماعت اللہ کے علاوہ اس کی مدد نہ کر سکی اور کسی اور کی طرف سے بھی کوئی مدد نہ ہوئی۔

۷۔ وہ جو کل خواہش کر رہے تھے کہ ان کے پاس قارون جیسی ثروت ہو، پیچھے ہٹ گئے اور کہنے لگے کہ افسوس ہم پر سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے وسیع رزق دیتا ہے اور چاہے تو روک بھی لیتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم بھی زمین میں دھنس چکے ہوتے۔ گویا کافر کبھی فلاح نہیں پاتے۔

۸۔ یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے قرار دیں گے جو زمین میں تکبر نہ کریں اور فساد برپا نہ کریں اور انجام کار بس متقیوں ہی کا ہے۔

۹۔ جو نیک کام کرے گا اسے اس سے بہتر اجر دیا جائے گا اور جو برائی کرے گا تو برائی کرنے والوں کو جزا نہیں دی جائے گی مگر اتنی ہی جتنا انہوں نے عمل کیا ہوگا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

پہلی آیت میں قارون کو حضرت موسیٰؑ کی قوم سے شمار کیا ہے۔فرماتا ہے:"ان قارون کان من قوم موسیٰ"مورخین نے اُسے حضرت موسیٰؑ کا چچا زاد قرار دیا ہے۔ وہ بڑا خوبصورت، سرخ وسفید رنگت والا شخص تھا اور تورات کو بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتا تھا۔لیکن در حقیقت سامری کی طرح منافق تھا۔[1] جب بنی اسرائیل مصر میں تھے تو فرعون کے لیے بنی اسرائیل میں جاسوسی کرتا تھا۔

بعض آیات سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کے سلسلہ میں فرعونیوں کی مدد کرتا تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَہَامٰنَ وَقَارُوۡنَ فَقَالُوۡا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِالۡحَقِّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوا اقۡتُلُوۡۤا اَبۡنَآءَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ وَاسۡتَحۡیُوۡا نِسَآءَہُمۡ ؕ وَمَا کَیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

(مومن: ۲۳ تا ۲۵)

یعنی''ہم نے موسیٰؑ کو اپنی آیات و معجزات اور روشن حجت کے ساتھ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا۔(انہوں نے جھٹلایا) انہوں نے کہا کہ یہ جھوٹا جادوگر ہے جب ان کے پاس ہماری طرف سے مکمل حق کے ساتھ آیا تو کہنے لگے کہ باایمان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کردو اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دو۔لیکن کافروں کے حیلے صرف گمراہی ہیں (نتیجہ بخش نہیں)

اس آیت کے جملہ"فقالوا اقتلوا"سے پتہ چلتا ہے کہ قارون بہت اونچی سطح پر فراعنہ کا ساتھ دیتا تھا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کی سازش میں مکمل طور پر شریک تھا۔ جہاں قرآن مجید نے زمانہ کے ظالم و جابر افراد اور ان کی ہلاکت ونابودی کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کی تباہی کی خبر دی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَقَارُوۡنَ وَفِرۡعَوۡنَ وَہَامٰنَ ۟ وَلَقَدۡ جَآءَہُمۡ مُّوۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا کَانُوۡا سٰبِقِیۡنَ ﴿۳۹﴾ فَکُلًّا اَخَذۡنَا بِذَنۡۢبِہٖ ۚ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِ حَاصِبًا ۚ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اَخَذَتۡہُ الصَّیۡحَۃُ ۚ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ خَسَفۡنَا بِہِ الۡاَرۡضَ ۚ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اَغۡرَقۡنَا ۚ (عنکبوت: ۳۹ تا ۴۰)

---

[1] بحارالانوار، ج ۱۳، ص ۲۵۴، تفسیر ثعلبی سے نقل ہوا۔

"موسیٰؑ روشن دلیلوں کے ساتھ قارون، فرعون اور ہامان کی طرف آئے۔ ان لوگوں نے زمین میں تکبر کیا لیکن وہ ہم پر سبقت کرنے والے نہیں تھے۔ (یعنی ہمارے عذاب سے فرار نہ کر سکتے تھے)۔ لہٰذا بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو دریا میں غرق کر دیا۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ مصر میں فساد کی جڑ یہی تین شخص تھے جن میں دو قبطی اور ایک اسرائیلی تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب وہ فرعون کے ساتھ اس حد تک قرب رکھتا تھا اور اس کے جرائم میں شریک تھا تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تورات بڑی خوش الحانی سے پڑھتا تھا اور کیسے وہ اپنے قبیلہ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر کی سرزمین سے نکل آیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس نے اپنے چہرے پر منافقت کی نقاب چڑھا رکھی تھی اور فریب و دھوکہ کے ذریعے دونوں طرف روابط رکھے ہوئے تھا اور شاید اس کا مصر سے بنی اسرائیل کے ساتھ جانا بھی جاسوسی کی غرض سے ہی تھا، اگرچہ ظاہراً کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا تاہم وہ فرعون کا وزیر خزانہ بھی رہ چکا تھا۔[1] شاید قرآن نے جو اس کی عظیم دولت کا ذکر کیا ہے وہی ہو جو اس کے ہمراہ مصر سے نکلتے ہوئے تھے اور پھر کیمیا گری کے ذریعے سے مزید ثروت حاصل کر لی ہو۔[2] قرآن نے اس کی دولت کی کثرت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

واتینه من الکنوز ما ان مفاتحه لِتنوٓءُ بالعصبة اولی القوة

مفاتح مفتح کی جمع ہے اور مفاتیح مفتاح کی۔ مفتاح کے معنی کنجی کے ہیں، لیکن کیا مفاتح جو مفتح کی جمع ہے کے معنی بھی یہی ہیں (جیسا کہ طبری نے کہا ہے) یا اس کے معنی خزانہ کے ہیں جو عموماً بڑے مضبوط، نہ ٹوٹنے والے صندوقوں میں رکھا جاتا ہے؟ اور تنوٓءُ از باب ناءَ یَنُوْءُ ہے جس کے معنی مشکل سے کسی چیز کا اٹھانا ہے اور عصبہ دس سے پندرہ تک کے درمیان افراد کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔

اگر مفتح کے معنی خزانہ کے ہوں تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا خزانہ اتنا تھا کہ کم از کم دس آدمی مل کر اسے مشکل سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ لیکن اگر مفتح کے معنی کنجی کے ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ خزانہ اتنے زیادہ صندوقوں میں بھرا ہوا تھا کہ ان کی چابیاں ایک جماعت (کم از کم دس نفر) مشکل سے اٹھا پاتی تھی۔ لیکن پہلی تفسیر ہماری نظر میں زیادہ صحت کے قریب معلوم ہوتی ہے۔

وہ لوگ جن کے پاس خداداد مال و دولت ہوتی ہے اور کوئی ذاتی کمال نہیں ہوتا بلکہ مال و دولت کے بغیر عام انسان کی حیثیت رکھتے ہیں، عموماً مالِ دنیا پر مغرور و متکبر ہو جاتے اور اس پر اترانے لگتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اُسے خدا کی نعمت سمجھ کر اس پر خدا کا شکر ادا کریں وہ اسے اپنی صلاحیتوں کا مرہونِ منت سمجھتے ہیں اور دولت کے حصول کو اپنی طرف نسبت دیتے ہیں نہ کہ خدا کی طرف۔ یہی حالت قارون کی تھی۔

اس اثناء میں بنی اسرائیل کے کچھ عقل مند افراد نے قارون کو بڑی پر مغز نصیحتیں بھی کیں اور کہا:

---

[1] مجمع البیان، ج ۴، ص ۵۲۱

[2] بحار الانوار، ج ۱۳، ص ۲۴۹ تفسیر قمی سے نقل کیا گیا۔

۱۔ مال ودولت پر مت اترا۔اس طرح تو خدا کو بھول جائے گا۔"لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین"

۲۔ مال دنیا اچھی چیز ہے بشرطیکہ اس سے آخرت کو حاصل کیا جائے نہ کہ اسے صدفِ زندگی بنا لیا جائے:"وابتغ فیما اتاك اللہ الدار الاخرۃ"

۳۔ انسان کا حصہ اورلطفِ زندگی اس دنیا سے بہت محدود ہے۔کوئی انسان اس دنیا میں ہمیشہ کے لیے نہیں آیا بلکہ مختصر سی مدت کے بعد سب کو یہاں سے رختِ سفر باندھنا پڑتا ہے:"ولا تنس نصیبك من الدنیا"

۴۔ یہ مال و دولت تجھے اللہ نے عطا فرمایا ہے۔اس پر اللہ کا شکر اس طرح ادا کر کہ اس سے لوگوں کی خدمت کر:"واحسن کما احسن اللہ الیك"

۵۔ فتنہ وفساد بہت عظیم گناہ ہیں۔ایسا نہ ہو کہ مال ودولت کے ذریعہ زمین میں فساد پیدا کرے:"ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین"

قارون نے ان مفید مشوروں کے عوض جن سے اچھا سبق حاصل کرسکتا تھا،دورِ عمل دکھائے:

قارون کے دورِ عمل

الف قارون نے جواب دیا کہ یہ مال ودولت کسی سے حاصل کی ہوئی نہیں بلکہ اسے میں نے اپنی عقل وفکر سے حاصل کیا لہٰذا اس کا مکمل اختیار خود مجھے ہی حاصل ہے کسی دوسرے کو نہیں حتیٰ کہ......

بالفاظِ دیگر یوں کہہ لیں کہ مومنین نے اس سے "فیما آتاك اللہ"(جو کچھ تجھے خدا نے دیا ہے) کہا تو اس نے جواب دیا:"انما اوتیتہ علی علمٍ عندی"(اسے میں نے اپنے علم وفضل سے حاصل کیا ہے)۔اللہ تعالیٰ سے بے خبر دنیادار لوگوں کی سوچ یہی ہوتی ہے۔

ایک اور آیت میں ان ہی جیسوں کا ایسا ہی ایک جملہ اس طرح ذکر ہوا ہے:فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ (زمر:۴۹) جب بھی (ناشکرے) انسان کو کوئی تکلیف ومصیبت پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے(تاکہ ہم اس کی تکلیف کو دور کردیں) پھر جب ہم اسے نعمت دے دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ نعمت تو مجھے میرے علم وعقل کی وجہ سے دی گئی ہے۔(یعنی میں نے اسے اپنی عقل کے ذریعے حاصل کیا ہے)۔

ظاہری طور پر اس قسم کے لوگ ابدیت ودوام کے قائل ہوتے ہیں۔وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مال ودولت کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اپنی دولت کے ذریعہ ہر قسم کی مصیبت کو اپنے سے دور کریں گے۔لہٰذا قرآن مجید کے بیان کے مطابق قارون کو اس سے پہلی اقوام کی ہلاکتوں کے تذکرے سنائے گئے اور پوچھا گیا کہ کیا قارون نہیں جانتا کہ جو اس سے پہلے کی قومیں دولت و ثروت دونوں میں اس سے زیادہ تھیں جنہیں اللہ نے ہلاک کردیا اور ہلاکت کے وقت مجرمین کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جاتا ہے،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اولم یعلم ان الله قد اهلك من قبله من القرون من هو اشد منه قوة واکثر جمعاً ولا یسئل عن ذنوبهم المجرمون۝

سورہ زمر میں اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان فرمایا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

قَدۡ قَالَهَا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ۝۵۰ (زمر: ۵۰)

''یہ بات (کہ مال ودولت ہمارے علم کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوا ہے) ان سے پہلے مشرکین نے بھی کہی تھی لیکن ان کا مال انہیں نجات نہ دلا سکا''

آیت میں جملہ ''ولا یُسئل عن ذنوبهم المجرمون''ایک سنت الٰہی کا بیان ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت کا حال انسانی عدالتوں جیسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا گناہ ثابت ہونے کا منتظر رہے یا مجرم خود اعتراف کرے تب اُسے عذاب کرے، بلکہ اللہ اپنے علم کے ذریعے انہیں سزا دے دیتا ہے، اس کو خود مجرموں کے اعتراف کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ب قارون کا دوسرا ردِ عمل یہ تھا کہ ایک دن اس نے اپنے کارندوں اور ملازموں کے ہمراہ اپنے جاہ وحشم کا مکمل مظاہرہ کیا۔اس کے مال اورنوکروں کی تعداد میں مبالغہ کی حد تک تاریخ وتفسیر میں بیانات وارد ہوئے ہیں لیکن ہم اُن کے قابل یقین نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں۔

قارون کا مالی مظاہرہ موحدین کے ایمان کی تقویت اور کمزور ایمان والوں کے لیے تعریف کا سبب بنا۔قرآن کریم اس کا تذکرہ اس طرح فرماتا ہے کہ جب قارون نے مال کی نمائش کی تو دنیا دار لوگ یہ خواہش کرنے لگے کہ کاش ہمارے پاس بھی قارون جیسی مال ودولت ہوتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فخرج علی قومه فی زینته قال الذین یریدون الحیوة الدنیا یلیت لنا مثل مآ اوتی قارون انه لذوحظ عظیم۝

یہ لوگ جو قارون جیسا ہونے کی خواہش کررہے تھے ان کے پاس بھی مال ودولت کی کمی نہیں تھی،فرق صرف یہ تھا کہ قارون کو ایسے مواقع میسر آ گئے تھے جو انہیں میسر نہ آ سکے تھے۔ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک دوسرا حقیقت پسند گروہ جسے قرآن نے ''اوتوا العلم'' کی خصوصیت سے موصوف فرمایا ہے انہیں نصیحت کرنے لگا کہ تم پر بڑا افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھا اجر اس کے لیے ہے جس نے نیک کام کیے جو اس مال وجاہ سے بہتر ہے اور یہ نکتہ صابرین کے علاوہ کوئی نہیں پا سکتا۔ارشاد ہوتا ہے:

و قال الذین اوتوا العلم و یلکم ثواب اللہ خیر لمن امن و عمل صالحًا

ولا یلقھا الا الصبرون٥

ان مومنین کی قارون کو ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ زمین پر فساد برپا نہ کرے کیونکہ اللہ مفسدین کو پسند نہیں فرماتا: "ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین٥

زمین پر فساد کی کئی قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان دولت کے زور پر کسی کی عزت وآبرو سے کھیلے۔ قارون کے اعمالِ قبیحہ میں سے ایک فعل یہ بھی تھا۔

قارون حضرت موسیٰؑ کو اپنے راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا کیونکہ وہ مسلسل اس کے مال سے زکوٰۃ کا حکم دیتے رہتے تھے، لیکن وہ دنیا پر اس قدر فریفتہ تھا کہ فریضہ مالی کے طور پر انتہائی معمولی سا مال خرچ کرنے پر بھی راضی نہیں تھا۔ پس اس نے حضرت موسیٰؑ کو ان کے مقام ومنزلت سے گرانے کی خاطر ایک سازش کی، وہ اس طرح کہ اس نے ایک بدکار عورت کو دو ہزار دینار دے کر تیار کیا کہ وہ موسیٰؑ کو اپنے ساتھ بدنام کرے اور بنی اسرائیل کے عمومی مراکز میں اس کا تذکرہ کرے۔ اس نے بھی زر وجواہر کی دو تھیلیاں لے کر یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ لیکن جب گھر پہنچی تو اسے اپنی اس شرمناک حرکت پر پشیمانی ہوئی اور سوچنے لگی کہ میں نے بہت گناہ کیے ہیں، اب یہی کسر رہ گئی تھی کہ پیغمبر خدا پر تہمت لگاؤں۔ لہٰذا وہ اٹھی اور بنی اسرائیل کا جہاں اجلاس ہو رہا تھا وہاں جا کر اس نے قارون کی سازش سے سب کو مطلع کر دیا کہ اے لوگو! سن لو کہ قارون نے مجھے یہ دو تھیلیاں دی ہیں کہ میں موسیٰؑ کو (نعوذ باللہ) بدکاری سے متہم کروں۔ میں خدا کی پناہ مانگتی ہوں کہ نبی خدا کو متہم کروں۔ اس کے بعد شاہد کے طور پر اس نے وہ دو تھیلیاں دکھائیں جن پر قارون کی مخصوص مہر لگی ہوئی تھی۔ اس طرح دشمنِ خدا کی سازش نبی خدا کے خلاف نقش بر آب ہو گئی۔

اب وہ وقت آ گیا تھا کہ سنتِ الٰہی "ولا یسئل عن ذنوبھم المجرمون" پوری ہو جائے اور اس بد بخت انسان کو ہلاک و نابود کر دیا جائے۔

قارون اور اس کے خزانوں کو زمین کا نگل لینا

اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ قارون اور اس کے گھر کو جو اس کے خزانے کا مرکز تھا نگل لے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس نے جتنی بھی واویلا و فریاد کی کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فخسفنا بہ وبدارہ الارض فما کان لہ من فئۃٍ ینصرونہ من دون اللہ و ما کان من المنتصرین

شاید مال سمیت اس مخصوص عذاب کی علت یہ ہو کہ اگر صرف قارون کو عذاب کیا جاتا اور اس کے خزانہ پر قبضہ کر لیا جاتا تو تہمت کا موجب بن سکتا تھا۔ نادان افراد یہ سوچنے لگتے کہ موسیٰؑ نے قارون پر بد دعا ہی اس لیے کی تھی کہ اس کی بے پناہ دولت پر قبضہ جما

سکے۔ لہٰذا اس وجہ سے قارون اپنے تمام مال و دولت سمیت زمین میں دھنس گیا اور دوسروں کے لیے عبرت بن گیا جو بڑے عزم کے ساتھ یہ خواہش کر رہے تھے کہ کاش ان کے پاس بھی قارون کی مانند مال و دولت ہوتی۔ لیکن اب وہ سمجھ گئے کہ ایمان کے بغیر مال و دولت مایۂ ہلاکت تو ہوسکتی ہے موجب سعادت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اب برملا کہنے لگے کہ اگر خدا کا لطف و کرم ہمارے شاملِ حال نہ ہوتا تو ہم بھی قارون کی مانند زمین میں دھنس چکے ہوتے۔ اسی بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

واصبح الذين تمنوا مكانه بالامس يقولون و يكان الله يبسط الرزق لمن يشاءُ من عباده و يقدر لولا ان من الله علينا لخسف بناويكانه لايفلح الكفرون٥

اس طرح ایک دنیا پرست انسان کی داستانِ زندگی تمام ہوئی۔ اس کے بعد قرآن کریم اس کی سرگذشت سے ایک کلی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ آخرت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اس دنیا میں تکبر نہ کریں اور فساد نہ کریں۔ وہ مال و دولت، زر و جواہر کو تکبر، غرور اور دوسروں پر حکومت کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لايريدون علوا فى الارض و لا فساداً والعاقبة للمتقين

اس آیت میں ''تلک'' کی لفظ میں ایک نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آخرت ابھی سے موجود ہے، اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور وہ گھر صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ پس اگر انسان تہذیب نفس اور درجات کمال کو زیادہ سے زیادہ طے کر چکا ہو تو پھر اس دنیا میں بطور کامل یا کسی حد تک آخرت کا مشاہدہ کر سکتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ٦ (تکاثر: ۵،۶)

یعنی ''اگر تمہیں علم الیقین کی منزل حاصل ہو تو اس دنیا میں دوزخ کو دیکھ لو گے''

آخر میں ایک نکتہ کا ذکر کر دیں کہ تورات میں لفظ ''قارون'' نہیں آیا، لیکن تین اشخاص کا بنام ''تورح'' اس میں ذکر کیا گیا ہے اور تیسرا شخص جس کا تذکرہ سفر خروج میں ہے تورح یسر ''یصھا'' ہے۔ وہ قبیلہ لادیان سے تھا اور حضرت ہارونؑ کا مخالف تھا۔ جب ہارونؑ کہانت کے عہدے پر فائز ہوا تو تورح نے دوسو آدمی لے کر ہارونؑ کے خلاف خروج کیا اور بنی اسرائیل میں اختلاف و تفرقہ کا موجب ہوا۔ بالآخر حضرت موسیٰؑ کی بددعا سے زمین پھٹ گئی اور وہ زمین میں دھنس گیا۔[1]

[1] اعلام قرآن، ص ۴۶۹

حضرت موسیٰ اور اُن کے معلم کا واقعہ

حضرت موسیٰؑ اور ان کے معلم کا واقعہ قرآنِ پاک میں صرف ایک بار ذکر ہوا ہے (سورہ کہف ۶۰ تا ۸۲) اگر ایک واقعہ قرآن میں کئی بار ذکر ہوا تو ایک جگہ کا ابہام دوسری جگہ سے دور کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر اس واقعہ کا ذکر ہی ایک مرتبہ ہوا ہو تو پھر جہاں اس میں ابہام ہوگا وہاں اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ ابہام کو صحیح روایات کے ذریعے دور کیا جائے ورنہ اس کے بارے میں حتمی اظہارِ نظر سے گریز کیا جائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کی اس غیبی معلم کے ساتھ سرگذشت بڑی عجیب اور تعجب خیز ہے۔ اس میں بڑے بڑے نکات پوشیدہ ہیں جنہیں ہم آیات کی تفسیر کے ضمن میں ذکر کریں گے۔ موضوع سے متعلق آیات اس طرح ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ
حُقُبًا ﴿٦٠﴾

۲۔ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

۳۔ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

۴۔ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا
الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾

۵۔ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾

۶۔ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا
عِلْمًا ﴿٦٥﴾

۷۔ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

۸۔ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾

۹۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

۱۰۔ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾

۱۱۔ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾

۱۲۔ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ
اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

۱۳۔ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾

۱۴۔ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾

۱۵۔ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ
نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

۱۶۔ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾

۱۷۔ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ
عُذْرًا ﴿۷۶﴾

۱۸۔ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ
يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ
لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

۱۹۔ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ
صَبْرًا ﴿۷۸﴾

۲۰۔ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا
وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

۲۱۔ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾

۲۲۔ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

۲۳۔ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا
وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ
رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ
صَبْرًا ۝۸۲ (الکھف: ۶۰ تا ۸۲)

آیات کا ترجمہ

۱۔ یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ میں اپنے سفر کو جاری رکھوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے سنگھم پر پہنچ جاؤں یا ایک مدت تک چلتا جاؤں۔

۲۔ جب وہ دو دریاؤں کے سنگھم پر پہنچے تو اپنی مچھلی کو جوان کے پاس (کھانے کے لیے) تھی، بھول گئے۔ مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چلی گئی۔

۳۔ جب وہ دونوں اس سنگھم سے آگے چلے گئے تو موسیٰؑ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ کھانا کھا لو۔ اس سفر میں تو بہت تھک گئے ہیں۔

۴۔ جوان نے موسیٰؑ سے کہا کہ آپ کو یاد ہے کہ جب دریا کے کنارے ایک چٹان پر ہم آرام کر رہے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا۔ شیطان کے علاوہ کسی نے مجھے اس کو نہیں بھلایا اور مچھلی دریا میں اپنی راہ لے کر چلتی بنی۔

۵۔ موسیٰؑ نے کہا کہ یہی تو وہ چیز ہے جس کی ہم تلاش میں ہیں۔ لہٰذا جس راستے سے آئے تھے اسی پر واپس چلیں۔

۶۔ وہاں انہوں نے ہمارے ایک بندہ کو پایا ہماری طرف سے رحمت جس کے شامل حال تھی اور اُسے ہم نے علم عطا فرمایا تھا۔

۷۔ موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ کیا (آپ اجازت مرحمت فرمائیں گے کہ) میں آپ کی پیروی کروں اور جو آپ کو علم دیا گیا ہے مجھے بھی وہ تعلیم دیں، ایسی تعلیم جس میں رشد و ہدایت ہو۔

۸۔اس نے موسیٰؑ سے کہا کہ تم میرے کاموں پر صبر و تحمل نہیں کر سکو گے۔

۹۔اور تم کیسے اس چیز پر تحمل کر سکتے ہو جس کے رموز سے تم آ گاہ ہی نہیں ہو۔

۱۰۔موسیٰؑ نے کہا کہ ان شاءاللہ تم مجھے صابر پاؤ گے اور میں تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا۔

۱۱۔اس بندہ نے موسیٰؑ سے کہا کہ اگر تم میرے ہمراہ رہو گے تو کسی چیز کے بارے میں سوال مت کرنا جب تک کہ میں خود تمہیں آ گاہ نہ کروں۔

۱۲۔پس دونوں چل پڑے۔جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو موسیٰؑ کے ساتھی نے اس کشتی میں سوراخ کر دیا۔موسیٰؑ (اس کی تاب نہ لا سکے) اور کہنے لگے کہ تم نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔کیا اس کے مسافروں کو غرق کر دینا چاہتے ہو؟ تم نے یہ بہت برا کام کیا۔

۱۳۔موسیٰؑ کے ساتھی نے کہا کہ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ تم میرے کاموں پر تحمل نہیں کر سکو گے؟

۱۴۔موسیٰؑ نے کہا کہ میں بھول گیا تھا لہٰذا میرے اس بھولنے پر مواخذہ نہ کرو اور میرے اس کام کی وجہ سے مجھ پر زیادہ سختی بھی نہ کرو۔

۱۵۔پھر دونوں چل پڑے۔دونوں کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی۔موسیٰؑ کے ساتھی نے اس لڑکے کو قتل کر دیا۔(موسیٰؑ سے برداشت نہ ہو سکا) کہنے لگے کہ تم نے ایک پاک انسان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو تا قتل کر دیا۔یہ تو یقینا بہت برا کام تم نے کیا۔

۱۶۔اس نے موسیٰؑ سے کہا کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے؟

۱۷۔موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ اگر اس کے بعد میں آپ سے آپ کے رموز کے متعلق سوال کروں تو بے شک مجھے چھوڑ دینا اور یہی آپ کے لیے کافی عذر ہو گا۔

۱۸۔پھر دونوں چل پڑے اور ایک بستی میں داخل ہوئے۔انہوں نے بستی والوں سے چاہا کہ انہیں اپنا مہمان بنا لیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔موسیٰؑ کے ساتھی نے ایک دیوار کو گرتے دیکھا تو اُسے تعمیر کر کے سیدھا کر دیا۔موسیٰؑ نے اپنے ساتھی سے کہا کم از کم اس کام کی اُجرت ہی ان سے لے لیتے (کیونکہ انہوں نے ہمیں اپنا مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا)۔

۱۹۔پس ساتھی نے موسیٰؑ سے کہا کہ اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آن پہنچا۔اب میں آپ کو ان کاموں کی حقیقتِ حال بتاتا ہوں۔جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

۲۰۔وہ کشتی کچھ غریب لوگوں کی ملکیت تھی جس کے ذریعہ وہ دریا میں کام کرتے تھے۔میں نے چاہا کہ اُسے معیوب کردوں کیونکہ ان کا ایک بادشاہ تھا جو تمام (صحیح) کشتیوں پر زبردستی قبضہ کر لیتا تھا۔

۲۱۔اسی طرح لڑکے کا قصہ یہ ہے کہ اس کے والدین مومن تھے۔مجھے خوف ہوا کہ کہیں بڑا ہو کر انہیں بھی کفر وطغیان کی طرف مائل کردے۔

۲۲۔ہم نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کے بدلہ نیک، پاک اور محبت کرنے والا فرزند عطا فرمائے۔

۲۳۔وہ دیوار اس بستی کے رہنے والے دو یتیموں کی تھی۔اس دیوار کے نیچے ان دونوں پاک و صالح لڑکوں کا خزانہ تھا۔خدا نے چاہا کہ یہ حدِ بلوغ کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکالیں۔یہ کام میرے پروردگار کی طرف سے کارِ رحمت تھا۔میں نے کوئی کام بھی اپنی طرف سے نہیں کیا۔یہ ہیں وہ رموز جن پر آپ صبر وتحمل نہ کر سکے۔

اس داستان کا خلاصہ

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ داستان قرآن میں صرف ایک بار ذکر ہوئی ہے لہٰذا آیات کے مفاہیم کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس داستان کو روایات کی مدد سے مختصراً بیان کردیں، اس کے بعد آیات کی تفسیر کریں۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک عالم سے ملاقات کی خواہش کی تھی جو انہیں علم سکھلائے۔خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ موسیٰؑ سفر پر روانہ ہوں اور دریا کے کنارے ایک چٹان پر انہیں وہ عالم ملے گا۔موسیٰؑ نے اس دریا اور چٹان کی نشانی پوچھی؟ حکم ہوا کہ اپنی غذا میں ایک مچھلی ساتھ رکھنا۔جہاں اس مچھلی کو گم کر بیٹھو، وہی وہ مقام ہے جہاں تم اس عالم سے ملاقات کروگے۔

حضرت موسیٰؑ نے ایک اور جوان یوشع ابن نون کو ساتھ لیا اور سفر پر روانہ ہوگئے۔راستے میں جب تھکاوٹ اُن پر غالب آ گئی تو دریا کے کنارے ایک بڑی چٹان پر ستانے لگے۔

اس مقام پر جیسے بھی ہوا یوشع مچھلی کو گم کر بیٹھے۔یا تو دریا کی موج مچھلی کو بہا لے گئی یا مچھلی بحکم خدا خودبخود زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔یوشع مچھلی کی طرف توجہ کرنے یا حضرت موسیٰؑ کو اس کے بارے میں بتائے۔بغیر ان کے ہمراہ پھر روانہ ہوگئے۔جب دونوں تھک گئے اور آرام

کی نیت سے ایک جگہ بیٹھے تو موسیٰؑ نے یوشع سے کہا کہ ذرا کھانا تو نکالو۔ اس سفر میں تو ہم بہت تھک گئے ہیں۔
جب یوشع نے موسیٰؑ کی یہ بات سنی تو اب انہیں مچھلی کا گم ہونا یاد آیا۔ کہنے لگے جہاں ہم نے ساحل پر ایک چٹان کے اوپر آرام کیا تھا وہاں میں مچھلی کو گم کر بیٹھا اور شیطان مانع ہوا کہ مجھے مچھلی یاد آئے اور میں آپ کو بتلا سکوں۔
موسیٰؑ نے کہا کہ یہی تو وہ چیز ہے جس کی تلاش میں ہم سرگرداں ہیں۔ لہٰذا جس راستے سے آئے تھے اس پر واپس روانہ ہوئے۔ چٹان کے پاس انہوں نے ایک عبدِ خدا کو دیکھا، رحمتِ پروردگار جس کے شاملِ حال تھی اور اُسے اللہ کی طرف سے خاص علم عطا ہوا تھا۔ موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ آپ کی پیروی کروں تا کہ جو علم آپ کو حاصل ہے آپ اس سے کچھ مجھے بھی عطا کریں۔
وہ عبدِ خدا جسے اب ہم موسیٰؑ کا ساتھی کہیں گے، کہنے لگا کہ تم میرے کاموں کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ حضرت موسیٰؑ نے وعدہ کیا کہ وہ برداشت کریں گے۔ اب دونوں نے یا تینوں نے سفر کا آغاز کر دیا اور ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ اچانک موسیٰؑ متوجہ ہوئے کہ ان کا ساتھی کشتی میں سوراخ کر رہا ہے۔ موسیٰؑ نے اس کے کام پر اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ ہماری رفاقت کی شرط ہی یہ تھی کہ آپ بے صبری کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ موسیٰؑ اپنے سوال پر نادم ہوئے اور صبر کا پھر وعدہ کیا۔ اب کی بار ساتھی نے ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ پھر موسیٰؑ نے اعتراض کر دیا۔ دوبارہ وہی باتیں ہوئیں اور موسیٰؑ نے پھر صبر کا وعدہ کیا۔
سفر کے دوران وہ ایک بستی میں پہنچے جہاں انہوں نے چاہا کہ وہاں کے باشندے انہیں اپنا مہمان بنا لیں۔ لیکن ان لوگوں نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ ان کے انکار کے باوجود موسیٰؑ کے ساتھی نے وہاں پر ایک گرتی ہوئی دیوار دیکھی تو اس کا بلا معاوضہ تعمیر کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا کہ جب انہوں نے ہمیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا تو آپ ان سے اس کام کی مزدوری ہی لے لیتے۔
اس مرحلہ پر حضرت موسیٰؑ کے ساتھی نے اُن سے کہہ دیا کہ اب آپ کا اور میرا ساتھ ممکن نہیں، کیونکہ موسیٰؑ نے جو صبر کا وعدہ کیا تھا اس پر پورا نہیں اتر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے تینوں کاموں کے رازوں سے پردہ اٹھایا جو سب اللہ کے حکم سے بندوں کے فائدہ کی خاطر تھے۔
اب اس داستان کے اجمالی بیان کے بعد ہم آیات کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ چونکہ اس موضوع کی مشابہ آیات موجود نہیں ہیں لہٰذا ہم بالترتیب آیاتِ مذکورہ کی تفسیر ذکر کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۝

یعنی ''حضرت موسیٰؑ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ میں اپنا سفر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے سنگھم پر پہنچ جاؤں، یا ایک مدتِ دراز تک چلتا رہوں''۔

اس آیت میں چند سوالوں کے جواب دینا ضروری ہیں:

۱۔ موسیٰؑ سے اس آیت میں کون سی شخصیت مراد ہے؟

جواب: معجم المفهرس (آیات کی فہرست) کی بیان کردہ تعداد کے مطابق لفظ موسیٰؑ قرآن میں ۱۳۶ مرتبہ آیا ہے۔ ان تمام موارد میں مراد موسیٰؑ ابن عمران ہی ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں بھی مراد موسیٰؑ ابن عمران ہی ہیں۔ کیونکہ اگر ان کے علاوہ کوئی اور موسیٰؑ مراد ہوتے تو اس پر کوئی شاہد ہونا چاہیے تھا۔ بنا بریں اس موسیٰؑ سے مراد بنی اسرائیل کے ایک دوسرے نبی بنام موسیٰؑ ابن ہشام ابن یوسفؑ مراد لینا صحیح نہیں ہے۔

"فتی" کے معنی لغت عربی میں جوان کے ہیں اور کبھی دلیر جوانمرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصحابِ کہف کی داستان میں "فتیه" کی لفظ استعمال ہوئی ہے، جو فتی کی جمع ہے کہ روایات میں جس کے معنی جوانمرد لیے گئے ہیں۔

مجمع البحرین (دو دریاؤں کے سنگھم کی جگہ) سے کون سی جگہ مراد ہے؟

جواب: یہاں چار احتمال پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ تو صحیح نہیں ہو سکتے اور کچھ بعید از قیاس نظر آتے ہیں، خصوصاً اس زمانہ کے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

۱۔ مشرق کی طرف سے دریائے روم (بحر ابیض یا بحیرۂ روم) اور مغرب کی طرف سے دریائے فارس ان دریاؤں کے ختم ہونے کی جگہ [۱]

یہ نظریہ موجودہ دریائی اور زمینی نقشوں سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ خلیج فارس کی آخری حد دریائے عمان ہے۔ بحر عمان بحر احمر کے ساتھ جا ملتا ہے اور اس کی آخری حد نہر سویز ہے جو بحیرۂ روم کے ساتھ نہیں ملتی کیونکہ دونوں کے درمیان خشکی ہے۔ یہ تو سابقہ کی صورت حال تھی لیکن موجودہ دور میں نہر کے ذریعہ دونوں کو ملا دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آیت سے مراد خلیج فارس کی آخری حد اور بحیرۂ روم کی پہلی حد ہے۔

۲۔ دریائے احمر میں خلیج عقبہ اور سویز کے ملنے کی جگہ مراد ہے، یعنی اگر نقشہ دیکھیں تو ہمیں شمال مشرق اور شمال مغرب کی جانب دو دریا نکلتے دکھائی دیں گے۔ پہلے کو خلیج عقبہ اور دوسرے کو خلیج سویز کہا جاتا ہے۔ ان دونوں خلیجوں کی آخری حد، جو بحرِ احمر میں جا ملتی ہے، مجمع البحرین کہلاتی ہے۔ یہ مدنظر رکھتے ہوئے کہ موسیٰؑ شام میں رہتے تھے اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس بہت مختصر تھا، (مچھلی پکی ہوئی یا نمک لگی ہوئی) اور جب کچھ دور سفر کر چکے تو موسیٰؑ نے اپنے ساتھی سے غذا نکالنے کو کہا، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دو دریاؤں کے سنگھم سے مراد یہی جگہ تھی۔

۳۔ وہ جگہ مراد ہے جہاں مغرب کی طرف سے بحر احمر اور مشرق کی طرف سے خلیج عدن آپس میں ملتے ہیں۔ جسے آج کل "باب

---

[۱] مجمع البیان، ج ۳، ص ۴۸۱

المندب“ کہا جاتا ہے۔

۴۔ بحیرۂ روم جس جگہ بحرِ اوقیانوس سے اٹلس میں ملتا نظر آتا ہے۔ اسے تنگنائے جبل الطارق کہتے ہیں، یہ جگہ مراد ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ان چار احتمالات میں سے دوسرا احتمال زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے۔ ایک تو اس زمانہ کے وسائل سفر کے پیش نظر اور دوسرا یہ کہ بقیہ احتمالات سے لازم آتا ہے کہ موسیٰؑ ایک لمبی مدت اپنی قوم سے دور رہے ہوں، جب کہ یہ بعید ہے۔

جملہ ”او امضی حقباً“ سے کیا مراد ہے؟

حُقب عتق کے وزن پر مفرد کلمہ ہے جس کی جمع احقاب آتی ہے اور اس کے معنی طویل زمانہ کے ہیں۔ یہ حکم ستر سال یا اسی سال کی مدت پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس طرح کامل طور پر اس کے مصادیق مختلف ہیں۔

اس جملہ میں کلمہ ”او“ استعمال ہوا ہے جو تردید کے لیے آتا ہے اور شاید یہاں بطور قرینہ استعمال ہوا ہو کہ اس سے پہلے جملہ ”حتی ابلغ مجمع البحرین“ میں حقب کے بالمقابل لفظ پوشیدہ مانا جائے، یعنی موسیٰؑ نے گویا اس جوان سے یوں کہا کہ یا تو میں جلد ہی دریاؤں کے سنگھم پر پہنچ جاؤں گا یا عرصۂ دراز تک چلنے کے بعد وہاں پہنچوں گا۔ پس وہ حقب کے مقابل لفظ یا سریعاً مقدر مانیں گے یا عنقریب، تو عبارت یوں بنے گی

”حتیٰ ابلغ مجمع البحرین سریعاً عن قریبٍ او امضی حقبا“

پس چار احتمالات میں سے چونکہ ہم نے دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ کو زیادہ لمبی مدت سفر نہیں کرنا پڑا بلکہ جلدی ہی اپنے مقصد پر پہنچ گئے تھے۔ اگرچہ مقصد سے کچھ آگے بڑھ گئے تھے، لیکن جلد ہی دوبارہ لوٹ آئے۔

۲۔ فلما بلغ مجمع بینھما نسیا حوتھما فاتخذ سبیلہ فی البحر سرباً [1]

اس آیت سے دو مطلب استفادہ ہوتے ہیں:

۱۔ جب دو دریاؤں کے سنگھم پر پہنچے تو مچھلی کو بھول گئے۔

۲۔ مچھلی نے دریا کی راہ لی اور چلی گئی۔

پہلے حصہ میں بھولنے کی نسبت دونوں کی طرف دی گئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ذمہ دار و بااختیار شخص بھولتا ہے تو اس کی نسبت تمام اراکین کی طرف دی جاتی ہے گویا کہتے ہیں کہ ہم بھول گئے تھے، جب کہ در اصل بھولنے والا صرف ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔

دوسرے جملہ میں کہا گیا ہے کہ مچھلی نے دریا میں راہ لی اور چلی گئی (سُرب ”حسن“ کے وزن پر سوراخ یا تنگ راستے کو کہتے ہیں۔ شاید یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہو کہ مچھلی جو زندہ ہو کر چوری چوری، آہستگی سے دریا کی گہرائی میں چلی گئی)

یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ وہ زندہ مچھلی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ بلکہ یہ مچھلی پکی ہوئی تھی یا اس کو نمک لگا ہوا تھا۔ بعد والی آیت

[1] ”سرب“ بر وزن ”حسن“ مسلک یا راہِ راست کے معنی رکھتا ہے گویا اس کی تقدیر اس طرح ”تسرب سربا“

میں کہا گیا ہے کہ ہمارا کھانا لاؤ۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مچھلی پکی ہوئی اور کھانے کے قابل تھی۔پس نتیجہ یہ نکلے گا کہ مچھلی اللہ کے حکم سے اسی وقت زندہ ہوگئی اور دریا میں چلی گئی۔

اس جملہ کا دوسری آیت میں تکرار مزید شاہد بنتا ہے کہ اس مطلب پر، نیز دوسری آیت میں ''سربًا'' کی جگہ ''عَجَبًا'' کا کلمہ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب تعجب کا اظہار ہے کہ مچھلی دریا میں چلتی بنی۔ یہ لفظ ''عَجَبًا'' قرینہ بن سکتا ہے کہ مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔ بنا بریں علامہ طباطبائی نے جو فرمایا ہے کہ آیت میں مچھلی کے زندہ ہونے پر کوئی شاہد موجود نہیں ہے، اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔[۱]

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دونوں آیتوں میں یہ جملہ حضرت موسیٰؑ سے متعلق ہے۔یعنی موسیٰؑ نے دریا میں اپنی راہ لی اور چلے گئے۔[۲] لیکن یہ احتمال کئی اعتبار سے درست نہیں۔

۱۔ ''اتخذ'' میں نزدیک ترین مرجع ضمیر ''حوت''،یعنی مچھلی ہے، موسیٰؑ نہیں۔

۲۔ اگر مراد موسیٰؑ ہوں تو پھر سَرَبًا اور عَجَبًا کی لفظوں کا استعمال بے فائدہ ہوگا کیونکہ کشتی پانی کی گہرائی میں نہیں چلتی بلکہ سطح آب پر چلتے ہوئے پانی کی سطح کو چیرتی ہوئی جاتی ہے۔

۳۔ دوسری دفعہ اس جملہ کے استعمال میں بلا فاصلہ کہا گیا ہے کہ موسیٰؑ جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے لوٹ گئے، ایسا نہیں کہا گیا کہ وہ آگے بڑھ گئے، جیسا کہ ارشاد ہے:''فارتدا علی اثارِ هما قصصا''۔

موسیٰؑ بہر حال اس نشانی پر متوجہ نہ رہ سکے جس کا اشارہ اللہ نے دیا تھا کیونکہ وہ مچھلی کی کیفیت سے آگاہ نہ رہے اور آگے بڑھتے گئے۔ یہ دن کا پہلا حصہ تھا۔ پھر جب تھکان نے ان پر غلبہ کیا تو ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اگر دن کی روشنی میں وہ کسی چٹان کے سایہ تلے بیٹھے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تمام رات چلتے رہے اور صبح کی دوسری منزل پر پہنچے تو موسیٰؑ نے غذا طلب کی۔ اور آیت میں جو ''غداءنا'' کی لفظ استعمال ہوئی ہے یہ اس کھانے پر استعمال ہوتی ہے جو دن میں کھایا جائے لہٰذا ہو سکتا ہے ناشتہ یا دوپہر کا کھانا مراد ہو، اگرچہ آج کل عرب ناشتہ کے لیے ''فطور'' اور دوپہر کے کھانے کے لیے ''غدایٔ'' کی لفظیں استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ آرأيت اذا وينا اِلَى الصخرة فانى نسيت الحوت و ما انسانيه الا الشيطن ان اذكره واتخذ سبيله فى البحر عجبًا

''(حضرت موسیٰؑ نے جب کھانا مانگا تو) ان کے ساتھی جوان نے کہا کہ جب ہم نے چٹان کی پناہ لی تھی تو میں مچھلی بھول گیا اور مجھے یاد رکھنے سے شیطان کے علاوہ کوئی مانع نہیں ہوا''

---

[۱] المیزان، ج ۱۳، ص ۳۶۵

[۲] اعلام قرآن، ص ۱۹۳

اس آیت کی تفسیر میں تین موارد کی تشریح ضروری ہے:

الف۔ حضرت موسیٰؑ کے جوان ساتھی نے نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کیوں دی؟

ب۔ ''ان اذکرہ'' کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ میں کھانے پر توجہ نہ رکھ سکا اور مجھے مچھلی کا خیال ہی نہ رہا، یا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے مچھلی کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ زندہ ہوکر دریا میں چلی گئی لیکن موسیٰؑ کو بتانا یاد نہ رہا، یعنی عبارت اس طرح بنے گی: "ان اذکرہ لك بعد ما رأيت انه اتخذ سبيله فى البحر عجبًا"

ج۔ "واتخذ سبيله" کا جملہ یوشع کا کلام ہے یا خدا کا کلام ہے جو ایک حقیقت کی خبر دے رہا کہ یوشع کا کھانے پر توجہ نہ رکھ سکنا اس وجہ سے تھا کہ کھانا اب رہا ہی نہ تھا کہ اس کی طرف توجہ رکھتے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ شیطان حضرت موسیٰؑ کی اس عالم سے ملاقات سے راضی نہ تھا کیونکہ یہ ملاقات موسیٰؑ کے روحانی کمال کے لیے مفید تھی۔ کھانے پر توجہ نہ دے سکنا اس ملاقات کی تاخیر کا موجب ہوا لہٰذا اسے شیطان کی طرف منسوب کیا اور کہا: "وما انسنيه الا الشيطن"

دوسرے سوال جا جواب یہ ہے کہ پہلا احتمال زیادہ صحیح نظر آتا ہے، یعنی مچھلی دریا میں چلی گئی تھی اور جوان کو پتہ نہ چل سکا۔ لہٰذا کھانا (مچھلی) ہی نہ رہا تو اس نے سوچا کہ اس نے غذا کے بارے میں غفلت برتی ہے، اگرچہ غفلت نہ برتی ہوتی تب بھی کھانا ہی نہ تھا جسے اٹھاتا۔ لہٰذا ایسی صورت میں اُسے موسیٰؑ کو بتلا دینا چاہیے تھا جس سے موسیٰؑ اس علامت کے بارے میں متوجہ ہوجاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتا رکھی تھی اور اس جگہ سے آگے نہ بڑھتے بلکہ وہیں اپنے معلم کے انتظار میں بیٹھ جاتے۔

لیکن دوسرا احتمال بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ اتنا عجیب اور بڑا واقعہ ہوجائے اور جوان موسیٰؑ کو بتلانا بھول جائے، اس سے غفلت برتے، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دو آدمی ایک جگہ بیٹھے ہوں اور ایسا واقعہ ہوجائے جسے ایک آدمی تو دیکھ لے اور دوسرا نہ دیکھ سکے۔

دوسرے سوال کے جواب سے تیسرے سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ "فاتخذ سبيله ..."کلامِ خدا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ایک حقیقت کی خبر دے رہا ہے اس کے بارے میں غفلت کی نشاندہی نہیں فرمارہا۔

بہرحال حضرت موسیٰؑ نے یہ بات سن کر کہا کہ یہی وہ نشانی تھی جس کی ہم تلاش میں تھے کیونکہ وحی کے ذریعہ حضرت موسیٰؑ کو خبر دی جا چکی تھی کہ جہاں مچھلی گم کر بیٹھوگے وہیں اس عالم سے ملاقات کروگے۔ لہٰذا موسیٰؑ نے اپنے ساتھی سے کہا:

٥۔ قال ذلك ما كنا نبغ فارتدا على اثارهما قصصاً

لہٰذا انہوں نے جو راستہ طے کیا تھا اسی پر واپس ہولیے۔ جب اس جگہ پر پہنچے تو وہاں انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جس کے بارے میں قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

٦۔ فوجدا عبدًا من عبادنا اتينه رحمة من عندنا و علمنه من لدنا علماً

یہاں اس کی دو اہم صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

۱۔ ایک تو رحمت اور نعمتِ خدا اس کے شامل حال تھی: اٰتینہ رحمۃ من عندنا"، شاید اس سے مراد معنوی و روحانی مقامات ہوں جو کہ باطنی نعمتیں شمار ہوتے ہیں۔

۲۔ اس کو علم خداداد حاصل تھا: "وعلمنہ من لدنا علماً"، نہ یہ کہ انہیں صرف کام کی ظاہری کیفیت کا علم تھا بلکہ اسکے باطن اور نتیجہ سے بھی مکمل طور پر آ گاہ تھے۔

حضرت موسیٰؑ نے بڑی انکساری و ادب سے ان سے کہا:

۷۔ قال لہ موسیٰ ھل اتبعك علی ان تعلمن مما علمت رشداً

حضرت موسیٰؑ نے اس معلم کے ساتھ طرزِ تخاطب میں مکمل طور پر ادب کی رعایت کی ہے، وہ یوں کہ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ اس سے پیروی کی اجازت مانگتے ہیں اور اصلی مقصد کو جو علم حاصل کرنا تھا، پیروی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: "علی ان تعلمن" لہٰذا اب دوبارہ علمنی یعنی مجھے تعلیم دو، کہنے کی ضرورت نہیں رہی اور کہتے ہیں کہ جو علم و دانش آپ کے پاس ہے اس سے کچھ مجھے بھی سکھلا دیں، نہ کہ سارا علم۔ حضرت موسیٰؑ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تا کہ سعادت و ہدایت حاصل ہو سکے، نہ کہ خود علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم نے موسیٰؑ کو کیا جواب دیا، جس کا نام روایات میں "خضر" ذکر ہوا ہے۔

انہوں نے ایک بزرگ شاگرد بننے کے خواہشمند کو جو اولوالعزم انبیاء سے ہیں اور تورات ان پر نازل ہوئی ہے، اس طرح جواب دیا:

۸۔ قال انك لن تستطیع معی صبراً

۹۔ و کیف تصبر علی ما لم تحط بہ خبراً٥

حضرت موسیٰؑ نے اُن کی یہ بات سن کر صبر کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔ یہ طرزِ تکلم بھی حضرت موسیٰؑ کی طرف سے اپنے معلم کے لیے بہت بڑے ادب کی بات ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

۱۰۔ قال ستجدنی إن شآءَ اللہ صابرا ولا اعصی لك امرا

بزرگ معلم نے حضرت موسیٰؑ کے وعدہ کے جواب میں انہیں اختیار دے دیا، البتہ یہ کہہ دیا کہ اگر میری پیروی کرنا چاہتے ہو تو میرے کاموں کے بارے میں سوال نہ کرنا، یہاں تک کہ میں خود ان کی حقیقت حال تم پر واضح کر دوں۔ انہوں نے سوال نہ کرنے کی بات کو پیروی سے مشروط کر دیا جس کا لازمہ یہ تھا کہ خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہنا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۱۔ فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیءٍ حتی احدث لك منہ ذکرا٥

پیروی کی پہلی منزل

بالآخر حضرت موسیٰؑ اور ان کے معلم کے ساتھ مذاکرات کے بعد یہ طے پایا کہ موسیٰؑ معلم کی پیروی کریں گے۔ لہٰذا دونوں پہلے موقع پر کشتی پر سوار ہو کر آگے بڑھ گئے۔ اچانک حضرت موسیٰؑ نے دیکھا کہ اُن کے رہنما معلم کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہو سکتا تھا کہ سب مسافر غرق ہو جاتے۔ موسیٰؑ چونکہ اس کام کے راز سے واقف نہیں تھے لہٰذا خاموش نہ رہ سکے اور کہنے لگے کہ کیا سوراخ کر کے سب لوگوں کو غرق کر دینا چاہتے ہو؟

۱۲۔ فَانْطَلَقَا ٙ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔـا اِمْرًا ۝ (الکہف: ۷۱)

اس آیت میں صرف دو آدمیوں کے سفر پر جانے کا تذکرہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جو جوان (یوشع) تھا اسے انہوں نے ساتھ نہیں لیا تھا بلکہ اسے وہیں چھوڑ دیا تھا کیونکہ جہاں موسیٰؑ جیسی شخصیت میں ساتھ چلنے کا یارا نہ ہو وہاں یوشع کا معاملہ تو واضح ہے۔ اور ''لتغرق'' پر جو لام داخل ہے اسے عربی میں لام عاقبة کہتے ہیں جو کسی چیز کے نتیجہ کو بیان کرنے کی خاطر لائی جاتی ہے۔ یہ لام غایت نہیں۔ پس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کے اس کام (کشتی میں سوراخ کرنے) کا نتیجہ کشتی والوں کا غرق ہونا ہے۔ اگرچہ آپ نے اس کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ آپ کا کام امراً (بڑی مصیبت) ہے۔ ''لقد جئت شیئًا امراً'' (☆) امر کے معنی تعجب خیز کے نہیں ہیں بلکہ بڑی مصیبت کے ہیں۔ جیسا کہ بعد والی آیات کی تفسیر کے ضمن میں معلوم ہو جائے گا۔

اس عظیم معلم نے حضرت موسیٰؑ کو ان کا سابقہ وعدہ یاد دلایا اور کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ (الکہف: ۷۲)

حضرت موسیٰؑ کو فوراً اپنا وعدۂ صبر یاد آ گیا۔ لہٰذا انہوں نے معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ زیادہ سختی نہ کریں اور چشم پوشی سے کام لیں۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝ (الکہف: ۷۳)

اس آیت میں حضرت موسیٰؑ نے دو باتوں کا تذکرہ کیا ہے:

الف۔ میں نے جو وعدہ آپ کے ساتھ کیا تھا وہ میرے خیال سے نکل گیا، جو کام آپ نے کیا ہے اس کی اہمیت کے پیش نظر مجھے وعدہ یاد نہیں رہا۔ ''لا تواخذنی بما نسیت''

ب۔ مجھ پر زیادہ سختی نہ کریں یعنی میں اپنے ساتھ نرمی و درگزر کرنے کی گزارش کرتا ہوں۔

ولا ترھقنی عسراً

یعنی

ولا تکلفنی عسراً من امری

اب دیکھنا ہے کہ اس معلم نے تمام کشتی سوار لوگوں اور ملاح کے سامنے کشتی کو سوراخ کرنا شروع کر دیا تو اُسے موسیٰ کے علاوہ دوسروں نے کیوں نہ روکا؟ کیا صرف ایک لمحے کا کام تھا جس پر وہ لوگ متوجہ نہ ہو سکے اور کیوں کوئی آدمی غرق نہ ہوا؟

تو ان دونوں سوالوں کے قطعی جواب دینا تو مشکل ہے لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ خضرؑ نے کشتی کے پیندے میں سوراخ کیا تھا، یا اس سے تختہ اکھاڑ دیا تھا اور دوسرے کشتی کے سواروں کی توجہ کو معجزاتی طور پر اس سے ہٹا دیا تھا۔ نیز جب سوراخ کر چکے تو اسے پھر درست کر دیا اور کسی طرح اس سوراخ کو بند کر دیا جس کی وجہ سے کشتی غرق نہ ہوئی، نہ ہی وہ سالم و بے عیب رہی۔

معلم نے حضرت موسیٰؑ کی درخواست قبول کر لی۔ پھر وہ کشتی سے اتر کر خشکی میں پیدل ہی چل پڑے۔ اسی اثنا میں معلم نے ایک جوان کو اس کے کسی جرم کو دیکھے بغیر قتل کر دیا۔ اس بار بھی حضرت موسیٰؑ سے رہا نہ گیا اور کہنے لگے کہ آپ نے ایک جوان کو کیوں قتل کر دیا بغیر اس کے کہ وہ کسی قتل کا مرتکب ہوا ہو۔ آپ نے بڑا برا کیا ہے۔

۱۵۔ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓی اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾ (الکہف: ۷۴)

عربی میں ''غلام'' عموماً نابالغ لڑکے کو کہا جاتا ہے، اگرچہ کبھی علی الاطلاق جوان کو بھی غلام کہا جاتا ہے اگرچہ وہ بالغ ہو چکا ہو۔ [1] قرآن میں اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ، یوسفؑ (جب وہ کنوئیں میں تھے) یحیٰؑ اور دو یتیم بچوں کے لیے غلام کی لفظ ہی استعمال ہوئی ہے۔ ان تمام آیات سے پتہ چلتا ہے کہ بچے کی ولادت سے لے کر بھرپور جوانی کے وقت تک اسے غلام کہا جاتا ہے۔ اگر قائل ہو جائیں کہ اس زمانہ میں بلوغ کی عمر سولہ سال کی تھی، ۱۸ سال یا اس سے بھی کچھ اوپر تک عمر کے جوان کو غلام ہی کہتے تھے اور جب شباب کا دور آتا ہے تو پھر اس کے لیے دوسری لفظیں استعمال کی جاتیں ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ وہ جوان بھی بالغ تھا کیونکہ موسیٰؑ نے اپنے معلم پر جب اعتراض کیا تو کہا تھا کہ کیوں آپ نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے کسی کا خون نہیں بہایا تھا "قال اقتلت نفس زکیة بغیر نفس"۔ اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مقتول عمر کے اس حصے میں تھا کہ اگر اُس نے کسی کا خون بہایا ہوتا تو اس سے قصاص لیا جا سکتا تھا، ظاہر ہے کہ قصاص بالغ ہی سے لیا جاتا ہے، نابالغ افراد سے نہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنے معلم کے پہلے عمل کو "امراً" کہا اور دوسرے کو "نکراً" کہا۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ ''امراً'' کے معنی جیسا کہ طبرسیؒ نے کہا ہے بڑی مصیبت کے ہیں کسی تعجب خیز کام کے نہیں، کیونکہ جہاں ایک انسان کا قتل نکر و ناپسندیدہ عمل شمار ہوتا ہو وہاں کئی انسانوں کی

---

[1] لیلیٰ اخیلیہ نے ایک شعر میں کہا ہے:۔ شفا ھا من الداء العضال الذی بھا غلام اذا ھز القناة سقاھا

ہلاکت کے اسباب فراہم کرنا یقیناً بڑی مصیبت اور فاجعہ شمار ہوگا۔ یہاں پھر اس بزرگ معلم نے اپنے شاگرد کو اس کا ابتدائی وعدہ یاد دلایا اور کہا:

۱۶۔ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ۝ (الکھف: ۷۵)

''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے؟''

اب کی بار حضرت موسیٰؑ نے کوئی معذرت نہ کی بلکہ استاد کے حق میں ظاہر کیا کہ اُن کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا کہا کہ اس کے بعد اگر میں نے کوئی اعتراض کیا تو آپ کو حق ہوگا کہ میرا ساتھ چھوڑ دیں، کیونکہ عملی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ مجھ میں آپ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۷۔ قَالَ اِنۡ سَاَلۡتُكَ عَنۡ شَىۡءٍۢ بَعۡدَهَا فَلَا تُصٰحِبۡنِىۡ‌ ۚ قَدۡ بَلَغۡتَ مِنۡ لَّدُنِّىۡ عُذۡرًا ۝ (الکھف: ۷۶)

یہاں ''من لدنی عذراً'' کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو اب کے بعد جا ہو جانے پر معذور مانوں گا۔

اس کے بعد ان کے سفر کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس میں دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا طرزِ عمل کیا رہا؟ حضرت موسیٰؑ اور ان کے معلم ایک شہر میں داخل ہوئے کہ اُن کی خوراک ختم ہو چکی تھی۔ وہاں کے رہنے والوں سے انہوں نے اپنے آپ کو مہمان بنانے کو کہا لیکن ان کنجوس لوگوں نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ اب حالت یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ سخت تھک چکے اور بھوکے بھی تھے۔ اچانک حضرت خضرؑ نے ایک عجیب کام اپنے ذمہ لے لیا۔ جو یہ تھا کہ ایک گرتی ہوئی دیوار کو تعمیر کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُن کے معلم ان برے لوگوں کے ساتھ بھلائی کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو تو اپنی اور اپنے معلم کی ضرورت کا علم تھا لہٰذا معلم سے کہنے لگے آپ اس عمل کے عوض ان سے اجرت لے سکتے تھے۔ ایسی صورتِ حال نے حضرت موسیٰؑ کو اس وعدہ سے پھر غافل کر دیا جو وہ اپنے معلم کے ساتھ کر چکے تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۸۔ فَانۡطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهۡلَ قَرۡيَةِ ۨاسۡتَطۡعَمَاۤ اَهۡلَهَا فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا فَوَجَدَا فِيۡهَا جِدَارًا يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّنۡقَضَّ فَاَقَامَهٗ‌ ؕ قَالَ لَوۡ شِئۡتَ لَتَّخَذۡتَ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ۝ (الکھف: ۷۷)

قرآن میں قریہ مکمل آبادی کو کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی دیہات کے نہیں ہوتے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ مصر اس دور میں فرعونی تہذیب وتمدن کا بہت بڑا گہوارہ تھا۔ اسے بھی قرآن نے قریہ کہا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡيَةَ الَّتِىۡ كُنَّا فِيۡهَا (یوسف: ۸۲)

اب جس قریہ میں وہ داخل ہوئے اس سے مراد کون سی آبادی ہے، اس میں مفسرین سے مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد انطاکیہ ہے جو حلب اور اسکندرون کے درمیان واقع ہے۔ اس زمانہ میں اسکندرون بھی سوریہ کا ایک شہر تھا لیکن اب یہ ترکیہ

میں شامل ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے شہر ''ایلہ'' مراد ہے جو بحرِ احمر کے کنارے خلیج عقبہ کے نزدیک واقع ہے۔[1]

اس موقع پر معلم نے حضرت موسیٰؑ سے جدائی کا اعلان کر دیا کیونکہ تجربہ نے ثابت کر دیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ ان کے تعجب خیز یا بظاہر نا پسندیدہ کاموں کو دیکھنے کا یارا نہیں رکھتے۔ لہٰذا انہوں نے شاگرد کو مخاطب کر کے کہا:

هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

(الکہف: ۷۸)

جو شاگرد استاد سے محبت کرتا ہو، اس کے لیے استاد کی جدائی کا مرحلہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ لہٰذا جب حضرت موسیٰؑ نے ''ھذ افراق بینی وبینک'' کا کلام سنا تو ان کا دل بڑا مضطرب ہوا لیکن اب کی بار ساتھ چلنے کی درخواست نہ کی کیونکہ اس سے پہلے کہہ چکے تھے کہ دوبارہ اگر میں اعتراض کروں تو بے شک آپ کو میرا ساتھ چھوڑنے کا حق پہنچتا ہے۔ استاد نے جدائی کا وقت ان تینوں کاموں کے اسرار سے حضرت موسیٰؑ کو آگاہ کر دیا اور کہا کہ میرے یہ سب کام اللہ کے حکم سے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے کاموں کے اسرار اس طرح بیان کیے:

جس کشتی پر ہم سوار ہوئے وہ کچھ غریب لوگوں کی تھی، جن کی روزی کا دارومدار اسی کشتی پر تھا۔ ہمارے[2] آگے ایک بادشاہ تھا جو قزاقوں کی مانند تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیتا تھا۔ میں نے کشتی کو معیوب کر دیا تا کہ اس طرح وہ اس سے صرفِ نظر کر لے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۲۰۔ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ (الکہف: ۷۹)

درحقیقت یہ معمولی سی تخریب ان غریبوں کے مال کی حفاظت کی خاطر تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ با صلاحیت افراد دوسروں کے اموال میں تصرف کر سکتے ہیں، اگر چہ جن کے اموال ہیں انہیں ان کے تصرف کا یا تصرف کی حقیقت کا علم نہ بھی ہو، بلکہ تصرف کرنے والے کو بھی نہ پہچانتے ہوں، اگر چہ یہ تصرف اُن کے حق میں ہو، مثلاً پانی اگر کسی کے گھر کی طرف راہ نکالے تو ممکن ہے کہ پانی کا راستہ روکنے میں ہی اُسے زندگی کے تصرفات حاصل ہوں۔

اس کام سے ہمیں ایک اور نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ دنیا میں اللہ نے ایسے اولیاء بھی رکھے ہوئے ہوتے ہیں جو لوگوں کی منفعت کی خاطر کام کرتے رہتے ہیں اگر چہ وہ لوگ خود ان تصرفات یا ان کے طریق کار سے آگاہ نہ بھی ہوں، نہ اُن کے عامل سے آگاہ ہوں۔ اس کی

---

[1] یاقوت نے مراصد الاطلاع میں کہا ہے کہ انطاکیہ کی آب و ہوا بہت خوشگوار ہے۔ اس کے اور حلب کے درمیان ۲۴ گھنٹے کا سفر ہے، مادہ انطاکیہ سے مراجعہ ہے۔

[2] وراء کی لفظ آگے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے جیسے ''ومن ورآئھم برزخ'' (مومنون: ۱۰۰) میں آیا ہے اور احتمال ہے کہ بمعنی تعقیب ہو چاہے آگے سے ہو یا پیچھے سے۔

تفصیل بعد کے واقعات میں آئے گی۔

پھر اس نوجوان کے قتل کے بارے میں یوں فرمایا: ''اس نوجوان کے ماں باپ مومن تھے میں ڈرا کہ کہیں یہ نوجوان انہیں اپنی طرح کا گناہگار و سرکش نہ بنادے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

۲۱۔ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝۸۰

(الکھف: ۸۰)

خشینا کے معنی ڈرنے کے ہیں۔ اس کا مادہ خشیت ہے۔ حضرت خضرؑ حقائقِ ہستی اور امورِ باطن سے آگاہ تھے۔ ان کی آگاہی حتمی و علمی ہوگی، اس میں خلاف کا احتمال نہیں تھا۔

نیز ''یُرھِق'' کے معنی ڈھانپنے اور سخت بوجھ دینے کے ہوتے ہیں۔ یہی دوسرے معنی یہاں زیادہ مناسب ہیں جیسا کہ اس سے پہلے ''ولا ترھقنی من امری عسراً'' کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ میں ڈرا کہ یہ انہیں بھی کفر و سرکشی پر مجبور نہ کردے۔

قرآن فرماتا ہے کہ ہم نے ان ماں باپ سے یہ بیٹا لے کر اس کے بدلہ پاک و پاکیزہ بیٹا انہیں دیا جو صلۂ رحمی کے لحاظ سے زیادہ مہربان ہوا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۲۲۔ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝۸۱

(الکھف: ۸۱)

آیت کے ظاہری کلمات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت خضرؑ کا کلام ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی کیا ہے کہ یہ خود اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اگر یہ احتمال مان لیا جائے تو اس آیت میں علم بدیع کی ''صنعتِ التفات'' کا قائل ہونا پڑے گا جو یہاں متکلم ''فاردنا'' سے غائب ''ربھما و یبدلھما'' کی طرف ہے۔

اس سے پہلے والی آیت میں کسی قدر یہی دونوں کمزور احتمال بھی آسکتے ہیں۔ بہرکیف آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ماں باپ کے ایمان کی اہمیت اس سے زیادہ تھی کہ اس پر ان کے بیٹے کی ہلاکت گوارا کر لی جائے تاکہ ان کا ایمان محفوظ رہ سکے اور اس پر کوئی حرف نہ آئے۔

اس آیت کا جملہ ''خیر منہ زکٰوۃ'' سے مراد اس دوسرے بیٹے کی دوسری خصوصیت کا بیان ہے اور شاید یہ اشارہ کرنا بھی مقصود ہو کہ پہلے بیٹے میں پاکیزگی نہیں پائی جاتی تھی اگرچہ حضرت موسیٰؑ نے اسے ''نفس زکیه'' ہی کہا تھا۔ پھر ''اقرب رحما'' کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا بیٹا اس پہلے کی نسبت ماں باپ سے زیادہ محبت و مہربانی کرنے والا ہوگا اور انہیں ان کی مرضی کے خلاف کرم کرنے پر مجبور نہیں کرے گا۔

آخر میں دیوار تعمیر کرنے کے راز سے یوں پردہ اٹھایا کہ اس دیوار کے نیچے خزانہ دبا ہوا تھا جو دو بچوں کا تھا۔ ان کا باپ چونکہ ایک

پاک وصالح شخص تھا لہٰذا اس کی خاطر اللہ نے چاہا کہ یہ خزانہ محفوظ رہ جائے تا کہ یہ یتیم بچے جوان ہو کر اس خزانہ کو نکال لیں۔ بہر حال یہ تینوں کام اللہ تعالیٰ کی رحمت کے زیر سایہ عمل میں آئے اگر چہ آپ (حضرت موسیٰؑ) کی نظر میں یہ کام برے اور فاجعہ ہی شمار ہوتے ہوں۔

پس معلم نے آخر میں اس بات کا اشارہ کیا کہ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ جو کام کرنے کا حکم ہمیں اللہ تعالیٰ دے گا اس کو انجام دیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۳۲۔ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۸۲ (الکھف: ۸۲)

دوسرے کام کی تعبیر میں بتلایا گیا ہے کہ والدین کے ایمان کی خاطر ان کے ناخلف فرزند کو قتل کر دیا گیا اور خدا اس کی جگہ صالح بیٹا انہیں دے گا تو تیسرے کام کے سلسلہ میں باپ کا صالح ہونا موجب ہوا کہ اس کی موت کے بعد اس کے بچوں کا مال ولیِ خدا کے توسط سے محفوظ کر دیا جائے تا کہ خود بالغ ہو کر اس پر قبضہ کر لیں۔

نکات!

حضرت موسیٰؑ کی اپنے معلم کے ساتھ داستان کے بیان کے ساتھ ساتھ ہم نے آیات کی لغات اور جملوں کے معانی کے بیان کے سلسلہ میں بھی پوری کوشش کی۔ اب جو اہم ترین مطلب باقی ہے وہ اس داستان سے حاصل شدہ اصلاحی نکات کا بیان ہے۔ لہٰذا مختصراً درج ذیل نکات کو بیان کرتے ہیں۔

۱۔ انسان جتنا بھی پڑھ لکھ کر ترقی کر جائے اسے علم کی تحصیل سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ حضرت موسیٰؑ جیسے عالم کہ جن کے سینے میں تورات جیسی کتاب کا علم موجزن ہے، وہ بھی علم کی زیادتی کے طالب پائے جاتے ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے معلم کے اوصاف "عبدا من عبادنا اتینه رحمة من عندنا و علمنه من لدنا علماً" کہہ کر بیان فرمائے۔ اس آیت میں عبداً کا کلمہ پہلے ذکر فرمایا گیا ہے۔ شاید اس سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہو کہ تمام فضائل وکمالات کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ جس نے بندگی کی راہیں طے کر لیں اس نے معرفت کی وہ تمام چوٹیاں سر کر لیں جنہیں دوسرے علوم حاصل کرنے والے طے نہیں کر سکتے۔ حضرت موسیٰؑ کے یہ راہنما بندگی خواہ اور ہوا وہوس پر ضبط کے ذریعہ اس منزل پر فائز ہو چکے تھے کہ مستقبل میں واقع ہونے والے واقعات کو دیکھ لیتے تھے۔ ان کا علم اشیاء کے ظاہر سے آگے بڑھ کر باطن پر جار کرتا تھا۔ آیات وروایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان استاد وشاگرد میں سے ہر فرد ایک خصوصیت کا حامل تھا جو دوسرے میں نہیں تھی۔ حضرت موسیٰؑ کو شریعت و احکام کا علم تھا تو اس رہنما کو اشیاء کے باطن کا۔

۲۔ اس پوری داستان سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے دو قسم کے سرپرست مقرر فرمارکھے ہیں: ایک ظاہری سرپرست اور دوسرا باطنی سرپرست (یعنی مخفی و پوشیدہ باتوں کا عالم)

ظاہری سرپرست کو لوگ دیکھتے ہیں اور اس کے وجود سے ظاہر بظاہر استفادہ کرتے ہیں جب کہ مخفی سرپرست لوگوں میں موجود ہوتا ہے لیکن لوگ اسے نہیں دیکھتے۔ وہ اپنے سرپرستی کے تقاضے پورے کرتا رہتا ہے اور لوگوں کو اس کے وجود سے ایسے ہی فائدہ پہنچتا ہے جیسے بادلوں کے پیچھے سورج سے یعنی وہ اپنے کام اس طرح انجام دیتا ہے کہ لوگ متوجہ نہیں ہو پاتے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک کلام میں سرپرست وولی کی ان دو قسموں کو بیان فرمایا ہے:

اللھم بلی لا تخلو الارض من قائمٍ لله بحجة اما ظاھراً مشھوراً اوخائفاً مغموراً[1]

یعنی ”خدایا! زمین خدا کی قائم حجت سے کبھی خالی نہیں رہتی، حجت یا ظاہری ہوگی یا عوام الناس کے خوف سے مخفی ہوگی“۔

ان دو قسموں کے پیش نظر ہم عرض کریں گے کہ حضرت امام زمان حجۃ ابن الحسنؑ (سلام اللہ علیہ) دوسری قسم کے ولی وسرپرست ہیں۔ وہ حضرت خضرؑ کی مانند امت کی مصلحتوں کو سمجھتے ہیں اور پوشیدہ رہ کر ان کے تقاضے پورے کرتے ہیں، اگرچہ ہمیں ان کا پتہ نہیں چلتا۔

۴۔ انسانوں کو بہت سے تلخ حوادث ومصائب پیش آتے ہیں لیکن ان کا انجام ان کے لیے اچھا ہوتا ہے۔صرف حادثہ کے ظاہر کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کر دینا چاہیے۔ کشتی میں سوراخ کرنا اور جوان کو قتل کر دینا سب کی نظر میں، حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰؑ جیسے پیغمبر کی نظر میں ناگوار واقعہ تھا۔لیکن جن کی نظریں امور کے باطن پر ہوتی ہیں ان کے نزدیک یہ واقعات بڑے مفید وخوشگوار تھے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اکثر زندگی کے نشیب وفراز اور مصائب ومسائل ایسے ہی ظاہر وباطن رکھتے ہیں۔لہٰذا انسان کو انہیں اپنے لیے بہتر سمجھنا چاہیے نہ کہ برا۔

آج کے دور میں پڑھے لکھے حضرات ان مصائب کو شر محض کہہ کر اللہ تعالیٰ کی رحمت ورأفت اور عدل کے ساتھ اس کا موازنہ کرتے ہیں اور پھر ان دونوں کو آپس میں متضاد گمان کرتے ہیں۔حالانکہ یہ تضاد صرف ظاہر پر نظر رکھنے والوں کے لحاظ سے ہوتا ہے، جن کی نظریں امور کے حقائق کو پا لیتی ہوں وہ ایسا ہرگز نہیں سوچتے۔

۵۔ کشتی میں سوراخ کرکے اسے ظالم حاکم سے بچا لینا، چونکہ وہ سالم کشتیاں چھینتا تھا ہر کسی کے لیے نمونہ عمل نہیں ہے بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاشرہ کی سرپرستی کی ذمہ داری سونپ رکھی ہو۔ البتہ دیوار تعمیر کرکے یتیموں کا مال محفوظ کر دینا سب کے لیے نمونہ عمل بن سکتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار ۱۴۷

جوان کا قتل کرنا، صرف اس جرم میں کہ وہ آئندہ ماں باپ کے لیے مشکلات کا باعث بن سکتا ہے مفسرین کے لیے مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے کیونکہ یہ اصولِ مسلم ہے کہ ظلم وجنایت سے پہلے قصاص لینا قبیح ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، وہ بچہ نہیں تھا، بلکہ بالغ شخص تھا، ماں باپ کا راستہ چھوڑ چکا تھا اور انہیں تکلیفیں پہنچاتا رہتا تھا۔ اب خطرہ تھا کہ وہ ماں باپ کو گمراہ نہ کر دے۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں ایسے شخص کی سزا قتل ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے مرتد افراد (جنہوں نے گئوسالہ کی پرستش کی تھی) کو موت کی سزا دی تھی۔ ایسے فاسد اور مفسد شخص کا زندہ رہنا کبھی مفید نہیں ہو سکتا اور موسیٰؑ کے رہنما نے جو اس جوان کے مستقبل کا حوالہ دیا اس کے جرائم کے دوگنا ہونے کا پتہ بتلاتا ہے۔

۶۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے رہنما کا یہ واقعہ تورات وانجیل میں نہیں آتا۔ لیکن ''اعلامِ قرآن'' کے مصنف نے (جو گیارہویں صدی میں ہو گزرا ہے) یہودی علما کی کتب سے ایک داستان نقل کی ہے جو حضرت موسیٰؑ کی اس داستان کے مشابہ ہے لیکن وہاں موسیٰؑ کی بجائے الیاسؑ کا تذکرہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ داستان صحیح ودرست ہو تو بھی یہ دو الگ الگ داستانیں ہیں نہ کہ ایک۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے:

یوشع نے اللہ سے الیاسؑ کے ساتھ ملاقات کی درخواست کی۔ اُن کی دعا قبول ہوئی اور انہوں نے حضرت الیاسؑ سے ملاقات کی۔ یوشع نے الیاسؑ سے بعض اسرار کے اظہار کی درخواست کی تو الیاسؑ نے کہا تم میں ان کے برداشت کی صلاحیت نہیں ہے۔ جب یوشع نے اصرار کیا تو الیاسؑ نے قبول کر لیا۔ بشرطیکہ یوشع جو بھی دیکھیں گے اس پر خاموش رہیں گے، سوال نہیں کریں گے۔ اگر سوال کر لیا تو الیاس ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یوں دونوں سفر پر چل پڑے۔

ابتدائی مرحلہ میں وہ ایک شخص کے گھر مہمان بنتے ہیں۔ اس صاحب خانہ نے اُن کی بڑی اچھی مہمان نوازی کی۔ اس گھر والوں کے پاس کل جمع پونجی ایک گائے تھی جس کا دودھ بیچ کر وہ گزارا کرتے تھے۔ الیاس نے حکم دیا کہ صاحب خانہ اس گائے کو ذبح کر دے۔ یوشع کو اس حرکت پر بڑا تعجب ہوا اور سوال کیا کہ آپ نے ایسا حکم کیوں کیا؟ الیاسؑ نے وعدہ یاد دلایا اور یوشع خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد وہ اگلی آبادی میں پہنچے اور ایک امیر شخص کے گھر وارد ہوئے۔ یہاں الیاسؑ نے ایک گرتی ہوئی دیوار تعمیر کر کے اسے ٹھیک کر دیا۔ اس سے اگلی آبادی میں الیاسؑ نے چند اشخاص کو جنہوں نے اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا تھا، دعا دیتے ہوئے کہ آپ سب کو ریاست نصیب ہو۔ (امارت) اس سے اگلی آبادی میں اُن کی خوب پذیرائی ہوئی لیکن اُن کو الیاس دعا دیتے ہیں کہ ان میں سے صرف ایک آدمی کو ریاست نصیب ہو۔ بالآخر یوشع ابن لاوی اسے برداشت نہ کر سکے اور تمام چاروں کاموں کے بارے میں پوچھا: الیاسؑ نے کہا کہ پہلے گھر میں صاحب خانہ کی بیوی بیمار تھی اگر وہ گائے صدقہ کے طور پر ذبح نہ کی جاتی تو اس کی بیوی فوت ہو جاتی اور صاحب خانہ کے لیے یہ نقصان گائے کی نسبت زیادہ ہوتا۔

دوسرے گھر میں دیوار کے نیچے خزانہ تھا جو ایک یتیم بچے کی ملکیت تھا جس کا محفوظ رہنا ضروری تھا۔

تیسری بستی والوں میں سب کے لیے امارت کی دعا کی تا کہ ان میں نظم ونسق بحال نہ ہو سکے۔ اور ہمیشہ آشوب برپا رہے جب کہ چوتھی آبادی کے لیے ایک آدمی کی امارت کی دعا کی تا کہ اُن کے معاملات بہتر رہیں اور نظم ونسق صحیح چلتا رہے۔

چودھویں پیغمبر

حضرت داؤد علیہ السلام کی سرگزشت

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے عظیم پیغمبروں سے تھے جو نبوت کے علاوہ مقامِ امامت پر بھی فائز تھے اور بنی اسرائیل کے امور و مسائل کی باگ ڈور بھی انہی کے ہاتھ میں تھی۔ قرآن مجید نے ان کے حالات سورہ بقرہ، انبیائ، نمل، سباء اور ص میں بیان فرمائے ہیں۔ سورہ بقرہ اور ص میں اُن کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔ ہم سب آیات کا تذکرہ ان کی مناسب جگہوں پر کریں گے۔

حضرت داؤدؑ کا نام قرآن میں ۱۶ جگہ پر آیا ہے یعنی سورہ بقرہ ۲۵۱، نساء ۱۶۳، مائدہ ۷۸، انعام ۸۵، اسراء ۵۵، انبیاء ۷۸، ۷۹، نمل ۱۵، ۱۶، سبا ۱۰ تا ۱۲، ص ۱۷، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۳۰۔

حضرت داؤدؑ کے حالاتِ زندگی شروع کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم ان کی ایک جنگ کا تذکرہ کرتے ہیں جو ان کی شہرت کا موجب بنی اور وہ اسی جگہ کے بعد بڑے مقامات تک پہنچے۔ لہٰذا ہم پہلے اسی واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

یوشع ابن نون کی کوششوں سے بالآخر بنی اسرائیل سرزمین فلسطین میں داخل ہو گئے۔ یوشع نے زمین کو ان کے درمیان تقسیم کر دیا۔ جب تک یوشع زندہ رہے ان کے جھگڑوں کے فیصلے خود کرتے تھے۔ گویا اُن کی زندگی کا طریقہ کار حضرت موسیٰؑ کی وفات سے ۳۵ سال بعد تک اسی طرز پر چلتا رہا، یعنی خدا کے حکم سے ایک نبی ان کی ہدایت کا فریضہ بھی انجام دیتا تھا اور اختلافات وغیرہ میں قاضی بھی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور شخص بادشاہ کے عنوان سے نہیں تھا (یعنی ان میں کوئی شاہی حکومت نہیں تھی)۔ اس دوران بنی اسرائیل مختلف اقوام کے زیر اثر ہے۔ عمالقہ (جس قوم کو انہوں نے فلسطین سے نکال دیا تھا) اور آرامیوں کے ساتھ ان کی جنگیں گاہے بگاہے ہوتی رہتی تھیں کبھی وہ غالب آ جاتے کبھی بنی اسرائیل، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو انہوں نے قیدی بنالیا اور ان کو ذلت و خواری کی زندگی پر مجبور کر دیا۔

تاریخ میں آتا ہے کہ فلسطینیوں کے حملوں میں بنی اسرائیل جب جنگ پر جاتے تو ایک صندوق میں تورات بھی تبرکاً ساتھ لے جاتے تھے۔ اتفاقاً ایک حملے میں مخالفین نے ان کے صندوق پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنے بت خانہ میں لے گئے۔ بنی اسرائیل کی یہ شکست اور صندوق کا نہ ہونا اُن کے لیے ناقابل برداشت اور تکلیف دہ بن گیا۔

اُن کی شکست، صندوق جوان کے لیے بڑا افتخار تھا اس کا ہاتھ سے دے بیٹھنا اور کچھ لوگوں کا اسیر ہو جانا وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے بنی اسرائیل اپنے نبی کے پاس گئے جن کا نام اشموئیل [1] تھا (عربی میں اسماعیل کہا جاتا ہے) اور ان سے درخواست کی کہ اُن کے لیے ایک حاکم مقرر کر دیں جس کی سرکردگی میں وہ جہاد اور دفاع کریں۔ وہ نبی ان کی نفسیات سے مکمل طور پر آگاہ تھا کہ یہ پیمان شکن لوگ ہیں جو جنگ کا وعدہ

---

[1] مجمع البیان، ج ۱ ص ۳۵۰

کر کے پیچھے ہٹ جانے والے ہیں۔

بہر حال ان کے لیے ایک حاکم مقرر ہوا جس سے اُن کی پیمان شکنی ظاہر ہوگئی۔ اب ہم اس حصہ سے متعلق آیات کو ذکر کرتے ہیں جن میں داوٗدؑ کی مخالفین کے ساتھ جنگ کا تذکرہ ہے جس میں کامیابی کے نتیجہ میں حضرت داوٗدؑ منصبِ نبوت پر فائز ہوئے۔

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّہُمُ
ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ قَالَ ہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ
الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا
مِنۡ دِیَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ؕ
وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۴۶﴾

۲۔ وَقَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ
لَہُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ وَلَمۡ یُؤۡتَ سَعَۃً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ
اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىہُ عَلَیۡکُمۡ وَزَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ
مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۷﴾

۳۔ وَقَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اٰیَۃَ مُلۡکِہٖۤ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ التَّابُوۡتُ فِیۡہِ سَکِیۡنَۃٌ مِّنۡ
رَّبِّکُمۡ وَبَقِیَّۃٌ مِّمَّا تَرَکَ اٰلُ مُوۡسٰی وَاٰلُ ہٰرُوۡنَ تَحۡمِلُہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ
لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۴۸﴾

۴۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبۡتَلِیۡکُمۡ بِنَہَرٍ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ
مِنۡہُ فَلَیۡسَ مِنِّیۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ یَطۡعَمۡہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡۤ اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَۃًۢ بِیَدِہٖ ۚ
فَشَرِبُوۡا مِنۡہُ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَہٗ ہُوَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ ۙ قَالُوۡا
لَا طَاقَۃَ لَنَا الۡیَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِہٖ ؕ قَالَ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوا

اللّٰهِ ؕ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

۵۔ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

۶۔ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

۷۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾ (البقرة ۲۴۶ تا ۲۵۲)

آیات کا ترجمہ

۱۔کیا آپ نے زعمائے بنی اسرائیل کو نہیں دیکھا، حضرت موسیٰؑ کے بعد جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک حاکم مقرر کر دیں تا کہ اس کی سرکردگی میں ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔اُن کے نبی نے کہا کہ اگر اللہ تم کو جہاد کا حکم دے تو تم شاید جہاد سے منہ موڑ جاؤ۔انہوں نے کہا ہم راہِ خدا میں کیوں جنگ نہ کریں گے۔ جب کہ انہوں نے ہماری زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے اور ہمارے بیٹوں کو اسیر کر لیا ہے؟ لیکن جب ان کو جہاد کا حکم دیا گیا تو سوائے معدودے چند افراد کے سب نے جنگ سے روگردانی کر لی، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پہچانتا ہے۔

۲۔اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تم پر حاکم مقرر فرمایا ہے۔بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا کہ وہ کیسے ہمارا حاکم بن سکتا ہے حالانکہ اس کی نسبت ہم بادشاہت کے زیادہ لائق ہیں، اس کے پاس تو کوئی مال و دولت بھی نہیں ہے۔اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ اللہ نے اُسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور اس کو علم اور قوتِ جسمانی میں اضافہ عطا فرمایا ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں

سے جسے چاہتا ہے حاکمیت عطا فرماتا ہے۔ وہ وسیع فضل کا مالک اور دانا ہے۔

۲۔ اُن کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی حاکمیت کی نشانی یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس وہ صندوق لائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکون و تسکین ہے اور آلِ موسیٰؑ و آلِ ہارونؑ کے باقی ماندہ تبرکات، اس حال میں کہ فرشتے اُسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اسی میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم صاحبِ ایمان ہو۔

۳۔ (طالوت کے حاکم ہونے کی نشانی جس میں تابوت کا آنا طے ہو چکا تھا، متحقق ہوگئی، بنی اسرائیل نے اُسے حاکم تسلیم کر لیا اور طالوت فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا)۔ اس موقع پر طالوت نے اپنے ماتحت لشکر سے کہا کہ اللہ تعالیٰ ایک نہر کے ذریعے (جب کہ تم پیاسے ہو گے) تمہیں آزمائے گا۔ جس نے اس سے پانی نہ پیا یا صرف ایک چلو پانی پیا وہ مجھ سے ہو گا۔ لیکن (افسوس) سوائے چند ایک کے باقی سب نے اس سے پانی پی لیا۔ جب طالوت نے اپنے اوپر ایمان لانے والے افراد کے ساتھ نہر عبور کی تو وہ کہنے لگے ہم اس تھوڑی سی فوج کیساتھ جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن جو گمان رکھتے تھے کہ اللہ سے ملاقات کریں گے، کہنے لگے کہ ڈرو نہیں۔ بسا اوقات چھوٹے گروہ بڑے گروہوں کو شکست دے دیتے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

۵۔ جب طالوت اپنی فوج کے ساتھ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے پہنچے تو کہنے لگے کہ خدایا! ہمیں صبر عطا فرما! میدانِ جنگ میں ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر قوم پر ہمیں فتح عطا فرما۔

۶۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے دشمن کو شکست دے دی اور داوٗدؑ نے (جو طالوت کے لشکر میں ہی اُن کے ماتحت تھے) جالوت کو قتل کر دیا جس کے نتیجہ میں اللہ نے انہیں سلطنت اور حکمت عطا فرمائی، نیز جو کچھ چاہا اس کی انہیں تعلیم دی۔ اگر اللہ تعالیٰ بعض افراد کے شر کو بعض دوسرے افراد کے ذریعے دور نہ کرے تو زمین فتنہ و فساد سے پُر ہو جائے۔ لیکن اللہ کائنات پر فضل کرنے والا ہے۔

۷۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم حق کے ساتھ آپ پر تلاوت کرتے ہیں اور بتحقیق آپ مرسلین

سے ہیں۔

آیات کی موضوعی تفسیر

پہلے ذکر ہو چکا کہ بنی اسرائیل نے اپنے قیدیوں کی رہائی اور مقبوضہ علاقوں کی آزادی کی خاطر اپنے نبی سے درخواست کی تھی کہ اُن کے لیے حاکم مقرر کریں تا کہ اس کی سرکردگی میں وہ جہاد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو، جو حضرت یعقوبؑ کے بیٹے بنیامین کی نسل سے تھا، اُن پر حاکم چن لیا۔ اس موقع پر حسب سابق بنی اسرائیل اپنے نبی پر اعتراض کرنے لگے، انہوں نے طالوت کے چناؤ پر تین اعتراض کیے۔

۱۔ بنیامین کی نسل میں کوئی نبی نہیں ہوا۔ لہٰذا حاکم ایسے قبیلہ سے بنایا جائے جس میں نبوت رہی ہو۔

۲۔ بنیامین کی نسل سے ابھی تک کوئی شخص بھی حاکم نہیں ہوا۔

۳۔ اس کے پاس مال و دولت نہیں ہے کہ اس کے ذریعے جنگ کے نقصانات کو پورا کر سکے۔

قرآن مجید نے ان مندرجہ اعتراضات کو یوں نقل فرمایا ہے:

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ (بقرہ:۲۴۷)

پہلے جملے "انی یکون له الملك" میں پہلے دو اعتراضات کی طرف اشارہ مقصود ہے اور دوسرا جملہ ان کے تیسرے اعتراض کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے پہلے دو اعتراضوں کا جواب یوں دیا: ''سربراہی کی شرط اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تم پر برگزیدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس کی حاکمیت کے لیے کافی ہے، اس کے بزرگوں میں کوئی اس منصب کا حامل ہو یا نہ ہو۔

ان کے تیسرے اعتراض کے جواب میں ارشاد ہے کہ حکمرانی کی شرط اس کے لیے علم و فہم اور جسمانی قوت کا ہونا ہے اور طالوت میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ نیز سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ حکومت جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے کاموں میں مشورہ لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اس کے تمام کام علم و حکمت کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ (بقرہ: ۲۴۷)

ہمیشہ کی طرح بنی اسرائیل نے اس مرتبہ بھی اپنے نبی کے کہہ دینے کو کافی نہ سمجھا اور طالوت کی خدا کی طرف سے بادشاہت پر نشانی مانگنے لگے۔ خطاب آیا کہ اس کی بنی اسرائیل پر سربراہی کی نشانی یہ ہے کہ میدانِ جنگ کی طرف جانے سے پہلے وہ صندوق واپس آ جائے گا جسے دشمن نے چھین لیا تھا، اس میں تورات اور آلِ موسیٰؑ و آلِ ہارونؑ کے باقی ماندہ تبرکات تھے۔ اس حال میں کہ ملائکہ اسے اٹھائے ہوئے ہوں

گے اور وہ دوبارہ سرزمین فلسطین پر لوٹ آئے گا۔

اس صندوق میں وہ تورات رکھی ہوئی تھی جو حضرت موسیٰؑ پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھی، جب عرب کے عمالقہ نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا تو یہ صندوق ان کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ گویا جنگ میں بنی اسرائیل اس صندوق کو ساتھ لے جاتے تھے۔ اس صندوق میں تورات کے علاوہ حضرت موسیٰؑ کا عصا، جوتے اور حضرت ہارونؑ کا عمامہ بھی تھا۔ یہ سب کے سب لوٹ لیے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کی صداقت کی علامت یہ بتائی کہ صندوق اپنے تمام تبرکات سمیت دشمن کی سرزمین سے بغیر کسی انسانی مدد کے بنی اسرائیل میں لوٹ آئے گا اور اسے اٹھانے والے ملائکہ ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۲۴۸ (بقرہ: ۲۴۸)

اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ صندوق اپنے تمام تبرکات سمیت واپس پہنچ گیا۔ یقیناً منصف مزاج افراد کے لیے یہ معجزہ علم و یقین کا موجب تھا۔ لہٰذا مجبوراً انہوں نے طالوت کو سربراہ مان ہی لیا اور اس کے پرچم تلے جنگ کے لیے جمع ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ فوجیوں کی تعداد ستر سے اسی ہزار افراد تک تھی۔ جب انہوں نے تابوت کو دیکھا تو اسے اچھی فال سمجھا اور جنگ میں کامیابی پر یقین کر لیا۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ جنگ میں کامیابی کی پہلی شرط صبر و بردباری ہوتی ہے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ حقیقی مجاہدوں کو نمائشی مجاہدوں سے جدا کیا جائے۔ اس کا طریقہ کار یہی تھا کہ صبر و بردباری کے ذریعہ سے ان کا امتحان لیا جائے۔

طالوت نے اپنے لشکر والوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعہ آزمائے گا، وہ اس طرح کہ جو اس نہر سے پانی نہ پیئے گا یا صرف ایک چلو کی حد تک پیئے گا، وہ مجھ سے ہوگا جو اس بات کی علامت ہوگی کہ اس میں صبر و بردباری پائی جاتی ہے۔ لیکن جن میں اپنے آپ پر ضبط نہیں ہوگا وہ اس سے زیادہ پانی پئیں گے اور میری ولایت سے خارج ہوں گے۔ تعجب کی بات ہے کہ یہ معجزہ دیکھ لینے کے باوجود اکثریت اس امتحان میں ناکام ہو گئی، سوائے چند افراد کے جن کی تعداد مشکل سے تین سو سے زیادہ نہ تھی، اگرچہ بعض لوگوں نے اُن کی تعداد چار ہزار تک بھی لکھی ہے۔

اس موقع پر طالوت نے اکثریت کو ساتھ چلنے سے روک دیا اور اسی کم تعداد کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ راستے میں چند نفر، جو اس امتحان میں کامیاب ہو چکے تھے اپنی کمزوری کا رونا روتے رہے اور کہتے رہے کہ اس کم تعداد کے ساتھ کیسے دشمن کی اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اس جماعت میں چند مخلص افراد بھی تھے جنہیں اللہ تعالیٰ کی نوازشات پر مکمل بھروسہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے ان اعتراض کرنے والوں سے کہا کہ افراد کی کمی یا بیشی سے فتح و شکست کا معیار نہیں دیکھا جاتا کیونکہ تاریخ بشریت شاہد ہے کہ بسا اوقات کم تعداد فوجوں نے لائق سالار اور

مستحکم ایمان کے زیر سایہ بڑی کثیر تعداد فوجوں کو شکست دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام حقائق کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ (بقرہ: ۲۴۹)

بس دونوں لشکروں میں جنگ چھڑ گئی۔ ایماندار افراد کا نعرہ یہ تھا کہ خدایا! ہمیں صبر عطا فرما، میدانِ جنگ میں ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ (بقرہ: ۲۵۰)

یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایماندار بندوں پر فضل و کرم فرماتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بندے بھی اُن کی نعمات سے صحیح استفادہ کریں۔ لہٰذا مومنین کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے اُسے راہِ خدا میں خرچ کریں اسی وجہ سے ایسی جماعت جنگ میں کامیاب ہوتی ہے۔

بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے طالوت کے لشکر کے ایک سپہ سالار کا نام ذکر فرمایا ہے جس نے جالوت کو قتل کر کے دشمن کی شکست یقینی بنا دی۔ وہ شخص قوم بنی اسرائیل کے ایک فرد داؤدؑ نامی تھے۔ ان کو اسی شجاعت کی وجہ سے بعد میں حکمرانی، نبوت، علم اور حکمت عطا ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ (بقرہ: ۲۵۱)

اس آیت کے ذیل میں اللہ تعالیٰ نے فلسفۂ جہاد کا ذکر فرمایا ہے، وہ یہ کہ اگر مفسد و خرابکار قوموں سے جنگ و مبارزہ نہ کیا جائے تو زمین فساد سے بھر جائے گی۔ اگر چہ جہاد میں دونوں طرف سے نیک و بد لوگ قتل ہوتے ہیں، لیکن اس کے نتیجہ میں معاشرہ برے لوگوں سے پاک ہو جاتا ہے، ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

تمنوا الفتنة ففيها هلاك الجيابرة وطهارة الارض من الفسقة [1]

یعنی "فتنہ کی تمنا کریں کیونکہ اس میں ظالم ہلاک ہوجاتے ہیں اور زمین فاسقوں سے پاک ہوجاتی ہے"۔

قرآن وحدیث میں فتنہ مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ امتحان وآزمائش کے لیے جیسے فرمایا:

اِنَّمَآ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ (تغابن: ۱۵)

۲۔ وہ شورشیں جن میں ہدف ذاتِ الٰہی نہ ہو، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

کن فی الفتنة کابن اللبون لا ظهر فير كب ولا ضرع فيحلب [2]

یعنی "ان بے ہدف شورشوں میں اونٹ کا ایسا بچہ بن جاؤ جس میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ اس پر سواری کی جائے یا اُسے دوہا جا سکے"

۳۔ باہدف تحریکیں اور انقلابات۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں بھی فتنہ کے معنی یہی ہیں۔ آج کل جدید عربی میں اس کے بجائے "تورہ" کی لفظ استعمال کی جاتی ہے۔ ہم نے خود انقلابِ اسلامی ایران میں مشاہدہ کیا ہے کہ کس طرح ظالم لوگ ہلاک ہوگئے اور سرزمین ایران ان فاقوں کے ناپاک وجود سے پاک ہوگئی۔ یہی مطلب اس آیت میں آیا ہے:

وَلَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۵۱﴾ (بقرہ: ۲۵۱)

اس حصہ کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ طالوت وجالوت اور داؤد کا قصہ دوسری کتابوں میں اس طرح آیا ہے کہ ان میں حق و باطل میں تمیز نہیں ہوتی جب کہ صحیح وحق بات وہی ہے جو یہاں (قرآن) میں ذکر ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: تلك ايت الله نتلوها عليك بالحق وانك لمن المرسلين یہ جو کہا گیا ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتب پر غالب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ لہٰذا واقعات قرآن پر پیش کیے جائیں تاکہ صحیح وغلط کی تشخیص ہو سکے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا

---

[1] تنبیہ الخواطر ونزہۃ النواظر ج ۲، ص ۹۳، طبع اول (ورام بن ابی فراس)

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱، ابن لبون دوسالہ اونٹ کو کہتے ہیں

عَلَيْهِ (مائدہ:۴۸)

سموئیل کی کتاب میں قصہ طالوت دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے کیوں ''بالحق'' کی لفظ یہاں ذکر فرمائی۔ اس کتاب میں یوں بیان ہوا ہے:

شاودل (طالوت) بن قیس جو بنیامین کی نسل سے تھا، ایک خوش اندام وخوبصورت شخص تھا۔ اپنی بادشاہت کے دور میں اس نے عمالقہ اور فلسطینیوں پر مختلف جنگوں میں غلبہ حاصل کیا۔ لیکن غرور وتکبر نے اسے راہِ حق سے دور کر دیا۔ وہ داؤد کے ساتھ دشمنی کا اظہار کرنے لگا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس سے توجہ ہٹالی۔ شاؤدل نے ایک عملِ حاضرات کی ماہر عورت سے حضرت سموئیل پیغمبر کی روح سے مدد مانگی۔ اسے جواب ملا کہ فلسطینیوں سے شکست کھاؤ گے اور بادشاہی ہاتھ سے دے بیٹھو گے۔ اگلے دن اسے فلسطینیوں کے ساتھ جنگ میں شکست ہوئی اور اس کے تین بیٹے جنگ میں مارے گئے، خود بھی زخمی ہوا۔ قریب تھا کہ گرفتار کرلیا جاتا لیکن اس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور اسی پر گر کر مر گیا۔ [1]

جس شخص کو قرآن نے "زادہ بسطة فی العلم والجسم" جیسے اوصاف سے متصف کیا ہو، اس کی سربراہی میں ولایت بھی ہو اور وہ اپنے ماتحت افراد کو پیاس پر صبر کے ذریعے آزمائے، کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کا انجام اس طرح کا ہو۔ لہٰذا اسی واقعہ میں سموئیل کی کتاب کو قرآن سے موازنہ کر کے قرآن کے ان کتب پر "مھیمن" وغالب ہونے کو سمجھا جا سکتا ہے۔

---

[1] اعلام القرآن، ص ۴۰۳

تعارف

حضرت داؤدؑ بزبانِ قرآن مجید

قرآن کریم نے حضرت داؤد کو درج ذیل خصوصیات کے ساتھ متصف فرمایا ہے:

اللہ تعالیٰ نے انہیں منصبِ نبوت اور کتاب عطا فرمائی، علم و حکمت عطا کی، ہنر وصنعت کی نعمت سے نوازا، صالح و نیک فرزند عطا فرمایا، حکومت و بادشاہت عنایت کی، اس حد تک قدرت وقوت بخشی کہ کائنات ان کے سامنے مسخر ہوگئی، لوہا ان کے ہاتھ میں نرم ہوجاتا تھا۔ ان خصوصیات کو درج ذیل آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾ (نساء ۱۶۳، اسراء: ۵۵)

۲۔ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ (البقرۃ: ۲۵۱)

۳۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ (الانبیاء ۸۰)

۴۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿۱۰﴾

۵۔ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱﴾ (سبا: ۱۱،۱۰)

۶۔ وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ (الانبیاء ۷۹)

۷۔ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ (ص: ۳۰)

۸۔ اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾

۹۔ اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَ الطَّیۡرَ مَحۡشُوۡرَۃً ؕ

کُلٌّ لَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾

۱۰۔ وَ شَدَدۡنَا مُلۡکَہٗ وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحِکۡمَۃَ وَ فَصۡلَ الۡخِطَابِ ﴿۲۰﴾ (ص: ۱۷ تا ۲۰)

آیات کا ترجمہ

۱۔ ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

۲۔ اللہ نے داؤد کو حکومت و حکمت عطا فرمائی اور جو جو علم چاہا اُسے سکھا دیا۔

۳۔ ہم نے اسے زرہ بنانا سکھایا جو تمہارے نفع کے لیے ہے، تاکہ تمہیں جنگ میں خطرہ سے محفوظ رکھے۔ پس کیا تم شکر ادا کرنے والے ہو؟

۴۔ ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے فضیلت عطا کی، (حکم کیا کہ) اے پہاڑو اور اے پرندو! اس کے (تسبیح کرنے میں) ہم صدا بن جاؤ (اس کے ساتھ تسبیح کرو)

۵۔ اس کے لیے ہم نے لوہے کو نرم کر دیا اور کہا کہ اس سے کھلی زرہیں بنائے اور ان کا اندازہ صحیح معین کرے۔ اے آلِ داؤدؑ اعمالِ صالحہ انجام دو کہ میں تمہارے اعمال سے مکمل طور پر آگاہ ہوں۔

۶۔ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا جو سب داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور ہم مسلسل ایسا کرنے والے ہیں۔

۷۔ ہم نے داؤد کو سلیمان (جیسا بیٹا) عطا کیا۔ وہ کیسا اچھا بندہ تھا کہ ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا۔

۸۔ ہمارے بندہ داؤد کو یاد کرو۔ وہ صاحبِ قدرت و نعمت تھا اور ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا تھا۔

۹۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کا تابع کر دیا جو شام و صبح اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ ہم نے تمام پرندوں کو مسخر کر دیا جو سب اسی کے تابع فرمان تھے (اسی کے ساتھ تسبیح کرتے تھے یا اس کے حکم

کے مطابق عمل کرتے تھے)۔

۱۰۔ہم نے اس کی حکومت کو مستحکم کیا اور اسے حکمت اور صحیح فیصلہ کرنا سکھایا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

قرآن نے ان آیات میں ایک ایسے نورانی انسان کی تصویر کشی کی ہے جو خصوصیات کے لحاظ سے کمال کی انتہائی بلند منزلوں پر فائز تھا۔انبیاء میں سے ایسے نبی بہت کم ہوئے ہیں جن میں یہ سب خصوصیات یکجا پائی گئی ہوں۔اب ہم ان خصوصیات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں:

۱۔ حضرت داؤدؑ روحانی و معنوی اعتبار سے ایسے مرتبے پر فائز تھے کہ ان پر وحی و کتاب الٰہی نازل ہوئی۔وہ ان رسولوں میں سے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کتاب نازل ہوئی۔قرآن مجید میں دو مقامات پر ارشاد ہوتا ہے:"واتینا داود ذبوراً"۔اب حضرت داؤد کی زبور (شاید تحریف شدہ صورت میں) عہد عتیق میں موجود ہے۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے زبور سے ایک جملہ ذکر کیا ہے کہ آخرکار زمین کے وارث اللہ کے نیک بندے ہوں گے۔یہی جملہ بعینہٖ موجودہ زبور میں بھی موجود ہے۔اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِي الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّكۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوۡنَ○(انبیاء:۱۰۵)

یعنی"ہم نے زبور میں ذکر (تورات یا قرآن) کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے"۔

موجودہ زبور میں اس بارے میں آیا ہے:

"کیونکہ نیک و متبرک لوگ زمین کے وارث ہوں گے اور ملعونوں کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا"۔[۱]

۲۔ قرب معنوی میں حضرت داؤدؑ اللہ کے اس حد تک متقرب ہو چکے تھے کہ مشیت الٰہی کے مظہر تھے۔یعنی جو کچھ اللہ چاہتا تھا وہی وہ کرتے تھے۔حضرت داؤدؑ دو سطح پر یہ قابلیت بھی رکھتے تھے اور ان کی مشیت کا سرچشمہ مشیت الٰہی تھے۔زرہ بناتے وقت لوہا ان کے ہاتھوں میں آکر سخت نہیں رہتا تھا۔بلکہ موم کی طرح نرم ہوجاتا اور وہ جیسے چاہتے اسے موڑ دیتے،جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے:"والنالہ الحدیں"

۳۔اس معنوی کمال کے زیر سایہ کائنات اور پرندے ان کے ہم صدا ہوگئے تھے،چنانچہ جب حضرت داؤدؑ تسبیح خدا کرتے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہم آواز ہوجاتے،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] مزمور:۶۳،جملہ ۲۳

وَّعَلِمًا ۡ وَّسَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ یُسَبِّحۡنَ وَ الطَّیۡرَ ؕ وَ کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۷۹﴾ (انبیاء

:۷۹)

دوسری آیت میں فرماتا ہے:

اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿ۙ۱۸﴾ وَ الطَّیۡرَ مَحۡشُوۡرَۃً ؕ کُلٌّ

لَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ (ص:۱۹)

اس تسبیح سے مراد تکوینی تسبیح نہیں ہے کیونکہ تسبیح تکوینی تمام موجودات میں پائی جاتی ہے، پرندوں اور پہاڑوں کے لیے مخصوص نہیں۔ علاوہ ازیں تسبیح تکوینی تو تمام موجودات ہر لحظہ انجام دیتی ہیں۔ حضرت داؤدؑ کی تسبیح کی الگ کوئی خصوصیت نہیں۔ تمام موجودات ہر لحظہ اپنی خلقت کے نظم و ضبط کے مطابق اپنے خالق کے کمال کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لہٰذا اس آیت میں تسبیح سے موجودات کی علم و شعور کے ساتھ تسبیح مراد ہے (جیسے انسان اور فرشتے تسبیح کرتے ہیں)۔ بعض آیات بھی اس طرح کی تسبیح پر شاہد ہیں اور ہم اس بحث کو تفصیل کے ساتھ اسی کتاب کی دوسری جلد میں ذکر کر چکے ہیں۔ [۱]

۴۔ حضرت داؤدؑ پر اللہ تعالیٰ کی ایک اور نعمت یہ تھی کہ انہیں اللہ نے ایک نیک، دانا اور عادل بیٹا عطا فرمایا تھا۔ آئندہ صفحات میں حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے مناظرہ کا تذکرہ بھی ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے:

ووھبنا لداود سلیمان نعم العبد انہ اواب (ص:۱۸)

اس آیت میں جملہ "نعم العبد" میں حضرت داؤدؑ کے بیٹے (حضرت سلیمانؑ) کی مدح کا بیان ہے کہ وہ اللہ کا نیک بندہ تھا، ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا تھا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو بادشاہی عطا فرمائی۔ اس سلسلہ میں آیات کے مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤدؑ ایک اچھے حاکم و فرمانروا بھی تھے اور حکیم و دانا بھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ○ (بقرہ: ۲۵۱)

یعنی "اللہ نے اُسے حکومت و حکمت عطا فرمائی جو جو علم چاہا اُسے سکھا دیا"۔

---

[۱] منشورِ جاوید، ج ۲، ص ۸۵ تا ص ۱۱۰

قضاوت میں حضرت داوٗدؑ بطور خلیفۂ خدا

آیات قرآن کے مطابق حضرت داوٗدؑ قضاوت میں بھی زمین پر اللہ کے خلیفہ تھے۔قرآن مجید نے مختصر طور پر دو موارد میں حضرت داوٗدؑ کی قضاوت کا تذکرہ فرمایا ہے۔یہ آیات اس طرح ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا
تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝٢٦ (ص: ٢٦)

۲۔ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝٢١ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ
فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا
بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۝٢٢

۳۔ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۣ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۣ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا
وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۝٢٣

۴۔ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ
لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا
هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝٢٤ ۩

۵۔ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝٢٥ (ص: ٢١ تا ٢٥)

۶۔ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا
لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝٧٨

۷۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ

يُسَبِّحۡنَ وَالطَّيۡرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيۡنَ (انبیاء: ۷۸،۷۹)

آیات کا ترجمہ

۱۔ اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین میں اپنا جانشین مقرر کیا، لہٰذا لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کرو اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو۔ مبادا یہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر دے۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے گمراہ ہو جاتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے کیونکہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے۔

۲۔ کیا تم ان جھگڑا کرنے والوں کی داستان سے مطلع ہو جب وہ داؤدؑ کے حجرہ کی دیوار پر چڑھ آئے، داؤد پر داخل ہوئے، داؤدؑ ان سے ڈر گئے تو انہوں نے کہا آپ مت ڈریئے۔ ہمارا نزاع اس بات پر ہے کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے، زیادتی نہ کریں اور ہمیں صحیح راستے کی ہدایت کریں۔

۳۔ ان میں ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانویں بھیڑیں ہیں جب کہ میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ میں ایک بھیڑ بھی اسے ہی دے دوں اور باتوں میں اس نے مجھے مغلوب کر دیا ہے۔

۴۔ حضرت داؤدؑ نے فیصلہ کیا کہ اُس بھائی نے جو تم سے ایسا مطالبہ کیا ہے اس نے تم پر ظلم کیا ہے۔ بہت سے دوست ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں، مگر وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالحہ انجام دیئے جو بہت کم ہیں۔ لیکن داؤدؑ سمجھ گئے کہ ہم نے ان کا امتحان لیا ہے۔ پس انہوں نے اللہ سے مغفرت طلب کی، جھک گئے اور توبہ کی۔

۵۔ ہم نے بھی یہ ترکِ اولیٰ انہیں بخشا دیا۔ ان کے لیے ہمارے پاس مقام و منزلت ہے اور اچھا انجام بھی۔

۶۔ یاد کرو جب داؤدؑ اور سلیمانؑ نے کسی کے باغ کے بارے میں فیصلہ کیا جب ایک کی بکریاں

دوسرے کے باغ میں جا گھسیں اور اسے تباہ کر دیا اور ہم ان کے فیصلے کے شاہد تھے۔

۷۔ہم نے قضاوت سلیمانؑ کو سمجھا دی، ہر ایک کو علم وحکمت عطا فرمائی اور داؤد کے لیے پہاڑ و پرند مسخر کر دیئے جو اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور سابقہ انبیاء میں بھی ہم یہی طریقہ رکھتے تھے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ان آیات میں داؤدؑ کو زمین میں قضا کی خاطر اللہ کا خلیفہ بتلایا گیا ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ فیصلہ وحکم صرف خدا کا حق ہے اور یہی بات قضاوت میں توحید ہے، مگر قضاوت کا حق اس کو ہے جسے خدا معین فرما دے، جیسا کہ داؤدؑ کو خدا کی طرف سے متعین کیا گیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (ص:۲۶)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے کوفہ کے قاضی شریح سے فرمایا کہ تم ایسی مسند پر بیٹھے ہو جس پر پیغمبر بیٹھتے ہیں یا اُن کے وصی، یا بد بخت انسان۔ [۱]

ایک اور روایت میں آیا کہ قضاوت کرنے سے بچو کیونکہ قضاوت مسلمانوں میں امام کا حق ہے جو اس کا عالم ہو، عادل ہو اور وہ نبی ہوتا ہے یا نبی کا وصی۔ [۲]

لہٰذا اس منصب کے اہل انبیاء ان کے اوصیاء یا ان کے وہ عمومی نائب ہیں جن کی خصوصیات انہوں نے بیان فرمادی ہیں۔ گر قاضی کا اللہ سے رابطہ نہ رہے اور اس کی قضاوت وفیصلے اللہ کے فیصلوں سے ہٹ جائیں تو اُسے قضاوت نہیں کہا جائے گا۔

بعد والی آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ دو شخص مدعی گھر کی دیوار کود کر حضرت داؤدؑ کے سامنے داخل ہوئے۔ جب داؤدؑ نے ان کو یوں داخل ہوتے دیکھا تو ڈر گئے کہ شاید کسی بری نیت سے گھس آئے ہیں جب کہ وہ اپنے دعوی کے فیصلے کی خاطر آئے تھے۔

سوال یہ ہے کہ وہ دونوں انسان تھے جن میں جھگڑا ہوا تھا جس میں وہ فیصلے کے متقاضی تھے یا وہ دونوں فرشتے تھے جنہیں داؤدؑ کے امتحان کے لیے انسان کی شکل میں بھیجا گیا تھا؟ آیات کے ظاہر سے تو پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے لیکن دوسرا احتمال بھی خالی از امکان نہیں ہے۔ شکایت کرنے والے نے حضرت داؤدؑ سے کہا کہ میرا ساتھی میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانویں بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک ہے۔ اس

---

[۱] وسائل الشیعہ ج ۱۸، باب ۳، از ابواب صفات قاضی حدیث ۲، ۳

[۲] وسائل الشیعہ ج ۱۸، باب ۳، از ابواب صفات قاضی حدیث ۲، ۳

کے باوجود وہ ایک بھی مجھ سے لے لینا چاہتا ہے۔ کیا اسے یہ حق پہنچتا ہے جب کہ میرے پاس ایک بھیڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو یوں بیان فرمایا ہے:

اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ (ص: ۲۳)

صحیح قضاوت کا طریقۂ کار مقتضی تھا کہ حضرت داؤدؑ فریق ثانی کی بات بھی سنتے تب فیصلہ کرتے۔ لیکن انہوں نے دوسرے فریق سے کچھ پوچھے بغیر فیصلہ کر دیا اور وہ یہ کہ اُس نے تم سے یہ مطالبہ کر کے تم پر ظلم کیا اور اصولی طور پر اکثر شریک ایک دوسرے کے حق میں ایسی زیادتی کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں سوائے صحیح کردار والے مومن کے جن کی تعداد کم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰی نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ (ص: ۲۴)

انہوں نے حضرت داؤدؑ کا فیصلہ سن لیا اور واپس چلے گئے۔ لیکن اُن کے جاتے ہی حضرت داؤدؑ کو فوراً احساس ہوا کہ انہیں دوسرے فریق کی بات سنے بغیر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا، اگر چہ مدعی کی بات صحیح اور حضرت داؤدؑ کا فیصلہ بھی بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ کسی دولت مند شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی دولت میں اضافہ کی خاطر دوسرے کا مال ہتھیا لے۔ اب حضرت داؤدؑ کو اپنے فیصلہ کے بارے میں احساس ہوا کہ اس سوال کا مقصد ان کی آزمائش کے سوا کچھ نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کی اور خضوع وخشوع کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں متوجہ ہو گئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿۲۴﴾ (ص: ۲۴)

بالآخر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کا یہ ترکِ اولیٰ معاف فرما دیا اور بتلایا کہ داؤدؑ کو ہمارے نزدیک بڑا مقام حاصل ہے۔ نیز اس کا انجام بھی اچھا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ (ص: ۲۵)

یہاں نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ دوسرے فریق سے سوال نہ کرنا گناہ نہیں تھا کہ عصمتِ انبیاء کے منافی ہوتا، بلکہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ مدعی کی بات سچ ہو سکتی تھی پس اگر کوئی اعتراض کرتا بھی تو مشروط طور پر اس کا جواب دیا جا سکتا تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر سوال صحیح ہو تو جواب یہ ہی ہوگا۔ اس بات پر کہ حضرت داؤدؑ نے اس فیصلہ میں کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا، یہی بعد والی آیت شاہد ہے جس میں فیصلہ کے بعد بتایا گیا ہے کہ داؤدؑ کا رتبہ ومقام بلند اور ان کا انجام اچھا ہے۔ پھر اس کے بعد حکم دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے طور پر افرادِ زمین کے درمیان قضاوت کریں۔

حضرت داؤدؑ کا حضرت سلیمانؑ کے مطابق فیصلہ

قرآن نے حضرت داؤدؑ کی ایک اور قضاوت کا تذکرہ کیا ہے جس میں وہ اپنے بیٹے حضرت سلیمانؑ کے ہمراہ کرسیٔ قضا پر بیٹھے ہیں۔ داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ بکریوں کا ریوڑ رات کو ایک باغ میں گھس آیا اور تمام پھول پتیوں کو کھا گیا۔ اس طرح باغ کو اچھا خاصا نقصان پہنچا۔ باغ کے مالک نے حضرت داؤدؑ سے شکایت کی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جرمانہ کے طور پر تمام بکریاں باغ کے مالک کو دے دی جائیں۔

شاید یہ فیصلہ اس بنا پر تھا کہ باغ کو جو نقصان پہنچا تھا وہ تمام بکریوں کی قیمت کے برابر تھا۔ غالباً اس زمانہ میں باغ کے مالک پر رات کو باغ کی حفاظت کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی اور باغات بھی دیوار وغیرہ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ یہ ریوڑ کے مالک کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے ریوڑ کی نگہبانی کرتا تا کہ وہ کسی کے باغ کو نقصان نہ پہنچائے۔

پیغمبر اسلامؐ سے روایت ہے کہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ اسی بنا پر تھا یعنی رات کو بکریوں وغیرہ کی ذمہ داری ان کے مالک پر تھی اور دن کو باغ کی حفاظت باغ کے مالک کے ذمہ ہوتی تھی۔ [۱]

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ یہ قانونِ کلی نہ تھا۔ بلکہ تمام صورتوں میں ریوڑ کے مالک کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ تمام نقصانات کو پورا کرے، جو اس کے ریوڑ کی طرف سے وارد ہوتے تھے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں یہی رواج تھا جس کی بنا پر حضرت داؤدؑ نے فیصلہ فرمایا۔ حضرت کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں اس مسئلہ میں حضرت سلیمانؑ نے جو فیصلہ کیا وہ اُس کے برعکس تھا۔ انہوں نے کہا کہ باغ ریوڑ کے مالک کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ اس پر کام کرے، یہاں تک کہ وہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے اور اتنی مدت تک ریوڑ باغ کے مالک کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ اس ریوڑ کی آمدنی سے فائدہ حاصل کرتا رہے، یہاں تک کہ اس کا باغ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے۔

درحقیقت دونوں فیصلے عدل ہی کی بنیاد پر تھے۔ لیکن فرق صرف یہ تھا کہ حضرت داؤدؑ کے فیصلہ کے نتیجہ میں نقصان کو یک دم پورا کرنا پڑتا جب کہ حضرت سلیمانؑ کے فیصلہ میں یہ نقصان بالتدریج پورا ہوتا جس میں ریوڑ اپنے مالک کے پاس اور باغ اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتا اور جو منافع ضائع ہوئے تھے وہ بھی پورے ہو جاتے۔ قرآن نے دونوں واقعات اختصار کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ [۲] فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا

---

[۱] طبرسی نے ایک روایت پیغمبر اسلامؐ سے نقل کی ہے کہ حضرت نے فرمایا: "انه قضی بحفظ المواشی علی اربابها لیلاً و قضی بحفظ الحرث علی اربابه نهاراً۔ مجمع البیان، ج ۴، ص ۵۸

[۲] نفشت کے معنی تفرق کے ہیں

مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (انبیاء: ۷۸، ۷۹)

شاید حضرت داؤدؑ نے ایسا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ان کا چھوٹا سا بیٹا کچھ بولے اور اپنی علمی صلاحیتوں کا لوہا منوائے، جیسا کہ کبھی کبھی استاد و شاگرد میں ایسی صورت حال پیش آ جاتی ہے۔ یہاں تک قرآن کی رو سے حضرت داؤدؑ کی داستان مکمل ہوگئی۔ اب ہم داستانِ حضرت داؤدؑ کے نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

داستانِ حضرت داؤدؑ کے سبق آموز نکات

اس بارے میں حضرت داؤدؑ سے متعلق واردشدہ آیات کے مجموعہ سے درج ذیل نکات حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت داؤدؑ راہِ خدا میں مجاہدت کے نتیجہ میں انتہائی کمال کی منزلوں پر فائز ہو چکے تھے اور ان کے کامل و ترقی کی بنیاد و اساس ان کا وہی جہاد تھا جو ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۲۔ قرآن فرماتا ہے کہ ہم نے داؤد کے لیے لوہے کو نرم کر دیا، لیکن داؤدؑ اسے انسانوں کے فائدہ کی خاطر استعمال میں لائے تھے، اس سے جان لیوا اسلحہ کے بجائے انسان کو خطرہ سے بچانے والا اسلحہ بناتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وسائل ایسے مہیا کیے جائیں جو انسانی جان کی حفاظت کے کام آئیں نہ کہ انسانوں کے قتل کے لیے استعمال ہوں۔ ہر ایسی صنعت جو انسانوں کو مارنے کا موجب بنے انبیاء کی تعلیمات کے منافی ہوتی ہے۔

۳۔ جملہ "وقدر فی السرد" میں ایک بڑا خوبصورت نکتہ پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ "قدر" کے معنی مقدار و ماپ معین کرنے کے ہیں اور "سرد" کے معنی بننے کے ہیں۔ لہٰذا جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ زرہ بنانے میں ماپ کا خیال رکھیں، یعنی اس کی کنڈیاں متناسب ہوں تاکہ پہننے میں مشکل پیش نہ آئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جو بھی کام کرے اس میں اندازہ اور خوبصورتی کا خیال رکھنا چاہیے۔ روایت میں آتا ہے کہ جب مسلمانوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کے بیٹے حضرت ابراہیمؑ کی میت کو قبر میں اتارا اور اس پر مٹی ڈالنے لگے تو بغیر اس کے کہ قبر کو صاف کریں مٹی ڈال کر قبر بنا دی، لیکن آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھوں سے قبر صاف کی، اُسے درست کیا اور پھر فرمایا: "اذا عمل احد کم عملاً فلیتقن" [1]

۴۔ دو اشخاص کے جھگڑے (جن میں سے ایک کے پاس ننانوے بھیڑیں اور دوسرے کے پاس صرف ایک تھی اور حضرت داؤدؑ نے مدعی کو حق پر ٹھیرایا تھا) کے فیصلہ کے بعد اللہ نے فرمایا: "وظن داؤد انما فتنه"، تو داؤد سمجھ گئے کہ ہم نے اُسے آزمایا ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ اس امتحان سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب صرف وہی ہو سکتا ہے جو ایک روایت میں امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ حضرت داؤد یہ سمجھنے لگے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑا عالم پیدا ہی نہیں کیا تھا۔ اس تصور کو ان کے ذہن سے خارج کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو آدمیوں کو اس طرح کا مسئلہ پیش کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ اُن کا جواب واضح تھا اور حضرت داؤد دونوں فریق کی باتیں سن کر فیصلہ کر دیتے لیکن انہوں نے اس مسئلہ میں جلد بازی کی، دونوں کا دعویٰ سنے بغیر

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲۲، ص ۲۶۴

مدعی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس فیصلہ کے کچھ دیر بعد ہی اپنی غلطی پر متوجہ ہو گئے کہ ان کا تصور غلط تھا کہ وہ اپنے آپ کو بڑا عالم سمجھتے تھے۔

لہٰذا حضرت داؤدؑ کے پاس ان دو آدمیوں کا آنا خدا کی طرف سے تھا اور وہ بھی ایک مثبت و صحیح مقصد کی خاطر اور اس بات میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ دونوں فرشتے ہوں جو انسانی صورت میں ظاہر ہوئے ہوں، یا عام آدمی ہوں جو شکایت لے کر حضرت داؤدؑ کے پاس آئے ہوں۔

یہاں بہت سے اہل سنت مفسرین، جو تحریف شدہ تورات سے متاثر ہیں، حضرت داؤدؑ کی طرف ایسی غلط باتوں کی نسبت دیتے ہیں جو ایک عام مومن عادل کو بھی زیب نہیں دیتیں، چہ جائیکہ انبیاء کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں۔ ہماری کتاب ان افسانوں سے آلودہ نہ ہو جائے لہٰذا ہم ان کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں اور صرف ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:

> ''انسان کی تمام خواہشات کا پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا اور نہ لوگوں کی زبانیں ہی بند کی جاسکتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے حضرت داؤدؑ کی طرف غیر مناسب باتیں منسوب کیں اور کہا کہ وہ ایک پرندہ پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے لپکے تو پرندہ ان کے ایک افسر اوریا کے گھر کی چھت پر جا بیٹھا۔ حضرت داؤدؑ چھت پر چڑھے تو اچانک اُن کی نظر اوریا کی خوبصورت بیوی پر پڑی۔ وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے اور مختلف حیلوں بہانوں سے اوریا کو مروا کر اس کی بیوی سے شادی کر لی''[1]

بڑے تعجب کی بات ہے کہ بعض سنی مفسرین اس جیسی غلط باتوں کو بے دھڑک اپنی تفسیروں میں نقل کر دیتے ہیں اور پھر اُن سے بغیر کسی تنقید کے گزر جاتے ہیں، لیکن اس جیسی اگر کسی حقیقت کو پیغمبرِ اکرمؐ کے کسی صحابی کی طرف منسوب کیا جائے تو انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے او رکھنے والے کو زندگی و ملحد تک کہہ دیتے ہیں، گویا ان کی نظر میں صحابہ کی شان انبیاء کرامؑ سے بلند تر ہے۔

---

[1] امالی شیخ صدوق، ۸۳ طبع بیروت۔ تفسیر برہان ج ۴، ص ۴۵

پندرہویں پیغمبر

حضرت سلیمانؑ کی سرگذشت

حضرت سلیمانؑ حضرت داوٴدؑ نبی کے بیٹے تھے اور معنوی مراتب کے علاوہ ظاہری قدرت و جاہ وجلال کے بھی حامل تھے۔ کائنات کے وسیع حصہ پر حکومت کے ساتھ ساتھ بہت سی مخلوقات مثلاً جن، پرند وغیرہ بھی ان کے تابع تھے۔ انبیاء میں حضرت سلیمانؑ اس لحاظ سے بے نظیر و بے مثل تھے۔ حضرت سلیمانؑ کا نام قرآن پاک میں سولہ مرتبہ درج ذیل سوروں میں آتا ہے: بقرہ ۱۰۲، نسا ۱۶۳، انعام ۸۵، انبیائ: ۷۸، ۷۹، ۸۱، نمل: ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۳۶، ۴۴، سبا: ۱۲، ص: ۳۰، ۳۴۔ اتنی دفعہ ان کے نام کا قرآن میں آنا ان کی عظیم الشان شخصیت اور قرآن کی اُن پر خاص توجہ کی دلیل ہے۔

ان کی زندگی کے واقعات وحوادث قرآن میں درجِ ذیل عنوانوں کے تحت شمار کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ حضرت سلیمانؑ کی عادات وصفات

۲۔ حضرت سلیمانؑ کے سامنے ان کے سوار لشکر کی کارکردگی

۳۔ حضرت سلیمانؑ کا امتحان

۴۔ حضرت سلیمانؑ کی اللہ سے بے مثل بادشاہی کی درخواست

۵۔ حضرت سلیمانؑ کی بادشاہی کی حدود (یعنی جنات اور دوسری مخلوق کا اُن کے لیے مسخر ہونا)

۶۔ چیونٹیوں کی سرزمین سے گزرنا

۷۔ ہُدہُد اور ملکۂ سبا کی داستان

۸۔ حضرت سلیمانؑ کی زندگی کا آخر اور اُن کی وفات

(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام کی صفات

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝۴۰ (ص:۴۰)

۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۵

۳۔ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝۱۶ (النمل:۱۵،۱۶)

۴۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ (الانبیاء:۷۹)

۵۔ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۳۰ (ص:۳۰)

آیات کا ترجمہ

۱۔ اسے ہمارے پاس قرب ومنزلت حاصل ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔ ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو علم عطا فرمایا۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ تمام تعریفیں اس اللہ کی ہیں جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت بخشی۔

۲۔ سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ٹھہرے اور کہا کہ اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز (جو کچھ انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے) عطا کی گئی ہے جو کھلی فضیلت ہے۔

۳۔ ہم نے قضاوت سلیمانؑ کو سکھلا دی اور ان دونوں یعنی سلیمانؑ و داؤد کو ہم نے حکمت وعلم عطا فرمایا۔

۴۔ داؤدؑ کو ہم نے سلیمانؑ جیسا بیٹا دیا۔ وہ کیسا نیک بندہ ہے جو ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا ہے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت سلیمانؑ کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی بارگاہ میں مقرب ٹھہرایا اور انہیں اچھے انجام کا وعدہ دیا، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٤٠﴾ (ص:٤٠)

اللہ تعالیٰ نے جو وسیع علم حضرت سلیمانؑ و حضرت داؤدؑ کو دیا تھا اس کے بارے میں بتاتے ہوئے فرمایا کہ وہ دونوں اللہ کی اس نعمت پر شکر گزار تھے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ۖ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥﴾ (النمل: ١٥)

اس کے بعد بتایا کہ سلیمانؑ داؤدؑ کا وارث تھا۔ وہ نہ صرف اُن کے مال و دولت کا وارث تھا بلکہ دوسرے مقامات و مراتب میں بھی اُن کا وارث تھا۔ حضرت سلیمان نے باپ کے سامنے مقدمہ کا فیصلہ سنایا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ چونکہ ان کی وراثت کا دائرہ وسیع ہے۔ لہٰذا قرآن نے وراثت کا تذکرہ کرتے ہی بتا دیا کہ سلیمانؑ نے لوگوں سے کہا کہ ہمیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز عطا کر دی گئی ہے جو دوسرے انبیاء کو دی جاتی ہے۔ اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ:

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ ۖ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾ (النمل:١٦)

حضرت سلیمانؑ کا پرندوں کے ساتھ کلام کرنا، ساتویں عنوان میں ذکر ہوگا۔

اس کے بعد قرآن نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے سلیمانؑ کو اُن کے باپ کی طرح منصبِ قضاوت اور علم عطا فرمایا اور وہ بڑے نیک بندے اور ذکر خدا کرنے والے تھے:

وکلا اتینا حکما و علماً

نیز

نعم العبد انه اواب

بطورِ خلاصہ قرآن مجید میں اُن کے یہ چند اوصاف ذکر ہوئے ہیں:

١۔ مقرب درگاہِ الٰہی "لزلفی"

۲۔ اچھا انجام "حسن ماب"

۳۔ حکیم و قاضی "اتینہ حُکماً"

۴۔ عالم و دانش مند "عِلمًا"

۵۔ ہر چیز کا علم رکھتا تھا "او تینا من کل شیئً"

۶۔ نیک بندہ تھا "نعم العبد"

۷۔ ہمیشہ خدا کا ذکر کرنے والا بندہ "اواب"

اس بات میں بڑا فرق ہے کہ عام انسان کہے کہ ہم نے فلاں کو علم سکھایا، یا خود خدا کہے کہ ہم نے فلاں شخص کو علم عطا فرمایا۔ واضح ہے کہ دوسری صورت میں جو علم عطا ہوا ہے وہ بڑا وسیع ہوگا۔

(۲) حضرت سلیمانؑ کے سامنے سواروں کی حاضری

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اِذۡ عُرِضَ عَلَيۡهِ بِالۡعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الۡجِيَادُ ۟ۙ﴿۳۱﴾

۲۔ فَقَالَ اِنِّيۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَيۡرِ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّيۡ ۚ حَتّٰى تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ٜ﴿۳۲﴾

۳۔ رُدُّوۡهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسۡحًۢا بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ ﴿۳۳﴾ (ص: ۳۱ تا ۳۳)

آیات کا ترجمہ

۱۔ یاد کرو جب تیز دوڑنے والے گھوڑے ان کے سامنے پیش کیے گئے۔

۲۔ انہوں نے کہا کہ میں ان گھوڑوں کو اللہ کے ذکر کی خاطر پسند کرتا ہوں (وہ انہیں دیکھتا رہا حتیٰ کہ) وہ آنکھوں سے پوشیدہ ہوگئے۔

۳۔ انہوں نے کہا کہ انہیں واپس لوٹاؤ۔ پس ان کی پنڈلیوں اور گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

تفسیر آیات سے پہلے بہتر ہوگا کہ ہم الفاظ اور کسی حد تک جملوں کی تراکیب بیان کردیں۔

۱۔ "صافنات"، صافنہ کی جمع ہے جس کے معنی تیز دوڑنے والے گھوڑے کے ہیں۔ ایسے گھوڑے عموماً تین پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک پاؤں کو اٹھائے رکھتے ہیں۔

۲۔ "جیاد"، جواد کی جمع ہے جس کی اصل جود ہے۔ گویا گھوڑا تیز رفتاری کے ساتھ اپنی جان بھی نثار کردیتا ہے۔

۳۔ "خیر"، شر کی ضد ہے۔ قرآن میں کہیں کہیں مال کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۚۖ (بقرہ: ۱۸۰) کیونکہ طبعی طور پر مال "خیر" ہے، صرف انسان عقل و دین سے دور رہ کر اس سے غلط فوائد حاصل کرتا ہے۔

۴۔ "حب"، بغض کی ضد ہے۔

۵۔ "حب الخیر"، مفعول کا بدل ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: "احببت الخیل حب الخیر"، یعنی میں گھوڑوں کو پسند کرتا ہوں۔ اس قسم کی محبت خیر کی محبت ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود کلمہ "حب الخیر" مفعول ہوا۔ حببت کے لیے جس کے معنی و مراد تیز رفتار گھوڑے ہوں تو معنی

ہوں گے "احببت الخیر حباً عن ذکر ربی"یعنی میں گھوڑوں کو یادِ خدا اور اس کے حکم کی خاطر پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ ان گھوڑوں کے ذریعے دشمن سے جہاد کیا جا سکتا ہے،یعنی میری گھوڑوں سے اور فوجی مظاہروں سے محبت حکم خدا کی خاطر ہے۔

۶۔ "تورات"، فعل تواریٰ کا مونث ہے جس کے معنی چھپنے کے ہیں۔اس کا فاعل "صافنات الجیاد" ہے۔یعنی جب حضرت سلیمانؑ ان تیز رفتار گھوڑوں کو دیکھ رہے تھے تو وہ اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئے،یعنی اُن کے بعد گھوڑوں کے درمیان حجابات حائل ہو گئے۔

۷۔ "ردوھا" کے معنی ان گھوڑوں کے پلٹانے کے ہیں۔حضرت سلیمانؑ نے گھوڑوں کے مالکوں سے کہا کہ گھوڑوں کو واپس لے آئیں تا کہ وہ نزدیک سے ان کا مشاہدہ کر سکیں۔

۸۔ "فطفق مسحاً بالسوق والا عناق" جب گھوڑے اپنے سواروں کے ساتھ لوٹ آئے تو حضرت سلیمانؑ نے گھوڑوں سے اظہارِ محبت کی خاطر ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا اور انہیں پچکارا۔

آیات کے ان معانی کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات کی تفسیر اس طرح ہوگی:

ایک دن حضرت سلیمانؑ نے اپنے فوجی رسالہ کو دیکھا اور اپنی قوت کا اظہار کیا۔اس موقع پر انہوں نے ایک بات کہی اور ایک کام بھی کیا۔ بات یہ کہی کہ میں مجاہدوں کے گھوڑوں کو پسند کرتا ہوں اور میرا ان کو پسند کرنا اللہ کے حکم سے ہے۔شاید اللہ کے حکم سے یہ مراد ہو کہ اللہ نے جہاد کی تیاری کا حکم دیا ہے اور گھوڑے تیاری کا حصہ ہیں۔جو کام انجام دیا وہ یہ تھا کہ مجاہدوں کے گھوڑے، جو دور چلے جانے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے،انہیں لوٹانے کا حکم دیا۔جب گھوڑے واپس آ گئے تو گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔دراصل حضرت سلیمانؑ کا یہ عمل فوجی نوعیت کا تھا اس فرق کے ساتھ کہ اس میں حکم خدا شامل تھا۔ابھی تک جو کچھ بیان ہوا یہ تفسیر تھی لفظوں کے معانی اور ان کی جملہ بندی کی۔ان آیات کے بارے میں یہی کچھ سید مرتضیٰ نے "تنزیہ الانبیاء" میں فرمایا ہے اور علامہ مجلسی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔[1]

ان آیات کی تسیر میں کچھ بے ربط و بے اساس اقوال بھی پائے جاتے ہیں جو نہ تو حضرت سلیمانؑ ایسے نبی کے مقام و مرتبہ سے مناسبت رکھتے ہیں اور نہ ہی آیات کے الفاظ و ظواہر سے ان کا کوئی تعلق ہے۔

سید قطب (صاحب تفسیر فی ظلال القرآن) نے چونکہ ان آیات کی تفسیر میں اسرائیلی روایات پر اعتماد کیا ہے لہٰذا وہ ان کی صحیح تفسیر کرنے سے قاصر رہے اور انہوں نے خود بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ جو کچھ اس بارے میں مفسرین نے کہا ہے وہ اسرائیلی روایات پر مبنی ہے۔ہم نے اس کی مفصل بحث اسی تفسیر "منشور جاوید" کی پانچویں جلد میں کر دی ہے جو کہ ص ۱۲۵ تا ۱۳۰ میں مذکور ہے۔

---

[1] تنزیہ الانبیاء، ص ۹۵ تا ۹۷، بحار الانوار ج ۱۴ ص ۱۰۲ تا ۱۰۴

(۳) حضرت سلیمانؑ کا امتحان اور آزمائش

موضوع سے متعلق آیت

۱۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ﴿۳۴﴾ (ص: ۳۴)

یعنی ''ہم نے سلیمانؑ کو آزمایا اور ان کے تخت پر ایک بے جان جسم ڈال دیا۔ انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور توبہ کی''

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو ان کے تخت پر ایک مردہ جسم ڈال کر آزمایا۔ اب یہ سوال کہ یہ جسم کس کا تھا، اس جسم کے ڈالنے سے حضرت سلیمانؑ کی کس طرح آزمائش ہوئی، اس بارے میں آیت سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ''ثم اناب'' کے جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے کوئی ایسا کام سرزد ہوا تھا جس کی وجہ سے توبہ کی ضرورت پیش آئی۔

یہاں ایک روایت پر اعتماد کرنا پڑتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا ایک بیٹا تھا جس سے انہیں بہت محبت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیٹے کی موت کے ذریعہ حضرت سلیمانؑ کے صبر کو آزمایا جب انہوں نے بیٹے کی لاش اپنے سامنے پڑی دیکھی۔ یہ صحیح ہے کہ اولاد سے محبت کرنا انہیں اپنی امیدوں اور آرزوں کا مظہر و محور سمجھ لینا نہ عام لوگوں کے لیے گناہ ہے اور نہ ہی انبیاء کے لیے لیکن چونکہ انبیاء معرفتِ خداوندی کے اعتبار سے بلند تر منزل پر فائز ہوتے ہیں لہٰذا اولاد کو اپنی امیدوں اور آرزوں کا محور بنا لینا ان کے مرتبہ سے مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اُن کے لیے لازم ہے کہ اولاد کی محبت کے ساتھ ساتھ اپنے کاموں کو اللہ کے حوالے کریں، مستقبل کی منصوبہ بندی میں اللہ پر بھروسہ کریں اور ہمیشہ یہ جملہ ''افوض امری الی اللہ بصیر بالعباد'' (غافر: ۴۴) ان کے ورد زبان رہنا چاہیے۔ ''ثم اناب'' اسی تنبہ کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) بے مثل بادشاہی کی درخواست

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴿۳۵﴾ (ص: ۳۵)

یعنی ''اس نے عرض کیا کہ خدایا! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو نہ

ملے کہ تو ہی سب سے زیادہ دینے والا ہے''۔

اس آیت کی تفسیر میں دو سوال سامنے آتے ہیں:

۱۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے لیے بادشاہی کیوں مانگی؟

۲۔ پھر بے مثل بادشاہی کی درخواست کیوں کی؟

پہلے سوال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ملک و بادشاہی کی لفظیں سن کر بے حدو حدود بادشاہی کا تصور ذہن میں آتا ہے اور ایسی حکومت کی درخواست ایک عام عقل مند شخص نہیں کرتا چہ جائیکہ اللہ کا پیغمبر ایسی درخواست کرے۔ لہٰذا حضرت سلیمانؑ نے ایسی حکومت کی درخواست کی جس پر وحی و نبوت کے ذریعے اختیار حاصل ہو، ایسی حکومت کے زیر سایہ لوگ دینِ حق اختیار کریں اور اپنے حقوق کو حاصل کریں، ایسی حکومت جو عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہو انبیاء ہی کے شایانِ شان ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ملک (بادشاہ) کہہ کر اس کے بعد القدوس کی صفت ذکر کی ہے یعنی فرمایا:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ (حشر: ۲۳)

یعنی ''وہ ہی ہے ایسا معبود جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور وہی ہے پاک و منزہ بادشاہ''

شاید ''الملك'' کے بعد ''القدوس'' کی صفت ذکر کر کے یہ بتلانا مقصود ہو کہ یہ بادشاہ عام بادشاہوں کی مانند نہیں بلکہ یہ انتہائی مقتدر و قوی بادشاہ ہے لیکن ہر قسم کے نامناسب کام سے منزہ و پاک ہو۔ لہٰذا ایسی بادشاہی ایک بلند ہدف کے پیش نظر چاہنا در حقیقت کارِ الٰہی کا چاہنا ہے۔ اس کی مثال یوں لیں کہ کوئی دعا کرے کہ خدایا مجھے مال و دولت عطا فرما تا کہ اسے تیری راہ میں خرچ کروں۔

پیغمبر اکرمؐ نے حضرت سلیمانؑ کے بارے میں فرمایا:

ارأيتم ما اوتی سليمان ابن داؤد من ملكه فان ذلك لم يزده الا تخشعاً ما كان يرفع بصرة تخشعا لربه [1]

''اللہ تعالیٰ نے جو سلیمانؑ ابن داؤدؑ کو بادشاہی دی اس نے ان میں سوائے خضوع و خشوع کے کسی اور چیز کو زیادہ نہ کیا۔ وہ خدا کے خوف سے آنکھیں نہیں اٹھاتے تھے''۔

دوسرے سوال کے بارے میں کہیں گے کہ حضرت سلیمانؑ نے جس بادشاہت کی درخواست کی تھی وہ اتنی وسیع تھی کہ اس کا دائرہ انسان کے علاوہ طبعی قوتوں پر بھی مشتمل تھا جیسے ہوا، جن اور پرند، یہ سب کے سب ان کی فرمانروائی کے تحت تھے، جیسا کہ بعد والی آیات میں اس پر شاہد ہیں۔ واضح ہے کہ اتنی وسیع طاقت و قوت غیر معصوم انسانوں کے مناسب نہیں ہے کیونکہ اُن کے لیے ایسی قدرت کا سنبھالنا ممکن نہیں بلکہ

[1] روح البیان، ج ۸، ص ۳۹

کبھی یہ لوگ زمین میں فساد و تباہی کا موجب بن سکتے ہیں۔ ایسی قوت حضرت سلیمانؑ یا ان جیسے افراد ہی کے مناسبِ حال ہے اور شاید جملہ "لاینبغی لاحد من بعدی" کا مطلب بھی یہی ہو، یعنی ایسی بادشاہی چاہی جو صرف انبیاء ہی کے مناسبِ حال ہو نہ کہ دوسرے عام انسانوں کے۔

حضرت سلیمانؑ کی بادشاہی کی حدود

آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت صرف انسانوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ طبیعی قوتیں مثلاً ہوائیں، معدن (کانیں)، جن اور پرند، بھی اُن کے حکم کے پابند تھے۔ انسانی تاریخ میں ایسی قدرت کسی کو عطا نہیں ہوئی۔ مصلحتوں کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس زمانہ میں ایک پیغمبر ہی کو ایسی عظیم قوت اور بے پناہ جاہ و جلال دیا جانا چاہیے تھا۔ آیات کے مطالعہ سے حضرت سلیمانؑ کی قوتوں کے لحاظ سے ان کے مرتبہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی قوتوں کو ہم تین حصوں میں ذکر کریں گے۔

ہواؤں کی تسخیر

۱۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ (الانبیآ: ۸۱)

۲۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ (سبا: ۱۲)

۳۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ۙ (ص: ۳۶)

آیات کا ترجمہ

۱۔ سلیمانؑ کے اختیار میں تیز رفتار ہوا تھی جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس کو ہم نے برکت بخشی اور ہمیں ہر چیز کا علم تھا۔

۲۔ ہم نے سلیمانؑ کے اختیار میں ایسی ہوا دے دی جو صبح کو ایک مہینہ کی مسافت اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت طے کرتی تھی۔

۳۔ ہم نے ہوا سلیمانؑ کے تابع کر دی جو ان کے حکم سے نرم سے چلتی تھی اور وہ جہاں چاہتے انہیں لے جاتی۔

۲۔جنات کی تسخیر

۴۔ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍۙ﴿۳۷﴾

۵۔ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴿۳۸﴾

۶۔ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴿۳۹﴾ (ص: ۳۷ تا ۳۹)

۷۔ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَۙ﴿۸۲﴾ (الانبیاء: ۸۲)

۸۔ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ﴿۱۲﴾ (سبا: ۱۲)

آیات کا ترجمہ

۴۔ہم نے جنات سلیمان کے تابع کر دیئے، ان میں معمار بھی تھے اور غوطہ خور بھی۔

۵۔کچھ اور شیاطین زنجیروں میں جکڑے ہوئے (ان کے تابع کر دیئے)

۶۔ ہم نے سلیمانؑ سے کہا یہ ہماری عطا ہے جسے چاہو دو، جسے نہ دینا چاہو نہ دو، آپ سے کوئی پرسش نہیں۔

۷۔کچھ شیاطین ان کے لیے غوطہ خوری کرتے تھے اور کچھ دیگر کام انجام دیتے تھے اور ہم اُن کے محافظ تھے۔

۸۔کچھ جنات سلیمانؑ کے سامنے اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے امر کی سرپیچی کرتے تھے ہم انہیں جلانے والی آگ کا عذاب چکھاتے تھے۔

۳۔تانبے کی کانوں کی تسخیر

۹۔ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ (سبا: ۱۲)

۱۰۔ یَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَتَمَاثِیۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ (سباء: ۱۳)

آیات کا ترجمہ

۹۔تانبے کا چشمہ ہم نے اس کے لیے جاری کر دیا۔

۱۰۔اس کے لیے جو وہ چاہتا وہ بناتے تھے، جیسے محراب، بڑے بڑے غذائی برتن اور زمین میں گڑی ہوئی دیگیں۔(جو بڑی ہونے کی وجہ سے جگہ نہیں بدل سکتی تھیں)

آیات کی تفسیر سے پہلے ہم آیات میں استعمال ہونے والے الفاظ کے لغوی معنی ذکر کرتے ہیں:

۱۔ "عاصفه" عاصف کی مونث ہے۔جس کے معنی تیز وتند آندھیوں کے ہیں۔

۲۔ "غدو" دن کا پہلا نصف حصہ،"رواح" دن کا دوسرا نصف حصہ

۳۔"رخآء" یعنی نرم وآرام

۴۔"بناء" یعنی معمار (مکانات بنانے والا)

۵۔"غواص" غوطہ خور (یعنی پانی میں غوطہ لگا کر قیمتی اشیا نکالنے والا)

۶۔ "مُقرنین" مقرن کی جمع،بمعنی جکڑا ہوا۔

۷۔"اصفاد" صفد کی جمع جس کے معنی ایسی زنجیر کے ہیں جس سے گردن و بازو باندھے جائیں۔

۸۔"اسلنا" از باب افعال جس کا مصدر "اسالہ" ہے۔اس کے معنی چلانے کے ہیں یعنی جاری کرنا۔

۹۔ "عین" یعنی چشمہ

۱۰۔ "قطر" پگھلا ہوا تانبہ یا لوہے کے علاوہ ہر دھات

۱۱۔"محاریب" محراب کی جمع جس کے معنی معبد(عبادت گاہ) کے ہیں، یا بلند و بالا عمارت کے۔

۱۲۔ "تماثیل" تمثال کی جمع،بمعنی مجسمہ وتصویر

۱۳۔ "جواب" جابیہ کی جمع،بمعنی حوضِ آب

۱۴۔ "جفان" جفنۃ کی جمع بمعنی کھانے کا برتن

۱۵۔ "قدور" قدر کی جمع یعنی کھانا پکانے کی بڑی دیگ۔

۱۶۔ "راسیات" راسیۃ کی جمع گڑی ہوئی چیز۔یہاں مراد ہے زمین میں گڑی ہوئی دیگیں۔

یہاں تینوں قسموں کی زیر بحث آیات میں استعمال شدہ مفردات کے معنی معلوم ہوئے۔ اب ان کی موضوعی تفسیر پیش کرتے ہیں:

آیات کی موضوعی تفسیر

ان آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کو اتنی بڑی مملکت، جس کی حدیں کم از کم شام سے یمن تک یقیناً پھیلی ہوئی تھیں، چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین بڑی قوتیں عطا فرمائی تھیں:

الف۔ ہوا: جو انتہائی تیز رفتار سفر کا ذریعہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ اس کے ذریعہ سفر کرتے تھے۔

ب۔ پگھلا ہوا تانبہ۔ صنعت میں جس سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

ج: جن وشیاطین جیسی قوی مخلوق بطور کارندے اور پرندگان بطور قاصد۔

کسی تہذیب وتمدن کی ترقی کے لیے یہ تین شعبے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

سفری ذرائع کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہوائیں اُن کے تابع کر دی تھیں۔ ہوائیں تیز چلنے والی بھی اور نرم چلنے والی بھی تھیں۔ چونکہ مختلف مواقع پر دونوں سے استفادہ کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، یا یوں کہا جائے کہ حضرت سلیمانؑ ہمیشہ تیز ہواؤں سے سفر کرتے تھے جب کہ یہ ہوائیں بڑے آرام سے چلتی تھیں جن میں کسی قسم کا ہچکولہ وغیرہ نہیں لگتا تھا۔ یہ ہوائیں حضرت سلیمانؑ کے حکم کے تابع تھیں، جہاں وہ چاہتے لے جاتیں۔ سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ ان سے کس طرح استفادہ کرتے تھے، اس بارے میں قرآن میں کچھ نہیں آیا۔ قرآن صرف اتنا بتلاتا ہے کہ ہوا اُن کے حکم سے دن کے پہلے نصف حصہ میں ایک ماہ کی مسافت اور دن کے دوسرے نصف حصہ میں ایک ماہ کی مسافت طے کرتی تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ (الانبیاء: ۸۱)

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ (سبا: ۱۲)

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ (ص: ۳۶)

ان آیات کا ترجمہ پہلے ہو چکا ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمانؑ اور ان کے ہمراہی ایک بساط پر بیٹھ جاتے اور ہوا اسے اڑا کر لے جاتی۔ اس طرح وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرتے۔ یہ بات کسی طرح ناممکن وانہونی یا تعجب خیز نہیں ہے۔ یہی ہوا ہوتی ہے جو چکی کے پرزوں کو چلاتی ہے اور اسی ہوا سے فضاؤں میں جہاز اڑتے نظر آتے ہیں۔ یقیناً حضرت سلیمانؑ کا ہواؤں سے یہ استفادہ معجزہ کی حیثیت سے تھا، لہٰذا اس میں عام طبیعی عوامل کے تلاش کرنے کی سعی لا حاصل ہے۔ واضح بات ہے کہ تیزی کے ساتھ اڑنے میں ہوا کا دباؤ انسانی جسم پر شدید ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کیا چیز انہیں

اس دباؤ سے بچاتی تھی؟اس کا جواب یہ ہے کہ ان تمام مراحل میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ نافذ تھا اور حضرت سلیمانؑ کا ارادہ اللہ کے ارادہ کا مظہر تھا۔اگر اس کو تمام طبعی قوانین پر حمل کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر یہ معجزہ نہیں رہے گا۔

البتہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے عام ذرائع سفر سے ایک دن یا ایک مہینے میں کتنا فاصلہ طے ہوتا تھا تا کہ اس طرح ہوا کی رفتار کا اندازہ کیا جا سکے جو حضرت سلیمانؑ کو لے جاتی تھی۔

عام تفریحی سفر تو بہت کم ہوتے تھے۔شاید ایک دن میں چھ کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہو پاتے تھے۔یہاں مراد تجارتی سفر ہیں جو عموماً گھوڑے، خچر اور صحراؤں میں اونٹوں پر انجام پاتے تھے۔لیکن چونکہ حضرت سلیمانؑ کا رہائشی علاقہ شام و فلسطین پر حائل تھا اور ان علاقوں کے مناسب سواری گھوڑا وغیرہ ہے، علامات وقرائن سے پتہ چلتا ہے کہ کاروان اس سواری کے ذریعے روزانہ ۴ فرسخ (تقریباً ۲۲ کلومیٹر) فاصلہ طے کر لیتے تھے۔اس طرح ۲۲ ضرب ۳۰ سے ۶۶۰ کلومیٹر فاصلہ بنتا ہے۔پس ایک مہینے میں ۶۶۰ کلومیٹر فاصلہ طے ہوتا ہے۔اگر دن کے پہلے نصف میں اتنی مقدار فاصلہ طے ہو تو ایک دن میں تقریباً ۱۳۲۰ کلومیٹر فاصلہ طے ہوگا۔اس حساب سے اس ہوا کی رفتار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس پر حضرت سلیمانؑ سفر کرتے تھے۔کیونکہ عام دن ۱۲ گھنٹے کا ہوتا ہے، لہٰذا ہوا کی ۱۱۰ کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار بنتی ہے جب کہ عام ہوائیں چالیس سے پچاس کلومیٹر تک کی رفتار سے چلتی ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جس ہوا سے سفر کرتے تھے وہ بڑی تیز ہوتی تھی۔پس یہ جو قرآن مجید نے اس ہوا کے بارے میں "عاصفه" اور "رخاء" اصطلاحیں استعمال کی ہیں، جیسے وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ (انبیاء: ۸۱) اور فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً (ص: ۳۶) یہ دونوں آیتیں ہوا کی ایک ہی قسم کو بیان کر رہی ہیں۔پہلی آیت کے مطابق ہوا رفتار کے لحاظ سے طوفانی ہوتی تھی اور دوسری آیت کہتی ہے کہ چلنے میں بڑی نرم و آرام دہ تھی، بالکل جہاز کی طرح کہ باوجود انتہائی سرعت کے بالکل ساکن و آرام اس حد تک ہوتا ہے کہ خود مسافر کو حرکت کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا صرف ایک اندازہ ہے۔ہو سکتا ہے حقیقت اس کے علاوہ ہو یا اس سے معمولی فرق رکھتی ہو۔

حضرت سلیمانؑ کے پاس دوسری قوت کارندوں کی تھی۔یہ ایسے مزدور تھے جو آسانی سے کسی انسان کو نہیں ملتے۔جن اور شیطان (جن ہی کی ایک قسم) اللہ کے حکم سے حضرت سلمانؑ کے تابع تھے اور ان میں سے جو سرکش تھے انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔اُن میں سے کچھ کو عمارتیں اور مکانات بنانے پر معین کیا گیا تھا اور بعض سمندر سے غوطہ خوری کے ذریعے قیمتی چیزوں کے نکالنے پر مامور تھے۔ان مطالب پر درج ذیل آیات دلالت کرتی ہیں۔

وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ (ص: ۳۷ تا ۳۹)

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ (الانبیا: ۸۲)

دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے جو بھی سرکشی کرتے انہیں جلانے والی آگ سے سزا دی جاتی تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

الْقِطْرِ ؕ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ⑫ (سباء: ۱۲)

فلسطین میں ان عظیم عمارتوں کے کھنڈرات اور ہیکل سلیمان ان قوتوں کی عظیم کاریگری پر آج بھی شاہد ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے پاس تیسری قوت تانبہ کے پگھلے ہوئے چشمے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ باپ (داوٗدؑ) کے لیے اللہ نے لوہا نرم کر دیا تھا اور بیٹے (سلیمانؑ) کو پگھلا ہوا تانبا اختیار میں دے دیا۔ اب یہ کس قسم کا تانبا پگھلا ہوا تھا جو ان کے اختیار میں تھا، قرآن نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، صرف احتمال ہو سکتا ہے کہ ماضی میں شاید آتش فشاں پہاڑوں کے ذریعے تانبہ پگھل کر بہتا ہو جس سے حضرت سلیمانؑ استفادہ کرتے رہتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمان ان مزدوروں سے کہاں اور اس مادہ سے کیسے استفادہ کرتے تھے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ مزدوروں سے مکانات کی تعمیر، ان کی زیب و زینت اور نقش نگاری میں مدد لیتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (سباء: ۱۳)

اس خام دھات سے کھانے کے بڑے برتن اور پکانے کی بڑی دیگیں بنائی جاتی تھیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ (سباء: ۱۳)

ان آیات سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے اختیار میں جو قوتیں تھیں وہ انہیں رفاہِ عمومی کے لیے استعمال میں لاتے تھے کیونکہ محاریب بنواتے تو یہ چاہے عبادت گاہیں مراد ہوں یا بلند و بالا عمارتیں، سب کے فائدہ سے تعلق رکھتی اور اجتماعی پہلو رکھتی ہیں۔ تماثیل کے بارے میں مفسرین نے جو مجسمے بنانا کہا ہے، صحیح نہیں ہے، بلکہ اہل بیتؑ کی روایات کے مطابق اس سے مراد طبیعی مناظر کی تصویر کشی و نقاشی ہے۔ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ''خدا کی قسم! جو تماثیل سلیمانؑ کے لیے بنائی جاتی تھیں ان سے مراد عورتوں، مردوں کے مجسمے نہیں تھے بلکہ درختوں اور ان جیسی چیزوں کی تصویر کشی تھی۔ [1]

اگر فرض کر بھی لیں کہ تماثیل سے دونوں مراد ہیں یعنی مجسمہ بھی اور غیر مجسمہ بھی، یا جاندار یا غیر جاندار دونوں کی تصویر کشی مراد ہے، تو جواب یہ ہوگا کہ یہ کام اس زمانہ کی شریعت کے مطابق تھا اور ہو سکتا ہے کہ جائز ہو۔ اسے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ یہ آج کل بھی جائز ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۲ باب ۹۴ از ابواب ما یکتسب بہ حدیث ۱

(٦) چیونٹیوں کی سرزمین کا سفر

حضرت سلیمانؑ کی زندگی کا ایک واقعہ جس کا ذکر قرآن میں آتا ہے، ان کا چیونٹیوں کی سرزمین سے گزرنا ہے۔ یہ بھی ایک داستان ہے جس کو درجِ ذیل آیات بیان کرتی ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

١۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۝١٧

٢۔ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝١٨

٣۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ۝١٩ (النمل: ١٧ تا ١٩)

آیات کا ترجمہ

١۔ حضرت سلیمانؑ کا جنوں، انسانوں اور پرندوں پر مشتمل لشکر جب ان کے پاس حاضر ہوا اور متفرق نہیں تھے۔

٢۔ یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچ گئے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں گھس جاؤ تاکہ تمہیں سلیمانؑ اور اس کا لشکر پامال نہ کردے، درآنحالیکہ انہیں پتہ بھی نہ چلے۔

٣۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کی بات سن کر تبسم فرمایا اور عرض کیا کہ خدایا! تیرا شکر ادا کرتا ہوں ان نعمتوں پر جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہیں۔ مجھے اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرما تاکہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں شمار کر۔

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت سلیمانؑ کا ایک سفر اپنے لشکر کے ساتھ چیونٹیوں کی وادی سے ہوا۔ سلیمانؑ کے عظیم لشکر میں انسان، جن اور پرندے سب شامل تھے۔ لشکر اتنا بڑا تھا کہ آخری حصے کے آ ملنے کی خاطر اگلے حصے کو روکنا پڑتا تھا اور مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد اس میں ہوتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

(النمل: ۱۷)

اس آیت میں دو کلمے دقت طلب ہیں:

۱۔ حشر ۲۔ یوزعون

کلمۂ حشر وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں لوگ ایک تعداد میں اپنی رہائش گاہوں سے نکل کر کسی مقصد کی خاطر چل پڑیں۔ [۱] قیامت کے دن کو "یوم الحشر" اسی لیے کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنی قبروں سے جو ان کی رہائش گاہیں ہوں گی۔ حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ سلیمان کا لشکر اپنی رہائش گاہوں سے نکل کر کسی مقصد کی خاطر روانہ ہوا تھا۔ کلمہ **یوزعون وزع** [۲] کے مادہ سے ہے جو روکنے کے معنی دیتا ہے۔ اس آیت میں روکنے کا مطلب یہ ہے کہ جب لشکر اپنی رہائش گاہ سے نکلا تو انہیں چلنے سے روک دیا گیا تاکہ باقی ماندہ حصے بھی ان سے آ ملیں اور لشکر منظم ہو کر چلے۔ درحقیقت لشکر کا یہ مظاہرہ سلیمانؑ نبیٔ خدا کی ظاہری قدرت اور جاہ و جلال کا ایک مظاہرہ تھا جسے وہ راہ خدا میں استعمال کرتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کے ہم رکاب یہ لشکر چلتا ہوا ایسی سرزمین پر پہنچا جہاں چیونٹیوں کی کثرت تھی [۳] اور اس وقت سب چیونٹیاں بلوں سے باہر تھیں۔ لہٰذا ان میں سے ایک چیونٹی نے لشکرِ سلیمانؑ کو آتا دیکھ لیا تو دوسری چیونٹیوں سے کہا کہ جلدی جلدی اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمانؑ اور اس کا لشکر انجانے میں تمہیں روندتا ہوا گزر جائے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ
لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ (النمل: ۱۸)

---

[۱] مفردات راغب مادۂ حشر

[۲] مفردات مادہ وزع

[۳] یہ کون سی جگہ تھی اس بارے میں اختلاف ہے ابن بطوطہ و یاقوت کے بقول یہ وادی نمل عسقلان میں تھی۔ (اعلام القرآن، ص ۳۶۸)

نملۃ میں تاء کا حرف وحدت کی علامت ہے، جس کا مطلب ایک چیونٹی ہے یعنی یہ خطاب ایک چیونٹی نے کیا تھا۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے ہم نوع افراد کے لیے شفقت کا جذبہ انسانوں کے علاوہ دوسرے حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے جیسا کہ چیونٹی کے خطاب سے پتہ چلتا ہے۔ بعد والی آیت بتلاتی ہے کہ اس کی بات نہ صرف چیونٹیوں نے سمجھ لی بلکہ اس عظیم لشکر کے شور کے باوجود حضرت سلیمانؑ نے بھی سمجھ لی۔ اس سے اس بات پر شہادت ملتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ چیونٹیوں کی زبان سمجھنے پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی تیز سماعت بھی رکھتے تھے کہ انہوں نے چیونٹی کی آواز سن لی۔ لہٰذا انہوں نے تبسم فرمایا۔ شاید ان کے ہنسنے کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے ہمدردی کا مشاہدہ چیونٹی سے کیا تھا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہنسنے کی وجہ یہ ہو کہ چیونٹی نے اپنی بات میں حضرت سلیمانؑ اور ان کے لشکر کی عدالت کا تذکرہ کیا تھا، یعنی اس نے کہا تھا کہ کہیں وہ انجانے میں تمہیں پامال نہ کر دیں، یا شاید کوئی اور وجہ ہو جس کا ہمیں علم نہ ہو۔ بہر کیف حضرت سلیمانؑ نے اپنی جاہ و حشمت کا خیال نہ کرتے ہوئے اس حشمت و جلال کے عطا کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جس نے انہیں اور ان کے والدین کو یہ عزت و قدرت بخشی تھی اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے دو چیزوں کی دعا کی:

۱۔ یہ عظمت عملِ صالح کی موجب بنے اور رضائے خدا کے علاوہ اسے کہیں استعمال نہ کیا جائے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ انہیں (حضرت سلیمانؑ کو) صالحین سے قرار دے۔

یہیں سے عام بادشاہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ بادشاہوں کے فرق کا پتہ چلتا ہے۔ عام بادشاہ اپنی عظمت کا احساس کرتے ہوئے غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں جب کہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ بادشاہ ایک لحظہ کے لیے بھی تکبر سے دوچار نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ بارگاہِ خداوندی میں خضوع و خشوع کا اظہار کرتے رہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ (النمل: ۱۹)

یہاں ہم اس بات کا تکرار کریں گے جو ہم اس سے پہلے حضرت داؤدؑ کے بارے میں اور اس سے پہلے حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے بارے میں کہہ چکے ہیں۔ بہر حال جو کچھ اس داستان میں ذکر ہوا ہے اس کی اعجاز و معجزہ کے علاوہ اور کوئی توجیہ ممکن نہیں۔ جو لوگ ایسے غیبی مسائل کو عام طبیعی قوانین سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس غلط طریقۂ کار کی وجہ سے غیب کا بالکل انکار کر بیٹھتے ہیں۔ آج کل سائنسدان چیونٹی پر مطالعہ کر کے بڑے اہم نتائج حاصل کر رہے ہیں۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ چیونٹیاں بھی ایک دوسرے سے گفتگو کرتی ہیں۔ یہ شعورِ مرموز نہ صرف چیونٹی میں پایا جاتا ہے بلکہ شہد کی مکھی، دیمک، عنکبوت (مکڑی) وغیرہ میں بھی یہ شعور پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی اجتماعی زندگی چلتی ہے اور ان کے متعلقہ کاموں کو مختلف جگہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تقسیم کار کا یہ سلسلہ ان حیوانوں میں بہت ہی منظم ہے۔ یہ کتاب چونکہ ایسے مطالب کی گنجائش نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس بارے میں مطالعہ کرنے کے شائق کو اس موضوع پر لکھی گئی کتب کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ بہر کیف علم و سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود ابھی ان آیات کی تہہ تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اگر کبھی انسان ان رموز کو پانے میں کامیاب ہو گئے تو اس سے قرآن کی عظمت اور نبیِ خدا حضرت سلیمانؑ کی عظیم قدرت کا مزید اندازہ ممکن ہوگا۔

(۷) ھُد ھُد اور ملکہ سبا کا واقعہ

آیاتِ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا لشکر تین صفوں پر مشتمل تھا، انسانوں اور جنوں کے علاوہ تیسری صف پرندوں کی تھی۔ ہر جگہ کی مناسبت سے حضرت کسی ایک قوت سے کام لیا کرتے تھے۔ پرندوں میں ہُدہُد سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ اسی کے ذریعے سباء نامی سرزمین کا پتہ چلا جہاں ایک عورت کی حکومت تھی اور اُن کا مذہب بت پرستی تھا۔ حضرت سلیمانؑ کی زندگی کا یہ دور حساس واہم ترین دور ہے۔ اس میں بڑے سبق آموز نکات ملتے ہیں جو آئندہ صفحات میں بیان ہوں گے۔ پہلے موضوع سے مربوط آیات بیان کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ؁ (النمل: ۱۶)

۲۔ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ڮ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَاۗىِٕبِيْنَ ؇

۳۔ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ؈

۴۔ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۢ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ؉

۵۔ اِنِّىْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ؊

۶۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ؋

۷۔ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ؍

۸۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ؎ السجدۃ

۹۔ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ؏

١٠۔ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾

١١۔ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٩﴾

١٢۔ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣٠﴾

١٣۔ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣١﴾

١٤۔ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى
تَشْهَدُوْنِ ﴿٣٢﴾

١٥۔ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا
تَاْمُرِيْنَ ﴿٣٣﴾

١٦۔ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ
وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٤﴾

١٧۔ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣٥﴾

١٨۔ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ
بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿٣٦﴾

١٩۔ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ
اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٣٧﴾

٢٠۔ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣٨﴾

٢١۔ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ
عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿٣٩﴾

٢٢۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ

طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۫ لِیَبْلُوَنِیْٓ
ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ
غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ﴿۴۰﴾
۲۳۔ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا
یَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾
۲۴۔ فَلَمَّا جَآءَتْ قِیْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِیْنَا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِیْنَ ﴿۴۲﴾
۲۵۔ وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ﴿۴۳﴾
۲۶۔ قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ
سَاقَیْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ ؕ۬ قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ
وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾ (النمل: ۲۰ تا ۴۴)

آیات کا ترجمہ

۱۔ سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث بنے اور کہا کہ اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر نعمت عطا کی گئی ہے جو واضح فضیلت ہے۔

سلیمانؑ نے پرندوں کے بارے میں جستجو کی تو پوچھا کہ آج ہُدہُد نظر نہیں آ رہا، کیا وہ غیر حاضر ہے؟

۳۔ (اگر وہ بلاوجہ غیر حاضر پایا گیا تو) میں اسے سخت سزا دوں گا، یا اُسے ذبح کر دوں گا۔ مگر یہ کہ وہ اپنی غیر حاضری کے لیے واضح دلیل پیش کرے۔

۴۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہُدہُد حاضر ہو گیا اور اس نے کہا کہ جس چیز کا آپ کو علم نہیں تھا میں اس سے مطلع ہو کر آیا ہوں۔ سرزمین سباء کے بارے میں یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔

۵۔ میں نے وہاں ایک عورت کو لوگوں پر حکمران پایا، اُسے ہر چیز دی گئی ہے اور اس کا تخت

بہت بڑا ہے۔

۶۔ میں نے اس کو اور اس کی قوم کو اللہ کے علاوہ سورج کی پرستش کرتے پایا۔ شیطان نے اُن کے اعمال ان کے لیے مزین کر رکھے ہیں اور انہیں راہِ حق سے روک دیا ہے کہ وہ سب گمراہ ہیں۔

۷۔ وہ کیوں اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو زمین و آسمان میں پوشیدہ چیزوں کو ظاہر فرماتا ہے، وہ اُسے جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور اسے بھی جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

۸۔ اللہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور جو بہت بڑے عرش کا مالک ہے۔

۹۔ سلیمانؑ نے کہا ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹوں سے ہے؟

۱۰۔ میرا یہ خط لے جا اور ان تک پہنچا دے، پھر اُن سے دور ہو کر دیکھ کہ وہ کیا کرتے ہیں؟

۱۱۔ (سلیمانؑ کا خط ملکہ سباء کو جو اس ملک کی حکمران تھی پہنچ گیا۔ اس نے خط کو پڑھا اور اپنے امراء سے کہا): اے زعماء ملت ایک بڑا شریف و کریم خط مجھے بھیجا گیا ہے۔

۱۲۔ یہ خط سلیمانؑ کی طرف سے ہے۔ اس میں لکھا ہے: اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے۔

۱۳۔ مجھ پر برتری کی کوشش نہ کرو اور میرے پاس تسلیم ہو کر آ جاؤ۔

۱۴۔ (ملکہ نے) کہا: اے زعماء ملت! مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو۔ میں کسی بارے میں تمہارے مشورہ کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی۔

۱۵۔ انہوں نے کہا کہ ہم زبردست قوت اور سخت رعب والے ہیں، (آگے آپ کی مرضی جو حکم دیں)

۱۶۔ ملکہ سباء نے کہا: کہ بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں، وہاں کے عزت داروں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔

۱۷۔ میں اُن کی طرف کچھ تحائف بھیجتی ہوں اور انتظار کرتی ہوں یہاں تک کہ قاصد اس کا کیا ردِ عمل بتاتے ہیں!

۱۸۔ جب قاصد سباء سلیمانؑ کے پاس پہنچا تو سلیمانؑ نے تعجب سے کہا کہ کیا تم اپنے مال سے میری

دولت میں اضافہ کرنا چاہتے ہو) (یا مجھے فریب دینا چاہتے ہو)۔ جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو تم لائے ہو، بلکہ تم خود ہی اپنے تحائف کے ساتھ خوشحال رہو۔

۱۹۔ ان کو لے کر لوٹ جاؤ۔ میں ان کی طرف ایسا لشکر لاؤں گا جس کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے بلکہ ہم انکو اس شہر سے ذلت کی حالت میں نکالیں گے۔

۲۰۔ (ملکہ سباء کے نمائندے سلیمانؑ کا پیغام لے کر سبا کی طرف واپس ہو گئے تا کہ سلیمانؑ کا پیغام اپنی حکمران کو پہنچا دیں)۔ اسی اثنا میں سلیمانؑ نے اپنے بڑے بڑے درباریوں سے کہا کہ تم میں کون اس کے تخت کو لا سکتا ہے قبل اس کے کہ وہ تسلیم ہو کر میرے پاس حاضر ہو۔

۲۱۔ جنوں میں سے ایک عفریت (خبیث و بداطوار) نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں (دربار برخواست کریں) میں اسے لے آتا ہوں اور میں اس کام پر قادر و امین ہوں۔

۲۲۔ وہ جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا، اس نے کہا کہ آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے میں اس کو لے آتا ہوں۔ سلیمانؑ نے اچانک تخت کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو (شکر ادا کرتے ہوئے) کہا کہ یہ سب میرے رب کا فضل و کرم ہے۔ اللہ مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں اس کا شکر کرتا ہوں یا کفر۔ جو شکر کرتا ہے اس کا اپنا فائدہ ہوتا ہے اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے تو میرا پروردگار تو غنی و کریم ہے۔

۲۳۔ سلیمانؑ نے حکم دیا کہ تختِ بلقیس کو اس کے لیے نا قابل پہچان بنا دیں تا کہ ہم دیکھیں کہ وہ اس کو پہچان سکتی ہے یا اُن میں سے ہے جو اسے نہیں پہچان سکتے۔

۲۴۔ جب ملکہ سباء آئی تو اس سے پوچھا کہ کیا تمہارا تخت بھی ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا کہ یہ تو ویسا ہی لگتا ہے اور کہا کہ ہمیں پہلے ہی (سلیمانؑ کی حق دعوت) کا علم ہو چکا ہے اور ہم اس کی اطاعت کرنے والے تھے۔

۲۵۔ سلیمانؑ نے اسے غیر خدا کی عبادت سے روک دیا کہ وہ پہلے بت پرست تھی۔

۲۶۔ ملکہ سباء سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جائے۔ جب اس نے دیکھا تو اس نے اسے

ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی سمجھا، لہٰذا اس نے اپنا لباس پنڈلیوں سے اوپر اٹھا لیا۔ سلیمانؑ نے کہا کہ یہ محل صاف شیشے سے بنا ہوا ہے پانی نہیں ہے۔ ملکۂ سبا نے کہا کہ خدایا! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور میں سلیمانؑ کے ساتھ پروردگارِ عالم پر ایمان لائی۔

آیات میں آمدہ الفاظ کے لغوی معنی و توضیحات

۱۔ سباء: جزیرۃ العرب کے جنوبی علاقوں میں رہنے والے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ یہ قبیلہ تجارت و نعمتوں کے لحاظ سے بڑی فراوانی رکھتا تھا۔ جب ۵۴۲ عیسوی میں سیلاب نے مآرب کا ڈیم توڑ دیا تو وہاں کے رہنے والے قبائل ادھر اُدھر بکھر گئے، کچھ حجاز میں آ کر ٹھہر گئے اور بعض نے شام و عراق میں سکونت اختیار کر لی۔

۲۔ خَب: منع کے وزن پر پوشیدہ و مخفی کے معنی دیتا ہے۔

۳۔ عفریت: خبیث و بداطوار کو کہا جاتا ہے۔

۴۔ نکروا: نکیر سے ماخوذ ہے، بمعنی ناشناس، یعنی اس کے تخت میں ایسی تبدیلیاں کر دو کہ وہ اسے پہچان نہ پائے۔

۵۔ صرح: قصر و محل کے معنی میں ہے۔ کبھی کھلی فضا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

۶۔ لجه: جبہ کے وزن پر، معنی پانی کی موجوں کی آمد و رفت

۷۔ ممرد: باب مرد سے صاف کے معنی میں آتا ہے۔ عربی میں اسے املس بھی کہتے ہیں۔ عرب پتوں کے بغیر درخت کو "ملسا" کہتے ہیں۔

۸۔ قواریر: قارورۃ کی جمع ہے، بمعنی شیشہ۔ اس محل یا کھلی فضا کا فرش شیشے کا تھا۔

آیات کی موضوعی تفسیر

چیونٹیوں کی وادی سے لوٹنے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ایک لائق فرمانروا کی طرح جو اپنی جملہ اطراف کی طرف پوری متوجہ ہوتا ہے، پرندوں کی فوج کا حال پوچھا اور کہا: "میں ہُدہُد کو کیوں نہیں دیکھ رہا؟" باوجود اس کے کہ ان کی فوج میں پرندے کم نہیں تھے، بلکہ تعداد میں بہت تھے، پھر بھی حضرت سلیمانؑ نے ہُدہُد کو غیر حاضر پایا، اس سے حضرت سلیمانؑ کی تمام پہلوؤں پر کامل توجہ کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا پوچھا وہ کیوں حاضر نہیں ہے! اگر بلاوجہ غیر حاضر ہے تو سرکشی کے لیے اسے سزا دوں گا تاکہ دوسروں کو سرکشی کی جرأت نہ ہو کیونکہ فوج کے نظم میں معمولی سی بے قاعدگی کو بھی جاننا چاہیے، اگرچہ عام لوگوں میں اس بے قاعدگی کی پروا نہ بھی کی جاتی ہو۔

اگر ہُدہُد نے غیر حاضری کی مناسب وجہ نہ بتائی تو حضرت سلیمانؑ نے اس کے لیے دو سزائیں معین کیں جو اس کے جرم کے مناسب تھیں یعنی شدید تنبیہ یا پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا۔

لیکن عذر معقول پایا گیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿٢٠﴾
لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢١﴾ (النمل: ٢٠، ٢١)

کچھ دیر کے بعد ہُد ہُد حاضر ہو گیا اور اپنی غیر حاضری پر مناسب عذر بھی پیش کیا وہ یہ کہ اس نے کہا کہ میں سرزمین سبا پر گیا تھا جہاں سے حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک اہم خبر لایا ہوں۔ اس سے بڑی خبر اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو ایسی قوم کے بارے میں بتائے جو غیر خدا (سورج) کی پرستش کرتی ہے۔ شیطان نے اُن کے لیے اس بُرے کام کو اچھا بنا رکھا ہے اور اس قوم کی حاکم ایک عورت ہے جس کا تخت بہت بڑا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ
يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ
عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾ (النمل: ٢٢، ٢٣، ٢٤)

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے لشکر کے ساتھ کس جگہ ٹھہرے ہوئے تھے جہاں سے ہُد ہُد نے شہر سبا جا کر وہاں کی خبر اُن کو لا کر دی! ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے لشکر کے ساتھ یقیناً سرزمین سبا کے قریب ہی کہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں گے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت سلیمانؑ صنعاء میں تھے جب یہ واقعہ پیش آیا (یعنی ہُد ہُد سبا گیا اور وہاں کی خبریں حضرت سلیمانؑ کو لا کر دیں) یہاں دو احتمال ہو سکتے ہیں:

۱۔ خیال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ بیت اللہ کی زیارت کی نیت سے یہ سفر کر رہے تھے تب یہ واقعہ پیش آیا ہوگا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ زیارت پر جانے کے لیے اتنے لاؤ لشکر کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے راستے میں ایسی قومیں پڑتی تھیں جو بت پرست تھیں۔ لشکرِ توحید کا یہ جاہ و جلال جس کی سرپرستی اللہ کا نبی کر رہا ہو، جس کی دعوت کی بنیاد معبود یگانہ کی عبادت پر تھی، جہاں یہ کام فکرِ توحید کی تقویت کا باعث تھا وہاں بت پرستوں کو بت پرستی سے روکنے کا موجب بھی تھا۔

۲۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو ایسی شاداب و سرسبز زمین پر ایک بت پرست قبیلہ کی پہلے سے اطلاع ہو اور حضرت سلیمانؑ کی یہ لشکر کشی انہی کی ہدایت کی خاطر انجام پائی ہو۔ ابھی تک وہ ان کی سرزمین پر نہیں پہنچے تھے کہ ہُد ہُد نے انہیں اُن کے بارے میں آ کر خبر دی۔

بہر حال ان دونوں باتوں کے سلسلہ میں قرآن سے کوئی شاہد نہیں ملتا۔ ہُد ہُد نے نہ صرف اس سرزمین پر رہنے والوں کے حالات سے حضرت سلیمانؑ کو باخبر کیا، بلکہ آپ کے سامنے اللہ کے اوصاف جیسے زمین و آسمان کے رازوں سے واقف ہونا، ظاہر و مخفی اعمال سے آگاہی کا بھی تذکرہ کیا اور کہا کہ عبادت کے لائق ایسی ذات ہے جو ایسا علم رکھتی ہو۔ یہ قوم کیوں ایسے خدا کی عبات چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پرستش کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ (النمل: ۲۵)

اسی طرح کا کلام لقمان کی نصیحتوں میں بھی ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کیں جب فرمایا:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾ (لقمان: ۱۶)

یعنی ”اے بیٹے! اگر انسان رائی کے دانہ کے برابر عمل کرے اور وہ چٹانوں، آسمانوں یا زمین میں پوشیدہ ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ اُسے معلوم کرلے گا کہ اللہ لطیف و باخبر ہے“

ہُد ہُد نے اللہ تعالیٰ کے وسیع علم کے بیان میں ساتھ ساتھ یہ وصف بھی ذکر کیا کہ:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة (النمل: ۲۶)

یعنی ”اللہ ہی (نہ کہ سورج) معبود یگانہ ہے جو عرش عظیم کا مالک ہے“۔

نیز یہ شاہی تخت عرشِ الٰہی کے مقابلہ میں بالکل بے حیثیت ہیں۔

یہاں تین سوال سامنے آتے ہیں: ایک تو یہ کہ ہُد ہُد کی اس عاقلانہ گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صاحب فکر تھا کیونکہ اس نے عقلی دلیل سے ملکہ سبا نیز اس کی قوم کے عقیدہ پر تنقید کی اور دینِ توحید کو ثابت کیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ فکر و اندیشہ تمام ہُد ہُد نامی پرندوں میں پایا جاتا ہے یا یہ خصوصیت صرف اسی ایک ہدہد میں تھی؟

دوسرا سوال یہ کہ اگر ایسی فکر و عقل ایک ہدہد یا اس کی پوری صنف میں ہو تو لازم ہے کہ اس امتیاز کی وجہ سے وہ شرعی احکام کا مکلف ہو۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ ہدہد کیسے اس قوم کے حالات سے مطلع ہو گیا جب کہ حضرت سلیمانؑ کو ان کا علم نہیں تھا، ہدہد کے ذریعے اُن کو پتہ چلا؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس خاص پرندہ میں یا اس کی پوری نوع میں اللہ کی طرف سے اس قسم کے ادراک

کی صلاحیت موجود ہو، لیکن وہ اپنے ادراکات کو دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت سے محروم ہیں، مگر یہ کہ حضرت سلیمانؑ جیسی شخصیت جو اُن کی زبان سے واقف ہو تو وہ ان کے ادراکات سے مطلع ہو سکے۔ انسانوں میں تو ادراک کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان ادراکات کو دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت بھی موجود ہے، لہٰذا قرآن نے انسان کی یہ خصوصیت یوں بیان فرمائی ہے:

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝۴ (الرحمن: ۴)

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس ہُد ہُد میں اتنی عقل کا ہونا اس کے مکلف ہونے کی دلیل ہے اور اس پر شرعی تکلیف کی دلیل یہ ہے کہ جب ہُد ہُد کو حضرت سلیمانؑ نے غیر حاضر پایا تو اس کے بارے میں پوچھا اور اس کی غیر حاضری کی سزا بھی بیان فرمائی یعنی ذبح کر دینا یا تنبیہ کرنا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل کی نظر میں کسی پیغمبر کا معارف و احکامِ شرعی سے ناواقف ہونا قبیح ہے، نہ کسی ایسی قوم کے حالات کا نہ جاننا جو اس سے بہت دور علاقے میں رہتی ہو۔ لہٰذا یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ قصہ سلیمان عجائب سے پُر ہے اور ان کی توجیہ وحی و اعجاز کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ملکہ سباء کے نام حضرت سلیمانؑ کا خط!

بہر کیف ہد ہد نے اپنی غیر حاضری کے لیے سرزمین سبا کی طرف سفر اور ایک اہم خبر لانے کو عذر کے طور پر بیان کیا۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ ہمیں اس بارے میں تحقیق کرنا ہوگی۔ حضرت سلیمانؑ کا یہ جواب ہمیں درس دیتا ہے کہ ہمیں کسی کی معذرت کو ایک دم رد نہیں کر دینا چاہیے بلکہ پہلے اس کے بارے میں تحقیق کرنا لازم ہے تا کہ اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝۲۷ (النمل: ۲۷)

تعجب کی بات یہ ہے کہ خود حضرت سلیمانؑ نے تحقیق کی ابتدا بھی خود ہد ہد کے ذریعے ہی کی یعنی اسے ہی حکم دیا کہ میرا خط سرزمین سبا پر لے جا کر ملکہ کے سامنے ڈال دے اور پھر ایک طرف ہو کر دیکھے کہ اس خط پر ان لوگوں کا ردِ عمل کیا ہے اور پھر آ کر ہمیں نتیجہ سے مطلع کرے، ارشاد ہوتا ہے:

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ۝۲۸

(النمل: ۲۸)

آیت میں "الیھا" کی بجائے "الیھم" کی لفظ استعمال کی گی ہے یعنی ملکہ کے سامنے ڈالنے کی بجائے ان لوگوں کے سامنے ڈالے، جب کہ خط کا مضمون ملکہ سباء کے نام تھا اور پھر بعد والی آیت سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ ہد ہد نے خط خود ملکہ کے سامنے ڈالا۔

اس سلسلہ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ خط ملکہ کے نام تھا لیکن خط کے مضمون کا تعلق سب لوگوں سے تھا۔ یعنی حضرت سلیمانؑ

نے ان سب سے کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو حق کے حوالے کر دیں اور ان کے پاس چلے آئیں۔ ایسی صورت میں ملکہ سبا کو خط دینا سب کو دینا شمار ہوتا تھا۔

ہُدہُد نے خط لیا اور ملکہ سبا کے سامنے ڈال دیا۔ اس نے خط کھول کر مضمون سے آگاہی پائی اور مناسب جانا کہ زعمائے قوم کو اس کے بارے میں مطلع کرے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ (النمل: ۲۹، ۳۰)

اس آیت میں ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کے خط کی کریم کہہ کر تعریف کی ہے۔ ممکن ہے اس صفت سے اس کی مراد اندازِ تحریر ہو جو اللہ کے نام سے شروع ہوا تھا اور پھر رحمن و رحیم ایسی صفات ذکر کی گئی تھیں۔ ممکن ہے کریم سے مراد مہر شدہ ہو، کیونکہ لغت میں کریم کے معنی مہر شدہ ہونا بھی آئے ہیں اور اس زمانہ میں صرف اسی خط کو قابلِ اعتبار سمجھا جاتا تھا جس پر مہر لگائی گئی ہوتی تھی یعنی حضرت سلیمانؑ کا خط مہر شدہ تھا۔ [1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ (النمل: ۳۰)

یہ خط تین مطالب پر مشتمل تھا:

۱۔ مہربان و بخشنے والے اللہ کے نام سے شروع ہونا اور پھر اس کی دو صفات ''رحمن و رحیم'' کی خوشخبری دینا ہے۔

۲۔ چونکہ حضرت سلیمانؑ کا فرد دشمن کے ساتھ ایک مقتدر بادشاہ کے طور پر خطاب فرما رہے تھے، اگرچہ سلطنت کے پس پردہ ان کی نبوت تھی، لہٰذا ان کے کلام میں اظہارِ قدرت ہونا لازم تھا، جیسا کہ کہا گیا: "الا تعلوا علي..."

۳۔ انہیں اپنی قوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی دعوت دی، یعنی نہ صرف یہ کہ اپنی برتری ظاہر نہ کریں بلکہ حضرت سلیمانؑ کی قوت کے سامنے جھک بھی جائیں۔

اگرچہ اس طرح کا طرزِ تخاطب انبیاء کے شایانِ شان نہیں لیکن چونکہ حضرت سلیمانؑ ایک مقتدر بادشاہ تھے اور ان کا مقابل دشمن بھی شان و شوکت والا تھا، لہٰذا حالات کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت سلیمانؑ اس طرح کا طرزِ تخاطب اختیار کریں۔

ایک سوال یہ ہے کہ کیا خط عربی میں تھا، یا کسی اور زبان میں تھا اور آیت کے جملے اس کا ترجمہ ہیں؟ اس بات کے پیش نظر کہ حضرت سلیمانؑ عرب نہیں تھے، یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ خط عربی کے علاوہ کسی زبان میں تھا۔ آج کل بھی یہی طریقہ ہے کہ فرمانروا خط اپنی زبان میں ہی لکھتے ہیں اور خط وصول کرنے والا مترجم کے ذریعہ اس کے مضمون سے آگاہی حاصل کرتا ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے خطوط عربی

---

[1] روایات میں آیا ہے "اکرام الکتاب ختمه"، یعنی اکرام الکتاب کے معنی ختم و مہر کرنے کے ہیں۔

میں لکھا کرتے تھے۔لہٰذا احتمال یہی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے خط خود سبا والوں میں رائج زبان ہی میں لکھا ہو۔کیونکہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ مختلف زبانیں جانتے تھے اوران میں کلام کرتے تھے۔[1]

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا پورا خط ان تین جملوں ہی پر مشتمل تھا یا طویل تھا۔ملکہ سبا نے اس کا خلاصہ صرف تین جملوں میں کیا؟ اس بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔صرف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خط کا مضمون صرف اتنا ہی تھا۔یہ بات بھی بعیداز قیاس نہیں ہے کہ خط مفصل تھا مگر ملکہ سبا نے اس کے اہم ترین نقاط کی طرف زعمائے قوم کی توجہ مبذول کروائی۔پھر اس نے حضرت سلیمانؑ کے خط سے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کو بھی ان لوگوں کے لیے نقل کیا۔یہ اس لیے کہ اندازِ آغاز اسے اچھا لگا ہوگا۔

یہ جو ملکہ نے خط کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے زعمائے قوم سے مشورہ کرلینا ضروری سمجھا،اس سے اس کی سمجھداری و عقلمندی کا ثبوت ملتا ہے۔ایسے حساس و اہم مسائل میں دوسروں کے فہم و فراست سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہے تاکہ اگر ان کا مشورہ مفید نہ ہو تب بھی کم از کم ان کے اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی یعنی وہ بعد میں یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس معاملہ کی کیوں اطلاع نہ دی گئی؟ لہٰذا ملکہ نے ان کی طرف رخ کرکے کہا:

يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ‌ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ۝۳۲

(النمل:۳۲)

جملہ ''ما کنت قاطعة'' سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ ملکہ نے نہ صرف اس ایک مورد میں زعمائے قوم سے مشورہ کیے بغیر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا بلکہ اس کا ہمیشہ کے لیے طریقۂ کار یہی تھا کہ وہ کسی معاملہ میں ان کے بغیر فیصلہ نہیں کرتی تھی۔(کان فعل استمرار و ہمیشگی کے معنی دیتا ہے اور کانت اسکی مونث ہے لہٰذا معنی یہ ہوں گے کہ میں ہمیشہ ان کے مشورہ کے بغیر حتمی فیصلہ نہیں کرتی)۔انہوں نے جو جواب ملکہ کو دیا اس سے اُن کی سمجھداری کا ثبوت ملتا ہے۔انہوں نے جواب میں دو باتیں کہیں:

۱۔ ہمارے پاس بڑی بہادر اور حوصلے والی فوج موجود ہے۔

۲۔ اس صورت میں فیصلے کا اختیار آپ (ملکہ) کو حاصل ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّاُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ ۙ وَّالۡاَمۡرُ اِلَيۡكِ فَانۡظُرِىۡ مَاذَا تَاۡمُرِيۡنَ۝۳۳ (النمل:۳۳)

دونکات پر توجہ کرنے سے دیکھا جائے تو ان کا جواب صحیح و منطقی تھا،ایک تو یہ کہ بادشاہ کو ایسے ناگوار حالات میں ڈرایا یا مایوس نہ کیا جائے،اور دوسرے یہ کہ انہیں حضرت سلیمانؑ کی فوجی قوت اور نظم و نسق کا اندازہ نہیں تھا۔وہ ان کو عام طاقت سمجھ رہے تھے،اگرچہ حضرت سلیمانؑ

---

[1] بحرانی: برہان، ج۳،ص ۲۰۳

کی فوجی قوت کے پیش نظر ان کا مشورہ اہم نہیں تھا لیکن ملکہ سبا نے جو فیصلہ کیا وہ اُن کے نظریہ کے برعکس تھا کیونکہ ملکہ حضرت سلیمانؑ کی قوت و عظمت سے واقف تھی۔لہٰذا اپنی عقل کی بنیاد پر اس نے سوچا کہ پہلے سلیمانؑ کو پرکھا جائے۔اگر وہ صرف بادشاہ ہی تھے تب بھی ان سے اچھے روابط رکھنا چاہیے کیونکہ جنگ کی صورت میں اگر شکست ہو جائے تو اس کا نتیجہ سوائے شہروں کی تباہی و بربادی اور لوگوں کی ذلت و رسوائی کے کچھ نہیں نکلے گا۔اس کے برعکس اگر حضرت سلیمانؑ پیغمبر خدا ہیں اور واقعاً اللہ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں تو پھر اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینا چاہیے۔انہیں آزمانے کا طریقہ یہ سوچا کہ گراں قیمت تحفے ان کے لیے بھیجے جائیں تا کہ اس طرح ان کی حقیقت حال معلوم ہو جائے، کیونکہ اگر ملکہ سبا کے بھیجے ہوئے بیش بہا تحفوں کی چمک دمک انہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے اور تحفے وصول کر کے وہ ملکہ سبا کی حکومت پر چڑھائی کرنے سے رک جائیں تو پتہ چل جائے گا کہ وہ ایک بادشاہ ہیں جس کے ساتھ کسی بھی طرح روابط برقرار کیے جا سکتے ہیں۔لیکن اگر انہوں نے تحفے واپس بھیج دیئے، ان کی پروا نہ کی اور اپنی بات پر قائم رہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ اللہ کے نبی ہیں جن پر ایمان لے آنا چاہیے۔یہ سوچ کر ملکہ نے زعمائے ملت سے کہا کہ بادشاہوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اگر کسی شہر میں داخل ہو جائیں تو اُسے برباد کر دیتے ہیں، وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہ بادشاہوں کا طریق کار ہے، لہٰذا میں سلیمانؑ کو قیمتی تحفے بھیج کر دیکھتی ہوں کہ قاصد ان کا کیا جواب لاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۝۳۴ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ۝۳۵ (النمل:۳۴، ۳۵)

ملکہ سبا کے قاصد حضرت سلیمانؑ کے حضور!

ملکہ سباء کے نمائندے انتہائی گراں بہا و قیمتی تحفے لے کر، تاریخ میں جن کو افسانوی صورت میں لکھا گیا ہے، حضرت سلیمانؑ کے حضور پہنچ گئے۔جب حضرت سلیمانؑ کی نظریں تحفوں پر پڑیں تو ان کی زرق و برق سے متاثر ہونے کی بجائے انہوں نے بیک جنبش لب انہیں ٹھکرا دیا اور کہا: ''کیا تم اپنے تحفوں کے ذریعے میرے مال و دولت میں اضافہ کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تمہیں دیا ہے، کیونکہ اللہ نے مجھے حکمت و نبوت عطا فرمائی ہے جو دنیا و آخرت پر حاوی ہیں جب کہ تمہیں صرف مال دنیا حاصل ہے۔لہٰذا مجھے تمہاری کسی طرح احتیاج نہیں۔تم خود اپنے تحفوں سے خوش ہو سکتے ہو، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۟ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ۝۳۶ (النمل:۳۶)

پس حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کے نمائندہ کو حکم دیا کہ اپنے تحفہ جات اپنے ملک سبا میں واپس لے جائے اور ملکہ کو ان کا یہ حکم پہنچا دے

کہ اگر اس نے حق کے سامنے سرِ تسلیم نہ کیا تو وہ ایسی فوج لے کر آئیں گے جس کا وہ مقابلہ نہ کر سکے گی اور وہ ان سب کو ذلیل و خوار کر کے ملک سے نکال دیں گے۔ یہ دھمکی صرف اس صورت میں ہے جب وہ حضرت سلیمانؑ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۝ (النمل: ٣٧)

شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ملکۂ سبا (بلقیس) اپنے مصاحبوں کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہو چکی ہے، لیکن حضرت سلیمانؑ نے اپنی بے پناہ قوتوں کے مظاہرہ کی خاطر اپنے مصاحبوں سے پوچھا کہ کون ہے جو اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ملکہ سباء کا تخت یہاں لے آئے تا کہ ملکہ یہاں پہنچ کر اپنا تخت دیکھے تو اُسے حضرت سلیمانؑ کی قدرت و عظمت کا بہتر اندازہ ہو سکے اور وہ ایمان لے آئے۔ دراصل تخت کا صاحبِ تخت کے آنے سے پہلے اس کی ہدایت کی خاطر ایک اقدام تھا، ورنہ معاذ اللہ انبیاء کبھی ایسی قدرت کا مظاہرہ نہیں کرتے جس سے مقصد صرف اپنی قدرت کا اظہار ہو، ہدایت مقصود نہ ہو۔ لہٰذا حضرت سلیمانؑ نے اپنے مصاحبوں سے فرمایا:

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۝ (النمل: ٣٨)

اس کے جواب میں حضرت سلیمانؑ کو دو پیش کش ہوئیں۔ ایک عفریت جن نے کی اور دوسری ان کے ایک قریبی مصاحب نے کی، عفریت نے کہا کہ میں آپ کا دربار برخواست ہونے سے پہلے اسے لا سکتا ہوں۔ لیکن دوسرا جو عفریت سے دانا تر تھا اور کتاب کا کچھ علم رکھتا تھا، اس نے کہا کہ میں تخت کو پلک جھپکنے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ جب اس نے محسوس کیا کہ حضرت سلیمانؑ اس سے متفق ہیں تو اس نے فوراً تخت کو حاضر کر دیا۔ حضرت سلیمانؑ نے جب تخت کو اپنے سامنے حاضر پایا تو اللہ تعالیٰ کی اس عظمت و نعمت کے سامنے اس کا شکریہ ادا کیا، اسے ایک امتحانِ الٰہی سمجھا۔ پھر عرض کیا کہ شکر کرنے والے کا شکر اس کے اپنے نفع میں ہوتا ہے جب کہ کفرانِ نعمت کرنا اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا:

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ۝ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ۝ (النمل: ٣٩-٤٠)

یہاں کچھ سوالات ہیں جنہیں بالترتیب ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ عفریت جن جو ایک خبیث و بد اطوار وجود کا مالک ہو کیسے اتنی توانائی وقوت پر فائز ہوا کہ اتنے بڑے تخت کو اتنے طویل فاصلے سے تھوڑی مدت میں حضرت سلیمانؑ کے پاس حاضر کر سکے؟ یقیناً اس نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا ورنہ حضرت سلیمانؑ اسے جھوٹ کی سزا ضرور دیتے یا کم از کم اسے گھر تک پہنچا تے۔ پھر اس نے حضرت سلیمانؑ کے اطمینان کی خاطر اپنے دو اوصاف ذکر کیے، کہا: ''وانی علیہ لقوی امین'' (☆) اپنی قوت کا تذکرہ کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہ کام انجام دے سکتا ہے، نیز امانت داری کا تذکرہ کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس قوت سے غلط استفادہ نہیں کرے گا اور دوسرے چونکہ وہ ایک خبیث و بد اطوار وجود رکھتا تھا اپنا یہ وصف بیان کیا تا کہ کوئی اس کے بارے میں غلط نہ سوچے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی توانائی وقوت کا تعلق صاحبِ قوت کے ایمان و کفر سے نہیں ہوتا کیونکہ ممکن ہے کہ ایک ملحد شخص ریاضت کر کے ایسی قوت حاصل کر لے۔ شاید اس قوت کے مخفی خزانے انسان و جن کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ ان خزانوں سے استفادہ غالباً ایسے شرائط رکھتا ہے جو چلہ کشی و ریاضت کے ذریعے پورے ہوتے ہیں اور ہندوستان کے جوگیوں کی چلہ کشیوں کو دیکھ کر اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تخت نے پلک جھپکنے سے بھی پہلے اتنا لمبا سفر طے کر لیا اور اسے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ تیز رفتاری کی وجہ سے جو دباؤ جسم پر پڑتا ہے جسم اسے برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ لہٰذا انتہائی رفتار سے چلنے والے جسم نابود ہو جاتے ہیں۔ اگر حضرت سلیمانؑ کا قیام فلسطین میں تھا تو سرزمین سبا سے اس کا فاصلہ ہزاروں کلومیٹر بنتا ہے۔ لہٰذا اجسام میں اتنی تیز رفتاری جو انہیں موجوں میں بدل دے طبیعی قوانین سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اس سوال کا جواب وہی ہے جس کا متعدد بار تذکرہ ہو چکا ہے کہ ایسے کام معجزہ و کرامت کے ذریعے انجام پاتے ہیں اور معجزہ یقیناً طبیعی قوانین سے ہٹ کر ہوتا ہے۔

۳۔ وہ دوسرا شخص جو تختِ بلقیس کو پلک جھپکتے ہی لے آیا کون تھا اور اس کے پاس کتاب کا علم کس قسم کا تھا؟

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص جو حضرت سلیمانؑ کا بھانجا، آصف بن برخیا اُن کا وصی تھا۔ اگر کتاب سے مراد تشریعی کتاب ہو (وہ کتاب جس میں شریعت کو بیان کیا گیا ہو) جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے تو اس کتاب کے علم کے نتیجہ میں اسے یہ قوت حاصل تھی، گویا ایسی کتابوں کے باطن میں ایسے اسرار پنہاں ہوتے ہیں کہ اگر انسان کو ان پر علمی تسلط حاصل ہو جائے (یعنی ان کا صحیح عالم ہو جائے) تو اُسے ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کرامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ یہ احتمال بھی ممکن ہے کہ اس کتاب سے مراد کوئی ایسی کتاب ہو جس میں اسماء خدا اور اسمِ اعظم ہو۔ ایسی صورت میں یہ کتاب عام کتب کی مانند لکھی ہوئی کتاب نہیں ہوگی بلکہ اس سے مراد ان اسماء کی حقیقت ہوگی جسے کتابِ تکوینی کہا جاتا ہے اور الفاظ ان اسماء کے نام ہوں گے۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص درجہ کمال کی اس منزل پر فائز ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کا مظہر بن جائے۔ یہ دوسرا احتمال پہلے کی نسبت حقیقت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ سورۂ رعد کے آخر میں ایسے انسان کا تذکرہ موجود ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم تھا:

قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًۢا بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ (رعد: ۴۳)

یعنی ''کہہ دو کہ شاہد کے طور پر میرے اور تمہارے درمیان کافی ہے اللہ اور وہ جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے''۔

ان آیات میں علم کتاب کے بارے میں دو جملے آئے ہیں، اصطلاحی لحاظ سے جن کے درمیان واضح فرق پایا جاتا ہے۔ ایک جملہ ''قال الذی عندہ علم من الکتاب'' اور دوسرا جملہ ''ومن عندہ علم الکتاب'' ہے۔ (پہلے جملے میں علم من الکتاب ہے، من تبعیض کے معنی دے رہا ہے۔ یعنی اس کے پاس پوری کتاب کا علم نہیں تھا، بعض کتاب کا علم تھا جب کہ دوسرے جملے میں علم الکتاب ہے یعنی اس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے)۔ روایات میں آیا ہے کہ سورۂ رعد کی آیت سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔[1]

بنابریں احتمال یہی ہے کہ اس کتاب سے مراد تکوینی کتاب اور اسماء اللہ کی واقعیت و حقیقت ہو کیونکہ وہ مظہر ہیں اسماء اللہ کے۔ لہٰذا ان میں یہ قدرت پائی جاتی ہے۔

ملکہ سباء کے حضرت سلیمانؑ کے پاس حاضر ہونے سے پہلے انہوں نے حکم دیا کہ اس کے تخت میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے ناقابل شناخت بنا دیا جائے تاکہ ملکہ آسانی سے اسے پہچان نہ سکے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ نَكِّرُوۡا لَهَا عَرۡشَهَا نَنۡظُرۡ اَتَهۡتَدِىۡۤ اَمۡ تَكُوۡنُ مِنَ الَّذِيۡنَ لَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۴۱﴾

(النمل: ۴۱)

سوال یہ ہے کہ ملکہ کے لیے تخت کو ناقابل شناخت بنانے سے کیا مقصد تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو خود تخت کا لانا انتہائی قوت کے ساتھ نبوت اور غیبی قدرت کے اثبات کی خاطر تھا۔ ملکہ نے جب اپنا ملک چھوڑا تو اس کا تخت اس کے اختیار میں تھا، لیکن اس کے حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچنے سے پہلے تخت وہاں پہنچ گیا جب کہ ملکہ نے اپنے راستے میں تخت کے گزرنے کو نہیں دیکھا۔ دوسرے یہ کہ تخت کو تبدیل کرنا ملکہ کو آزمانے کی خاطر تھا کہ اس کے فہم و فراست کا پتہ چل سکے۔

ملکہ سباء حضرت سلیمانؑ کے حضور!

ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں پہنچی۔ جب تخت کو دیکھا تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کا تخت اس جیسا ہی ہے؟ اس نے بڑی

[1] اس بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں ہے۔ تفسیر برہان ج ۲، ص ۳۰۲، ص ۳۰۴ کی طرف رجوع کریں۔

احتیاط سے (محتاط انداز میں جو زندگی میں پختہ فکری کی علامت ہے) جواب دیا مجھے تو وہی تخت لگتا ہے۔ مزید کہا کہ ہمیں اس سے پہلے سلیمانؑ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ تھا، اسی لیے ہم سر تسلیم خم کر کے آپ کے ملک میں آئے ہیں۔ شاید اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایمان قبول کرنے کے لیے سرزمین سبا سے ہمارا تخت منگوانے کی ضرورت نہیں تھی، اگرچہ یہ بڑے تعجب کی بات ہے بلکہ دوسری وجوہات ہی کافی تھیں کہ ہم سلیمانؑ پر ایمان لے آئیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ (النمل:۴۲)

حضرت سلیمانؑ کا اُسے اپنے ہاں بلانا موجب ہوا کہ اُس کو بتوں کی پرستش چھڑوا دیں۔ حالانکہ وہ خود اور اس کی پوری قوم کافر تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

(النمل:۴۳)

اس تفسیر کی بنا پر ''صدھا'' کے فاعل سلیمانؑ ہیں اور ''ما کانت'' میں ''ما'' موصول، دوسرا مفعول ہے جس سے حرفِ جر حذف کیا گیا ہے۔ پس اس کی تقدیر اس طرح ہے: ''وصدھا سلیمن مما کانت تعبد من دون اللہ''۔ آیت کے آخری جملہ ''و کنا مسلمین'' سے پہلے اس تفسیر پر غور کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کبھی خیال کیا جاتا ہے کہ ''صدھا'' کا فاعل وہی ما موصولہ ہے اور ''ما کانت'' میں ''ما'' سے مراد سورج ہے جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ اس طرح آیت سے مراد یہ ہوگی کہ جس چیز کی وہ پرستش کرتے تھے وہ انہیں اللہ کی پرستش سے دور رکھتی تھی۔ لیکن یہ نظریہ چنداں درست نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلی آیت میں ملکۂ سبا کا تسلیم کرلینا ذکر ہوا ہے جو اس معنی سے مناسبت نہیں رکھتا۔ دوسرے یہ کہ جملہ ''صدھا عن عبادۃ اللہ ما کانت تعبد من دون اللہ''، کو اس کی تقدیر ہونا چاہیے لیکن یہ دونوں باتیں آیت کے ظاہر کے خلاف ہیں۔

مزید قدرت کا مظاہرہ کرنے کی خاطر اس سے کہا گیا کہ شیشے کے محل یا صحن میں داخل ہو (گویا اس کے نیچے پانی چل رہا تھا) جب اس نے اسے دیکھا تو سمجھی کہ اس کا فرش حوض کے مانند ہے جس میں پانی چل رہا ہے لہٰذا اس نے اپنا کپڑا پنڈلیوں سے اٹھا لیا تا کہ اس میں پاؤں رکھے۔ یہاں حضرت سلیمانؑ نے اس سے کہا کہ یہ پانی نہیں ہے بلکہ شیشے کا فرش ہے۔ ملکہ نے جب یہ منظر دیکھا تو اس نے اپنے اندر بڑی عظیم روحانی تبدیلی محسوس کی اور بے اختیار ہو کر بارگاہ پروردگار میں عرض کی کہ خدایا! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اب میں سلیمانؑ کے ہمراہ اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں پیش کرتی ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے:

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ

قَالَ اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ ؕ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّىۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِىۡ وَاَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَيۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ۝ (النمل:۴۴)

یہاں تک حضرت سلیمانؑ کے حالاتِ زندگی اور اس ضمن میں آمدہ آیات کی توضیح وتفسیر مکمل ہوگئی۔اور تفسیر کے ضمن میں کچھ نکات کی طرف اشارہ ہو چکا۔لیکن اس بارے میں مزید کچھ نکات بھی ہیں جن کی طرف ہم اب اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ حضرت سلیمانؑ کی سرگزشت سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کو وہ قوت وتوانائی حاصل تھی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

۲۔ سرگزشت حضرت سلیمانؑ میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جنہیں معجزہ وکرامت کے علاوہ حل نہیں کیا جاسکتا اور یہ سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ علمی بنیادوں پر ان کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔

۳۔ مکہ کی سرزمین میں ایسی آیات کا نازل ہونا جن میں ایک پیغمبر خدا کی عظمت کا تذکرہ ہو جنہوں نے ایک پرندہ کی مدد سے ایک مشرک قوم کو بت پرستی سے ہٹا کر جادۂ توحید پر گامزن کر دیا، مکہ کے رہنے والے موحد کے لیے موجبِ تسلی خاطر ہے جو بت پرستوں کے زیرِعتاب تھے۔

۴۔ اس داستان میں ایسے مادی مظاہر بھی نظر آتے ہیں جن کے پیچھے اکثر اہل دنیا بھاگتے نظر آتے ہیں جب کہ روایات میں ان تجملات کی بڑی مذمت کی گئی ہے۔پھر سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے اس وسیع وعریض نظام کی کیا توجیہ کی جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ظاہری شان وشوکت اور زیب وزینت کے ذریعہ کافروں کو بت پرستی سے روکا جاسکتا ہو تو پھر اس میں کوئی عیب نہیں۔حضرت سلیمانؑ کی یہی ظاہری شان وشوکت ہی تو تھی جو بلقیس کو اتنی دور کی سرزمین سباء سے سرزمین توحید پر کھینچ لائی اور جس سرزمین پر شرک کے جھنڈے گڑے تھے وہاں توحید کا بول بالا ہوگیا۔لہٰذا اگر ظاہری تجملات موجبِ ہدایت ہو جائیں تو اُن سے استفادہ کرنا عقل وشرع کی رو سے کوئی اشکال نہیں رکھتا۔

حضرت سلیمانؑ کی وفات

عالمِ خلقت میں ہر موجود کے لیے موت وفنا لکھ دی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے علاوہ ہر موجود کو بالآخر فنا ہونا ہے۔قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ۝ ۖ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ۝ (رحمن:۲۶، ۲۷)

یعنی ”ہر کسی کو جو بھی اس کائنات میں ہے، فنا ہو جانا ہے، سوائے ذاتِ پروردگار کے جو

صاحب جلال و جمال ہے''

جب یہ سنت الٰہی ہر موجود کے لیے جاری ہے تو حضرت سلیمانؑ کو بھی اس دنیا سے رختِ سفر باندھنا ہی تھا۔ لیکن جیسے اُن کی زندگی تعجب خیز و پراسرار تھی اسی طرح ان کی موت بھی پُراسرار تھی۔ قرآن مجید نے اُن کی وفات کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿١٤﴾ (سباء: ۱۴)

یعنی ''جب ان پر موت وارد کی گئی (حضرت سلیمانؑ نے وفات پائی) تو اس کی موت پر رہنمائی نہ کی مگر ایک زمینی کیڑے (دیمک) نے جس نے اُن کے عصا کو کھا لیا۔ پس جب وہ زمین پر گر پڑے تو جن (جو ان کے مسخر تھے) مطلع ہوئے کہ اگر انہیں غیب کی اطلاع ہوتی تو اس ذلیل وخوار کر دینے والے عذاب میں نہ رہتے (اور انہیں یہ پُر مشقت کام نہ کرنے پڑتے)۔

''ما لبثوا فی العذاب المھین'' کے جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ موت کے بعد کچھ مدت تک حضرت سلیمانؑ اسی حالت پر یعنی عصا پر ٹیک لگا کر کھڑے رہے اور جنات انہیں زندہ سمجھتے ہوئے بدستور اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ مفسرین نے تو یہ مدت ایک سال لکھی ہے جو بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کا دربار ہوتا تھا اور وہ خود قاضی بھی تھے اور ہر روز ان کی ملاقات کے لیے لوگ آتے تھے۔ ایسی شخصیت کی موت ایک سال تک مخفی رہ جائے اور کسی کو پتہ نہ چل پائے، بہت بعید از قیاس ہے۔

آیت کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کسی بلند جگہ پر لاٹھی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ جب کہ اُن کے کارندے اُن پر نظر رکھے ہوئے تھے، جب قضائے الٰہی نے انہیں آ لیا تو ان کی موت واقع ہوگئی۔ اس مدت کو اتنا کم ہونا چاہیے کہ درباریوں کو اتنی مدت اُن کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ ممکن ہے کسی خاص وجہ سے حضرت سلیمانؑ نے کچھ مدت کے لیے ملنا جلنا ترک کر رکھا ہوا اور ظاہراً کچھ کھانے پینے کا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔ جب آپ عبادت سے فارغ ہوئے اور مزدوروں اور کارندوں کے کام کا مشاہدہ کرنے کے لیے محل کی چھت پر ظاہر ہوئے تو ملک الموت نے ان کی روح قبض کر لی اور دیمک نے بھی مناسب رفتار سے آپ کے عصا کو کھایا۔ بس عصا کے ٹوٹنے سے حضرت سلیمانؑ کا بے جان جسم زمین پر گر پڑا۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جیسے ان کی زندگی عام کیفیت حیات سے مختلف تھی اسی طرح اُن کی موت بھی خلافِ عادت واقع ہوئی، اُن کی اس طرح کی وفات نے ثابت کر دیا کہ عام لوگوں کے خیالات کے مطابق جنات کو غیب کی خبریں حاصل نہیں ہوتیں اور اگر ان میں سے بعض کو خدا کے فضل وکرم سے غیب سے کچھ خبریں حاصل ہو بھی جائیں تو جو جن حضرت سلیمانؑ کے مسخر تھے، ان میں یہ خصوصیت نہیں تھی۔

حضرت امیر المومنینؑ دنیا کی بے اعتباری کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت سلیمانؑ کی موت وحیات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اگر اس دنیا میں دائمی زندگی ممکن ہوتی اور موت سے فرار ممکن ہوتا تو یہ سلیمانؑ ابن داؤد کے لیے ممکن ہوتا، وہ سلیمانؑ جو نبوت وقرب الٰہی کی منزل پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں اور جنوں پر تسلط رکھتے تھے۔ لیکن جب ان کی دنیا کی زندگی ختم ہوئی اور ان کا وقت آخر آن پہنچا تو موت کا تیر کانِ فنا سے آن پہنچا پس وہ گھر ان سے خالی ہو گئے جو انہوں نے بطورِ مسکن بنائے تھے۔ پھر دوسرے لوگ ان کے وارث بن گئے۔ اسی طرح لوگوں کی زندگی تمہارے لیے نمونۂ عبرت ہے۔[1]

بالآخر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی پوری زندگی، موت تک، عجائب وغرائب سے پُر ہے، جنہیں ہم اپنے محدود علمی معیار سے ہرگز نہیں جانچ سکتے۔ ایمان بالغیب کے علاوہ اُسے واقعیت وحقیقت کے عنوان سے مانا نہیں جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے متقین کا ایک وصف ایمان بالغیب بتلایا ہے: "الذین یؤمنون بالغیب"

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۲

سولھویں پیغمبر

حضرت ایوب علیہ السلام کے حالاتِ زندگی

حضرت ایوبؑ بزرگ انبیاء میں سے تھے۔ اُن کا نام قرآن مجید میں چار مرتبہ سورۂ نسا ۱۶۳، انعام: ۸۴، انبیاء ۸۳، اور ص: ۴۱ میں آتا ہے۔ حضرت ایوبؑ صاحبِ کتاب نبی تھے۔ اُن کی کتاب عہد قدیم کا ایک حصہ ہے۔ اُن کی زندگی سے متعلق آیاتِ قرآن کا بیان اس طرح ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡكَ كَمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلٰی نُوۡحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ وَاَوۡحَیۡنَآ اِلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِیۡسٰی وَاَیُّوۡبَ وَیُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَیۡمٰنَ ۚ وَاٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾ (النساء: ۱۶۳)

۲۔ وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ ؕ كُلًّا هَدَیۡنَا ۚ وَنُوۡحًا هَدَیۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ وَاَیُّوۡبَ وَیُوۡسُفَ وَمُوۡسٰی وَهٰرُوۡنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۸۴﴾ (الانعام: ۸۴)

۳۔ وَاَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۸۳﴾

۴۔ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَكَشَفۡنَا مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّاٰتَیۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَذِكۡرٰی لِلۡعٰبِدِیۡنَ ﴿۸۴﴾ (الانبیاء: ۸۳، ۸۴)

۵۔ وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَیُّوۡبَ ۘ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾

۶۔ اُرۡكُضۡ بِرِجۡلِكَ ۚ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾

۷۔ وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنَّا وَذِكۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۴۳﴾

۸۔ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۴۴﴾ (ص: ۴۱ تا ۴۴)

آیات کا ترجمہ

۱۔ ہم نے آپ پر وحی کی جیسے کہ ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد والے انبیاء پر وحی کی تھی۔ ہم نے ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوب اسباط، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی فرمائی اور داؤدکو زبور عطا کی۔

۲۔ ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاق و یعقوبؑ عطا فرمائے۔ سب کو ہم نے ہدایت کی اور اس سے پہلے نوحؑ کو ہدایت کی اور ان (ابراہیمؑ یا نوحؑ) کی ذریت سے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ ہیں۔ ہم اسی طرح نیکی کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔

۳۔ یاد کرو جب ایوبؑ نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا: خدایا! مجھے مشکلات اور سختیوں نے آن گھیرا ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

۴۔ ہم نے اُن کی دعا قبول فرمالی، اُن کی مشکلات و تکلیفات دور کردیں اور ان کے اہل وعیال ان کو لٹا دیئے۔ نیز جو سب اُن کی مانند تھے وہ بھی انہیں لوٹا دیئے۔ یہ ہماری رحمت تھی ایوبؑ پر جو عبادت کرنے والوں کے لیے سبق آموزی کا موجب تھی۔

۵۔ ہمارے بندے ایوبؑ کو یاد کرو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا: خدایا! مجھے شیطان نے رنج وعذاب میں ڈال دیا ہے۔

۶۔ (ہم نے اسے کہا) اپنے پاؤں کو حرکت دو، (جس سے پانی پھوٹ نکلا) یہ دھونے والا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے۔

۷۔ ہم نے ان کے اہل وعیال انہیں لوٹا دیئے اور جو ان کی مثل تھے وہ بھی دے دیئے۔ یہ ہماری رحمت تھی اور صاحبانِ عقل کے لیے موجبِ ہدایت تھی۔

۸۔ باریک لکڑیوں کا ایک دستہ (مٹھا) لے لو اور اپنی قسم کو نہ توڑو۔ ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا۔ کیسا نیک بندہ تھا جو اللہ کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ رہتا تھا۔

وضاحتِ الفاظ

ا۔ ضر: یہ لفظ حضرت ایوبؑ کے حالات میں دو آیات میں آیا ہے: مسنی الضر"۔ "فکشفنا مابہ من ضر"
ضر، شرق کے اوزان پر نقصان کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَّآ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِيۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا (اعراف: ۱۸۸)

یعنی "(کہہ دو) میں اپنے نفع ونقصان کا خود مالک نہیں ہوں۔ سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے"۔

لیکن ضر بروزن حر، ناگوار حالات اور بدحالی کے معنی میں آتا ہے جیسے آج کل نامناسب وغیر موافق حالات میں کہا جاتا ہے۔ فقر، تنگدستی اور بیماری وغیرہ اس کے مصادیق ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنۡۢبِهٖۤ اَوۡ قَاعِدًا اَوۡ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنۡ لَّمۡ يَدۡعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ (یونس: ۱۲)

یعنی "جب انسان کو ناگوار حالات پیش آتے ہیں تو لیٹتے، اٹھتے، بیٹھتے ہمیں پکارتا ہے، لیکن جب ہم اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو اسی طرح بھول جاتا ہے گویا اس نے ہمیں کبھی کسی مشکل میں پکارا ہی نہیں تھا"

۲۔ نصب، ظلم کے وزن پر مشقت وتعب کے معنی میں آتا ہے۔ بیماری مصائب میں اس کا استعمال اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ بیماری میں تعب ومشقت ہوتی ہے۔

۳۔ عذاب، باب تفعیل سے عذب کا مصدر ہے۔ لغوی طور پر روحانی یا جسمانی بے آرامی کے معنی دیتا ہے جو انسان پر وارد ہوتی ہے، اگر چہ انسان اس کا مستحق نہ بھی ہو۔ لہٰذا عربی زبان میں شکنجہ دینے والے کو معذب اور اس کے کام کو عذاب کہا جاتا ہے۔ ابتدائی معنی اس کے قطعاً سزا وعقوبت کے نہیں، البتہ اکثر سزائیں عذاب وبے آرامی کا موجب ہوتی ہیں۔

۴۔ رُکض، یہ لفظ پاؤں مارنے کے معنی میں آتا ہے اور آیت میں اس سے مراد پانی میں پاؤں مارنے کے ہیں، جو حضرت ایوبؑ کے لیے ظاہر ہوا تھا۔

۵۔ مغتسل، دھونے کی جگہ یا دھونے کے پانی کو کہا جاتا ہے اور بارد وشراب کی لفظوں کو دیکھتے ہوئے اس سے پانی کے معنی مراد لینا

زیادہ مناسب ہے۔[1]

٦۔ ضغث، بروزن ارث گھاس پھوس کے مٹھے کو کہا جاتا ہے۔

٧۔ حنث، بروزن جنس قسم توڑنے کو کہتے ہیں۔

آیات کی موضوعی تفسیر

آیات کے لغات کے بیان کے بعد اب ہم آیات کی موضوعی تفسیر ذکر کرتے ہیں:

سورہ نساء، انعام کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ایوب بزرگ انبیاء میں سے تھے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن نے سورہ انعام میں حضرت ایوبؑ کو حضرت نوحؑ کی ذریت سے شمار کیا ہے۔ لہٰذا ان کے طبقہ کی تعیین نہیں کی جا سکتی، اگرچہ احتمال یہ بھی ہے کہ "من ذریتہ" کی ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف راجع ہو۔ بناء بریں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ایوبؑ حضرت سلیمانؑ کے بعد گزرے ہیں، کیونکہ فرمایا گیا ہے من ذریۃ داؤدؑ و سلیمانؑ و ایوبؑ"۔ البتہ آیت سے یہ استنباط اس وقت تک حجت ہے جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل قائم نہ ہو، جب کہ آیت میں ایوبؑ کے بعد یوسف، موسیٰؑ اور ہارونؑ کا ذکر آیا ہے جو یقیناً داؤدؑ و سلیمانؑ سے پہلے گزرے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ "من ذریتہ" کی ضمیر یقیناً حضرت نوحؑ کی طرف لوٹتی ہے حضرت ابراہیمؑ کی طرف نہیں کیونکہ بعد میں ان پر حضرت لوطؑ کا عطف واقع ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے:

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَيُوۡنُسَ وَلُوۡطًا‌ ؕ وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۸۶﴾ (انعام:۸۶)

یہ بات یقینی ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے نہیں تھے بلکہ ان کے ہم عصر اور ان کی شریعت کے پیرو تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس ضمیر کا حضرت ابراہیمؑ کی طرف لوٹنا زیادہ واضح ہے، اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کا نام چند آیات سے پہلے (انعام ۸۴) ذکر ہوا ہے۔ شاید لوطؑ کا عطف اس پر اس جہت سے ہو کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے رشتہ دار یعنی بھانجے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کو ان پر تقدم حاصل تھا، گویا وہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے خاندان سے تھے۔

حضرت ایوبؑ کی زندگی کے اہم واقعات

سورۂ انبیاء و سورہ ص کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوبؑ کی زندگی میں کچھ اہم مسائل پیش آئے تھے۔ چند ایک کا تذکرہ

[1] مفردات راغب مادہ غسل

یہاں کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت ایوبؑ بعض ناسازگار حالات وحوادث کا شکار ہوئے تھے جنہیں "مسنی الضر" اور "فکشفنا ما به من ضر" کے جملے بیان کر رہے ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان مصائب و آلام سے نکالنے کی خاطر حکم دیا تھا کہ وہ پانی کے ساتھ اپنے آپ کو دھوئیں، جملہ "ارکض برجلك هذا مغتسل بارد و شراب" اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ حضرت ایوبؑ نے کوئی قسم کھائی تھی، اللہ نے جس پر عمل کرنے کا خاص طریقہ انہیں بتلایا۔ "خذبيدك ضغثا" میں اس کا بیان ہے۔

۴۔ گویا ان کے اہل وعیال ان کے پاس نہیں تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے دوگنا کر کے انہیں لوٹا دیا۔ "واتينه اهله و مثلهم"، "ووهبناله اهله ومثلهم" اس مطلب کا بیان ہیں۔

اب ہم ان چاروں مطالب وواقعات کی تشریح ووضاحت کرتے ہیں:

پہلے حادثہ کے بارے میں ہم عرض کرتے ہیں کہ آیات سے اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت ایوبؑ بڑے سخت مصائب و حوادث کا شکار ہوئے تھے اور شاید ان کے مصائب میں کسی قسم کی کوئی جسمانی بیماری شامل تھی، لیکن ایسی بیماری نہیں جو لوگوں کو متنفر کرنے کا موجب بنتی، جیسا کہ بعض روایات میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایسی روایات کو اسرائیلی مختر عات سمجھ کر رد کر دینا چاہیے۔

کسی شخص کا مریض ہونا اس کے گناہ گار ہونے کی علامت نہیں بلکہ ممکن ہے کہ یہ اس کی پاکیزگی کی علامت ہو۔ حضرت ایوبؑ کی بیماری اسی قسم کی تھی کیونکہ اُن کا صبر و بردباری قضائے الٰہی کے مقابلہ میں اُن کی استقامت کی علامت ہے۔

قابل بحث بات یہ ہے کہ سورہ ص میں اس سختی ومشقت کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾ (ص:۴۱)

اس کے برعکس سورۂ انبیاء میں اس نسبت کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا، بلکہ صرف "مسنی الضر" کہا گیا ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ جیسے پیغمبر کے بارے میں شیطان کی دخالت کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟

اس سوال کے دو جوابات دیئے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دو جملے "مسنی الضر" اور "مسنی الشيطان" ایک معنی میں نہیں ہیں۔ پہلے جملے سے بیماری مراد ہے جس کے ہمراہ رنج و تکلیف بھی تھی جب کہ دوسرے جملہ کا مطلب راہبوں کی شماتت ہے جو شیطان کے اکسانے پر حضرت ایوبؑ کو سرزنش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ حالات تمہارے کون سے گناہ کی سزا ہیں؟ امام جعفر صادق علیہ السلام اسی بارے میں فرماتے ہیں:

ان الله ابتلى ايوب بلا ذنبٍ فصبر حتى عير وان الانبياء لا يصبرون على

الیعس [1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو بغیر گناہ کے مصیبت میں مبتلا کیا اور انہوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ انہیں لوگ مطعون کرنے لگے۔ جب کہ انبیاء شماتت وعار پر صبر نہیں کرتے۔(انبیاء میں یہ قانون غالب ہے)۔

بناء بریں یہاں مس شیطان کا مطلب جسمانی وروحانی تکلیف نہیں بلکہ اس سے مراد شیطان کا راہوں میں اثر پیدا کرنا ہے جس کی وجہ سے حضرت ایوبؑ مشکلات واذیتوں میں مبتلا ہوئے۔ دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں آیات سے مراد ایک ہی بات ہو اور شیطان نے اذنِ خدا کے ساتھ حضرت ایوبؑ کے اموال ومزاج میں تصرف کیا ہو، کیونکہ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ ایوبؑ کا شاکر ہونا ان نعمتوں کی وجہ سے ہے جو اللہ کی طرف سے اُسے دی گئی ہیں۔ اگر مجھے اس پر مسلط کر دیا جائے اور میں اس سے تمام نعمتوں کو چھین لوں تو پھر دیکھنا ہوگا کہ وہ اس حالت پر باقی نہیں رہے گا۔[2] یہی وجہ ہے کہ حضرت ایوبؑ نے ایک جگہ پر فاعل کا نام ذکر کیا اور کہا: "مسنی الشیطان" اور دوسری جگہ فاعل کا ذکر نہیں کیا صرف "مسنی الضر" کہا۔

ان دو جوابوں میں پہلا جواب زیادہ مناسب وصحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ایوبؑ کی بیماری نے طول کھینچا اور سخت فقر وناداری کے باوجود وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے روحانی کمالات کو ظاہر کیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں فرمایا:

انا وجدنہ صابراً نعم العبد انہ اواب

یعنی "ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا! کیسا اچھا بندہ تھا وہ کہ ہمیشہ اپنے معبود کی طرف متوجہ رہتا تھا"

لوگوں کے امتحان کی وجہ صرف یہی نہیں ہوتی بلکہ مختلف افراد کے امتحان کے سلسلہ میں روایات میں کچھ اور وجوہ کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ دوسرا حادثہ یعنی ان مصائب سے چھٹکارے کا طریقہ جسے سورہ ص ۴۲ میں بیان کیا گیا ہے، یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کے پاؤں مارنے سے معجزانہ طور پر پانی کا چشمہ بہہ نکلا جس میں انہوں نے اپنا جسم دھویا۔ وہ پانی ٹھنڈا بھی تھا اور پینے کے قابل بھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ (ص:۴۲)

تیسرے مطلب کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ نے بیماری کے دوران اپنی بیوی سے نافرمانی کا مشاہدہ کیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے قسم کھائی تھی کہ صحت یاب ہوکر اسے کوڑے ماریں گے۔ جب وہ صحت یاب ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں قسم کے توڑنے سے

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۲، ص ۳۴۷

[2] بحار الانوار جلد ۱۲، ص ۳۴۷

بچانے کی خاطر اجازت دی کہ اپنی قسم پر اس خاص طریقہ کے ذریعہ عمل کریں، وہ اس طرح کہ گھاس پھوس کا ایک مٹھا لے کر اس سے اپنی زوجہ کو ماریں۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں آئے کہ یہ تو شریعت کی ایک تاویل ہوئی، حیلہ و بہانہ کے ذریعے، جو مقام انبیاء کے لیے مناسب نہیں۔ لیکن اگر نافرمانی و مخالفت کرنے والے میں ایسے پہلو موجود ہوں جو اس کی سزا میں کمی کا تقاضا کرتے ہوں تو پھر اس قسم پر عمل کرنا حیلہ و بہانہ نہیں ہوگا۔ یہاں بھی حضرت ایوبؑ کی زوجہ نے ان کی بیماری کی اس پوری مدت میں ان کا ساتھ دیا اور ہمیشہ ان کی خدمت میں رہی۔ اس وجہ سے وہ سزا ئیں کمی کی مستحق تھی اور دوسری طرف سے حضرت ایوبؑ نے چونکہ اللہ کے نام کی قسم کھائی تھی لہٰذا اللہ کو بھی حق حاصل ہوجاتا ہے کہ ایوبؑ سے قسم پر بطورِ استثناء اس طرح کا عمل قبول فرمالے۔ یہ کوئی شرعی حیلہ بازی نہیں ہے کہ لوگ اسے اپنے اعمال پر دلیل بنالیں۔ اور سورۂ انبیاء کی آیت: "و اتینه اهله و مثلهم معهم اور سورہ ص کی آیت ووهبنا له اهله ومثلهم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے خاندان کو اُن کے پاس لوٹا دیا۔ اس مورد میں روایات میں دو طرح کی تفسیر وارد ہوئی ہے، ایک تو یہ کہ حضرت ایوبؑ کی بیماری کے دوران اُن کے بیٹے بھی اُن سے جدا ہو کر ادھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ جب حضرت ایوبؑ صحت یاب ہو گئے تو تمام بیٹے واپس لوٹ آئے اور حضرت ایوبؑ دوبارہ صاحبِ اولاد ہو گئے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ امتحان کے دوران حضرت ایوبؑ کے سب بیٹے وفات پا گئے تھے۔ حضرت ایوبؑ کے حالات سازگار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا اور ان کی تعداد کے برابر اللہ نے حضرت ایوبؑ کو اور بیٹے بھی عطا فرمائے۔ حضرت ایوب کے راہِ خدا میں صبر کو دیکھتے ہوئے ایسی کرامات کا وقوع آسانی سے قبول کیا جاسکتا ہے۔

داستانِ حضرت ایوبؑ کے اہم نکات

درج ذیل چند نکات کا اس داستان سے پتہ چلتا ہے:

۱۔ کسی کا مصائب و تکالیف سے دوچار ہونا اس کے گناہگار ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، اگرچہ بعض مشکلات گناہوں کا کفار بھی ہوتی ہیں اور بعض تکلیفیں انسان کے تقربِ خدا کی صلاحیت کو اجاگر کرتی ہیں۔

۲۔ صبرِ ایوبؑ جو زبان زدِ عام و خاص ہے، کی مدت تقریباً بیس سال تھی۔ جس عرصہ میں حضرت ایوبؑ نے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا۔ وہ اس طویل مدت میں ہمیشہ اللہ کی بارگاہ میں صبر و شکر کرتے رہے اور قرآن نے انہیں "اواب" کہا ہے نہ کہ شاکی۔ یہ طرزِ عمل ہمارے لیے بہت بڑا درس ہے کہ ہمیں مشکلاتِ زندگی میں صبر و بردباری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

۳۔ ممکن ہے مصائب و مشکلات میں انسان بعض مادی منافع ہاتھ سے دے بیٹھے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ ظاہری یا باطنی طور پر ضرور دیتا ہے، جیسا کہ حضرت ایوبؑ کو اولاد کے سلسلہ میں عطا فرمایا۔

۴۔ خدمت گزار شخص اگرچہ سزا کا مستحق ہو جائے تب بھی اس کی سابقہ خدمات کا خیال ضرور کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی نیکیاں اس کی سزا میں کمی کا موجب بن سکتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی بیوی کے سلسلہ میں اس طرح کا عمل کرنے کی ہدایت فرمائی کہ اسے لکڑی سے مارنے کی بجائے گھاس کے مٹھے سے مارا جائے۔

سترھویں پیغمبر

حضرت یونسؑ کے حالات

حضرت یونسؑ کا نام قرآن مجید میں چار بار سورۂ نساء ۱۶۲، سورۂ انعام ۸۶، سورۂ یونس: ۹۸ اور سورہ صافات ۱۳۹ میں آیا ہے۔ نیز سورۂ انبیاء ۸۷، ۸۸ سورۂ ن والقلم ۵۰ میں ان کی صفات ذکر ہوئی ہیں۔

قرآن مجید نے اُن کی سرگذشت کے کچھ حصے نقل فرمائے ہیں۔ سورۂ صافات میں ان کا قوم کی طرف مبعوث ہونا، پھر قوم سے روگردان ہوکر کشتی میں سوار ہونا، مچھلی کے پیٹ میں جانا، ان کی نجات اور دوبارہ قوم کی طرف مبعوث ہونا ذکر ہوا ہے۔ سورۂ انبیاء میں شکم ماہی میں صرف اُن کی تسبیح اور نجات کا تذکرہ ہے جب کہ سورہ ن والقلم میں ان کی پشیمانی کے ساتھ پکار اور شکم ماہی سے نکلنا، پھر دوبارہ مرتبہ رسالت پر فائز ہونا مذکور ہوا ہے۔

سورۂ یونس میں ان کی قوم کے ایمان اور ان سے عذاب کے ٹلنے کا ذکر ہے۔ ان سب واقعات سے متعلق آیات درج ذیل ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ۚ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ‌ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا‌ۚ ﴿۱۶۳﴾ (النساۃ ۱۶۳)

۲۔ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَيُوۡنُسَ وَلُوۡطًا‌ ؕ وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَۙ ﴿۸۶﴾ (الانعام: ۸۶)

۳۔ وَاِنَّ يُوۡنُسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَؕ ﴿۱۳۹﴾

۴۔ اِذۡ اَبَقَ اِلَى الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِۙ ﴿۱۴۰﴾

۵۔ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الۡمُدۡحَضِيۡنَ‌ۚ ﴿۱۴۱﴾

۶۔ فَالۡتَقَمَهُ الۡحُوۡتُ وَهُوَ مُلِيۡمٌ ﴿۱۴۲﴾

۷۔ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

۸۔ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

۹۔ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

۱۰۔ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾

۱۱۔ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

۱۲۔ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾ (الصفت ۱۳۹ تا ۱۴۸)

۱۳۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى
الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

۱۴۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُـنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾
(الانبیاء: ۸۷، ۸۸)

۱۵۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى
وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾

۱۶۔ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾

۱۷۔ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ (القلم ۴۸ تا ۵۰)

۱۸۔ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا
كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾
(یونس: ۹۸)

آیات کا ترجمہ

۱۔ ہم نے تم پر ایسی ہی وحی کی جیسے تم سے پہلے نوحؑ اور ان کے بعد والے انبیاء اور ابراہیمؑ پر وحی کی

تھی اور یونسؑ پر

۲۔ہم نے اسمٰعیلؑ، یسعؑ، یونسؑ اور لوطؑ پر وحی کی اور سب کو عالمین پر فضیلت عطا فرمائی۔

۳۔ بتحقیق یونسؑ مرسلین سے ہے۔

۴۔ جب وہ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔

۵۔ کشتی سواروں کے ساتھ قرعہ ڈالا گیا جس میں وہ مغلوب ہو گیا۔

۶۔ مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت کا مستحق قرار پایا۔

۷۔ اگر وہ مچھلی کے پیٹ میں تسبیح کرنے والوں سے نہ ہوتا۔

۸۔ تو اس دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہتا جس دن لوگوں کو (قیامت میں) اٹھایا جائے گا۔

۹۔ ہم نے اسے بے آب وگیاہ زمین پر پھینکا، اس حال میں کہ وہ مریض تھا۔

۱۰۔ اس کی جان بچانے کے لیے ہم نے اس پر کدو کا درخت اگا دیا۔

۱۱۔ ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا۔

۱۲۔ سب لوگ ایمان لے آئے اور انہیں ہم نے ان کی اجل تک نعمات عطا فرمائیں۔

۱۳۔ مچھلی والے کو یاد کرو جب وہ غصہ کی حالت میں (اپنی قوم کو چھوڑ کر) چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ ہم اس پر زندگی تنگ نہیں کریں گے۔ پھر اس نے تاریکیوں میں (مچھلی کے پیٹ میں اپنی حالت کو سمجھا تو) ندا دی کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں ہی ظالمین سے تھا۔ (میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا)

۱۴۔ ہم نے اس کی درخواست پر جواب دیا، اُسے غم سے نجات دی اور ہم اسی طرح مومنین کو نجات دیا کرتے ہیں۔

۱۵۔ اپنے رب کے حکم وقضا پر صبر کر۔ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جا، جب اس نے ندا دی اس حال میں کہ وہ اپنا غصہ پی چکا تھا۔

۱۶۔ اگر اللہ کی نعمت اس کے شاملِ حال نہ ہو چکی ہوتی تو اُسے بے آب وگیاہ زمین پر اس حال

میں پھینکا جاتا کہ وہ موردِ مذمت قرار پا چکا ہوتا۔ (لیکن اللہ کی نعمت مانع ہوئی کہ مذموم حالت میں
اسے بیابان میں ڈال دیا جائے)
۱۷۔ اللہ نے اُسے چن لیا اور صالحین سے قرار دیا۔
۱۸۔ کسی بستی والے کیوں ایمان نہیں لائے کہ انہیں ان کے ایمان سے فائدہ پہنچے مگر قومِ یونسؑ
جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے انہیں دنیا میں خوار کر دینے والے عذاب سے نجات دی اور
انہیں ان کی اجل تک نعمتیں عطا فرمائیں۔

آیات کے الفاظ کی تشریح

۱۔ مَشحون: باب شحن کا اسم مفعول ہے، بھری ہوئی چیز کو مشحون کہتے ہیں

۲۔ مدحضین: باب دحض سے اسم مفعول ہے۔ زوال و بطال کے معنی دیتا ہے، یہاں مراد حضرت یونسؑ کا محکوم ہونا ہے کیونکہ قرعہ ان کے نام نکلا تھا۔

۳۔ ابق: فرار کرنے کے معنی میں ہے۔ بھاگ جانے والے غلام کو ابق کہا جاتا ہے۔

۴۔ ساھم: ساھمہ سے قرعہ کشتی کے معنی میں ہے۔

۵۔ التقام: نگلنے کے معنی میں ہے۔

۶۔ ملیم: الام کے باب سے اسم فاعل ہے جس کے معنی ہیں ملامت کا مستحق۔

۷۔ نبذ: فقر کے وزن پر کسی چیز کو دور پھینکنے کے معنی میں ہے۔

۸۔ عراء: وہ جگہ جہاں چھت یا سائبان وغیرہ کچھ نہ ہو۔

۹۔ یقطین: کدو کی بیل

۱۰۔ نون و حوت: بہت بڑی مچھلی

آیات کی موضوعی تفسیر

آیات مندرجہ کے ذیل میں یہ عناوین موردِ تفسیر قرار پائیں گے۔

۱۔ حضرت یونسؑ کی اپنی قوم کے لیے بدعا

۲۔ حضرت یونسؑ پر کشتی میں واقع ہونے والے حالات

۳۔ حضرت یونسؑ بے آب و گیاہ زمین پر

۴۔ مخالفین عصمت کی بحث

اب ہم بالترتیب ان موضوعات پر بحث کرتے ہیں:

(۱) حضرت یونس کی اپنی قوم کے لیے بددعا

حضرت یونسؑ اپنی قوم کی ہدایت کے لیے سرزمین عراق میں مبعوث ہوئے انہوں نے جتنی بھی تبلیغ کی اس کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بقولِ مفسرین [1] صرف دو آدمی ان پر ایمان لائے جن میں ایک عالم تھا دوسرا عابد۔ حضرت یونسؑ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ انہوں نے اپنی قوم کے لیے بددعا کرتے ہوئے قوم کی سرزمین کو چھوڑ دیا اور انہیں بتلایا کہ تین دن کے بعد عذاب الٰہی نازل ہو گا۔ حضرت یونسؑ کچھ فاصلہ سے اپنی قوم کی حالت کا مشاہدہ کرنے لگے اور عذاب کے آثار بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اب قوم اس عالم کی تلاش میں گئی کہ کیا کریں۔ اس نے کہا کہ اللہ سے پناہ مانگو اور گریہ وزاری کرو۔ صحرا کی طرف نکل جاؤ اور رحمتِ خداوندی کی درخواست کرو۔ اس طرح بتدریج عذاب برطرف ہونا شروع ہو گیا اور وہ اپنے گھروں کو لوٹ آئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ

(یونس: ۹۸)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عذاب کے نزول کے وقت تو ایمان لانے کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا، جیسا کہ اسی سورہ میں چند آیات پہلے فرمایا گیا ہے کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو اس نے ایمان کا اعلان کیا اور کہا:

امنت انه لا اله الا الذی امنت به بنوا آاسرائیل و انا من المسلمین

لیکن جواب میں کہا گیا:

آٰلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱ (یونس: ۹۰، ۹۱)

اسی طرح سورۂ مومن میں نزولِ عذاب کے وقت کے ایمان کو بے فائدہ کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝۸۴

[1] مجمع البیان، جلد ۳، ص ۱۳۵

فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ قَدۡ خَلَتۡ فِىۡ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ۝۸۵ (مومن: ۸۴۔۸۵)

یعنی ”جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ تو کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لائے اور ان کا انکار کرتے ہیں جن کو اس کے ساتھ شریک کرتے تھے۔لیکن اس حالت میں جب کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھ لیا تو انہیں اُن کے ایمان نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ سابقہ لوگوں میں ہمارا طریق یہی رہا ہے، درآنحالیکہ کافر گھاٹے میں ہیں“

پس قومِ یونسؑ اور بقیہ اقوام میں کیا فرق ہوا؟

اس سوال کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کا فرعون اگر ایمان لے بھی آتا تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوتا، یقیناً اُسے سخت عذاب پھر بھی ملنا تھا کیونکہ جس نے ہزاروں بیگناہ بچوں کو قتل کیا ہو اور انواعِ جنایات کا مرتکب ہوا ہو، وہ صرف ایمان لانے سے پاک نہیں ہوسکتا جب کہ قومِ یونسؑ کا ایمان لانا عذاب کے نزول کے وقت نہیں تھا بلکہ انہوں نے ابھی صرف عذاب کے آثار مشاہدہ کیے تھے اور چونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ یونسؑ انہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو اس سے انہوں نے عذاب کے یقینی ہونے کو سمجھ لیا۔ لہٰذا وہ اپنے مکمل اختیار کے ساتھ ایمان لائے، اپنی عقل اور عالم کی رہنمائی کے ساتھ انہوں نے اپنے اوپر توبہ کے دروازے کھول لیے اور ایمان لے آئے، جب کہ مومن میں ”فلما را وا باسنا“ کی تعبیر کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خود عذاب کو جب دیکھا“۔ اس میں فرق ہے کہ عذاب کی آثار مشاہدہ کر لیے جائیں۔ نیز آیت فلو لا کانت قریۃ امنت فنفعھا ایما نہا“ سے پتہ چلتا ہے کہ جو صورتِ حال قومِ یونسؑ کو درپیش تھی اگر یہی صورتِ حال کسی اور قوم کو پیش آجاتی اور وہ ایمان لے آتے تو اُن کا ایمان بھی قبول کرلیا جاتا اور ان کے لیے ان کا ایمان فائدہ مند ہوسکتا تھا۔

بعد والی آیت بتلاتی ہے کہ ایمان وہ مفید ہوتا ہے جو اختیار کے ساتھ قبول کیا جائے لہٰذا مجبوری کی حالت میں ایمان لانا کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ تُكۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ۝۹۹ (یونس: ۹۹)

یعنی ”اگر تمہارا رب چاہتا تو تمام لوگ ایمان لے آتے۔ کیا تم (اے پیغمبر) لوگوں کو مجبور کرتے ہو کہ ایمان لے آئیں (لیکن ایسے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں)“۔

بنابریں یونسؑ کا ایمان اس آیت کی حدود سے خارج ہے، کیونکہ وہ اپنے مکمل اختیار سے ایمان لائے تھے اور یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ عذاب کے سامنے قرار نہ پاچکے ہوں۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ قومِ یونسؑ سے عذاب کا اٹھ جانا حضرت یونسؑ کو جھٹلائے جانے کا سبب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عذاب کی نشانیاں تو قوم پر ظاہر ہو ہی چکی تھیں اور سب کو یقین ہو چکا تھا کہ اگر اب چارہ جوئی نہ کریں تو یقینا ان پر عذاب نازل ہوگا، حضرت یونسؑ کی غیب کی خبر واقع ہوجائے گی۔ لہٰذا حضرت یونسؑ کی تکذیب تب لازم آتی اگر انہیں حضرت یونسؑ کی سچائی پر دلیلیں نہ مل جاتیں۔ ہم نے اپنی کتاب "البلا فی الکتاب والسنۃ" میں ثابت کیا ہے کہ اس قسم کے واقعات انبیاء کی تکذیب کا موجب نہیں بنتے، جیسا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے خبر دی کہ انہیں اسمٰعیلؑ کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ انجام پذیر نہ ہوا کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے منسوخ ہوگیا۔ لیکن چونکہ مقدمات فراہم ہو چکے تھے لہٰذا اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ حکم یقینا نافذ ہو چکا تھا۔

(۲) حضرت یونس کی کشتی میں کیفیت

حضرت یونسؑ دور سے اپنی قوم کے حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ جب انہوں نے سمجھ لیا کہ عذاب اُن سے اٹھا دیا گیا ہے تو سخت غصہ کی حالت میں اپنی سرزمین سے دور چلے جانے کا قصد کر لیا۔ چلتے چلتے دریا کے کنارے جا پہنچے جہاں انہوں نے مسافروں اور سامان سے بھری کشتی دیکھی۔ پس ان سے درخواست کی کہ انہیں بھی کشتی میں سوار کر لیں۔ انہوں نے حضرت یونسؑ کو کشتی میں بٹھا لیا۔ کشتی چل پڑی لیکن کچھ دور جا کر رُک گئی۔ اب کشتی کیوں رُکی، اس بارے میں دو قول ملتے ہیں، ایک تو یہ کہ وزن کی زیادتی موجب بنی کہ کشتی چل نہ سکی اور دوسرا یہ کہ کشتی کے آگے ایک بڑی مچھلی آ کر اسے آگے جانے سے مانع ہو گئی۔

بہرکیف جو بھی ہوا، طے یہ پایا کہ کشتی سے ایک آدمی اتار دیا جائے۔ اب سوال یہ پیش تھا کہ کس شخص کو اتارا جائے۔ اس کے لیے بہترین طریقہ قرعہ اندازی تھی تاکہ اس شخص کی تعیین کی جا سکے۔ جب قرعہ ڈالا گیا تو قرعہ حضرت یونسؑ کے نام نکلا اور انہوں نے حضرت یونسؑ کو دریا میں پھینک دیا جہاں اس بڑی مچھلی نے حضرت یونسؑ کو نگل لیا۔ لیکن ارادۂ خدا یہ ٹھہرا کہ حضرت یونسؑ مچھلی کی خوراک نہ بنیں اور انہیں کوئی نقصان بھی نہ پہنچے۔ حضرت یونس اس صورت حال کے مشاہدہ سے فوراً اس مصیبت کی وجہ سمجھ گئے کہ بے صبری کا مظاہرہ اور قوم سے ناراضگی ان کے شایانِ شان نہ تھی۔ لہٰذا اپنی غلطی پر پشیمان ہو گئے اور شکم ماہی کی اس تاریکی میں، انہوں نے تسبیح و تقدیس شروع کر دی۔ یہی چیز ان کی نجات کا سبب بنی۔ اللہ نے مچھلی کو حکم دیا کہ انہیں باہر پھینک دے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ
اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ‌ۖ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۚ‌ۖ ۝۸۷ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ ۙ
وَنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡغَمِّ‌ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـنۡجِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۸۸ (الانبیاء: ۸۸،۸۷)

دوسری جگہ فرمایا:

وَاِنَّ يُوۡنُسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ؕ ۝۱۳۹ اِذۡ اَبَقَ اِلَى الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِ ۙ ۝۱۴۰ فَسَاهَمَ
فَكَانَ مِنَ الۡمُدۡحَضِيۡنَ‌ ۚ ۝۱۴۱ فَالۡتَقَمَهُ الۡحُوۡتُ وَهُوَ مُلِيۡمٌ ۝۱۴۲ فَلَوۡلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ
الۡمُسَبِّحِيۡنَ ۙ ۝۱۴۳ لَلَبِثَ فِىۡ بَطۡنِهٖۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ‌ ۚ ۝۱۴۴ (الصف: ۱۳۹ تا ۱۴۴)

واضح ہے کہ حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا ایک غیبی امر ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کی غالب مشیت ہر چیز پر حاکم ہے۔

دوسری بات یہ کہ جو لوگ بلند مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں ان سے کوئی معمولی سا غیر مناسب کام بھی، اگرچہ فعلِ حرام بھی نہ ہو، انہیں بڑی سخت آزمائشوں میں مبتلا کرنے کا موجب بن جاتا ہے، جیسا کہ حضرت یونسؑ کی یہ سب مصیبتیں اُن کی بے صبری کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔

لہٰذا اس بات پر دلیل کی انبیاء سے ترکِ اولیٰ پر بھی سختی سے حساب لیا جاتا ہے، یہ ہے کہ حضرت یونسؑ کے عمل کو اللہ تعالیٰ نے ابق سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی آقا سے غلام کے فرار کے ہیں، ''اذابق الی الفلك المشحون'' اور جب غلام بھاگ جاتا ہے تو اس کا آقا اس سے جواب طلبی ضرور کرتا ہے۔

(۳) حضرت یونس ۔۔۔۔۔ بے آب وگیاہ سرزمین پر

حضرت یونسؑ کی تسبیح اُن کی نجات کا سبب بنی جس میں رحمتِ الٰہی ہر طرح شاملِ حال ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قید کرنے والے (مچھلی) کو حکم دیا کہ انہیں خشکی کی طرف لے جائے، تاہم انہیں خوراک اور لباس کی بھی ضرورت تھی۔ قرآن میں صرف اتنا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یقطین (کدو) کی بیل کو اُن پر سایہ بنا دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کدو ہی سے اُن کی غذائی ضرورت بھی پوری ہوتی ہو۔ یہی وہ موقع تھا جہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی بارگاہ میں خصوصی قبولیت بخشی [۱]۔

اور انہیں صالحین سے قرار دیا، جیسا کہ فرماتا ہے:

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُــجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ (الانبیاء: ۸۸)

نیز فرمایا:

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ (الصفت: ۱۴۵۔۱۴۶)

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ صافات میں فرمایا ہے: ''اگر وہ مچھلی کے پیٹ میں تسبیح نہ کرتا تو روزِ قیامت تک اسی میں رہتا'' (صافات: ۱۴۳) جب کہ سورہ قلم میں آتا ہے: ''اگر اللہ تعالیٰ اس کے ترکِ اولیٰ کو اپنی نعمت سے معاف نہ فرماتا تو اُسے بے آب وگیاہ زمین پر اس حال میں پھینکا جاتا کہ وہ مورِدِ مذمت قرار پاچکا ہوتا'' (قلم: ۴۹)

لَوْلَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ (القلم: ۴۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ دو آیتیں دو مختلف موضوعات کو بیان کر رہی ہیں:

۱۔ پہلی آیت میں حضرت یونسؑ کی تسبیح کا ذکر ہے، ان مشکلات میں مبتلا ہونے سے پہلے ہو یا ان کے بعد، یعنی اُن کا تسبیح کرنے والوں سے ہونا ہی شکم ماہی سے اُن کی نجات کا سبب بنا۔

۲۔ اپنی تسبیح کی وجہ سے شکم ماہی سے باہر آگئے۔ یہاں بھی اگر رحمتِ الٰہی اُن کے شاملِ حال نہ ہوتی تو ترکِ اولیٰ کا اثر باقی رہتا۔ ایسی صورت میں انہیں ایک مذموم شخص کے طور پر باہر پھینکا جاتا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اُن کے شامل رہی اس لیے ایک غیر مذموم انسان کی شکل میں باہر آئے۔ لہٰذا دو مرتبہ رسالت سے مشرف ہوئے۔ اس طرح دوبار نعمتِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہوئی، اسی لیے فرمایا:

---

[۱] یہاں آیت ''فاجتبه ربه فجعله من الصلحين'' (قلم: ۵۰) مراد ہے جس کی تشریح بعد میں آئے گی۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝۵۰ (القلم:۵۰)

عصمت کے مخالفین کی بحث

جولوگ عصمتِ انبیاء کے بارے میں آیات کا دقیق مطالعہ نہیں کرتے وہ داستانِ یونسؑ میں استعمال ہونے والے الفاظ کو ان کے معصوم نہ ہونے کی دلیل بتاتے ہیں حتیٰ کہ جولوگ اُن کا جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کلمات اُن کے مبعوث بہ نبوت ہونے سے پہلے ان کے بارے میں آئے ہیں، حالانکہ قرآن انہیں ان کے پورے زمانہ رسالت سے متعلق قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے: "وان یونس لمن المرسلین"

عصمت انبیاء کے مخالفین نے درج ذیل کلمات کا سہارا لیا ہے:

۱۔ ذھب مغاضباً

۲۔ فظن ان لن نقدر علیه

۳۔ انی کنت من الظٰلمین

۴۔ و ھو ملیم

پہلے جملے یعنی "ذھب مغاضبًا" کی توضیح میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اس میں دو احتمال وجود رکھتے ہیں:

۱۔ اس سے حضرت یونسؑ کا اپنی قوم پر غصہ کرنا مراد ہے کیونکہ جس شخص نے سالہا سال قوم کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے انہیں سعادت کے راستے کی دعوت دی ہو اور صرف ان میں دو شخص ایمان لائیں تو ایسی صورت حال میں انسان کا ان پر غضب ناک ہونا فطری امر ہے، جب کہ عصمت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ معصوم میں انسانی وفطری خصوصیات بھی نہ رہیں۔ امام رضا علیہ السلام سے ایک روایت میں اس جملے کے بارے میں یہی احتمال نقل ہوا ہے۔ جب مامون نے حضرتؑ سے اس آیت کے معنی پوچھے تو حضرتؑ نے فرمایا: "ذلك یونس ابن متی ذھب مغاضبًا لقومه"[1] شاید کوئی یہ سمجھے کہ حضرت یونسؑ کے بارے میں یہ جملہ اس وقت کہا گیا جب وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر دریا کی طرف جا رہے تھے کیونکہ اس کے بعد فرمایا: "فظن ان لن نقدر علیه" اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں جملے اکٹھے تھے اور چونکہ دوسری بات اس وقت کی ہے جب وہ علاقہ چھوڑ رہے تھے، لہٰذا پہلا جملہ بھی اسی وقت سے متعلق ہوگا۔ پس مطلب یہ نکلے گا کہ حضرت یونسؑ کا غصہ اپنی قوم پر نہ تھا بلکہ ان سے عذاب کے اٹھنے پر تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی دلیل ایسی نہیں پائی جاتی جو دلالت کرے کہ یہ دوسرا جملہ "فظن ان لن نقدر علیه" دوسری حالت سے متعلق ہو بلکہ ہوسکتا ہے کہ دونوں جملے پہلی ہی حالت سے تعلق رکھتے ہوں (یعنی انہوں نے مدتوں ہمدردی کے ساتھ قوم کو راہِ سعادت کی

---

[1] بحار الانوار۔ ج ۱۴، ص ۳۸۷

طرف ہدایت کی لیکن قوم نہ مانی تو غضب ناک ہونا فطری تھا)

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ حضرت یونسؑ کی وہ علاقہ چھوڑتے وقت حالت کو بیان کر رہا ہو یعنی ان کا چھوڑنا اس شخص کی مانند تھا جو غصے میں ہو، یعنی وہ خود غصے میں نہ تھے بلکہ وہ تو انتہائی سکون کے ساتھ جا رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؛ البتہ اس احتمال کی نسبت پہلا احتمال زیادہ واضح ہے۔

دوسرا جملہ "فظن ان لن نقدر علیه" عدمِ عصمت پر دلیل نہیں کیونکہ "نقدر" قدر سے مشتق ہے جس کے معنی سختی کرنا یا تنگ کرنا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰـهُ اللّٰهُ ط (طلاق:۷) جس کا رزق تنگ ہو جائے تو جو کچھ اللہ نے اُسے دیا ہے اس میں سے خرچ کرے (انفاق کرے)۔ نیز یہ کہ حضرت یونسؑ وہ علاقہ چھوڑتے وقت یہ گمان کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے صبری پر ان سے جواب طلب نہیں کرے گا پھر بھی یہ دونوں جملے اگر ان کی گناہ سے عصمت پر دلیل نہ ہوں تب بھی کم از کم گناہ کی دلیل یقیناً نہیں ہیں۔

تیسرے جملہ "انی کنت من الظٰمین" کے بارے میں ہم عرض کرتے ہیں کہ عربی لغت میں ظلم کے معنی کسی چیز کو اس کی نا مناسب جگہ پر رکھنا ہے، یعنی انسان ایسا کام کرے جو بہتر تھا کہ انجام نہ دیا جاتا۔ جان و مال ونفس پر تجاوز کی صورت میں جو کلمۂ ظلم استعمال کیا جاتا ہے وہ اسی لحاظ سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت یونسؑ کا یہ عمل اُن کے شایانِ شان نہ تھا۔ مقامِ نبوت کی رحمت و رافت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی قوم میں رہتے اور حتیٰ الوسع انہیں عذاب سے بچانے کی کوشش کرتے جیسا کہ اس قوم کے عالم نے یہی کام کیا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک پیرو یا مقتدی اپنے مرشد و مقتدیٰ سے کمال میں آگے بڑھ گیا ہو کیونکہ اس عالم نے قوم کی ہدایت و تبلیغ کے سلسلہ میں اتنی مشکلات و تکالیف برداشت نہیں کی تھیں اور حضرت یونسؑ کی مانند اس نے قوم کے ساتھ مدتوں بحث و جدال نہیں کی تھی۔ لہٰذا اگر وہ بھی ان حالات سے گزرا ہوتا جو حضرت یونسؑ کو پیش آئے تھے تو یقیناً وہ بھی وہی کچھ کرتا جو حضرت یونسؑ نے کیا۔

اس سے جملہ "و ھو ملیم" کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ ملامت کا مستحق ہونا عذاب کا مستحق ہونا نہیں۔ حضرت یونسؑ صرف ملامت کے مستحق ہوئے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی، اس بارے میں تین امور ذکر ہوئے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک ان کے استحقاقِ ملامت کی وجہ ہو سکتا ہے:

۱۔ انہوں نے جلدی (وقت سے پہلے) ہی وہ علاقہ چھوڑ دیا، جب کہ انہیں تا حدِ امکان وہیں رکنا چاہیے تھا۔

۲۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے قوم کے لیے عذاب کی درخواست کر دی۔

۳۔ دور سے قوم کی حالت دیکھتے رہے۔ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ عذاب ان سے ٹل گیا ہے۔ تو چونکہ انہیں قوم کی توبہ و ایمان کی خبر نہیں تھی، لہٰذا غصہ کی حالت میں وہاں سے چلے گئے۔

ان تینوں میں سے کوئی کام بھی گناہ نہیں، بلکہ صرف ترکِ اولیٰ ہو سکتا ہے جو منافیٔ عصمت نہیں ہے۔

اس داستان کے سبق آموز نکات

اس داستان سے درج ذیل نکات کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ مرسلوں کو جہاں تک ہو سکے اور امیِ اصلاح ہو، اصلاح کی کوشش کرنا چاہیے اور چاہیے کہ عذاب کی درخواست نہ کریں۔ لہٰذا قرآن میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلامؐ کو فرمایا کہ حکمِ خدا کے مقابل صبر کریں اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں کہ جب اس نے ہمیں پکارا، اس حال میں کہ وہ غم وغصہ میں تھا:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ ۘ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿۴۸﴾

(قلم: ۴۸)

۲۔ حضرت یونسؑ کی داستان سابقہ اقوام میں بداء کے واقع ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کا ارادہ بدل جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ پیغمبرِ خدا الہام یا وحی کے ذریعے کسی چیز کے واقع ہونے کی خبر دے اور اس کے آثار بھی ظاہر ہونا شروع ہو جائیں، لیکن پھر کچھ وجوہ کی بنا پر وہ واقعہ وقوع پذیر نہ ہو، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیغمبر نے جھوٹی خبر دی تھی، بلکہ اس کی خبر بالکل صحیح تھی، البتہ کچھ شرائط پر موقوف تھی جن کا پورا نہ ہونا موجب ہوا کہ وہ خبر متحقق نہ ہو سکی، جیسا کہ حضرت یونسؑ کے واقعہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ ان کا قوم کو عذاب کی خبر دینا اس شرط پر موقوف تھا کہ قوم حالتِ کفر پر باقی رہے۔ لہٰذا قوم کے ایمان لانے سے عذاب کا موضوع ہی ختم ہو گیا اور عذاب نہ ہوا۔

۳۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ بداء اللہ تعالیٰ کی قدیمی سنت ہے۔ اگر بداء کے مخالفین خود بداء کو صحیح طور پر درک کر لیں تو کبھی اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔

۴۔ یہ داستان اللہ تعالیٰ کی انتہائی وسیع رحمت کو بیان کر رہی ہے، یعنی جہاں تک ہو سکے اللہ تعالیٰ انسان کو رحمت سے محروم نہیں کرتا مگر یہ کہ رحمت حکمت کے تقاضوں کے برخلاف ہو، بقولِ شاعر

لطف حق با تو مدارا ہا کند
چون کہ از حد بگذرد رسوا کند

اٹھارہویں پیغمبر

حضرت ذکریا علیہ السلام

حضرت زکریاؑ اُن انبیائے الٰہی سے ہیں جن کا نام قرآن مجید میں اس طرح سات مرتبہ آیا ہے کہ سورۂ آل عمران ۳۷، ۳۸ (دوبار) سورہ انعام ۸۵، سورہ مریم ۲، ۷، سورہ انبیاء ۸۹

حضرت زکریاؑ کے واقعات صرف سورۂ آل عمران و سورۂ تحریم میں آئے ہیں۔ ہم پہلے ان سے متعلق جملہ آیات، ان کے ترجمہ اور اس کے بعد اُن کے حالات بیان کریں گے۔

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا ۚ قَالَ يٰمَرۡيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

۲۔ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىۡ فِى الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّقَدۡ بَلَغَنِىَ الۡكِبَرُ وَامۡرَاَتِىۡ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾

۵۔ قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّىۡۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَاذۡكُرْ رَّبَّكَ كَثِيۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِىِّ وَالۡاِبۡكَارِ ﴿۴۱﴾ (ال عمران: ۳۷ تا ۴۱)

۶۔ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ (الانعام: ۸۵)

۷۔ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾

۸۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾

۹۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ
بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾

۱۰۔ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ
وَلِيًّا ﴿۵﴾

۱۱۔ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾

۱۲۔ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾

۱۳۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ
عِتِيًّا ﴿۸﴾

۱۴۔ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ
شَيْـًٔا ﴿۹﴾

۱۵۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ
سَوِيًّا ﴿۱۰﴾

۱۶۔ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾
(مریم: ۲ تا ۱۱)

۱۷۔ وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ ۚۖ

۱۸۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا
يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

(الانبیاء: ۸۹۔۹۰)

آیات کا ترجمہ

۱۔(عمران کے گھر بیٹی پیدا ہوئی۔اس نے لڑکی کا نام مریمؑ رکھا، اسے اور اس کی ذریت کو اس نے اللہ کی پناہ میں دے دیا تاکہ شیطان اُن پر مسلط نہ ہو جائے۔ان حالات میں) اللہ تعالیٰ نے مریم کی ماں کی دعا قبول فرمالی (یعنی مریمؑ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمالیا) اس کی اچھے طریقے سے پرورش کی اور اس کی کفالت زکریا نے کی۔جب بھی زکریاؑ اس کی (مریمؑ کی) عبادت گاہ میں آتے تو اس کے پاس رزق دیکھتے۔(علامہ طبرسیؒ کی روایت کے مطابق سردی کے پھل گرمی کے موسم میں اور گرمی کے پھل سردیوں میں اس کے پاس پاتے [1]۔چنانچہ زکریاؑ اس سے) پوچھتے کہ اے مریمؑ یہ رزق کہاں سے آتا ہے؟ مریمؑ جواب دیتیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔

۲۔ان حالات میں زکریاؑ نے (جب اللہ کا یہ کرم مریمؑ پر دیکھا تو) اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ خدایا! مجھے بھی اپنے الطاف و رحمت سے پاکیزہ بیٹا عطا فرما۔تو اپنے بندوں کی دعائیں سننے والا ہے۔

۳۔فرشتوں نے زکریاؑ کو جواب دیا، اس حال میں کہ وہ محرابِ عبادت میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰؑ نام کے بیٹے کی بشارت دیتا ہے جو کلمۂ خدا (حضرت مسیحؑ) کی تصدیق کرنے والا ہو گا، وہ سید و سردار و عفیف و پاکدامن اور صالح لوگوں میں سے نبی ہوگا۔

۴۔اس (زکریا) نے عرض کیا کہ کیسے میرے ہاں لڑکا پیدا ہو جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔خطاب ہوا کہ اگر اللہ کرنا چاہے تو ایسا ہی کرتا ہے۔

۵۔اس (زکریاؑ) نے عرض کیا کہ خدایا! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما دے۔اللہ نے فرمایا کہ

---

[1] مجمع البیان، ج۲،ص ۴۳۶

تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے رمز و اشارہ کے علاوہ بات نہیں کر سکے گا۔ اپنے پروردگار کا ذکر زیادہ کر اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کر۔

۶۔ اور زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ سب کے سب صالحین سے تھے۔

۷۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ خبر ہے تیرے رب کی اپنے بندے زکریاؑ پر، رحمت کی (اس کی درخواست کی قبولیت کے سلسلہ میں)۔

۸۔ جب اس نے اپنے پروردگار کو آہستہ آہستہ پکارا (تا کہ اس میں ریا کے شائبہ سے دوری رہے)

۹۔ (زکریاؑ نے) عرض کیا کہ خدایا میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں، سر سفید ہو گیا ہے اور ماضی میں تو نے مجھے استجابتِ دعا سے محروم نہیں فرمایا۔

۱۰۔ میں اپنے بعد اپنے چچا کے بیٹوں سے ڈرتا ہوں (یعنی وہ اچھے لوگ نہیں ہیں، میرے ترکہ سے سوا استفادہ کریں گے)، میری بیوی بانجھ ہے، تو اپنی بارگاہ سے مجھے بیٹا عطا فرما (جو میرا وارث ہو)

۱۱۔ تا کہ وہ میرا وارث اور آلِ یعقوبؑ کا وارث ٹھہرے۔ نیز اسے اپنا پسندیدہ قرار دے۔

۱۲۔ (خطاب آیا) اے زکریاؑ! ہم تجھے ایک بیٹے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰؑ ہوگا اور اس سے پہلے یہ نام نہیں رکھا گیا۔

۱۳۔ زکریاؑ نے عرض کیا کہ میرے ہاں بیٹا کیسے ممکن ہے جب کہ میری بیوی بانجھ ہے، میں خود انتہائی بوڑھا ہو چکا ہوں اور میرا بدن بھی خشک ہو چکا ہے۔

۱۴۔ خطاب آیا کہ ایسا ہی ہے (ہم تیری ضعیفی اور تیری بیوی کے بانجھ پن کے باوجود تجھے ایک بیٹا عطا فرمائیں گے، ایسا نہ ہوگا کہ تیری جوانی پلٹ آئے)۔ تیرے پروردگار نے فرمایا ہے کہ یہ کام مجھ پر آسان ہے۔

میں نے تجھے اس سے پہلے خلق فرمایا جب کہ تو کچھ بھی نہ تھا (بانجھ پن اور قوائے جسمانی کی تجدید

تیری خلقت کی نسبت زیادہ آسان ہے)

۱۵۔ زکریا نے عرض کیا کہ اس بچے کی پیدائش کے وقت کوئی علامت میرے لیے مقرر کر دے۔ خطاب ہوا کہ تیری نشانی یہ ہے کہ تو صحت وسلامتی کے باوجود تین راتیں لوگوں سے بات نہ کر سکے گا۔

۱۶۔ زکریاؑ اس کے بعد محراب سے اپنی قوم کی طرف نکلے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح اور عصر کے وقت اللہ کی تسبیح کیا کرو۔

۱۷۔ اور یاد کرو جب زکریاؑ نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا کہ خدایا مجھے تنہا نہ چھوڑنا کہ تو بہترین ہے وارثین میں سے۔

۱۸۔ ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، اسے یحییٰؑ بخش دیا اور اس کی بیوی میں ولادت کی صلاحیت پیدا کر دی۔ یہ وہ لوگ تھے جو نیکی کرنے میں جلدی کرتے تھے، ہمیں اجر کے شوق وعذاب کے خوف کے باعث پکارتے تھے اور وہ ہمارے حضور خضوع وخشوع کرنے والے تھے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت زکریاؑ کے زمانہ میں دو پاکدامن بہنیں تھیں۔ ان میں ایک حضرت زکریاؑ کی بیوی بنی اور دوسری حنہ نامی عمران بن ہشم کی بیوی بنی جو سلیمانؑ بن داوٗدؑ کی نسل سے تھے۔ (معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عمران وہ عمران نہیں ہے جو حضرت موسیٰؑ نبی کے باپ تھے، کیونکہ ان دونوں میں اٹھارہ سو سال کا فاصلہ ہوا ہے)۔

عمران کی زوجہ نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ اسے بیٹا دے گا تو وہ اسے عبادت گاہ کا خادم بنا دے گی۔ لیکن بعض مصلحتوں کے بناء پر اللہ نے اُسے بیٹی دی جس کا نام اس نے مریمؑ رکھا، جو حضرت عیسیٰؑ کی ماں بنیں۔ جب مریم پیدا ہوئیں تو عمران زندہ نہیں تھے۔ لہٰذا بنی اسرائیل اس کی کفالت کے اخراجات کے سلسلہ میں اختلاف کا شکار ہو گئے۔ بالآخر بات قرعہ اندازی پر آ کر ٹھہری اور مریم کی کفالت کا قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام نکلا۔ یہ بچی اپنی خالہ کے گھر رہنے لگی۔ چونکہ پہلے دن سے ہی خدا کی رحمت اس پاک دامن بچی کے شاملِ حال تھی لہٰذا اس کی اچھی تربیت ہونے لگی، یہاں تک کہ مریم حدِ بلوغ کو پہنچ گئیں اور اپنی عبادت گاہ میں اللہ کی عبادت کرنے لگیں۔

جب بھی حضرت زکریاؑ مریمؑ کی عبادت گاہ میں آتے تو وہاں پر رزق موجود پاتے۔ پیغمبر خدا بار بار یہ منظر دیکھ کر حیران ہوئے اور مریمؑ سے پوچھا کہ یہ کھانا کہاں سے آتا ہے؟ مریمؑ نے کہا کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے بے حساب روزی عطا فرماتا ہے۔

حضرت زکریاؑ نے جب یہ دیکھا کہ جوان لڑکی روحانی کمال کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ اسے رزق غیب سے بغیر طبعی اسباب کے ملتا ہے تو سوچا کہ مجھے بھی اللہ سے اولاد کی درخواست کرنا چاہیے اگر چہ اس کے لیے طبعی اسباب موجود نہیں کیونکہ زکریاؑ مکمل طور پر بوڑھے ہو چکے تھے، ان کے جسم کا پانی خشک ہو چکا تھا اور ان کی زوجہ بانجھ تھی۔ لیکن چونکہ رحمت خدا سے انہیں امید تھی اور مریمؑ کے بارے میں دیکھ چکے تھے کہ رزق کے لیے کسی کا دروازہ کھٹکائے بغیر انہیں غیب سے رزق مل رہا ہے، لہٰذا اپنے آپ سے کہنے لگے کہ مجھے بھی اللہ سے درخواست کرنا چاہیے کہ وہ مجھے غیب سے بیٹا عطا فرمادے اگر چہ اس کے طبعی اسباب موجود نہیں ہیں۔ درج ذیل دو آیتیں اس مطلب کو ظاہر کرتی ہیں:

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَمِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿۳۸﴾ (ال عمران: ۳۷، ۳۸) [1]

اسی طرح سورۂ مریم میں حضرت زکریاؑ کی درخواست اس طرح ذکر ہوئی ہے:

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَاۗءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَاۗىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ (مریم: ۳، ۴)

اس آیت میں ہے کہ اس نے آہستہ سے دعا مانگی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مخالفین نہ سن لیں یا اس لیے دعا آہستہ مانگی کہ آہستہ مانگی جانے والی دعا جلد قبول ہوتی ہے، یا کوئی اور وجہ ہو جو ہمیں معلوم نہیں۔ دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ (الانبیاء: ۸۹)

دوسری طرف اس دعا کی ایک اور وجہ بھی تھی، وہ یہ کہ حضرت زکریاؑ کے وارث ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ حضرت زکریاؑ کی نظر میں ان کی عادات پسندیدہ نہیں تھیں۔ لہٰذا انہیں ڈر تھا کہ اگر اُن کے وارث یہ لوگ بن گئے تو اُن کے مال سے سوا استفادہ کریں گے۔ لہٰذا انہیں ہوئی کہ اللہ سے دعا کریں کہ انہیں وارث عطا کرے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَاۗءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ

[1] حضرت مریمؑ کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی کے سلسلہ میں سورۂ آل عمران آیت ۴۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (مریم:۵،۶)

پھر حضرت زکریاؑ نے اپنے لیے ایسے بیٹے کی درخواست کی جو اللہ کا پسندیدہ ہو اور عرض کیا ''واجعلہ رب رضیاً'' (☆) یہ درخواست اس لیے تھی کہ اس کا ان چچیروں کے ساتھ امتیاز باقی رہے کیونکہ اگر ان کا بیٹا نہ ہوتا تو وہ لوگ وارث ہو جاتے۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ انبیاء کی اولاد ان کے ترکہ کی وارث ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت زکریاؑ کے وارث اچھے لوگ نہیں تھے اس لیے انہوں نے اللہ سے اچھے وارث کی دعا کی۔

بعض مفسرین کبھی کبھی اس وراثت کو علم و نبوت کی وراثت شمار کرتے ہیں، حالانکہ خود آیت اس کیفیت کے خلاف ہے۔ اگر اس سے علم و نبوت کی وراثت مراد ہوتی تو پھر حضرت زکریاؑ کو خوف کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اگر موالی (چچازاد بھائیوں) میں ایسی وراثت کی لیاقت موجود ہوتی تو پھر ان کے وارث بننے سے حضرت زکریاؑ کو ڈرنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر وہ اس وراثت کے اہل نہیں تھے تو پھر وہ علم و نبوت میں حضرت زکریاؑ! کے وارث بن ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس منصب کا عطا کرنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ کسی نااہل کو یہ منصب عطا نہیں فرماتا۔

دوسرے یہ کہ علم و نبوت کا منصب تو وراثت میں آتا ہی نہیں۔ عربی زبان میں میراث یا اس سے مشتق دوسری لفظیں مال میں وراثت کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ اس لفظ کا استعمال مجازی ہوگا جو مناسب قرینہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین فطری قوانین ہیں۔ جب اس نے وراثت کا قانون بنایا ہے تو سب لوگ اس میں شریک ہوں گے، اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ سب لوگوں کی اولاد تو اپنے والدین کے ترکہ سے وراثت حاصل کرے لیکن انبیاء کی اولاد اپنے والدین کے ترکہ سے محروم رہے۔

حضرت زکریاؑ کی دعا کی قبولیت

حضرت زکریاؑ نے اللہ تعالیٰ سے لائق بیٹے کی درخواست کی جو ان کا اور آلِ یعقوب کا وارث ٹھہرے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس یعقوب سے مراد یعقوبؑ نبی نہیں بلکہ یہ حضرت مریمؑ کے باپ عمران کے بھائی تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے حضرت زکریاؑ کو اطلاع دی کہ تمہاری دعا قبول ہو چکی ہے:

اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جب زکریاؑ محرابِ عبادت میں مشغول نماز ہوں تو انہیں یحییٰؑ نام کے بیٹے کی بشارت دیں جو درج ذیل پانچ صفات رکھتا ہوگا:

۱۔ اس کا نام یحییٰؑ ہے اور اس کا کوئی ہم نام نہیں۔

۲۔ وہ کلمۃ اللہ (حضرت مسیحؑ) کی تصدیق کرنے والا ہوگا جیسا کہ حضرت یحییٰ کے حالاتِ زندگی میں آئے گا کہ وہ مسیحؑ کی تصدیق کرنے والے تھے۔

۳۔ وہ سردار و رہبر ہوگا۔

۴۔ نفسانی خواہشات سے اپنے آپ کو روکنے والا، پرہیز گار ہوگا۔

۵۔ صالحین میں سے نبی ہوگا۔

ان اوصاف کو درج ذیل آیات نے بیان فرمایا ہے:

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۳۹ (ال عمران: ۳۹)

دوسری جگہ فرمایا:

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝۷ (مریم:۷)

تیسری جگہ فرمایا:

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝۹۰ (الانبیاء:۹۰)

اگرچہ حضرت زکریاؑ کو اللہ کی عظیم قدرت پر یقینِ کامل تھا اور حضرت مریمؑ کے بارے میں اس کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے، پھر بھی اس بشارت کے بارے میں زیادہ یقین حاصل کرنے کی خاطر عرض کیا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے، پھر اولاد کیسے ہوگی؟ اسی طرح کی صورتِ حال حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بھی سامنے آتی ہے کہ وہ قیامت کے دن مردوں کے زندہ ہونے کے مکمل یقین کے باوجود عملی طور پر مردوں کے زندہ کرنے کا مشاہدہ کرنے کی درخواست کرتے ہیں، جب اللہ نے فرمایا: کیا تمہیں ایمان حاصل نہیں؟ جواب میں عرض کیا ایمان تو حاصل ہے لیکن مزید اطمینان چاہتا ہوں۔ [۱]

یہاں ایک اور وجہ بھی حضرت زکریاؑ کے سوال کے لیے ہوسکتی ہے، وہ یہ کہ جو انسان عمر کے آخری دور میں داخل ہو چکا ہوا چانک اسے خبر دی جائے کہ تمہیں اس بڑھاپے میں بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود خدا بیٹا دینے والا ہے، تو اس کا حیران ہونا فطری سی بات ہوگی۔ لہٰذا وہ بے اختیار اللہ کے سامنے اپنی یہ حالت ذکر کر دے گا۔ اس مورد میں کچھ اور وجوہ کا تذکرہ بھی ہوا ہے اور شاید یہی دو وجہیں زیادہ بہتر نظر آتی ہیں۔ [۲] حضرت زکریاؑ نے عرض کیا:

---

[۱] بقرہ ۲۶۰

[۲] مجمع البیان، ص ۴۳۸ کی طرف رجوع کیا جائے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۝۴۰ (ال عمران:۴۰)

دوسری آیت ہے:

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۝۸ (مریم:۸)

اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی وسیع قدرت کی طرف متوجہ کیا، وہ یہ کہ اللہ کے سامنے مشکل و آسان کے کوئی معنی نہیں۔ یہ بشر کی خصوصیت ہے کہ بعض چیزوں کو آسان اور بعض کو مشکل سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر بات آسان ہے کیونکہ اللہ نے تجھے اس وقت وجود بخشا جب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہی خالق قادر ہے کہ تجھے بڑھاپے میں صاحبِ اولاد کر دے۔ ارشاد ہوتا ہے:

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۝۴۰ (ال عمران:۴۰)

دوسری آیت میں آتا ہے:

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا۝۹ (مریم:۹)

اس آیت میں جملہ "هو علي هين" سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کو ان دو مطالب یعنی ایک طرف اولاد کی صلاحیت کے نہ ہونے اور دوسری طرف قدرتِ مطلقہِ خلاقِ عالم کے موجود ہونے نے کشمکش میں ڈال دیا کہ اولاد کیسے ہوگی۔

لہٰذا اس مشکل کو دور کرنے کی خاطر حضرت زکریاؑ نے سوال کر دیا۔ یقیناً حضرت زکریاؑ کی دعا کا قبول ہونا بغیر سبب کے نہیں تھا اور اللہ نے جو کرم اُن پر کیا تو وہ بھی کسی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زکریاؑ اور ان کی زوجہ کی پاک نیتیں، ان کا ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہنا اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا، موجب ہوا کہ اللہ تعالیٰ اُن کی دعا قبول کرے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ۝۹۰ (الانبیاء:۹۰)

بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت پر حضرت زکریاؑ کے دل کو تسلی ہو گئی لیکن چونکہ اس بشارت کے وہ بڑے مشتاق تھے لہٰذا درخواست کی کہ اس کا وقت انہیں بتا دیا جائے اور علامت بھی مقرر کر دی جائے۔ خطاب ہوا کہ اس کی علامت و نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے کلام نہیں کر سکو گے اور لوگوں سے صرف اشاروں سے باتیں کرو گے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِیۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡكَارِ ﴿۴۱﴾ (ال عمران:۴۱)

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ﴿۱۰﴾

(مریم:۱۰)

اس آیت میں ایک شاہد موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کا ان تین دنوں میں بول نہ سکنا کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ شاید کلمہ ''سویا'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے صحیح وسالم ہونے کے باوجود کچھ مصلحتوں کی بنیاد پر تم بول نہ سکو گے۔

بعض نے کہا ہے کہ تین دن بول نہ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ تین دن روزہ رکھو گے اور اس زمانہ میں روزہ کے شرائط میں نہ بولنا بھی شامل تھا جیسا کہ حضرت مریمؑ سے جب پوچھا گیا کہ یہ بچہ کہاں سے لائی ہو تو انہوں نے جواب میں کہا کہ میں نے روزہ کی منت مانی تھی کہ کسی سے کلام نہیں کروں گی۔ [۱]

یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت زکریاؑ نے اللہ سے علامت مانگی تھی تا کہ بشارت کے متحقق ہونے کا وقت کا انہیں پتہ چل جائے، حالانکہ خاموشی کے ساتھ روزہ اس کی علامت نہیں بن سکتا کیونکہ یہ تو حضرت زکریاؑ کے اپنے اختیار کی بات تھی، جب چاہتے روزہ رکھ لیتے۔ نشانی ایسی ہونا چاہیے تھی جو حضرت زکریاؑ کے اختیار سے باہر ہوتی تا کہ اس علامت کے وقوع پذیر ہونے سے انہیں پتہ چل جاتا کہ وہ وعدہ کا وقت آن پہنچا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ اللہ کی طرف سے اُن کی زبان بند ہو جاتی۔

ایک سوال یہاں یہ سامنے آتا ہے کہ کیا حضرت زکریاؑ صرف لوگوں سے باتیں کرنے سے محروم ہوئے تھے یا بطورِ مطلق ان کی زبان بند ہو گئی تھی؟

جواب یہ ہے کہ آیت میں آیا ہے:

وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِیۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡكَارِ ﴿۴۱﴾ (آل عمران:۴۱)

جس کا مطلب یہ ہے کہ ذکر و تسبیح کے لیے اُن کی زبان کھلی تھی اور چونکہ یہ جملہ ''الا تکلم الناس'' کے بعد آیا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ تکلم سے محروم ہونے کے وقت بھی ذکر و تسبیح کرتے رہو گے۔ یہ کرامت و اعجاز ہی تو ہے کہ بعض مواقع میں انسان بولنے پر قادر نہ رہے اور بعض جہات سے تکلم کر سکے۔ اس کی مثال میں نے خود بعض علما میں دیکھی ہے تا کہ یہ بات تاریخی حیثیت اختیار کر جائے، اس کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[۱] سورۂ مریم ۲۱

شہید ڈاکٹر مفتح کے سسر حاج شیخ حیدر ہمدانی مرحوم سکتہ میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں ہمدان سے قم لایا گیا اور شہید مفتح کے گھر انہیں رکھا گیا۔ ہمارا بھی شہید مفتح کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ وہ بتلاتے ہیں کہ ہمارے سسر کی صورت حال بڑی عجیب ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے اُن کی زبان مکمل طور پر کھل جاتی ہے، لیکن نماز ختم ہوتے ہی زبان بند ہو جاتی ہے، صرف اشاروں سے مطلب سمجھا پاتے ہیں۔

حضرت زکریاؑ نے جب اللہ تعالیٰ کی تعیین کردہ علامت کو محسوس کر لیا تو چونکہ صورتحال کی اطلاع پہلے سے وہ لوگوں کو دے چکے تھے لہٰذا وہ اپنی عبادت گاہ سے اس حال میں نکلے کہ لوگوں کو اشاروں سے کہہ رہے تھے کہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کیا کریں۔ شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ اس نعمت کے شکرانے میں لوگوں کو بھی اللہ کی حمد و تسبیح کرنا چاہیے کیونکہ ان کی سرنوشت میں بھی یہ مولود دخیل تھا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت زکریاؑ کا ان سے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اپنی عبادات ان دونوں وقتوں میں خود انجام دیا کریں اور حضرت زکریاؑ کا انتظار نہ کریں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نمازیں حضرت زکریاؑ کے ساتھ پڑھتے ہوں۔ حضرت زکریاؑ خود تو ذکرِ خدا کرتے تھے، مصلحت اس میں تھی کہ لوگوں سے دور رہیں۔ اس لیے ارشاد ہوتا ہے:

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ○ (مریم: ۱۱)

اسی لیے وحی کے ایک معنی اشارہ کے بھی ہیں۔ بالآخر اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور حضرت یحییٰ کی ولادت ہوگئی۔ آئندہ صفحات میں حضرت یحییٰؑ کے حالاتِ زندگی جداگانہ ذکر کیے جائیں گے۔

حضرت زکریاؑ کی داستان کے سبق آموز نکات

۱۔ انسان کو تمام حالات میں رحمتِ الٰہی کی اُمید رکھنا چاہیے، حتیٰ کہ ایسے حالات میں بھی جب طبعی اسباب و عوامل ناکام اور امیدیں ختم ہو چکی ہوں۔ اس کے باوجود قادر و مطلق پروردگار مشکلوں کو حل کرتا ہے۔ پس اللہ اپنی رحمت بیکراں سے کسی کو محروم نہیں کرتا۔

۲۔ ائمہ کی روایات میں آیا ہے کہ بیٹا انسان کے لیے اچھا مددگار اور وارث ہوتا ہے۔[1] لیکن ہر بیٹا نہیں بلکہ صرف پاک اولاد، جیسا کہ حضرت زکریاؑ نے اپنی دعا میں بیٹا مانگتے ہوئے ذریت طیبہ کی درخواست کی تھی، یا مرضی و پسندیدۂ خدا کی التجا کی، "واجعله رب رضیاً"، اسی طرح قرآن مجید نے بھی ایسے بیٹے کی خواہش کو جو ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہو، اللہ تعالیٰ کے بندوں کی واضح صفات میں سے قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا

---

[1] امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں: "نعم العضد الولد"

لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝۷۴ (فرقان: ۷۴)

یعنی ''وہ جو کہتے ہیں کہ پروردگار! ہماری ازواج وذریات کی طرف سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے (یعنی ایسی اولاد وازواج عطا فرما جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں)

۳۔ انبیاء کی اولاد بھی دوسری اولادوں کی طرح والدین کے ترکہ کی وارث ہوتی ہے۔کوئی وجہ نہیں کہ انبیاء کی اولاد کو اس طبیعی حق سے محروم رکھا جائے۔

۴۔ انسان کو صرف اولاد کی فکر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے ترکہ کی بھی فکر کرنی چاہیے کہ کہیں غلط ہاتھوں میں پہنچ کر غلط مقامات میں صرف نہ ہونے لگے۔حضرت زکریاؑ کے اولاد طلب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر ان کا کوئی نزدیکی وارث نہ ہوا تو ان کا ترکہ غیر شائستہ ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

۵۔ خوف واُمید انسان کی تربیت کے دو اہم عامل ہیں۔صرف خوف موجب یاس وناامیدی ہوتا ہے اور تنہا اُمید موجبِ غرور وتکبر۔ قرآن مجید نے عذاب سے ڈرانے کے ساتھ ساتھ ثواب کی بشارت بھی دے رکھی ہے۔گھاٹے میں وہ شخص رہتا ہے جو صرف ایک کو دیکھتا ہے اور دوسری کیفیت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند رکھے۔

انیسویں پیغمبر

حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰؑ کے ہم عصر اور ان کی تصدیق کرنے والے پیغمبر تھے۔ قرآن میں ان کا نام پانچ مرتبہ درج ذیل آیات میں آیا ہے۔

آل عمران ۳۹، انعام: ۸۵، مریم: ۷، ۱۲، انبیائ: ۹۰، سورۂ آل عمران: ۳۹ میں اُن کی صفات ذکر کی گئی ہیں۔ اُن سے متعلق قرآن مجید کی آیات اس طرح ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا

(ال عمران: ۳۹)

۲۔ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ (الانعام: ۸۵)

۳۔ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾

(مریم: ۷)

۴۔ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾

۵۔ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾

۶۔ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾

۷۔ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

(مریم: ۱۲ تا ۱۵)

آیات کا ترجمہ

۱۔اللہ تعالیٰ تجھے (اے زکریاؑ) ایک بیٹے کی بشارت دیتا ہے جو کلمۂ الٰہی (عیسیٰؑ) کی تصدیق کرنے والا، رہبر اور نفسانی خواہشات کو ضبط کرنے والا ہوگا۔

۲۔زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ میں ہر ایک صالحین سے ہے۔

۳۔اے زکریاؑ! ہم تجھے ایک بیٹے کی، جس کا نام یحییٰؑ ہے، خوشخبری دیتے ہیں۔اس سے پہلے ہم نے اس کا ہم نام کسی کو قرار نہیں دیا۔

۴۔اے یحییٰ! کتاب خدا کو مضبوطی سے تھام لو۔ہم نے اُسے بچپن میں ہی نبوت و رہبری عطا فرمائی۔

۵۔اور اسے اپنے لطفِ خاص سے ہم نے لوگوں پر مہربان بنایا اور نفسانی پاکیزگی عطا فرمائی اور وہ متقی و پرہیز گار تھا۔

۶۔وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے والا تھا اور ہرگز سرکش و نافرمان نہیں تھا۔

۷۔اس پر درود ہو اس دن جب وہ پیدا ہوا جس دن وہ مرے گا اور جس دن اُسے اٹھایا جائے گا۔

الفاظ کی لغوی توضیح

۱۔ سید: یہ کلمہ باب "ساد یسود" بمعنی سرداری و رہبری آتا ہے اور چونکہ کسی جماعت کی رہبری کے لیے رہبر میں طہارتِ نفسانی اور تہذیب نفس ضروری ہے لہٰذا ایسی فضیلت والے ہر شخص کو سید کہا جاتا ہے۔[1]

۲۔ حصوراً: کلمہ باب حصر سے تنگی کے معنی میں ہے، جیسا کہ قرآن میں اسی معنی میں آتا ہے۔"احصروھم" (☆) یعنی اس پر دائرہ تنگ کر دو یہاں اس سے مراد خواہشات نفسانی کے مقابلہ میں ضبط کرنا ہے۔

۳۔حنان: جبان کے وزن پر باب حن سے ہے، یعنی شفقت و مہربانی، چونکہ شفقت رحمت سے الگ نہیں ہوتی۔لہٰذا کبھی کبھی یہ کلمہ رحمت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت "وحنا نا من لدنا" میں احتمال یہی ہے کہ اس سے رحمت کے معنی مراد ہوں، یعنی ہم نے اسے اپنی طرف سے رحمت کی صفت عطا فرمائی ہے۔

---

[1] یہ لفظ سید کے لغوی معنی ہیں لیکن اس لفظ کے اصطلاحی معنی میں سید کا لقب صرف اولاد علیؑ و فاطمہؑ کے لیے مخصوص ہے۔

۴۔ جبار: اصل میں جبر سے ہے جس کے معنی کسی شی کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ لیکن بعد میں لغوی تغیر و تبدل کرنے کی وجہ سے یہ کلمہ اس شخص کے لیے استعمال کیا جانے لگا جو تسلط حاصل کرکے اپنی کمزوریاں چھپائے نیز کبھی یہ کلمہ ظالم و سرکش کے معنی

۵۔ عصی: رضی کے وزن پر صفت مشبہ، اسم فاعل کے معنی میں ہے، یعنی نافرمانی۔

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت یحییٰؑ سے متعلق سب آیات ایک ہی محور کے گرد گھومتی ہیں اور وہ ہے ان کی پسندیدہ صفات کا ذکر جن میں حضرت یحییٰ کا محض نیکی و اچھائی کے مجسمے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ صفات یہ ہیں:

الف۔　آپ کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے تھے۔ "مصدقاً بکلمة من الله" اس کلمۃ اللہ سے مراد حضرت مسیحؑ ہیں کیونکہ قرآن مجید کے بارے میں فرماتا ہے:

الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ○(نساء: ۱۷۱)

چونکہ حضرت یحییٰؑ لوگوں میں متقی و پارسا جانے جاتے تھے لہٰذا حضرت مسیحؑ کے بارے میں ان کی تصدیق لوگوں کو دین حضرت مسیحؑ کی طرف مائل کرنے میں موثر واقع ہوسکتی تھی اور بعض کا نظریہ تو یہ ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت مسیحؑ کے ایک طرح اوصیاء میں سے تھے۔

ب۔　حضرت یحییٰؑ قائد، رہبر اور مطاع تھے نیز سید تھے جس کی وضاحت لغات کے بیان میں گزر چکی ہے۔

ج۔　نفسانی خواہشات پر قابو رکھنے والا، "حصوراً"۔ یہ انتہائی بڑا روحانی و معنوی کمال ہے۔ "حصوراً" کی تفسیر خواتین سے دور رہنے والے کے طور پر بھی کی گئی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے یہ انسان کے لیے کوئی خاص صفتِ کمال نہیں ہے۔ یہ بات کہ ان میں ذاتی طور پر اس قسم کے تمایلات تو تھے لیکن وہ انہیں قابو رکھتے تھے، خود آیت بھی اس کی گواہی دیتی ہے کیونکہ "حصور" باب حصر سے ہے جس کے معنی روکنے اور سختی کرنے کے ہیں۔

یہ سب صفات اس آیت میں ذکر ہوئی ہیں:

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا (آل عمران: ۳۹)

د۔　وہ صالحین سے تھے، جیسا کہ فرمایا ہے:

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (الانعام: ۸۵)

ھ۔ بنی اسرائیل میں ان سے پہلے کسی بچے کا نام یحییٰ نہیں رکھا گیا تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝

(مریم:۷)

و۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص لطف سے انہیں حنان (شفیق ومہربان) خلق فرمایا تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "وحناناً من لدنا"۔ حنان سے کیا مراد ہے، اس بارے میں کئی معانی بیان کیے گئے ہیں۔

ا۔ اس سے مراد ولایت ونبوت ہے، جیسا کہ حضرت نوحؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ (هود:۲۸)

حضرت صالحؑ نے بھی فرمایا:

وَاٰتٰىنِیْ مِنْهُ رَحْمَةً (هود:۶۳)

۲۔ مراد لوگوں سے محبت بھی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں فرمایا:

لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ (طٰه:۳۹)

۳۔ مراد ان کا لوگوں پر مہربان ہونا بھی ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ ہمیشہ نیکی کی نصیحت کرتے اور لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے تھے۔

۴۔ اُن سے اللہ تعالیٰ کی خاص محبت مراد ہے کیونکہ ان کی دعا ہمیشہ مستجاب ہوتی تھی۔

۵۔ یہاں حضرت یحییٰؑ کی خدا سے خاص محبت مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت حضرت یحییٰؑ کے دل میں ڈال دی تھی، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ○(بقرہ: ۱۶۵)

پہلی تفسیر بعید از خیال ہے کیونکہ "حنان" بطور نبوت استعمال کرنا عام استعمال سے ہٹ کر ہے۔ لہٰذا بقیہ چار احتمالات میں سے کوئی ایک مراد ہوسکتا ہے، بلکہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ باقی سب معنی ایک حقیقت میں شامل ہیں اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ کو غیب سے مہر ومحبت عطا فرما رکھی تھی جس کے مختلف پہلو تھے، مثلاً وہ اللہ سے عشق ومحبت رکھتے تھے جس کے نتیجہ میں اللہ ان پر اپنا خاص کرم فرماتا تھا، انہیں لوگوں سے محبت تھی اور نتیجتاً لوگ بھی اُن سے محبت کرتے تھے۔ اس پر دلیل یہ آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (مریم:۹۶)

یعنی جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالحہ انجام دیئے، اللہ تعالیٰ ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتا ہے۔

ز۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پاکیزگی وطہارت عطا فرمائی: ’’وزکاۃ‘‘ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو ہر قسم کی پستی وآلودگی سے پاک کر دیا تھا جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی داستان میں گزر چکا ہے کہ جب ان کے ساتھی نے ایک بچے کو قتل کر دیا تو موسیٰؑ نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ط (کھف: ۷۴)

حضرت موسیٰؑ کے ساتھی نے جواب دیا:

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ (کھف: ۸۱)

اسی طرح جبرئیلؑ نے جب حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دی تو کہا:

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ (مریم: ۱۹)

ح۔ حضرت یحییٰؑ پرہیزگار انسان تھے: ’’کان تقیاً‘‘ کیونکہ طہارتِ نفسانی ایسی صفات ان میں موجود تھیں، لہٰذا ان کا لازمی نتیجہ تقویٰ وپرہیزگار بنتا ہے۔

ط۔ وہ ماں باپ پر مہربان تھے: ’’برا بوالدیہ‘‘

ی۔ وہ سرکش ونافرمان نہیں تھے: ’’لم یکن جباراً اعصیاً‘‘

ک۔ پروردگارِ عالم کے معاصی میں مبتلا نہ تھے: ’’لم یکن جباراً اعصیاً‘‘

یہ آخری چاروں صفات یعنی نفسانی پاکیزگی، والدین سے مہربانی، تواضع وفروتنی اور اللہ کی اطاعت، یہ سب صفات حضرت مسیحؑ کے لیے بھی ذکر ہوئی ہیں۔ پہلی صفت سورہ مریم ۱۹ میں آئی ہے اور درج ذیل آیت بقیہ تین صفات کو بیان کر رہی ہے:

وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ (مریم: ۳۲)

مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ ومسیحؑ دونوں کے بارے میں ایک جیسا درود ذکر ہوا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ حضرت یحییٰؑ پر درود بھیجنے والا اللہ ہے جب کہ حضرت مسیحؑ نے خود اپنے بارے میں اس درود کو ذکر فرمایا ہے جو یحییٰؑ کے بارے میں ہے:

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ (مریم: ۱۵)

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہے:

والسلامُ علی یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیاً

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰؑ وحضرت عیسیٰؑ کے درمیان ایک قسم کی طبعی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ:

۱۔ دونوں کی ولادت طبعی وفطری قوانین سے ہٹ کر تھی۔ حضرت یحییٰؑ کے والد ضعیف اور والدہ بانجھ تھیں جب کہ حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے یعنی بلا ازدواج صرف اپنی والدہ سے متولد ہوئے۔

۲۔ مندرجہ بالا چار صفات دونوں میں پائی جاتی تھیں۔

۳۔ حضرت مسیحؑ بچپن میں مقامِ نبوت پر فائز ہوئے (اسرائی:۳)۔اسی طرح حضرت یحییٰؑ کے بارے میں فرمایا:"واتینه الحکم صبیاً" کیونکہ وہ بھی لڑکپن ہی میں نبوت پر فائز ہو چکے تھے۔

حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی، اُن سے بڑے تھے، لہٰذا جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو حضرت یحییٰؑ نے ان کی تصدیق وتائید فرمائی۔ آیت "ومصدقاً بکلمة من الله" اسی مطلب کی طرف اشارہ کررہی ہے۔

یہاں ہم اہل بیت علیہم السلام سے وارد شدہ وہ روایات ذکر کرتے ہیں جن میں حضرت یحییٰؑ اور امام حسین علیہ السلام کے درمیان پائی جانے والی مشابہتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے درمیان یہ مشابہت پائی جاتی ہے۔حضرت یحییٰؑ نام کا بچہ ان سے پہلے بنی اسرائیل میں کوئی نہ تھا، اسی طرح امام حسینؑ کا بھی ان سے پہلے کوئی ہم نام نہیں تھا۔حضرت یحییٰؑ کا قاتل زنازادہ وناپاک شخص تھا۔اسی طرح امام حسینؑ کا قاتل بھی ایسا ہی تھا۔

سفیان ابن عینیہ نے دو واسطوں سے امام سجاد علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا: "میرے باپ امام حسینؑ کسی منزل پر نہیں اترتے تھے اور وہاں سے کوچ بھی نہیں کرتے تھے مگر یہ کہ حضرت یحییٰؑ کا تذکرہ فرماتے تھے۔ دنیا کی بدبختی یہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ جیسی شخصیت کا سر بنی اسرائیل کے ایک زانی شخص کو تحفہ کے طور پر دیا گیا۔ [۱]

حضرت یحییٰؑ کے قتل کے سلسلہ میں تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بہتر اطلاع کے لیے بحارالانوار کی طرف رجوع کریں۔ [۲]

---

[۱] بحارالانوار، ج ۱۴، ص ۱۷۵

[۲] بحارالانوار، ج ۱۴، باب ۱۵، ص ۱۶۳ تا ۱۹۰

بیسویں پیغمبر

قرآن مجید میں ۔۔۔۔۔حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات

حضرت عیسیٰؑ انبیائے الٰہی میں بڑے مرتبہ والے نبی ہیں، جو کتاب وشریعت اور بہت سے معجزات رکھتے ہیں۔قرآن مجید میں ان کے لیے بھی بعض دیگر انبیاء کی مانند دو نام ذکر ہوئے ہیں۔۱۔مسیحؑ۔ ۲۔عیسیٰؑ۔پہلا نام درج ذیل ترتیب سے قرآن مجید میں آیا ہے: آلِ عمران ۴۵،نسائی:۱۵۷،۱۷۱،۱۷۲، مائدہ:۱۷(دو مرتبہ)،۷۲(دو مرتبہ)،۷۵،توبہ:۳۰،۳۱۔

آپ کا دوسرا نام اس ترتیب سے وارد ہوتا ہے: سورۂ بقرہ:۸۷،۱۳۶، ۲۵۳۔آل عمران ۴۵، ۵۲،۵۵،۵۹، ۸۴،نسائی:۱۵۷، ۱۶۳،۱۷۱، مائدہ:۴۶،۷۸، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۶انعام:۸۵،مریم:۳۴،احزاب:۷،شوریٰ:۱۳،زخرف:۶۳،حدید:۲۷،صف ۶، ۱۴۔

اس طرح ان کا نام قرآن مجید میں ۳۶ مرتبہ آیا ہے اور اس کثرتِ تکرار سے ان کی شخصیت وعظمت کا پتہ چلتا ہے۔

اس عظیم پیغمبر کے بارے میں وارد شدہ آیات کی تحقیق ومطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید نے ان کے بارے میں درج ذیل موضوعات سے گفتگو کی ہے:

۱۔ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت۔
۲۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کی خصوصیات۔
۳۔ حضرت عیسیٰؑ کی کتاب وشریعت
۴۔ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت پر شواہد ومعجزات
۵۔ بنی اسرائیل میں آپ کی تبلیغ
۶۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواری اور آسمانی دسترخوان
۷۔ حضرت مسیحؑ کے قتل کی کوشش اور ان کا آسمان پر اٹھ جانا۔
۸۔ انجیل اور ان کی شریعت میں تحریف
۹۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں دعوائے الوہیت
۱۰۔ حضرت مسیحؑ روزِ قیامت میں

ہم پہلے ان موضوعات سے متعلق آیات کا بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد ان کی تفسیر ذکر کی جائے گی۔

(۱) حضرت مسیح علیہ السلام کی معجزانہ ولادت

حضرت مسیحؑ کی ولادت خارق العادت تھی۔قرآن نے اس کا تذکرہ دو عنوان سے درج ذیل آیات میں کیا ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ (ال عمران: ۵۹)

۲۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖۗ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

۳۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

۴۔ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ (ال عمران: ۴۵ تا ۴۷)

۵۔ وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾

۶۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾

۷۔ قَالَتْ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾

۸۔ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖۗ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾

۹۔ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾

۱۰۔ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

١١۔ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

١٢۔ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا
وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

١٣۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

١٤۔ وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

١٥۔ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْٓ اِنِّىْ
نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

١٦۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾

١٧۔ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

١٨۔ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾

١٩۔ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾

٢٠۔ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ
حَيًّا ﴿۳۱﴾

٢١۔ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِىْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِىْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾

٢٢۔ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾ (مریم: ١٦
تا ٣٤)

٢٣۔ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِىْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾

آیات کا ترجمہ

١۔ عیسیٰؑ کی خلقت اللہ کے نزدیک خلقتِ آدم کی مانند ہے۔ اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر فرمایا: ہو جا!

پس وہ ہو گیا۔

۲۔ یاد کرو جب فرشتوں نے مریمؑ سے کہا کہ اللہ تجھے بشارت دیتا ہے۔ اپنی طرف سے ایک کلمہ کی، جس کا نام مسیحؑ، عیسیٰؑ ابن مریم ہے۔ وہ دنیا اور آخرت میں باعزت اور اللہ تعالیٰ کے مقربین سے ہو گا۔

۳۔ وہ بچپن میں گہوارے میں اور بڑھاپے میں لوگوں سے گفتگو کرے گا، اور وہ صالحین سے ہو گا۔

۴۔ مریمؑ نے عرض کیا کہ خدایا! میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا جب کہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے خلق فرماتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کی مشیت چاہتا ہے تو فرماتا ہے ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔

۵۔ قرآنِ کریم میں حضرت مریمؑ کو یاد کرو، جب اس نے اپنے اہل سے مشرقی جانب ایک جگہ کی طرف دوری اختیار کی۔

۶۔ مریمؑ نے اپنے اور ان کے درمیان پردہ ڈال لیا۔ اس وقت ہم نے اپنی روح (جبرائیل) کو اس کی طرف بھیجا جو اس کے لیے ایک صحیح وسالم انسان کی صورت میں مجسم ہو گیا۔

۷۔ مریمؑ نے کہا کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو پرہیز گار ہے۔

۸۔ اس نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا قاصد ہوں، تاکہ تجھے ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروں۔

۹۔ مریمؑ نے کہا کہ میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا، حالانکہ کسی بشر نے مجھے چھوا تک نہیں اور میں بدکار بھی نہیں رہی ہوں۔

۱۰۔ اس (روح) نے کہا کہ اسی طرح ہے جیسے تو کہہ رہی ہے لیکن تیرے پروردگار کا فرمان ہے کہ یہ کام میرے لیے آسان ہے۔ میں اس بچے کو لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت قرار دوں گا اور ایسا ہو کر رہے گا۔

۱۱۔ مریمؑ بیٹے سے حاملہ ہو گئی اور ایک دور مقام پر چلی گئی (اتہام کے خوف سے)

۱۲۔ دردِ زہ اُسے ایک کھجور کے نیچے لے آیا۔ مریمؑ نے کہا کہ کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور

مجھے بھلا دیا گیا ہوتا۔

۱۳۔اس نے اس (مریمؑ) کی آواز سن لی تو نیچے سے آواز دی کہ غمگین مت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے پاؤں کے نیچے پانی کی نہر جاری فرمادی ہے (اس سے پانی پیو اور اپنے جسم کو دھوڈالو)۔

۱۴۔درخت کو ہلاؤ تو تم پر تازہ کھجوریں گریں گی۔

۱۵۔کھاؤ اور پیو اور اس بچے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو۔اس کے بعد جس شخص کو بھی دیکھو تو اسے کہو کہ میں نے اللہ کے لیے خاموشی کی منت مانی ہے۔آج کسی شخص سے گفتگو نہیں کروں گی۔

۱۶۔مریمؑ بچے کو لے کر اپنی قوم کے پاس آئی تو انہوں نے کہا کہ اے مریمؑ تو نے کیسا عجیب اور برا کام کیا ہے۔

۱۷۔اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی۔

۱۸۔اس پر مریمؑ نے اس بچہ کی طرف اشارہ کیا (یعنی اس سے پوچھ لو) تو انہوں نے کہا کہ جو بچہ گہوارے میں ہے ہم اس سے کیسے گفتگو کریں۔

۱۹۔(اسی وقت بچہ نے بات کرنے کے لیے زبان کھولی اور) کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے اور نبی بنایا ہے۔

۲۰۔میں جہاں بھی ہوا اللہ نے میرے وجود کو مبارک بنایا ہے اور مجھے نماز وزکوٰۃ کی وصیت کی ہے، جب تک میں زندہ رہوں۔

۲۱۔اور مجھے اپنی والدہ پر مہربان قرار دیا ہے، سرکش و بے رحم نہیں بنایا۔

۲۲۔مجھ پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا، جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے زندہ اٹھایا جائے گا۔

۲۳۔یہ ہے عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ اور (اس کے بارے میں) صحیح بات، وہ عیسیٰؑ جس کے بارے میں وہ شک اور جھگڑا کرتے ہیں!

آیات کی موضوعی تفسیر

حضرت مسیحؑ معجزانہ طور پر متولد ہوئے اور قرآن مجید نے ان کی ولادت کو مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی کیفیت ولادت مسیحی و مسلم دانشوروں کے درمیان علم کلام کی بحثوں کا موجب بنی۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ کے حضرت مریمؑ سے پیدا ہونے کو خدا کا بیٹا ہونے کی دلیل بناتے ہیں اور ان کی کتب میں حضرت عیسیٰؑ کے لیے اللہ کے بیٹے کی تعبیر عام ہے۔ عیسائی الوہیت کو تین افراد پر تقسیم شدہ مانتے ہیں:

۱۔ باپ خدا، ۲۔ بیٹا خدا۔ روح القدس خدا۔ اس عقیدہ پر ان کی دلیل حضرت عیسیٰ کا ظاہری طور پر باپ کے بغیر متولد ہونا ہے۔ یہی عقیدہ نجران کے نصاریٰ نے پیغمبر اکرمؐ کی ولادت کی طرح ہے۔ خدا نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا۔ اگر کسی شخص کے باپ کا نہ ہونا اس کے پسرِ خدا ہونے کی دلیل ہے تو پھر آدمؑ میں ماں باپ دونوں کا نہ ہونا بھی دلیل بن سکتا ہے کہ آدمؑ خدا کا بیٹا ہو۔[1] جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ﴿۵۹﴾ (آل عمران:۵۹)

حضرت مسیحؑ کی ولادت کے بارے میں خود اہلِ کتاب کی باتوں میں تناقض پایا جاتا تھا، ان میں سے بعض تو شرک کی حد پر پہنچ چکے تھے۔ چونکہ قرآن مجید دوسری آسمانی کتب پر بھاری ومحافظ ہے لہٰذا قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کی ولادت کو سورہ آلعمران کی تین اور سورہ مریم کی بیس آیات میں بیان فرمایا ہے اور کئی پہلوؤں کی طرف اشارہ فرمایا ہے تاکہ وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے جو اس کے ذمہ عائد ہوتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے:[2]

اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَكۡثَرَ الَّذِىۡ هُمۡ فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ﴿۷۶﴾

(نمل: ۷۶)

یعنی ”یہ قرآن اکثر وہ سب کچھ جس میں بنی اسرائیل اختلاف کرتے ہیں، بیان فرماتا ہے“

اب موقع آن پہنچا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزانہ تولد کی کیفیت کو قرآن و وحی کی زبان سے سنا جائے۔ قرآن مجید نے مسیحؑ کی سرگذشت کو دو سوروں میں بیان فرمایا ہے۔ سورۂ آل عمران میں فرشتوں کی حضرت مریمؑ کے ساتھ گفتگو کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تجھے اس طرح بیٹا عطا کرنا چاہتا ہے۔ مریمؑ نے کہا کہ میں شوہر کے بغیر کیسے ماں بن سکتی ہوں؟ ملائکہ نے کہا کہ اگر خدا کی حتمی مشیت کسی کام کے انجام

---

[1] مجمع البیان، ج ۱ ص ۴۵۲

[2] سورۂ مائدہ ۴۸۔ ”وانزلنا الیك الکتاب بالحق... و مھیمنا علیه

سے متعلق طے ہو جائے تو پھر وہ کام ہو کر رہتا ہے، اگرچہ طبیعی اسباب وعلل موجود نہ بھی ہوں۔

اس سورہ میں صرف اتنا ہی ذکر ہوا ہے، البتہ اس گفتگو کے ضمن میں مسیحؑ کی چار صفات کو بیان کیا گیا ہے: ا۔ دنیا و آخرت میں باعزت ہونا۔ ۲۔ اللہ کی بارگاہ کے مقربین سے ہونا۔ ۳۔ گہوارہ میں باتیں کرنا۔ ۴۔ اور صالحین سے ہونا۔

سورۂ مریم میں حضرت مریمؑ کے سامنے روح کے مجسم ہونے کا تذکرہ ہے اور کہا گیا ہے کہ میں اللہ کی طرف سے مامور ہوں کہ تمہیں بیٹا عطا کروں۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ مریمؑ حاملہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد مریم کے حمل و بچے کی ولادت اور ان کے ایمان کا تذکرہ ہے جس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دونوں سوروں کی آیات ایک ہی زمانہ اور ایک واقعہ سے متعلق ہیں یا جو کچھ سورۂ آل عمران میں آیا ہے وہ سورۂ مریم میں جو کچھ ذکر ہوا ہے اس سے مختلف ہے؟

اس بارے میں حتمی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے، صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سورۂ آل عمران میں صرف فرشتوں کا مریمؑ سے گفتگو کرنا ذکر ہوا ہے۔ وہاں حضرت مریمؑ کے حمل کے بارے میں کچھ نہیں۔ گویا اس طرح کی خبریں دے کر حضرت مریمؑ کو بعد میں ہونے والے واقعہ کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ نبوت کے باب میں اس قسم کے غیبی اشارات و رہنمائیوں کو ''ارہاص'' کہا جاتا ہے۔ عموماً انبیاء کے سچے خوابوں کو بھی جو ان کی نبوت کی خبر دیتے ہیں ''ارہاص'' ہی کہا جاتا ہے۔ البتہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ دونوں سوروں میں ایک ہی واقعہ کا تذکرہ ہوا اور تعبیریں اس لیے مختلف ہیں کہ سورۂ آل عمران میں اس واقعہ کا خلاصہ ذکر ہوا ہے۔ جب کہ سورۂ مریم میں اسے وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اب ہم سورۂ آل عمران کی آیات کی توضیح پیش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں جہاں حضرت مریمؑ کو حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کریں، اسے سجدہ کریں اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کریں، اسی کے ضمن میں پیغمبر اکرمؐ کو خطاب فرمایا کہ آپ یاد کریں مریم و ملائکہ کے واقعہ کو جب ملائکہ نے ان سے کہا کہ اللہ آپ کو ایک بیٹا عطا فرمائے گا جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ ہوگا، دنیا و آخرت میں وہ آبرومند ہوگا۔ اور خدا کے مقربین سے ہوگا۔ اس کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ وہ بچپن میں گہوارے میں بڑے لوگوں کی طرح گفتگو کرے گا، اسے صالحین میں شمار کیا جائے گا اور وہ کلمۃ اللہ بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾ (آل عمران: ۴۵،۴۶)

سورۂ مریم میں حضرت مریمؑ و ملائکہ کی گفتگو کسی قدر وضاحت سے ذکر ہوئی ہے اور وہ اس طرح کہ حضرت مریمؑ نے اپنے گھر والوں سے دوری اختیار کر لی اور بیت المقدس کے مشرقی حصے کی طرف چلی گئیں۔ شاید یہ عزلت اس لیے تھی کہ وہاں اطمینان سے عبادت کر سکیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾

(مریم:١٦)

''انتبذت'' کے معنی تنہائی وعزلت اختیار کرنے کے ہیں اور عزلت کے لیے بیت المقدس کے مشرقی گوشہ کو شاید اس لیے اختیار کیا کہ وہاں خلوت تھی، اگرچہ اس بارے میں مفسرین کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت مریمؑ نے اس مشرقی گوشہ میں بیشتر اطمینان وسکون کے ساتھ عبادت کرنے کی خاطرہ پردہ ڈال لیا۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ انہوں نے وہاں ایک صحیح وسالم انسان کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر حضرت مریم ڈر گئیں اور اپنے دل میں سوچا کہ یہ مرد ان کی عبادت گاہ میں کیسے گھس آیا؟ کہیں بُری نیت سے تو نہیں آیا؟ لہٰذا اس سے کہا کہ میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے خدا کا خوف ہے؟

فارسلنا اليها روحنا فتمثل لها بشراً سويا ٥ قالت انى اعوذ بالرحمن منك ان كنت تقياً

''حضرت مریمؑ نے اس شخص سے کہا کہ اگر تجھے خدا کا ڈر ہے تو میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں''

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے بھی اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ اس قسم کی تعبیریں قرآن میں عام استعمال ہوئی ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ (مائدہ:٥٧)

اور

فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾ (مائدہ:٢٣)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اور تجھے بھی تقویٰ مانع ہونا چاہیے اس سے کہ کوئی ناز یبا حرکت کردے۔

حضرت مریمؑ نے یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے خصوصاً اس کی صفتِ رحمانیت کا تذکرہ کیا تا کہ اس نازک مرحلہ میں رحمتِ الٰہی ان کے شامل حال ہو سکے اور وہ ہر قسم کی لغزش سے محفوظ رہ سکیں جیسا کہ حضرت یوسفؑ کو جب مریمؑ ہی کی طرح نازک صورتِ حال کا سامنا ہوا تو انہوں نے کہا تھا:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ (یوسف:٥٣)

حضرت مریمؑ نے یہاں اللہ کی صفت رحیم کی بجائے رحمان استعمال کی ہے کیونکہ رحمان کی صفت اللہ کی وسیع رحمت سے متعلق ہے کہ جو دنیا وآخرت میں لوگوں کے شاملِ حال ہوگی جب کہ رحیم کی صفت آخرت میں رحمتِ خدا کا ذکر کرتی ہے۔

حضرت مریم یہ بات کر کے اس شخص کے ردِعمل کا انتظار کرتی ہیں۔ اچانک اس نے مریمؑ سے کہا آپ مت ڈریں۔ میں آپ کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں اور میری ذمہ داری یہ ہے کہ آپ کو ایک پاک وپاکیزہ بیٹا عطا کروں۔ حضرت مریمؑ کو یہ خبر سن کر تعجب ہوا اور کہنے لگی کہ

میں کیسے بچہ پیدا کر سکتی ہوں حالانکہ ولادت کے اسباب و مقدمات (شادی وغیرہ) فراہم ہی نہیں ہیں۔ اس مجسم روح نے یہ کہہ کر حضرت مریمؑ کے تعجب کو ختم کر دیا کہ اس طرح کے کام اللہ کے لیے آسان ہیں (یعنی اگر آپ اپنی زندگی پر نظر کریں کہ کیسے محراب میں آپ کو کھانا پہنچتا تھا، گرمیوں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں آپ کو ملتے تھے تو آپ کا تعجب ختم ہو جائے گا)۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بنی اسرائیل کو ایسا بچہ دے جو اس کا معجزہ اور اس کی رحمت کا مظہر ہو۔ ایسے بچے کی ولادت اللہ کی حتمی مشیت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ ‌ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝١٩ قَالَتۡ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ وَّلَمۡ اَكُ بَغِيًّا ۝٢٠ قَالَ كَذٰلِكِ‌ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ‌ ۚ وَلِنَجۡعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحۡمَةً مِّنَّا‌ ۚ وَكَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِيًّا ۝٢١ (مریم: ۱۹ تا ۲۱)

یہی مفہوم سورۂ آل عمران میں بھی آیا ہے جہاں فرماتا ہے:

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ‌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝٤٧ (آل عمران: ۴۷)

حضرت مریمؑ نے اللہ کے قاصد کی بات سنی تو اُن کے دل کو کسی قدر تسلی ہوئی۔ پھر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ حضرت مریمؑ حاملہ ہو گئیں۔

اب یہ سوال کہ وہ حاملہ کیسے ہوئیں، اس کا جواب ہمیں معلوم نہیں ہے۔

حضرت مریمؑ نے حمل کا احساس کیا۔ وہ اپنی قوم سے کچھ مدت کے لیے دور رہنے کی خاطر وہاں سے ایک دور جگہ پر چلی گئیں۔ وہ جگہ کون سی تھی آیت میں اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں۔ بہر کیف مریمؑ اس جگہ پر پہنچیں تو انہیں درد زہ شروع ہو گیا اور وہ کھجور کے تنے کے نیچے جا کر بیٹھ گئیں، اس حال میں کہ لرزہ ان پر طاری تھا۔ انہوں نے خواہش کی کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور مجھے بھلا دیا جاتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ‌ ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ۝٢٣ (مریم: ۲۳)

ایسے حالات میں کہ جب حضرت مریمؑ اپنی اور خاندان کی عزت کے لیے فکرمند ہیں اور لوگوں کی تہمتوں سے ڈر رہی ہیں تو مناسب ہے کہ اللہ کی رحمت دوبارہ ان کے شاملِ حال ہو اور اُسے اس پریشانی سے نجات بخشے، لہٰذا حضرت مریمؑ نے نیچے کی طرف سے آواز سنی۔ یہ آواز یا تو مولود کی تھی یا روح مجسم کی تھی جو مریمؑ کے نیچے آ چکا تھا۔ اس خطاب میں کہا گیا تھا کہ آپ اپنے پاؤں کے نیچے چشمہ ملاحظہ کریں جس سے اپنے آپ کو اور نومولود کو غسل دے سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جس کھجور کے تنے سے آپ ٹیک لگائے بیٹھی ہیں اسے ہلائیں تو تازہ کھجوریں آپ پر

گریں گی۔ان کو کھائیں، پانی پئیں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کریں۔لوگوں کے اعتراضات وسوالات کے مقابلہ میں روزہ کی نذر کرلیں تاکہ ان سے گفتگو کی ضرورت نہ رہے۔اس طرح یہ مشکل جو آپ کو نظر آرہی ہے حل ہوجائے گی،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ (مریم:۲۴تا۲۶)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نے حضرت مریمؑ پر اس حد تک رحمت وفضل فرمایا تھا اس نے کیوں اُن کو یہ حکم دیا کہ درخت کو ہلاؤ، کہ اس سے تازہ کھجوریں گریں۔کیا اللہ قادر نہ تھا کہ حضرت مریمؑ کے درخت کو ہلائے بغیر کھجوریں اُن کے لیے گرتیں؟

جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں درس یہ ہے کہ اگرچہ انسان کے لیے تمام اسباب غیب فراہم ہوں پھر بھی اُس کو ہاتھ پاؤں ہلانا لازم ہے اور تمام کاموں کو غیب پر ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔یہ صحیح ہے کہ تمام نعمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔لیکن اس کی مشیت یہ ہے کہ لوگوں کو فیض ان کے خاص عمل سے ملنا چاہیے اور فیض یاب ہونے کی ایک شرط یہی ہے کہ انسان خود بھی ہاتھ پاؤں ہلائے۔

حضرت مریمؑ کو حکم ہوا کہ لوگوں کے سوالات کے جواب میں کہیں کہ میں نے روزہ کی نذر مانی ہوئی ہے،لہٰذا میں آج کسی سے گفتگو نہیں کروں گی۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کس قسم کا روزہ تھا؟ کیا حقیقتاً روزہ تھا جس کی ایک شرط کسی سے گفتگو نہ کرنا تھی، یا اس روزہ سے صرف زبان بندی مراد تھی؟

دوسرے معنی پہلے کی نسبت زیادہ واضح معلوم ہوتے ہیں کیونکہ کھانے پینے کا حکم تو خود آیت میں حضرت مریمؑ کے لیے موجود ہے۔ پس اس کھانے پینے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت مریمؑ کا حقیقی روزہ نہیں ہوسکتا بلکہ صرف چپ کا روزہ تھا اور بنی اسرائیل میں ہوسکتا ہے اس قسم کے روزہ کا رواج ہو۔

حضرت مریمؑ کا بچہ کو لے کر قوم کی طرف آنا

حضرت مریمؑ کو غیبی پیغام سن کر تسلی ہوئی اور وہ بچے کو لے کر قوم کے پاس آئیں۔ان حالات میں اُن کو نادان لوگوں کی طرف سے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔بعض نے کہا کہ یہ کیسا عجیب کام ہے؟ بعض نے کہا یہ کیسا بُرا کام ہے؟ اے ہارون کی بہن! تیرا باپ بُرا آدمی نہیں تھا، نہ ہی تیری ماں بُری عورت تھی (لہٰذا تو نے یہ کیا کیا، کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ حضرت مریمؑ غیر شادی شدہ ہیں)

حضرت مریمؑ نے حکم خدا کے مطابق اعتراض کے سلسلہ میں بچے کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارے اعتراضات کا

جواب یہ بچہ دے گا۔ وہ حضرت مریمؑ کی بات سن کر حیرت سے کہنے لگے کہ جو بچہ گہوارے میں ہے وہ ہماری باتوں کا جواب کیسے دے گا؟ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ﴿۲۷﴾ یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ﴿۲۹﴾ (مریم: ۲۷ تا ۲۹)

اس آیت میں حضرت مریمؑ کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اعتراض کے جواب میں بچہ کی طرف اشارہ کریں۔ لیکن سورۂ آل عمران میں آیا کہ ملائکہ حضرت مریمؑ کو پہلے بتا چکے تھے کہ یہ بچہ گہوارے میں گفتگو کرسکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ویکلم الناس فی المھد و کھلاً"، شاید اسی بات کے پیش نظر حضرت مریمؑ نے جواب کے لیے بچہ پر بات رکھی اور اس کی طرف اشارہ کیا۔

حضرت مریمؑ اور ان کے بچہ کی سرگذشت سراسر اعجاز و کرامت ہے۔ جب لوگ حضرت مریمؑ پر اعتراضات کر رہے تھے اور انہوں نے جواب کے لیے بچہ کی طرف اشارہ کیا تو اچانک اس ایک دن کے بچے نے کلام کیا اور اپنے آپ کو درج ذیل صفات کے ساتھ متصف کیا:

۱۔ میں اللہ کا بندہ ہوں، ۲۔ مجھے کتاب دی گئی ہے، ۳۔ مجھے پیغمبروں میں شامل کیا گیا ہے، ۴۔ میرا وجود جہاں بھی ہوگا برکت کا باعث ہوگا، ۵۔ جب تک زندہ ہوں مجھے نماز و زکوٰۃ کی تعلیم دی گئی ہے، ۶۔ میں اپنی ماں پر مہربان ہوں اور سرکش و سنگدل ہرگز نہیں ہوں، ۷۔ جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن مجھے اٹھایا جائے گا، رحمت پروردگار میرے شامل حال رہے گی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ؗ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾

۲۲۔ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾ (مریم: ۳۰ تا ۳۳)

تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنی صفات کے ضمن میں اپنی والدہ گرامی پر مہربان ہونا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بات بالکل اس مطلب کے خلاف ہے جو موجودہ تورات میں پایا جاتا ہے۔

حضرت مسیحؑ نے احکامِ شرعی میں سے نماز و زکات کا تذکرہ کیا جس سے ان دو فریضوں کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کی عمر کے تین اہم دنوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن کی حیاتِ بشر میں انتہائی اہمیت ہے کیونکہ ان تین دنوں میں سے ہر ایک نئی زندگی کی ابتدا ہے، وہ ہیں ولادت کا دن، موت کا دن اور اٹھائے جانے کا دن۔

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تین مراحل میں انسان کو دیگر تمام مراحل سے زیادہ خوف و وحشت سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ (۱) جس دن انسان پیدا ہوتا اور اس کائنات میں آنکھیں کھولتا ہے۔ (۲) جس دن وہ مرتا ہے تو دوسرے جہاں اور وہاں کے لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ (۳) جس دن اُسے اٹھایا جائے گا اور وہ ایسے احکام و فیصلے دیکھے گا جو اس نے اس دنیا میں نہ دیکھے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ پر ان تین موارد میں درود بھیجا ہے۔ جیسا کہ حضرت مسیحؑ نے بھی ان تین مراحل میں اپنے آپ پر درود بھیجا ہے۔[1]

یہاں حضرت مسیحؑ کی ولادت کی کیفیت اختتام کو پہنچی۔ ان کی ولادت کا تذکرہ کرنے کے بعد قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ مسیحؑ کی سر گذشت اسی قدر ہے اور ان کی ولادت کے بارے میں صحیح حقیقتِ حال بھی یہی ہے جو بیان ہوئی۔ اُن کے بعد قرآن مجید نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شادی کے بغیر حضرت مریمؑ سے مسیحؑ کی ولادت کو دلیل نہیں بنانا چاہیے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ کنواری مریمؑ سے اُن کی ولادت معجزہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ سب چیزوں پر نافذ ہے۔ اگر مشیتِ خدا یہ ٹھہرے کہ انسان طبیعی اسباب و عوامل کے بغیر متولد ہو تو یقیناً ایسا ہو کر رہے گا، ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٣٥﴾

(مریم: ۳۴۔ ۳۵)

حضرت مسیحؑ کے بارے میں عیسائیوں کے غلط نظریات کے سلسلہ میں ہم ایک الگ فصل میں بحث کریں گے۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۴، ص ۱۷۱۔ خصال و عیون اخبار الرضا علیہ السلام سے نقل کیا گیا۔

(۲) حضرت مسیح علیہ السلام کی قرآن مجید میں خصوصیات کا بیان

قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کی مختلف صفات کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے بعض وہبی اور بعض اکتسابی ہیں۔ان صفات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مسیحؑ ولایت تامہ رکھتے تھے۔ہم یہاں اُن خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پہلے ہم موضوع سے متعلق آیات کا ذکر کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ (بقرہ ۸۷، ۲۵۳)

۲۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ (آل عمران: ۴۵)

۳۔ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ (مریم: ۲۱)

۴۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ (آل عمران: ۴۶)

۵۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾

۶۔ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ

۷۔ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (آل عمران: ۴۸ تا ۵۰)

۸۔ الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (النساء: ۱۷۱)

۹۔ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾

۱۰۔ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ (الانعام: ۸۵، ۸۷)

۱۱۔ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ (مریم: ۱۹)

۱۲۔ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾

۱۳۔ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠

۱۴۔ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ (مریم: ۳۰ تا ۳۲)

۱۵۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (شوریٰ: ۱۳)

آیات کا ترجمہ

۱۔ ہم نے عیسیٰؑ ابن مریم کو معجزے عطا فرمائے اور اس کی تائید روح القدس سے کی۔

۲۔ یاد کرو جب ملائکہ نے مریمؑ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارد دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ ہوگا۔ وہ دنیا و آخرت میں معزز و مقربین سے ہوگا۔

۳۔ اس کو ہم لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت قرار دیں گے۔ نیز یہ ہو کر رہے گا۔

۴۔ وہ لوگوں کے ساتھ گہوارے اور بڑھاپے میں کلام کرے گا اور صالحین سے ہوگا۔

۵۔ اسے کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم دی جائے گی۔

۶۔ وہ بنی اسرائیل کی طرف ہمارا رسول ہے۔

۷۔ وہ تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تورات اس سے پہلے موجود ہے۔

۸۔ مسیح عیسیٰؑ ابن مریم صرف اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جو اس نے مریمؑ پر القا کیا ہے اور اللہ کی طرف سے ایک روح ہے۔

۹۔ زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ سب صالحین سے تھے۔

۱۰۔ ہم نے ان انبیاء کو (جن میں عیسیٰؑ بھی شامل ہیں) برگزیدہ کیا اور انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائی۔

۱۱۔اس مجسم روح نے مریمؑ سے کہا کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروں۔

۱۲۔عیسیٰؑ نے (اپنے تعارف میں) کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

۱۳۔میں جہاں بھی ہوں، مجھے بابرکت انسان قرار دیا گیا ہے۔

۱۴۔مجھے اپنی ماں پر مہربان بنایا ہے اور مجھے سرکش وسنگدل نہیں بنایا گیا۔

۱۵۔تمہارے لیے وہ شریعت بھیجی جس کی نوحؑ کو ہدایت کی تھی، وہ جس کی تیری طرف ہم نے وحی کی اور جس کی ہم نے ابراہیمؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ کو ہدایت کی تھی۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ان آیات کے مطالعہ سے حضرت عیسیٰؑ کا عظیم مقام ومرتبہ واضح ہوجاتا ہے۔اب ہم عیسیٰؑ کی صفات کو آیات کی ترتیب کے مطابق ذکر کرتے ہیں:

۱۔کلمۂ خدا

قرآن مجید نے دو مقامات پر حضرت عیسیٰؑ کو ''کلمۃ اللہ'' کہا ہے۔اس کلمہ سے مراد لفظ نہیں ہے جو منہ سے نکلتا ہے بلکہ اس سے مراد حضرت مسیحؑ کا حقیقی وجود ہے جو اللہ تعالیٰ کے تکوینی کلمات سے ہے۔اگرچہ تمام کائنات اللہ ہی کا کلام ہے لیکن چونکہ حضرت عیسیٰؑ کا وجود معجزانہ طریقہ سے خلق ہوا، لہٰذا خصوصیت کے ساتھ انہیں کلمۂ خدا کہا گیا۔دراصل عالمِ تکوین کو کلامِ خدا اس لیے کہتے ہیں کہ اشیاء کا تکوینی وجود اُن کے خالق کے کمالات پر شاہد ہوتا ہے۔جیسا کہ لفظی کلام ذہن میں موجود مخفی معانی کو بیان کرتا ہے اور قرآن مجید میں اس پوری کائنات کو کلامِ خدا شمار کیا گیا ہے۔[1]

۲۔آپ کا نام مسیحؑ وعیسیٰؑ ابن مریمؑ

آیات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو یہ دونوں نام اللہ کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، جیسا کہ فرشتوں نے مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے

[1] سورۂ کہف ۹۰، لقمان ۲۷

ہوئے کہا تھا:

ان الله يبشرك بكلمة منه اسمه المسيح عيسیٰ ابن مريم

انہیں مسیحؑ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کلمہ مسح سے نکلا ہے جس کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ بیماروں پر ہاتھ پھیرتے تھے تو وہ شفایاب ہوجاتے تھے، لہٰذا انہیں مسیح کہا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسیح ممسوح کے معنی میں ہے یعنی گناہوں سے دھلا ہوا یا خیر و برکت میں گھرا ہوا۔ نیز مسح اصل میں عبرانی لغت کا لفظ تھا جو مسح سے مشتق ہوا ہے۔ لہٰذا عیسیٰؑ کو مسیح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی تورات کی رو سے اپنی مقدس اشیاء پر ایک خاص تیل ملتے تھے اور جب انہیں ایک بادشاہ کی ضرورت ہوتی تو، چونکہ سلطنت کو بھی وہ ایک مقدس چیز سمجھتے تھے، لہٰذا اپنے شاؤول (طالوت) نامی پہلے بادشاہ کو بھی انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ وہ تیل ملا تھا۔ اس کے بعد یہ رسم قائم ہوگئی کہ بادشاہ کو تخت نشینی کے وقت یہ تیل ملا جاتا تھا تاکہ اُسے تمام بنی اسرائیل پر حکومت حاصل ہو۔ (اس تیل ملنے کو مسح کہا جاتا تھا)۔ جب بنی اسرائیل اپنی سرزمین سے نکال دیئے گئے اور ان کی حکومت ختم ہوگئی تو وہ ہمیشہ ایک ایسے شخص کے ظہور کے منتظر رہتے جو ان کی عظمت رفتہ کی تجدید کرے اور بنی اسرائیل کو ایک جھنڈے تلے جمع کردے۔ یہ شخص حضرت عیسیٰؑ مسیح تھے جن کے ظہور کی خبریں انبیاء بنی اسرائیل دیتے رہے تھے۔[1]

لفظ عیسیٰؑ کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ لفظ ''یشوع'' بمعنی ''نجات دہندہ'' یا ''بعش'' بمعنی ''زندہ (یحییٰ) سے مشتق ہو۔ سابقاً بیان ہو چکا ہے کہ عیسیٰ و یحییٰؑ میں کئی لحاظ سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

نیز عیسیٰؑ و مسیح دونا موں کی وجہ تسمیہ بھی ایسی چیز کو ہونا چاہیے جو پہلے سے موجود ہو جب نام رکھا جا رہا ہو۔ لہٰذا مسیحؑ نے جو کام بعد میں انجام دیئے وہ نام رکھنے کی وجہ بن سکتے بلکہ اس کی وجہ وہ باتیں ہی ہو سکتی ہیں جو اسی زمانہ میں واقع ہوئی ہوں۔

۳۔ آیت خدا اور رحمتِ الٰہی کا مظہر

حضرت یحییٰؑ کی طرح حضرت مسیحؑ کی خلقت بھی مکمل طور پر معجزانہ طریقے سے ہوئی، بلکہ حضرت مسیحؑ کی خلقت حضرت یحییٰؑ سے زیادہ پُراسرار تھی۔ اسی وجہ سے خود حضرت مسیحؑ کو آیاتِ الٰہی میں سے ایک آیت شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''ولنجعله اية للناس'' یا فرمایا ''لاهب لك غلاماً زكياً'' اور بخشنے (لاهب) سے مراد بھی معجزانہ خلقت ہی ہے۔

۴۔ گہوارے میں کلام

حضرت مسیحؑ کے آیت الٰہی ہونے کی ایک دلیل اُن کا گہوارے میں گفتگو کرنا بھی ہے جہاں وہ بڑوں کی طرح کلام کرتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''ویکلم الناس فی المهد و كهلاً''۔

---

[1] اعلام القرآن، ص ۵۴۴ جس نے قاموسِ کتابِ مقدس سے نقل کیا۔

۵۔روحانی کمالات

قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کے درج ذیل روحانی کمالات کا تذکرہ فرمایا ہے:

(۱) غلام زکیاً...... (۲) مبارکاً......... (۳) برا بوالدتی...... (۴) لم یجعلنی جباراً شقیاً ... (۵) و من الصلحین... (۶) وجتبینھم (بزرگی یافتہ)... (۷) وایدنہ بروح القدس ... ۔ان صفات کے معانی یہ ہیں کہ وہ گناہ سے پاک، با برکت وجود والے، اپنی والدہ پر مہربان و متواضع و نرم دل اور صالحین سے تھے۔ان صفات کا ان کی ذات میں جمع ہونا ان کی روحانی عظمت کی علامت ہے۔ انہی صفات کی وجہ سے وہ اس عظیم مرتبہ پر فائز ہوئے۔

٦۔صاحبِ شریعت وصاحبِ کتاب نبی!

حضرت عیسیٰؑ ان کمالات کے پرتو میں نبی بنے اور انہیں کتاب و شریعت عطا کی گئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں تورات وحکمت کی تعلیم بھی عطا کی گئی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾ (آل عمران: ۴۸)

نیز فرمایا:

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۟ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ (مریم: ۳۰)

۷۔اولوالعزم انبیاء سے ایک

جب ہم اولوالعزم انبیاء کے نام بیان کرتے ہیں کہ جو حاملِ کتاب و شریعت بھی تھے تو حضرت عیسیٰؑ بھی ان میں سے ایک قرار پاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (شوریٰ: ۱۳)

۸۔بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے

یہ سوال کہ کیا حضرت مسیحؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے، یا ان کی نبوت و رسالت اس سے وسیع ترتھی، ایک مستقل موضوع ہے جس کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔البتہ آیات کے ظاہر سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ”و رسولاً الی بنی اسرآئیل“

بعض آیات سے حضرت مسیحؑ کی ایک اور خصوصیت کا پتہ بھی چلتا ہے اور وہ ہے اعمال پر شاہد ہونا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مسیحؑ کے لیے یہ تعبیر بھی استعمال فرمائی ہے ''و یوم القیمه یکون علیهم شهیداً''،شہادت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک کسی کے خلاف گواہی دینا اور دوسرا کسی کے حق میں گواہی دینا۔ یہاں حضرت مسیحؑ کی خصوصیات میں پہلی قسم کی شہادت ذکر کی گئی ہے جو لفظ علیٰ کے استعمال سے ظاہر ہوئی ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مسیحؑ اپنے پیروکاروں کے باطل و غلط نظریات کے خلاف گواہی دیں گے، مثلاً ان کا یہ نظریہ ہے کہ حضرت مسیحؑ قتل ہو گئے، حالانکہ وہ قتل نہیں ہوئے بلکہ پیروکاروں کو اشتباہ ہو گیا تھا۔ حضرت مسیحؑ قیامت کے دن حقیقتِ حال سے نقاب کشائی کریں گے۔ دوسرے لوگوں کے باطل نظریات کے بارے میں بھی اسی طرح اور آیات کے سیاق کو دیکھنے سے، اس نظریہ کی مزید تائید ہوتی ہے۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ کی کتاب اور شریعت

قرآن مجید کی رو سے حضرت عیسیٰؑ اللہ کے پیغمبر تھے اور کتاب کے ذریعہ انہیں شریعت عطا کی گئی تھی۔ طبعی سی بات ہے کہ جو شخص پیغمبر ہو اس پر وحی بھی ہونا چاہیے۔ اس موضوع سے متعلق آیات کا بیان اس طرح ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۴۸ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۥ (آل عمران: ۴۸، ۴۹)

۲۔ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ
عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۵۰ (آل عمران:
۵۰)

۳۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ
اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ
وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝۱۶۳ (النساء: ۱۶۳)

۴۔ الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ (النساء:
۱۷۱)

۵۔ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۶ (المائدہ: ۴۶)

۶۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ
(المائدہ: ۷۵)

۷۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ (الحدید: ۲۶،۲۷)

۸۔ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (الصف: ۶)

۹۔ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الزخرف: ۶۳)

آیات کا ترجمہ

۱۔ اللہ اسے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دے گا اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔

۲۔ میں تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو میرے پاس ہے۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ ان بعض چیزوں کو حلال کردوں جو مجھ سے پہلے تم پر حرام تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لایا ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

۳۔ ہم نے ابراہیمؑ ...... اور عیسیٰؑ پر وحی فرمائی ......

۴۔ مسیح عیسیٰؑ ابن مریمؑ اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ تھا۔

۵۔ ان کے پیچھے ہم نے عیسیٰؑ کو بھیجا جو تصدیق کرنے والا تھا اپنے سے پہلے موجود تورات کی اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت ونور تھا جو تصدیق کرنے والی تھی اپنے سے پہلے موجود تورات کی اور وہ متقین کے لیے ہدایت ونصیحت ہے۔

۶۔ مسیح ابن مریمؑ نہیں تھا مگر اللہ کا پیغمبر۔ اس سے پہلے بھی پیغمبر گزر چکے ہیں۔

۷۔ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان کی ذریت میں نبوت و کتاب قرار دی۔
ان کے پیچھے ہم نے اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰؑ ابن مریمؑ کو بھیجا جس کو ہم نے انجیل عطا کی۔

۸۔یاد کرو جب مسیحؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اپنے سے پہلے موجود تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور اپنے بعد ایک پیغمبر کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمدؐ ہوگا۔

۹۔جب عیسیٰؑ دلائل کے ساتھ بنی اسرائیل کی طرف آیا تو کہا کہ میں تمہاری طرف حکمت لایا ہوں تا کہ تمہیں بتاوں وہ بعض چیزیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، اللہ کی مخالفت سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ان آیات میں حضرت مسیحؑ کی رسالت، شریعت، کتاب اور گذشتہ و آئندہ کے انبیاء کے مقابلہ میں ان کے مقام کو بیان کیا گیا ہے۔ ان خصوصیات کے پیش نظر انبیاء میں اُن کے بلند مرتبہ کا ہمیں پتہ چلتا ہے۔اب ہم آیات کی ترتیب کے مطابق ان خصوصیات کو ذکر کرتے ہیں:

۱۔آیات میں حضرت مسیحؑ کو اللہ کا رسول یا رسولِ بنی اسرائیل بتایا گیا ہے اور مسلم ہے کہ مقامِ رسالت مقامِ نبوت سے مختلف ہے۔ نبی وہ ہوتا ہے جس پر صرف وحی نازل ہو۔رسول وہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وحی کے ذریعہ حاصل کرتا ہے وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے اور اس طرح اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے۔اس طرح حضرت مسیحؑ نبی بھی تھے اور رسول بھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:"واوحینآ الی ابراھیم ... و عیسیٰ ... نیز فرمایا:"رسول اللہ و کلمتہ" یا فرمایا:"ورسولاً الی بنی اسرآئیل" علیٰ ہذا القیاس دوسری آیات۔

۲۔ان کی کتاب انجیل تھی جس کا ذکر تین جگہ پر ہوا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:"واتینہ الانجیل فیہ ھدیً و نور" نیز فرمایا:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ (آل عمران: ۴۸)

۳۔ان کی شریعت کو شریعتِ تورات پر تبصرہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے گویا حضرت مسیحؑ شریعتِ تورات کو قبول کرتے تھے، سوائے چند موارد کے جہاں کچھ چیزیں شریعتِ تورات میں حرام تھیں اور حضرت مسیحؑ کی شریعت میں انہیں حلال کیا گیا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (آل عمران: ۵۰)

۴۔وہ تورات اور اپنے سے پہلے والے انبیاء کی تصدیق کرنے والے تھے اور اپنے سے بعد والے پیغمبر کی بشارت دینے والے تھے،

ارشاد ہوتا ہے:

مصدقاً لما بین یدی من التوراة و مبشراً برسولٍ یأتی من بعدی اسمه احمد

نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اپنی کتاب وشریعت کے ذریعہ بعض اصلاحات کیں تا کہ بعد میں آنے والے پیغمبر موعود کے لیے بنیاد فراہم ہو سکے۔

۵۔ انہیں بنی اسرائیل کے اختلافات میں فیصلہ کرنے والے کے طور پر بھیجا گیا، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٦٣﴾

(زخرف: ٦٣)

(۴) حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے معجزات و دلائل

نبوت اور عالمِ بالا کے ساتھ ارتباط کے اثبات کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ ایسے مرتبہ کا مدعی معجزہ رکھتا ہے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق تمام انبیاء معجزہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ بھی جب کسی سے دعویٰ نبوت سنتے تھے تو اس سے معجزہ مانگتے تھے۔ حضرت مسیحؑ بھی انبیاء میں حضرت موسیٰؑ کے بعد ایسے پیغمبر تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی واضح و روشن دلیلیں و معجزات دے کر بھیجا تھا۔ اس بارے میں آمدہ آیات دو قسم کی ہیں۔ بعض آیات میں ان کے معجزات کو بطور مجمل بیان کیا گیا ہے جب کہ بعض دیگر آیات میں ان کے معجزات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہم یہاں ان آیات کو بیان کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ (البقرہ: ۸۷)

۲۔ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْھُمُ الْبَيِّنٰتُ (البقرہ: ۲۵۳)

۳۔ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ؀ (آل عمران: ۴۹)

۴۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ
الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ
بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ
جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٠﴾
(المائدہ: ۱۱۰)

۵۔ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ
الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٦٣﴾ (الزخرف: ۶۳)

آیات کا ترجمہ

۱۔ہم نے عیسیٰؑ کو روشن دلیلیں دیں اور روح القدس کے ساتھ اس کی تائید فرمائی۔

۲۔ہم نے عیسیٰؑ کو روشن دلیلیں دیں اور روح القدس کے ساتھ اس کی تائید فرمائی۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ روشن دلیلوں کے آنے کے بعد (اختلاف نہ کرتے اور) ایک دوسرے کو قتل نہ کرتے۔

۳۔ہم نے مسیحؑ کو رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف بھیجا۔اس نے کہا: ''میں تمہاری طرف از جانب پروردگار آیت و معجزہ لے کر آیا ہوں۔ میں مٹی سے پرندہ کی شکل بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔اللہ کے حکم سے نابیناؤں اور برص کے مریضوں کو شفا دیتا ہوں، تم جو کچھ کھاتے ہو یا گھروں میں جو کچھ ذخیرہ کرتے ہو اس کی خبر دیتا ہوں۔اس کام میں تمہارے لیے نشانی ہے (میری حقانیت پر)، اگر تم مومن ہو''۔

۴۔اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے عیسیٰؑ ابن مریمؑ سے کہا کہ میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر کی، جب میں نے تمہاری روح القدس کے ساتھ تائید فرمائی۔تم گہوارے میں اور بڑے ہو کر لوگوں سے یکساں گفتگو کرتے تھے۔ یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمہیں کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔ یاد کرو جب مٹی سے تم پرندہ بناتے اور اس میں پھونک

مارتے تھے تو وہ میرے اذن سے اصلی پرندہ بن جاتا تھا، تم میرے اذن کے ساتھ نابیناؤں اور برص کے مریضوں کو شفا دیتے تھے۔ یاد کرو جب تم مردوں کو قبروں سے نکالاتے (یعنی زندہ کرتے تھے) نیز یاد کرو جب تم بنی اسرائیل کے پاس روشن دلیلیں لائے (اور وہ تمہاری جان کے درپے ہوگئے)، تو ہم نے انہیں تم سے باز رکھا۔ پس ان میں کافروں نے کہا کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔

۵۔ جب عیسیٰؑ اپنی قوم کی طرف روشن دلیلوں کے ساتھ پیش آئے تو انہوں نے ان سے کہا کہ میں تمہارے پاس پرحکمت باتیں لے کر آیا ہوں اس لیے کہ تمہارے لیے روشن وواضح کردوں وہ کچھ جس میں تم اختلاف کرتے ہو۔ اللہ کی مخالفت سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

آیات کی موضوعی تفسیر

ا۔ حضرت مسیح بھی دوسرے انبیاء کی طرح اپنے زمانہ کی مناسبت سے معجزات رکھتے تھے۔ معجزہ کی حقیقت صرف یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا خارق العادۃ (برخلاف عادت) کام کرے کہ اس فن کے ماہر حضرات اس جیسا کام کرنے سے عاجز و ناقابل ہوں اور اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس جیسا کام ان کی طاقت سے باہر ہے۔ اس فن کے ماہرین کا یہ اعتراف کہ یہ کام بشری قوت سے باہر ہے، دوسروں کے لیے صاحبِ معجزہ کی نبوت پر یقینی وحتمی دلیل و برہان ہوگا۔ اس صورت میں ماہرینِ فن ان مطالب کی تائید کرسکتے ہیں کہ صاحبِ معجزہ کا کام اسی نوعیت کا ہو جیسے کام وہ کرتے رہتے ہوں یعنی جس فن میں وہ لوگ سرِ ذمہِ روزگار و ماہر ہیں، نبی اس فن میں انہیں مقابلہ کی دعوت دے، ورنہ اگر اہلِ فن اس کام کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں تو اس کی تصدیق بھی نہیں کرسکیں گے کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا کام ایسی نوعیت کا ہے جس کے بارے میں ہمیں مکمل معلومات حاصل نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا کام بشری قدرت سے باہر ہے یا بشر اس کے انجام پر قادر ہے!

اس اصل کی بنیاد پر ضروری ہے کہ ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانہ میں رائج فنون میں سے ہونا چاہیے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ کچھ لوگ ایسے موجود ہوں جنہیں اس فن میں مہارت حاصل ہو اور اگر ایسے لوگ ان میں نہ پائے جاتے ہوں تو پھر پیغمبر کا معجزہ وہی ہوگا جس کی درخواست لوگ کریں گے۔

خلاصہ یہ کہ نبی سے معجزہ کی درخواست اس کے دعوائے نبوت کی حقیقت جانچنے کی خاطر کی جاتی ہے اور یہ ہدف تب ہی پورا ہوسکتا ہے جب مدعیِ نبوت انہیں اسی چیز میں مقابلہ کی دعوت دے جس چیز کے بارے میں وہ لوگ مکمل معلومات رکھتے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے معجزات حضرت عیسیٰؑ کے معجزات سے بالکل جدا ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے عصا پھینک کر اور یدِ بیضا کے

ذریعہ اپنے دعویٰ کو ثابت کیا کیونکہ اس دور میں لوگ سحر وجادو میں مہارت رکھتے تھے۔لہٰذا نبی پر لازم تھا کہ اس فن میں لوگوں کو مقابلہ کی دعوت دے اوران پر اپنی برتری ثابت کرے تا کہ ان پر واضح ہوجائے کہ اس کا کام بشر کی قوت سے خارج ہے، جب کہ حضرت عیسیٰؑ وہ معجزات لائے جو اُن کے اپنے زمانے سے مناسبت رکھتے تھے۔اُن کے زمانہ میں یونانی تہذیب وتمدن کی وجہ سے طب کے فن کو عروج حاصل تھا۔

قرآنی آیات میں بعض مقامات پر ان کے معجزات کو ''بینات'' کی تعبیر سے بطورِ مجمل بیان کیا گیا ہے۔بینات بینہ کی جمع ہے جس کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی مدعا کی وضاحت کرے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:''واتینا عیسیٰ ابن مریم البینت'' بعض مقامات پر ان کے معجزات کو جدا جدا بیان کیا گیا ہے۔آپ کے معجزات دو قسم کے ہیں۔بعض مقامات پر مسیحؑ کی اپنی زبان سے ان کے معجزات ذکر کیے گئے ہیں اور بعض آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے معجزات کو ذکر فرمایا ہے۔آپ کے معجزات کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ وہ مٹی سے پرندہ کی شکل بناتے، اس میں پھونک مارتے تو اذنِ خدا سے وہ اصلی پرندہ بن جاتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ (آل عمران:۴۹)

نیز فرمایا:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔــةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ (المائدہ: ۱۱۰)

۲۔ مادرزاد نابیناؤں کو شفا دیتے تھے۔

۳۔ برص کی بیماری میں مبتلا افراد کو ٹھیک کر دیتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وابری الاکمہ والابرص و تبرئ الاکمہ والابرص باذنی

۴۔ اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے:''واحی الموتی باذن الله''، نیز''واذ تخرج الموتی باذنی''

۵۔ لوگ جو کچھ کھاتے اور گھروں میں ذخیرہ کرتے تھے حضرت مسیحؑ اس کے بارے میں بتا دیتے تھے:

وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم

حضرت مسیحؑ کے ایسے معجزات ودلائل تھے جن کو دیکھ کر بنی اسرائیل کو ان پر ایمان لے آنا چاہیے تھا لیکن سوائے چند افراد کے اس ضدی وہٹ دھرم قوم نے دینِ مسیحؑ کو قبول نہ کیا۔

آخرِ بحث میں ہم اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر دیں کہ مشہور اختلاف یہ ہے کہ کیا معجزہ فعلِ خدا ہے یا خود پیغمبر کا فعل ہے؟ جب ہم ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں حضرت مسیحؑ کے معجزات کو بیان کیا گیا ہے تو چاہے خود حضرت مسیحؑ نے اپنے معجزے بیان کیے ہوں یا اللہ

نے ان کا تذکرہ کیا ہو، دونوں صورتوں میں فعل کی نسبت حضرت مسیحؑ کی طرف ہی دی گئی ہے، جیسے کہا ''میں شفا دیتا تھا''، ''میں مردے زندہ کرتا تھا''، یا اللہ نے کہا ''تم بیماروں کو شفا دیتے تھے''، ''تم مردے کو زندہ کرتے تھے''۔ یہ آیات شاہد ہیں کہ معجزہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے، اگرچہ اذنِ خدا کے سایہ میں ہو۔ یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ انبیاء کے ہاتھ پر صرف وہ خارق العادۃ کام ظاہر ہوتا ہے، فعل خدا کا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ انبیاء معجزات کی نسبت صرف دیکھنے والوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ معجزہ کے انجام میں ان کی کلیدی حیثیت ہوتی ہے اور فلسفی بحثوں میں جو کچھ نفوسِ قدسیہ کے بارے میں کہا گیا ہے اسی حقیقت کا بیان ہے، یعنی نفس کمال حاصل کر کے ایسے مرتبہ پر پہنچ سکتا ہے کہ کائنات میں تصرف و خلقت کر سکتا ہے اور خدا کی صفت خالقیت کے لیے مظہرِ خاص بن سکتا ہے۔

استاد بزرگوار مرحوم علامہ طباطبائی صاحب تفسیر المیزان، سورہ غافر کی آیت ۷۸ (☆) وما کان لرسول ان یاتی بایۃ الا باذن اللہ کی تفسیر کے ذیل میں اسی مطلب پر استدلال فرماتے تھے کیونکہ اس آیت میں بھی معجزہ لانے کی نسبت خود پیغمبر کی طرف دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: ''ان یاتی بایۃ'' جن لوگوں کو اللہ کے مقرب بندوں کے بارے میں صحیح معرفت حاصل نہیں ہے وہ اس قسم کے نظریات کو غلو سمجھتے ہیں، حالانکہ اگر نظریات کا معیار ظواہر قرآن ہوں تو ان ظواہر کے خلاف ہر قسم کا نظریہ قرآن سے دوری شمار ہوگا۔ ہم اس موضوع پر اس سے پہلے مفصل بحث کر چکے ہیں۔ [1]

---

[1] منشور جاوید، ج ۵، ص ۱۷۷

(۵) بنی اسرائیل میں تبلیغ

دوسرے انبیاء کی طرح حضرت مسیحؑ نے بھی اپنی شریعت کی تبلیغ کی اور قرآن نے ان کی گفتگو کو ذکر کیا ہے۔ان کی تبلیغ کے مقابلہ میں اُن کی امت نے بھی ردِعمل ظاہر کیا، جسے دوسری آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔اس بارے میں آنے والی آیات کا بیان درج ذیل ہے:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾ (المائدہ: ۱۴)

۲۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾

۳۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ (المائدہ: ۷۸، ۷۹)

۴۔ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

آیات کا ترجمہ

۱۔ان میں سے وہ جنہوں نے کہا کہ ہم نصرانی ہیں ہم نے ان کے ساتھ مضبوط پیمان باندھا۔ جو کچھ انہیں سمجھایا گیا تھا اس میں سے زیادہ کو انہوں نے بھلا دیا۔ پس ہم نے بھی ان میں قیامت تک کے لیے دشمنی و بغض ڈال دیا۔عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے بارے انہیں بتلائے گا۔

۲۔بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤدؑ و عیسیٰ ابن مریم کی طرف سے لعنت کی گئی۔ یہ حکم الٰہی میں اُن کی نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے تھے۔

۳۔وہ جن برائیوں کو انجام دیتے تھے باوجود روکنے کے رکتے نہیں تھے۔ وہ کیسے بُرے کام کرتے

تھے۔

۴۔(اے مسیحؑ) یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل کو تمہاری ایذا یا قتل سے باز رکھا جب تم ان کے پاس روشن دلیلیں لائے، کافروں نے کہا کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا جادو۔

آیات کی موضوعی تفسیر

آیات کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے لفظ ''نصاریٰ'' کے بارے میں مختصر وضاحت کر دینا ضروری ہے۔حضرت مسیحؑ کے پیروان کو نصاریٰ کہا جاتا ہے۔یہ لفظ قرآن مجید میں تیرہ مرتبہ آیا ہے۔نصاریٰ، نصرانی یا نصری کی جمع ہے، ناصرہ کی طرف نسبت ہے جو فلسطین کے قریب ایک بستی کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت بتائی جاتی ہے۔لہٰذا انہیں کبھی ناصری عیسائی یا جلیلی عیسائی بھی کہا جاتا ہے (جلیل بھی فلسطین کے قریب ایک شہر ہے) [1]

آیاتِ قرآنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کا طریقۂ تبلیغ قرآن میں کم بیان ہوا ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت عیسیٰؑ لوگوں کو صلح و سلامتی، آخرت کی طرف توجہ اور دنیا سے روگردانی کی تبلیغ کرتے تھے اور انہیں دنیوی مال و متاع کی خاطر جنگ و جدال سے روکتے تھے۔لیکن انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی اکثر باتوں کو بھلا دیا جس کی وجہ سے ان میں قیامت تک جنگ و نزاع نے راہ پالی۔ان کا یہ تلخ انجام تعلیماتِ الٰہی سے انحراف کی وجہ سے واقع ہوا ہے۔

پہلی آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ؀ (المائدہ: ۱۴)

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک عہد و پیمان لیا تھا۔وہ پیمان کس چیز کے بارے میں تھا، آیت میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ممکن ہے یہ پیمان توحید و استقامت کے بارے میں ہو کیونکہ پہلی آیت میں حضرت موسیٰؑ کے توسط سے بھی بنی اسرائیل سے پیمان لینے کا بیان کیا گیا ہے، جہاں فرمایا:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ (مائدہ: ۱۲)

یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں آیات میں پیمان توحید کے علاوہ انبیاء کی اطاعت و فرمانبرداری سے متعلق ہو۔تمام موارد میں کیونکہ اسی آیت

---

[1] اعلام القرآن، ص ۶۶۱

میں جو بنی اسرائیل کے بارے میں ہے نماز، زکوٰۃ اور انبیاء پر ایمان ونصرت کا ذکر بھی ہوا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ [1] وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (مائدہ: ۱۲)

یعنی اللہ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، انبیاء پر ایمان لائے ان کی مدد کی اور اللہ کو قرضِ حسنہ دیا۔ اس صورت میں تمہاری غلطیاں معاف کر دوں گا''۔

بہرکیف بنی اسرائیل نے دونوں مقام پر یعنی حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں بھی پیمان شکنی کی اس آیت میں اور اس سے پہلے والی آیت میں ان کی انہی پیمان شکنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیت بتلاتی ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے دین کو نہیں چھوڑیں گے، قیامت تک اپنے دین پر باقی رہیں گے اور یہ کہ حضرت امام زمانہ عجل اللہ فرجہ کے دور میں بھی یہ مذاہب محو نہیں ہو جائیں گے بلکہ حضرت کی حکومت میں یہ لوگ جزیہ کی شرائط پر عمل کرتے ہوئے ذمیوں کی زندگی بسر کریں گے۔

اسی طرح آیت نے یہ حقیقت ذکر کی ہے کہ قیامت تک نصاریٰ میں آپس میں بغض وعداوت باقی رہے گی۔ یہ بات درست ہی ہے کیونکہ آج تک مسیحی فرقوں میں جنگیں ہوئی ہیں جیسے دو عالمی جنگیں ہو چکی ہیں جن میں لاکھوں انسان مارے گئے، اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اگر اس مذہب میں کبھی اتحاد ہوتا بھی ہے تو یہ جغرافیائی اتحاد ہوتا ہے نہ کہ مذہبی، جب کہ یہ اتحاد بھی زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوتا۔

بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کی وجہ سے یہ جماعت ہمیشہ انبیاء کی طرف سے لعنتی قرار پاتی رہی ہے۔ اس آیت نے ان پر حضرت داؤدؑ و حضرت عیسیٰؑ کی لعنت کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ اس حد تک بُرے لوگ تھے کہ اگر صالح لوگ انہیں ان کی برائیوں سے روکتے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ

---

[1] اغراء کے معنی کس کو کسی کام کی ترغیب وتشویق دلانا ہے۔ یہاں اغراءِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ اپنے غلط کاموں کی وجہ سے وہ جنگ وجدال میں مبتلا ہوئے۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا نے انہیں اس پر وادار کیا ہو۔

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ (المائدہ: ۷۸، ۷۹)

بالآخر قرآن مجید ان کی ہٹ دھرمی و دشمنی کی خبر دیتا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کی اذیت یا قتل کی سازش کی۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے معجزات کو سحر و جادو قرار دیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

بِإِذْنِيْ ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

مجموعی طور پر ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت مسیحؑ کی تبلیغ کے مقابلہ میں منفی ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ مثلاً

الف۔ حضرت مسیحؑ سے اللہ کے عہد و پیمان کو بھلا دیا۔

ب۔ برائی و گناہ میں اس حد تک دھنس چکے تھے کہ کسی کی تبلیغ اُن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔

ج۔ حضرت مسیحؑ کے قتل و آزار کے درپے ہوئے۔

د۔ ان مخالفتوں کی وجہ سے حضرت مسیحؑ نے ان پر لعنت کی اور وہ صلح و محبت کی بجائے جنگ و دشمنی میں مبتلا ہو گئے۔

(٦) حضرت عیسیٰؑ ۔۔۔۔ان کے حواری اور مائدہ (دسترخوان) کا نزول

قرآن مجید نے ایک جماعت کو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ان کے بارے میں کچھ آیات وارد ہوئی ہیں جو سرگذشت عیسیٰؑ میں بذاتِ خود ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ہم پہلے ان آیات اور ان کے ترجمہ کو بیان کرتے ہیں۔

موضوع سے متعلق آیات

١۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٥٢﴾

٢۔ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ (ال عمران: ٥٢، ٥٣)

٣۔ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿١١١﴾

٤۔ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١١٢﴾

٥۔ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿١١٣﴾

٦۔ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿١١٤﴾

۷۔ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ (المائدہ: ۱۱۱ تا ۱۱۵)

۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ (الصف: ۱۴)

آیات کا ترجمہ

۱۔ جب عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کا کفر محسوس کیا تو کہا کہ اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے، تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں (اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرتے ہیں)

۲۔ پروردگار! جو کچھ تو نے نازل کیا ہم اس پر ایمان لائے اور تیرے رسول کی اتباع کی۔ ہمیں شاہدین میں شمار فرما۔

۳۔ یاد کرو جب ہم حواریوں کو الہام کیا کہ ہم پر اور ہمارے رسول پر ایمان لاؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔

۴۔ حواریوں نے عیسیٰؑ ابن مریمؑ سے کہا کہ کیا تمہارا پروردگار ہم پر آسمان سے کھانے کا دسترخوان نازل کرسکتا ہے؟ حضرت مسیحؑ نے کہا کہ اگر مومن ہو تو اللہ کی مخالفت سے ڈرو۔

۵۔ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس دسترخوان سے کھانا کھائیں، ہمارا دل مطمئن ہوجائے، ہمیں معلوم ہوجائے کہ تم نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس پر شاہد رہیں۔

۶۔ عیسیٰؑ ابن مریمؑ نے اللہ سے درخواست کی اور عرض کیا کہ خدایا! آسمان سے دسترخوان نازل فرما تا کہ ہمارے آغاز و انتہا کے لیے عید ہوجائے اور تیری طرف سے نشانی ہو۔ ہمیں رزق عطا

فرما کہ تو بہترین رزق دینے والا ہے۔

۷۔ اللہ نے فرمایا میں دسترخوان تم پر بھیجوں گا۔ اس کے بعد جس نے کفر کیا میں اسے ایسا عذاب کروں گا جیسا میں نے عالمین میں سے کسی پر نہ کیا ہوگا۔

۸۔ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے دوست بن جاؤ جیسا کہ عیسیٰؑ نے حواریوں سے کہا کہ کون ہے جو راہِ خدا میں میرا مددگار ہو، تو حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں خدا کے مددگار۔ بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لے آیا اور ایک گروہ نے کفر کیا۔ ہم نے اُن کی مدد و تائید کی جو ایمان لائے تھے، ان کے دشمنوں کے خلاف، اور وہ اپنے دشمنوں پر غالب آ گئے

آیات کی موضوعی تفسیر

آیات کی تفسیر سے پہلے کچھ الفاظ کی تشریح ضروری ہے جو ہم بیان کرتے ہیں:

۱۔ **حواریون**: یہ حواری کی جمع ہے اور حور کی طرف منسوب ہے جس کے معنی انتہائی سفیدی کے ہیں۔ لیکن لغت کی ترقی کے سلسلہ میں یہ کلمہ انسان کے خاص دوستوں اور ساتھیوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ البتہ قرآن مجید میں حضرت مسیحؑ کے ساتھیوں کے علاوہ کسی کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ اب یہ لغت کی ترقی اور تغیر و تبدل کس طرح ہوا، اس بارے میں مجمع البحرین منفہ طریحی کی طرف رجوع کیا جائے۔ [1]

۲۔ **مائدہ**: یہ کلمہ لغت میں غذا کی ظرف یعنی دسترخوان کو کہا جاتا ہے اور کبھی خود غذا کو بھی مائدہ کہا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں محورِ بحث صرف دو چیزیں ہیں:

۱۔ حضرت مسیحؑ جب معجزات و دلائل کے ساتھ اپنی قوم کی طرف آئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ لوگ ان کے مقابلہ میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کریں گے تو انہوں نے کہا کہ مومن اگرچہ تھوڑے ہی ہوں مخالفوں سے جدا ہو جائیں۔ اس وجہ سے اُن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ راہِ خدا میں میرے مددگار کون لوگ ہیں؟ میرے مددگار اگر میرے دین کی پیروی پر آمادہ ہیں تو اس کا اعلان کر دیں۔

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تبلیغی سفر میں جب حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حواری بھی تھے، کھانا افراد کے اعتبار سے کافی نہیں تھا۔ لہٰذا حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے آسمانی کھانے کی درخواست کی اور حضرت عیسیٰؑ کی دعا کے نتیجہ میں آسمان سے دسترخوان نازل ہوگیا۔

آئندہ صفحات میں ہم انہی دو محوروں پر آیات کی تفسیریں کریں گے:

---

[1] مجمع البحرین مادۂ حور

ا۔ مومنوں کا کافروں سے جدا ہونا

حضرت مسیحؑ نے بنی اسرائیل کی ہدایت کی خاطر جس حد تک ہوسکا تبلیغ کی اور اس بارے میں اپنا مقام ومرتبہ بھی واضح کیا لیکن اکثر بنی اسرائیل نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے جب ان کے انکار کو محسوس کیا تو سوچا کہ بہتر ہے کہ حقیقی مومنوں کو کافروں سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اس موقعہ پر حواریوں نے نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کا اعلان کیا بلکہ اُن سے چاہا کہ ان کے ایمان کی گواہی بھی دیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آل عمران ۵۲، ۵۳)

اس آیت میں "فاکتبنا مع الشھدین" کے معنی یہ ہیں کہ خدایا ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو گواہی دیتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے تبلیغ کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ پس حواری حضرت عیسیٰؑ کی تبلیغ پر شاہدین میں سے ہیں۔

ایک اور آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انبیاء کی امتوں میں سے بھی سوال کرے گا کہ کیا ان کے نبی نے اپنی تبلیغی ذمہ داری پوری کی تھی یا نہیں؟ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (اعراف: ۶)

ظاہر ہے کہ اس سوال کے بارے میں مومنین مثبت جواب دیتے ہوئے نبی کی تبلیغ کو گواہی دیں گے۔ حواری بھی اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی تبلیغ پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں گے۔ لہٰذا انہوں نے حضرت عیسیٰؑ سے درخواست کی کہ انہیں شہادت دینے والوں میں شمار کریں۔ مندرجہ بالا آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے ان سے کہا کہ مومن کفار سے جدا ہو جائیں تو خدا نے اُن کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اپنے ایمان کو ظاہر کریں اور علی الاعلان حضرت مسیحؑ کے دین وتبلیغ کی پیروی پر شہادت دیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ (المائدہ: ۱۱۱)

اس آیت کا مضمون پہلی آیت کے بالکل موافق ہے جہاں فرمایا: "فاکتبنا مع الشھدین" دراصل ان کی ایمان کی درخواست اُن کی ابتدائے زندگی سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ حضرت عیسیٰؑ کے اس مطالبہ کے بعد ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ مومن کافروں سے جدا ہو جائیں اور اپنے ایمان کو ظاہر کریں۔

اور آیت میں بھی حضرت مسیحؑ کے اس مطالبہ کا ذکر ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلامؐ سے بھی یہی فرمایا ہے کہ آپ بھی مسیحؑ کی طرح مومنین سے پوچھیں گے کہ راہِ خدا میں میرا مددگار کون ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (الصف: ۱۴) [۱]

اس آیت میں خطاب اگر چہ حواریوں سے ہے لیکن اس خطاب کا نتیجہ تمام بنی اسرائیل کو شامل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اسی آیت کے ذیل میں حواریوں کی حالت بیان کرتے ہوئے تمام بنی اسرائیل کی حالت کو بھی واضح کیا گیا ہے اور ان کو دو گروہوں (مومن، کافر) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پس اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ خطاب کا نتیجہ حواریوں کے لیے خاص نہیں ہے۔

اب یہ سوال کہ خطاب صرف حواریوں سے کیوں ہوا تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مخاطب قرار پانے کے لیے ان میں زیادہ شائستگی پائی جاتی تھی اور حضرت مسیحؑ بھی جانتے تھے کہ وہ لوگ ان کے سوال کا مثبت جواب دیں گے۔ علاوہ ازیں ان کا ممتاز رتبہ موجب تھا کہ ان کا فیصلہ دوسروں کی بہتر رہنمائی کر سکے۔

۲۔ مائدہ آسمانی کی درخواست

اگر چہ حواری حضرت عیسیٰؑ پر پورا ایمان رکھتے تھے لیکن ایمان میں مزید تقویت و اضافہ کی خاطر انہوں نے حضرت مسیحؑ سے درخواست کی کہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے اُن کے لیے ایک دسترخوان نازل فرمائے۔ اس معجزہ کی درخواست اس خاطر نہیں ہے کہ انہیں حضرت مسیحؑ کی نبوت میں شک یا تردد تھا، بلکہ ایمان کے درجات میں اضافہ کی خاطر ایسا سوال کیا گیا تھا کیونکہ انسان جتنا بھی کسی مطلب پر ایمان رکھتا ہو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس مطلب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ قیامت اور مردوں کے زندہ ہونے پر کامل ایمان رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ انہیں مردوں کا زندہ ہونا دکھا دے۔ جب اللہ نے پوچھا کیا ابھی تک مردوں کے زندہ ہونے پر تیرا ایمان پختہ نہیں، تو انہوں نے جواب دیا ایسا نہیں بلکہ بہتر اطمینان کی خاطر دیکھنا چاہتا ہوں۔ "ولکن لیطمئن قلبی" [۲]

---

[۱] یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے کہ یہ تشبیہ درست نہیں کیونکہ پیغمبرِ اسلامؐ سے متعلق حصہ میں حکم ہوا ہے کہ خدا کے ناصر بن جاؤ، جب کہ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں ہے کہ سوال کیا حضرت عیسیٰؑ نے کون ہے میرا ناصر؟ تشبیہ تب صحیح ہوتی جب دونوں جگہ پر امر ہوتا یا دونوں جگہ پر حکم ہوتا جب کہ یہاں مشبہ میں امر اور مشبہ بہ میں سوال ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں بھی امر ہے جو محذوف ہے: یعنی اے ایمان والو خدا کے مددگار بن جاؤ! اس صورت میں تشبیہ درست ہوجائے گی یعنی امر کی امر کے ساتھ تشبیہ ہوگی۔

[۲] البقرہ: ۲۶۰

حواریوں کی حضرت عیسیٰؑ سے آسمانی مائدہ کی درخواست بھی اسی طرح کی تھی۔ان کی گفتگو میں بھی ''وتطمئن قلوبنا'' (☆) کی تعبیر وارد ہوئی ہے،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴿۱۱۲﴾ (المائدہ:۱۱۲)

ہم پہلے بھی اس جملہ ''ان کنتم مومنین'' کی تفسیر کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ یہ جملہ ایمان کی استقامت کو بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایمان لے آئیں اور عذاب سے ڈریں۔حضرت مسیحؑ کے جواب سے ظاہر ہوتا تھا کہ حواری ابھی تک ایمان میں متردد ہیں،لہٰذا انہوں نے اپنے مقصود کی وضاحت کی اور کہا کہ دسترخوان کے نزول کی درخواست انہوں نے درج ذیل چند امور کی خاطر کی ہے:

۱۔ وہ آبادی سے بہت دور تھے اور اثنائے سفر میں انہیں کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بھوک مٹانے کے لیے ایسی درخواست کی، جیسا کہ ارشاد ہے: ''نریدان ناکل منها''

۲۔ ایمان میں اضافہ اور مزید اطمینان کی خاطر یہ درخواست کی گئی: ''وتطمئن قلوبنا''

۳۔ جزم و یقین حاصل ہو جائے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے نبی ہیں اور جو کچھ چاہتے ہیں اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ''ونعلم ان قدصدقتنا''

۴۔ اس معجزہ کو دیکھ کر ہم حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و تبلیغ پر شاہد ہو جائیں گے۔

اگرچہ حواریوں نے حضرت مسیحؑ سے بہت سے معجزات دیکھے تھے لیکن اس معجزہ کی خصوصیت کی وجہ سے گواہی کو اس معجزہ کے ساتھ ذکر کیا۔بعد والی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ سے مائدہ آسمانی کی خواہش اس لیے کی کہ حضرت عیسیٰؑ دعا کریں اور دسترخوان نازل ہو تا کہ اُن کی نبوت و رسالت پر یہ ایک جداگانہ دلیل بن جائے۔حضرت عیسیٰؑ نے بھی ان کی درخواست سے یہی مطلب سمجھا،لہٰذا بارگاہِ خدا میں عرض کیا کہ خدایا ہم پر آسمان سے کھانے کا دسترخوان نازل فرما تاکہ مندرجہ بالا چار نتائج کے علاوہ دو اور نتیجے بھی حاصل ہو سکیں۔

الف۔ یہ دن حاضرین اور آنے والوں کے لیے عید کا دن ہو جائے،یعنی میری امت اس دن کو بطور عید منائے گی۔

ب۔ تیری طرف سے یہ ایک نشانی ہو جائے تاکہ اس طرح لوگوں کے دل تیری توحید اور میری نبوت کی طرف مائل ہوں۔

اس دعا کے آخر میں اللہ کی ایک صفتِ جمال میں ''خیر الرازقین'' کا واسطہ دیا،ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴿۱۱۴﴾

(مریم: ۱۱۴)

قرآنی دعاؤں میں اس دعا کی ترکیب ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کو اللھم ربنا" سے شروع کیا گیا جب کہ دوسری تمام دعائیں صرف "ربنا" سے شروع ہوتی ہیں۔ اللھم ربنا کے ذریعہ زیادہ رحمتِ خدا کو جذب کیا جا سکتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ چونکہ حضرت مسیحؑ کے شاگردان کے روشن معجزے پہلے دیکھ چکے تھے۔ ایسی صورت حال میں دوبارہ معجزہ کا مانگنا مقامِ ایمان واخلاص کے لیے مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے اس کے نتائج ان کے حق میں اچھے نہ نکلتے۔ پس حضرت مسیحؑ کو مجبوراً مکمل احتیاط کے ساتھ ایسے کلمات استعمال کرنا پڑے جن کے ذریعے بیشتر رحمتِ خدا کو حاصل کیا جا سکے۔

اس آیت سے ایک دوسرے نکتے کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر کسی صورتِ حال میں امت کو خدا کی عظیم رحمت شامل حال ہو جائے تو اس دن کو باقاعدہ عید کا درجہ دیا جانا چاہیے جیسا کہ حضرت مسیحؑ نے دسترخوان کے یومِ نزول کو اپنی امت کے لیے عید کا دن قرار دیا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو امتِ اسلامیہ کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی ولادت یا بعثت کا دن جس میں خدا کی طرف سے معنوی دسترخوان نازل ہوا ہو، عید شمار ہونا چاہیے کیونکہ ان دونوں کے فوائد حواریوں کے دسترخوان سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

لہٰذا دعا میں اللہ تعالیٰ کو اس نام سے پکارنا چاہیے جو دعا سے مطابقت رکھتا ہو۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعا کے لیے مناسب لفظ ''خیر الرازقین'' ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ "ارحم الراحمین"، "جبار"، "منتقم" جیسی صفات کے بجائے "خیر الرازقین" کی صفت ذکر ہوئی خصوصاً جب کہ عرفاء کہتے ہیں کہ خدا کا ہر اسم ایک خاص تجلی رکھتا ہے اور وہ اسم اس تجلی کے ساتھ خاص رابطہ رکھتا ہے۔

حضرت مسیحؑ کی دعا مستجاب ہوگئی اور اللہ نے مائدہ کے نزول کا وعدہ فرمالیا، لیکن ساتھ ہی اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ بھی کر دیا کہ اس جیسے معجزے دیکھ کر بھی اگر کسی نے تیرے دین سے کفر کیا تو اسے ایسے سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا جس کی دنیا میں مثال نہیں ملتی ہوگی کیونکہ اتنے معجزے دیکھ کر کفر کرنا کسی شخص کی طینت کی پلیدی اور باطنی خبث وخباثت پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ (المائدہ:۱۱۵)

مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ مائدہ نازل ہوا یا حواری یہ بات سننے کے بعد اپنی درخواست سے منحرف ہوگئے، آیت کے ظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ دسترخوان واقعی نازل ہوا کیونکہ فرماتا ہے "انی منزلھا علیکم"

یہاں ایک لغوی مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ انزال وتنزیل کے معنی میں فرق ہے۔ انزال ایک ہی دفعہ نزول کو کہتے ہیں اور تنزیل تدریجاً نزول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، بلکہ آیت سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں کیونکہ درخواست میں حضرت مسیحؑ نے "ربنا انزل" کہا اور خدا نے جواب میں "انی منزلھا" فرمایا:

لا اعذبہ میں ضمیرہ منصوب بنزع الخافض ہے، یعنی اصل میں یہ ضمیر مجرور ہے۔ اصل "لا اعذب بہ" ہے، ضمیر حذف کر کے منصوب

کردی گئی۔اس ضمیر کا مرجع عذاب ہے،اسم مصدر کے معنی میں،یعنی میں نے کسی کو اس عذاب کی طرح کا عذاب نہ کیا ہوگا!

آیات کی تفسیر و بیان کے بعد چند نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔حواریوں کے نام

حواری حضرت مسیحؑ کے وہ خاص شاگرد تھے جو ان پر پختہ ایمان رکھتے تھے اور انہوں نے مسیحؑ کی غیبت کے بعد ان کے دین کو پھیلایا۔ان کے نام یہ ہیں:

۱۔شمعون پطرس، ۲۔اندریاس (شمعون کا بھائی)، ۳۔یعقوب، ۴۔یوحنا (یعقوب کا بھائی)، ۵۔فیلسیوس، ۶۔برتونما، ۷۔لوقا، ۸۔متی (اس کا دوسرا نام لاوی بھی ہے)، ۹۔شمعون غیور، ۱۰۔یسبوس (یہودا)، ۱۱۔یعقوب صغیر، ۱۳۔یہودا اسخر یوطی[1]

۲۔حواریوں کا تعارف بزبان قرآن مجید

قرآن مجید نے حواریوں کا تعارف مکمل الٰہی انسانوں کے طور پر کرایا ہے، بلکہ قرآن مجید نے سورۂ صف میں حواریوں کا تذکرہ ہی اس خاطر کیا ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ میں شوق پیدا ہو کہ وہ حواریوں کو اپنے لیے نمونہ عمل بنائیں۔اس سے بہتر تعریف اور کیا ہوسکتی ہے کہ فرمایا ہم نے ان پر وحی کی:

وَاِذۡ اَوۡحَیۡتُ اِلَی الۡحَوَارِیّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِیۡ وَبِرَسُوۡلِیۡ ۚ (مائدہ:۱۱۱)

یقیناً یہ وحی فرشتہ کے ذریعے تو نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے ذہن و روح میں ایک الہام تھا جب تک انسان میں باطنی طہارت اور روحانی پاکیزگی نہ ہوگی وہ معرفتِ الٰہی کی تجلی گاہ نہیں بن سکتا۔دوسری آیات بھی ان کے عظیم مقام و مرتبہ کا پتہ دیتی ہیں،لیکن اس بارے میں کتبِ عہدین کی طرف رجوع کیا جائے تو ان کے بارے میں مختلف و نقیض باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔چند مختصر جملے جو قاموس کتابِ مقدس کے مؤلف نے لکھے ہیں ان سے ایک عظیم مقام کا پتہ چلتا لیکن عہدِ جدید میں کچھ باتیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو اس کے خلاف مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔ہم یہاں دونوں قسم کی باتوں کو نقل کرتے ہیں۔

حواریوں کے بارے میں کتاب مقدس کا نظریہ

کتابِ مقدس کے مولف نے حواریوں کی شخصیت کے بارے میں جو گفتگو کی ہے ہم اپنے قارئین کے لیے اسے نقل کرتے ہیں،وہ لکھتا ہے:

حواری حضرت مسیحؑ کے خاص شاگرد تھے جو اُن کے جلال و عظمت پر شاہد تھے۔مسیحؑ نے انہیں اپنی انتہائی قوت سے انتخاب کیا اور

---

[1] انجیل متی باب ۱۰ چاپ لندن ۱۸۳۷ زیر نظر بائیبل سوسائٹی کرٹزم اور قاموس کتاب مقدس، ص ۴۱۴، مادۂ سول

انہیں اپنی روح سے بھر دیا تھا اور اپنی خاص تعلیمات و خدمات ان کے سپرد کیں۔ ظاہر ہے کہ حواریوں کا یہ منصب اُن کی زندگی کے خاتمہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوا اور ان کے نمائندوں کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

حواری عام اور ان پڑھ لوگ تھے جنہیں دوسرے لوگوں میں سے منتخب کیا گیا تھا۔ دعوت اور مکمل دستور العمل دیئے جانے کے بعد انہوں نے اپنے مقدس والٰہی رہنما کی پیروی کی۔ وہ اس کے اعمال و کردار کو دیکھ کر ہمیشہ اس کی روح سے شرمسار ہوتے رہے اور آہستہ آہستہ حقائق و انجیل کی تعلیمات کو درک کرتے رہے۔ مسیحؑ نے اپنے قیام کے بعد انہیں پوری دنیا کو تبلیغ و وعظ کی ذمہ داری سونپ دی اور انہیں معجزہ و خارق العادۃ کام کے اظہار کی قدرت بھی بخش دی۔ البتہ معجزات و خارق العاوت کاموں کے لحاظ سے سب حواری برابر تھے، کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں تھی، اور نہ ہی ان میں سے کسی نے ایسا دعویٰ کیا۔ البتہ اُن میں کوئی بھی یونس جتنی قوت و فعالیت نہیں رکھتا تھا۔

حواریوں نے رسالتِ مسیحؑ کو سمجھنے میں تدریجاً ترقی کی، یہاں تک کہ سب کے سب افاضہ رُوح کی منزل پر فائز ہوگئے۔

کتاب اعمال حوارین میں ان بارہ آدمیوں کا لذاتِ دنیوی سے انکار، ان کی دین مسیحؑ کی راہ میں زحمتیں اٹھانا جس میں وہ حضرت مسیحؑ کے مشابہ تھے، اُن کے افعال جو حضرت اقدسِ الٰہی کے ارادہ کے تابع تھے اور ان کی اللہ تعالیٰ سے خالص محبت بطور تفصیل مذکور ہے۔ انہوں نے اپنی غیرت و محبت، جو حضرت مسیحؑ کی مرضی کے مطابق تھی، کے ساتھ اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا کہ وہ ہمیں تعلیم دیں۔ [1]

حواریوں کے عہدہ جدید کا دوسرا رخ

مندرجہ بالا جملات کے مقابلہ میں عہدِ جدید نے ان کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی لکھی ہیں جو اس تعریف و توصیف کے بالکل برعکس ہیں جسے دیکھ کر انسان یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کسے تسلیم کرے اور کسے نہ کرے۔ مثلاً انجیل متی جس نے ایک جگہ پر حواریوں کو صاحب کرامت اور مریضوں کو شفا دینے والا لکھا ہے، دوسری جگہ یہودا اسخر یوطی کے بارے میں لکھتی ہے کہ اس نے اپنا دین دنیا کے بدلے بیچ ڈالا۔ اس نے صرف تیس درہم کے عوض مسیحؑ کو یہودیوں کے حوالہ کر دیا، بالآخر پشیمان ہوا، اپنے آپ کو پھندے پر لٹکا لیا اور مر گیا۔ اس سلسلہ میں انجیل متی کی عبارت اس طرح ہے:

جب صبح ہوگئی تو اس قوم کے بزرگوں اور کاہنوں کے روسا نے عیسیٰؑ کے بارے میں صلاح و مشورہ کیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ پس انہوں نے انہیں جکڑ کر باہر کھینچا اور پنطیوس پیلاطس نامی بادشاہ کے حوالہ کر دیا۔ پھر جب یہودا نے چاندی کے تیس ٹکڑے ان کاہنوں اور بڑوں کے رئیس کو واپس کر دیئے اور کہا کہ میں نے غلطی کی ہے کیونکہ میں نے بے گناہ خون کو تمہارے حوالے کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا

---

[1] مقدس کتاب قاموس نے ص ۴۱۴ ص ۴۱۵ پر ان جملوں کے مکمل حوالے، جو اس نے انجیل متی، لوقا، یوحنا اور عہدِ جدید کی تمام کتابوں، مانند کتاب اعمالِ رسول، کتاب اول قرنشیان، کتاب اول تسالونیکیان وغیرہ سے نقل کیے ہیں، لیکن چونکہ موجودہ کلیسا اس کتاب کو مانتا ہے لہٰذا ہمیں دوسرے حوالوں کی ضرورت نہیں۔

کام، تم خود جانو! اس کے بعد اُس نے وہ ٹکڑے ہیکل میں پھینک دیئے، واپس لوٹ گیا اور اپنا گلا گھونٹ لیا۔[1]

چور حواری!

اس حواری (یہودا) نے نہ صرف یہ گل کھلائے کہ بے گناہ حضرت عیسیٰؑ کو ظالم یہودیوں کے حوالے کر دیا بلکہ وہ اس سے پہلے بھی کسی اچھے کردار کا مالک نہیں تھا۔ کبھی چوری چکاری بھی کر لیتا تھا۔ انجیل یوحنا اس کے بارے میں لکھا ہے:

''عید فصح سے چھ دن پہلے حضرت عیسیٰؑ بیت عنیہ میں لغادر مروہ، جسے حضرت عیسیٰؑ نے مردوں سے زندہ کیا تھا، کے مکان کی طرف گئے۔ وہاں حضرت عیسیٰؑ کے لیے انہوں نے کھانا تیار کیا۔ مرثا ان کی خدمت کرتا تھا اور لغادر ان کا ایک ہمنشین تھا۔ حضرت مریمؑ نے ایک رطل قیمتی عطر خریدا اور حضرت عیسیٰؑ کے پاؤں پر ملا، پھر اُن کے پاؤں کو اپنے بالوں سے خشک کیا اور پورا گھر اس عطر کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اس کے بعد ان کے ایک شاگرد یعنی یہودا اسخر یوطی ابن شمعون نے جس نے بعد میں حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ خیانت کی، کہا کیوں نہ یہ عطر تین سو دینار میں بیچ دیں اور یہ رقم غریبوں پر خرچ کریں۔ اس کا یہ کہنا اس خاطر نہ تھا کہ وہ غریبوں کا حامی تھا اور ان کے بارے میں سوچتا تھا بلکہ اس نے یہ اس لیے کہا تھا کہ وہ خود چور تھا، تھیلیاں اٹھا لیتا تھا اور ان میں جو کچھ ہوتا اُسے لے جاتا تھا''[2]

مسیح کی گرفتاری اور حواریوں کی گہری نیند!

مسیحؑ نے اپنی گرفتاری کی رات حواریوں کو حکم دیا تھا کہ بیدار رہیں، لیکن وہ اس کے حکم کے خلاف گہری نیند سو گئے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ نے کچھ نماز پڑھی اور پھر ان کے پاس آئے تو سب کو سوتے پایا اور پطرس سے کہا کہ کیا تم لوگ ایک گھنٹہ جاگ نہیں سکتے تھے کہ میرے ساتھ دعا کرتے۔ پھر عیسیٰؑ دوبارہ چلے گئے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ جب دوبارہ لوٹ کے آئے تو پھر سب کو سوتے پایا۔ پھر تیسری مرتبہ لوٹ کر آئے تو حواریوں سے کہا کہ اب سو جاؤ اور آرام کرو۔[3]

حواری نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری کی رات سو گئے بلکہ گرفتاری کے وقت انہیں چھوڑ کر سب فرار ہو گئے۔[4]

ہم ان دو بیانات میں سے کس کو قبول کریں۔ کیا وہ بیان جس نے حواریوں کو انبیاء کے مقام تک پہنچا دیا اور انہیں صاحبِ کرامت و خارق العادت کام انجام دینے والوں کے طور پر ذکر کیا ہے تسلیم کریں، یا دوسرا بیان جس نے انہیں کمزور ایمان اور بزدل ظاہر کیا ہے، یہاں تک کہ ان سے ایسے کام بھی سرزد ہوئے جو ایک عام مومن سے بھی سرزد نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنے رہبر کو تیس درہم کے بدلہ ظالم یہودیوں کے ہاتھ بیچ

[1] انجیل متی، باب ۲۷، جملہ ۱ تا ۵

[2] انجیل یوحنا، باب ۱۲، جملہ ۱ تا ۵

[3] تلخیص از انجیل متی، باب ۲۷، جملہ ۳۶ تا ۴۶

[4] انجیل متی، باب ۲۷، جملہ ۵۷

دیتے ہیں، حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری کے وقت سوجاتے ہیں یا فرار ہوجاتے ہیں، گویا حضرت عیسیٰؑ وہاں نہ تھے یا آئے ہی نہیں تھے۔

مسیحی پیشواؤں کی حضرت عیسیٰؑ سے برائت!

پطرس بھی جو حواریوں کا سردار تھا، دوسرے حواریوں کی طرح گرفتاری کی رات سوگیا اور گرفتاری کے بعد فرار ہوگیا۔ لیکن کچھ دیر بعد اس نے قدرے دلیری دکھائی، دور دور سے مسیحؑ کے پیچھے کاہنوں کے سردار کے گھر پہنچا اور غلاموں کے پاس انجام کار دیکھنے کی خاطر بیٹھ گیا۔ پطرس جب بیرونی ایوان میں بیٹھا تھا تو ایک کنیز نے اس سے پوچھا کہ کیا تو بھی بزرگ عیسیٰؑ کے ہمراہ تھا، تو اس نے سب کے سامنے انکار کردیا اور کہا میں نہیں جانتا تو کیا کہہ رہی ہے۔ اس کے بعد دوسری کنیز نے اسے دیکھا اور کہا کہ یہ شخص بھی عیسیٰؑ ناصری کے ساتھ تھا۔ پطرس نے قسم کھائی کہ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔ کچھ دیر بعد جو لوگ وہاں کھڑے تھے ان میں سے ایک نے پطرس کے پاس آکر کہا کہ تو انہی میں سے ہے۔ تیرا لہجہ تجھے ظاہر کرتا ہے۔ پطرس نے اس وقت لعنت شروع کردی اور قسمیں کھانے لگا کہ میں تو مسیحؑ کو جانتا تک نہیں۔ جب مرغ نے بانگ دی تو اس وقت پطرس کو عیسیٰؑ کی بات یاد آئی کہ تم مرغ کی بانگ سے پہلے تین بار میرا انکار کروگے۔ پس وہ باہر نکل آیا اور زار و قطار رونے لگا۔[1]

پطرس شیطان ہے!

جب حضرت عیسیٰؑ اپنی سرنوشت سے حواریوں کو آگاہ کررہے تھے تو پطرس نے انہیں پکڑ لیا، پہلے انہیں ملامت کی اور پھر کہا کہ خداوند آپ سے دور ہو۔ تجھ پر یہ واقع نہیں ہوگا۔ حضرت مسیحؑ نے جواب میں کہا کہ شیطان دور ہوجا کہ تو میرے لیے صدمہ کا باعث ہو۔ تیری یہ فکر و سوچ الٰہی نہیں بلکہ افسانوی ہے۔[2] یہاں تک کہ ہم نے حواریوں کے بارے میں عہدِ جدید کی متضاد و نقیض باتیں نقل کیں۔ اس صورت حال میں یہ کتاب کیسے اقوام و ملل کے لیے رہنما اور لوگوں کے لیے چراغِ راہ بن سکتی ہے۔

یہیں سے اہل تحقیق پر قرآن حکیم کی عظمت و حقیقت واضح و روشن ہوجاتی ہے کہ قرآن کے علاوہ کوئی آسمانی کتاب بھی تحریف سے بچی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی روایات بھی حواریوں کے بارے میں متفق ہیں۔ سب میں ان کی عظمت اور ایثار کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے اس بارے میں روایات بحارالانوار میں ذکر فرمائی ہیں۔[3]

مائدہ کی حقیقت کیا تھی؟

مائدہ کی حقیقت کے بارے میں قرآن نے کچھ نہیں بتایا، لیکن مختلف روایات اس بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ آیات سے صرف اتنا

---

[1] انجیل متی، باب ۲۶، جملہ ۵۷، ۵۸

[2] انجیل متی، باب ۱۶، جملہ ۲۳ تا ۲۷

[3] بحارالانوار، جلد ۱۴، ص ۲۷۲ تا ۲۸۲

پتہ چلتا ہے کہ یہ بابرکت دسترخوان عالمِ غیب سے نازل ہوا تھا۔ قصص الانبیا مصنفہ عبدالوہاب نجار میں ایک دوسرا نظریہ بیان ہوا ہے جو غالباً اس نے انجیل سے متاثر ہوکر لکھا ہے۔ اس وقت ان کے پاس پانچ روٹیاں اور دو مچھلیاں تھیں یقیناً یہ مقدارِ خوراک ان کے لیے ناکافی تھی۔ لہٰذا انہوں نے صورتِ حال حضرت عیسیٰؑ کو بتائی تو حضرت عیسیٰؑ نے خدا سے دعا کی کہ اس غذا میں برکت دے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے روٹیوں کے ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا سب کو دیا۔ سب نے اسے کھالیا اور سیر ہو گئے۔ [1]

مصنف نے یہ نظریہ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: ''مائدہ کے نزول کا مطلب صرف یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خوراک میں برکت ڈال دی۔ اس کے بعد وہ اُس اعتراض کا جواب دیتا ہے جو جامعہ ازہر کی کمیٹی کی طرف سے اس نظریہ پر کیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ انزل اور نزل کی لفظیں قرآن میں ایسے موارد میں استعمال کی گئی ہیں جن کا عالمِ غیب سے نزول کے ساتھ کوئی تعلق نہیں مثلاً قرآنی اصطلاح میں انزال قضائے الٰہی، خلق کرنا، آمادہ کرنا، بخشنا اور بغیر عادی سبب کے عطا کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح جو کچھ قرآن مجید میں آیا ہے اس مطلب کے مطابق ہے جو انجیل متی میں آیا ہے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ آیات میں تین قرینے اس نظریہ کے خلاف گواہی دیتے ہیں:

۱۔ ''انزال'' کا کلمہ ''من السما'' کے ساتھ استعمال ہوا ہے، حواریوں کی درخواست میں بھی اور حضرت عیسیٰؑ کی درخواست میں بھی۔ فرمایا ہے: ''ان ینزل علینا مآئدۃ من السمآء'' نیز ''انزل علینا مائدۃ من السمآء''۔ ان دو جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ مائدہ مکمل طور پر عالمِ غیب سے تھا۔

۲۔ قرآن میں نزول کا تعلق مائدہ سے ہے جس کے معنی دسترخوان کے ہیں یعنی ایسا دسترخوان بھیج جس میں کھانا ہو اور یہ ان کے اپنے دسترخوان میں موجود کھانے میں برکت دینے سے بہت فرق رکھتا ہے، اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔

۳۔ اللہ نے مسیحؑ کی درخواست کے جواب میں فرمایا کہ یہ معجزہ دوسرے معجزوں سے مختلف ہے۔ اگر کسی نے اس معجزہ کے دیکھنے کے بعد انکار کیا تو اسے شدید عذاب ہوگا۔ اس خطاب کا مطلب یہ ہے کہ وہ دسترخوان مکمل طور پر عالمِ غیب سے تھا اور انہوں نے اپنے سامنے ایسا دسترخوان دیکھا جس میں ان کی درخواست کی ہوئی غذا موجود تھی۔ اگر صرف برکت ہی مراد ہوتی تو اتنی لمبی چوڑی گفتگو کی کیا ضرورت تھی۔ صرف اتنا کہہ دیتے: ''اللھم بارك لنا فی لعامنا ھذا''

صحیح بات تو یہ ہے کہ جو مصنف موجودہ علومِ حسی سے متاثر ہوکر کتابیں لکھتے ہیں مسائلِ غیبی کا ان کے لیے تسلیم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایک طرف تو انہیں دینی رشتہ قرآن حکیم کی تصدیق پر مجبور کرتا ہے تو دوسری طرف سائنسی نظریات نے ان کو جکڑ رکھا ہے۔ اس صورت حال میں وہ ایسی راہیں تلاش کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ دونوں طریقوں کو کسی نہ کسی طرح درست ثابت کریں۔

---

[1] انجیل متی، اصحاح ۱۴

(۷) حضرت مسیحؑ کے قتل کی سازش اور مسیحؑ کا آسمان کی طرف اٹھنا

دوسرے انبیاء کی طرح حضرت مسیحؑ بھی کچھ مدت تبلیغ کرنے کے بعد امت کی بے توجہی کا شکار ہو گئے اور ہٹ دھرم یہودی ان کے قتل کے درپے ہو گئے تا کہ اس چراغِ ہدایت کو خاموش کر دیں۔ پہلے اس بارے میں ہم آیات کو بیان کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۖ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

۲۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

۳۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

۴۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ (آل عمران: ۵۴ تا ۵۷)

۵۔ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ ۗ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۢ ﴿۱۵۷﴾

۶۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

۸۔ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ

عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ﴿۱۵۹﴾ (النساء ۱۵۷ تا ۱۵۹)

۸۔ وَاِنَّهٗ لَعِلۡمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوۡنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۶۱﴾

(الزخرف: ۶۱)

آیات کا ترجمہ

۱۔انہوں نے مکر کیا۔اللہ نے بھی ان کے مکر کا جواب دیا۔اللہ تعالیٰ مکر کا بہترین جواب دینے والا ہے۔

۲۔یاد کرو جب عیسیٰؑ سے اللہ نے کہا، میں تجھے لے لوں گا، اپنی طرف اٹھا لوں گا، تجھے کافروں سے پاک کر دوں گا اور جنھوں نے تیری پیروی کی میں انہیں کافروں پر قیامت کے دن تک برتری عطا کروں گا۔پھر تجھے میری طرف لوٹ کر آنا ہے اور میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان اس کا جس میں تم اختلاف کرتے ہو۔

۳۔جنھوں نے کفر کیا میں انہیں دنیا و آخرت میں سخت ترین عذاب دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

۴۔اور جنھوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال انجام دیئے، انہیں پورا پورا اجر دوں گا۔اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔

۵۔ان کے (یہود کے) اس قول کی وجہ سے کہ ہم مسیح عیسیٰؑ ابن مریمؑ رسول خدا کو قتل کر دیا (حالانکہ وہ اشتباہ کرتے ہیں) انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ پھانسی پر چڑھایا ہے بلکہ انہیں اشتباہ ہوا ہے۔جو لوگ مسیحؑ کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ اس کی نسبت شک میں مبتلا ہیں اور انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں سوائے گمان کی پیروی کے۔یقیناً انہوں نے اسے قتل نہیں کیا۔

۶۔بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور اللہ غلبہ والا، حکیم ہے۔

۷۔کوئی بھی اہلِ کتاب سے نہیں مگر یہ کہ موت سے پہلے اس پر ایمان لے آئے گا اور وہ قیامت

کے دن ان پر گواہی دے گا۔

۸۔عیسیٰؑ کا نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ان کے نزول سے قیامت کا قریب ہونا معلوم ہو جائے گا۔پس اس (قیامت) کے بارے میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو کہ یہ ہی سیدھا راستہ ہے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

مندرجہ بالا آیات میں یہودیوں کی سازش کا تذکرہ ہے۔یہودیوں کا ارادہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو پھانسی دے دیں،لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو ان کے شر سے نجات دی اور انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بجائے اُن کے ایک ہم شکل کو پھانسی پر چڑھا کر یہ سمجھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو پھانسی پر چڑھا دیا ہے۔چونکہ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت عیسیٰؑ یہودیوں سے نجات پا جائیں لہٰذا اللہ نے انہیں نجات دے کر اپنی طرف اٹھا لیا۔رہا یہ سوال کہ وہ شخص کیسے حضرت عیسیٰؑ کے مشابہ تھا،آیات میں اس بارے میں کچھ بیان نہیں ہوا۔تاریخ بھی اس باب میں اختلاف کا شکار ہے۔

اہم تر مسئلہ یہ ہے کہ کیا حضرت عیسیٰؑ جب آسمان پر اٹھائے گئے تو وہ زندہ تھے یا ان کی موت واقع ہو چکی تھی،اگر وہ زندہ تھے تو کیا ابھی تک زندہ ہی ہیں یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ آیات اس بارے میں دو قسم کی ہیں۔بعض میں ذکر ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ حالت میں آسمان پر اٹھائے گئے ہیں جب کہ بعض دوسری آیات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ ابھی تک زندہ حالت پر باقی ہیں۔جس کے بارے میں ہم پھر بحث کریں گے۔پہلے ہم پہلی قسم والی آیات سے بحث کرتے ہیں:

۱۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۝۵۵ (آل عمران:۵۵)

۲۔ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ

اِلَیۡہِ ؕ (نساء: ۱۵۷، ۱۵۸)

پہلی آیت کی تفسیر

اس آیت کے ضمن میں ضروری ہے کہ پہلے متوفی کے معنی بتا دیے جائیں جو توفّیٰ سے مشتق ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آج کل محاورات میں یہ کلمہ موت کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے، خدا کو متوفی اور مرنے والے انسان کو متوفی کہتے ہیں جب کہ عربی زبان میں یہ کلمہ اس سے وسیع تر معنی میں استعمال ہوتا ہے اور مارنا یا مرنا اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے۔ ابن منظور ''لسان العرب'' میں کہتا ہے: "توفی فلان و توفاہ اللہ اذا قبض نفسہ"۔ صحاح اللغۃ میں آیا ہے: "توفی فلان" فلاں کی روح قبض کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی لفظ دوسرے معنی یا مصداق میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: "توفی المیت" اس نے اپنی زندگی پوری کر لی۔ جب انسان کسی سے مال لے تو کہتا ہے: "توفیت المال منہ و ستوفیتہ" [1]

قرآن مجید کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ کلمہ "توفی" کے حقیقی معنی لینا یا پورا کرنا کے ہیں۔ لیکن یہ بات مختلف صورتوں میں بیان کی جاتی ہے۔ انسان کے متعلق یہ حقیقت درج ذیل چند صورتوں میں سے کسی ایک میں ہوگی:

الف۔ روح کا بدن سے مکمل طور پر نکال لینا۔ یہ صورت موت کا لازمہ ہے۔

ب۔ روح کا بدل سے نکالنا لیکن مکمل طور پر نہیں۔ یہ صورت نیند کا لازمہ ہے۔

ج۔ انسان کو عالمِ بشریت سے اٹھا کر دوسرے عالم میں لے جانا۔

ان تینوں صورتوں پر قرآن آیات شاہد ہیں، مثلاً پہلی اور دوسری صورت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَالَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا ۚ فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَیُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾ (زمر: ۴۲)

اللہ تعالیٰ جانوں کو موت کے وقت اور وہ جو نہیں مرتے، نیند کی حالت میں ان کو جانوں کو لے لیتا ہے۔ پھر جن کی موت یقینی ہو چکی ہوتی ہے، ان کی روح کو روک لیتا ہے اور دوسری ارواح کو ایک معین وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے''

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا اس آیت میں کلمہ ''توفی'' دو معنی دے رہا ہے۔ آیت کے پہلے حصے میں موت کے ذریعہ روح نکالنے

[1] السان العرب، ج ۱۵، ص ۴۰۰، مادہ وفی

کے معنی دے رہا ہے یعنی فرمایا "یتوفی الانفس حین موتها"۔ جب کہ آیت کے دوسرے حصہ میں نیند کے ذریعہ روح نکالنے کے معنی دے رہا ہے یعنی فرمایا: "والتی لم تمت فی منامها"۔[1]

کچھ اور آیات میں بھی کلمہ توفی نیند کے ذریعہ روح نکالنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى (انعام:۶۰)

"وہ رات کے وقت تمہیں لے لیتا ہے اور وہ آگاہ ہے اس کے بارے میں جو تم دن کے وقت حاصل کرتے ہو۔ تمہیں نیند سے اٹھاتا ہے تاکہ معینہ مدت پوری ہو جائے"

اس آیت میں "یتوفی" اس معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی نیند کے وقت روح نکال لینا۔ یہ بات کہ "توفی" مارنے کے معنی میں نہیں بلکہ لینے کے معنی میں ہے، جس کی مختلف حالتیں ہو سکتی ہیں، اس پر واضح و شاہد وہ آیت ہے جو بدکار عورتوں کے بارے میں آئی ہے۔ فرماتا ہے:

فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ (نساء:۱۵)

"انہیں گھروں میں روک لو، یہاں تک کہ موت انہیں آلے، یا اللہ تعالیٰ اُن کے لیے کوئی اور راستہ نکال دے"

اس آیت میں یتوفی کا فاعل موت ہے۔ "یتوفهن الموت" یعنی "یاخذهن الموت"۔ اگر یتوفی مارنے کے معنی میں ہو تو معنی یہ ہوں گے "یمیتهن الموت" یعنی موت انہیں مار دے۔ یہ استعمال غلط ہوگا۔

اب جب کہ واضح ہو گیا کہ یتوفی ایک جامع معنی رکھتا ہے کسی ایک معنی کے معین کرنے کے لیے خاص قرینہ کی ضرورت ہوگی۔ پہلی آیت یعنی "متوفيك ورافعك الى" میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ نے عیسیٰؑ کو تین چیزوں کے ساتھ خطاب فرمایا ہے۔[2] ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ (آل عمران:۵۵)

یہ تین خطاب یعنی "متوفيك، رافعك اور مطهرك" حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہیں۔

اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ عیسیٰؑ کسی روح کا نام نہیں بلکہ روح و جسم دونوں کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا یہاں پر بھی ان تینوں خصوصیات

---

[1] والتی کا عطف الانفس پر ہے۔ عبارت یوں بنے گی: "الله یتوفی الانفس التی لم تمت فی منامها"

[2] چوتھی خصوصیت کا ایک لحاظ سے مسیح سے تعلق ہے اور ایک لحاظ سے اُن کی امت سے جہاں فرمایا "و جاعل الذین اتبعوك" اس وجہ سے یہاں صرف تین خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا

کا حامل عیسیٰؑ کا خارجی وجود ہوگا یعنی روح کا جسم پر دو۔ پس خطاب اس خارجی وجود بنام عیسیٰؑ سے ہے۔

اگر "متوفيك"، کا مطلب عیسیٰؑ کو یہودیوں کے پنجہ سے نجات دینا ہو تو اس صورت میں یہ تینوں خصوصیات حضرت عیسیٰؑ کے خارجی وجود کے ساتھ قائم ہوں گی، یعنی اللہ نے انہیں لوگوں سے نجات دی، انہیں اوپر اٹھا لیا اور کافروں سے دور کر دیا۔ لیکن اگر "متوفیک" کے معنی موت دینے کے ہوں تو ظاہر ہے کہ صرف روح آسمان پر اٹھائی جاتی ہے نہ کہ جسم۔ اس صورت میں صرف پہلی خصوصیت حضرت عیسیٰؑ کے جسم و روح کے ساتھ قائم ہے، دوسری خصوصیت کا تعلق صرف روح سے ہوگا۔ اس طرح آیت کے معنی یہ ہوں گے: "اے مسیحؑ! میں تجھے موت دیتا ہوں اور تیری روح کو اٹھا لیتا ہوں۔ اس تفسیر کا لازمہ یہ ہے کہ موصوف میں جدائی پیدا ہو جائے کیونکہ عیسیٰؑ صرف روح کا نام نہیں، اگرچہ حقیقتِ عیسیٰؑ روح ہی ہے، بلکہ عیسیٰؑ کا مسمی وہ مادی جسم روح کے ساتھ ہے، لہٰذا یہ خصوصیات بھی اس کے متعلق ہی ہونا چاہئیں۔

مفسرین میں سے ابوجعفر طبری نے پہلے معنی اختیار کیے ہیں اور تفسیر آلاء الرحمن میں مرحوم بلاغی نے اس پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔[1]

جب ان دو خصوصیات کا مطلب واضح ہو گیا تو اب ہم تیسری اور چوتھی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق اُن کی امت سے ہے۔

الف۔ "مطهرك من الذين كفروا"، تجھے کفار کے ساتھ رہنے سے پاک کر دوں گا"

ب۔ تیرے پیروکاروں کو قیامت تک کفار پر برتری دے دوں گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وجاعل الذين اتبعوك فوق الذين كفروا الى يوم القيمة

اس میں مراد مسیحؑ کے پیروکاروں سے یا تو صرف عیسائی ہیں جو مخالفین یعنی یہودیوں پر ہمیشہ غالب رہے اور اب بھی وہ اُن کی سرپرستی میں زندہ ہیں۔ یا ممکن ہے مراد بطور مطلق مسیحؑ کے پیرو ہوں، کہ مسلمانوں کو بھی شامل ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ مسیحؑ پر ایمان رکھنے والے ہمیشہ مخالفین (یہودیوں) پر غالب رہے ہیں اور رہیں گے خدائے حکیم کی مشیت یہی ہے۔

بعد میں اللہ تعالیٰ اس بات کو ذکر فرماتا ہے کہ سب لوگوں کو اسی کی طرف آنا ہے اور ایک دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرما دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

ثم الى مرجعكم فاحكم بينكم فيما كنتم فيه تختلفون

اس کے بعد والی دو آیات میں اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل ذکر فرماتا ہے جو پہلے والی آیت میں ذکر ہوا ہے اور فرماتا ہے کہ کافروں کو دنیا و آخرت میں سخت ترین عذاب ہوگا اور اُن کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ یقیناً ان کا دنیاوی عذاب مومنین کے ہاتھوں میں ہوگا اور اخروی عذاب آتشِ جہنم کے ذریعہ۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ

---

[1] تفسیر طبری، ج ۳، ص ۲۰۳، آلاء الرحمن، ج ۵ ص ۳

مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ۝۵۶ (آل عمران: ۵۶)

اس پہلی والی آیت کے دوسرے حصہ میں مومنین کا تذکرہ تھا۔ اس آیت میں اس کی تفصیل یوں ذکر فرمائی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے ایمان اور نیک اعمال کا اجر دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ‌ؕ (آل عمران: ۵۷) [1]

دوسری آیت کی تفسیر

یہاں تک اس پہلی آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو ان کے خارجی جسم کے ساتھ کافروں سے نجات دی اور انہیں آسمان پر اٹھالیا اور وہ اُن کے قتل پر قادر نہ ہو سکے۔ اب یہ سوال کہ حضرت عیسیٰؑ ابھی تک زندہ و بقید حیات ہیں، اس آیت سے اس کا جواب ہرگز نہیں ملتا۔ اس آیت نے صرف یہ بتلایا کہ حضرت عیسیٰؑ کو زندہ حالت میں اوپر اٹھالیا گیا۔ اب دوسری آیت کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

دوسری آیت میں حضرت مسیحؑ کے بارے میں یہودیوں کے عقیدہ پر تنقید کی گئی ہے، جو کہتے تھے کہ ہم نے مسیحؑ کو صلیب پر چڑھا کر مار ڈالا۔ اس عقیدہ کی رد میں اللہ تعالیٰ نے مستقل مطالب ذکر فرمائے ہیں:

۱۔ انہوں نے مسیحؑ کو ہرگز قتل نہیں کیا اور نہ ہی صلیب پر چڑھایا: "وما قتلوه وما صلبوه"

۲۔ انہیں اشتباہ ہوا ہے۔ کسی اور کو مصلوب کر کے وہ سمجھے کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو سولی پر لٹکایا ہے۔ "ولكن شبه لهم"

۳۔ وہ اس بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کا انہیں خود بھی یقین نہیں بلکہ شک و تردید کی بنیاد پر ایسا کہتے ہیں:

وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ۚ (النساء: ۱۵۷)

۴۔ دوبارہ خداوند نے مسیحؑ کے قتل کی سختی سے تردید کی ہے: "وما قتلوه يقينا"

۵۔ ایک دفعہ پھر قطعی طور پر یہی بتایا گیا ہے کہ مسیحؑ کو قتل نہیں کیا گیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اوپر اٹھالیا۔

بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا۝۱۵۸ (النساء: ۱۵۸)

---

[1] یوفیھم یعنی مومن کو مکمل اجر دینا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر وفی باب تفعیل سے ہو تو اس کے معنی مکمل دینے کے ہیں اور اگر باب تفعل سے ہو تو اس کے معنی مکمل لینے کے ہیں۔

اس آیت کے مختلف فقرے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت کا مفاد پہلی آیت والا ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسیحؑ کو زندہ حالت میں اوپر اٹھا لیا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلی آیت میں "متوفيك" اور "رافعك" کی دو لفظیں ذکر ہوئی ہیں جب کہ اس آیت میں صرف رفع کا ذکر ہوا ہے۔ نیز یہ جو ہم نے کہا کہ دوسری آیت میں بھی صرف مسیحؑ کے زندہ حالت میں اٹھائے جانے کو بیان کر رہی ہے، اس پر شاہد "و ما قتلوه و ما صلبوه" کی دونوں مفعول کی ضمیریں ہیں جو عیسیٰؑ ابن مریمؑ کی طرف لوٹ رہی ہیں، جیسا کہ "بل رفعه الله" میں بھی مفعول کی ضمیر انہی کی طرف لوٹتی ہے اور تینوں میں موضوع عیسیٰؑ کا خارجی وجود ہے جس کے بارے میں یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اسے قتل کر دیا اور اُسے سولی پر لٹکا دیا، جب کہ قرآن فرماتا ہے "وما قتلوه و ما صلبوه بل رفعه الله" پس یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہودی اس بات میں قطعاً غلطی پر ہیں اور صحیح صورتِ حال یہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ قتل و مصلوب نہیں ہوئے بلکہ اوپر اٹھا لیے گئے۔ یہاں بھی یہ سوال کہ حضرت عیسیٰؑ ابھی تک بقیدِ حیات ہیں، اس بارے میں یہ دوسری آیت بھی کچھ نہیں بتلاتی۔ ہمارے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس آیت کے ضمن میں دو تفسیریں جو ذیل میں پیش کی گئی ہیں صحیح نہیں ہیں:

الف۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت عیسیٰؑ کو موت دی، پھر انہیں اوپر اٹھا لیا، "امات المسيح اولاً ثم رفعه" [1]

اس تفسیر کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں جملہ "بل رفعه الله اليه" یہودیوں کے عقیدہ کو رد کرنے کی خاطر ذکر کیا گیا ہے۔ جو کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰؑ کو پکڑ کر قتل کر دیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی بات کے رد میں کہا ہے کہ تم غلط کہتے ہو۔ ہم نے عیسیٰؑ کو نجات دی اور اُسے اوپر اٹھا لیا۔ اگر مراد یہ ہو کہ ہم نے عیسیٰؑ کو موت دی اور اُسے وہاں سے دوسری جگہ پر منتقل کر دیا، تو اس صورت میں یہ جملہ یہودیوں کے نظریہ کے رد کے طور پر واقع نہیں ہو سکے گا۔

ب۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ کے درجات بلند کرنا ہے۔ [2]

یہ تفسیر بھی آیت کے سیاق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ آیت کا موضوع یہود کا حضرت عیسیٰؑ پر تسلط یا عدمِ تسلط ہے۔ یہودیوں کا قول تب ہی غلط ثابت کیا جا سکتا ہے جب آیت کا مطلب یہ ہو کہ حضرت عیسیٰؑ کو ہم نے تم سے نجات دے کر اوپر اٹھا لیا۔ لیکن اگر معنی یہ لیے جائیں کہ ہم نے عیسیٰؑ کے درجات بلند کر دیئے اور اسے اوپر اٹھا لیا، تو یہ ان کے نظریہ کا ردِّ نہیں ہوگا۔

تیسری آیت کی تفسیر

تیسری آیت میں جو دوسری آیت کے بعد آتی ہے، ایک اور مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ ایک دن اہل کتاب اس بات پر ایمان لے آئیں گے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا، نہ سولی پر لٹکایا تھا بلکہ وہ یہودیوں سے نجات پا گئے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] یہ تفسیر موجودہ انجیل کے عین مطابق ہے اس میں بھی ہے کہ خدا نے عیسیٰؑ کو موت کے ایک ہفتہ یا چند دن بعد اوپر اٹھا لیا۔

[2] کتاب موقف العقل والعلم والعالم، ص ۱۵ میں اس نظریہ کو مفسر مراغی کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُـؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ۝۱۵۹

(نساء: ۱۵۹)

اس آیت کی تفسیر سے پہلے دو مطلب کا ذکر ضروری ہے:

الف۔ اس آیت میں جملہ "وان من اهل الکتب" میں لفظ "ان" نافیہ ہے جو "ما" نافیہ کے معنی دیتا ہے۔ لفظ احد یہاں مقدر ہے۔ چنانچہ آیت اس طرح ہوگی: "وان احد من اهلك الکتب"۔

ب۔ جملہ "لیؤ من به قبل موته" میں دو ظاہری ضمیریں ہیں۔ پہلی ضمیر "بہ" کی ہے جو مسیحؑ کی طرف لوٹتی ہے اور دوسری ضمیر "موتہ" کی ہے جس کے بارے میں دو نظریے ہیں:

ا۔ یہ ضمیر بھی پہلی ضمیر کی طرح حضرت مسیحؑ کی طرف ہی لوٹتی ہے کیونکہ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت میں موضوعِ بحث حضرت مسیحؑ ہیں۔ یہ آیت اس کے بعد ہے۔ لہٰذا اگر دونوں آیات کے جملے ترتیب کے ساتھ سامنے رکھے جائیں تو بلا شبہ یقین ہو جائے گا کہ یہ ضمیر بھی حضرت مسیحؑ کی طرف ہی لوٹتی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے ہم ان جملوں کو ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

قتلنا المسیح عیسی ابن مریم

وما قتلوہ وما صلبوہ

وما قتلوہ یقیناً

بل رفعه الله الیه

وان من اهل الکتب الا لیئومنن به قبل موته

ویوم القیمة یکون علیهم شیهداً

ان سب جملوں میں محورِ موضوع حضرت مسیحؑ کی ذات ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ خبر دے رہا ہے کہ ایک دن آئے گا۔ جب حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اہل کتاب کا باطل عقیدہ ان پر روشن ہو جائے گا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا دن ہے؟ اس بارے میں کہتے ہیں کہ زمانہ آخر میں یہ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا دن ہے۔ اس دن اہل کتاب حقیقتِ حال کو سمجھ جائیں گے اور حضرت مسیحؑ کی زندگی کے بارے میں شک و تردید سے آزاد ہو جائیں گے۔

اس نظریہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل نہیں کر سکے، بلکہ اللہ نے اُسے اٹھا لیا، اس بات کی تائید کی خاطر اس

مطلب میں اضافہ ہوا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جس دن اہل کتاب اس بات پر ایمان لے آئیں گے جو ہم نے کہی اور وہ دن وہ ہوگا جس میں حضرت عیسیٰؑ اپنی موت سے پہلے ان پر ظاہر ہوں گے اور سب کو حقیقتِ حال کا پتہ چل جائے گا۔

اس نظریہ کی بنیاد پر نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے قتل کی سازش سے نجات حاصل کر لی تھی بلکہ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور اپنی موت سے پہلے اہل کتاب پر ظاہر ہوں گے۔ روایات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی وفات ان کے آسمان سے اترنے، اور دجال کے قتل کے بعد واقع ہوگی۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ پہلی ضمیر حضرت عیسیٰؑ کی طرف اور دوسری ضمیر اہل کتاب کی طرف لوٹتی ہے۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اہل کتاب میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے ایمان نہ لے آئے، یعنی قبضِ روح کے وقت حقیقتِ حال اس پر روشن ہو جاتی ہے اور وہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آتا ہے اور اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا گیا۔

لیکن اس نظریہ کی بنیاد چنداں درست نہیں ہے کیونکہ کسی کو معلوم نہیں کہ موت کے وقت اہل کتاب کے ایمان کا حاضرین کو پتہ چل پاتا ہے یا نہیں۔ اگر کہیں کہ پتہ چلتا ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ کسی اہل کتاب سے موت کے وقت ایسا اقرار کبھی نہیں سنا گیا۔ دوسرا احتمال بھی پہلے کی طرح صحیح نہیں کیونکہ موت کے وقت سب پردے اُٹھ جاتے ہیں اور مرنے والے پر ہر حقیقت واضح و روشن ہو جاتی ہے، چاہے مسیحؑ سے متعلق ہو یا اس کے علاوہ ہو۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ صرف حضرت مسیحؑ کی صورتِ حال کے واضح ہونے کو ذکر کیا جائے، جیسا کہ ارشاد ہے:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾
لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ (مومنون: ۹۹۔ ۱۰۰)

یعنی "جب کسی کی موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے: خدایا! مجھے (ایک بار پھر لوٹا دے تا کہ میں نیک اعمال انجام دے لوں"

ہماری بات کی تائید فریقین کی ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں قیامت سے پہلے واقع ہونے والی علامات میں حضرت عیسیٰؑ کے نزول کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ ابن کثیر کہتا ہے: رسولِ اکرمؐ سے متواتر روایات وارد ہوئی ہیں جن میں قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کے نزول کو بتایا گیا ہے۔ [1]

چوتھی آیت کی تفسیر

چوتھی آیت میں حضرت مسیحؑ کے وجود کو قیامت کی نشانیوں میں سے ایک شمار کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ قیامت کے بارے میں شک یا تردید نہ کرو اور عیسیٰؑ کو اپنا خدا نہ بناؤ۔ وہ اللہ کا ایک بندہ ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نزولِ قیامت کی نشانیوں میں

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۳۳

سے ایک ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنَّهٗ لَعِلۡمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوۡنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ۝۶۱

(زخرف:۶۱)

اس آیت کی تفسیر کے لیے ضروری ہے کہ اس سے پہلے والی آیات پر بھی نظر ڈالی جائے۔پہلی آیات میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابۡنُ مَرۡيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوۡمُكَ مِنۡهُ يَصِدُّوۡنَ ۝۵۷ وَقَالُوۡٓا ءَاٰلِهَتُنَا

خَيۡرٌ اَمۡ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوۡهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ خَصِمُوۡنَ ۝۵۸ اِنۡ هُوَ اِلَّا

عَبۡدٌ اَنۡعَمۡنَا عَلَيۡهِ وَجَعَلۡنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۝۵۹ (زخرف: ۵۷ تا ۵۹)

یعنی" جب مشرکین کی طرف سے حضرت مریمؑ کے بیٹے کی بات ہوئی تو اس وقت تیری قوم (قریش) نے مناظرہ شروع کر دیا۔کہنے لگے کہ ہمارے خدا بہتر ہیں یا مسیحؑ؟ ان کی بات جھگڑا کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ وہ تو مجادلہ کرنے والے لوگ ہی ہیں۔(قریش جانتے ہیں کہ) وہ (مسیحؑ) نہیں ہیں مگر صرف ہمارا بندہ جسے ہم نے نعمت عطا فرمائی اور اُسے بنی اسرائیل کے لیے نشانی قرار دیا"۔

مفسرین کہتے ہیں جب آیت اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ ۝۹۸ (انبیاء:۹۸) [1] نازل ہوئی تو مشرکین قریش جھگڑا کرنے لگے کہ مسیحؑ بھی عیسائیوں کا معبود ہے۔اگر طے ہو کہ اللہ کے علاوہ سب معبود جہنم میں جائیں گے، یہاں تک کہ مسیحؑ بھی، تو پھر کیا اشکال ہے کہ معبود بھی جہنم میں چلے جائیں کیونکہ یہ مسیحؑ سے زیادہ شرف کے مالک تو نہیں، یعنی اگر عیسیٰؑ کا انجام ہے تو ہمارے خداؤں کا یہ انجام ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔

قرآن مجید ان کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے کہ تم شک میں مبتلا ہو۔ہم نے جو کچھ کہا ہے تمہارے مصنوعی بتوں کے بارے میں کہا ہے۔مسیحؑ تو معبود نہیں تھے وہ ہمارا بندہ تھے جسے ہم نے نعمت عطا کی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے اپنی نشانی بنایا تھا۔ان کا وجود قیامت کی نشانی ہے، قیامت کے بارے میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔

دوسری لفظوں میں ہم نے جو کہا کہ تمہارے معبود جہنم کا ایندھن ہیں، اس سے ہمارا مراد تمہارے بے روح و بے عقل معبود ہیں کیونکہ آیت میں لفظ "ما" استعمال ہوا ہے، "و ما تعبدون" (ما بے عقل موجودات کے لیے استعمال ہوتا ہے) لیکن جو موجودات شرف اور روحِ عقل

[1] تم اور جس کی تم خدا کے علاوہ پرستش کرتے ہو، سب جہنم کا ایندھن ہیں

رکھتے ہیں اور دوسروں نے اُن کے بارے میں غلط نظریات اپنا لیے ہیں، وہ جہنم میں دوسروں کے نظریات کی وجہ سے نہیں چلے جائیں گے۔ لکڑی کے بتوں کو جلانا ان کی تحقیر اوران کے بطلان کی نشاندہی کی خاطر ہے۔صاحبِ عقل وروح معبودوں میں یہ معنی نہیں پائے جاتے کیونکہ وہ خوداللہ کی بندگی کے ہمیشہ معترف رہے ہیں۔

بہرکیف یہ آیت بتلاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی خوبی قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہونا ہے۔ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت قیامت کی نشانی تونہیں تھی، ورنہ خودپیغمبراکرمؐ کی ذاتِ گرامی جوحضرت مسیحؑ کے بعدتشریف لائے، اس مقام ومرتبہ کی زیادہ مستحق تھی، بلکہ مراد یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ دوبارہ نزول کریں گے توان کا وجود قیامت کے نزدیک ہونے کی نشانی ہوگا۔روایات بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں کہ حضرت مسیحؑ قیامت سے پہلے ایک عادل رہبروفریادگیرکی طرح نازل ہوں گے۔[۱]

زمخشری نے اس آیت "انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم" کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی توعبداللہ ابن زبعری پیغمبراسلامؐ سے اس بات پر جھگڑا کرنے کے لیے اٹھا اور کہا کہ یہ آیت کیا ہمارے اور ہمارے خداؤں کے ساتھ اختصاص رکھتی ہے یا تمام اُمتوں کے خداؤں کو شامل ہے؟ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ دوسری بات صحیح ہے۔اس نے کہا خدائے کعبہ کی قسم میں تم پر کامیاب ہوگیا ہوں کیونکہ تم کہتے ہو کہ عیسیٰؑ ابن مریمؑ پیغمبر ہیں، ان پرسلام بھیجتے ہو جب کہ نصاریٰ ان کو اوران کی والدہ کو پوجتے تھے۔اسی طرح حضرت عزیزؑ بھی بنی اسرائیل کے معبود تھے۔اور ملائکہ بھی کچھ لوگوں کے معبود ہیں۔کیا یہ سب جہنمی ہیں؟ اگر یہ ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں کہ ہمارے خدا بھی اور ہم بھی جہنم میں چلے جائیں گے۔اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّ الَّذِيۡنَ سَبَقَتۡ لَهُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰٓى ۙ اُولٰٓـئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ ۝۱۰۱ (انبیاء: ۱۰۱)

یعنی "جن کی پہلے ہماری طرف سے تعریف ہوچکی ہے وہ جہنم سے دور ہیں"[۲]

ہمارے اس مفصل بیان سے واضح ہو گیا کہ دو آخری آیات حضرت مسیحؑ کی موجودہ زندگی کی گواہی دیتی ہیں۔اس بارے میں روایات کثرت سے وارد ہیں۔قارئین کرام کتب روایات واسانید میں خصوصاً کنزالعمال ج ۱۴ ص ۳۳۲ روایات ۳۸۴۲ تا ۳۸۸ کی طرف اس سلسلہ میں رجوع فرمائیں۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر اور دوسرے منابع

[۲] کشاف ج ۳، ص ۱۰۰ مطبوعہ مصر

(۸) دین وکتابِ مسیحؑ میں تحریف

عیسائیوں کا رویہ اپنی کتاب اور قرآن مجید کے بارے میں یہودیوں کے ردِعمل کی نسبت خاصا نرم ہے، لیکن قرآن کی رو سے دونوں گروہوں کو متہم کیا گیا ہے کہ وہ اس پر عمل نہیں کرتے جو خدا کی طرف سے اُن پر نازل کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کا لہجہ دونوں میں فرق کا مظہر ہے، اگرچہ جن آیات سے ہم یہاں بحث کریں گے وہ یکساں ہیں۔ پہلے آیات کو بیان کیا جاتا ہے۔

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ (المائدہ: ۴۷)

۲۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ (المائدہ: ۶۶)

۳۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ (المائدہ: ۶۸)

آیات کا ترجمہ

۱۔ اہلِ انجیل (نصرانیوں) کو چاہیے کہ اس کے مطابق حکم کریں جو اللہ نے ان پر نازل فرمایا ہے اور جو بھی اس کے مطابق حکم نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے وہ فاسق ہے۔

۲۔ اگر اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) تورات وانجیل اور جو کچھ ان پر خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرتے تو وہ اوپر نیچے سے اللہ کی نعمتوں سے مالا مال ہو جاتے۔ ان میں سے بعض میانہ رو ہیں جب کہ اکثر بدکردار ہیں۔

۳۔اہل کتاب سے کہہ دو کہ تم کسی چیز پر قائم نہیں ہو مگر یہ کہ تورات وانجیل اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اس پر عمل کرو اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں اکثر لوگوں کی سرکشی وکفر کو زیادہ کرتا ہے۔لہٰذا کافروں پر افسوس مت کرو۔

آیات کی موضوعی تفسیر

آسمانی شریعتیں ہمیشہ سے لوگوں کے لیے نیک بختی وسعادت کی ضمانت کے ساتھ نازل ہوتی ہیں۔اس لحاظ سے کوئی شریعت دوسری شریعت سے مختلف نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں کی مذمت فرماتا ہے کہ وہ حکمِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کی بجائے اس کے غیر کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ارشاد ہوتا ہے:

یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۴۵﴾ (مائدہ: ۴۵)

”جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ ظالم ہے“

اسی طرح اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو بھی مذمت فرماتا ہے کہ وہ انجیل کے مطابق فیصلے نہیں کرتے جب کہ اس کے علاوہ فیصلہ کرنا اطاعتِ خدا کی مخالفت کا موجب ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴿۴۷﴾ (المائدہ: ۴۷)

تورات وانجیل میں چونکہ تحریف کا احتمال پایا جاتا ہے۔بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کتاب پیغمبرِ اسلام پر نازل ہوئی ہے وہ سابقہ کتابوں کی تصدیق کے ساتھ ساتھ اُن پر ناظر بھی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ: ۴۸)

قرآن مجید بعد والی آیات میں اس سعادت کی مزید وضاحت فرماتا ہے وہ یہ کہ اگر اہلِ کتاب صحیح طور پر خود تورات وانجیل پر عمل کرتے تو الٰہی نعمتوں سے مالا مال ہو جاتے لیکن افسوس کہ صرف ان میں سے کچھ لوگوں نے عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی کتاب کے قوانین پر عمل پیرا رہے، ورنہ ان میں سے اکثر منحرف ہو کر کتاب کے خلاف عمل کرنے لگے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ

فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ۝۶۶ (المائدہ: ٦٦)

چونکہ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بشارت تورات و انجیل میں وارد ہو چکی تھی لہٰذا قرآن فرماتا ہے کہ صحیح اہل کتاب وہ ہیں جو تورات و انجیل کو پڑھتے ہیں، ان پر عمل کرتے ہیں، جو کچھ ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کا احترام کرتے ہیں اور تورات و انجیل کے احکام کے علاوہ وہ بشارتیں ہیں جو ان دونوں کتابوں میں پیغمبر خاتمؐ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ لیکن وہ اس ہدایت کے خلاف جب بھی قرآن مجید سے ایسی باتیں سنتے ہیں اُن کے کفر و سرکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝۶۸ (المائدہ:٦٨)

اس آیت میں ''فلا تاس'' کے معنی ''فلاتحزن'' کے ہیں۔ یہ خطاب پیغمبرِ اسلامؐ کے لیے ہے تا کہ ان کے کفر و سرکشی و تکذیب سے آنحضرتؐ غم زدہ نہ ہوں کیونکہ یہ بنی اسرائیل کی پرانی عادت ہے۔

ان تمام آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوموں کی سعادت آسمانی شریعتوں پر عمل کرنے میں ہے اور یہ سعادت تب ہی مکمل ہوتی ہے جب ان آسمانی شریعتوں کی آخری شریعتِ اسلام پر عمل کیا جائے، نیز پوری کتاب پر عمل کریں نہ کہ اس کے بعض حصوں پر۔

(۹) حضرت مسیحؑ کے لیے الوہیت کا تصور

قرآن حکیم کی نظر میں حضرت مسیحؑ اللہ کے رسول ہیں جن کے کچھ اپنے فرائض و تکالیف ہیں۔لیکن عیسائیوں نے ان کے بارے میں ایک الگ نظریہ اپنا رکھا ہے۔قرآن مجید نے اُن کے نظریہ کو ذکر کر کے رد فرمایا ہے۔وہ لوگ کبھی مسیحؑ کو خدا اور کبھی خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور کبھی تثلیث کے نظریہ کی تیسری فرد قرار دیتے ہیں۔ان میں صاحب نظر حضرت مسیحؑ کو کائنات کا رب شمار کرتے ہیں۔ان آیات میں ہم ان کے ان پانچ عقائد کی تفصیل و تحلیل ذکر کریں گے۔پہلے موضوع سے متعلق آیات کو بیان کرتے ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴿۵۹﴾ (آل عمران: ۵۹)

۲۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴿۷۹﴾

۳۔ وَ لَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ النَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۸۰﴾ (آل عمران: ۷۹، ۸۰)

۴۔ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴿۶۴﴾ (آل عمران: ۶۴)

۵۔ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ٘ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ۫ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ

اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۟

٦۔ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ
وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۟
(النساء: ۱۷۱، ۱۷۲)

٧۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ
مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۟ (المائدہ: ۱۷)

٨۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ
يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۟

٩۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ
وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۟
(المائدہ: ۷۲، ۷۳)

١٠۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ
صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى
يُؤْفَكُوْنَ ۟ (المائدہ ۷۵)

١١۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ

اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۳۰

۱۲۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱ (التوبة: ۳۰،۳۱)

۱۳۔ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝۳۴

۱۴۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۳۵

۱۵۔ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۳۶ (مریم: ۳۴ تا ۳۶)

۱۶۔ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝۲ (الفرقان: ۲)

آیات کا ترجمہ:

۱۔ عیسیٰؑ کی خلقت، خلقتِ آدمؑ کی طرح ہے جسے مٹی سے پیدا کیا گیا پھر اس سے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔

۲۔ کسی بشر کو جسے اللہ نے کتاب و حکمت و نبوت عطا کی ہو، یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ بلکہ اُسے چاہیے کہ انہیں کہے کہ اللہ کے بندے بن جاؤ اور اس کے دین کی پابندی اس ذریعے سے کرو جو تم کتاب سے سکھاتے ہو یا سیکھتے ہو۔

۳۔ (نیز اللہ کے کسی پیغمبر کو سزاوار نہیں کہ) تمہیں حکم دے کہ انبیاء اور فرشتوں کو اپنا رب بنالو۔ کیا وہ تمہیں حق قبول کرنے کے بعد کفر کا حکم دے سکتا ہے؟

۴۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب! آؤ ہمارے اور تمہارے درمیان جو مشترک کلمہ ہے اس کو اختیار کر

لیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم بجز خدا کے الگ الگ کسی کو اپنا خدا نہ بنائیں۔ اس دعوت کے بعد اگر انہوں نے روگردانی کی تو ان سے کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم اللہ کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں۔

۵۔ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو، اللہ کے بارے میں حق کے علاوہ کچھ نہ کہو۔ مسیح ابن مریمؑ صرف اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جو اس نے مریمؑ پر القا فرمایا اور اس کی روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے انبیاء پر ایمان لاؤ اور (تین خداؤں) تثلیث کے قائل نہ ہو۔ اس عقیدہ سے اپنے آپ کو روک لو کہ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ واحد و لاشریک ہے۔ وہ منزہ ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اسی کا ہے اور انسان کے لیے کافی ہے کہ خدا ہی اس کا وکیل ہو۔

۶۔ مسیحؑ نے اللہ کا بندہ ہونے سے انکار نہیں کیا اور نہ فرشتوں نے جو اس کے مقرب ہیں۔ جو بھی اس کی بندگی سے انکار کرے اور بڑائی دکھائے تو عنقریب ان سب کو اس کی طرف محشور کیا جائے گا۔

۷۔ جنہوں نے کہا کہ مسیحؑ ابن مریمؑ خدا ہے، وہ کافر ہو گئے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ مسیحؑ، ان کی والدہ اور سب اہل زمین کو ہلاک کرنا چاہے تو کون اُسے روک سکتا ہے، حالانکہ زمین، آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے خلق فرماتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۸۔ جنہوں نے کہا کہ مسیحؑ ابن مریمؑ خدا ہے وہ کافر ہو گئے، باوجود اس کے کہ مسیحؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اس خدا کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے کیونکہ اللہ نے جنت ہر اس شخص پر حرام کر دی ہے جو اس کے ساتھ شرک کرے، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

۹۔ جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے، (تثلیث کے قائل ہوئے) وہ کافر ہو گئے۔ خدائے واحد کے علاوہ کوئی خدا نہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ان (عیسائیوں) میں سے کافروں کو بڑا دردناک عذاب ہوگا۔

۱۰۔ مسیح ابن مریمؑ نہیں ہے مگر رسول، ان سے پہلے بھی انبیاء گزر چکے ہیں۔ ان کی ماں صدیقہ ہیں،
وہ دونوں کھاتے پیتے تھے (لہٰذا خدا نہ تھے) دیکھو کیسے ہم اپنی نشانیاں ان پر ظاہر کرتے ہیں۔
پھر دیکھو کہ کیسے وہ حق سے منہ پھیرتے ہیں۔

۱۱۔ یہودیوں نے کہا کہ عزیزؑ خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ ان کی یہ باتیں
ان سے پہلے والے کفار جیسی ہیں۔ اللہ انہیں ہلاک کرے! وہ کیسے حق سے روگردانی کرتے ہیں۔

۱۲۔ احبار اور راہبوں نے اپنے آپ کو اور مسیح ابن مریمؑ کو خدا کے علاوہ رب بنا لیا حالانکہ انہیں اللہ
کی عبادت کے علاوہ کسی چیز کا حکم نہیں ہوا۔ وہ خدا جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں، وہ منزہ ہے اس سے
جس کو انہوں نے اس کا شریک قرار دیا۔

۱۳۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریمؑ، حق بات جس کی تم تردید کرتے ہو۔

۱۴۔ خدا کے لیے (عقلاً) صحیح نہیں کہ اپنے لیے کسی کو بیٹا قرار دے۔ وہ پاک و پاکیزہ ہے۔ جب
بھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کافی ہے کہ اُسے کہے، ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ پس اس کی عبادت کرو کہ یہ ہی صحیح راستہ ہے۔

۱۶۔ الوہیت اسی کے لیے ہے، آسمانوں اور زمین کی ملکیت بھی۔ اس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں
بنایا، اس کی کائنات کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں اور اس نے سب چیزوں کو صحیح اندازہ
پر خلق فرمایا ہے۔

آیات کی موضوعی تفسیر

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مسیح کے بارے میں عیسائیوں کے مختلف عقائد کا ذکر فرمایا ہے اور ان کا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ عیسائیوں کے مسیح کے بارے میں عقائد درج ذیل صورت پر ہیں:

۱۔ وہ اللہ کا نبی ہے۔

۲۔ اللہ کا بیٹا ہے۔

۳۔ (خود) اللہ ہے۔

۴۔ رب اور کائنات کا مدبر ہے۔

۵۔ تثلیث کے ارکان میں سے ایک ہے۔

اب ہم ان عقائد میں سے ہر ایک کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ ذکر کرتے ہیں:

ا۔ مسیح اللہ کے نبی ہیں!

یہ کہ مسیح انبیاء الٰہی میں سے ایک نبی تھے یہ بات قرآن سے مسلم ہے اور قرآن نے مسیح کے لیے یہی مقام ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ قرآن نے مسیح کے بارے میں واضح بیان فرمایا ہے:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۠﴿۱۷۱﴾ (النسآء: ۱۷۱)

دوسری آیت میں ذکر کیا ہے کہ اگر آپ حقیقتاً مسیح کو پیغمبر کے طور پر قبول کرتے ہیں تو پھر مسیح کی طرف اس بات کو مت منسوب کرو کہ وہ لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دے گا کیونکہ جس انسان کو خداوند نے کتاب وحکمت ونبوت دے رکھی ہو اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ خدا کی عبادت کے بجائے لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دے، بلکہ پیغمبر الٰہی کی شان یہ ہے کہ لوگوں کو خدائی مخلوق بنا دے اور انہیں بتلائے کہ یہی کتاب جسے تم سیکھتے ہو، پڑھتے ہو، اسی سے رہنمائی حاصل کرو اور جادۂ توحید سے انحراف نہ کرو اور ایک خدا کی عبادت کرو جیسا کہ ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ (آل عمران: ۷۹)

پیغمبر کو زیب نہیں دیتا کہ لوگوں کو کہے انبیاء اور ملائکہ کو اپنا معبود بنا لو چونکہ فرض یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ ہرگز لوگوں کو کفر کی دعوت نہیں دے سکتا اور نہ انہیں اسلام سے خارج کر سکتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾ (آل عمران:۸۰)

خلاصہ یہ کہ اگر تم مسیح کو پیغمبر خدا سمجھتے ہو تو اس کی طرف ایسی جھوٹی باتیں منسوب نہ کرو مگر یہ کہ اسے نبی نہ سمجھو۔اس کے بعد ان کے دوسرے عقیدے کا بیان ہے۔

۲۔مسیحؑ کے اللہ کا بیٹا ہونے کا مفروضہ

اس نظریہ والے مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں جب کہ ان کے پاس اس عقیدہ پر کوئی دلیل نہیں ہے سوائے اس کے کہ بظاہر مسیحؑ کا کوئی باپ نہیں تھا۔یہی چیز موجب بنی کہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھا جائے۔قرآن مجید نے اس مفروضہ کی رد میں جو مطالب پیش کیے ہیں ہم یہاں ان کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ قرآن فرماتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھنا ان دو نظریوں کی تقلید ہے جو ان سے پہلے والے لوگوں کے تھے۔عیسائیوں سے پہلے یہودی حضرت عزیزؑ کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے اور ان کو خدا کا بیٹا جانتے تھے۔پیغمبرؐ اسلام کے زمانہ میں بھی یہودیوں میں یہ عقیدہ رائج تھا،اگرچہ آج کل کے یہودی اس نظریہ کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ عزیزؑ حقیقی بیٹے نہیں تھے بلکہ محض قرب کی بنا پر ان کو ایسا کہا گیا۔لیکن آج یہودیوں میں اس عقیدہ کا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت یہودی یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے،وگرنہ اگر اس دور میں یہودیوں کا یہ عقیدہ نہ ہوتا تو وہ فوراً قرآن کی تردید کر دیتے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے جب کہ تاریخ و حدیث کی کتابوں میں ان کی تردید کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا،جیسا کہ قرآن مجید نے فرمایا:"وقالت الیهود عزیر ابن الله"

دوسرے یہ کہ اس عقیدے میں عیسائیوں نے اپنے وجود سے پہلے کے کافروں کی پیروی کی ہے کیونکہ مشرکین عرب میں یہ طرزِ فکر بڑا پرانا ہے کہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور عیسائی جو حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں،ایک قسم کی انہی مشرکینِ عرب کی پیروی ہے۔

یہاں ایک دوسرا احتمال بھی پایا جاتا ہے وہ یہ کہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھنا عقیدۂ تثلیث کا لازمہ ہے۔یہ عقیدہ برہمن و بدھ مت میں بہت پہلے سے رائج تھا۔آج بھی تین سروں والے بت ان میں رائج ہیں جو اسی عقیدۂ تثلیث ہی کی ایک کڑی ہے۔

عیسائی حضرت مسیحؑ کی کنواری ماں سے ولادت کو اُن کے خدا کا بیٹا ہونے کی دلیل جانتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اُن کے اس گمان کی رد میں فرماتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت کنواری ماں سے ہوئی ہے لیکن آدمؑ تو بغیر کسی طبیعی طریقے کے خلق ہوئے۔اگر اس قسم کی ولادت خدا کا بیٹا ہونے کی دلیل مانی جائے تو پھر آدمؑ وحواؑ کے بارے میں بھی یہی نظریہ اپنانا چاہیے۔دوسرے یہ کہ اللہ کی قدرت بہت وسیع ہے۔وہ بعض مصلحتوں کی بنا پر کسی بھی چیز کو طبعی طریقے کے بغیر خلق فرما دیتا ہے۔ان دونوں دلیلوں کو قرآن مجید نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴿۵۹﴾ (آل عمران: ۵۹)

۲۔ نیز سب کو معلوم ہے کہ بچہ کی ولادت اس طریقے سے متحقق ہوتی ہے کہ نر و مادہ کے ملاپ سے نطفہ رحم مادر میں مستقر ہوتا ہے اور کچھ مدت گزرنے کے ساتھ انہی کی نوع سے بچہ پیدا ہو جاتا ہے، جب کہ اللہ کے لیے کسی چیز کی خلقت کا طریقہ اور ہے۔ اس کی مشیتِ حکیمانہ جس چیز کی خلقت کے متعلق قرار پا جائے وہ شی اسی وقت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴿۳۵﴾ (مریم: ۳۵)

قرآن کریم پیغمبر اکرمؐ کی بات سے نتیجہ نکالتا ہے کہ اب جب کہ مسیحؑ کا مقام و مرتبہ اور خدا کا بیٹے سے منزہ ہونا تمہیں معلوم ہو چکا تو جان لو کہ میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے، اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے:

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴿۳۶﴾ (مریم: ۳۶)

۳۔ قرآن مجید ایک اور آیت میں تیسری دلیل ذکر فرماتا ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہو سکتا۔ قرآن فرماتا ہے کہ کائنات اللہ کی ملکیت ہے، وہ اس کا مالک اتنا بے نیاز ہے کہ پوری کائنات اس کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا اسے بیٹے کی کیا ضرورت ہے جو اس کی کسی احتیاج کو پورا کرے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴿۱۷۱﴾ (النساء: ۱۷۱)

دوسری جگہ فرماتا ہے:

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴿۲﴾ (الفرقان: ۲)

۳۔ مسیحؑ کی الوہیت کا مفروضہ

عیسائیوں کے پانچ نظریات میں سے تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ مسیحؑ خود اس کائنات کے خدا ہیں۔ افسوس ہے کہ بعض مسیحی اس مفروضہ کے اظہار سے باز نہیں آتے۔ قرآن نے بھی ان کے اس نظریہ کو ان سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ؕ (المائدہ:۱۷)

قرآن مجید نے اس مفروضہ کی رد میں چند دلیلیں ذکر کی ہیں جنہیں ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

۱۔ مسیحؑ اور خدا کے مقرب فرشتے اپنے لیے اللہ کا بندہ ہونے سے ہرگز انکار نہیں کرتے۔ یہ بات اُن کے خدا نہ ہونے پر بذاتِ خود ایک دلیل ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہستی کائنات کی خالق ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کسی دوسری ہستی کا بندہ بتائے۔ حضرت مسیحؑ کی تمام پر افتخار زندگی ان کی بندگی اور اللہ کی عبادت کا واضح ثبوت ہے۔ اس کے باوجود عیسائی کیسے اُسے خدا مانتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَمَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيَسۡتَكۡبِرۡ فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۷۲﴾ (النساء: ۱۷۲)

حضرت امام رضا علیہ السلام نے جاثلیق (اپنے زمانے کے عیسائیوں کے پیشوا کے ساتھ مناظرہ انجام دیا تو امامؑ نے اس آیت سے استفادہ فرمایا اور اپنی بات اس طرح شروع کی کہ خدا کی قسم ہم اس عیسیٰؑ پر ایمان رکھتے ہیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان رکھتا ہے۔ ہمیں آپ کے عیسیٰؑ پر صرف ایک اعتراض ہے کہ وہ نماز روزے کی زیادہ پابندی نہیں کرتا تھا۔

جاثلیق نے جواب میں کہا کہ آپ نے اپنے علم پر پانی پھیر دیا اور اپنے آپ کو کمزور کر دیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ مسلمانوں میں آپ دانا ترین انسان ہیں۔

امام رضا علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہارا مطلب اس سے کیا ہے؟ اس نے کہا کہ آپ نے یہ کہا کہ عیسیٰؑ نماز روزہ کی کم پابندی کرتے تھے، یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ عیسیٰؑ تو ہمیشہ دن کو روزے سے ہوتے اور رات کو کبھی نہیں سوتے تھے۔ پوری رات عبادت کرتے تھے۔

امامؑ نے فرمایا کہ جناب جاثلیق! حضرت مسیحؑ کس کے لیے روزہ رکھتے اور کس کی عبادت کرتے تھے؟ جب جاثلیق کو امامؑ کی مضبوط دلیل کا علم ہوا تو سوائے خاموشی کے اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہا۔ [1]

لہٰذا کیا حضرت مسیحؑ کو جن کی تمام زندگی اللہ کی عبادت و بندگی میں گزری، خدا سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ تو بے معنی بات ہے کہ خدا خود اپنے عبادت کرے۔

۲۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ دو عام طبیعی انسان تھے جو اس زمین پر زندگی بسر کرتے تھے۔ طبیعی وجود پر فنا کو بالآخر آنا ہے۔ لہٰذا مسیحؑ اور ان کی والدہ بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں انہیں خدا کیسے سمجھا جا سکتا ہے، کیونکہ اللہ وہ مطلق حقیقت ہے جس کے لیے عدم و زوال کا کوئی تصور نہیں جب کہ مسیحؑ اور ان کی والدہ کی حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر مشیتِ الٰہی دونوں کی موت سے متعلق ہو جاتی تو

---

[1] توحید صدوق، ص ۴۲۱ تا ۴۲۲

ان دونوں کے لیے اسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ (المائدہ: ۱۷)

۳۔ زمین، آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اللہ کی ملکیت ہیں اور مسلماً جو چیز اللہ کی ملکیت ہے وہ اس کی مخلوق ہے۔ لہٰذا مسیح پر بھی یہی دونوں حکم جاری ہیں کیونکہ وہ زمین و آسمان کے درمیان موجودات کی طرح مخلوق خدا ہیں۔ پس ایسا وجود خود خدا نہیں ہوسکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ اللہ کی ملکیت اعتباری نہیں ہے کہ مالک اور مملوک کے درمیان اعتبار کرنے سے برقرار ہو جاتی ہو، بلکہ اس کی مالکیت کا سرچشمہ اس کا خالق ہونا ہے۔ بنا برایں وہ زمین، آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا خالق ہے۔ ظاہر ہے کہ مسیح بھی اس حکم سے باہر نہیں ہیں، یعنی وہ بھی مخلوق اور عبد خدا ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وللہ ملك السموت والارض وما بینهما

عیسائی حضرت مسیح کی بغیر باپ کے ولادت کو ان کی الوہیت پر دلیل بتاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اُن کی اس بات کے مختلف جواب دیئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت عام طبیعی طریقوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ اگر وہ انسان کو ماں باپ کے ملاپ کے ذریعہ پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی قدرت اسی حد تک محدود ہے، بلکہ وہ اس قانون کے خلاف کسی کو معجزانہ طریقہ سے بھی خلق کر سکتا ہے۔ حضرت مسیح کی ولادت اسی طرح ہے کہ وہ اللہ کا معجزہ و آیت تھے، اللہ نے انہیں بغیر باپ کے کنواری ماں سے پیدا فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "یخلق ما یشاءُ واللہ علی کل شیءٍ قدیر"

۴۔ حضرت مسیح اور ان کی والدہ کی زندگی مکمل طور پر طبیعی زندگی تھی۔ وہ کھانا کھاتے تھے اور طبیعی بات ہے کہ انہیں بھوک بھی لگتی تھی۔ پس جو انسان کھانے کا محتاج ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے۔ پس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ کہیں کہ مسیح بھی دوسرے انبیاء کی طرح ایک نبی تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (المائدہ:۷۵)

پس ان واضح دلیلوں کے بعد حق سے منہ موڑ کر باطل کے راستے پر چلنا ہٹ دھرمی و دلی عناد کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ان دلیلوں کے ذکر کے بعد نصاریٰ کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ دیکھو ہم کس طرح اپنی دلیلیں اور نشانیاں بیان کرتے ہیں اور پھر دیکھو کہ یہ لوگ کیسے حق سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۷۵

(المائدہ:۷۵، [ا])

۴۔تثلیث کا مفروضہ

حضرت ابراہیمؑ کی توحید ہی بعد میں آنے والے تمام انبیاء کی دعوت کی اساس و بنیاد ہے۔سب خدا پرستوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دی اور ہر قسم کی بت پرستی وغیر خدا پرستی کے خلاف جہاد فرمایا۔حضرت مسیحؑ بھی اسی توحید ابراہیمیؑ ہی کے راستے پر گامزن رہے اور انہوں نے لوگوں کو خدائے واحد کی طرف دعوت دی۔لیکن عیسائی ایک طرف تو اپنے آپ کو ابراہیمؑ کی شریعت کا پیروشمار کرتے ہیں،لہٰذا ایک خدا کے ماننے پر مجبور ہیں جب کہ دوسری طرف غلط افکار اور اپنے بزرگوں کی تحریف کی وجہ سے تثلیث کے نظریہ کے قائل ہو گئے۔اس طرح ان کے عقائد تناقضات کا شکار ہو گئے۔وہ خدائے واحد کے معتقد بھی ہیں اور تثلیث کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔اُن کے لیے یہ ایسی مشکل پیدا ہوئی جسے آج تک حل نہ کیا جاسکا اور اسی حیرت کا نتیجہ ہے کہ کلیسا آج تک یہی سمجھتا ہے کہ تثلیث کا نظریہ کوئی ایسا رمز ہے جس کا مطلب ہمیں معلوم نہیں،یعنی یہ نظریہ عقلی بنیادوں پر قائم نہیں ہے بلکہ صرف سابقہ لوگوں کی طرف سے کہی ہوئی بات ہے۔یہیں سے وہ عقل کے راستے دین سے جدا کر لیتے ہیں کہ عقل تو ہمیں خدائے واحد کی طرف بلاتی ہے جب کہ دین تثلیث کی طرف تو گویا الوہیت وخدائی ایک شراکت ہے جس کے مختلف حصے ہیں،ہر حصے کا ایک جدا مالک ہے جس میں باپ خدا، بیٹا خدا اور روح القدس خدا ہیں۔

اب یہاں مسیحی محقق علماء کیا کہتے ہیں؟ کیا ان تین میں سے ہر ایک تمام الوہیت کا مالک ہے یا اس کے کسی ایک حصہ کا۔اگر تمام الوہیت کا مالک ہر ایک کو تسلیم کریں تو ثنویت کا نظریہ بصورتِ واضح متحقق ہو جائے گا کیونکہ یہاں تین مستقل خدا ہیں اور تینوں واجب الوجود۔ اگر ہر ایک کو الوہیت کے بعض حصوں کا مالک مانیں کہ تینوں مل کر ایک خدا کو تشکیل دیتے ہیں تو ایسی صورت میں خدا کی ترکیب لازم آئے گی جب کہ مرکب اجزا کا محتاج ہوتا ہے اور جو محتاج ہو وہ ممکن الوجود ہو گا نہ کہ واجب الوجود بالذات۔لیکن عیسائی ان واضح دلیلوں کے باوجود عقیدۂ تثلیث پر مصر ہیں۔قرآن مجید وضاحت کے ساتھ اس نظریہ کو رد کرتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ (النساء: ۱۷۱)

اس آیت میں عقیدہ تثلیث کے بطلاق پر دلیل سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ وہ (مسیحؑ) مریمؑ نامی والدہ سے متولد ہوئے، پھر وہ کیسے ان

[ا] ''افك'' لغت میں انصراف وروگردانی کے معنی میں آتا ہے۔اس کو جھوٹ اور تہمت اس لیے کہتے ہیں کہ افک میں حق سے انحراف شامل ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا دوصورتوں میں سے کسی صورت پر مقامِ الوہیت پر فائز ہو سکتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ وہ کلمۂ خدا ہیں جیسا کہ پوری کائنات اللہ کا کلمہ ہے اور قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کے لیے بلند مقام کا ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ اللہ نے اُن کی نسبت اپنی طرف دی اور فرمایا: ''و روح منه'' یہ نسبت صرف اعزازی طور پر ہے، جیسا کہ ''بیت اللہ'' کہا جاتا ہے۔لہٰذا جملہ ''و کلمته القها الی مریم و روح منه''،اور کلمۂ خدا جو اس کی مخلوق ہے، بعد میں ذکر ہونے والے مسئلہ تثلیث کے لیے دلیل و برہان کی بنیاد کے طور پر ذکر ہوا ہے۔دوسری آیت میں ایک بار پھر عقیدۂ تثلیث ذکر کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کو تین میں سے ایک جانتے ہیں انہوں نے اللہ کو نہیں پہچانا اور حق کو چھپایا ہے۔خداوندِ عالم کے علاوہ کوئی خدا نہیں۔ان کو جان لینا چاہیے کہ اگر اس عقیدے سے باز نہ آئے تو بڑا دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ ؕ وَقَالَ الۡمَسِيۡحُ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبَّكُمۡ‌ ؕ اِنَّهٗ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ الۡجَـنَّةَ وَمَاۡوٰٮهُ النَّارُ‌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ۝ (المائدہ: ۷۲)

۵۔مسیحؑ کی الوہیت کا مفروضہ

کچھ مسیحی محقق حضرت مسیحؑ کے لیے ایک اور مقام کے قائل ہوئے ہیں، وہ یہ کہ حضرت مسیحؑ باوجود مخلوق ہونے کے کائنات کے رب اور مدبر ہیں۔سب جانتے ہیں کہ توحید کے مختلف مراتب ہیں، توحید در خالقیت کے علاوہ توحید کا ایک شعبہ ربوبیت میں توحید بھی ہے، یعنی علاوہ اس کے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے، اس کا رب اور اصلی مدبر بھی ایک ہے، وہی خالق بھی ہے اور رب بھی۔اگر اس کائنات میں اللہ کے علاوہ بعض اسباب وعوامل کارفرما ہیں تو یہ صرف آلات ہیں، یا صحیح تعبیر کے اعتبار سے یہ اسباب طبیعی وظلی ہیں۔بنابرایں حضرت مسیحؑ اب اس کائنات کے مدبر نہیں ہیں بلکہ وہ بھی دوسری موجودات کی طرح اس کائنات سے اپنی غذائی ضروریات کو پورا کرتے اور احتیاجات رفع کرتے تھے۔کبھی وہ حضرت مسیحؑ کی ربوبیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسانوں کے کچھ امور مثلاً گناہوں کا بخشنا، ان کی مغفرت کرنا، وغیرہ قسم کے کام حضرت مسیحؑ کے اختیار میں ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ وہ عیسائیوں کے گناہوں کو بخشتے اور انہیں اخروی سعادت کی ضمانت دیتے ہیں۔

قرآن اس قسم کی ربوبیت کی بھی تردید کرتا ہے کیونکہ مغفرت وشفاعت صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ (آل عمران: ۱۳۵)

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ (زمر: ۴۴)

پس غیر خدا کے لیے ہر قسم کی ربوبیت کا عقیدہ باطل ہے اور قرآن نے عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ربوبیت کے عقیدہ کو باطل کرنے کی خاطر انہیں تمام ابراہیمی شریعتوں کے مشترکہ اصول کی طرف دعوت دی ہے جو یہ ہے کہ سب اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ

کریں، نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیں۔ اسی طرح کسی کو اس کائنات کا رب قرار نہ دیں، نہ ہی انسان کی سرنوشت کا ذمہ دار ٹھہرائیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ (آل عمران: ۶۴)

تعجب کی بات یہ ہے کہ عیسائیوں نے اللہ سے مقامِ ربوبیت لے کر نہ صرف حضرت مسیحؑ کو بخش دیا ہے بلکہ وہ اپنے علما و راہبوں کو بھی رب مانتے ہیں اور تشریع و تحریم (شریعت کے احکام بنانے) میں انہیں صاحبِ اختیار جانتے ہیں۔ اگر راہب کسی چیز کو حرام قرار دے دیں جو کتاب خدا کی رو سے حلال ہو، یا اس کے برعکس، تو وہ ان کی بات کو کتاب پر ترجیح دیتے ہیں۔ قرآن مجید اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَہُمۡ وَرُہۡبَانَہُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَالۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ ۚ (التوبہ: ۳۱)

عدی ابن حاتم کہتا ہے کہ میں نے اسلام کی خصوصیات اپنی بہن کی زبانی سنیں تو میں نے قصد کیا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی زیارت کروں۔ جب اُن کے حضور شرف یاب ہوا تو وہ اسی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے جس کا مضمون یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو رب بنا لیا ہے۔ میں نے پیغمبرِ اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔ ہم ہرگز ان کی عبادت نہیں کرتے۔ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا کہ وہ جب حلالِ خدا کو حرام یا حرامِ خدا کو حلال کرتے ہیں تو کیا تم ان کی پیروی نہیں کرتے؟ میں نے کہا کہ اس میں کیا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہی ان کی عبادت ہے۔ (☆) امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! عیسائیوں کی عبادت یہ نہیں تھی کہ ان (راہبوں اور علما) کے لیے روزے رکھیں یا نماز پڑھیں، بلکہ وہ ان کی اندھی تقلید کرتے تھے یعنی اگر وہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دیتے تو یہ ان کی پیروی کرتے تھے اور اسی طرح درحقیقت نامحسوس طور پر ان کی عبادت کرتے تھے۔ [1]

بالآخر قرآن مجید فرماتا ہے:

مَرۡیَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡۤا اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ سُبۡحٰنَہٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۱﴾ (التوبہ: ۳۱)

---

[1] مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۴

(۱۰) حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں آخری بحث اللہ تعالیٰ کی اُن کے ساتھ قیامت کے دن کی گفتگو ہے۔عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے خود انہیں اپنی پرستش کی دعوت دی لہٰذا وہ جو اُن کی الوہیت کے قائل ہیں تو خود حضرت عیسیٰؑ کے کہنے کے مطابق ہیں۔اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا جسے قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے۔اس موضوع سے متعلق آیات اس طرح ہیں:

موضوع سے متعلق آیات

۱۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ
اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ
بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ
نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

۲۔ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ
عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ
عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

۳۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

۴۔ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ (المائدہ: ۱۱۶ تا ۱۱۹)

آیات کا ترجمہ

۱۔ یاد کرو جب اللہ نے عیسیٰؑ ابن مریمؑ سے کہا کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری

والدہ کو اللہ کا شریک بنا لو؟ عیسیٰؑ نے کہا کہ تیری ذات پاک و منزہ ہے۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایسی بات کروں جو حق نہ ہو۔ اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تو اُسے جانتا ہے۔ تو اس کو بھی جانتا ہے جو میرے دل میں ہے جب کہ میں نہیں جانتا اس کو جو تیری ذات میں ہے۔ تو ہی غیب سے واقف ہے۔

۲۔ میں نے نہیں کہا ان سے مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میرے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو جو اللہ ہے۔ میں جب تک ان کے درمیان تھا ان پر شاہد و ناظر تھا۔ جب تو نے مجھے اٹھالیا تو پھر تو خود ان پر ناظر وہ شاہد تھا اور تو تو ہر چیز پر شاہد و ناظر ہے۔

۳۔ اگر تو انہیں عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر انہیں بخش دے تو تُو غالب حکمت والا ہے۔

۴۔ اللہ نے فرمایا: آج وہ دن ہے کہ جب سچ بولنے والوں کو ان کا سچ فائدہ دے گا۔ اُن کے لیے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ یہ ہے بہت بڑی کامیابی۔

آیات کی موضوعی تفسیر

قرآن نے واضح دلیلوں سے حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے عقیدہ کو باطل قرار دیا ہے اور ہم نے بھی ان آیات کی شرح کی ہے۔ اب موضوع کی تکمیل کی خاطر ہم قیامت کے دن مسیحؑ اور اللہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو ذکر کرتے ہیں، اگرچہ یہ دن (روزِ قیامت) ابھی تک محقق نہیں ہوا لیکن چونکہ اس دن کو یقینی واقع ہونا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے فعل ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: "اذیقول اللہ یعیسی ابن مریم" جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گفتگو قیامت کے دن ہوگی۔ اس کی گواہ آیت: "قال اللہ ھذا یوم ینفع الصدیقین صدقھم" جو آیات کے آخر میں آئی ہے جس سے قیامت کا دن مراد ہے۔

چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کی پرستش کو خود حضرت عیسیٰؑ کے حکم کے مطابق بیان کرتے ہیں لہٰذا ان کے اس نظریہ کو باطل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ایسی گفتگو کرے گا تا کہ گمراہ و فریب خوردہ لوگ خود حضرت عیسیٰؑ کی زبان ہی سے سن لیں کہ انہوں نے قطعاً لوگوں کو غیر خدا کی پرستش کی دعوت نہیں دی اور اُن کی تبلیغ کا انداز بقیہ تمام انبیاء کی تبلیغ والا ہی ہے جن سب نے خدائے وحدہ لا شریک کی عبادت کی طرف ہی بلایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰـهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (المائدہ: ١١٦)

قرآن میں ''دون'' کا کلمہ کبھی غیر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (آل عمران: ١١٨)

''اے ایمان والو! اپنے علاوہ کسی کو راز دار نہ بناؤ''

کبھی ''دون'' اقل، کم از کم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ (نساء: ١١٦)

''اللہ تعالیٰ شرک سے کم جس چیز کو چاہے بخش دے''

لیکن جب بھی لفظ ''دون'' اللہ کے ساتھ استعمال ہو یعنی اللہ کی طرف مضاف ہو تو اس صورت میں دو اللہ کے معنی اللہ کا شریک قرار دینے کے ہوں گے۔ اس صورت میں ''الھین من دون اللہ'' کے معنی یہی ہوں گے کہ وہ اللہ کی اولوہیت کے بھی قائل ہیں اور اس کے ساتھ عیسیٰ ابن مریمؑ کو بھی الوہیت میں شریک قرار دیتے ہیں، یہ معنی نہیں کیے جائیں گے کہ وہ اللہ کی الوہیت کے بالکل معتقد نہیں ہیں، صرف عیسیٰؑ اور مریمؑ کو معبود مانتے ہیں، کیونکہ مشرکین میں سے کسی کا بھی یہ نظریہ نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ عیسائی تو صرف حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے قائل ہیں، نہ کہ حضرت مریمؑ کی۔ پھر قرآن نے کیوں یہ ذکر کیا ہے کہ وہ عیسیٰؑ اور ان کی والدہ دونوں کی الوہیت کے معتقد ہیں؟

اس سوال کے دو جواب دیئے جاسکتے ہیں جن سے اس ابہام کو رفع کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ممکن ہے قرآن کے نزول کے زمانہ میں اور اس سے پہلے عیسائیوں کا کوئی ایسا فرقہ پایا جاتا ہو جو دونوں کی اولوہیت کا قائل رہا ہو۔ طبرسی نے ابو جعفر سے ایک روایت نقل کی ہے کہ پہلے زمانہ میں عیسائیوں میں ایک فرقہ تھا جنہیں ''مریمیہ'' کہا جاتا تھا۔ وہ مریم کی الوہیت کے قائل تھے۔ اس قسم کی بات ہم پہلے عزیرؑ کے خدا کا بیٹا ہونے کے ضمن میں بھی ذکر کر چکے ہیں۔ اگر آج عیسائی حضرت مریمؑ کی الوہیت کے منکر ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ماضی میں بھی ان میں یہ عقیدہ نہیں پایا جاتا تھا۔

۲۔ اگرچہ عیسائی حضرت مریمؑ کی الوہیت کے قائل نہیں ہیں، لیکن ان کے اعمال حضرت مریمؑ و عیسیٰؑ کے مجسموں کے سامنے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس طرح جو دعائیں وہ مانگتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسائل کا حل ماں اور بیٹے کے ہاتھ میں سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی دعائیں الوہیت کے اعتقاد کا لازمہ ہیں، اگرچہ زبان سے اقرار نہ بھی کریں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بھی ''تسمیہ'' کے بجائے ''اتخاذ'' کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی عملی طور پر وہ حضرت مریمؑ کو خدا ہی سمجھتے ہیں اگرچہ ان کو خدا نہیں کہتے۔

اسی قسم کی تعبیر احبار و رہبان کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ: ۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو عملی طور پر اپنا رب بنالیا''

(اس آیت کی تفسیر پہلے بیان ہو چکی ہے)

حضرت مسیحؑ نے اللہ تعالیٰ کے سوال کے چند طریقوں سے جواب دیئے ہیں:

۱۔ تیری ذات ہر قسم کے شرک سے پاک و منزہ ہے اور مجھے حق نہیں پہنچتا کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں۔ ''سبحانك ما يكون لي ان اقول ما ليس لي بحقٍ'' یعنی نہ صرف یہ کہ ایسا میں نے کہا بلکہ ایسا کہنے کا مجھے حق بھی نہیں ہے، کیونکہ میں تیرا بندہ ہوں اور مجھے ایسا حق نہیں دیا گیا۔

۲۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے معلوم ہوتا کیونکہ تجھے میرے دل کی تمام باتوں کا علم ہے اور یہ کیوں نہ ہو کہ تو علام الغیوب ہے، جب کہ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں جو کچھ تیری پاک ذات میں ہے: ''ان كنت قلته فقد علمته تعلم ما في نفسي ولا اعلم ما في نفسك انك انت علام الغويب۔

۳۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ لوگوں سے کہا اُسے ذکر کیا کہ میں نے انہیں صرف یہ کہا تھا کہ تم اللہ کی، جو میرا اور تم سب کا رب ہے، عبادت کرو:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ (المائدہ: ۱۱۷)

پھر اگر انہوں نے ان تعلیمات پر عمل نہیں کیا اور غلط عقائد اپنا لیے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں، میں اس میں بالکل بے گناہ ہوں۔

۴۔ جب تک میں اُن میں تھا میرا کام تبلیغ دین اور ان کے اعمال پر نظر رکھنا تھا۔ جب تو نے مجھے اُن میں سے اٹھالیا تو پھر اُن کے اعمال پر تو خود شاہد ہے اور تو سب چیزوں پر ناظر و شاہد ہے۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ (المائدہ: ۱۱۷)

۵۔ بالآخر حضرت مسیحؑ مکمل طور پر اپنی ذمہ داری کے سلسلہ میں لوگوں کے معاملہ کو اللہ ہی کے سپرد کرتے ہیں کہ وہ تیرے ہی بندے ہیں، تو انہیں اس گمراہی پر عذاب بھی کر سکتا ہے اور بخش بھی سکتا ہے کیونکہ تو غالب حکمت والا ہے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ (المائدہ: ۱۱۸)

جب حضرت مسیحؑ کے اللہ تعالیٰ کو جوابات معلوم ہو گئے تو قرآن فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کی باتیں سننے کے بعد اُن کی

سچائی کی تائید فرمادی اور کہا کہ اس دن (قیامت کے دن) نہ صرف تم بلکہ تمام سچ بولنے والے اپنے سچ کا پھل پالیں گے اور سچ بولنے والوں کا اجر جنت ہے، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ اس طرح بہت بڑی کامیابی انہیں حاصل ہوگی۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١٩﴾ (المائدہ:١١٩)

والحمد للہ رب العلمین

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁